جامعہ

زیرِ ادارت ۔ پروفیسر محمد عاقل ایم ۔ اے

سالانہ چندہ صہ/ فی پرچہ ۸/	بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء	جلد ۱۴ ۔ نمبر ۱

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن ۔ دیال پریس، دہلی

اسلام کا جماعتی نظام

جامعہ اسکاوٹ کے درس کے سلسلے میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے "اسلام کا جماعتی نظام" کے عنوان سے ایک نہایت بیش بہا مقالہ سنایا تھا، یہ مقالہ جامعہ اسکاوٹ کے لئے بنیادی نصب العین کا کام انجام دے گا۔ ہم اس قیمتی مقالہ کو بجنسہٖ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ "مدیر"

جامعہ ملیہ نے اسکاوٹنگ کی ایک تحریک شروع کی ہے اور اس کے مقاصد اور طریق کار کی مناسب اشاعت کی جارہی ہے، ایسی تحریکیں افراد کے ولولوں کا نتیجہ ہوں تب بھی کامیاب ہوسکتی ہیں اگر ان کی پشت پر تہذیبیں اور تاریخی روایات ہوں تو انہیں بہت جلد عمومیت حاصل ہوجاتی ہے اس لئے نہیں کہ روایات کی سند لوگوں کو مجبور کر دیتی ہے، بلکہ اس سبب سے کہ یہ روایات طبیعت اور میلانات کا آئینہ ہوتی ہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس چیز کو کسی تہذیب کے حاملوں نے ایک مرتبہ پسند کیا ہے وہ اگر کسی نئی اور زمانے کے لحاظ سے مفید شکل میں پیش کی جائے تو وہ اسے خوشی سے قبول کرینگے

جامعہ نے جو نئی تحریک شروع کی ہے وہ ایک جماعتی منصوبہ ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ پوری جماعت کے لئے ہے ایک یا چند سیاسی یا مذہبی فرقوں کے لئے نہیں ہے اس کے مقاصد کسی اتفاق یا حادثے یا وقتی ضرورت سے اثر لے کر نہیں بلکہ تہذیب اور اخلاق کے ایک اعلیٰ تاریخی معیار کو سامنے رکھ کر مقرر کئے گئے ہیں، میں اس وقت بحث کرنا یا وعظ کہنا نہیں چاہتا، کوئی نئے خیالات بھی نہیں پیش کروں گا صرف آپ کو چند باتیں یاد دلاؤں گا جو آپ میں سے بیشتر کو معلوم ہیں، آپ کو یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ اسلام کی جماعت شروع سے خود مختار تھی، جن منصوبوں کو ہم اسلامی تہذیب کا جوہر کہہ سکتے ہیں، انھیں جماعت نے بادشاہوں اور ان کی طاقت کا سہارا لئے بغیر پورا کیا، خود اپنی ترقی کی راہیں نکالیں، خود اپنی

حفاظت کا انتظام کیا، پچھلے زمانوں کے مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے اس [illegible] بہت واقف ہوتے، اگر تقلید کے دَور میں اجتہاد کا دروازہ بالکل بند نہ کر دیا جاتا، آج کل بھی ہم اپنی روایات کو خوشی اور آسانی سے اپنا رہنما بنا لیتے اگر ہمیں بحث اور خاص طور پر اصولی بحث کا بے جا شوق نہ ہوتا، اصول ہر علم اور ہر کام کے لئے ہوتے ہیں، دین اور اخلاق کے بھی اصول ہوتے ہیں، جن کی وضاحت نیک اور مفید زندگی کے لئے لازمی ہے، لیکن ان کی وضاحت کرتے وقت ہم منطق سے اس درجہ متاثر ہو سکتے ہیں کہ حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیں اور یہ بھول جائیں کہ بعض باتیں جنہیں دل میں رکھنے تو دلچسپ ہوتی ہیں، زبان پر لانے سے بے تاثیر ہو جاتی ہیں اور اصول کا بے تاثیر ہو جانا جماعت کے لئے زہر ہے، دین کے لئے زندگی، علم کے لئے عمل ویسا ہی ہے جیسے کھیتی کے لئے زمین اور آب و ہوا، علم کی کوئی حد مقرر کرنا صحیح نہیں ہے، مگر کاشت تو انھیں چیزوں کی ہو سکتی ہے جن کے لئے زمین اور آب، و ہوا مناسب ہو، جن کی بازار میں مانگ ہو، جو کسی ضرورت کو پورا کرتی ہوں، اس وقت ہمارے لئے صحیح عمل وہ ہے جو ہماری جماعت میں قوت اور یک جہتی پیدا کرے اور اسے سیاسی کشمکش کے نقصان سے محفوظ رکھے اس لئے ہمیں ان باتوں کا علم ہونا چاہئے جو ہماری جماعتی نظام کی بنیاد تھیں جنھوں نے اس نظام کو مستحکم کیا اور جو ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ ہماری جماعت کی ساری قوت پھر بحال ہو سکتی ہے ہم میں وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کو بتائیں کہ ان کی حکومت کیسی ہونی چاہئے اس وجہ سے بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں کہ دینی احکامات اور تاریخی واقعات میں بڑا اختلاف ہے۔ یہ مشکل آج کل ہی نہیں بہت زمانے سے محسوس ہو رہی ہے۔ بعض بزرگوں نے یہ دیکھ کر کہ سیاسی حاکم کسی طرح دین اور قانون کی پابندی نہیں کرتے ان سے الگ رہنے کی تعلیم دی۔ ایسی تعلیم دی جا سکتی تھی، بادشاہوں اور ان کے امراء کے مال کو حرام، ان کے طریقہ کو گنہگاری کا نمونہ قرار دیا جا سکتا تھا، اس لئے کہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ سیاسی نظام جماعت کی تنظیم کا صرف ایک پہلو ہے۔ حکومت کرنے والے جماعت کے بے حساب کاموں میں سے صرف چند کے ذمہ دار ہیں، اور وہ اگر راہ راست پر نہیں آتے تو انھیں نظر انداز کرنا چاہئے۔ آج کل ہمیں خیال ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ غلط تھا، مسلمانوں کو

شاہی حکومت گوارا نہیں کرنی چاہئے تھی بلکہ جمہوریت کے ان اصولوں کو برتنا چاہئے تھا جن کی مثال
پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین نے قائم کی تھی۔ مگر ہم بیشتر سیاسی تاریخ پڑھتے ہیں، اس کو پوری سرگرمیوں
کا خلاصہ سمجھتے ہیں، اور وہ مقاصد جنہوں نے ہمارے بزرگوں کو مصروف رکھا ہماری نظروں سے چھپے
رہتے ہیں۔ ہمارے بزرگ دراصل تصورات، قوانین اور اخلاق میں اسلام کی ترجمانی کرنا چاہتے تھے
ان کے لئے کافی تھا اگر جماعت ان کے خیالات کو پسند اور قبول کرتی یا کم از کم ان پر غور کرتی۔ حاکموں
نے یہ مان لیا کہ حکومت شریعت کی تابع ہے تو ان لوگوں کے لئے جو علم اور عمل کا نمونہ بتانا چاہتے تھے سیاست
میں کوئی کشش نہیں رہ گئی۔ وہ حکومت کے لئے جبر کو لازمی سمجھتے تھے، اور اس سے ان کی طبیعت بھاگتی تھی
انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ حاکم اپنے حال پر چھوڑ دئے گئے تو اس سے کیا کیا نقصان پہنچیں گے۔ بلکہ دوسروں
کا ظلم سہنا بہتر جانا اس سے کہ خود جبر کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اور معاشی تنظیم کا اختیار ایسے لوگوں
کے ہاتھوں میں رہا جو اسلام اور جماعت کا حق ادا نہیں کرنا چاہتے تھے، زکوٰۃ حکومت کی آمدنی کا ذریعہ
بن گئی اور اس کا بہت ہی حقیر حصہ ایسے کاموں میں صرف ہوتا تھا جن کے لئے زکوٰۃ مخصوص ہے، دولت
نسل اور خاندان کے وہ امتیازات جنہیں اسلام مٹانا چاہتا تھا سیاسی مصلحتوں کی خاطر قائم رکھے گئے۔
بنو امیہ کی حکومت عربوں کی غیر عربوں پر حکومت تھی، اور بنو عباس جس انقلاب کی بدولت برسر
اقتدار ہوئے وہ اپنے معاشرتی اور اخلاقی مقاصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ مسلمانوں کے بیشتر فرقے
اور خلافت کی ساری کمزوریاں اسلام کی تعلیم کو سیاسی غرض اور مصلحت پر قربان کرنے کا نتیجہ ہیں۔
اب تحقیق کرنے سے رفتہ رفتہ معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے کئی فرقے جو اپنے عقائد کی وجہ سے
مردود قرار دئے گئے اسلام کی کسی نہ کسی بڑی قدر کے حامل تھے۔ قرامطہ نے جو سب سے زیادہ
بدنام ہیں، اپنے فرقے کی جو معاشی تنظیم کی وہ عدل اور افراد کے باہمی ربط کا ایک بیش بہا نمونہ ہے
کہ اس میں کسانوں اور صنعت پیشہ لوگوں کو وہ حق اور امتیاز اور مرتبہ دیا گیا جو ان کا حصہ ہے اور اسلام
کا مطالبہ شریعت کے عالم تو صرف اس حقیقت کو واضح کر سکے کہ جماعت کا مدار اتحاد عمل پر ہے نہ کہ
مقابلہ پر، اس لئے صنعت اور تجارت کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں، نہ یہ

ہونا چاہئے کہ ہر شخص کسی کی ضرورت اور کسی کی محنت سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے دولت جمع کرے۔ تمام امکانات کو دیکھئے تو یہ کارگزاری بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے، اس پر غور کیجئے کہ دنیا میں آزاد مقابلے کے مسئلہ نے کیا ستم ڈھائے ہیں تو اس کا یقین ہو جائے گا کہ ہماری شریعت کی تعلیم نے معاشی زندگی کا سب سے اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں سیاست کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور اب ایسے جماعتی نظام کا تصور کرنا مشکل ہو گیا ہے جو سیاست سے بالکل بے تعلق ہو۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حکومت ان جماعتوں کو ہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جو منظم ہوں، اور وہی جماعتیں اس کی زیادتیوں سے محفوظ بھی رہ سکتی ہیں جن میں تنظیم اور یک جہتی ہو۔ ہمیں سیاست میں پورا حصہ لینا چاہئے لیکن اس سیاست کی پشت پر ایسا نظام اور ایسے مقاصد ہونا چاہئیں جو ہر سیاسی خیال کے لوگوں کو اپنے خیال کے مطابق جماعت کی خدمت کا موقع دیں۔ اتحاد ہم سب چاہتے ہیں، جماعت کی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا یقین بہت کم لوگوں کو ہے کہ خارجی امداد اور ایک نامعلوم انقلاب کے بغیر ہماری جماعت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے گی۔ ہمیں خلفا اور بادشاہوں کے نام اور ان کے کارنامے یاد ہیں۔ یہ یاد نہیں کہ ان کی قوت جماعت کے زور بازو کی علامت تھی، ان کے کارنامے جماعت کے حوصلے کی مثالیں ہیں۔ اس لئے اپنی سیاسی تاریخ پر غور کرتے وقت ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ حق دار کو اس کا حق دیں۔ تہذیب کی تاریخ کا مطالعہ کریں کہ وہ غلط فہمی دور ہو جائے جو صرف سیاسی تاریخ پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے اور ہمیں معلوم ہو کہ ہماری جماعت حاکموں کی مدد کے بغیر اور کبھی ان کی مرضی کے خلاف کیا کچھ کر چکی ہے۔

پہلا کام جو مسلمانوں نے کیا وہ ان قوانین کی وضاحت تھی جن کے ماتحت ان کی اجتماعی و معاشرتی زندگی بسر ہوتی تھی۔ دراصل یہ کام پیغمبر اسلام صلعم کے ساتھ شروع ہوا اور اب تک جاری ہے، مگر ایک خاص زمانہ تھا جب اس کی طرف بہت توجہ کی گئی۔ عقائد کے تعین اور شریعت کی تدوین میں سیاسی حاکموں سے کوئی مدد نہیں ملی، اور ان کی مداخلت سے ہمیشہ نقصان اور فساد ہی ہوا۔ جماعت نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں فقہ کی ترتیب اور تدوین کا سارا کام خود ہی کیا۔ اور اسلامی دنیا کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ علما کے اپنے اپنے طور پر مطالعہ و غور کر

کرنے سے اور بغیر کسی درمیانی وسیلے کے شرع اسلامی جیسی جامع و مکمل چیز مرتب ہو گئی۔ خلفاء کو اپنی رائے پر عمل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ صرف تعلیم دیتے، کتابیں لکھتے، سوالوں کے جواب دیتے تھے۔ جماعت ان کی رائے کو اہمیت دیتی تھی، ان کی رائے ایک حکم کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا ماننا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور زیادہ مستند اور قابل قبول رائے حاصل نہ کی جاتی۔ علماء کی ضدیں اور مخالفتیں مشہور ہیں۔ تقلید کے دور میں یہ شدید اور بڑی حد تک بے معنی ہو گئیں۔ لیکن آپ یہ دیکھئے کہ عیسائیوں نے ایسی ہی مخالفتوں کی وجہ سے ایک روس پر کتنا ظلم کیا تو آپ اپنی جماعت کی رواداری اور سلامت روی پر فخر کریں گے۔ ہماری جماعت نے ہر شخص کی رائے کو اہمیت دی اس لئے کہ جماعت کے قانون کا دار و مدار اتفاق رائے پر تھا۔ اصولاً نہیں تو عملاً آخری فیصلہ وہی کرتی تھی اور اجماع کا سند کے طور پر مسلم ہونا اسی کی دلیل ہے۔ اجماع کے مطلب پر بزرگوں میں بہت بحث ہو چکی ہے۔ میرے لئے اس میں شریک ہونا مناسب نہیں، مگر اس پر علماء کی اکثریت متفق ہو گی کہ اجماع کے تصور میں جماعت اور عام رائے کو ایک ہی مرتبہ دیا گیا ہے جو نیابتی حکومت سے پہلے کسی جماعت کو حاصل نہیں تھا۔

مسلمانوں کی جماعت کے بہت سے حقوق چھن گئے مگر شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش وہ برابر کرتی رہی، بادشاہ اور دوسرے حاکم شریعت کے عالم نہیں ہوتے تھے اور اپنی مصلحتوں کو شریعت کا پابند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شریعت کی محافظ اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کی ذمہ دار خود جماعت تھی۔ اور جماعت اس فرض کو انجام دیتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خود غرض یا فتنہ و فساد کو پسند کرنے والے لوگ مجمعوں کو مشتعل کر کے انھیں اپنا آلۂ کار بنا سکتے تھے اور ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب جماعت نے اپنے اختیار سے نامناسب طریقے پر کام لیا لیکن جماعت فعل کے ساتھ عمل کو بھی دیکھتی رہی۔ نتائج کو جانچتی رہی اس نے افراد کو اتنی آزادی نہیں دی کہ جماعت کے نظام کو اپنی کسی رائے کی بنا پر برباد کر دیں۔ لیکن انھیں اتنا اختیار دیا کہ اپنے اصولوں کو اپنی ذاتی زندگی میں برتیں اور اس طرح ان کا مفید ہونا ثابت کریں۔ شریعت نے نجم میں ہر ایک شخص کا یہ حق بھی دیا ہے کہ

اچھی بات کا حکم دے، بُری بات کو منع کرے، اور ہم اتنے عرصے تک اس طریقے کو برتتے رہے ہیں کہ وہ ہماری طبیعت میں داخل ہو گیا ہے اور اس سے ناگوار صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں، اور ہوتی رہتی ہیں، مگر جن افراد کا یہ عقیدہ ہے کہ جماعت کا ایک مقرر اور معلوم نظامِ زندگی ہونا چاہئے وہ بے تکے سوالات کو اس بے پروائی پر ترجیح دیں گے جو انتشار اور بے حسی کی علامت ہے۔ اعتراض کرنے والوں کی نظر عموماً چھوٹی اور ظاہری باتوں پر پڑتی ہے، اور زندگی کی ادنیٰ تفصیلات پر جو نکتہ چینی کی جائے اس سے زیادہ وحشت ہوتی ہے، ہماری جماعت نے تفصیلات پر کچھ زیادہ توجہ کی تو اہم اور غیر اہم کے فرق کو بھی یاد رکھا۔ اگر اپنے کسی خادم کو غیر مقلد اور جماعت کا دشمن سمجھا تو بعد میں اس کی تلافی بھی کر دی، ایسی انفرادیت جو خدمت سے انکار کرے جماعت کے لئے ایک بڑا خطرہ ہوتی ہے اور جماعت کے پاس معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ وہ انفرادیت جو زندگی کی تفصیلات میں نظر آتی ہے کسی بڑی اور مؤثر شخصیت کی نشانی ہے یا محض آزادی کی نمائش کبھی اصلاح کا پیش خیمہ ہے یا بگڑی طبیعت کی ایک ادا، یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر ایک جماعت جس میں ہر درجے کے عالم اور جاہل شامل ہوں کسی جدت کے بارے میں غلط رائے قایم کرے، نقصان تو اس وقت ہوتا ہے جب وہ غلطی پر قایم رہے۔ پچھلے ستر اسی برس میں ہماری جماعتی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوا ہے اور اس کا سبب چند شخصیتیں ہیں جنہیں ہماری جماعت نے پہلے مخالفت کرکے آزمایا اور پھر تائید کر کے انھیں کامیاب کیا۔ اس طرح ہماری جماعت نقصان سے بچی رہی اس لئے کہ ہمارے معترض صرف اصولی بحث کرنے والے لوگ نہیں تھے بلکہ اکبر الٰہ آبادی مرحوم جیسے شاعر بھی، جن کا ہنسنا اور رونا، غم اور غصہ سب ایک دل کی کیفیتیں تھیں جو درد اور محبت سے لبریز تھا۔

شریعت ایسے عقائد اور قوانین کا مجموعہ ہے جو اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں، ہماری جماعت اپنی شریعت کی حفاظت کرتی رہی، مگر اسے اپنے لئے ایک قیدخانہ نہیں بنا لیا ہے اور ان لوگوں کا ادب مقدم کرتی رہی جو یہ کہتے تھے کہ شریعت کی پابندی اصل دین نہیں ہے صرف اس کی ظاہری شکل ہے،

ایسے لوگوں کی دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک تو وہ تھے جو سماجی زندگی میں بہترین اخلاقی نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد سے ہم خیال لوگوں کی جماعتیں بنا لیتے تھے، یہ طریقہ [illegible] کہلاتا تھا اور اس کے برتنے والے اہلِ فتوت۔ دوسری قسم صوفیوں کی تھی، تصوف کی خصوصیات بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا اور اہلِ دنیا سے کنارہ کشی صوفیوں کا کوئی عام اور مسلم اصول نہیں تھا۔ شیخ سرّی سقطی جو نویں صدی عیسوی کے ایک بزرگ تھے ایک پیرزادے کے بارے میں فرماتے ہیں جو دنیا سے بھاگ کر پہاڑوں میں رہنے لگے تھے کہ:۔

وہ تو پہاڑ میں ساکن ہو گئے ہیں اور یہ کوئی جوان مردی نہیں ہے، مرد ایسا ہونا چاہئے کہ بازار میں رہ کر حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا مشغول ہو کہ اس سے غائب نہ ہو۔ صوفی کی اصل شان یہ تھی کہ دنیا میں رہے اور ان معاملات کے علاوہ جو اس کے اور حق تعالیٰ کے درمیان تھے اپنے قول و عمل کو پاک زندگی کی جیتی جاگتی مثال بنائے۔ ظاہر میں فتوت اور تصوف کے درمیان کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ فتوت میں تہذیب کا، تصوف میں دین کا عنصر غالب تھا، جماعتی زندگی کو تقویت اور تقویت دونوں کی بدولت حاصل ہوئی۔

فتوت اور تصوف کے سلسلے میں بہت سی اصطلاحیں آتی ہیں جن کے معنی رفتہ رفتہ اس قدر بدل گئے ہیں کہ اب وہ بے معنی ہو گئی ہیں ان میں سے بعض کا جو فتوت اور تصوف دونوں میں بنیادی حیثیت رکھتی تھیں کسی قدر سمجھنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک نفس ہے، دینیات، فلسفہ اور تصوف میں یہ اصطلاح مختلف اور متضاد معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا کون سا استعمال صحیح اور کون سا غلط ہے۔ عام طور پر اس سے مراد وہ خواہشیں ہوتی ہیں جن کا پورا کرنا دین یا اخلاق کی رو سے غلط ہے لیکن یہ خواہشیں انسان اپنی جہالت یا حماقت سے پیدا نہیں کرتا۔ یہ اُسے قدرت کی طرف سے ملی ہیں اور ان میں سے بعض مادی زندگی کی اساس ہیں اسی وجہ سے وہ روحانیت جس کی خاطر نفس کو مارنا ہو تو فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ دین اور فطرت کا یہ تضاد دور ہو جاتا ہے اگر ہم نفس کو خواہشوں کا مجموعہ نہ فرض کر لیں بلکہ وہ میلان جو انسان کو اپنی ذات کی طرف متوجہ

کرتا ہے اور اسے جماعت میں محو ہونے کے بجائے جماعت سے الگ ہونے پر آمادہ کرتا ہے اسے یہ سکھاتا ہے کہ جماعت کے وجود سے اس کا الگ اپنا ایک وجود ہے۔ جماعت کے فائدے سے الگ اس کا اپنا ایک فائدہ ہے اگر یہ میلان قوی ہو تو انسان اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کی فکر میں پڑجاتا ہے، شریعت میں حیلے کرتا ہے، خدا سے سودا کرتا ہے، اور دنیا میں چور کی طرح رہتا ہے لیکن اگر کوئی تعلیم یا کسی شخصیت کا اثر انسان کو یقین دلادے کہ اپنی ذات کو ایک سوراخ بناکر اس میں چوہے کی طرح چھپ کر بیٹھنے سے وہ لطف اور وہ آسودگی نصیب ہی نہیں ہوسکتی جو آزاد زندگی کا حصہ ہے، تو پھر وہی خواہشیں جو آدمی کو چور اور مکار بناتی ہیں اس کی پیشانی کو روشن، اس کی نظر کو دلیر، اس کے دل کو شوق، اور وجد کی کیفیتوں کا خزانہ بنادیتی ہیں۔

تصوف کی اصطلاح میں ایسا شخص توبہ کرلیتا ہے یعنی اس کا عہد کرتا ہے کہ اعلیٰ کو ادنیٰ پر، بزرگ کو حقیر پر قربان نہ کروں گا آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس توبہ کا گناہ یا گناہ کی نیت سے کوئی خاص تعلق نہیں، یہ صحیح اور اچھی زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے جو اس سے بچنے اور بچنے سے پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ دل اور دماغ کو ایسے کاموں میں مصروف رکھنے سے جو اپنے لئے خواہش کرنے کی عادت ہی چھڑادیتے ہیں، بیشک اچھی زندگی بسر کرنے کا ارادہ مضبوط ہونا چاہئے اور اس میں پختگی، خلوص اور صدق کی بدولت پیدا ہوتی ہے لیکن توبہ کی طرح خلوص اور صدق سے بھی مراد نفس اور خواہشوں کو [illegible] رنے کے طریقے نہیں ہیں، یہ ایسی قوتوں کو بیدار کرنے کے ذریعے ہیں جو آدمی کو سچا اور پورا آدمی بناتی ہیں، آدمی اپنی قوت کو صرف میں لانے سے طاقتور ہوتا ہے، اخلاق کو مستحکم کرنے کے لئے سخاوت ضروری ہے، سخاوت کے معنی صرف یہ نہیں کہ بھوکے کو کھلائیے، فقیر کو خیرات دیجئے اور ہاں چندہ مانگنے والوں کو چندہ دیجئے۔ ہم اگر خودغرضی کی ایسی کیفیت کو معیار مانیں جس میں آدمی اپنی ذات اور اپنی ملکیت پر کسی کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا تو اتنا دے دینا بھی سخاوت ہے۔ دراصل سخاوت اس جذبے کی پرورش کا نام ہے جو انسان کو مانگنے والے کے بجائے دینے والا بنادیتا ہے۔ انسان دیتا رہے تو پھر اس کے پاس رہ کیا جاتا ہے؟ یقین کی ایک کیفیت جسے توکل کہتے ہیں، یہ قناعت سے بہت

بلند درجہ رکھتی ہے کہ اس میں آدمی ان چیزوں کو کافی نہیں سمجھتا جو اسے میسر ہوں بلکہ اپنے آپ کو ہر چیز سے محروم کر کے اس کا تو جوے کرتا ہے کہ اسے ہر چیز مل گئی۔ اس نظام کے برحق ہونے کا اقرار کرتا ہے جس میں سب سے زیادہ دولت مند وہ ہے جو سب سے زیادہ دے سکے اور سب سے زیادہ محتاج وہ ہے جو اپنے ہی لئے مانگے اور اپنے ہی پاس رکھنا چاہے۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ میرا مقصد نصیحت اور تلقین کرنا نہیں ہے اور اب مجھے ڈر ہے کہ آپ کہیں گے کہ میں وعدہ خلافی کر رہا ہوں، اس میں صرف میرا قصور نہیں ہے۔ اسلام منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق افراد کا مذہب نہیں ہے، لیکن دینیات اور اخلاق کی بیشتر اصطلاحوں کا جو مفہوم عام طور پر سمجھا جاتا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کا خدا سے براہِ راست معاملہ ہے، جماعت کا کوئی حق اور حصہ، کوئی منصب اور مرتبہ نہیں، اس طرح عمل کا میدان بہت تنگ ہو جاتا ہے اتنا ہی تنگ جتنا کہ خود غرض آدمی کا دل۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے دین کو مانتے ہیں مگر اس کے اصولوں کو برتنے سے معذور ہیں، میں نے شریعت اور اس سے متعلق چند امور کی مثال دے کر یہ دکھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی جماعت نے کس طرح اپنے نظام زندگی کو مرتب کیا اور پھر میں یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ ان لوگوں نے جو شریعت پر عمل کرنا کافی نہیں سمجھتے تھے کیا طریقہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں فتوت اور تصوف کا ذکر آیا اور ان اصطلاحوں کی تھوڑی سی وضاحت کرنا ضروری ہوا، جس کے معنی پہلے بہت وسیع تھے اور اب بہت محدود ہو گئے ہیں، جب تک ہم اس فرق کو ذہن نشین نہ کر لیں تو ہمارا دین اصطلاحوں میں بند رہے گا، ہماری جماعت کو افراد سے اور افراد کو جماعت سے کچھ فیض نہ پہنچ سکے گا اور فتوت اور تصوف جیسے مسلک ہمارے لئے معمّہ بنے رہیں گے۔

فتوت کے بارے میں ابھی تک اتنی تحقیق نہیں کی جا سکی ہے کہ ہم اس کا صحیح اندازہ کر سکیں کہ اس کا کتنا چرچا تھا۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ایسی جماعتوں کا ذکر کیا ہے جن کے اراکین جو صنعت پیشہ لوگ تھے ایک خانقاہ میں ساتھ رہتے تھے اور اپنی کمائی پر گذر کرتے تھے جماعت کے اراکین فتیان کہلاتے تھے ان کا سردار اخی۔ ان کا ایک مخصوص لباس تھا، ایک خاص عہد، جس کی

ہر حال میں پابندی کی جاتی تھی، ان کی تواضع اور سخاوت مشہور تھی، لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ ظالم حاکموں اور ان کے کارندوں کی مخالفت کرنے میں ان سے زیادہ مستعد اور جاں باز کوئی نہیں۔ ابن بطوطہ کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی ہے اس سے قریب سوا سو برس پہلے خلیفہ الناصر لدین اللہ نے ایسے لوگوں کی ایک جماعت بنائی جنہوں نے فتوت کا عہد لیا تھا، ان لوگوں کا جماعت میں داخلہ ایک خاص رسم ادا کر کے ہوتا تھا اور داخلے کے بعد وہ اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لئے کوئی مخصوص لباس پہنتے تھے۔ یہ سیاسی اور سرکاری فتوت ایک زیادہ بڑی اور مفید تحریک کا عکس تھی جسے حکومت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ فتوت کے کوئی ایک معنی نہیں ہیں، جیسے شرافت کسی ایک بات میں نہیں ہوتی اور اس کا فیصلہ لوگ اپنی طبیعت کے مطابق کرتے ہوں گے کہ وہ اپنی فتوت کو کس طرح نمایاں کریں گے۔ علامہ قشیری نے اپنے رسالے میں بہت سی رائیں اور مثالیں دے کر فتوت کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ فتوت کے لفظی معنی جواں مردی کے ہیں لیکن اس کا تعلق شجاعت سے زیادہ سخاوت اور ایثار سے ہے۔ اصلی فتوت یہ ہے کہ انسان دوسرے کے کام میں مدد دے، آنحضرت صلعم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی حاجت پوری کرتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے مسلمان بھائی کی حاجت میں مددگار ہے۔ فتوت نام ہے لوگوں کی خطیوں کو نظر انداز کرنے کا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فتوت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسرے سے برتر نہ سمجھے۔ ابوبکر وراق کا قول ہے کہ اہلِ فتوت وہ ہے جس کا کوئی دشمن نہ ہو۔ حضرت حارثؒ محاسبی کا قول ہے کہ فتوت یہ ہے کہ تم خود اپنے معاملات میں انصاف سے کام لو۔ اور کسی دوسرے کو اس میں انصاف کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ عمر بنؒ عثمان مکی کہتے ہیں کہ فتوت حسنِ خلق کا نام ہے۔ نصیر آبادی نے کہا ہے کہ مروت فتوت کی ایک شاخ ہے اور فتوت نام ہے دونوں جہان سے روگرداں ہو جانے اور ان سے دور بھاگنے کا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ فتوت نام ہے اس بات کا کہ انسان کسی کو آزار نہ پہنچائے، اور اپنا مال خرچ کرتا رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فتوت کا مفہوم ہے وفاداری اور عیب پوشی۔ بعض نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان لوگوں پر مہربانی کرے اور پھر اپنے آپ کو

بڑا نہ سمجھے۔ ایک صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ فتوت یہ ہے کہ نہ جمع رکھے اور نہ معذرت کرے اور کہا گیا ہے کہ فتوت یہ ہے کہ نعمت ظاہر کی جائے اور مصیبت چھپائی جائے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ فتوت امتیاز مٹا دینے کا نام ہے۔

فتوت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے علامہ قشیریؒ نے طرح طرح کی مثالیں بھی دی ہیں:۔

ایک صوفی نے اپنی جماعت کی دعوت کی، ان میں ایک شیخ شیرازی بھی تھے۔ جب سب کھانا کھا چکے اور قوالی شروع ہوئی تو سب کے اوپر نیند طاری ہو گئی، شیخ شیرازی نے دعوت دینے والے سے پوچھا کہ سماع میں ہمارے سو جانے کا کیا سبب ہے۔ اس نے کہا کہ جو چیزیں میں نے آپ لوگوں کو کھلائی ہیں ہر ایک کی بابت اچھی طرح جانچ لیا تھا۔ سوائے بینگن کے، جب صبح ہوئی تو وہ لوگ کنجڑے کے پاس گئے اور پوچھا۔ جو بینگن تم نے کل دئے تھے وہ کہاں سے لائے تھے۔ اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ کل میرے پاس کوئی بینگن نہیں تھا میں نے فلاں کھیت سے چرا کر دعوت کرنے والے کے ہاتھ بیچا، وہ لوگ اس کو اپنے ساتھ کھیت والے کے پاس لے گئے کہ اس سے معاف کرائیں۔ (یہ اہل فتوت میں سے تھا) اس نے کہا کہ میں نے یہ کھیت ہی اس شخص کو بخش دیا، اور اس کے ساتھ دو کھیت اور، اور ایک گدھا، اور کھیتی کے اوزار تاکہ وہ پھر ایسی حرکت نہ کرے

ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی، ابھی اس سے ملا بھی نہیں تھا کہ عورت کو بخار آیا اور چیچک نکلی جس سے اس کی صورت بگڑ گئی، اس مرد نے یہ کہا کہ میری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ بیوی رخصت ہو کر اس کے یہاں آئی اور بیس برس تک اس کے ساتھ رہ کر گذر گئی۔ اس وقت اس شخص نے اپنی آنکھیں کھولیں، لوگوں نے کہا کہ یہ کیا؟ اس نے کہا میں اندھا نہیں ہوا تھا، اندھا بن گیا تھا اس خوف سے کہ میری بیوی کو دُکھ نہ ہو۔ لوگوں نے کہا کہ تم فتوت میں سب سے بازی لے گئے ہو۔

ایک شخص نیشاپور کا نسا سے گیا وہاں ایک آدمی نے اس کی دعوت کی اور ساتھ ہی چند

ارباب فتوت کی بھی۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو ایک لونڈی ہاتھ دھلانے کے لئے لوٹے سے پانی گرانے لگی۔ نیشاپوری نے ہاتھ روک لیا اور کہا یہ فتوت کے خلاف ہے کہ عورتیں مردوں کے ہاتھ پر پانی ڈالیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں سالہا سال سے اس گھر میں دعوت کھانے آتا ہوں اور مجھے پتہ نہیں کہ میرے ہاتھ پر عورت پانی ڈالتی ہے یا مرد۔ شفیق بلخی نے امام جعفرؒ ابن محمدؒ سے فتوت کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا پہلے تم بتاؤ۔ شفیقؒ نے کہا کہ اگر ملے تو شکر کرے اور اگر نہ ملے تو صبر کرے۔ امام نے فرمایا کہ یہ تو ہمارے مدینے کے کتے بھی کرتے ہیں۔ فتوت یہ ہے کہ اگر ملے تو ایثار کرے اور نہ ملے تو شکر کرے۔

فتوت کے سلسلے میں علامہ قشیری نے آخر میں جو رائے دی ہے وہ ہمارے زمانے کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جاننا چاہئے کہ اصلی فتوت دوستوں کی عیب پوشی ہے خاص کر ایسے عیبوں کی جن سے دشمن کو ہنسنے کا موقع ملے۔ آپ کو معلوم ہے کہ شرعی احکامات اور ان اعلیٰ مصلحتوں کے لحاظ سے جو شرعی احکامات کی بنیاد مانی جاتی ہیں، ہر مسلمان کے لئے باقی تمام مسلمانوں پر حقوق ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ۲۶ ایسے حقوق کی تفصیل دی ہے، ان میں بعض کا تعلق میل جول کے معمولی آداب سے ہے، بعض اجتماعی زندگی کی جان ہیں۔ پہلا اور ہر معاملے پر حاوی حق یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے کے لئے وہی چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہو اور اس کے لئے وہی بات بری سمجھے جو اپنے لئے بری سمجھتا ہو۔ اسے کسی کو اپنے قول و فعل سے ایذا نہیں دینا چاہئے، ہر ایک پر حتی الامکان احسان کرنا چاہئے اور اس میں مستحق اور غیر مستحق کا فرق نہ کرنا چاہئے۔ اسے عیبوں کو چھپانا، کسی کے بارے میں بری بات سننے میں آئے تو اسے بھول جانا، خیر خواہی کرنا اور خوشی پہنچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ مسلمان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ امیروں کے پاس بیٹھے۔ اسے مساکین سے اختلاط اور یتیموں سے سلوک کرنا چاہئے۔ اس کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمان بھائی کی عزت اور جان کو ظالموں سے بچائے، چونکہ ہمسایوں سے ہر وقت سابقہ رہتا ہے۔ ان کے حقوق ادا کرنا اخوت اسلامی سے بھی سوا ہے۔ ان کی مدد اور

دستگیری کرنا، ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھر اور مال کی حفاظت کرنا، اور جوامر دنیاوی اور دینی انہیں معلوم نہ ہوں وہ انھیں ٹھیک ٹھیک بتانا چاہئے۔ ہمسائے گی سے بڑھ کر دوستی اور محبت فی اللہ کا درجہ ہے۔ یہ رشتہ شریعت اور قانون کے مطالبوں سے الگ اور برتر ہے اسے وہ لوگ جو چاہتے آپس میں قایم کرتے تھے اور اس میں مقصود یہ تھا کہ دوست کے مقابلے میں اپنی ذات نیست ونابود کردی جائے۔ شیخ ابوالحسن نوری کا قصہ مشہور ہے کہ خلیفہ سے کسی نے ان کی اور ان کے چند دوستوں کی چغلی کھائی اور اس نے سب کی گردن مارنے کا حکم دیا، جب جلاد آیا تو شیخ ابوالحسن نوری سب سے پہلے اس کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہا کہ پہلے مجھے قتل کرو اس نے وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس لحظہ اپنی زندگی اپنے بھائیوں کی زندگی پر مقدم کروں۔ محبت فی اللہ قایم کرنے کا رواج زیادہ تر صوفیوں میں تھا لیکن دوستی کا جو مرتبہ اسلامی جماعت کے اخلاق میں دیا گیا وہ دنیا کی کسی تہذیب میں نظر نہیں آتا، عام مسلمانوں ہمسایوں اور دوستوں کے حقوق کو ذہن میں رکھ کر فتوت کی ان توضیحوں پر غور کیجئے جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمانوں کی جماعت نے اپنی شیرازہ بندی کیسے لطیف اور موثر طریقے سے کی تھی۔

ہم لوگ فتوت کا نام تک بھول گئے ہیں۔ تصوف کی اب بھی عزت کی جاتی ہے مگر احترام کے اس جذبہ کا جماعت کے حقوق اور اس کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہماری عقیدت کا سبب کرامات کی روائتیں ہیں، جماعت کی اصلاح اور رہنمائی کے وہ منصوبے نہیں ہیں جن میں صوفی دراصل مشغول تھے۔ تصوف کا میلان کسی نہ کسی حد تک ہر شخص میں ہوتا ہے مگر ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں جن کا اصل محرک یہی میلان ہو۔ صوفیوں کی جماعتیں ان نسبتاً تھوڑے سے لوگوں پر مشتمل تھیں جو اپنے روحانی رشتے کو طرح طرح سے مضبوط کرتے رہتے تھے، ان کی زندگی لوگوں کی نظروں کے سامنے تھی، اور لوگوں کی نیت اور عمل کا سارا حال انھیں معلوم تھا، ان کا کام لینا نہیں تھا، دینا تھا یہ مستحق اور غیر مستحق میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ ان کے احسان کے ساتھ کوئی شرط نہیں تھی۔

دنیا میں بے شک ایسے لوگ ہیں جنہیں صرف دوسروں کی نیکی سے فائدہ اٹھانا آتا ہے، مگر شاید ایسے لوگ تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں جن پر اچھی مثال کا اثر پڑتا ہے، صوفیوں کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ انہوں نے مذہب اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کو عام مسلمانوں کے سامنے رکھا اور ان کا اس خلوص اور شوق سے اقرار اور اثبات کرتے رہے کہ کوئی ان سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

اب میں پھر اسی مطلب پر آگیا جس سے یہ مضمون شروع ہوا تھا۔ جامعہ سکاؤٹنگ کی تحریک بالکل نئی ہے، اس کی اصطلاحیں انوکھی ہیں، اس کا طریق کار زمانے کے مناسب۔ یہ صرف اس بھروسے پر شروع کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں اتنی توفیق ہے کہ وہ اپنی ترقی اور استقلال کی تدبیریں خود کر سکے، اپنی سیاست کو اپنے اجتماعی کاموں کا ایک شعبہ قرار دے سکے۔ اجتماعی کاموں کو سیاست پر منحصر نہ کرے، آپ کی مدد سے اس تحریک کو فروغ ہوا تو یہ شریعت سے ایک نئی محبت پیدا کرے گی، فتوت کی مشق کے لیے میدان فراہم کرے گی اور ان اعلیٰ انسانی قدروں کی علم بردار ہوگی جن کی شہادت ہمارے صوفیوں نے دی ہے۔

محمد مجیب

دیہات کا مشترک انتظام

ترلوک سنگھ صاحب آئی سی ایس نے چھ سال تک پنجاب کے دیہات کا ذاتی طور پر مشاہدہ اور مطالعہ کیا، اور خود دیہات کے لوگوں اور دیگر واقف کار حضرات سے اصلاح و ترقی کی تجویزوں کے بارے میں بحث و مباحثہ کیا اور ان کی بنیاد پر ایک تجویز مرتب کی ہے جسے انھوں نے "دیہات کے مشترک انتظام" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کی کتاب "پاورٹی اینڈ سوشل چینج" (افلاس اور معاشری تبدیلی) میں اس تجویز کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ "زمین کی ملکیت کس کے ہاتھ میں ہو" یہ مسئلہ چونکہ زراعتی اصلاح و ترقی کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور یہی اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔ اس لئے اس کے جستہ جستہ اقتباسات کو ہم اپنے قارئین کی واقفیت اور اظہار رائے کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

برما چین اور مشرق وسطیٰ کی زراعت کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پیداوار فی کارکن کم ہے۔ اس لئے زراعت کا کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت گذر اوقات کے جو لوازمات ہیں، ان کی محض کمترین مقدار کو حاصل کر پاتی ہے اور قحط سالی اور بیماری کا شکار بہت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ غذا کی وہ حالیہ کمی جس کی وجہ سے ملک کے بڑے رقبہ خصوصاً بنگال میں سخت مصیبت نازل ہوئی اور جس نے جنگ کے ایک نازک دور میں ہندوستانی معیشت کے شیرازہ کو تقریباً برباد کر دیا، ہمیں تنبیہ کرتی ہے کہ جب تک ہم اپنے وسائل کو تنظیم نہیں دیں گے ہم اپنی آبادی کے لئے غذا کے ان ناکافی معیاروں کو بھی قائم نہ رکھ سکیں گے جو اس وقت عام طور پر رائج ہیں۔

کاشت کو بہتر کرنے کے لئے ہر مزرعہ کے لئے جداگانہ طریقے پر چار چیزیں لازمی طور پر مہیا کرنے کی ضرورت ہے :-

(۱) اتنا کافی رقبہ کہ اس پر اچھی طرح کام کیا جا سکے۔

(۲) تنظیم (۳) سرمایہ اور

(۴) اس سطح کی فنی واقفیت جس سے موجودہ حالات میں بیش ترین کفایت کے ساتھ کام چلایا جا سکے۔

ان میں اولین لازمی ضرورت کافی رقبہ ہے۔ دوسرے عوامل بغیر اس کے کام نہیں ہو سکتے اس لئے بنیادی تبدیلی جسے ہمیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ انتظام کے واحدے میں اور جہاں تک فنی واقفیت اجازت دے، کاشت کے واحدے میں بھی خاصی توسیع کی جائے بڑے زمینداروں کے پاس تو بڑا رقبہ موجود ہے۔ اس لئے ان کے لئے تو ایسی تدبیریں نکالنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے اُسے پٹے پر نہ اُٹھائیں ۔لیکن خود کاشت کرنے والے زمینداروں اور کسانوں کا مسئلہ بہت مشکل ہے یہ یقینی ہے کہ جتنی آبادی بڑھتی جائے گی اُتنے ہی کسان کے رقبے غیر نفع بخش ہوتے چلے جائیں گے، اور جب تک اس رجحان کو روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جائے گی، کسان اور اس کے مزدور برابر روز بروز زیادہ غریب ہوتے چلے جائیں گے۔

اس صورت حال کا علاج کرنے کے لئے مختلف تجویزیں زیر بحث آ چکی ہیں۔ اس ملک میں ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو کسانوں کو زمینداری کے حقوق دئے جانے پر بہت زور دیتا ہے اگر کسانوں کو زمیندار بنا دینے سے کام چل سکتا تو دوسرے علاجوں کو سوچنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ہندوستان میں آدمی اور زمین کا جو تناسب پایا جاتا ہے اور کسانوں کے قبضے میں جو رقبے ہیں وہ جس حد تک غیر نفع بخش بن چکے ہیں ان کی موجودگی میں اس قسم کی امید قائم کرنا بالکل بے بنیاد ہے۔ موجودہ خرابیوں کو دور کرنے کے لئے اشتمال اراضی اور اور میراث کے حق کی بھی حمایت کی جاتی ہے۔ لیکن اشتمال اراضی کے کام میں اول تو بہت مدت صرف

ہوتی ہے۔ دوسرے یہ بذات خود مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے بلکہ اس کے بعد جب تک زمین پر سرمایہ لگانے کا بندوبست نہ کیا جائے اس وقت تک اس کے فائدوں کو حاصل نہیں کیا جا سکتا اور تیسرے یہ کوئی مستقل علاج نہیں بلکہ عارضی علاج ہے، کیونکہ کسان کے جن مقبوضہ رقبوں کو استعمال اراضی کے ذریعے یکجا کیا جاتا ہے وہ کسان کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کے درمیان دوبارہ برابر تقسیم ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے چھٹائی وراثت کو تجویز کیا گیا ہے لیکن جب دوسرے لڑکوں کے لئے زراعت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ معاش موجود نہ ہو محض بڑے لڑکے کو زمین کا وارث بنا دیا اور بقیہ اولاد کو ترکہ سے محروم کر دینا انصاف کے خلاف نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ علاج بھی مفید نہیں معلوم ہوتا۔

مشرقی یورپ کے کئی ملکوں میں جنگ عظیم اول کے بعد بڑے زمینداروں کے مقبوضہ رقبوں کو تقسیم کر کے چھوٹے زمینداروں کے مقبوضہ رقبوں کو وسیع کر دیا گیا ہے، لیکن مشرقی یورپ میں زمین کی تقسیم میں جتنی عدم مساوات پائی جاتی تھی، اتنی ہندوستان میں نہیں پائی جاتی یورپ کے برعکس ہندوستان میں بڑی زمینداریوں کی کاشت کا کام مزدوروں سے نہیں کرایا جاتا بلکہ چھوٹے کسانوں سے کرایا جاتا ہے۔ اگر بڑی زمینداریوں کو تقسیم کر کے چھوٹے زمینداروں کے رقبہ کو بڑھایا جائے گا تو ان کسانوں کے لئے زمین کو فراہم کرنے کا مسئلہ جو اس وقت بڑے زمینداروں کی زمینوں کو پٹے پر لے کر کاشت کر رہے ہیں پھر بھی باقی رہے گا اور ان کے مقابلے میں خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمینداروں کے حقوق کو ترجیح دینے سے اصل مسئلہ کا کوئی حل نہ نکل سکے گا۔

اب اگر خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمیندار بھی ہمارے مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا سرمایہ داری کے طریقوں پر کاشت کرنے سے ہمارا کام چل سکے گا جس کے ذریعے کمزور اور نااہلوں کو مقابلے سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تائید اول تو وہ لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اپنے روپئے سے یا تو براہ راست بڑی زمینداریاں خریدی ہیں یا جنہوں نے پہلے روپیہ چھوٹے زمینداروں کو قرض دیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کی زمینداریوں کو ہتھیا کر اپنے لئے ایک بڑی جائداد پیدا کر لی ہے، اور دوسرے وہ لوگ کرتے ہیں جو یا تو صرف زراعت کے کاروبار میں روپیہ لگا کر نفع کمانا چاہتے ہیں یا صنعت

کے ساتھ زراعت کے کاروبار کو بھی نفع کی خاطر چلانا چاہتے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ رجحان ہماری زراعت پیشہ آبادی کی کثیر تعداد کے لئے مہلک ثابت ہوگا، لیکن اگر چھوٹے پیمانہ کی کاشت روز بروز اسی طرح غیر نفع بخش ہوتی چلی گئی تو چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کو ان سرمایہ داروں کے لئے جگہ چھوڑنا ہی پڑے گی۔

ان حالات کو دیکھنے کے بعد ہمارا روشن خیال طبقہ اس کا علاج یہ تجویز کرتا ہے کہ زمین کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ لیکن قومی ملکیت کا سوال تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) ایسے چھوٹے زمینداروں کے حقوق کو قومی ملکیت بنانا جو خود کاشت نہیں کرتے (۲) خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کے حقوق کو قومی ملکیت بنانا،

(۳) بڑے زمینداروں کی زمین کو جو براہ راست ان کے قبضہ میں ہو قومی ملکیت بنانا

آیئے سب سے پہلے ان چھوٹے زمینداروں کے بالاتر حقوق کے مسئلے کو لیا جائے جو اپنی زمین لگان پر اٹھاتے ہیں۔ جہاں تک زمین کے مناسب استعمال کا تعلق ہے جن لوگوں کو اہمیت حاصل ہے وہ، وہ لوگ نہیں ہیں، جنھیں زمین سے لگان وغیرہ وصول کرنے کا حق ملا ہوا ہے۔ بلکہ دراصل وہ کسان ہیں جو براہ راست زمین پر قابض ہیں اور ان کسانوں کے فائدہ کے لئے (کیونکہ ان کی ترقی کے ساتھ زراعت کی عام ترقی بھی وابستہ ہے۔) سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ زمین پر بالاتر حقوق رکھنے والے زمینداروں سے زمین کی اصلاح و ترقی میں مزاحم ہونے کا اختیار چھین لیا جائے۔

بنگال کے صوبے کے لئے رعیت واری نظام تجویز کرنے میں فلاوڈ کمیشن کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ کسان یا موروثی کاشتکار کے اوپر جتنے لوگوں کو بھی زمین پر حقوق حاصل ہوں ان سب کے حقوق کو سرکار معاوضہ ادا کرکے خرید لے، اور کسانوں کا رابطہ چاہے وہ اپنی زمین پر کاشت خود کرے یا کسی شکمی کاشتکار سے کرائے براہ راست حکومت کے ساتھ قائم کردیا جائے۔

کمیشن کی یہ تجویز اس حد تک تو مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کسان کا رابطہ براہِ راست سرکار سے کر دیا جائے۔ لیکن سرکار کو بالاتر حقوق فوراً نہ خرید نا چاہیں بلکہ درمیانی زمانے میں یہ کرنا چاہیے کہ جو لگان قانونی طور پر مقرر ہو اُسے گاؤں سے اشتمالی طور پر خود وصول کرے، اور اس کی وصولیابی میں اس کا جو خرچ ہو، وہ سرکاری مالگذاری وضع کر کے بقیہ حصہ کو زمین کے مالکوں اور حق داروں کے درمیان تقسیم کر دیا کرے۔

اسی درمیانی زمانے میں گاؤں کے اندر مشترک انتظام رائج کرا دینا چاہیے، دیہات کا مشترک انتظام کیا ہے؟ اس کا مفہوم آگے تفصیل سے سمجھایا جائے گا۔ جب یہ مشترک انتظام رائج ہو جائے گا تو گاؤں کے اندر ملکیت کے حقوق کو خریدنے کی خواہش پیدا ہو جائے گی اور ان کے پاس وسائل بھی اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس وقت سرکار کو ملکیت کے بالاتر حقوق کی خریداری کا اعلان کرنا چاہیے، اور گاؤں کی مشترک تنظیم کو شفع کا حق دینا چاہیے اگر گاؤں مشترک طور پر بالاتر حقوق کو خریدنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا تو سرکار ان کی خریداری کے لئے روپیہ کی فراہمی کی زحمت سے بچ جائے گی۔

کاشت نہ کرنے والے زمینداروں کے بعد خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمینداروں کے حقوق کو قومی ملکیت بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کی حکومت کو ہرگز کوئی کوشش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ان کی تنظیم کی بہتری کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

آخر میں بڑے زمینداروں کی جائداد کو قومی ملکیت بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کے لئے حکومت کو ایک طرف تو منصفانہ لگان اور اجرتوں کا مطالبہ کرنا چاہیے اور دوسرے رقبہ کی وسعت کے لحاظ سے مالگذاری کی شرح کو متزائد کرنا چاہیے۔ جب یہ کیا جائے گا تو یہ بڑے زمیندار اپنی زمینداری کی حالت کو بہتر کرنے کے لئے مجبور ہوں گے۔ ان کے لئے یہ بات البتہ لازمی کر دینا چاہیے کہ وہ اپنی فصلوں کو حکومت کے منصوبے کے ماتحت رکھیں۔

چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمینداروں کی تنظیم کے لئے کئی حل تجویز کئے گئے ہیں۔ ان سب میں ان کو متحد کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اس اتحاد کی شکلیں اور مدارج مختلف ہیں پہلی تجویز یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے کھیتوں پر تو خود ہی کام کرنا چاہیے لیکن جن فصلوں کو یہ بوئیں ان کا تعین جماعت کی طرف سے کیا جائے۔ اس میں عملی دشواریاں بہت سی ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے گروہ کی تجویز یہ ہے کہ اتحاد عمل، کھیتی کے کام کے علاوہ اور دوسرے کاموں۔ مثلاً قرض حاصل کرنے خریدنے اور بیچنے میں جاری کیا جائے۔ لیکن ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک جس کے مقاصد میں یہ سب چیزیں شامل تھیں۔ کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکی اس لئے دوسرے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی امداد باہمی کو شروع میں رواج دینے کی جگہ بعد میں رواج دیا جائے، اور اس سے پہلے امداد باہمی کی کاشت کو رائج کیا جائے۔

امداد باہمی کی کاشت کا مفہوم ابھی تک لوگوں کے ذہن میں صاف نہیں ہے امپیریل کاونسل آف اگریکلچرل ریسرچ نے جو یادداشت زراعت اور فلاحت حیوانات کی ترقی کے بارے میں ۱۹۴۴ء میں شایع کی ہے اس میں اس کی حسب ذیل تعریف کی گئی ہے "ہر کاشتکار کے حقوق اپنی زمین پر باقی رہیں گے، لیکن کاشت کا کام مشترک طور پر کیا جائے گا۔ خرچ ایک مشترک فنڈ سے پورا کیا جائے گا، اور اسے مجموعی آمدنی میں سے وضع کردیا جائے گا۔ اس کے بعد خالص آمدنی کو کاشتکاروں کے درمیان، ہر شخص کی زمین کے تناسب کے مطابق تقسیم کردیا جائے گا۔" جب ہم امداد باہمی کی کاشت کو اس تعریف کے ساتھ اپنی دیہی معیشت میں داخل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ہمیں اتنی مفید ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ نظر آتی ہے اور اس سے ہمارا زیادہ کام نہیں چلتا۔ نہ تو کاشتکار کے حقوق ہی زمین پر باقی رہتے ہیں اور نہ مشترک کاموں کی تقسیم ہی ٹھیک طریقے پر ہو پاتی ہے اور نہ ان کا معاوضہ ہی قابل اطمینان طریقے پر دیا جا سکتا ہے۔

اس لیے ہمیں ایک زیادہ کارگزار طریقہ پیدائش اور زیادہ منصفانہ طریقہ تقسیم

پیداوار کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اول یہ کہ چونکہ زمین کے انتظام پر نگرانی قائم کرنا دیہی تنظیم نو کے لئے نہایت لازمی ہے۔ اس لئے ہمیں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے جس سے کسان ہمارا ساتھ دینے کی جگہ ہمارا مخالف ہو جائے۔ دوسرے تنظیم نو کا کوئی طریقہ کسانوں میں اس وقت تک مقبول نہیں ہوگا جب تک وہ دو تصورات کا جو دونوں ہماری دیہی معاشرت کی نفسیات کے لئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، انکار کرتا رہے گا یعنی:-

(۱) ملکیت کا اصول اور

(۲) مساوی وراثت کا اصول

اس کے علاوہ جو لوگ امداد باہمی کی کاشت تجویز کرتے ہیں وہ صرف خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمینداروں کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں، اور دیہات کے لاکھوں زمین کی ملکیت سے محروم مزدوروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لئے نیا دیہی نظام بناتے وقت ہمیں چار ضرورتوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے:-

(۱) کارگذار جماعت

(۲) زمین کی ملکیت سے محروم، مزدوروں کی بہبود۔

(۳) دیہی اور صنعتی معیشت میں یک جہتی اور

(۴) معاشری قدروں اور محرکوں کے نئے معیار

جو تبدیلیاں ہم چاہتے ہیں، ان کے لئے زمین پر نگرانی قائم کرنا اولین شرط ہے، سویٹ روس میں اس نگرانی کو قائم کر لیا گیا ہے۔ لیکن اگر ہم پرامن طریقے پر تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں مناسب موقع پر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہمیں مزرعوں کے مشترک انتظام کی ضرورت ہے جس میں زمین کے حقوق کا تو خیال رکھا جائے، لیکن جس میں ساتھ ساتھ زمین محنت اور دیگر وسائل کے بہترین استعمال کی کوشش کی جائے اور امداد باہمی کا یہی وہ طریقہ ہے جسے موجودہ حالت میں سب سے زیادہ لائق عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔

مشترک انتظام سے مراد ایک ایسا نظام ہے جس میں ملکیت کے حقوق کا تو احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن جس میں مالکان اراضی انتظام کے لئے اپنی زمینوں کو متحد کر لیتے ہیں۔ اس کے اصول کو سمجھانے کے لئے ایک مثال کو پیش کرنا مناسب ہوگا۔ فرض کیجئے ہمارے پاس ۶۰ ایکڑ کا ایک رقبہ ہے۔ جس کے دس مالک ہیں جن میں سے ہر ایک کے قبضہ میں علی الترتیب دو چار چھ، آٹھ یا زیادہ ایکڑ ہیں۔ فرض کیجئے ان دسوں مالکوں میں سے چار خود کاشت نہیں کرتے کیونکہ ان میں سے دو کہیں ملازم ہیں، ایک تجارت کرتا ہے اور ایک اتنا بوڑھا ہے کہ کام نہیں کر سکتا۔ آج کل جو نظام رائج ہے، اس میں جو لوگ خود کاشت نہیں کرتے وہ اپنی زمین ذیلی کاشتکاروں کو لگان پر اٹھا دیتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ چونکہ زراعت کے لئے اچھا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے فرض کیجئے کہ ان ۶۰ ایکڑوں کو دسوں مالکوں کے مشترک نظام کے ماتحت لے آیا جاتا ہے لیکن ان میں سے صرف ۶ گاؤں میں کام کرنے کے لئے موجود ہوتے ہیں۔

اب زمین کی آمدنی دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگی، ایک حصہ تو کام کی آمدنی کا ہوگا دوسرا ملکیت کی آمدنی کا ہوگا۔ یہی وہ فرق ہے جس کے ماتحت ذیلی کاشتکار اور مالک دونوں ایک ہی زمین سے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ آمدنی کی تقسیم یا تو نقد میں کی جائے گی یا جنس کی صورت میں۔ یہ تقسیم عموماً رواج کے مطابق ہوگی لیکن کبھی کبھی مقابلے کے مطابق بھی ہو سکے گی۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ذیلی کاشتکار اور زمین کے مالک کے درمیان نصفا نصفی پر پیداوار کی بٹائی ہوتی ہے جو چھ آدمی ۶۰ ایکڑ رقبہ کی کاشت کریں گے۔ انھیں اپنی محنت کے معاوضہ میں نصف پیداوار ملے گی اور یہ چھ بقیہ چار کے ساتھ مل کر زمین کے مالک کی حیثیت سے نصف پیداوار کے حق دار ہوں گے اگر سہولت کی خاطر یہاں لیا جائے کہ ۶۰ ایکڑ کا یہ رقبہ دس ایکڑ کے چھ واحدوں میں بٹا ہوا ہے تو ہر کام کرنے والے کو اپنی زمین کی آدھی پیداوار ملے گی۔ بقیہ پیداوار کو وہ مشترک ذخیرہ میں شامل کرے گا۔ پھر اس مشترک ذخیرہ میں سے مشترک فرم اپنی مالگذاری ادا کرے گا۔ ان کاموں میں جو ضروری ہوں گے مشترکہ طور پر سرمایہ لگائے گا اور دوسرے لازمی

۔ ۔ ، پورا کرے گا۔ ، بہت بڑا جو بچت ہوگی ۔ دسوں مالکوں کے درمیان ان کے زمین کے حصے کے مطابق تقسیم کردی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ زمین کے مشترک انتظام کے لئے زمین کا کس قدر رقبہ ضروری ہوگا۔ اس کا انحصار تین باتوں پر ہوگا:۔

۱۔ سرمایہ کس قدر دستیاب ہوسکتا ہے۔

۲۔ انتظامی اہلیت کس پیمانہ کی پائی جاتی ہے اور (۳) فنی واقفیت کی کیا حالت ہے

ایک مزرعہ کے چلانے کے لئے کتنے سرمائے کی ضرورت ہوگی۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ ہمارے پاس فنی واقفیت کس قسم کی ہے اور ہمارا طریقۂ کار کیا ہو۔ جدید طرز پر قوت محرکہ سے جو کاشت کی جاتی ہے اس کے لئے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے انگلستان، کینڈا، آسٹریلیا اور امریکہ میں جو منفرد کسان زمین کو پٹہ پر لیتے ہیں وہ پہلے اس بات کا اندازہ کرتے ہیں کہ کتنا سرمایہ انھیں دستیاب ہوسکے گا اور اس کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ کتنی زمین انھیں حاصل کرنا ہوگی۔ لیکن جہاں معاملہ افراد کا نہ ہو بلکہ کسانوں کی جماعت کا ہو جس کی بہبودی کو سرکار نے اپنے مقاصد میں داخل کر لیا ہو تو وہاں سرمایہ کی فراہمی کا سوال اس بات کا فیصلہ کرنے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھے گا کہ مشترک تنظیم کی توسیع کتنے رقبہ پر کی جائے۔

مغربی ملکوں کے منفرد کسانوں کے لئے صرف سرمایہ ہی کا سوال اہمیت نہیں رکھتا بلکہ رقبہ کی توسیع کا فیصلہ کرنے میں انتظامی قابلیت کی نوعیت کو اس سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ انتظامی قابلیت کی ترقی مختلف اسباب کی پابند ہوتی ہے، تعلیم، تربیت روایت، تجربہ اور جماعت کی معاشی اور معاشرتی تنظیم یہ سب مجموعی اور انفرادی انتظامی قابلیت کی ترقی میں معاون یا مزاحم ہوسکتے ہیں۔ ہماری دیہی معاشرت کی خرابیاں سب پر روشن ہیں اس لئے ہمارے کسانوں کے اندر تو انتظامی قابلیت کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی

لیکن اس معاملے میں حکومت بہت کچھ مدد کرسکتی ہے۔ یہ جس قسم کی تنظیم کو ترقی دینا چاہے گی اس قسم کی انتظامی اہلیت کو مہیا کرسکے گی۔ چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے گاؤں میں مزرعوں کے مشیر، منیجر اور ان کے تربیت یافتہ عملہ کی خدمات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ جب چند سال تک کسان مشترک انتظام کے ماتحت کام کرلیں گے تو خود ان کے اندر مناسب انتظامی اہلیت پیدا ہوجائے گی۔ اس لئے جہاں تک انتظامی اہلیت کا تعلق ہے ہم اپنے مشترک مزرعوں کو جتنا چاہیں بڑا بنا سکتے ہیں اس لئے ہمارے لئے نہ تو سرمایہ کی فراہمی زیادہ اہمیت رکھتی ہے نہ انتظامی قابلیت بلکہ ہمارے لئے فنی واقفیت اور طریقہ کار کا سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ طریقہ کار ایک زبردست معاشری قوت ہے۔ اس کی تبدیلیوں سے معاشرہ کی تنظیم اور اس کی قدروں میں زبردست تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں جس معاشرہ میں طریقہ کار کی تبدیلیاں مسلسل ہوتی رہتی ہیں وہاں ذات پات کے فرق اور دوسرے معاشری امتیازات قائم نہیں رکھے جاسکتے۔ اس لئے ہمیں توقع ہے کہ طریقہ کار کی تبدیلیوں اور مشترک انتظام کی وجہ سے گاؤں کے اندر ایک ہی کام میں لگے ہوئے لوگوں میں حیثیت، آمدنی اور کام کے حالات میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ غائب ہوجائے گا مگر موجودہ طریقہ کار کے مطابق تنظیم دی گئی تو اس کے لئے سو دو سو ایکڑ کے مزرعے مناسب ہیں گے، ان مزرعوں میں انتظام اور فروخت کی کفایتوں کو بھی حاصل کرنا ممکن ہوگا اور بیج فصلوں، کھادوں، پودوں کی بیماریوں اور فلاحت حیوانات کے بارے میں جو علمی واقفیت موجود ہے۔ ان کے ذریعے جن کفایتوں کو حاصل کیا جاسکتا ہے انھیں بھی حاصل کیا جاسکے گا زراعت میں سائنس کے رواج کے معنی عام طور پر مشین کا استعمال سمجھے جاتے ہیں لیکن دراصل اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس سے بڑی حد تک علیحدہ ہے۔ اگر ہم زراعت کو ترقی دینے کے لئے مشین کا استعمال کرنا چاہیں گے تو اس کے لئے سو دو سو ایکڑ کے مزرعے کافی نہیں ہوں گے بلکہ انھیں بہت زیادہ بڑا کرنا ہوگا، لیکن ہندوستان میں، خصوصاً چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے گاؤں میں، ابھی مشین کے رواج میں دیر

سکے گی۔ یہاں کام کو دو منزلوں میں کرنا ہوگا۔ پہلے موجودہ طریقۂ کار کو جاری رکھتے ہوئے صرف انتظام کو عملی اصول پر ترقی دینا ہوگی۔ جب اس کام میں کامیابی ہوگی اور مزرعے ایک مکمل معاشی واحدے کی معیشت سے کام کرنے لگیں گے تب دوسری منزل میں جدید طریقۂ کار کو اختیار کیا جائے گا۔ اس طرح ہر گاؤں کی معیشت کے لئے جو لوگ فاضل ثابت ہوں گے ان کی تعداد کو بھی محدود رکھا جا سکے گا اور تبدیلی کی وجہ سے ابتری یکبارگی رونما نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے چھوٹے خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے گاؤں میں مشترک انتظام کا رقبہ کل گاؤں کو قرار دینا ہی زیادہ موزوں ہوگا۔ گاؤں کے اس رقبہ کو پانچ، سات یا دس مزرعوں میں جن کا رقبہ سو سو، دو دو سو ایکڑ ہوگا تقسیم کیا جا سکے گا اور اس طرح مختلف ذاتی قبائلی اور مذہبی اختلافات کو بھی جو گاؤں میں موجود ہیں چھوٹے پیمانے پر حل کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ گاؤں ان غیر زراعتی پیشوں کے لئے بھی جن کی ان لوگوں کے لئے ضرورت ہوگی جو زراعت کے کام میں فاضل سمجھ کر علیحدہ کئے جائیں گے ایک موزوں واحدہ ثابت ہوگا۔

ترلوک سنگھ

ہندوستان میں عورتوں کی تحریک

ہندوستان میں عورتوں کی تحریک کا آغاز ان مردوں کی کوششوں سے ہوا جنھوں نے اصلاح معاشرت کی تحریکوں کو ہندوستان میں سب سے پہلے شروع کیا تھا۔ ہندوستان کی سماج میں عورتوں کی جو ادنیٰ حیثیت تھی اور جن خرابیوں اور ناانصافیوں کا وہ شکار تھیں اور جن ناقابل علاج مشکلوں میں وہ مبتلا تھیں، ان کا احساس خود عورتوں کو بعد میں ہوا لیکن مردوں نے ان سے پہلے ان کے حقوق کی حمایت شروع کر دی تھی۔ راجہ رام موہن رائے نے جو برہمو سماج کے بانی تھے، نہ صرف عورتوں کو اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہونے سے بچایا بلکہ نکاح بیوگاں کو قانونی حیثیت دے کر سماج میں ماں کی حیثیت کو محفوظ کر دیا۔ ہندوستان کے قوانین و ضوابط میں نکاح بیوگان کا قانون، پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر کی کوششوں سے ۱۸۵۶ء میں شامل کیا گیا۔ ان ہی کی کوششوں سے شادی کی رضامندی کے لئے کم سے کم دس سال کی عمر پہلی مرتبہ قانونی طور پر لازمی قرار دی گئی۔ ودیا ساگر نے اپنا سارا وقت ہندو سماج کی برائیوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان ہی نے پہلی مرتبہ لڑکیوں کی تعلیم سے جو نہایت اچھے نتائج برآمد ہو سکتے تھے انھیں سمجھا اور یہ خود ایک عرصے تک کلکتہ کے پہلے لڑکیوں کے ... یعنی بیتھون اسکول سے متعلق رہے۔ م، ب ملاباری کی کوششوں سے ۱۸۹۱ء میں شادی کی رضامندی کی عمر کو دس سال سے بڑھا کر کم سے کم بارہ سال کر دیا گیا اور نکاح بیوگان کے سلسلے میں جو بعض پابندیاں تھیں انھیں ختم کر دیا گیا۔ ان کے بعد اس کام کو جسٹس مہادیو گووند راناڈے نے اور ان کے جانشین سر نرائن چندا ورکر نے جاری رکھا۔ اس کے بعد کے نٹراجن نے اخبار انڈین سوشل ریفارمر کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں اور آج زندہ لوگوں میں اس کام کو پروفیسر

ڈ.ک.کاروے پونا کی انڈین ویمنز یونیورسٹی کے بانی اور دیوان بہادر ہربلاس سردا قانون امتناع شادی بچگان کے مصنف انجام دے رہے ہیں۔

لیکن جس مشعل کو مردوں نے روشن کیا تھا وہ جلد ہی عورتوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی ہیں کام کو شروع کرنے والوں میں سب سے پہلا نام مہادیو گوند رانا ڈے کی اہلیہ رامابائی رانا ڈے کا ہے۔ ہم سے زیادہ قریب زمانے میں ممتاز نام کلکتہ کی مسز پ.ک.رے اور لیڈی بوس مدراس کی ڈاکٹر متھو لکشمی ریڈی اور احمد آباد کی شریمتی اناسویا بین سارابھائی کے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے بڑے نام نورودت اور سروجنی نائڈو۔ بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ، علی برادران کی والدہ بی اماں اور بڑودہ کی ہز ہائی نس مہارانی جمنابائی کے ہیں۔ ان سب نے اپنے اپنے طریقے پر ہندوستان کی عورتوں میں خود اعتمادی اور احساس عظمت پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ آہستہ آہستہ افراد و گروہ غیر نمایاں طور پر مختلف طریقوں سے اور کم و بیش محدود سمتوں اور حلقوں میں جو کام کر رہے تھے اس نے آخر کار ایک عظیم الشان تحریک نسواں کی صورت اختیار کر لی۔

قومی پیمانہ پر ہندوستانی عورتوں کی پہلی تنظیم ویمنز انڈین ایسوسی ایشن کی شکل میں ہوئی جس کی بنیاد مسز اینی بسنٹ نے ۱۹۱۷ء میں مدراس میں رکھی تھی۔ یہ اس زمانے کی عظیم الشان قومی تحریک کا جس کی مسز بسنٹ رہنما تھیں ایک جزو تھی۔ اس کے منشور آزادی میں حسب ذیل چیزیں شامل تھیں:۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی۔ معاشرتی خرابیوں کا ازالہ اور مردوں کے مساوی حقوق کا حصول۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سماجی خدمت کے لئے عورتوں کی تنظیم کی جائے۔ اس انجمن کو بلا خوف تردید عورتوں کی ان تمام تنظیموں کا جو اس وقت ہندوستان میں پائی جاتی ہیں پیشرو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کے چند سالوں میں عورتوں کے واسطے حق رائے حاصل کرنے کے لئے اس نے جو کامیاب شورش کی اس کو اس کا ایک بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے۔ ۱۹۲۴ء میں اس کی ۵۱ شاخیں، ۱۸ مرکز اور کارکن ممبروں کی ۲ ہزار سات سو ۲۷

تعداد تھی۔ اس کے سرکاری اخبار کا نام "استری دھرم" تھا۔ مدراس میں دیوا داسی کے نظام کو ختم کرنے میں اور نجات گھر (ریسکیو روم)، مدراس سیوا سدن اور انجمن امداد بچگان کے قایم کرنے میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اس قدر معروف ہیں کہ ان کے مزید تذکرے کی ضرورت نہیں ہے۔ آل انڈیا ویمنز کانفرنس اور آل ایشین ویمنز کانفرنس کے قایم کرنے میں زیادہ تر مسز مارگریٹ کزنس کی کوششوں کو دخل رہا ہے جو مسز بسنٹ کی بہت قریبی مشیر اور معاون تھیں اور ایک طویل زمانے تک الیوسی ایشن کی سکریٹری اور استری دھرم کی ایڈیٹر رہیں لیکن پچھلے کچھ سالوں سے ویمنز الیوسی ایشن کے شامل ویمنز کانفرنس کے ترقی پا جانے کی وجہ سے اور شاید کچھ اس لئے کہ شروع ہی سے اس کا تعلق تھیاسوفیکل سوسائٹی سے ہو گیا تھا۔ صرف احاطہ مدراس تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ مسز بسنٹ کے انتقال کے بعد سے اس کی صدر ڈاکٹر متھو لکشمی ریڈی چلی آرہی ہیں۔

نیشنل کونسل آف ویمن آف انڈیا کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں بین الاقوامی کونسل آف ویمن کی شاخ کے طور پر رکھی گئی اور اس کا الحاق بھی اسی بین الاقوامی انجمن کے ساتھ ہے۔ اس کی اب پانچ صوبائی کونسلیں دہلی، بمبئی، بہار، صوبہ متوسط اور بنگال میں ہیں۔ یہ ایک ماہانہ بلٹین شایع کرتی ہے جس میں ہندوستان اور تمام دنیا میں عورتوں سے متعلق خبریں درج کی جاتی ہیں۔ اس کی رکنیت زیادہ تر انگریزی داں عورتوں تک محدود ہے جن کا تعلق سرکاری اور دولت مند طبقوں سے ہے اپنے مخصوص حلقوں میں تو یہ خوب کام کرتی ہے اور عورتوں کے مفاد کی پوری دیکھ بھال کرتی رہتی ہے لیکن ویمنز کانفرنس کے برابر یہ ہندوستان کی عورتوں کو اپنی جانب مائل نہیں کر سکی ہے۔

آل انڈیا ویمنز کانفرنس اکتوبر ۱۹۲۶ء میں وجود میں آئی اور اس کا پہلا اجلاس ۱۹۲۶ء میں تعلیمی اصلاح کی کانفرنس کی حیثیت سے ہوا تھا لیکن بہت جلد اس کے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا گیا اور اب اس کے مقاصد اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہو گئے ہیں کہ

اس میں ہر قسم کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی، قومی اتحاد اور بہبود اور بین الاقوامی سمجھوتہ اور رضا جوئی سب کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے ومنیز انڈین ایسوسی ایشن اور نیشنل کونسل آف ومنیز کے ساتھ مل کر شادی کی رضامندی عمر کے بڑھانے، بچوں کی شادی کے روکنے، عورتوں کے حقِ رائے کو وسیع کرنے اور ہندوؤں کے قانون کو مرتب شکل دینے میں پورا حصہ لیا ہے نئی دلّی میں لڑکیوں کو علومِ خانگی سکھلانے اور استادوں کی تربیت کرنے کے لئے جو لیڈی ارون کالج چل رہا ہے وہ بھی اسی کی نگرانی اور اسی کی کوششوں سے چل رہا ہے۔ یہ کالج ڈپلوما تو عطا کرتا ہی ہے لیکن اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کو بھی اس بات سے واقف کر دیا کہ تدبیر منزل کے لئے عورتوں کی سائنٹیفک تعلیم و تربیت سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے زیرِ انتظام ایک آل انڈیا سیو دی چلڈرن فنڈ ایسوسی ایشن بھی بنائی گئی ہے تاکہ ان لاوارث بچوں کے لئے گھر فراہم کئے جائیں جنہیں جنگ اور قحط کے نے پیدا کر دیا ہے۔

ہندوستان میں عورتوں کی جتنی دوسری انجمنیں ہیں ان سب کے مقابلے میں اس انجمن کی رکنیت کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اس میں تمام طبقوں اور مذہبوں کی نمائندہ عورتیں شامل ہیں۔ اس کی شاخیں اور ماتحت شاخیں جن کی تعداد ۱۲۰ کے قریب ہے تمام صوبوں اور بہت سی ریاستوں میں موجود ہیں۔ یہ کانفرنس سیاسی معاملات میں سختی کے ساتھ غیر جانبداری سے کام لیتی ہے لیکن پھر بھی اس کا ایک مخصوص قومی نقطۂ نگاہ ہے جس کی وجہ سے اسے ایک عام مقبولیت حاصل ہے، یہ ایک رسالہ "روشنی" نام کا نکالتی ہے، جس کا شمار ہندوستان کے اندر عورتوں کے ممتاز رسالوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کے سالانہ اجلاسوں کا شمار ملک کے اہم واقعات میں کیا جاتا ہے اور اس کی کارروائیوں سے سرکاری اور غیر سرکاری حلقے بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا تمام انجمنیں غیر فرقہ وارانہ ہیں اور ہر چند اپنے مخصوص وجود کو قائم رکھنے کی

کوشش کرتی ہیں۔ لیکن ضروری موقع پر وقتاً فوقتاً عورتوں کا ایک متحدہ محاذ پیش کرنے کے لئے متحد ہوجاتی ہیں۔ عورتوں کے حق رائے کو وسیع کرنے کی جب شورش کی جارہی تھی تو ان سب نے مشترکہ طور پر اپنے مطالبوں کو پیش کیا اور ان کی یہ مشترک کوشش نہایت موثر ثابت ہوئی

ان کے علاوہ عورتوں کی چار اور انجمنیں بھی ہیں جن کی اہمیت اتنی زیادہ تو نہیں ہے لیکن پھر بھی ان کا تذکرہ ضروری ہے "نیشنل وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے جو اپنے مشاغل کو تعلیمی اور معاشرتی اصلاح تک اور وہ بھی صرف عیسائی فرقے کے درمیان محدود رکھتی ہے۔ مسلم لیگ اور ہندو سبھا نے بھی حال میں عورتوں کے شعبوں کو شروع کیا ہے لیکن ابھی تک ان کا کام صرف ابتدائی منزل میں ہے۔ ان کے علاوہ یونیورسٹیوں میں رہنے والی عورتوں کی انجمنوں کا بھی ایک وفاق فیڈریشن آف یونیورسٹی ویمن کے نام سے ہے جس کے اندر ترقی کے امکانات تو بہت ہیں لیکن اس کی رکنیت ابھی تک بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے شہروں تک محدود ہے۔

ہندوستان میں عورتیں تعلیمی اور معاشرتی حیثیت سے جتنی پس ماندہ ہیں اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ یہ تمام انجمنیں ملک کی عورتوں کے ایک نہایت مختصر تناسب کو متاثر کرپاتی ہیں۔ عورتوں کی اکثریت دیہات میں رہتی اور کھیتوں اور فیکٹریوں میں سخت کام کرتی ہے اور ان انجمنوں کی آواز ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ ان کے لئے شہری حقوق یا سیاسی آزادی کے حاصل کرنے کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ اپنے لئے کسی نہ کسی طرح روزی کے فراہم کرنے کا ہے۔ اس لئے جب تک عورتوں کی انجمنیں اُن تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں ان کی تمام تحریک عزلت پسند اور بے اثر رہیگی

جہاں تک عورتوں کی تحریک کے مستقبل کا تعلق ہے اس کی ترقی کی لازمی شرط جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا یہ ہے کہ اس کو زندگی کے حقیقی مسئلوں سے اپنے آپ کو آج کے مقابلے میں بہت زیادہ وابستہ کرنا چاہئے۔ حق رائے کی شورش انگیز تحریک کے زمانے میں انگلستان کی عورتوں نے جو سخت اذیتیں برداشت کیں یا امریکہ کی عورتوں نے اپنے طبقے سے متعلق جملہ حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں جو تنظیمی کارنامے انجام دئیے ہیں۔ جب ان کا مقابلہ ہم ہندوستان کی عورتوں

کی تحریک سے کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ہندوستان کی عورتوں کے لئے کتنا کام کرنا باقی ہے۔ لیکن ان کی کوششیں اس وقت تک مکمل نہ ہوسکیں گی جب تک حکومت کی طرف سے بھی ضروری قوانین وضع نہیں کئے جائیں گے۔ ایک حد تک تعلیم کے لئے سارجنٹ کے منصوبے ہندو قانون کی اصلاح کے لئے راؤ کے مسودے اور سنٹرل ہیلتھ سروے کمیٹی کی تحقیقاتوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان سے ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا۔ لیکن یہ سب چیزیں ابھی تک خیالی منصوبے کی منزل سے آگے نہیں بڑھی ہیں جب تک ان کو عملی جامہ پہنانا شروع نہیں کیا جاتا اس وقت تک یہ بیکار ہیں۔ حکومت کی کوششوں میں اب تک اس وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی رہی ہے کہ وہ ایک طرف تو مذہبی اور معاشرتی معاملات میں غیر جانبدار رہنا پسند کرتی ہے اور دوسری طرف بین الاقوامی معاملات میں جنگ جوئی سے اُسے فرصت نہیں ملتی۔ لیکن انگلستان میں تعلیم کا نیا قانون اور جامعی تحفظ اور قومی صحت کے لئے منصوبے جنگ کے نہایت تشویشناک زمانے ہی میں بنائے گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام وہاں کی قومی حکومت نے انجام دئے ہیں۔ اس سے بھی ہم ہندوستانی ایک سبق لے سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے لئے صرف انگلستان ہی درسِ عبرت فراہم نہیں کرتا بلکہ جاپان، روس، اور ترکی میں جو کچھ پچھلے پچیس سالوں میں عوام کی کثیر تعداد کی تعلیم، حفظانِ صحت اور معاشرتی ترقی کے لئے کیا جاتا رہا ہے اس کی اہمیت مشرقی ملک ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہے۔

اس لئے ہندوستان کی عورتوں کی موجودہ حالت اگرچہ اندیشہ سے خالی نہیں ہے، لیکن پھر بھی ان کا ماضی حوصلہ افزا ہے اور مستقبل کے لئے خوش آئند توقعات قایم کی جاسکتی ہیں۔

لکشمی۔ این۔ مینن

مسلم راجپوت برادری

مسلم راجپوتوں[۱] یا رانگڑوں کی برادری کی تاریخ اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کی تقسیم کے بارے میں مجھے بتلایا گیا ہے کہ ان کا حال راؤ صاحب راؤ عبدالحمید خاں صاحب رئیس پیرٹھی ضلع مظفر نگر سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو آل انڈیا مسلم راجپوت کانفرنس کے سکریٹری ہیں، لیکن ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔

سہارنپور شہر میں یہ برادری چھ سات محلوں میں ہے۔ سب سے زیادہ آبادی چار محلوں میں ہے (۱) محلہ داؤد سرائے (۲) محلہ جاٹوں (۳) کھجور تلہ (۴) لکھن تلہ۔ اس کے علاوہ شاہ بہلول اور محلہ کشہرہ میں بھی ان کی آبادی ہے۔ محلہ ہرن ماراں اور محلہ چوبرادان میں ان کی آبادی کم ہے۔ چند گھر محلہ پٹھان پورہ میں بھی ہیں۔ چند گھر محلہ منڈی اور محلہ شاہ مدار میں ہیں کل تعداد بارہ چودہ ہزار کے درمیان ہے۔

بھاجی (دعوت) کے حساب سے بھی آبادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کچی بھاجی میں آدھ سیر چاول اور پاؤ بھر دال تقسیم کی جاتی ہے۔ بعض محلوں میں دال کی مقدار کم ہے پکی بھاجی میں مٹھائی ہوتی ہے۔ اور آدھ سیر فی کس تقسیم کی جاتی ہے۔

اس حساب سے سب سے زیادہ بھاجی محلہ داؤد سرائے میں تقسیم ہوتی ہے۔ یہ سارا کا سارا محلہ راجپوتوں کا ہے۔ کچی بھاجی پندرہ من بٹتی ہے گویا بارہ سو آدمی ہوئے، کھجور تلہ میں آٹھ من بٹتی ہے۔ جاٹوں کا محلہ چھوٹا ہے۔ کھجور تلہ میں کچھ پٹھان بھی آباد ہیں اور ان کی راجپوتوں کے ساتھ رشتہ داریاں بھی ہیں۔ اسی طرح لکھن تلہ اور شاہ بہلول میں بھی پٹھانوں

---

[۱] یہ حالات تمام تر راؤ محمد کامل خاں صاحب کے بتلائے ہوئے ہیں جو "افضل" اخبار کے ایڈیٹر ہیں اور آل انڈیا مجلس احرار کے سرگرم کارکن ہیں۔

کے ساتھ رشتہ داریاں ہوگئی ہیں۔ یہ سلسلہ بیس پچیس سال سے شروع ہوا ہے۔ پہلے یہ بات معیوب سمجھی جاتی تھی، لیکن اب یہ بات نہیں رہی ہے۔ اس لئے بعض وقت راجپوتوں اور پٹھانوں کا شمار ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس میں غالباً کچھ الیکشن وغیرہ کی سیاسی مصلحتیں بھی ہیں۔ اول الذکر چھ محلوں میں، رعیت کے علاوہ باقی پوری آبادی راجپوتوں یا ان کے رشتہ دار پٹھانوں کی ہے۔

ان سب محلوں میں کچھ نہ کچھ کھیتی کا کام کرتے ہیں۔ یہ کام یا تو درون (یعنی شہر سہارنپور سے ملحقہ زمینوں) میں کیا جاتا ہے یا قرب وجوار کے دیہات مثلاً مانک مئو وغیرہ میں، کچھ لوگوں کی اپنی زمینیں ہیں اور کچھ دوسرے لوگوں سے زمین لے کر کھیتی کا کام کرتے ہیں۔

پلکمن تلہ، شاہ بہلول اور کٹہرہ کے محلوں کے راجپوت لکڑی کا کام کرتے ہیں یعنی نقشین چوبی کام۔ یہ لوگ کارخانہ دار بھی ہیں اور کاریگر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ عمارتی لکڑی کی دکانیں بھی ہیں۔ جو باغ کٹوائے جاتے ہیں ان کی لکڑی خرید کر کٹواتے اور اُسے فروخت کرتے ہیں۔ سوختنی لکڑی کی بھی دو دکانیں ہیں۔

محلہ جاٹوان میں زیادہ تر ملازم پیشہ ہیں اور کچہریوں وغیرہ میں ملازم ہیں۔

محلہ چیتور برداروں کے راجپوت مزدوری کا قلی کا اور ڈھالنے کا کام کرتے ہیں

ہرن ماران میں جراب کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور باقی ملازم پیشہ ہیں۔

ان سب محلوں میں کچھ لوگ معمار وغیرہ کا کام بھی کرتے ہیں

محلہ شاہ مدار میں زمیندار قسم کے لوگ ہیں۔ خاں بہادر راؤ قربان علی خاں صاحب اسی محلے میں رہتے ہیں۔ انھیں پہلی مرتبہ خاں بہادر کا خطاب ملا ہے۔ ورنہ پہلے راجپوتوں کو راؤ بہادر کا خطاب ملا کرتا تھا۔

کچھ آدمی بہت معمولی پیمانے پر پرچونی، پنسارہٹہ، وغیرہ کا کام بھی کرتے ہیں۔

کچھ مزدور پیشہ قسم کے لوگ سگریٹ فیکٹری وغیرہ میں بھی ہیں۔ اس برادری کے لوگ دولت مند برائے نام ہیں۔ کچھ متوسط الحال ہیں اور بیشتر مزدور پیشہ ہیں۔

کھیتی میں بعض لوگوں کے پاس اچھا کام ہے۔ کچھ لوگوں کے یہاں چالیس، پچاس ہزار کا ہیر پھیر ہے مثلاً سلہری کی فصل کی کاشت میں کسی کو بیس ہزار کسی کو ستائیس ہزار تک مل جاتا ہے۔ اس ذیل میں مندرجہ ذیل نام لائق ذکر ہیں۔

(۱) راؤ فضل محمد خاں (۲) محمد اکرام خاں (۳) سلطان احمد۔

یہ محلہ پلکھن تلہ میں رہتے ہیں، اور پڑھے لکھے بھی ہیں۔

لکڑی کے کام میں بعض لوگوں کے اپنے ذاتی کارخانے ہیں، اور اچھا بڑا کاروبار ہے مثلاً محلہ پلکھن تلہ میں نظر محمد خاں صاحب، طفیل احمد صاحب وغیرہ بڑے کارخانے دار ہیں۔ اسی طرح محلہ داؤد سرائے میں محمد ظہیر خاں بڑے کارخانہ دار ہیں۔ اسی محلے میں کچھ اچھی حیثیت کے کھیتی کے کام کرنے والے لوگ ہیں۔

محلہ شاہ مدار میں قربان علی خاں، یعقوب علی خاں، راؤ محمد احمد خاں بڑے زمیندار ہیں اور ٹھیکیداری بھی کرتے ہیں۔ آرمی کنٹریکٹر ہیں، راؤ قربان علی خاں کی نرسری ہے جس کا نام ہین ہین نرسری ہے اور ہندوستان بھر میں اس کی شہرت ہے اور اسی سلسلہ میں ان کو خاں بہادر کا خطاب بھی ملا ہے۔

محلہ جاٹوں میں بھی لوگ میونسپلٹی وغیرہ کے ٹھیکے لیتے رہتے ہیں۔ محلہ جاٹوں اس لئے جاٹ مشہور ہے کہ ایک روایت تو یہ ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ کے بال (جٹ) بڑے بڑے تھے اور دوسری یہ کہ جٹ راجپوتوں کی ایک گوت ہے۔ دراصل یہ لوگ جاٹ نہیں۔ ان کا محلہ کوچہ بند ہے۔ ان کے قریب البتہ ہندو جاٹوں کا ایک محلہ آباد ہے۔

محلہ کھور تلہ میں کھیتی کے سلسلے میں محمد یونس خاں کا نام لائق ذکر ہے

راجپوتوں میں جو لوگ کھیتی کرتے ہیں ان کے پاس عموماً دو سو، تین سو بیگھہ کی خود کاشت کھیتی ہوتی ہے۔ کچھ زمینیں ان کی اپنی ہوتی ہیں اور کچھ لگان پر لے لیتے ہیں۔ راؤ قربان علی خاں صاحب کا ایک اپنا ذاتی گاؤں ہے جس کا نام مکہ بانس ہے۔ ان کا باغ اور نرسری اسی گاؤں میں ہے۔

کچہری کے پاس راؤ محمد خاں صاحب کا باغ ہے، جس میں قلمیں وغیرہ بندھتی ہیں۔

ملازم پیشہ لوگوں میں بعض ریلوے میں کلرک ہیں۔ ایک نائب تحصیلدار محلہ پلکھن تلہ کے رہنے والے ہیں جن کا نام رضوان اللہ صاحب ہے۔ تھانیدار کئی ایک تھے لیکن اب سب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ کلکٹری میں بھی کچھ لوگ ملازم ہیں۔ چیف ریڈر عبدالرشید خاں صاحب بھی راجپوت ہیں۔ کلکٹری میں کچھ اور کلرک بھی ہیں۔ ڈاکٹروں میں ڈاکٹر فیاض خاں صاحب ہیں جو مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر تھے اور اس کے بعد کچھ دن جامعہ ملیہ میں بھی کام کیا ہے۔ کچھ لوگ تعلیمی محکمہ میں بھی ہیں۔ پانچ دس سال سے پڑھے لکھے لوگ بھی ہونے لگے ہیں۔ دو تین بی اے ہیں۔ ظفر احمد خاں صاحب بی اے، ایل، ایل، بی امپیریل سکریٹریٹ میں ملازم ہیں۔ ڈاکٹر فیاض خاں صاحب کے لڑکے ریاض خاں صاحب بی اے بی ٹی ہیں، اور علی گڑھ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ غلام محمد خاں ایم اے، ایل ایل بی وکالت کرتے ہیں۔ یہ نگرٹ کے رہنے والے ہیں۔ محلہ داؤد سرائے میں دس ایک نئے اور دو تین پرانے میٹرک پاس ہیں۔ محلہ جاٹوں میں بھی آٹھ نو میٹرک پاس ہیں، محلہ پلکھن تلہ میں بھی چار پانچ ہیں۔ محلہ ہرن ماران میں دو تین ہیں۔ محلہ شاہ مدار میں بھی ایک نے میٹرک پاس کیا ہے۔

محلہ داؤد سرائے اور محلہ جاٹوں میں لڑکیوں میں بھی تعلیم پائی جاتی ہے محلہ چوک میں بھی کچھ گھر راجپوتوں کے ہیں جن میں تعلیم ہے۔ تعلیم صرف پرائمری ہے۔ نماز روزہ سے واقفیت پیدا کرا دی جاتی ہے۔ محلہ چنور برداران میں البتہ دو لڑکیاں مڈل پاس ہیں۔

مدرسہ مظاہر العلوم یا دیوبند میں کسی نے تعلیم نہیں پائی ہے کچھ بچے تو مکتب میں پڑھتے ہیں کچھ اسلامیہ ہائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔

ایک انجمن اتحاد مسلم راجپوتان برائے نام قائم ہے۔ اس نے رسوم قبیحہ کو روکنے کی بھی کوشش کی ہے، جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں ان میں تو رسومات قبیحہ کے انسداد کا کام ہوا ہے بقیہ میں باوجود جد و جہد کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ تندرستی عام طور پر عورتوں، مردوں کی اچھی ہے۔ کسرت وغیرہ کا غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں کچھ شوق ہے لیکن عام طور پر کوئی شوق نہیں ہے۔

عام طور پر بری عادتیں نہیں ہیں۔ لیکن بے پڑھے لکھے لوگوں میں جو جہالت کی باتیں پائی جاتی ہیں وہ ہیں کبھی کبھار کوئی شخص شراب خوری میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور کسی کسی میں جوئے کی لت بھی ہو جاتی ہے۔

شادی بیاہ عام طور پر برادری کے اندر ہی ہوتا ہے۔ شہر کے کچھ خاندانوں میں البتہ پٹھانوں کے یہاں لین دین شروع ہو گیا ہے۔

برادری کی پنچایت ہر محلے میں ہے۔ پنچایت کے چودھری ہوتے ہیں۔ کسی محلے میں دو، کسی محلے میں چار، کسی میں پانچ۔ لیکن چودھریوں کا اقتدار بہت زیادہ نہیں رہا ہے شادی بیاہ کا تنازعہ یا خانگی جھگڑوں کا تصفیہ پنچایت کے ذریعے ہو جاتا ہے۔

برادری کا نظام قائم ہے، لیکن پہلے جیسا مستحکم نہیں ہے۔

بیاہ شادی اور دیگر تقریبات پر خرچ بہت زیادہ ہیں، برادری کو کھانا دینے، جہیز اور بھات (جو بہن کو بھائی کی طرف سے دیا جاتا ہے۔) میں خرچ بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ پیسے والے اب رسومات میں کمی کر رہے ہیں۔ لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگ پہلے سے زیادہ بڑھ چڑھ کر خرچ کر رہے ہیں۔ اصلاح رسوم کی زیادہ مخالفت چودھری گروپ نے کی اور انھوں نے اس کام کو نہیں چلنے دیا۔ بیاہ شادی لوگ عام طور پر قرض لے کر بھی کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے

قرض میں پھنس جاتے ہیں۔

شہر کے راجپوتوں میں زیادہ تر چوہان اور پنڈیر ہیں، اس کے علاوہ جاتون سرودھے وغیرہ ہیں۔ پنور اور تنور بھی ہیں۔

ضلع سہارنپور میں راجپوتوں کے بڑے مرکز تحصیل رڑکی میں کھیڑی سکڑوتہ، جوالاپور ہیں۔ تحصیل سہارنپور میں رائے پور اور کھجناور ہیں۔ ویسے ضلع کے تقریباً ہر حصہ کے دیہات میں دو دو چار چار گھر ہیں۔ ان سب میں زیادہ تر چھوٹے زمیندار ہیں اور خود کھیتی کرتے ہیں۔ بعض بڑے بھی ہیں۔ راؤ علی احمد خاں بیہٹ کے پیرزادوں سے رشتہ داری ہے۔

راجپوت برادری کے دو اخبار جاری ہیں۔ ایک امرتسر سے مسلم راجپوت اور دوسرا اگر ٹھ شنکر پنجاب سے۔ ایک رہتک سے بھی نکلنا شروع ہوا تھا جو بند ہو گیا ہے۔

برادری کے ممتاز لوگوں میں حسب ذیل اصحاب لائق ذکر ہیں:۔

۱۔ خان بہادر راؤ قربان خاں صاحب میونسپل کمشنر:۔ یہ اچھے زمیندار ہیں، اردو کی اچھی تعلیم ہے۔ پہلے ان کے یہاں کا کاروبار شکرم والوں کے نام سے مشہور تھا۔ ریل نکلنے سے پہلے دہرہ دون کی ڈاک شکرم کے ذریعے جاتی تھی اور راہی کی شکرموں میں جاتی تھی۔ یہ نرسری اور زراعت کے کام میں بڑے ماہر ہیں۔ معاشرت پرانی وضع کی ہے۔ خان بہادر کا خطاب نرسری کے سلسلہ میں ملا ہے۔

۲۔ احسان اللہ خاں مرحوم تھانہ دار تھے، پڑھے لکھے تھے محلے میں با اثر تھے ان کے والد کی بھی محلہ میں بہت عزت تھی۔ ان کے لڑکے سات ہیں جو تقریباً سب ملازم ہیں۔

۳۔ محمد ظہیر خاں صاحب:۔ میٹرک پاس ہیں۔ منظور اینڈ سنز کے نام سے فرنیچر کی ایک فرم اور سوڈا فیکٹری چلا رہے ہیں۔ آج کل شکر ایجنسی کی ایک فرم میں حصہ دار ہیں صحرائی جائداد بھی ہے۔ اے، آر، پی کے ڈپٹی چیف وارڈن ہیں۔ کارتوس وغیرہ

کی دوکان ہے جو کچہری روڈ پر ہے۔ پانچ چھ بھائی ہیں جن میں سے بعض ملازم ہیں اور بعض کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے والد بہت مخلص سیدھے آدمی تھے۔ منظور اینڈ سنز کی فرم انھی کی قائم کی ہوئی ہے۔

۴۔ راؤ محمد کامل خاں صاحب:۔ آل انڈیا مجلس احرار کی جنرل کاونسل کے ممبر ہیں سرگرم کارکن ہیں۔ متعدد اخبارات جاری کئے۔ "مجاہد"، "ہمدرد"، "آواز" اور "آج کل"، "افضل" نکال رہے ہیں۔ صوبہ احرار کانفرنس کمیٹی کے ممبر اور ضلع احرار کے سکریٹری ہیں۔ مسلم راجپوتوں کے بارے میں زیادہ تر معلومات آپ ہی کے ذریعے سے حاصل ہوئیں۔

۵۔ ڈاکٹر فیاض خاں صاحب ریٹائرڈ ڈاکٹر مسلم یونیورسٹی۔

۶۔ محمد ابراہیم خاں صاحب ٹھیکیدار:۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ بیس سال سے میونسپل کمشنر ہیں۔ جائداد صحرائی بھی ہے اور باغات بھی ہیں۔

غالباً صرف ایک ظہیر خاں صاحب انکم ٹیکس دیتے ہوں گے باقی اور کسی شخص کی حیثیت انکم ٹیکس ادا کرنے کے لائق نہیں ہے۔ صحرائی جائداد والے البتہ مال گذاری ادا کرتے ہیں۔

راؤ محمد خاں صاحب کے پاس باغ اور گاؤں ہے۔ ان کی حیثیت ایک لاکھ سے اوپر ہو گی۔ خان بہادر قربان علی خاں صاحب کی حیثیت ایک لاکھ سے کم ہو گی، دس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان حیثیت رکھنے والے لوگ دس بارہ ہوں گے۔ ایک ہزار اور دس ہزار کے درمیان بہت سے ہوں گے۔

برادری کے خوش حال لوگوں کا سرمایہ زیادہ تر صحرائی جائداد میں لگا ہوا ہے سکنائی جائداد کی مقدار کم ہے۔ کچھ سرمایہ لکڑی کے کارخانوں میں لگا ہوا ہے، کچھ لوگ کھیتی کے کام میں بھی لگاتے ہیں اور دوسرے کاموں میں سرمایہ

لگا ہوا، نہیں ہے۔ زیورات کا شوق ہے۔ بعض لوگوں کی ٹکسیاں کرایہ پر چل رہی ہیں۔ کاریں نہیں ہیں۔ عام طریقے پر لوگوں کی معاشرت پرانی ہے۔ نئی وضع کا کچھ سامان ظہیر خاں اور راؤ قربان علی خاں کے یہاں ملے گا۔

ڈسٹرکٹ بورڈ میں اس برادری کے ایک ممبر یعنی راؤ علی احمد خاں صاحب ہیں

یہ آرزو تھی

یہ آرزو تھی کہ شعر و ادب کی دنیا میں
ہرے حسین خیالوں کے باغ بھی ہوتے
دلوں کے سرد اندھیرے میں چاندنی کے لئے
ہرے چراغ سے روشن چراغ بھی ہوتے

یہ آرزو تھی کہ اس ملک کے جوانوں کو
ہم اپنے قلب کی ساری حرارتیں دیتے
حیاتِ تازہ کے وہ ولولے عطا کرتے
جو مشتِ خاک کو تاروں کی رفعتیں دیتے

یہ آرزو تھی کہ ہم اپنی درس گاہوں میں
سیاستوں کے فریبوں کو فاش کر سکتے
یہ بن گئے ہیں روایت کے مصلحت کے جو بت
بس ایک بار انھیں پاش پاش کر سکتے

یہ آرزو تھی سیاست کے پہلوانوں کو
نیا خیال، نیا دل، نئی نظر دیتے
ان انقلاب کا نعرہ لگانے والوں کی
طبیعتوں ہی میں کچھ انقلاب کر دیتے

مگر تری نگہِ لطف یاد آتی ہے
کسے خبر نگہِ لطف کل رہے نہ رہے
کسے خبر تری زلفوں میں بل رہے نہ رہے
بس آج اور نظر کامیاب ہو جائے
یہ آرزو ہے کہ کل انقلاب ہو جائے

آلِ احمد سرور

حالاتِ حاضرہ

جس وقت سے جرمنی کی شکست یقینی ہوگئی روس کا رویہ بین اقوامی سیاست کا سب سے اہم مسئلہ بن گیا، اور اب بھی یہی مسئلہ سب سے نمایاں ہے۔ پچھلے سال خارجی وزیروں کی جو کانفرنس لندن میں ہوئی وہ روس کی وجہ سے ناکامیاب ہوئی، وسط دسمبر میں برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر بیون متحدہ ریاستوں کے وزیر مسٹر برنز اور مسٹر مولوٹوف کی ماسکو میں ملاقات ہوئی جس سے نسبتاً بار آور تھی مگر اس موقع پر بھی ایران اور ترکی کے متعلق جو گفتگو ہوئی وہ بے نتیجہ تھی۔ اب متحدہ اقوام کی مجلس تحفظ کا پہلا جلسہ ہو رہا ہے، اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں معاملات کس حد تک سلجھائے جا سکتے ہیں۔

جب کوئی خطرہ نظر میں نہ ہو تو حفاظت کی معقول تدبیریں بھی طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کرتی ہیں۔ روس نے جنگ میں بہت نقصان اُٹھایا، لیکن برطانیہ اور متحدہ ریاستوں نے اس کی پوری مدد بھی کی، اور اب جو جرمنی کی طاقت بالکل مٹائی جا چکی ہے روس کا حفاظت کی تدبیریں کرتے رہنا برطانیہ اور متحدہ ریاستوں پر ایک طرح کی تہمت لگاتا ہے۔ روس نے فن لینڈ سے جو معاہدہ کیا ہے اس میں ایسے جزیروں کا پٹے پر لینا شامل ہے جو بہت اچھے ہوائی اور بحری مرکز بن سکتے ہیں، سویڈن کے جنوب میں ڈنمارک کا ایک جزیرہ بورن ہوم ہے جس پر روسیوں نے اپنی فوجیں جنگ کے آخری دنوں میں اتار دی تھیں، اور اب معلوم ہوتا ہے وہ اصرار کریں گے کہ یہ جزیرہ بھی انھیں ایک لمبی مدت کے لئے پٹے پر دیدیا جائے۔ اس طرح پورا بحر بالٹک روسیوں کے قبضے میں آجائے گا، اور چونکہ استھونیا، لیتویہ اور لتھوئینیا روس میں شامل کئے جا چکے ہیں، شمال مغرب میں روس بالکل محفوظ ہوگیا ہے۔ مغرب اور جنوب مغرب میں پولینڈ، چکوسلوواکیا، ہنگری، رومانیہ بلغاریہ اور یوگوسلاویہ بالکل روس کے اثر میں ہیں۔ ان ملکوں میں کومیونسٹ حکومتیں قائم نہیں ہو سکیں اور روسیوں نے یہ دیکھ کر کہ کومیونسٹ پارٹیوں کی حکومت مسلط کی گئی تو بہت سی عداوتیں پیدا

ہو جائیں گی اسے بہتر سمجھا کہ ان ملکوں کا معاشی نظام اپنے قابو میں کرلیں اور ان کی داخلی سیاست سے الگ رہیں۔ اس وقت ان ملکوں کی صنعت اور تجارت کو بحال کرنا صرف روس کی سرپرستی سے ممکن ہے، اور غالباً روس سے ان کا معاشی تعلق بڑھتے بڑھتے ایسا ہمہ گیر ہو جائے گا کہ ان کی سیاست بھی روس کی پالیسی سے علیحدہ نہ کی جا سکے گی۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں نے اسے گوارا کیا ہے کہ روس اپنا یہ سیاسی اور معاشی حلقہ بنالے، اور اس کے بدلے میں وہ چاہتے ہیں کہ روس بھی اسی حد تک انھیں اپنے حلقے بنانے کی اجازت دے۔ ماسکو میں جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں متحدہ ریاستوں کے وزیر خارجہ مسٹر برنز نے روس سے جاپان، مشرق بعید اور بحر الکاہل کے متعلق سمجھوتا کرلیا، اور اس کے بعد واشنگٹن چلے گئے۔ انھیں باقی مسائل سے خاص دلچسپی نہ تھی، یونان کے معاملے میں انھوں نے برطانیہ اور روس کے درمیان بحث ہونے دی، اور بالکل آخر میں برطانیہ کا صرف اس قدر ساتھ دیا کہ روسی خاموش ہو جائیں۔ ایران اور انڈونیشیا کے معاملوں میں بھی انھوں نے اپنا دامن بچایا یا دورخی باتیں کیں، برطانیہ کی صریحی حمایت نہیں کی۔ اب ایران، یونان اور انڈونیشیا کے بارے میں مجلس تحفظ غور کرے گی۔ مگر متحدہ ریاستوں کی نمائندگی مسٹر برنز نہ کریں گے۔ انھیں واشنگٹن واپس جانا ہے۔

یہ سوال صرف برطانوی مدبروں کی زبان پر نہیں بلکہ ہر شخص کے ذہن میں ہے کہ جب روسیوں نے اپنی مغربی سرحد کی بہت اچھی مورچہ بندی کرلی ہے اور ان کو خطرہ اسی سمت سے ہے تو وہ ایران اور ترکی کو کیوں چھیڑ رہے ہیں، خود ایران سے انھیں کسی قسم کا اندیشہ نہ ہونا چاہئے، اگر کسی موقع پر ایران برطانیہ یا کسی اور ملک کا آلہ کار بن گیا، تب بھی روسیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا ایران کا تیل بے شک اپنی قیمت رکھتا ہے۔ لیکن روس میں تیل کی کمی نہیں وہ اگر چاہے تو اپنے "حلقے" کی تمام ضروریات پوری کرنے کے بعد دوسری منڈیوں میں تیل بیچ سکتا ہے۔ اسی طرح ترکوں سے کارس اور اردہاں یا دردانیال کے انتظام اور حفاظت میں شرکت کا مطالبہ کرنا بالکل بیجا معلوم ہوتا ہے کوئی بھوکا دوسرے کا کھانا کھا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے، سیر ہونے کے بعد بھوکوں کی طرح

اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھانا معقولیت اور فطرت کے اس قدر خلاف ہے کہ اسے کسی گہری مصلحت ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے ۔ یہ مصلحت کیا ہے ؟

غالباً روسی سیاست داں جن حالات کو پیش نظر رکھ کر مطالبے اور کارروائیاں کر رہے ہیں وہ اس جنگ کے پہلے کے یا اس وقت کے حالات نہیں ہیں ۔ ان کی نظر میں ایسے ہوائی بیڑے ہوں گے جن کے پرواز پر وقت اور فاصلے کی کوئی قید نہ ہوگی ۔ ایسے بم ہوں گے جو سارے ملکوں کو برباد کر سکتے ہیں ، ایسی فوجیں ہوں گی جو اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچائی جا سکتی ہیں ۔ ایسے جنگ کے خطروں کی پیش بندی بھی مناسب طریقے پر کرنا چاہیئے ، اور اس وقت نہیں جبکہ خطرہ پیدا ہو جائے بلکہ اس وقت جب وہ محض امکانی معلوم ہوتا ہے ، جیسکہ آج کل غالباً روسی یہ محسوس کرتے ہیں کہ متحدہ ریاستوں کی اپنی الگ دنیا ہے جو روس کے حلقے سے دور ہوگی ، اور ایک بڑی مدت تک متحدہ ریاستوں کو تنگ نہ معلوم ہوگی برطانیہ کا میدان بھی روس سے الگ ہی ہے ، مگر مشرق قریب اور مشرق وسطےٰ میں ان کی حدود ایک دوسرے کے کچھ قریب آجاتی ہیں ، اس لئے یہ طے ہو جانا بہتر ہے کہ یہاں ملک اور قوت کی تقسیم کس طرح پر ہوگی ، روسی چاہتے ہوں گے کہ ترکی ان کے ویسے ہی اتحادی بن جائیں جیسے کہ بلغاریہ اور رومانیہ ، اور اگر وہ ایسے اتحاد پر راضی نہ ہوں تو اس کا قریب قریب صحیح اندازہ ہو جائے کہ وہ کسی حد تک اپنی مصلحت اور ضرورت ، کس حد تک برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے مشورے کا لحاظ کرتے ہیں ایران کی اپنی کچھ طاقت نہیں ہے ، اس لئے روسی وہاں ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور اس کے ایک صوبے کو ملک سے الگ کر دیا ہے ، ایرانیوں کو یقین ہے کہ آذربائجان میں جو کچھ ہوا ہے ، دراصل اس کا ذمہ دار روس ہے ، اور اسی وجہ سے ایرانی حکومت نے اس معاملے کو مجلس تحفظ کے سامنے پیش کیا ہے ۔ مجلس اس معاملے میں کوئی کارروائی نہیں کر سکے گی ، معاملہ روس اور ایران کے درمیان طے ہوگا مگر روس کو اندازہ ہو جائے گا کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستیں کس حد تک ایران کی حامی ہیں یعنی اس طرف امکانی خطرے کیا ہیں ۔ ایران تو صرف ایک کمزور ملک ہے جو اپنی کمزوری کی سزا بھگت رہا ہے ،

جس بات کا اندازہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی اغراض کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے۔

روسیوں کے طرز عمل پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوگا کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت ہے مگر یہ خیال صحیح نہ ہو کہ روسی اس عداوت کی بنا پر جو کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں میں شروع سے ہے لیبر پارٹی کو زک پہنچانے کی فکر میں ہوں گے۔ برطانوی وزارت اپنی طرف برطانیہ کی خارجی سیاست میں تسلسل قائم رکھنا چاہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انھیں مصلحتوں اور منصوبوں کی پابند ہوگی جو اب تک برطانیہ کے پیش نظر تھے۔ برطانیہ کے لئے ضروری ہے کہ بحر روم اور بحر احمر پر روس کا قبضہ رہے، اور وہ قومیں جو اس بحری شاہ راہ کو بند کر سکتی ہیں یا اسے برطانیہ کے لئے مخدوش بنا سکتی ہیں۔ برطانیہ کے اثر میں رہیں۔ اسی بنا پر جنگ کے دوران میں ہسپانیہ کو راضی رکھنے کی پوری کوشش کی اور شمالی افریقہ کے ساحل کو جنگ کے اور میدانوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی۔ اب برطانیہ بحر روم، مشرق قریب اور مشرق وسطے کو اپنا حلقہ بنانا چاہتا ہے۔ ہسپانیہ، فرانس اور اٹلی سے پوری مفاہمت نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن ان کی طرف سے کسی مخالفت کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ یونان میں ایسا انقلاب ہو سکتا تھا کہ روس کے اثر میں آ جائے اسی وجہ سے برطانیہ نے وہاں مستقل اور قابل اعتبار حکومت قائم کرنے کا کام اپنے ذمے لیا۔ اس پر تمام اتحادی اپنے اپنے طریقے پر رضامند تھے، مگر اس زمانے میں جب کہ یونان میں خانہ جنگی ہو رہی تھی اور برطانوی فوج اور ہوائی بیڑا امن قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا برطانیہ پر طرح طرح کے اعتراض بھی کئے گئے۔ برطانیہ کی کامیابی نے دوسروں کا منہ بند کر دیا۔ روسی ابھی تک جب موقع ملتا ہے کچھ نہ کچھ کہہ دیتے ہیں۔ برطانیہ کا دعوےٰ ہے کہ اس نے یونان میں جو کچھ کیا، خلوص اور ایمانداری سے کیا۔ حال میں اس نے وہ رقم جو جنگ کے دوران میں یونان کو بطور قرض دی گئی تھی معاف کر دی ہے۔ اور اس کے علاوہ یونانی سکے کی قیمت کو بحال کرنے کے لئے اور قرض دیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر مجلس تحفظ کے پہلے جلسے میں مسٹر بیون کو غصہ

آگیا، اور انھوں نے روسیوں کو مخاطب کرکے کہا کہ وہ اور ان کی قوم بے بنیاد اعتراض سنتے سنتے تھک گئے ہیں۔ مسٹر بیون نے اس پر اصرار کیا کہ یونان اور انڈونیشیا کے معاملے پر مجلس میں مفصل بحث ہو، اور ساتھ ہی اس پر زور دیا کہ ایران نے روس کے خلاف جو احتجاج کیا ہے اس پر بھی غور کیا جائے۔ ان کے معاملات پر بحث ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ روسیوں پر عیب جوئی کا الزام لگے، اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ ایران میں انھوں نے بے جا مداخلت کی ہے۔ غالباً اس کے بچنے کے لئے روسی، ایرانی حکومت سے سمجھوتا کرلیں گے اور برطانیہ بدستور اعتراض کرتے رہیں گے۔

مغربی ایشیا میں صرف ترکی ایسا ملک ہے جو اپنی تمام مجبوریوں کے باوجود اپنی سیاست کو غیروں کے اثر سے آزاد رکھ سکے، ایران، عراق اور عرب ممالک میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے برطانیہ کو یہاں اپنا اثر قائم رکھنے کے موقعے ملتے رہیں گے، لیکن جنگ کے دوران میں برطانیہ کی تمام سیاسی کارروائیوں کا مقصد یہ تھا کہ ان ملکوں کے پرانے معاشی اور سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائے، کیونکہ اس سے جنگ کے انتظامات میں خلل پڑ سکتا تھا، اور اس رویہ نے ان تمام لوگوں کو برطانیہ کا مخالف بنا دیا جو جنگ کی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر زندگی کے بوسیدہ نظام کو بدلنا چاہتے تھے اب یہ لوگ کیا کرسکتے ہیں سوائے اس کے کہ روس کو اپنا سرپرست بنائیں، اور اس کی امید کریں کہ ان کے ملک میں ایسا انقلاب ہو جائے گا جس کی بدولت روس ان پر مسلط نہ ہو جائے گا، مگر ترقی کی راہیں نکل آئیں گی۔ مشرق قریب کے سرمایہ دار اور زمیندار اور وہ لوگ جو کمیونزم کو بے دینی کا نمونہ مانتے ہیں، برطانیہ کا سہارا ڈھونڈیں گے اور یہ بہت ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ روسیوں نے ہوشیاری سے کام لیا تو وہ اصلاح اور ترقی کے حوصلے کو اپنا کام کرنے دیں گے، لیکن وہ چاہیں تو مداخلت بھی کرسکتے ہیں۔ فی الحال انھیں زبانی اعتراض کے سوا اور کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

۱۔ قاعدہ ۔/۲ ۲۔ دس سبق ۔/۲

- ۱۔ خاد ۲ر
- ۲۔ حکایتیں اول ۲ر
- ۳۔ ״ دوم ۲ر
- ۴۔ حبیب خدا ۲ر
- ۵۔ نظمیں ۲ر
- ۶۔ میونسپلٹی ۲ر
- ۷۔ صدیق اکبر ۲ر
- ۸۔ خط کتابت ۲ر
- ۹۔ ضلع کا انتظام ۲ر
- ۱۰۔ قومی گیت ۲ر
- ۱۱۔ غزلیں ۲ر
- ۱۲۔ ہمارا ہندوستان ۲ر
- ۱۳۔ امامی بھی پڑھنے لگے ۲ر
- ۱۴۔ عمر فاروق ۲ر
- ۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ۲ر
- ۱۶۔ شہید کربلا ۲ر
- ۱۷۔ ہماری دنیا ۲ر
- ۱۸۔ ایشیا ۲ر
- ۱۹۔ یورپ ۲ر
- ۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب ۲ر
- ۲۱۔ مثنوی میر حسن ۲ر
- ۲۲۔ گل بکاؤلی ۲ر
- ۲۳۔ چار درویش اول ۲ر
- ۲۴۔ ״ ״ دوم ۲ر
- ۲۵۔ ״ ״ سوم ۲ر
- ۲۶۔ چار درویش چہارم ۲ر
- ۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ۲ر
- ۲۸۔ ״ ״ دوم ۲ر
- ۲۹۔ ״ ״ سوم ۲ر
- ۳۰۔ ״ منصور موہنا ۲ر
- ۳۱۔ ״ فردوس بریں ۲ر
- ۳۲۔ ״ لیلےٰ مجنوں ۲ر
- ۳۳۔ شکنتلا ۲ر
- ۳۴۔ تلنگے والا ۲ر
- ۳۵۔ بھشتی ۲ر
- ۳۶۔ صوبے کی حکومت ۲ر
- ۳۷۔ حکومت ہند ۲ر
- ۳۸۔ جمہوریت ۲ر
- ۳۹۔ دوہے ۲ر
- ۴۰۔ دلچسپ شعر ۲ر
- ۴۱۔ مرثیے ۲ر
- ۴۲۔ مسدس حالی ۲ر
- ۴۳۔ حالی کی نظمیں ۲ر
- ۴۴۔ گنتی ۲ر
- ۴۵۔ بڑی گنتی ۲ر
- ۴۶۔ پہاڑے پہلے ۲ر
- ۴۷۔ اجرت کا حساب ۲ر
- ۴۸۔ تنخواہ کا حساب ۲ر
- ۴۹۔ چاند تارے ۲ر
- ۵۰۔ نزلہ زکام ۲ر
- ۵۱۔ حالات قرآن مجید ۲ر
- ۵۲۔ تعلیمات (عقائد) ۲ر
- ۵۳۔ ״ (عبادت) ۲ر
- ۵۴۔ ״ (اخلاق) ۲ر
- ۵۵۔ ״ (معاملات) ۲ر
- ۵۶۔ قصص قرآن مجید ۱ ۲ر
- ۵۷۔ ״ ״ ۲ ۲ر
- ۵۸۔ کعبہ شریف ۲ر
- ۵۹۔ حدیث شریف ۲ر
- ۶۰۔ عثمان غنی ۲ر
- ۶۱۔ علی مرتضیٰ ۲ر
- ۶۲۔ صحابۂ کرام ۱ ۲ر
- ۶۳۔ ״ ״ ۲ ۲ر
- ۶۴۔ ״ ״ ۳ ۲ر
- ۶۵۔ ״ ״ ۴ ۲ر
- ۶۶۔ ״ ״ ۵ ۲ر
- ۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۲ر
- ۶۸۔ حضرت غوث پاک ۲ر
- ۶۹۔ اجمیری خواجہ ۲ر
- ۷۰۔ نظام الدین اولیا ۲ر
- ۷۱۔ گوتم بدھ ۲ر
- ۷۲۔ کرشن کنہیا ۲ر
- ۷۳۔ رام کہانی ۱ ۲ر
- ۷۴۔ ״ ״ ۲ ۲ر
- ۷۵۔ افریقہ ۲ر
- ۷۶۔ امریکہ ۲ر
- ۷۷۔ جنوبی امریکہ ۲ر
- ۷۸۔ سرزمین ہند ۲ر
- ۷۹۔ صوبے ۲ر
- ۸۰۔ دیسی ریاستیں ۲ر
- ۸۱۔ داستان امیر حمزہ ۱ ۲ر
- ۸۲۔ ״ ״ ۲ ۲ر
- ۸۳۔ ״ ״ ۳ ۲ر
- ۸۴۔ ״ ״ ۴ ۲ر
- ۸۵۔ ״ ״ ۵ ۲ر
- ۸۶۔ کہاوتیں ۲ر
- ۸۷۔ پہیلیاں ۲ر
- ۸۸۔ گرو نانک ۲ر
- ۸۹۔ مثنوی میر حسن ۲ر
- ۹۰۔ گلستاں ۲ر
- ۹۱۔ حمد خاں دوکاندار ۲ر
- ۹۲۔ عبدالرحمٰن راج ۲ر
- ۹۳۔ نصیب خاں حجام ۲ر
- ۹۴۔ خنا خدمتگار ۲ر
- ۹۵۔ پیارے خاں درزی ۲ر
- ۹۶۔ حفیظ خانساماں ۲ر
- ۹۷۔ بن بڑھئی ۲ر
- ۹۸۔ محمد حلوائی ۲ر
- ۹۹۔ میرا ننھا ۲ر
- ۱۰۰۔ ہندوستان ۵ ہزار برس پہلے ۲ر

مکتبہ جامعہ دہلی

Freedom from Suffering

As one nears the shores of America, coming from across the Atlantic, one of the most inspiring sights is the Statue of Liberty. It not only serves as a cheering beacon to the mariner, but also symbolises the hopes of millions of downtrodden humanity who have left the Old World for the freedom of a new life in a new clime—freedom from want, from fear and from oppression.

Of all freedoms, however, the greatest is the freedom from disease. The healthiest—rich or poor—for want of this freedom are changed to sick and diseased whose lives become useless to themselves and to the world. Freedom from disease is therefore the greatest freedom which everyone should strive for.

Cipla Laboratories are devoting their full time and attention to the production of high quality drugs and medicines for the relief of mankind, thus striving for Freedom from disease. In quality, efficacy and high standard of production of drugs and medicines Cipla is equal to the world's best. Scientific methods of production and constant research lead to perfection. This is the motto followed by Cipla.

EQUAL TO WORLD'S BEST

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

چند ادبی کتابیں

دیوان غالب جدید مع مقدمہ بجنوری مرحوم۔ غالب کا مکمل دیوان جو مدت سے گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ مجلد عہ ر

گفتارِ بیخود۔ جانشین داغ حضرت بیخود دہلوی کے کلام کا مکمل مجموعہ۔ ے ر

دیوان ثاقب۔ مرزا ثاقب لکھنوی کا دیوان میر کی زبان اور غالب کی تخئیل دیکھنی ہو تو اس دیوان کو ملاحظہ فرمائیے۔ ے ر

مبادی انشاء۔ از شمس العلماء مولانا عبد الرحمٰن۔ عربی۔ فارسی اور اردو پر مفصل اور مبسوط بحث ے ر

محشرِ خیال۔ فلسفہ اور ادب لطیف کا ایک حیرت انگیز امتزاج اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اور اقبال کی نظم کی خصوصیات کا حامل۔ قسم اول للعہ ر۔ قسم دوم ے ر۔ قسم سوم عہ ر

باقیات بجنوری۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کے مضامین کا مجموعہ اور دور جدید کی ادبی تحریکوں کا سرچشمہ۔ للعہ ر

انشاء۔ آسمان شاعری کے درخشاں ستارہ انشاء اللہ خاں پر ایک تنقیدی نظر۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے قلم سے۔ ۱۲ ر

قول فیصل۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت اور انشاء پردازی کا بہترین نمونہ عہ ر

بڑھاپے کی برکتیں۔ از خواجہ عبد المجید دہلوی۔ دلی کی ایک ٹکسالی زبان کا ایک اچھا نمونہ۔ مجلد عہ ر

واردات۔ افسانے منشی پریم چند عہ ر

بیوہ۔ ناول منشی پریم چند ۸ ر

آسیب الفت۔ مترجمہ سید سجاد حیدر یلدرم۔ ایک ترکی افسانے کا ترجمہ ۱۲ ر

سازِ شکستہ۔ ناول رشید اختر ندوی ۸ ر

ایک ایکٹ کے ڈرامے۔ مشہور ادیب علی عباس حسینی کے نو مختصر ڈراموں کا مجموعہ۔ ۸ ر

نگارستان۔ مولانا ظفر علیخاں کی نظموں کا مجموعہ۔ ۸ ر

نقش فریادی۔ ایک ایسے شاعر کا مجموعہ کلام جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے یعنی فیض احمد فیض ۔

زیرِ ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۴۱۔ نمبر ۵	بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۶ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

طابع و ناشر:- پروفیسر محمد مجیب - بی اے (آکسن) - دیال پریس دہلی

متحدہ اقوام کی تنظیم کا نقشہ

——— خط اُن بلاواسطہ تعلقات کے ظاہر کرنے کے لئے جن کا ذکر منشور میں صراحت کیا گیا ہے۔

- - - - - - نقطہ دار خط ان تعلقات کے لئے جن کا تعین مخصوص راضی ناموں کے ذریعے کیا جائے گا۔

متحدہ اقوام کا منشور اور ان کی بین الاقوامی تنظیم

جس طرح جنگِ عظیم اوّل کی تباہ کاریوں نے دنیا کے نیک دل مدبّروں کو اس بات کے سوچنے کے لئے آمادہ کیا تھا کہ امن عالم کے قیام واستحکام کے لئے "انجمن اقوام" جیسی تنظیم کی تعمیر وتشکیل کی جائے اسی طرح جنگِ عظیم ثانی کی ہولناک غارتگری اور آشوب خیزی نے دوبارہ اقوام عالم کو بین الاقوامی قانون اور انتظام کی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ غور وفکر کا یہ سلسلہ جنگ کے دوران میں شروع ہو گیا تھا۔ ابھی جنگ اپنے نہایت نازک دور میں تھی کہ منشور اطلانتک کے ذریعے "متحدہ اقوام" نے ان بنیادی آزادیوں کے تحفظ کا اعلان کیا جن پر امن کی تعمیر منحصر ہے۔ اس کے بعد جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا لیکن معرکے کی جنگیں جتنا ابھی باقی تھیں اس وقت "متحدہ اقوام" کی طرف سے منشور فلاڈلفیا کی صورت میں معاشرتی مقاصد کا اعلان کیا گیا۔ جب یورپ کی جنگ اپنی فیصلہ کن منزل سے گذر چکی تو ڈمبرٹن اوکس کی "تحفظ امن کی عالمی کانفرنس" میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ، سلطنت متحدہ برطانیہ، اتحاد روس اور چین کی چار بڑی حکومتوں نے دنیا کے سامنے "متحدہ اقوام" کے "عالمی تحفظی ادارے" کا خاکہ پیش کیا۔ اس کے بعد دنیا کی پچاس قوموں کی ایک کانفرنس سان فرانسسکو میں ڈمبرٹن اوکس کی تجاویز پر آخری فیصلہ کرنے کے لئے منعقد کی گئی جس میں "متحدہ اقوام" کا منشور متفقہ طور پر ۲۶ رجون ۱۹۴۵ء کو منظور کیا گیا اور جب تک یہ بین الاقوامی تنظیم وجود میں آئے اس درمیانی مدت کے لئے بعض عارضی انتظامات کو بھی منظور کیا گیا۔

"متحدہ اقوام" کا منشور حسب ذیل الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:۔

ہم "متحدہ اقوام" کی قوموں کا عزم بالجزم یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کو، جنگ کی اس

غارت گری سے بچائیں جس نے ہماری زندگی میں دو مرتبہ انسانیت کو ناقابل بیان مصیبتوں میں مبتلا
کیا ہے۔

بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی قدر و عظمت، مرد اور عورت اور چھوٹی اور بڑی
قوموں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے اور ایمان کا دوبارہ اعلان کریں۔
ان حالات کو قایم کریں جن میں انصاف کیا جاسکے اور ان پابندیوں کا احترام کیا جاسکے
جو معاہدوں اور بین الاقوامی قانون کے دوسرے ماخذوں کی وجہ سے عاید ہوتی ہیں۔
وسیع تر آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی اور زندگی کے بہتر معیاروں کو ترقی دیں۔
اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے رواداری برتیں اور اچھے ہمسایوں کی طرح باہم
مل جل کر امن کے ساتھ رہیں۔
بین الاقوامی امن اور تحفظ کو قایم کرنے کے لئے اپنی طاقت کو متحد کریں۔
اصولوں کی قبولیت اور طریقوں کے قیام کے ذریعے سے اس بات کی ضمانت کریں
کہ مسلح طاقت کا استعمال سوائے مشترک مفاد کو پورا کرنے کے لئے کبھی نہیں کیا جائیگا۔
بین الاقوامی تنظیم کو تمام قوموں کی معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے استعمال کریں۔
ہم تہیہ کرتے ہیں کہ اپنی کوششوں کو ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے متحد کریں
چنانچہ ہماری حکومتیں علی الترتیب اپنے ان نمائندوں کی معرفت، جو شہر سان فرانسسکو
میں جمع ہوئے ہیں اور جنہوں نے اپنے اختیارات کے صحیح اور جائز ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے
"متحدہ اقوام" کے موجودہ منشور کو منظور کرتی ہیں اور اس کے ذریعہ اس بین الاقوامی تنظیم کو جو متحدہ اقوام
کے نام سے موسوم کی جائے گی، قایم کرتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد منشور کی ایک سو گیارہ دفعات ہیں جنہیں انیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے
پہلے باب میں اغراض و مقاصد اور اصول ہیں۔ دوسرے میں [illegible]

اس کی ہیئت ترکیبی، فرائض و اختیارات، رائے شماری اور طریقہ کار۔ پانچویں باب میں حفاظتی
کونسل، اس کی ہیئت ترکیبی، فرائض و اختیارات، رائے شماری اور طریقہ کار۔ چھٹے باب میں جھگڑوں
کے پُر امن تصفیہ کی دفعات ہیں۔ ساتویں باب میں امن کے خطرے میں پڑنے، نقض امن اور جارحانہ
اقدامات کے خلاف کارروائی کی دفعات ہیں۔ آٹھویں باب میں علاقہ وار انتظامات کی دفعات
ہیں۔ نویں باب میں بین الاقوامی معاشی اور معاشرتی اشتراک عمل کی دفعات ہیں۔ دسویں باب میں معاشی
اور معاشرتی کونسل، اس کی ہیئت ترکیبی، فرائض و اختیارات، رائے شماری اور طریقہ کار۔ گیارھویں
باب میں غیر خود مختار علاقوں کے بارے میں اعلان۔ بارھویں باب میں بین الاقوامی تولیت کا انتظام
تیرھویں باب میں تولیت کی کونسل، اس کی ہیئت ترکیبی، فرائض و اختیارات، رائے شماری اور طریقہ کار۔
چودھویں باب میں بین الاقوامی انصاف کی عدالت جس کا مستقل آئین بطور ضمیمہ منشور کے اختتام پر
[illegible] دفعات اور پانچ ابواب کی صورت میں درج کیا گیا ہے۔ پندرھویں باب میں معتمدی (سکریٹریٹ)
کے بارے میں دفعات ہیں۔ سولھویں باب میں متفرق دفعات ہیں۔ سترھویں میں درمیانی زمانے کے لئے
تحفظ کے عارضی انتظامات کی دفعات ہیں۔ اٹھارھویں باب میں ترمیمات۔ اور انیسویں باب میں تصدیق
اور دستخط کی دفعات ہیں۔

متحدہ اقوام کی تنظیم کی غرض و غایت، مختصر الفاظ میں یہ ہے (۱) اس کے تمام رکن اپنے بین الاقوامی
جھگڑوں کو اپنے پُر امن طریقہ پر طے کریں کہ [illegible] امن، تحفظ اور انصاف خطرہ میں نہ پڑ سکیں (۲)
[illegible] سان فرانسسکو کانفرنس میں شرکت
کرنے والے [illegible] اور اپنی اپنی مملکتوں سے اس کی تصدیق کرائی۔ بعد میں
[illegible] حفاظتی کونسل کی سفارش پر [illegible] عام اسمبلی
فیصلہ کرنے لگی۔
[illegible] ایک [illegible] حفاظتی کونسل

ایک معاشی اور معاشرتی کونسل"۔ ایک تولیت کی کونسل"۔ ایک بین الاقوامی عدالت"۔ اور ایک معتمدی

عام اسمبلی

"عام اسمبلی" میں "متحدہ اقوام" کے سب رکن شامل ہوں گے۔ اس کے عام اجلاس ہر سال ہوا کریں گے۔ اس کے ہر رکن کو صرف ایک رائے کا حق ہوگا۔ اگرچہ ہر رکن کے زیادہ سے زیادہ پانچ نمائندے تک اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کر سکیں گے۔

"عام اسمبلی" بین الاقوامی تحفظ اور امن سے متعلق ہر مسئلے پر جسے "متحدہ اقوام" یا "حفاظتی کونسل" یا کوئی ایسی مملکت جو "متحدہ اقوام" کی رکن نہیں ہے لیکن جو اس کے فیصلے کو قبول کرنے کی پیشگی رضامندی ظاہر کرتی ہے پیش کرے، بحث کر سکتی ہے اور اگر وہ مسئلہ "حفاظتی کونسل" کے زیر غور نہیں ہے تو اس کے بارے میں اپنی سفارشوں کو، معاملات کو پرامن طریقے پر طے کرانے کے لئے متعلقہ مملکت یا "حفاظتی کونسل" کے پاس روانہ کر سکتی ہے۔

"عام اسمبلی" کے سامنے "حفاظتی کونسل" کی طرف سے سالانہ رپورٹیں پیش کی جائیں گی جن میں بین الاقوامی امن اور تحفظ کے قایم رکھنے کے لئے جو کارروائیاں یا فیصلے "حفاظتی کونسل" نے کئے ہیں شامل ہوں گے۔

"عام اسمبلی" کے سامنے "متحدہ اقوام" کے دوسرے اعضا کی رپورٹیں بھی پیش ہوں گی۔

حفاظتی کونسل

"حفاظتی کونسل" "متحدہ اقوام" کے گیارہ اراکین پر مشتمل ہوگی۔ جمہوریت چین، فرانس، اتحاد روس، سلطنت متحدہ برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس کونسل کے مستقل رکن ہوں گے اور بقیہ چھ ممبروں کا انتخاب دو سال کے لئے غیر مستقل اراکین میں سے "عام اسمبلی" کرے گی۔ ہر رکن کا صرف ایک نمائندہ "حفاظتی کونسل" میں شرکت کر سکے گا اور ہر رکن کو ایک رائے دینے کا حق ہوگا۔ "کونسل" "مجلس عاملہ کے فرائض انجام دے گی"۔ "کونسل" کے ہر فیصلہ کے لئے سات اراکین کی تائید ضروری ہوگی جن میں مستقل اراکین کی تائیدی رائے کا شامل ہونا بھی ضروری ہوگا لیکن اگر کوئی رکن، فریق کی حیثیت رکھے گا تو وہ رائے نہ دے سکیگا۔

"حفاظتی کونسل" کی تنظیم ایسی ہوگی کہ وہ مسلسل اپنا کام جاری رکھ سکے گی اور مستقر پر [illegible]

ہر رکن کے نمائندے کا ہر وقت موجود رہنا ضروری ہوگا۔ "حفاظتی کونسل" کے ان مباحث میں جو کسی تنازعہ سے متعلق ہوں گے فریقین تنازعہ کو چاہے وہ متحدہ اقوام کے رکن ہوں یا نہ ہوں شرکت کی دعوت دی جائے گی، گو وہ رائے نہ دے سکیں گے۔

"حفاظتی کونسل" معاملات کا تصفیہ کرانے کی کوشش ابتداءً باہمی گفت و شنید، تحقیقات، مصالحت پنچائتی فیصلہ، عدالتی فیصلہ، علاقہ وار انتظامات یا دوسرے پُرامن ذرائع سے کرے گی۔ لیکن جب وہ نقض امن کا احتمال دیکھے گی تو ابتداءً ایسی تہدیدی کارروائیوں کو اختیار کرے گی جن میں مسلح قوت کا استعمال ضروری نہ ہوگا۔ ان میں معاشی تعلقات، ریل، سمندر، ڈاک، ریڈیو اور دیگر ذرائع رسل و رسائل میں جزوی خلل اندازی اور سفیرانہ تعلقات کا انقطاع شامل ہوں گے۔ لیکن اگر "حفاظتی کونسل" یہ محسوس کرے گی کہ یہ ذرائع ناکامیاب ہوئے یا ہوں گے تو پھر وہ ہوا، سمندر اور خشکی کی فوجوں کے ذریعے ان اقدامات کو شروع کرے گی جو امن و تحفظ کو قایم رکھنے یا بحال کرنے کے لئے ضروری ہوں گے۔ اس کارروائی میں متحدہ اقوام کے اراکین کی ہوائی، سمندری اور خشکی کی فوجوں کے مظاہرے، ناکہ بندیاں اور دیگر کارروائیاں شامل ہوں گی اور متحدہ اقوام کے تمام اراکین اس مقصد کے لئے، مخصوص معاہدوں کے مطابق ضروری افواج مہیا کرنے کے لئے پابند ہوں گے۔ "حفاظتی کونسل" کو مشورہ دینے کے لئے ایک فوجی اسٹاف کمیٹی ہوگی جو کونسل کے مستقل اراکین کے اعلیٰ ترین فوجی افسران پر مشتمل ہوگی

معاشی اور معاشرتی کونسل

استحکام اور بہبود کے ان حالات کو پیدا کرنے کے لئے جو قوموں کے درمیان مساوی حقوق اور خود ارادیت کے اصول کے مطابق پُرامن اور دوستانہ تعلقات قایم کرنے کے لئے ضروری ہیں، متحدہ اقوام حسب ذیل چیزوں کو ترقی دے گی:-

(الف) بلند تر زندگی کے معیار، کامل روزگار اور معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے مناسب حالات

(ب) بین الاقوامی معاشی، معاشرتی، صحتی اور متعلقہ مسائل کا تصفیہ اور بین الاقوامی ثقافتی، اور تعلیمی اتحاد عمل۔

(ج) نسل، جنس، زبان اور مذہب کا امتیاز کئے بغیر انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا عالمگیر احترام۔

مندرجہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کی ذمہ داری "عام اسمبلی" پر ہوگی اور اس کے ماتحت ایک معاشی اور معاشرتی کونسل کام کرے گی جس کے اٹھارہ ارکین کا انتخاب "عام اسمبلی" کرے گی اور اس کے چھ چھ ارکین ہر سال تین سال کے لئے منتخب ہوا کریں گے۔ معاشی اور معاشرتی کونسل کے ہر رکن کا صرف ایک نمائندہ ہوگا۔ "معاشی اور معاشرتی کونسل"۔ معاشی اور معاشرتی معاملات اور انسانی حقوق کی ترقی کے لئے کمیشنوں کا تقرر کرے گی اور اپنے دیگر فرائض کو پورا کرنے کے لئے بھی ان کمیشنوں کا جن کی ضرورت سمجھے گی تقرر کرے گی۔

غیر خود مختار علاقوں کے بارے میں اعلان

ایسے علاقوں کی حکومت کی ذمہ داری جن کو ابھی تک مکمل حکومت خود اختیاری نہیں مل سکی ہے متحدہ اقوام کے جن ارکین کے پاس ہے یا جو اس ذمہ داری کو بعد میں قبول کریں گے وہ سب اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان علاقوں کی آبادی کے مفاد کو مقدم اور برتر سمجھا جائے گا اور ایک مقدس امانت کے طور پر اس پابندی کو قبول کرتے ہیں کہ وہ بین الاقوامی امن اور تحفظ کو قایم رکھتے ہوئے ہر طرح ان علاقوں کی آبادی کی فلاح و بہبود کو ترقی دیں گے اور اس مقصد کے ماتحت:۔

(الف) متعلقہ آبادیوں کے تمدن کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی، ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ اور خرابیوں سے ان کے تحفظ کی ضمانت کریں گے۔

(ب) ان کی رعایا کے سیاسی حوصلوں کا لحاظ رکھتے ہوئے، حکومت خود اختیاری کو ترقی دیں گے اور ان کی آزاد سیاسی اداروں کی تدریجی ترقی میں امداد دیں گے۔

(ج) بین الاقوامی امن و تحفظ کو ترقی دیں گے۔

(د) ترقی کے تعمیری کاموں کو آگے بڑھائیں گے، تحقیقات علمی کی حوصلہ افزائی کریں گے اور باہم میل جول رکھیں گے اور جہاں ضروری اور مناسب ہوگا بین الاقوامی ماہروں کی جماعت سے میل جول

ترقی دیں گے۔

(۷) اور ان علاقوں کے بارے میں سکریٹری جنرل کو بطور اطلاع باقاعدگی کے ساتھ معلومات اور اعداد و شمار فراہم کرتے رہیں گے۔

تولیت کی کونسل "متحدہ اقوام" اپنی ماتحتی میں ان علاقوں کی حکومت اور نگرانی کے لئے جو اس کی تنظیم کو سپرد کئے جائیں گے ایک بین الاقوامی تولیت کا نظام قایم کرے گی۔ یہ علاقے حسب ذیل ہوں گے :-

(الف) وہ علاقے جو اب انتداب کے ماتحت ہیں۔

(ب) ایسے علاقے جو جنگِ عظیم ثانی کے نتیجہ کے طور پر دشمنوں سے چھینے جائیں گے۔

(ج) ایسے علاقے جنھیں وہ مملکتیں جو ان پر اب حکومت کرتی ہیں، اپنی ذاتی رضامندی سے آئندہ کونسل کو سپرد کریں گی۔

تولیت کا نظام ان علاقوں پر منطبق نہیں کیا جائے گا جو "متحدہ اقوام" کے رکن بن گئے ہیں کیونکہ ان کے تعلقات آزادا اور خود مختارانہ مساوات کے احترام پر مبنی ہوں گے۔

تولیت کے سلسلے میں معاہدوں کے مطابق جو فرائض عاید ہوں گے ان کو "متحدہ اقوام" عام اسمبلی کے ذریعے انجام دے گی۔

"عام اسمبلی" کے ماتحت ایک "تولیت کی کونسل" ہوگی جو "عام اسمبلی" کو اپنے فرائض کے انجام دینے میں مدد دے گی۔

"تولیت کی کونسل" "متحدہ اقوام" کے حسب ذیل ارکین پر مشتمل ہوگی۔

(الف) وہ ارکین جو ان علاقوں پر حکومت کر رہے ہوں گے۔

(ب) حفاظتی کونسل کے وہ ارکین جو ان علاقوں پر حکومت نہیں کر رہے ہوں گے۔

(ج) جتنے ارکین جو اس بات کی ضمانت کر سکیں کہ "تولیت کی کونسل" کے ارکین کی تقسیم اس طرح ہو کہ حکومت کرنے والے ارکین کی تعداد، حکومت نہ کرنے والے ارکین کے برابر ہے

ان ارکین کو اسمبلی تین سال کے لئے منتخب کرے گی۔

تولیت کونسل کا ہر رکن اپنا ایک نمائندہ مقرر کرے گا جو اس کام کی خاص طور پر اہلیت رکھتا ہوگا۔

"عام اسمبلی" اور اس کی ماتحتی میں "تولیت کی کونسل" مندرجہ ذیل کام کرے گی:۔

(الف) ان رپورٹوں پر غور کرے گی جو حکمراں حکومتیں "تولیت کی کونسل" کے سوال نامے کی بنیاد پر ان کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے بارے میں پیش کریں گی۔

(ب) درخواستوں کو قبول کرے گی اور حکمراں حکومتوں کے مشورے سے ان پر غور کرے گی۔

(ج) میعادی طور پر حکمراں قوموں کے اتفاق رائے سے وقت کا تعین کرکے تولیت کے علاقوں کا دورہ کرے گی اور:۔

(د) مندرجہ بالا اور دیگر اقدامات کو تولیت کے معاہدہ کے مطابق کرے گی۔

"تولیت کی کونسل" کے ہر رکن کی صرف ایک رائے ہوگی اور اس کے فیصلے موجودہ اراکین کی اکثریت رائے سے ہوں گے۔

"بین الاقوامی انصاف کی عدالت"

"بین الاقوامی عدالت" اس آئین کے مطابق اپنا کام کرے گی جو "بین الاقوامی انصاف کی مستقل عدالت" کے آئین پر مبنی ہے اور جسے متحدہ اقوام کے منشور کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔

"متحدہ اقوام" کی تمام قوموں نے اس آئین کو منظور کیا ہے اور ہر اس مقدمہ میں جس کی کہ وہ فریق ہوں بین الاقوامی عدالت کے فیصلوں کو ماننے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اگر کوئی فریق عدالت کے فیصلے کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے گا تو دوسرا فریق "حفاظتی کونسل" سے رجوع کر سکے گا جو یا تو ضروری سفارشوں کے ذریعے اس کا نفاذ کرائے گی یا اس کام کے لئے دوسر ضروری طریقے اختیار کرے گی۔

معتمدی (سکریٹریٹ)

"معتمدی" ایک "سکریٹری جنرل" اور اس عملہ پر مشتمل ہوگی جس کی کہ متحدہ اقوام کی تنظیم کو ضرورت ہوگی۔ "سکریٹری جنرل" کا تقرر "عام اسمبلی" "حفاظتی کونسل" کی سفارش پر کرے گی، اور وہ اس تنظیم کا انتظامی افسر اعلیٰ ہوگا۔ "عام اسمبلی" "حفاظتی کونسل"، "معاشی اور معاشرتی کونسل" اور "تولیت کی کونسل" کے تمام جلسوں میں سکریٹری جنرل، معتمد کے فرائض انجام دے گا اور "عام اسمبلی" کے سامنے متحدہ اقوام کی تنظیم سے متعلق ایک رپورٹ پیش کرے گا۔

متفرق دفعات

موجودہ منشور کے مطابق جو بھی معاہدہ متحدہ اقوام کا کوئی رکن کرے گا اس کی "معتمدی" میں رجسٹری کرانا ضروری ہوگی ورنہ متحدہ اقوام سے اس معاہدہ کی تعمیل کی درخواست نہیں کی جا سکے گی۔

متحدہ اقوام کی تنظیم کو اپنے ہر رکن کے علاقہ میں اس قسم کے حقوق اور مراعات حاصل ہوں گے جو اپنے فرائض کو آزادی کے ساتھ انجام دینے کے لئے ضروری ہوں گے۔

غرض متحدہ اقوام کا منشور اور اس کی یہ بین الاقوامی تنظیم ہے۔ اس کی "عام اسمبلی" کا پہلا اجلاس آج کل لندن میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس کے سامنے ایران، آذربائیجان میں روسی مداخلت کے مسئلہ کو پیش کرنے والا ہے اور روس یونان اور انڈونیشیا میں برطانیہ کی مداخلت کے مسئلے کو اٹھانے والا ہے۔ یہ بھی افواہ ہے کہ روس ہندوستان کا مسئلہ بھی پیش کرنے والا ہے۔ یہ بہت اچھا ہے، ابتدا ہی میں اس بین الاقوامی تنظیم کی سچائی کی آزمائش ہو جائے گی۔ اگر اس کے فیصلے انصاف اور بے خوفی پر مبنی ہوئے تو آئندہ کے لئے اس کی ذات سے کچھ بہتر توقعات قائم کی جا سکیں گی ورنہ اس کے بارے میں بھی انجمن اقوام کی طرح یہی بات کہنی پڑے گی کہ

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

اور دنیا کو ہولناک اور ہلاکت خیز جنگوں سے چھٹکارا نہ مل سکے گا۔

برٹن ووڈز کا راضی نامہ

زر کا بین الاقوامی ذخیرہ نقد

اور

از سر تعمیر و ترقی کے لئے بین الاقوامی بنک

تمہید لانے لے جانے اور خبر پہنچانے کی آسانیاں اب اتنی بڑھ گئی ہیں کہ جب کبھی مال کے لین دین میں ذرا سا بھی نسبتی فائدہ ایک قوم کے لوگوں کو دوسرے کے مقابلے میں نظر آتا ہے۔ فوراً مال کی درآمد یا برآمد شروع کر دی جاتی ہے۔ لین دین کی اس سہولت نے ساری دنیا کو ایک واحد منڈی بنا دیا ہے۔ نمایش اور عیش کے بیش قیمت سامان تو بہت پرانے زمانے سے دور دور کے ملکوں کو بھیجے اور وہاں سے منگائے جاتے تھے۔ یوں تو ان کی تعداد اور مقدار بھی پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن حیرت انگیز اضافہ عام اور ضرورت کے ان بے شمار سامانوں میں ہوا ہے جو اپنے عریض اور طویل حجم اور سستی قیمت کے باوجود ایک ملک سے دوسرے ملک میں آنے اور وہاں سے باہر جانے لگے ہیں۔ کئی ترقی یافتہ ملک ایسے ہیں جو اپنی لازمی غذاؤں اور ناگزیر کچے مالوں کے لئے اپنی نوآبادیوں یا دوسرے زراعتی ملکوں کے محتاج ہو گئے ہیں۔ اسی طرح صنعتی ترقی میں پچھڑے ہوئے ملک بنے ہوئے مال اور مشینوں کے لئے صنعتی ملکوں کے دست نگر بن گئے ہیں اور ایسا تو دنیا کا کوئی ملک نہیں ہے جو اپنی زندگی کے اس اعلیٰ تر معیار کو جس پر کہ اس زمانے میں وہ پہنچ گیا ہے، دوسرے ملکوں سے لین دین کئے بغیر قایم رکھ سکے۔

چیزوں کے لین دین کا کام زر کو ایک درمیانی کڑی بنانے سے بہت سہل ہو جاتا ہے جب سے اعتبار کے نظام کو ترقی ہوئی ہے، اعتباری آلات مثلاً چکوں، رقعوں اور ہنڈیوں نے بھی زر کے ساتھ مل کر ایک درمیانی کڑی کا کام انجام دینا شروع کر دیا ہے۔ لیکن ان سب اعتباری آلات کو آخر میں سہارا زر ہی کا لینا پڑتا ہے۔ لیکن ملکی لین دین کے لئے تو ملکی زر موجود ہے بین الاقوامی لین دین کے لئے کوئی بین الاقوامی زر نہیں ہے۔ جنگ عظیم اول سے پہلے اُن ترقی یافتہ ملکوں کے لئے جنہوں نے سونے کا معیار اختیار کر لیا تھا، ملکی زر ہی آسانی کے ساتھ بین الاقوامی زر کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا کیونکہ اس کی قدر ذاتی اور قدر قانونی میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ ملک کے اندر اور باہر ایک ہی قیمت پر چلتا تھا اور ملکی سکہ میں ہمیشہ ایک مقررہ شرح سے تبدیل کرایا جا سکتا تھا۔ اس لئے مختلف ملکوں میں مختلف سکوں کی موجودگی سے بین الاقوامی لین دین میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ایک جگہ کی قیمتوں کا مقابلہ آسانی کے ساتھ دوسری جگہ سے کیا جا سکتا تھا اور باہمی مطالبوں کو سہولت کے ساتھ ادا کیا جا سکتا تھا۔ بین الاقوامی ذریعہ مبادلہ کا بیشتر کام خارجی ہنڈیاں انجام دیتی تھیں اور درآمد یا برآمد کی کمی یا زیادتی کی صورت میں سونے کی آزادانہ منتقلی سے "توازن[1] ادائی" کو قایم رکھا جا سکتا تھا۔

لیکن جنگ عظیم اول اور ثانی کے دوران میں اور ان دونوں جنگوں کے درمیانی زمانے میں سونے کے معیار کو قایم نہیں رکھا جا سکا۔ اس کی جگہ غیر نقد پذیر کاغذی زر نے لے لی اور

---

[1] "توازن ادائی" کی اصطلاح وضاحت چاہتی ہے۔ بین الاقوامی لین دین میں "توازن ادائی" کے معنی یہ ہیں کہ درآمد کی ادائی برآمد سے اور برآمد کی ادائی درآمد سے ہو جائے۔ لیکن جہاں تک چیزوں کا تعلق ہے ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک ملک کی اشیاء کی برآمد بالکل اس کی اشیاء کے درآمد کے برابر ہو، کیونکہ ایک ملک دوسرے ملک کو جہاں مادی چیزیں برآمد کرتا ہے وہاں مختلف قسم کی خدمتوں کو بھی برآمد کر سکتا ہے۔ اس لئے "توازن ادائی" کی اصطلاح میں چیزوں اور خدمتوں دونوں کی درآمد و برآمد کو شامل کیا جاتا ہے۔

ملکی سکّہ کو غیر ملکی سکّہ میں مقررہ شرح سے تبدیل کرنا ممکن نہیں رہا۔ سونے کی آزادانہ منتقلی رک گئی، اور "توازن ادائی" کے ناموافق ہونے کی صورت میں سونے کی آزادانہ برآمد سے توازن کا دوبارہ قایم کرنا مشکل ہوگیا۔

سونے کے معیار کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے اندر خودکاری پائی جاتی تھی، وہ حکومت کی پالیسی سے آزاد رہ کر خودمختارانہ طریقہ پر اپنا کام انجام دیتا تھا لیکن جب سونے کا معیار ملک کے اندر ختم ہوگیا اور اس کی جگہ غیر نقد پذیر کاغذی زر نے لے لی جس کی رسد کی فراہمی قدرتی حالات کی جگہ حکومت یا مرکزی بنک کی پالیسی کی پابند ہوگئی تو یہ خودکاری بھی ختم ہوگئی۔ اب مرکزی بنک زر کی رسد کی کمی اور بیشی کا فیصلہ کرنے لگے۔ زر کی قدر میں نہ ملک کے اندر کوئی ثبات و پائداری رہی نہ ملک کے باہر۔ شرح مبادلہ کا استحکام غیر یقینی ہوگیا۔ غرض، جنگ عظیم ثانی سے پہلے مبادلات خارجہ کی کچھ اس قسم کی نزاعی صورت تھی جس کی وجہ سے بین الاقوامی لین دین میں بڑی ابتری پیدا ہوگئی تھی۔

جب درآمد سے برآمد بصورت مجموعی زیادہ ہو تو یہ صورت حال غیر مختتم حد اور مدت تک جاری نہیں رہ سکتی کیونکہ بین الاقوامی لین دین کے اصول کے مطابق جلد یا بدیر، درآمد کی ادائی برآمد کے ذریعہ ہونا لازمی ہے ورنہ لین دین تجارت نہیں رہے گا۔ ڈکیتی، ٹھگی، دھوکا بازی یا خیرات بن جائے گی۔ اس لئے "توازن ادائی" کا قایم رکھنا بہرحال ضروری ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس عدم توازن کو دور کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں اور انہیں کون اختیار کرے۔

"توازن ادائی" کی ناموافقت کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں میں سے کوئی ایک اختیار کیا جاتا رہا ہے:-

(۱) مبادلات کی فرسودگی کا طریقہ۔

(۲) تفریط زر کا طریقہ۔

(۳) زر کی قدر میں کمی کا طریقہ۔

(۴) مبادلات کی نگرانی کا طریقہ۔

(۵) درآمد کی تحدید کا طریقہ۔

یہاں ان طریقوں کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ یہ سب ایک ناموافق صورتِ حال کو عارضی طور پر موافق کرنے کی تدبیریں ہیں لیکن ان سب طریقوں میں کوئی نہ کوئی خرابی پائی جاتی ہے۔ پہلے طریقے کی خرابی یہ ہے کہ اس سے زر کی خارجی قدر میں عدم استحکام پیدا ہوتا ہے اور ملکوں کے زر کی قدر گھٹانے کے لئے باہمی مسابقت شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے طریقے کی خرابی یہ ہے کہ اس سے اجرتوں اور منافعوں میں کمی ہوتی ہے اور بے روزگاری اور کساد بازاری پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے طریقے کی خرابی یہ ہے کہ اس سے زر کی داخلی قدر میں استحکام باقی نہیں رہتا۔ چوتھے طریقے کی خرابی یہ ہے کہ حکومتیں من مانے طریقے پر مبادلات خارجہ کی فراہمی اور تقسیم کا کام انجام دینے لگتی ہیں۔ ادائیوں میں ہمہ رُخی کی جگہ دو رُخی پیدا ہو جاتی ہے۔ ترجیحی معاہدے اور دوسری امتیازی رعائتیں کی جاتی ہیں جن کی وجہ سے عنایت سے محروم ملکوں کو شکایت پیدا ہوتی ہے اور بین الاقوامی تعلقات میں بدمزگی اور کشیدگی رونما ہو جاتی ہے۔ آخری طریقے کی خرابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بین الاقوامی تجارت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور بصورتِ مجموعی دنیا کی پیداوار اور اس کا معیارِ زندگی گھٹ جاتا ہے۔

بنیادی خرابی دراصل یہ ہے کہ ہر ملک کی ایک علیحدہ حکومت ہے اور اس کا اپنا علیحدہ زر کا اور بنک کا نظام ہے اگر بین الاقوامی حکومت کے ماتحت ایک بین الاقوامی زر اور بنک ہوتا تو بین الاقوامی تجارتی معاملات بھی ویسے ہی سہولت سے طے پا سکتے جیسے کہ ملکی معاملات طے پاتے ہیں۔

جنگ عظیم اول سے پہلے جیسا کہ اوپر بیان گیا۔ سونا ملکی زر کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی زر کے فرائض بھی انجام دیتا تھا لیکن جب دنیا کی قوموں نے یکے بعد دیگرے سونے کے معیار کو ترک کر دیا اور سونے کے بین الاقوامی معیار کی کامیابی کے لئے جو شرائط ضروری تھیں وہ پوری ہوتی بند ہو گئیں تو سونے کے ذریعے اس کام کو اس خوبی کے ساتھ انجام نہیں دیا جا سکا جیسا

کمزوری تھا۔ پھر بھی ابھی تک سونے سے بے نیاز ہوکر کسی بین الاقوامی زر کو قایم کرنے کا موقع پیدا نہیں ہوا ہے۔ حتیٰ کہ روس کے ماہر معاشیات پروفیسر ماگرا کو بھی یہ بات کہنی پڑی۔ کہ روس بین الاقوامی معیار طلا کی حمایت کرتا ہے۔ جب صورت یہ ہے تو سونے کو تو بین الاقوامی زر کی بنیاد بنانا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ بہت سے دوسرے طریقے ایسے اختیار کئے جا سکتے ہیں جن سے سونے کے معیار کی خامیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم ثانی کے بعد کے زمانے کے لئے بین الاقوامی اشتراک عمل کے لئے جو تعمیری تجویزیں پیش کی گئیں ان میں بین الاقوامی زر اور بین الاقوامی بنک کی اسکیمیں خاص اہمیت رکھتی تھیں۔ انھیں انگلستان کے ماہر معاشیات پروفیسر کینس اور امریکہ کے وزیر مالیہ مسٹر مارگنتھو نے بنایا تھا۔ ان پر غور کرنے کیلئے امریکہ کی ریاست نیو ہیمپشائر کے مقام بریٹن ووڈز میں چوالیس قوموں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس یکم جولائی ۱۹۴۴ء سے ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء تک منعقد ہوئی اور زر کے بین الاقوامی ذخیرۂ نقد اور ازسر نو تعمیر و ترقی کے بین الاقوامی بنک کے بارے میں راضی نامے مرتب کئے گئے۔ ان راضی ناموں کی تصدیق، حکومت روس کے علاوہ، اکثر شرکاء کانفرنس کی حکومتوں نے کر دی ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے بھی ہندوستان کی مقننہ کی منظوری کی امید پر اس کی تصدیق کر دی ہے۔ روس کی عدم شرکت کی وجہ سے ہندوستان کا شمار ان پانچ بڑے ملکوں میں ہونے لگا ہے جن کی نسبیہ کی مقداریں سب سے زیادہ ہیں اور جنہیں اس بنیاد پر ذخیرۂ نقد کی مجلس عاملہ کے بارہ اراکین میں سے پانچ کو مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔

زر کے بین الاقوامی ذخیرۂ نقد کا راضی نامہ

یہ راضی نامہ بیس دفعات اور پانچ جدولوں پر مشتمل ہے جن میں حسب ذیل امور سے بحث کی گئی ہے۔ پہلی دفعہ میں اغراض و مقاصد۔ دوسری میں رکنیت۔ تیسری میں نسبیہ اور چندہ۔ چوتھی میں رائج الوقت زروں کی قدر مساوات۔ پانچویں میں ذخیرۂ نقد سے لین دین۔ چھٹے میں سرمایہ کی منتقلی۔ ساتویں میں قلیل الرسد زرہائے۔ آٹھویں میں اراکین کی عام ذمہ داریاں۔ نویں میں حیثیت، آزادیاں

اور مراعات۔ دسویں میں دوسری بین الاقوامی تنظیموں سے تعلقات۔ گیارھویں میں غیر اراکین ملکوں سے تعلقات۔ بارھویں میں تنظیم وانتظام۔ تیرھویں میں دفاتر اور تحویلیں۔ چودھویں میں عبوری دور۔ پندرھویں میں رکنیت سے علیحدگی۔ سولھویں میں ہنگامی تجاویز۔ سترھویں میں ترمیمات۔ اٹھارھویں میں تعبیر وتفسیر۔ انیسویں میں اصطلاحات کی توضیح۔ بیسویں میں آخری قواعد۔

جدولوں میں جدول (الف) میں نسبتے (ب) میں قواعد جن کے ماتحت ایک رکن اپنے زر کو جو ذخیرہ نقد کے پاس ہوگا دوبارہ خرید سکے گا (ج) میں جماعت عاملہ کے ڈائرکٹروں کا انتخاب (د) میں جو رکن علیحدہ ہوں گے ان کے حسابات کا تصفیہ اور (ہ) میں ذخیرہ نقد کے ختم کرنے کی کارروائی کا انتظام۔

اس راضی نامہ کا خلاصہ درج کرنے سے پہلے ہم مقاصد رکنیت، نسبیہ اور چندہ اور رائج الوقت زروں کی قدر مساوات کی دفعات کو تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہیں تاکہ راضی نامہ کی بنیادی شقوں کی نوعیت کا ایک اندازہ کیا جاسکے۔

مقاصد

حکومتیں جن کی جانب سے موجودہ راضی نامہ پر دستخط کئے گئے ہیں مندرجہ ذیل شرائط کے مطابق اپنا کام جاری رکھے۔

زر کے بین الاقوامی ذخیرہ نقد کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) زر کے بین الاقوامی اشتراک عمل کو ایک ایسے مستقل ادارے کے ذریعے ترقی دینا جو زر کے بین الاقوامی مسئلوں کے بارے میں مشوروں اور یکجہتی کا انتظام کرے۔

(۲) بین الاقوامی تجارت کی توسیع اور متوازن ترقی کے لئے سہولتیں فراہم کرنا اور اس کے ذریعہ روزگار اور حقیقی آمدنی کے قیام و اضافہ اور تمام اراکین کے دولت آفرین وسائل کی ترقی میں یہ سمجھ کر حصہ لینا کہ یہ بات معاشی پالیسی کے ابتدائی مقاصد میں داخل ہے۔

(۳) مبادلات کے استحکام کو ترقی دینا، اراکین کے درمیان مبادلہ کے باضابطہ انتظامات کو قائم رکھنا اور مسابقت میں قدر مبادلہ کو گرانے سے اجتناب کرنا۔

(۴) اراکین کے درمیان رواں معاملات کے سلسلے میں ادائیوں کے جہ جہت نظام کے قیام میں مدد دینا اور مبادلہ خارجہ کی ان پابندیوں کو ختم کرنا جو عالمگیر تجارت کی ترقی میں مزاحم ہوں۔

(۵) مناسب تحفظات کے ماتحت اراکین کو ذخیرہ نقد سے مستفید ہونے دینا اور ان کے اندر اعتماد کی کیفیت پیدا کرنا اور اس طرح انھیں موقع دینا کہ وہ اپنے ادائیوں کے توازن کی خرابیوں کی اصلاح ایسے طریقے اختیار کر کے کر سکیں جن سے قومی یا بین الاقوامی خوش حالی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

(۶) مندرجہ بالا کے مطابق، اراکین کی ادائیوں کے بین الاقوامی توازن میں جو بھی گڑبڑ پیدا ہو اس کی مدت اور اس کی شدت کو کم کرنا۔

ذخیرہ نقد کا ادارہ اپنے تمام فیصلوں میں مندرجہ بالا مقاصد کو ملحوظ رکھے گا

ابتدائی اراکین ذخیرہ نقد کے ادارے کے ابتدائی رکن وہ ملک ہوں گے جن کے نمائندے متحدہ اقوام کی زر اور مالیات کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور جن کی حکومتیں ۳۰ر دسمبر ۱۹۴۵ء تک اس کی رکنیت کو قبول کر لیں گی۔

دیگر اراکین دوسرے ملک اس وقت اور ان شرائط کے ماتحت رکن بن سکیں گے جنہیں کہ ذخیرہ نقد کا ادارہ مقرر کرے گا۔

نسبیہ ہر رکن کا ایک نسبیہ مقرر کیا جائیگا۔ متحدہ اقوام کی زر اور مالیات کی کانفرنس میں جو ملک شریک ہوئے تھے ان کا نسبیہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ دیگر اراکین کے نسبیہ کا تعین ذخیرہ نقد کا ادارہ کرے گا۔

نسبیہ کا جدول (امریکہ کے ملین ڈالروں میں)

ریاستہائے متحدہ = ۲۷۵۰ سلطنت متحدہ برطانیہ = ۱۳۰۰ اتحاد جمہوریت ہائے روس = ۱۲۰۰

چین = ۵۵۰ فرانس = ۴۵۰ ہندوستان = ۴۰۰ کناڈا = ۳۰۰ نیدرلینڈ = ۲۷۵
بلجیم = ۲۲۵ آسٹریلیا = ۲۰۰ برازیل = ۱۵۰ پولینڈ = ۱۲۵ جیکوسلوویکیا = ۱۲۵
جنوبی افریقہ = ۱۰۰ میکسیکو = ۹۰ یوگوسلیویا = ۶۰ جلی = ۵۰ کیوبا = ۵۰
کولمبیا = ۵۰ ناروے = ۵۰ نیوزی لینڈ = ۵۰ مصر = ۴۵ یونان = ۴۰ ایران = ۲۵
پیرو = ۲۵ فلیپین = ۱۵ یوروگوئے = ۱۵ وینی زوایلا = ۱۵ لگزمبرگ = ۱۰
بولیویا = ۱۰ عراق = ۸ —
حبش = ۶ - جمہوریت ڈومینکن = ۵، ایکوڈار = ۵ - گوآٹے مالا = ۵ - ہیتی = ۵ - کوسٹاریکا = ۵
ایل سالوادر = ۲/۵ - ہونڈوراس = ۲/۵ - پیراگوئے = ۲ - نیکارگوآ = ۲ - آیس لینڈ = ۱ - لیبریا = ۵/۱
پناما = ۲/۵ - میزان = ۸۸۰۰ ملین ڈالر۔

چندہ

(الف) ہر رکن کا چندہ اس کے نسبیہ کے برابر ہوگا، اور یہ پورا چندہ ذخیرہ نقد کی تحویل میں اس تاریخ کو یا اس سے پہلے داخل کرنا ہوگا جب کہ وہ رکن ذخیرہ نقد سے زر خریدنے کا مجاز ہوگا۔ ہر رکن ذخیرہ نقد سے زر خریدنے کا اس وقت مجاز ہوگا جب اسکے زر کی قدر مساوات کا تعین کر دیا جائے گا۔

(ب) ہر رکن سونے کی صورت میں مندرجہ ذیل میں سے جو بھی چھوٹی رقم ہوگی اُسے داخل کریگا

(۱) اپنے نسبیہ کا ۲۵ فی صدی۔

(۲) اپنے سونے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ڈالر کے سرکاری ذخیرہ کا دس فیصدی ہر رکن کو اپنے سرکاری ذخیرہ کے معلوم کرنے کے لئے ذخیرہ نقد کے ادارے کو سہولتیں فراہم کرنا ہوں گی۔

(ج) ہر رکن اپنے چندہ کا بقیہ حصہ اپنے رائج الوقت زر کی صورت میں جمع کرے گا۔

رائج الوقت زروں کی قدر مساوات

(۱) الف - ہر ملک کے زر کی قدر مساوات کا اظہار یا تو سونے کی صورت میں یا ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اس ڈالر کی صورت میں کیا جائے گا جس کے وزن اور کھرے پن کا اندازہ یکم جولائی ۱۹۴۴ء کے

ڈالر کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا۔

(ب) اراکین کے زر کے بارے میں اس راضی نامے کے تحت جملہ حسابات انہی قدر مساوات سے کئے جائیں گے۔

(۲) سونے کے سودوں کے لئے ذخیرہ نقد کا ادارہ قدر مساوات سے اوپر اور نیچے کی مختتم حدود کا تعین کر دے گا اور کوئی رکن سونے کو، قدر مساوات جمع اوپر کی مختتم حد سے زیادہ پر نہ خرید سکے گا اور نہ قدر مساوات نفی نیچے کی مختتم حد پر فروخت کر سکے گا۔

(۳) اراکین کے زروں کے مبادلات کے بیش ترین اور کم ترین نرخ ان سودوں کے لئے جو ان کے علاقوں میں طے پائیں گے قدر مساوات سے صرف حسب ذیل حد تک اختلاف رکھیں گے

(الف) مبادلات کے فوری حوالگی کے سودوں کے لئے صرف ایک فی صدی تک۔

(ب) دوسرے مبادلات کے لئے فوری ادئیگی کے نرخ کے مقابلہ میں اس حد تک جس کو ذخیرہ نقد کا ادارہ معقول قرار دے گا۔

شرح مبادلہ کے استحکام کی ذمہ داری

(الف) ہر رکن اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہے کہ وہ شرح مبادلہ کے استحکام کو ترقی دینے میں ذخیرہ نقد کے ادارے کے ساتھ پورا اشتراک عمل کریگا اور دوسرے ممبروں کے ساتھ مبادلات کے انتظامات کو باضابطہ رکھے گا اور شرح مبادلہ کی تبدیلیوں میں مسابقت کرنے سے احتراز کرے گا۔

(ب) ہر رکن مناسب تدبیروں کے ذریعے سے جو اس راضی نامے سے مطابقت رکھیں گی اپنے زر اور دوسرے اراکین کے زر کے مابین ایسے مبادلے کے سودوں کی اجازت دے گا جو مندرجہ بالا دفعہ کی حدود کے اندر ہوں گے جن اراکین کے زر کے منتظمین سونے کی آزادانہ خرید و فروخت کی اجازت اس شرح کے مطابق دیں گے جس کا کہ ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس ذمہ داری کو پورا کر رہے ہیں۔

قدر مساوات میں تبدیلی

کوئی رکن اپنی قدر مساوات میں تبدیلی کی تجویز پیش نہیں کریگا سوائے اس صورت کے کہ کسی بنیادی عدم توازن کی اصلاح

پیشِ نظر ہو۔ اس قسم کی تجویز صرف خود رکن کو پیش کرنا ہوگی اور اس کے لئے ذخیرہ نقد کی ادارے سے پہلے مشورہ ضروری ہوگا۔

جب تبدیلی کی کوئی تجویز پیش ہوگی تو ذخیرہ نقد کا ادارہ پہلے تو ابتدائی قدر مساوات میں جو تبدیلیاں ہو چکی ہیں ان پر غور کرے گا۔ اگر تمام سابق تبدیلیاں بشمول مجوزہ تبدیلی کے چاہے وہ اضافہ کے لئے ہو چاہے کمی کے لئے۔

(الف) ابتدائی قدر مساوات سے دس فی صدی تک زیادہ نہ ہوگی تو ذخیرہ نقد کا ادارہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

(ب) اگر مزید دس فی صدی تک ہوئی تو ادارہ اعتراض کر سکے گا لیکن بہر صورت اگر رکن کی یہ خواہش ہوئی تو ۷۲ گھنٹے کے اندر اپنا فیصلہ سنا دے گا۔

(ج) لیکن اگر (الف) اور (ب) سے مختلف ہوئی تو اس صورت میں اعتراض بھی کرے گا اور رضامندی بھی دے سکیگا لیکن اُسے حق حاصل ہوگا کہ اپنا فیصلہ سنانے کے لئے زیادہ وقت کا مطالبہ کرے۔

(باقی)

سہارنپور میں گاڑوں کی برادری

اس برادری[۱] کی کوئی صحیح تاریخ نہیں دی جاسکتی۔ مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک بات یقینی ہے کہ ایک چھوٹا سا گروہ ایسے لوگوں کا تھا جو پرگنہ فیض آباد ضلع سہارنپور میں جمنا کے کنارے آباد ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ان کی تعداد بہت مختصر تھی، ان کی اصلیت کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ عرب میں ایک قارہ قبیلہ تھا جو بحر قلزم کے کنارے آباد تھا، ان کا پیشہ کھیتی تھا۔ وہ لوگ یہاں آئے اور انہوں نے اس کام کو یہاں شروع کردیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ گوڑ برہمن جب مسلمان ہوئے تو وہ گاڑا کہلائے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ چونکہ مذہبی اعتبار سے بٹے تھے اس لئے گاڑھا مسلمان کہے جانے لگے۔

ان کی موجودہ شکل اس طرح پیدا ہوئی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد چونکہ غدر کا الزام مسلمانوں پر رکھا گیا تھا۔ اس لئے شہر کے بہت سے اعلیٰ خاندان کے مسلمان دیہات میں پہنچ گئے اور دیہات میں مسلم راجپوتوں اور پٹھانوں کے جو خاندان تھے انہوں نے اپنے آپ کو گاڑا کہنا شروع کردیا اور گاڑوں میں بالکل ہل مل گئے تاکہ سرکاری عتاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں، چنانچہ اب گاڑوں میں بہت سے خاندان ایسے ملتے ہیں جو اصل کے اعتبار سے مغل، سید، شیخ یا دوسری اعلیٰ برادریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ منفعت علی صاحب وکیل سہارنپور صوبہ اسمبلی کے ممبر شیخ ہیں۔ پرانے کاغذات سے یہ بات ثابت ہے۔ یہ شیخ انصاری ہیں، ان کا شجرہ بھی ان کے پاس موجود ہے۔ ان کا خاندان موضع باغوں والی پرگنہ وضلع مظفرنگر

[۱] یہ حالات تمام مسٹر خورشید علی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کے بتلائے ہوئے ہیں جو گاڑا برادری کے ایک ممتاز رکن اور مسلم لیگ کے ایک سرگرم کارکن ہیں۔ آپ نے دوسری برادریوں کے حالات معلوم کرانے میں بھی بہت امداد فرمائی۔

کا ہے۔ ان کے خاندان کے بارے میں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ موضع دھلا پڑہ پرگنہ سرساوے سے یہ خاندان مظفر نگر پہنچا تھا۔

گاڑوں میں وجاہت کے اعتبار سے موضع گھانا خوب مشہور ہے یہاں کے لوگ پندرہ بیس گاؤں کے مالک ہیں۔ اس موضع میں بڑے بڑے مکانات موجود ہیں۔ یہ لوگ راجپوتوں سے مسلمان ہوئے ہیں اور ان کی رشتہ داری ابھی تک پرانے راجپوتوں کے یہاں ہے۔ محمد امیر صاحب جو سہارنپور کے نہایت ممتاز مختاروں میں ہیں، راجپوتوں ہی سے مسلمان ہوئے ہیں۔

موضع مانکی پرگنہ دیوبند، سالم کا سالم اِن راجپوتوں کا ہے جو مسلمان ہوکر گاڑے کہلائے جانے لگے ہیں۔

موضع گوپالی پرگنہ دیوبند سالم کا سالم گاڑوں کا ہے اور اس میں گاڑے برہمن سے مسلمان ہوئے ہیں۔

سیانپلا بقال کے گاڑے بنیوں سے مسلمان ہوئے ہیں۔

بعض دیہات میں ہندو تگوں سے مسلمان ہوکر گاڑے بن گئے ہیں۔

دیوبند کے ایک نہایت ممتاز خاندان کے لوگ نہار سنگھ راجپوت کی اولاد سے ہیں جو دیوبند میں ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان ہوکر گاڑے بنے تھے۔ سر محمد رفیق ان ہی کی اولاد سے ہیں اس خاندان میں خان بہادر الٰہی بخش صاحب نہر کے ڈپٹی کمشنر رہے اور بعد میں اسسٹنٹ انجینیر ہوگئے۔ یہ سر سید کے شریک کار تھے، ان کی دو بیویاں۔ خاندانی بیوی سے محمد لطیف اور محمد صادق دو لڑکے ہوئے اور دوسری بیوی سے چار لڑکے ہوئے جن میں شیخ نور شمس سر محمد رفیق اور لارڈ حامد بھوپال والے ہوئے۔ اس شادی کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کرلی اور دہلی میں گیارہ سال تک وائس چیرمین رہے۔ پرانی بیوی کی اولاد کو دیوبند کی جائداد ملی۔ اور نئی بیوی کے لڑکوں نے تعلیم پائی۔ ایک صاحب سول سرجن ہوئے جن کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ ایک بیرسٹر ہوئے۔ محمد صدیق بار ایٹ لا۔ تعلیم کے لحاظ سے گاڑا برادری میں اس سے

زیادہ تعلیم یافتہ خاندان کوئی نہیں ہے۔

محمد لطیف صاحب کے بیٹے محمد ہاشم صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے انہوں نے ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ اور ہندوستانی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹوں میں سب سے پہلے شخص تھے ان کے ایک لڑکے اب بیکار ہیں، ان کے دوسرے لڑکے بمبئی میں پیشکار ہیں

جسٹس رفیق صاحب کے صاحبزادوں میں احمد رفیق صاحب حیدرآباد میں شاید سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں۔

سب سے زیادہ گاڑے ... کے لوگ سب سے زیادہ ضلع سہارنپور میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ضلع مظفر نگر میں ہیں۔ اس کے بعد ضلع میرٹھ کی تحصیل موانہ میں کچھ ضلع انبالہ میں بھی ہیں اور کچھ بلند شہر میں بھی ہیں جب گاڑا برادری کا آل انڈیا اجلاس ہوتا ہے تو اس میں شرکت کرنے کے لئے درخواستیں مختلف مقامات سے آتی ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ گاڑے اور کہاں کہاں موجود ہیں۔

ضلع سہارنپور اور مظفرنگر میں پندرہ سال ہوئے مردم شماری کرائی گئی تھی تو ان کی تعداد اسی ہزار ہوئی تھی۔ اس کے صحیح اعداد سکریٹری آل انڈیا گاڑا کانفرنس سے مل سکیں گے

شہر سہارنپور میں صرف محلہ جھوٹے والے میں زیادہ آبادی ہے۔ آبادی مشکل سے دو سو ہوگی۔ شہر میں یہ لوگ کبھی نہیں رہے ہیں۔ شہروں میں ان کی آبادی بہت تھوڑی ملے گی، قصبات میں البتہ ان کی آبادی مل جائے گی۔ شہر میں ملازمت یا وکالت کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

۹۹ فی صدی چھوٹے زمیندار ہیں۔ دو دو سو چار چار سو بیگہ کی زمینداری ہے یا یوں کہئے کہ سو ایکڑ سے ۵۰۰ ایکڑ تک۔ یہ لوگ خود کاشت کرتے ہیں۔ پہلے زمینداری معقول تھی لیکن چونکہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کیا اس لئے زمینداری تقسیم ہوگئی۔ بعض خاندانوں میں بڑے زمیندار اور کاشتکار رہے ہیں، لیکن ان کی تعداد کم ہے۔

بڑے زمینداروں کے نام یہ ہیں:۔

موضع گھانہ پرگنہ سہارنپور میں۔ حکیم انعام الحق وغیرہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اندازاً ایک لاکھ کا قرضہ ہے۔ بیس سالم گاؤں ان لوگوں کے پاس تھے۔ وہ سب قرضے میں نکل گئے ہیں۔ اخراجات بہت زیادہ تھے۔ نواب منصب علی کے پاس ۱۹۱۴ء میں سولہ ہزار کی جمع بندی تھی۔ لڑکے کے عقیقے میں ۷۰ ہزار کا خرچ ہوا۔ سب عیاشی، شراب، کوکین میں صرف کر دیا تھا، زندگی میں نادار ہو گئے ان کا لڑکا اب آٹے دال کی دوکان کرتا ہے۔

بڈھا کھیڑہ، پرگنہ سلطان پور میں:۔ ا۔ چودھری ظفر احمد صاحب ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ ۲۔ لطیف احمد صاحب۔

پانڈولی پرگنہ سہارنپور میں:۔ امیر احمد صاحب۔ یہ نثار احمد صاحب وکیل کے خاندان سے ہیں۔

موضع تھیتکی تحصیل و پرگنہ سہارنپور میں:۔ سلطان احمد صاحب۔ یہ پرگنہ دیوبند میں سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ ان کے بعد دوسرا نمبر دیوبند میں محمد عبداللہ صاحب موضع سانپلا والوں کا ہے۔

برادری میں باہر کے شادی بیاہ کو برا سمجھتے ہیں۔ برادری کا نظام اپنی جگہ پر قایم ہے ۱۹۰۳ء میں نثار احمد صاحب کے دادا منشی احمد علی صاحب نے برادری کو منظم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انھیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی پھر ۱۹۲۰ء میں برادری کو تنظیم دی گئی۔ یہ کام خاں صاحب ڈپٹی محمد ابراہیم صاحب نے انجام دیا۔ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے حکومت کی ملازمت سے ریٹائر ہوکر سہارنپور میں سکونت اختیار کی اور دیہات کا دورہ کرکے برادری کو تنظیم دی۔ ریڑھی میں مدرسہ قایم کیا۔ دس ہزار کی بلڈنگ بنائی۔ یہ موضع گاؤں ضلع و تحصیل مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ گاڑوں کے اندر سے ان کی ایک نہایت بری عادت جاتی رہی۔ ان میں عورتوں کے اغوا کے مقدمات بہت چلتے رہتے تھے لیکن

دس پندرہ سال سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ محمد ابراہیم صاحب نے برادری کی انجمن قایم کی۔ اب تنظیم کی صورت یہ ہے کہ تمام برادری کی ایک انجمن ہے۔ پورا سوشل نظام اس کے ماتحت چلتا ہے۔ اس کی شاخیں ہر تحصیل میں ہیں۔ پھر پانچ پانچ گاؤں کے حلقے کا سرپنچ مقرر کردیا گیا ہے اور ہر موضع میں پنچایت ہے، جس کے پنچ ہیں۔ انجمن کے سالانہ اجلاس ہوتے ہیں زیادہ تر سوشل معاملات سے بحث کی جاتی ہے۔ شادی کے رجسٹر بنادئے گئے ہیں۔ شادی بیاہ میں بہت فضول خرچی ہوتی تھی اب برادری میں کم سے کم ۵، فی صد آمدنی مقدمہ بازی اور بیاہ شادی میں صرف ہوتی تھی لیکن اب پنچایت کی وجہ سے شادی بیاہ کی فضول خرچی تقریباً ختم ہوگئی ہے فضول ہندوانہ رسمیں بھی قریب قریب ختم کردی گئی ہیں۔ ناچ تماشے سوانگ وغیرہ سب ختم ہوگئے ہیں۔ مقدمہ بازی بھی بہت کم ہوگئی ہے۔ لیکن اب بھی بہت کافی ہے۔

عبداللہ سیا نیلے میں ایک بارات تحصیل رڑکی کے ایک گاؤں [illegible] پور سے آئی تھی۔ اس میں چھ سو بارکش یعنی رتھ، بہل گاڑی وغیرہ آئی تھیں اور وہ خاندان اس شادی میں ہی ختم ہوگیا تھا۔

برادری کے لوگوں کی تندرستی بہت اچھی ہے۔ پٹھانوں میں اوران میں فرق نہیں کیا جاسکتا۔ ان لوگوں کو ورزش کا بھی شوق ہے، اس لئے تندرستی بہت اچھی ہے۔

تعلیم بہت کم ہے۔ گریجویٹ تین، شہر سہارنپور میں ہیں۔ ایک دیوبند میں ایک رڑکی اور ایک مظفرنگر میں۔ کل دس گریجویٹ ہیں کچھ کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ وکیل تین سہارنپور میں ہیں۔ ایک دیوبند میں۔ ایک رڑکی اور ایک مظفرنگر میں۔

ملازمت: بیس زیادہ تر نہر کے محکمے میں ہیں۔ دو انجنیر ہیں۔ دو ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ ایک ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ باقی کریکل لائن میں ہیں اور کلکٹری یا ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازم ہیں۔ نہر کی ملازمت میں یہ لوگ شروع سے ہیں۔ فوج میں بھی کافی تعداد میں ہیں۔ پہلے سے بھی ہیں اور اس جنگ کے زمانے میں اور زیادہ ہو گئے ہیں۔ پہلے قومیت راجپوت وغیرہ لکھا دیتے تھے۔ کوشش کی گئی

تھی کہ ایک گاڑا ہیڈمیلیس بن جائے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

تجارت میں بہت کم ہیں۔ ایک تو محمد ابراہیم صاحب کے لڑکے جنرل مرچنٹس کی دوکان کررہے ہیں۔ دوسرے قاسم حسن صاحب (اوکھلے کے سابق انجنیر نہر جو ریٹائر ہونے کے بعد اب بھوپال ریاست میں ملازم ہو گئے ہیں) کے دونوں لڑکے ہیں۔ ایک لڑکے کی رڑکی میں لوہے کی دوکان ہے اور دوسرے کی تلی باران دہلی میں چمڑے کی دوکان ہے۔ انبالین قیدیوں کا ٹھیکہ منفعت علی صاحب کے بھائی کے پاس ہے۔

حکیم دیہات میں ۲۰ ایک ہیں۔ مذہبی تعلیم میں حافظ قرآن عورتوں اور مردوں میں بہت ملیں گے۔ پانچ سات مولوی بھی ہیں۔ نماز روزے کے اس برادری میں سب سے زیادہ پابند ہیں۔

سہارنپور کے ڈسٹرکٹ بورڈ میں کل ۳۱ ممبر ہیں جن میں دس مسلمان ممبر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۹ ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ان ۹ ممبروں میں سے تین ممبر گاڑا برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک ممبر اور حلقہ دیوبند سے ان کا منتخب ہو سکتا ہے۔

برادری کے ممتاز لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ ممتاز زمینداروں کا نام پہلے دیا جاچکا ہے۔

۱۔ امانت علی صاحب ریٹائرڈ انجنیر مقیم رڑکی۔ تین چار لاکھ کی حیثیت کے آدمی ہیں۔

۲۔ مولوی منفعت علی صاحب وکیل ایم۔ ایل۔ اے سہارنپور کے نہایت ممتاز وکیلوں میں ہیں۔

۳۔ مسٹر خورشید علی صاحب وکیل مسلم لیگ کے سرگرم کارکن ہیں۔ میری اس تحقیقات میں صاحب موصوف نے بہت امداد فرمائی۔

۴۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب موضع خیل پور تحصیل رڑکی ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ۔

۵۔ حکیم انعام الحق صاحب موضع گھانہ ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ

۶۔ چودھری ظفر صاحب موضع بڈھا کھیڑہ ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ۔

۷۔ خاں صاحب قاسم حسن صاحب ریٹائرڈ سب ڈویژنل آفیسر نہر اوکھلہ، جو اب بھوپال میں ملازم ہو گئے ہیں۔

۸۔ علی جواد صاحب ڈپٹی کلکٹر۔

۹۔ علی جواد صاحب کے والد جو جھانسی میں ایس۔ ڈی۔ او نہر ہیں۔

نوٹ۔ محمد سلیمان صاحب انجنیر دہلی کا تعلق بھی اسی برادری سے ہے۔

برادری میں تقریباً دس آدمی ایسے ہیں جن کی حیثیت ایک اور تین لاکھ کے درمیان ہے۔ پندرہ بیس ایسے ہیں جن کی حیثیت پچیس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان ہے ایکہزار ایسے آدمی ہوں گے جن کی حیثیت پانچہزار اور پچیس ہزار کے درمیان ہے۔ ایک ہزار آدمی ایسے ہوں گے جن کی حیثیت ایک ہزار اور پانچہزار کے درمیان ہے۔ اور برادری کے اسی فی صد آدمی ایسے ہوں گے جن کی حیثیت ایک ہزار سے خاصی اوپر ہی ہوگی۔ ایک ہزار سے نیچے حیثیت رکھنے والے صرف پانچ فی صدی ہوں گے

برادری کا سرمایہ ۹۹ فی صد صحرائی جائداد میں لگا ہوا ہے۔ سکنائی جائداد صرف بابو امانت علی کے پاس ہے اور قصبہ رڑکی میں سب سے زیادہ جائداد ان ہی کے پاس ہے فیکٹریوں اور کارخانوں میں بالکل روپیہ نہیں لگا ہوا ہے۔ دوکان کے کاروبار میں گنتے چنے آدمیوں کا بیس بیس پچیس پچیس ہزار روپیہ لگا ہوا ہے۔ روپیہ سود پر نہیں چلاتے زیور وغیرہ کا شوق سب سے زیادہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر خرچ کا پچاس فی صد حصہ زیورات پر ہوتا ہے۔ غریب سے غریب گھر میں بھی سو دو سو کا زیور ہونا ضروری ہے۔ قیمتی کپڑوں [illegible] میں پندرہ [illegible] سال سے بہت کافی خرچ ہونے لگا ہے۔ پہلے پردہ بعض دیہات میں نہیں تھا۔ خصوصاً چمار عورتیں لیکن اب پردہ ہر جگہ ہو گیا ہے۔ مکان کے ساز و سامان اور فرنیچر پر زیادہ خرچ نہیں ہے۔ تانگے، بیلے، رتھ وغیرہ اور گھوڑوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اب پان اور چائے اور حقہ کا شوق دیہات میں بہت بڑھ گیا ہے۔ چھ برس کی عمر سے بچہ حقہ پینا شروع کر دیتا ہے۔

مقدمہ بازی میں خرچ سب سے زیادہ ہے۔ پچاس فی صد مقدمہ بازی میں خرچ کیا جاتا ہے۔ خیرات، زکوٰۃ اور مذہبی کاموں کے لئے ان سے زیادہ چندہ دینے والا کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ عالم پرست زیادہ ہیں، پیر پرست نہیں ہیں۔

قرض کافی ہے جس شخص کے پاس گھر کی ایک ہزار دو ہزار کی زمین ہے ان پر ایک ہزار دو ہزار کا قرضہ ضرور ہے۔ قرضہ بنیوں سے سودی کو لیا جاتا ہے اور پرانا قرضہ چلا آرہا ہے۔ سب بڑے بڑے زمینداروں پر قرض ہے۔ صرف تین چار خاندان ایسے ملیں گے جن پر قرض نہیں ہے۔ جائداد تقریباً پچاس فی صد نکل کر بنیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی لیکن ۱۹۲۰ء میں برادری کی انجمن کے قایم ہونے کے بعد سے اس میں بہت کمی ہوگئی ہے۔

حالاتِ حاضرہ

جب باتیں بنانے سے کام چل جائے تو معاملہ باتوں پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ متحدہ اقوام کی اسمبلی اور مجلس تحفظ کے پہلے جلسوں میں برطانیہ اور روس کے نمائندوں میں خوب بحث رہی اور اس کا نتیجہ وہی نکلا جو مناسب تھا۔ روسی جانتے تھے کہ ایران کا مسئلہ مجلس تحفظ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور انھیں اندیشہ تھا کہ برطانیہ ایران کا ساتھ دے گا۔ یہ اندیشہ نہ ہوتا تب بھی وہ جانتے تھے کہ دنیا ان کے موجودہ رویہ پر حیرت کر رہی ہے کہ آزادی اور انقلاب کے ایسے شیدائی ہر طرف زبردستی اور سامراجیت کے طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے یونان اور انڈونیشیا کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور برطانیہ کو ملزم کی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ کی پرورش پرانی وضع کے سیاست دانوں کے سائے میں نہیں ہوئی ہے، وہ بے تکلف آستینیں چڑھا کر کھڑے ہو گئے۔ موسیو ویژنسکی کے بیانات سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ آزربائجان کی بغاوت میں روس کی امداد شامل نہیں تھی، اور نہ روس نے غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے کوئی زحمت اٹھائی۔ لیکن ایران اس پر راضی ہو گیا کہ ان کے اور روس کے درمیان براہ راست گفتگو ہو اور متحدہ اقوام کو بیچ میں نہ ڈالا جائے۔ اگر روس کا رویّہ وہی رہا جو کہ اب تک تھا تو ایرانیوں کو اس کا موقع ہوگا کہ متحدہ اقوام کو پھر ثالث بنائیں۔ لیکن اگر روس کے کوئی ایسے منصوبے ہیں جن میں متحدہ اقوام کی مداخلت خارج ہو سکتی ہو تو متحدہ اقوام کی مجلس کے اگلے اجلاس تک جو کرنا ہے کر لیں گے۔ برطانیہ پر الزامات لگانے کی کوشش روسی سیاست کی طرف سے جو بدگمانیاں پیدا ہوئی ہیں انھیں دور کر سکی۔ برطانیہ کی صفائی پیش کرنے کو یونان کے نمائندے موجود تھے۔ اور مسٹر بیون نے یہ بھی واضح کر دیا کہ لیبر پارٹی اور مسٹر چرچل کی خارجی حکمت عملی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے معذرت کا یہ پہلو کہ ایک رجعت پسند سیاست داں سے غلطی ہوگئی تھی۔ اب برطانیہ کا رویہ بہتر ہوگا۔ اختیار نہیں کیا گیا

انڈونیشیا میں برطانوی فوج اب تک موجود ہے وہاں کی قومی حکومت سے تصادم کے امکانات اب بھی ہیں، لیکن اس معاملے میں بھی روسی متحدہ اقوام کی رائے پر کچھ اثر نہ ڈال سکے۔ بحث کی اصل نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جلسوں کے بعد مسٹر بیون اور مسٹر ویزنسکی ملتے تھے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔

اسمبلی اور مجلس تحفظ کے جلسوں سے معلوم ہوا کہ متحدہ ریاستوں کی حکومت کا رویہ اب بدل گیا ہے۔ جنگ کے آخری دور میں امریکی قوم روس کی مداح تھی، حکومت کا انداز معترض کا سا تھا۔ اب روس کی سیاسی چالوں نے قوم کو بدظن کر دیا ہے۔ امریکی حکومت کا برتاؤ دوستانہ ہے۔ بعض لوگ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ بحرالکاہل، جاپان اور چین کے معاملات میں روسی اور امریکی حکومتوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ ہو گیا جس سے امریکی حکومت مطمئن ہے، اور اسے دلچسپی انھیں معاملات سے تھی۔ روس اور برطانیہ کی بحثوں میں متحدہ ریاستوں نے غیر جانب داری برتی، مگر کوئی ناگوار صورت پیدا نہیں ہونے دی۔ اگر روس اور برطانیہ کے درمیان واقعی شدید اختلافات تھے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ متحدہ ریاستوں نے جھگڑے کو بڑھنے نہیں دیا اور آخر کار دونوں میں سمجھوتہ کرا دیا۔ غالباً متحدہ ریاستوں کا اطمینان اس عالم کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

انڈونیشیا کی قومی تحریک نے برطانیہ اور ہالینڈ کو اسقدر متاثر کر دیا ہے کہ اب وہاں حسب سابق ہالینڈ کی حکومت نہیں ہو سکتی۔ ہالینڈ اس پر راضی ہے کہ انڈونیشیا کو سوراج دیدے لیکن اس کے ساتھ شرطیں بھی ہیں۔ ہالینڈ کو یقین ہے کہ وقتی جوش میں انڈونیشیا نے ابھی سے بالکل قطع تعلق کر لیا تو اسے بہت سخت معاشی اور تہذیبی نقصان ہوگا، اور اس سے انڈونیشیا کو بچانے کے لئے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ایک خاص مدت تک دونوں کی مشترک حکومت ہو۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ انڈونیشیا کی ایک پارلیمنٹ ہوگی جس کے بیشتر اراکین منتخب شدہ قومی نمائندے ہوں گے، حکومت کا کام وزیر کریں گے جو پارلیمنٹ کی پارٹیوں کے نمائندے ہوں گے اور وزارت کا صدر اور حکومت کا افسر اعلیٰ تاج کا نمائندہ ہوگا۔ مختلف نوآبادیوں کے معاملات

میں ربط پیدا کرنے کے لئے ایک امپیریل یعنی سامراجی کابینہ ہوگی جسکا مرکز ہالینڈ کا دارالسلطنت ہوگا۔ یہ نظام اس خاص مدت کے لئے تجویز کیا گیا ہے جس میں کہ انڈونیشیا اور ہالینڈ کا اشتراک عمل ضروری ہے اس کے بعد انڈونیشیا چاہے تو ہالینڈ سے بالکل الگ اور خودمختار ہوسکتا ہے۔ ہالینڈ کی حکومت نے اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لئے اس کا وعدہ کیا ہے کہ وہ انڈونیشیا کو متحدہ اقوام کی صف میں جلد سے جلد شامل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہالینڈ کی طرف سے یہ تجویز ۱۰ فروری کو پیش کی گئی اور سر آرچیولڈ کلارک کر برطانیہ کے خاص نمائندے بنا کر بھیجے دیا بھیجے گئے ہیں کہ اس تجویز کو غلط فہمیوں کی وجہ سے مسترد نہ ہونے دیں۔ انڈونیشیا کی قومی حکومت کے نمائندے گفتگو کر رہے ہیں، اب تک یہ معلوم ہوا ہے کہ تاج کے نمائندے کے اختیارات کی وضاحت چاہتے ہیں اور مدت کا بھی تعین کرانا چاہتے ہیں جبکہ حکومت مشترک ہوگی۔ اب تک انڈونیشیا کی قومی تحریک میں ایسے اختلافات نمودار نہیں ہوئے ہیں جن سے سامراجی مدبر فائدہ اٹھا کر ترقی کا راستہ بند کر دیتے ہیں۔ انڈونیشیا میں ایک جماعت انتہا پسندوں کی ہے جس کی وجہ سے برطانوی فوج کو مداخلت کا موقع ملا ممکن ہے وہ اب بھی ایسا کچھ کردے کہ ہالینڈ کی حکومت اپنی تجویز کو واپس لے لے۔ مگر انڈونیشیا کو معاشی اور تہذیبی نقصان کے بچانے کا بہانا اب کچھ بہت کام نہ دے گا۔ جاپان کے قبضے نے ڈچ اور ملی جلی نسل کے لوگوں کے وقار کو بہت سخت صدمہ پہنچایا ہے اور ہالینڈ کی حکومت زبردستی قایم نہیں رکھی جاسکتی۔ انڈونیشیا کی قومی وزارت اپنی بات پر قایم رہی تو اسے ماننے کے سوا چارۂ نہ ہوگا۔

آذربائجان کی بغاوت نے صرف ایران ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی ملکوں میں ایک بیداری سی پیدا کردی ہے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جس طرح انقلاب سے پہلے روس مشرق قریب کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا ویسے ہی اب بھی کرے گا۔ پہلے اس کا آلۂ کار روس کی فوجیں تھیں، اور اس کی سیاست میں ایک بے باکی تھی جس کی دہشت سے مخالف بےبس ہوجاتے تھے۔ یہ بے باکی بدستور موجود ہے، فوجیں بھی ہیں اور ان کے علاوہ انقلاب کا ایک پیغام ہے جو ان تمام لوگوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرسکتا ہے جو ملک کی معاشی یا سیاسی یا ذہنی حالت سے مطمئن نہیں ہیں انقلاب سے پہلے روسی مدبر اور سپہ سالار پیش قدمی کرتے تھے اور ان کے خلاف وہ تمام لوگ متحد کئے جاسکتے تھے جو غیروں کے تسلط کو غلامی اور ذلت سمجھتے تھے۔ برطانیہ روسی اقتدار کی توسیع کو اپنے لئے ایک بڑا خطرہ سمجھتا تھا

اور ایران اور افغانستان میں وہ آسانی کے ساتھ روس کے مقابلے پر لایا جاسکتا تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ مشرق قریب کے ہر ملک میں ایک انقلابی جماعت پیدا ہوسکتی ہے، روس سے اس کو مدد پہنچ سکتی ہے اور ایسی امداد ترقی کی تحریکوں کے بھیس میں پہنچ سکتی ہے۔ اب تک ترکی کے سوا یہ تمام ملک برطانیہ یا فرانس کے اثر میں تھے۔ ان دونوں نے ہر جگہ موجودہ سیاسی اور معاشی نظام کو قایم رکھا، اور ان طبقوں اور اشخاص کے ذریعے سے اپنا کام کیا جو پہلے سے حکومت کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی تسلط ہر جگہ رجعت پسندی کی پشت پناہ بن گیا، اور سیاسی اور معاشی اصلاح کا کوئی امکان نہیں رہا۔ برطانیہ اب بھی روس کے خلاف میدان میں آنے کو تیار ہے، لیکن جنگ کے واقعات نے مشرق قریب کے روشن خیال لوگوں کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ برطانیہ سے دوستی کرنا قدامت پرستی اور نااہلی کو گلے لگانا ہے اور وہ اس عافیت کے بدلے جو برطانیہ کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے ترقی کے تمام حوصلوں سے توبہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مشرق قریب اور مصر میں اب عام خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ روس سے بچنے کے لئے برطانیہ کا سہارا لینا صحیح نہیں ہے، ہر ملک کے لوگوں کو اپنے سیاسی اور معاشی نظام کی اصلاح کرنا چاہئے اور اس طرح نئی زندگی کے ولولوں کو تعمیری کاموں میں لگا کر ایسے انقلاب کے خطرے کو دور کر دینا چاہئے جس کا نتیجہ بد میں کی بدنظمی ہو۔ مگر یہ مصلحت کی باتیں جو لوگوں کے علم میں ہوتی ہیں لیکن عمل میں نہیں آتیں۔ باتیں وہ عقل کو گرویدہ کرلیں تب بھی دل کو نہیں گرما سکتی ہیں، پھر اس مصلحت اندیشی کے مقابلے پر وہ تمام اغراض اور عادتیں ہیں جو شخصی حکومت سے وابستہ ہوگئی ہیں۔ بادشاہ انقلاب سے ڈرتے ہیں مگر اس قدر نہیں کہ دولت اور اقتدار سے دست بردار ہوجائیں، اور انہیں راضی رکھ کر ملکی زندگی میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کر دینا کہ انقلاب کے شیدائیوں کا دل مطمئن اور خوشنود ہوجائے ہرگز ممکن نہیں۔ مصر میں جو فساد حال میں ہوا ہے اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ چاہتے ہیں کہ پرانے نظام کا طلسم ٹوٹے، حکومت ملک کو برطانوی اثر سے آزاد کرنے، صنعت و تجارت کو ترقی دینے اور بے روزگاری کو دور کرنے کے لئے جد و جہد کرے۔ حکومت کی کل اب تک بادشاہ کے چلانے سے چلتی ہے اور روکنے سے رک جاتی ہے۔ فساد بڑھا تو ممکن ہے ملوکیت کچھ وعدے کرلے۔ ایران میں فی الحال ایسے فساد کے آثار نہیں ہیں، مگر وہاں انقلاب کی تبلیغ کرنے والے بہت ہیں، اور روس کی تھوڑی سی فوج بھی ایرانی سرحد کے قریب ہوئی تو دیکھتے دیکھتے وہی سب کچھ ہوسکتا ہے جس سے خود مختاری کے حامی اپنی قوم کو بچانا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ مشرق قریب اور مصر میں موجودہ حالت زیادہ عرصے تک قایم نہیں رہ سکتی۔

مطبوعات موصولہ پر ایک نظر

۱۔ کتب

ہمارا قائد | از محمد احمد خاں صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) چھوٹی تقطیع، عمدہ جلد، اچھی طباعت و کتابت، صفحات ۲۷، قیمت عصہ، ملنے کا پتہ:۔ قائد ملت اکادمی فیل خانہ قدیم حیدر آباد دکن۔

قائد ملت مولوی محمد بہادر خاں صاحب (بہادر یار جنگ) کی سیاست سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اور یہ اختلاف نہایت شدید ہو سکتا ہے، لیکن اس بات سے غالباً سب اتفاق کریں گے کہ ان کی شخصیت نہایت دل کش اور دل آویز خصوصیات کی مالک تھی۔ لیکن ارباب قضا و قدر نے جواں سالی میں ان کی مائل بہ ترقی زندگی کو ختم کر کے ملک و قوم کو ان کی طاقت ور رہنما کی نتیجہ خیز رہنمائی سے محروم کر دیا۔

ملک کے بعض مفکرین کا ایمانداری کے ساتھ یہ خیال ہے کہ قائد ملت کی رہنمائی رجعت پسند تھی۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمیں اس کشمکش کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہئے جو قائد ملت کی زندگی میں برابر متزائد رفتار کے ساتھ جاری رہی اور جس کی موجودگی میں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ابتداءً قائد ملت ترقی پسند نہیں تھے تو یہ بات ہرگز بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد وہ ضرور ترقی پسند ہو جاتے۔

قائد ملت کا تعلق مملکت دکن کے جاگیرداروں کے طبقے سے تھا۔ اس طبقے کا مفاد قدرتی طور پر تحفظ پسندی اور قدامت پرستی کے ساتھ وابستہ ہے، اور اس کی زندگی میں وہ تمام خصوصیات نظر آتی ہیں جو دنیا میں ہر جگہ طبقہ امرا کی زندگی کے لوازمات ہیں۔ اس طبقے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے قائد ملت کو بھی قدامت پسند اور عیش پرست ہونا چاہئے تھا۔ لیکن انہوں نے اس زندگی پر قناعت نہیں کی۔ ان کے غیر معمولی مذہبی شغف نے انھیں ان برائیوں اور

لغزشوں سے بچایا جو اس طبقہ میں عام طور پر نظر آتی ہیں۔ اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں نے ان کو اپنے طبقہ کی اصلاح اور اس کے حقوق کے تحفظ کی طرف مائل کیا۔ غرض ان کی طبقہ واراہم تحفظ پسندی میں بھی ترقی پسندی شامل رہی اور انہوں نے اپنے طبقے کے افراد کے لئے ایک نہایت اچھا نمونہ چھوڑا جس کی پیروی کر کے وہ اپنے وجود کو شاید زیادہ پسندیدہ بنا سکیں گے۔

لیکن قائد ملت کا جذبۂ اصلاح اپنے طبقے کے تنگ دائرے کے اندر محدود نہیں رہ سکا ان کی سحر بیان خطابت اور اصلاحی جوش ایک زیادہ وسیع میدان کا متلاشی تھا۔ انہوں نے میلاد النبی کے جلسوں میں جس میں خواص، عوام مساوی طور پر شریک ہوتے تھے اپنی بےچین طبیعت کے لئے سکون کا سامان ڈھونڈا لیکن یہ دائرہ بھی انہیں تنگ نظر آیا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں حکومت حیدر آباد کے خلاف مذہبی بنیاد پر ایک نیم سیاسی شورش اٹھائی گئی۔ قائد ملت کی بے قرار طبیعت اس ہنگامہ کو سکون کے ساتھ نہ برداشت کر سکی۔ والی مملکت کی ذات کے ساتھ فرماں برداری، اپنے طبقے کے مفاد کے ساتھ ہمدردی، اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ قریبی تعلق۔ ان سب نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اس تحریک کی مخالفت میں رہنما کی حیثیت سے پیش قدمی کریں اور جب قائد ملت جیسی زبردست شخصیت نے اس قسم کا اقدام کیا تو اس کا حدود اعتدال سے متجاوز ہونا لازمی ہو گیا۔

بہر حال یہ ہنگامہ تو کسی نہ کسی طرح فرو ہو گیا لیکن قائد ملت کی بے چین طبیعت نچلی نہ بیٹھ سکی اب انہوں نے مملکت دکن سے باہر اپنے لئے میدان عمل تلاش کرنا شروع کیا۔ کچھ دن خاکسار تحریک کی طرف مائل رہے، بعد میں مسلم لیگ کے ممتاز اور سرگرم رکن بن گئے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس مقام پر بھی نہ رکیں گے اور ضرور آگے بڑھیں گے۔ لیکن موت نے اس ارتقا کو ختم کر کے ہمیشہ کے لئے ان کی زندگی کو اسی جگہ پر قایم کر دیا۔

"ہمارا قائد" اس جواں مرگ رہنما کی زندگی، سیرت و خدمات کا ایک مرقع ہے۔ اسے ان کے ایک عقیدت مند پیرو محمد احمد خاں صاحب نے مرتب کیا ہے۔ محمد احمد خاں صاحب حیدر آباد کے

مسلم نوجوانوں میں اپنے قول و عمل کے خلوص اور اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے ایک ممتاز مرتبے کے مالک ہیں۔ ان کی کتابیں معاشیات کے مختلف موضوعوں پر شایع ہو چکی ہیں۔ لیکن سوانح کے موضوع پر یہ کتاب لکھ کر انہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ایک نئے رُخ کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کا انداز بیان نہایت شگفتہ اور موقع و محل کے عین مطابق ہے۔ یہ کتاب قائد ملت کے واقعات زندگی کی صرف ایک مستند اور دلچسپ روئداد ہی نہیں ہے بلکہ ان کی تحریک کی ایک مخلص علمبردار کی طرف سے پُرجوش دعوت عزیمت بھی ہے۔ ہم اسے سیرت کی کتابوں میں ایک بیش بہا اضافہ سمجھتے ہیں، اور اس کے مطالعہ کی سفارش ان لوگوں سے بھی کرتے ہیں جو محمد احمد خاں صاحب اور قائد ملت کے خیالات اور ان کی تحریک سے پورے طور پر متفق نہیں ہیں کیونکہ ہم اپنے آپ کو بھی دراصل اُسی زمرہ میں سمجھتے ہیں۔

توافق للبقا از نعیم صاحب صدیقی۔ چھوٹی تقطیع۔ غیر مجلد۔ طباعت و کتابت اچھی صفحات ۶۹ قیمت ۱۰/ ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ حیدر آباد دکن۔

اس کتاب میں ڈارون کے نظریہ تنازع للبقا کی تردید کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نظریہ ارتقا ایک تجربی صداقت نہیں ہے۔ اس کتاب میں بہت سی پتے کی باتیں ہیں۔ لیکن تحقیقات کا جو حق ہے اسے پورا نہیں کیا گیا ہے۔ حیوانی اور انسانی دونوں زندگیوں میں غالباً تنازع للبقا اور توافق للبقا دونوں اصول سرگرم عمل ہیں، اور غلبہ ان انواع حیات میں جو باقی ہیں، بظاہر توافق للبقا ہی کو حاصل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان مباحث پر محققین نے زبردست مواد جمع کیا ہے۔ اس لئے بے لاگ تحقیقات اور بے تعصبی کے معنی یہ ہونا چاہئیں کہ مسئلے کے دونوں رُخ مناسب طریقے پر پیش کئے جائیں اور پھر اپنا فیصلہ دیا جائے۔ اس معیار پر مصنف کی کتاب پوری نہیں اُترتی۔

ہندوستانی موسیقی کی کشش از مسز رانی ساہوکار۔ چھوٹی تقطیع غیر مجلد، خوب صورت مصور ٹائٹل نہایت عمدہ، لکھائی اور چھپائی ۹۴ صفحے قیمت

عہ۔ ۱۲ آ ر۔ ملنے کا پتہ:۔ میسرز تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔

یہ تھیکر کی ہندوستانی زبانوں (اردو) کے سلسلے کی دوسری کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے ہندوستان کے نغموں کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے اہم ابواب یہ ہیں "ہندوستانی موسیقی کی سرگم"۔ نغمے کی بنیاد راگ پر ہے"۔ "تال"۔ "ہندوستانی موسیقی کے ساز"۔ "ہندوستانی موسیقی کی کشش"۔ کتاب کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔ کتاب میں چار رنگین تصویریں "راگ ہنڈول"۔ "راگ بسنت"۔ "راگنی ٹوڈی"۔ اور "راگ کدارا" کی بھی دی گئی ہیں۔ یہ موسیقی کی مستند کتاب ہے اور لایق مطالعہ ہے۔

نیا راگ جلد اول مرتبہ ذکیہ سلطانہ ساغر۔ چھوٹی تقطیع، غیر مجلد، خوبصورت، ٹائٹل نہایت عمدہ لکھائی اور چھپائی۔ ۱۰۳ صفحے قیمت عہ ۱۲ آ ر۔ ملنے کا پتہ:۔ میسرز تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ

یہ تھیکر کی ہندوستانی زبانوں (اردو) کے سلسلے کی چھٹی کتاب ہے۔ اس میں مرتبہ نے ماہنامہ ایشیا کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب شایع فرمایا ہے۔ اس میں حسرت موہانی۔ جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی۔ ساغر نظامی۔ ن۔ م۔ راشد اور دوسرے اردو شعرا کا منتخب کلام درج کیا گیا ہے۔ "ایشیا" کا بذاتِ خود انتخاب بہت اچھا ہوتا تھا اور ان میں سے مزید انتخاب کے بعد جو کلام شایع کیا گیا ہے وہ ظاہر ہے شراب دو آتشہ بن گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتبہ کی تصویر بھی دی گئی ہے۔

باغ نشاط از جناب دھرم رتن پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب گلشن۔ متوسط تقطیع خوبصورت جلد اور گرد پوش۔ نہایت پاکیزہ کتابت و طباعت ۴۰۷ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد۔

یہ گلشن صاحب کا مجموعہ کلام ہے جس کے لئے رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے تقریب، دیوان بہادر راجہ نراندر ناتھ نے پیش لفظ، نوح ناروی صاحب نے تعارف، خان بہادر سید ابو محمد صاحب ثاقب نے تبصرہ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے تنقید، پنڈت تربھون

ناقد صاحب آغا نے تقریظ۔ اختر ہاشمی صاحب نے "نذر عقیدت" ہادی مچھلی شہری صاحب نے "حدیث اخلاص"۔ شوق شاہجہانپوری صاحب نے "گلہائے رنگین"۔ اور آغا صاحب نے "تحفۂ ناچیز"۔ جائسی صاحب نے "باغ نشاط میں سرود قدسی"۔ شوق صاحب نے "حقیقت جذبات" اور کم سے کم نو صاحبان نے قطعات تاریخ لکھے ہیں۔

جس تصنیف کے بارے میں اتنے محترم حضرات رطب اللسان ہوں اس کا مزید تعارف کرنا سعی حاصل ہے۔ مختصراً اسقدر کہنا کافی ہوگا کہ گلشن صاحب کے کلام میں پختگی، سادگی، سلاست اور قدیم استادانہ رنگ بدرجۂ کمال موجود ہیں۔

باغ فردوس از جناب بیدل صاحب بی۔اے۔ ڈسٹرکٹ جج بیکانیر غیر مجلد متوسط تقطیع۔ کتابت طباعت بہت اچھی۔ صفحات ۱۶۴۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ۔ بیدل منزل۔ محلہ چونگران۔ بیکانیر۔ یہ جناب بیدل صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے

بیدل صاحب، بیخود صاحب دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کے کلام کے بارے میں بیخود صاحب دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ "انہوں نے کمال محنت وجانفشانی سے میری زبان، میرا بیان، میرا تخیل حاصل کرلیا ہے۔ اصناف سخن پر باحسن الوجوہ قدرت رکھتے ہیں۔"

مجموعۂ رباعیات وقطعات کلام فارسی از جناب مضطر صاحب ٹونکی۔ بہت چھوٹی تقطیع۔ عمدہ کتابت طباعت۔ مجلد۔ صفحات ۴۴ قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ:۔ مولانا مولوی حکیم صوفی محمد یونس محلہ رحیبن، ٹونک اسٹیٹ۔ راجپوتانہ۔

یہ مضطر صاحب کی رباعیات وقطعات کا مجموعہ ہے۔ ان کے کلام کا بقول دیباچہ نگار، وہی رنگ ہے جو قدما نے بہت کچھ چھوڑا ہے۔"

میرا نام ہے تعلیم! از نعیم صدیقی صاحب ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ چھلگوڑہ حیدرآباد دکن۔ یہ نئے طرز کا خیالاتی ڈرامہ ہے جس میں موجودہ نظام تعلیم کے مہلک اثرات، کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ بہت دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔ قیمت ۱۲ر صفحات ۳۶

گھروندے | از جناب عرش تیموری صاحب، مجلد مع گرد پوش، کتابت وطباعت معمولی صفحات ۲۴۲ قیمت عہ ناشر مکتبہ سلطانی بمبئی ۳

یہ عرش صاحب کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں سے کچھ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کئے جاچکے

رہس | از اویس احمد صاحب ادیب۔ مجلد مع گرد پوش۔ کتابت طباعت معمولی۔ صفحات ۲۱۲ قیمت عہ ناشر اردو پبلشنگ ہاؤس الہ آباد۔

یہ ادیب صاحب کے ان ڈراموں کا مجموعہ ہے جو ریڈیو پر نشر کئے جاچکے ہیں۔

۲۔ رسائل

معاشیات | ایڈیٹر جناب طفیل احمد خاں صاحب ایم۔ اے۔ یہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کا معاشی رسالہ ہے۔ معاشیات کی اہمیت اس زمانے میں جتنی زیادہ ہوتی جارہی ہے، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اردو زبان میں معاشیات کے موضوع پر عام فہم زبان میں لکھنے والوں کی کمی ہے، اس کمی کو دور کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو نے معاشیات کے نام سے یہ رسالہ نکالا ہے۔ دو رسالے جنوری اور فروری کے شایع ہوچکے ہیں۔ معاشیات کے ممتاز استادوں اور ماہروں نے اس رسالے کے لئے مضامین لکھنے کے وعدے کئے ہیں اور کچھ کے مضامین رسالے کے زیر نظر نمبروں میں شایع بھی کئے گئے ہیں رسالہ کی زبان عام طور پر سادہ سلیس اور عام فہم ہوتی ہے، اور مضمون شمار بلند ہوتا ہے اپنے مضامین اور اپنے طرز تحریر دونوں کے لحاظ سے اس رسالہ نے اردو صحافت کے لئے ایک نئے راستے کی داغ بیل ڈالی ہے۔

ساقی (سالنامہ) دہلی | ایڈیٹر شاہد احمد صاحب دہلوی
رسالہ ساقی نے اردو ادب کی اشاعت وترقی میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، زیر نظر رسالہ ان کا ایک مزید ثبوت فراہم کرتا ہے۔ رسالہ کے صفحات ۳۲۴ اور اس میں، ملک کے مشہور ادیبوں کے نہایت بلند پایہ افسانوں، ڈراموں

نظموں اور تنقیدی مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ قیمت سالنامہ ۳ ؎

ہمایوں (سالنامہ) لاہور ایڈیٹر میاں بشیر احمد صاحب

"ہمایوں" کا شمار ملک کے ان چند چوٹی کے رسالوں میں کیا جاتا ہے جو اپنے ادبی اور علمی مضامین کی بلند معیاری سے اردو ادب کی ایک دائمی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ زیرِ نظر رسالہ بھی اپنی پُرانی روایات کا حامل ہے۔ رسالے کی ضخامت ۲۴۴ صفحات ہے۔ قیمت سالگرہ نمبر ۱۲؎

ہندُستانی ادب حیدر آباد دکن (نیا سال نمبر) یہ رسالہ اردو زبان کے اصلاحی رجحانات کا حامل ہے۔ اس میں رسمِ خط کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے۔ سالانہ چندہ ۱۲؎

نظامِ ادب حیدر آباد دکن یہ طلبائے نظام کالج کا ششماہی رسالہ ہے۔ نومبر ۱۹۴۲ء کے رسالے میں اساتذہ اور طلبائے کالج اور باہر کے ممتاز حضرات کے قیمتی علمی و ادبی مضامین وغیرہ کو جمع کیا گیا ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے۔

نوا نشرگاہ حیدر آباد دکن کا پندرہ روزہ رسالہ ہے جس میں حیدر آباد کی نشرگاہ کے پروگرام کے ساتھ ساتھ ایک دو اچھے مضامین اور نظمیں بھی شایع کی جاتی ہیں۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔

"قرآنی دنیا" "مومنہ" یہ دو مذہبی ماہوار رسالے۔ ایک بالغوں اور بچوں کے لئے اور دوسرا عورتوں کے لئے۔ ابو محمد صالح صاحب کی ادارت میں حیدر آباد دکن سے شایع کئے جارہے ہیں۔ سالانہ چندہ پانچ پانچ روپئے ہے۔

خوناب

(کسی کے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے پر)

حسن اور عشق کے پُرکیف خیالوں میں مگن جھومتا گاتا ہوا میں بھی تھا سرگرمِ سفر
کوئی پیکر ہو، کوئی زلف، کوئی آنچل ہو چند لمحوں کے لئے تھے مرے مسجودِ نظر
ایک بے نام سی خواہش سے جو دل تھا بیتاب ایک انجانی سی تسکیں کو تڑپتا تھا جگر

ایک دورا ہے پہ کچھ اس طرح ملیں تم مجھ سے جیسے تم مجھ سے کبھی تھیں ہی نہیں بیگانہ
تم نے پھر اپنی محبت کا جلایا دیپک اور مجھے بخش دیا سوزِ دلِ پروانہ
میرے ساقی! تری بدمست نگاہوں کی قسم تیرے ہر گام پہ بنتا ہی رہا میخانہ

ایک منزل ہی پہ دم لے کے چلے تھے آگے اور ابھی دور بہت دور تھا ہم کو جانا
تم ہی تھیں اور نہ تمہارا تھا وہاں نقشِ قدم میں نے اک موڑ پہ جو تم کو پلٹ کے دیکھا
تم نے سوچا نہیں کیا مجھ پہ گزر جائے گی اور مجھے چھوڑ دیا زار و ملول و تنہا

تم کو جب ساتھ نہ دینا تھا مرا آخر تک توڑنا تھا نہ تمہیں میری جوانی پہ ستم
خیر اب ہوگی نہ دامن کو تمہارے زحمت اب ہمیشہ ہی رہیں گی مری آنکھیں پُرنم
یاد کو اپنی بنا دو جو سہارا دل کا حال پر ایک مسافر کے بڑا ہوگا کرم

سلیمان اریب

(R)

نیا زمانہ

(اڈیٹر :- قاضی عبدالغفار)

گذشتہ چند سال میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے اتنی کافی ترقی کرلی ہے کہ اس کی ترجمانی کے لئے متعدد رسائل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے مدنظر حیدرآباد سے ایک معیاری سہ ماہی رسالہ "نیا زمانہ" جاری کیا گیا ہے جسے بعض مشاہیر اہل قلم، مثلاً ڈاکٹر عبدالعلیم۔ پروفیسر احتشام حسین۔ کرشن چندر اور فضل الرحمن صاحب (حیدرآباد) کی علمی تائید حاصل ہے۔

اسکا پہلا شمارہ اواخر فروری میں شایع ہوگا۔ ہمیں توقع ہے کہ ملک کے وہ اہل قلم جنہیں اردو ادب اور خصوصاً ترقی پسند ادبی رجحانات سے ہمدردی ہے اس طرف توجہ کرکے جلد از جلد افسانے۔ مضامین اور نظمیں عنایت فرماکر اپنے مشوروں سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیں گے فقط

مینجر "نیا زمانہ" کرمی جاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب ۔ عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپئے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	۲۲ لاکھ ۴۴ ہزار ۶۰	۲۲۴۴۰۶۰
ادا شدہ سرمایہ	۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار	۱۲۵۰۰۰۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل آگ ، زندگی ، رسل و رسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات ، مزدوروں کا مالی معاوضہ ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے۔

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں :

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں ۔

لندن ، لاہور ، بمبئی ، حیدرآباد دکن ، احمد آباد ، کانپور ، پشاور ، راجکوٹ ۔ کراچی ، سیلون اور فلسطین

TETVN

نئی کتابیں

بادشاہ۔ میکیاولی کی کتاب پرنس کا ترجمہ [illegible] عہد نبوی میں نظام حکمرانی [illegible]

سجاد حیدر یلدرم

ہما خانم سجاد حیدر یلدرم کا نام اُردو ادب میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ مدتوں ان کے طرز نگارش کی تقلید کی گئی اور ان کی کتاب خیالستان کو پڑھا گیا اور سر دھنا گیا۔

"ہما خانم میر محمد حجازی کے ایک فارسی ناول کا ترجمہ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے قلم نے اس میں کچھ خوبیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ حجازی کے بانکپن اور یلدرم کی شوخی نے ہما خانم کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

خیالستان	[illegible]	جلال الدین خوارزم شاہ	۱۲ر	حکایات و احتساسات	[illegible]
ثالث بالخیر	۸ر	لیلیٰ مجنوں	[illegible]	جنگ و جدال	۱۲ر
آسیب الفت	۱۲ر	پرانا خواب	۱۰ر	زہرہ	۱۰ر
		پرانا خواب اور دیگر افسانے	[illegible]		

ماہِ نو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے "شِشو" کا ترجمہ۔ از جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی۔ ٹیگور فطرت انسانی کا باکمال مصور ہے خصوصاً بچوں کے حیات اور ان کے خیالات کی ایسی سچی تصویریں اُس نے کھینچی ہیں وہ اور کہیں نظر نہ آئیں گی۔ [illegible]

گیتان جلی	عہ	میرا لڑکپن	[illegible]	شاہی تاج	۸ر
کون کسی کا	[illegible]	پھول اور کلیاں	[illegible]	الجھن	[illegible]
کمودنی	[illegible]	چوکیدرالی	ے ر		

چند اور کتابیں

وقار حیات:۔ نواب وقار الملک کی سوانح عمری۔ مصنفہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی۔ قیمت [illegible]

حیات حافظ رحمت خاں:۔ روہیلوں کی مشہور تاریخ۔ قیمت ے ر

مناجات و نصائح:۔ خواجہ عبداللہ انصاری کا فارسی کلام جو جیبی سائز پر دو رنگ میں خوش نما چھپا ہے۔ [illegible]

As one nears the shores of America, coming from acro... Atlantic, one of the most inspiring sights is the Statue ... It not only serves as a cheering beacon to the mariner ... symbolises the hopes of millions of downtrodden huma... have left the Old World for the freedom of a new life i... clime—freedom from want, from fear and from oppres...

Of all freedoms, however, the greatest is the freedom ...se The healthiest—rich or poor—for want of this freedom are changed to sic...ased whose lives become useless to themselves and to the world. Freedom from ... is therefore the greatest freedom which everyone should strive for.

Cipla ...ies are devoting their full time ...tion to the production of high ...ugs and medicines for the relief ...d, thus striving for Freedom from ... In quality, efficacy and high ... of production of drugs and medi...

EQUAL TO WORLD'S BEST

جامعہ

زیرِ ادارت:۔ پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴۱ نمبر ۶	بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۶ عیسوی	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

طابع و ناشر:۔ پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) جید برقی پریس دہلی

ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم

(صدارتی خطبہ)

(ذیل میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کا وہ صدارتی خطبہ درج کیا جاتا ہے، جو صاحب موصوف نے نیو ایجوکیشنل فیلوشپ لاہور کے جلسے میں پڑھ کر سنایا تھا۔ (مدیر)

بھائیو! اور بہنو! سب سے پہلے، آپ کا شکریہ ادا کرنے سے بھی پہلے، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ عام دستور کے خلاف آپ کی خدمت میں یہ خطبہ اپنی مادری زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ ایسا کرنے پر معافی مانگ رہا ہوں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر کسی دوسری زبان میں آپ کو مخاطب کرتا تو عذر خواہ ہوتا۔ لیکن ہماری مجلسوں کے عام دستور نے صورت حال کو بالکل الٹا کر دیا ہے۔ انگریزی ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بن گئی ہے، وہ اسی میں پڑھتے ہیں، اسی میں لکھتے ہیں۔ اور اگر کبھی سوچتے ہیں تو شاید اسی میں سوچتے ہیں۔ جب اہل علم کی کسی مجلس میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو اپنے افکار انگریزی الفاظ ہی کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا، اس سے مجھے اس وقت بحث نہیں۔ اچھا ہوا یا برا، اس پر بھی کچھ عرض کرنا نہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں تعلیم کسی ایک چھوٹی سی ذات کے ساتھ مخصوص رہنے والی نہیں ہے۔ اگر اس ملک کے بسنے والے جانوروں کے گلّوں کی طرح نہیں بلکہ آدمیوں کی جمعیتوں کی طرح زندگی گذارنے پر مُصر ہیں، اگر یہاں کی حکومت کسی چھوٹے سے طاقت ور یا چالاک گروہ کا اجارہ نہیں بلکہ یہاں کے جمہور کی مرضی کے مطابق ہونے والی ہے، تو علمی زبان کے معاملے میں صورت حال بدلے گی اور جلد بدلے گی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں انگریزی زبان کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم نے انگریزی زبان کی معرفت بہت کچھ سیکھا ہے، جانتا ہوں، کہ بہت کچھ اس سے اور سیکھنا ہے۔ اس نے ہمارے خیالات کے جمود میں حرکت پیدا کی۔ اس نے ہمیں

مغرب کے علوم و فنون، صنعت و حرفت، تمدن و افکار سے آشنا کیا۔ اس نے سیاست اور معیشت کے نئے اسلوبوں سے ہمیں آگاہ کیا۔ اس کا ہم پر بڑا احسان ہے اور اس سے ابھی اور بہت کام لینا ہے کہ ہم میں اور مغربی تمدن میں یہی ایک واسطہ شاید عرصہ تک قایم رہنے والا ہے لیکن جہاں میں یہ سب جانتا ہوں، وہاں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم انگریزی جاننے والوں نے جو ایک نئی ذات اس ملک میں بنالی ہے، اس نے غیر شعوری خود غرضی سے ہر ذات کی طرح اپنے مخصوص فوائد کو اپنے تک محدود رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنے علم کو اپنے تفوق کا ذریعہ بنایا ہے۔ جو کچھا وہ سکھایا نہیں۔ خواص کو جو حاصل ہوا عوام تک نہیں پہنچایا گیا، اپنے کو سیراب کیا ہے اور قوم کو پیاسا رکھا ہے، اور چونکہ علم و حکمت کے خزانے بچانے سے گھٹتے ہیں اور لٹانے سے بڑھتے ہیں، اس لئے اس طبقے کی خود غرضی نے اسے بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی قوم کی حقیقی زندگی سے بے تعلقی نے انھیں اپنے دیس میں پردیسی بنا دیا۔ وطن میں جلا وطن کر دیا۔ ان کے افکار میں جودت پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کے کردار کو خلوص سے بہرہ یاب نہیں ہونے دیا۔ ان کی زبان کو مانگے کی گفتگوئیں اور ان کے دلوں کو مانگے کی آرزوئیں اقبال نے سچ کہا ہے ؎

برزبانش گفتگو ہا مستعار
در دل او آرزو ہا مستعار

خیر، یہ جو ہوا سو ہوا۔ ہمیں اب جلد سے جلد اسے بدلنا چاہئے۔ خصوصاً تعلیم کا کام کرنے والوں کو اس میں ذرا دیر نہ کرنی چاہئے۔ اپنی راہ سے ایک پردیسی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی مصیبت کو ہٹائیں۔ اور ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لئے جو کانفرنس یہاں جمع ہے اس کے ارکین کو تو جاننا چاہئے کہ ان کا سارا کام بچوں میں اور بچوں کے والدین کے ساتھ مادری زبان ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں یہ خطبہ دینے پر معافی مانگنا کچھ بہت ضروری تو نہیں ہے لیکن رسم و رواج کے مطالبے سخت ہوتے ہیں۔ ہماری علمی مجلسوں میں مادری زبان کو راہ ملنا ابھی نئی بات ہے میں آپ سے اجازت لئے بغیر اسے یہاں لے آیا ہوں۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں۔ اگرچہ اس قدر جواب

تھوڑا سا گلہ، اور تھوڑی سی تنبیہ ضرور شامل ہے۔

آپ نے معاف کر دیا ہو، اور یقین کرتا ہوں کہ آپ معاف کر ہی دیں گے، تو اب آگے چلوں سب سے پہلے آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس جلسے کی صدارت کے لئے آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ میں نیو ایجوکیشن فلوشپ کے کام سے ایک عرصے سے واقف ہوں اور اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اس فلوشپ نے دنیا کے مختلف ممالک میں تعلیم کے کام کرنے والوں کو نئی راہیں سجھائی ہیں۔ اس نے بچے کی انفرادیت کو سانچوں اور ٹھپوں میں دبانے سے بچانے کی کوشش کی ہے بچوں کی صلاحیتوں اور میلانوں کو ان کی تعلیم کی بنیاد بنانے پر زور دیا ہے۔ بچوں کے ذاتی شوق کے کاموں کی مدرسہ اور گھر میں ہمت افزائی کی ہے۔ آزادی میں ڈسپلن کے صحیح تصور کو عام کیا ہے تعلیم میں کھیل اور اجتماعی کام کی اہمیت کو جتایا ہے۔ اور سب سے اہم یہ کہ تعلیم کا کام کرنے والے استادوں کو ایک نئی امید بخشی ہے، اور ان میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا ہے۔ اور ایک بے روح سی انفرادی بیگار کو ایک پُر کیف جماعتی وظیفہ کا مرتبہ دلایا ہے۔ اس فیلوشپ کی کسی کانفرنس میں صدارت کا شرف میرے استحقاق سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن آپ کی محبت نے مجھے یہ شرف بخش دیا۔ دل سے شکر گزار ہوں۔

آپ اس مجلس میں ابتدائی تعلیم اور اس سے پہلے کی تعلیم دونوں کے متعلق غور و بحث کرنے والے ہیں۔ میں نے ابتدائی تعلیم کے مسائل پر سوچنے اور کام کرنے میں کچھ وقت ضرور صرف کیا ہے لیکن اس سے پہلے کی تعلیم کے متعلق اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ اس لئے ذاتی تجربے سے اس پر کچھ عرض نہیں کر سکوں گا۔ البتہ لازمی بنیادی تعلیم کی حمایت کی وجہ سے بعض احباب نے مجھ پر جو یہ شبہ کیا ہے کہ میں اس سے پہلے کی تعلیم و تربیت کو شاید کچھ اہمیت نہیں دیتا اور اس کے مسائل کو قابل توجہ نہیں سمجھتا، وہ درست نہیں ہے۔ انفرادی عملی زندگی میں ایک وقت میں ایک چیز کا اصول اکثر کارآمد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی دوسری سب چیزوں سے غفلت یا بے تعلقی نہیں ہوتے۔ بنیادی تعلیم کی ضرورت پر اسے مفت اور لازمی بنانے پر پچھلے چند سال میں یکساں طور پر ہر جگہ زور دیا جاتا رہا ہے اسکا مطلب ہرگز یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس بنیادی تعلیم کی منزل سے پہلے کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ کوئی خاص

اہمیت نہیں رکھتا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں ابتک اس ابتدائی عمر میں تربیت کے مسئلے کو زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ زندگی کی بعض بنیادی عادتوں کے بننے بگڑنے میں یہ زمانہ بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ چاہے جسمانی نشوونما کو دیکھئے کہ عمر کے پہلے ہی سال میں بچہ کا وزن پیدائش کے وقت سے کوئی تگنا ہو جاتا ہے اور پھر ساری عمر کبھی اس تیز نسبت سے نہیں بڑھتا یا پہلے ۱۸ مہینے میں دماغ کے وزن میں جتنا اضافہ ہوتا ہے پھر کبھی اتنی مدت میں اتنا نہیں ہوتا۔ نظام اعصابی اور حسّی اعضا کا بھی یہی حال ہے۔ بدن کے اس تیز بڑھاؤ کی وجہ سے ہی یہ زمانہ تندرستی کے لئے خطروں سے پُر زمانہ ہے۔ ہمارے ملک کا تو کہنا ہی کیا، یہاں کی فضا میں جو ہزار بچے پہلا سانس لیتے ہیں ان میں سے پونے دوسو کے قریب تو طفلی کی منزل سے آگے ہی نہیں بڑھ پاتے۔ دوسرے ممالک میں بھی جہاں زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے اور بچے زندگی کے دسترخوان پر ناخواندہ مہمان کی حیثیت نہیں رکھتے وہاں بھی یہ خطرے ننھی ننھی جانوں کو انگیز نے پڑتے ہیں۔ امریکہ میں بھی ساری اموات کا ایک تہائی ۶ سال سے کم عمر والوں کے حصّہ میں آتا ہے۔ انگلستان میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۸۰ سے ۹۰ فیصدی بچے تندرست پیدا ہوتے ہیں مگر جب ۵ سال کی عمر میں مدرسہ جاتے ہیں اور وہاں طبّی معائنہ ہوتا ہے تو ایک تہائی سے زیادہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ کہیں غذا کی وجہ سے، چاہے کمی سے، چاہے زیادتی سے، کہیں متعدی امراض کے نتیجہ کے طور پر، کہیں گھر کے مضرِ صحت طبیعی ماحول کی بدولت، کہیں گھر کی نفسیاتی الجھنوں کے کھینچ تان کے اثر سے۔ اور جہاں ان حالات کو بدلا گیا ہے وہاں یہ صورت بھی بدل جاتی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اچھی تربیت گاہوں میں جا کر بچوں کی صحتیں درست ہو جاتی ہیں، بیماریاں بھاگ جاتی ہیں۔ دانتوں کی حالت بہتر ہو جاتی ہے، اور بچوں کے مقابلے میں قد اور وزن تیزی سے بڑھتا ہے پھر یہی نہیں کہ یہ زمانہ بچہ کی جسمانی نشوونما ہی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہو سیکھنے کی رفتار بھی جسمانی بڑھاؤ کی رفتار سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ اسی زمانہ میں بچہ حواس کا استعمال سیکھتا ہے، ان کی مدد سے اپنے ماحول کی پہچان حاصل کرتا ہے۔ جسم کے پٹھوں پر قابو حاصل کرتا ہے۔ حسّی اور حرکتی تجربہ میں تطابق پیدا کرتا ہے۔ چلنا سیکھتا ہے، بولنا سیکھتا ہے۔ ۲½-۳ سال کی عمر میں اپنی مادری زبان کو کام چلانے کے لائق سیکھ چکتا ہے، چیزوں کے روابط باہمی کا ادراک اسے ہونے لگتا ہے۔ تعقل کی راہ پر اسی عمر میں گامزنی شروع کر چکتا ہے اور تجربے

جذباتی پہلو میں تو اس کے نشوونما کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے کہ جاننے والے کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں اس کی سیرت کی بنیادیں پڑ سکتی ہیں۔ زندگی کا اور کونسا زمانہ اتنی اور ایسی بنیادی اہمیت رکھنے والی تفصیلات سے پُر ہوگا؟

نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہماری قومی زندگی کی تشکیل اور تنظیم کے ذمہ دار واقعی اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو انھیں اس عمر کے بچوں کی تربیت کو پہلے سے زیادہ اپنے منصوبوں میں جگہ دینی ہوگی۔ میں نہیں جانتا کہ بنیادی تعلیم ۶ سال کی عمر سے لازمی کی جائے گی جیسا کہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی تجویز ہے، یا ۷ سال کی عمر سے جیسا کہ بنیادی قومی تعلیم کی تجویز کا مطالبہ ہے، بہرحال ۲ سے ۵ یا جو عمر آپ کی کانفرنس غور و بحث کے بعد طے کرے) ۶ یا ۷ سال کی عمر تک بچوں کی دیکھ بھال، طبی جانچ اور مناسب علاج، ان کے لئے کھلی ہوا میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ دن کا ایک معتد بہ حصہ گذارنے کا انتظام، اس عمر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو جاننے والوں کی مشفقانہ نگرانی میں صحت اور صفائی کی، میل جول کی زندگی کی، اپنے ننھے ننھے پیروں پر کھڑے ہوسکنے کی، دوسرے ننھے اور نازک ساتھیوں کو سہارا دینے کی، انفرادی اور اجتماعی عادتیں پیدا کرنے کا اہتمام ضرور کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں اس عمر کے بچوں کو بالک باڑیوں اور ننھوں کی تربیت گاہوں میں بھیجنا ابھی والدین پر لازم تو نہیں کرنا چاہئے لیکن بچوں کی بڑی تعداد کے لئے، خصوصاً جہاں گھر معاشی یا دوسری مجبوریوں کی وجہ سے اپنا فرض انجام نہیں دے سکتا، ان تربیت گاہوں کا انتظام حکومت کی طرف سے ضرور ہونا چاہئے۔ غیر سرکاری انتظام میں ایسی تربیت گاہیں کھولی جائیں تو فیاضی سے ان کی مدد حکومت کا فرض ہے۔ اتنی چھوٹی عمر کے بچوں کو گھر سے علیحدہ کرنا بہت نئی سی بات ہے، اور بہت سے گھر شاید اپنا فرض آپ انجام دینے کے قابل بھی ہوں، اس لئے فی الحال اگر اس عمر کے بچوں میں دس میں دو ان تربیت گاہوں میں لے آئے جائیں تو حساب کے اعتبار سے تو کم ہی ہے مگر عملی لحاظ سے کافی ہوگا ان کے لئے علیحدہ تربیت گاہیں کھول کر یا بنیادی مدرسوں کے ساتھ ان چھوٹے بچوں کے لئے علیحدہ خاص انتظام کرکے حکومت اپنے فرض سے سبکدوش ہوسکتی ہے، بشرطیکہ مدرسہ کے اس حصہ کی دیکھ بھال کے لئے الگ تربیت یافتہ استاد بلکہ استانیاں فراہم کی جائیں اور بچوں کو صاف کھلی ہوا میں ایک اچھے

باغیچے کے اندر، گھر سے بہتر ماحول میں رکھنے کا انتظام ہو سکے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ننھے بچوں کی یہ تربیت گاہیں، یا بالک باڑیاں اس لئے درکار ہیں کہ بہتیرے بچوں کو اچھا گھر نصیب نہیں۔ افلاس اور جہالت ہمارے دیس کے بچوں کو اکثر گھر کی حقیقی نعمتوں سے محروم رکھتے ہیں۔ اس لئے بھی ان تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اگر گھر وہ سب کچھ ہو جو اسے ہونا چاہئے تب بھی وہ سب کچھ فراہم نہیں کر سکتا جس کا مطالبہ ننھے بچے کی نشوونما اور تیزی سے نت نئی شکلیں اختیار کرنے والی طبیعت کرتی ہے۔ اس لئے ان نئی تربیت گاہوں کے بناتے وقت یہ بات سامنے رکھنی چاہئے کہ یہ گھر کا بدل بھی ہیں اور گھر کی کمیوں کو پورا کرنے والے بھی۔ بچے کی تربیت میں گھر کا وہ اثر ہے کہ اگر ان تربیت گاہوں نے گھر سے اپنا رشتہ مضبوط نہ کیا تو یہ اپنا کام کبھی خوبی سے انجام نہ دے پائیں گے۔ ایک طرف ماں کی واقفیت سے کام لینا ہوگا، اور دوسری طرف ماں کو بچے کی خدمت کی راہیں سُجھانی اور سمجھانی ہونگی اس کا کچھ بوجھ اپنے کندھوں پر لینا ہوگا تاکہ جو بوجھ اس کے ذمہ رہے وہ اسے زیادہ خوبی سے اٹھا سکے۔ ان تربیت گاہوں کو طبی معائنہ کا انتظام کرنا ہوگا اور وہ طبی امداد پہنچانی ہوگی جس کی بچہ کو ضرورت رہتی ہے۔ انھیں بچہ میں اچھی عادتیں ڈالنی ہوں گی اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں وہ عمر کے تقاضوں کے اعتبار سے وہ سیکھ سکیں جو فطرت چاہتی ہے کہ وہ سیکھ جائیں۔ وہاں طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کرنا ہوگا۔ تعمیری بھی، تخلیقی بھی تخیّلی بھی، اور بچے کو اپنی بدنی نشوونما کے لئے جس عمل اور حرکت کی ضرورت ہے اس کے مواقع بھی فراہم کرنے ہوں گے یا آس پاس کی چیزوں کے خواص سے آگاہی کا سامان کرنا ہوگا، ان کے برتنے میں جو ہنرمندی درکار ہے اس کی بنیاد ڈالنی ہوگی؛ اور بات چیت کرنے، اپنے ساتھیوں سے اور اپنے بڑوں سے اپنی کہنے اور ان کی سمجھنے کا خوگر بنانا ہوگا۔ پھر ۲۔۳ سال کی عمر ہی سے بچے کو ساتھیوں کی تلاش ہوتی ہے، خالی ماں کی رفاقت کافی نہیں ہوتی وہ اپنے ارد گرد اور بچے چاہتا ہے، ان سے سہارا لینا، انہیں سہارا دینا چاہتا ہے اور جماعتی زندگی کا تمدن آفرین بنیادی لین دین شروع ہو جاتا ہے، اس لئے بچے کو دوسرے بچوں کی

صحبت اور رفاقت ملنی چاہئے اور یہ چیز تربیت گاہیں اکثر گھروں سے زیادہ خوبی سے فراہم کرسکتی ہیں۔ البتہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ساتھیوں کا یہ طبقہ کہیں بہت بڑا نہ ہوجائے۔ جب رفیق بہت زیادہ ہوجائیں تو وہ بھائی بہن نہیں رہتے انبوہ بن جاتے ہیں جس میں بچہ کھو سا جاتا ہے اور جس سے اُسے کبھی کوئی داخلی لگاؤ پیدا نہیں ہو پاتا۔ وہ اس انبوہ میں یا تو اندر کو کھنچ جاتا ہے، شرمیلا اور جھینپو بن جاتا ہے یا پھر لڑتا جھگڑتا ہے اور ہر ایک پر دھونس جمانے کی کوشش کرتا ہے، یا دب جاتا ہے، یا دبانا چاہتا ہے۔ تعداد کے بڑھانے میں ننھے بچوں کے لئے متعدی امراض کا خطرہ بھی سخت خطرہ ہے اس لئے تعداد کو کم ہی رکھنا ٹھیک ہے۔ اور اس کا خیال اس وجہ سے اور بھی ضروری ہے کہ ہم کہیں اپنی مالی دشواریوں کے پیشِ نظر یا کام کو جلد جلد پھیلانے کی خاطر یہ نہ کر بیٹھیں کہ ان تربیت گاہوں میں بہت بہت سے بچوں کو یک جا کردیں۔ میری رائے میں تو ایک تربیت گاہ میں ۳۰۔ ۴۰ سے زیادہ بچے نہیں ہونے چاہئیں۔

ان نئی تربیت گاہوں کو اگر واقعی گھر کا نعم البدل اور گھر کی کمیوں کا پورا کرنے والا بننا ہے تو اس کی عمارت، اس کے باغیچے، اس کے کھیل کے انتظام، اس میں کھانا تیار کرنے اور کھانا کھلانے کا ستھرا اہتمام، اس میں بچوں کے پالتو جانوروں کی گنجائش، بچوں کے لئے صفائی اور طہارت کے مواقع، ان کے لئے نیچے اور ہلکے ساز و سامان۔ غرض بہت سی باتوں کو سامنے رکھ کر ہر چیز کی جگہ نکالنی ہوگی۔ ہمارے ملک میں ابھی تعلیمی عمارتوں میں تعلیمی ضرورتوں کا خیال ذرا کم ہی رکھا جاتا ہے، ہر قسم کی عمارت ہر قسم کے کام میں لائی جاسکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ملک کے اچھے ماہرین تعمیرات اور ماہرین تعلیمات باہمی مشورہ سے ان تربیت گاہوں کے لئے نمونے کے نقشے بنائیں جنھیں مقامی خصوصیات کے پیشِ نظر کچھ بدل کر ہر جگہ کام میں لایا جاسکے۔ برطانیہ کی نرسری اسکول ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کے پارلیمنٹ میں پاس ہونے سے پہلے ہی اپنی ایک کمیٹی بٹھادی تھی جس نے برطانیہ کے حالات سامنے رکھکر ایک رپورٹ بھی شائع کردی ہے جس میں ان نئی تربیت گاہوں کے لئے جو اس قانون کے تحت سارے ملک میں بنیں گی

مکانات اور ساز و سامان سے متعلق تمام ضروری امور پر ماہرین کے مشوروں کا خلاصہ درج کر دیا ہے تاکہ ہم بھی اپنے کاموں میں اس پیش بینی کا ثبوت دے سکیں۔ کیوں نہ آپ کی فیلوشپ اس قسم کے کام اپنے ذمے لے لے؟

آپ کی کانفرنس کے سامنے دوسرا بحث طلب مسئلہ ابتدائی تعلیم کا ہے، جسے اب کل ملک کی تعلیمی اصطلاح میں بنیادی تعلیم کہنے لگے ہیں۔ یہ ۵-۶ سال سے اوپر کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ اس عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں میں سے کچھ کی تعلیم تو ہمیشہ جیسی تیسی ہوتی ہی رہی ہے، لیکن جب تک تعلیم کا یہ کام نجی کام رہتا ہے بچوں کے سرپرست اپنی مرضی اور بچے سے متعلق اپنے منصوبوں کے پیش نظر جس قسم کی اور جتنی تعلیم کا انتظام چاہتے ہیں کرتے ہیں، یا استاد اپنی مرضی سے شاگرد کو جو چاہتا ہے سکھاتا ہے اور جیسا چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس لئے تعلیم کے مقاصد اور اس کے طریقے کار کے متعلق بہت اختلاف رہتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے راہی اتنی راہیں۔ لیکن جب تعلیم جماعت کا وظیفہ بن جاتی ہے تو جماعت قدرتی طور پر ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ تعلیم سے متعلم کو اپنا کارآمد بنائے۔ اس کارآمد بنانے میں جماعت کی طرف سے بڑی زیادتیاں ہو سکتی ہیں اور برابر ہوتی رہتی ہیں۔ کارآمد بنانے کی خاطر آدمیت کے حق چھین لئے جاتے ہیں۔ سانچوں میں کس کر ہر انفرادی خصوصیت کا جھول مٹا دیا جاتا ہے اور ایک سے ترشے ترشائے ڈھلے ڈھلائے شہری بنانے کی خواہش کو بے روک ٹوک پورا کیا جاتا ہے۔ پر اگر جماعت کا نظام جمہوری ہو تو چونکہ جمہوریت انسان کی بہ حیثیت انسان قدر کرتی ہے، اس لئے اس کی انفرادیت کا پاس کرنے پر بھی مجبور ہوتی ہے۔ مگر کارآمد آدمی تو اسے بھی درکار ہوتے ہیں بلکہ اس کا تو وجود ہی اپنے شہریوں کی صحیح تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسرے اگر اپنے لئے کارآمد اور مطیع رعایا بنانے کی فکر میں رہتے ہیں تو اسے اپنے حقیقی آقاؤں کی تربیت کا کام انجام دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں بھی جمہوری سیاسی ادارے فروغ پاتے ہیں تعلیم کو عام کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مفت انتظام کرنا ہوتا ہے اور چونکہ معاملہ جماعت کے اچھی یا بری جماعت بننے کا ہوتا ہے بلکہ اس کی موت و زیست کا ہوتا ہے اس لئے تعلیم کو بحث و اتفاق پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ لازمی [illegible] کرنا ہوتا ہے ہمارے

ملک میں بھی جوں جوں سیاسی ارتقا جمہوریت کی طرف بڑھتا ہے تعلیمی مسئلہ جماعتی زندگی کا اہم ترین مسئلہ بنتا گیا ہے۔ اور اس وقت کہ ہم آزاد جمہوری حکومت سے بہت قریب ہیں۔ چاہے ایک متحدہ ہندوستان میں چاہے علیحدہ علیحدہ پاکستان اور ہندوستان میں، اس لئے اس بات پر شاید سب ہی متفق ہوں گے کہ ہمیں اتنی مدت کے لئے جتنی جماعتی مقاصد کے پیش نظر ضروری نظر آئے اپنے تمام لڑکے لڑکیوں کے لئے عام اور مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بھی سب کو اتفاق ہوگا کہ یہ مدت اگر ۴ یا ۵ ہی سال کی ہوئی تو کام نہ چلے گا اور خود مختاری اور جمہوری آزادی کا بوجھ اٹھانے والے شہریوں کی تیاری کے لئے فی الحال کم سے کم ۷ یا ۸ سال کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا اور آگے چل کر اس مدت کو شاید اور بڑھانا پڑے۔

لیکن یہ چیزیں جن پر میں نے کہا ہے کہ اتفاق ہے، بس خارجی ڈھانچے ہیں، اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ تعلیم ہو کیسی؟ اس کے جواب کا سوچنا اور اسے صحت سے برابر قریب تر لانے کی کوشش جمہوری جماعت میں یوں تو سب کا کام ہے مگر خصوصیت کے ساتھ اس کے تعلیمی کام کرنے والوں کا فرض ہے ہمیں اس کانفرنس میں بھی اس پر ضرور غور کرنا چاہئے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ہم یا جماعت کے اغراض کو پہلی جگہ دے سکتے ہیں یا فرد کی تعلیم پذیری کے امکانات کو۔ جماعت کی طرف سے تعلیم کا انتظام ہو تو اس کی غایت جماعت کا استحکام اور اس کی ترقی ہو تو آسانی سے یہ ہو سکتا ہے کہ ہم جماعت کی ضرورتوں ہی کو سامنے رکھ کر اس سوال کا جواب دے دیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس میں بڑے خطرے ہیں۔ جمہوری جماعت بھی کوتاہ اندیشی سے بالکل پاک نہیں ہوتی۔ باوجود انفرادیت کے احترام کے دعوؤں کے جماعتی زندگی کی ضرورتیں عملاً اس انفرادیت کا انکار کرا سکتی ہیں اور جمہوری تعلیمی نظام بھی آمری نظاموں کی طرح انسان کی انسانیت کو فنا کر کے اپنے شہریوں میں مشینوں کی سی کارکردگی پیدا کرنے کی تدبیریں کر سکتا ہے۔ وقتی فائدوں کے لئے مستقل مقاصد کو پس پشت ڈال سکتا ہے۔ حال پہ مستقبل کو، دنیا پہ آخرت کو قربان کر سکتا ہے۔ اس لئے صحیح راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم فرد کے نقطہ نظر سے بھی تعلیم کی ماہیت پر غور کریں اور جماعت کے نقطۂ نظر سے بھی اور دیکھیں کہ اگر دونوں میں کوئی تضاد ہے تو وہ کیسے حل ہو

اگر نہ ہو تو ایسی صورت کو اختیار کیا جائے۔

تعلیم کے عمل میں فرد اور جماعت کے درمیان پہلے دن سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ تعلیم کا کام کرنے والے ہیں، آپ سے تو یہ پوشیدہ نہ ہوگا کہ تعلیم یعنی واقعی ذہنی تربیت کیسے ہوتی ہے۔ جب ذہن بھی اپنی نمو کے لئے جسم کی طرح غذا چاہتا ہے۔ یہ غذا اسے کہاں ملتی ہے؟ جماعت کے تمدن سے۔ اس کی مادی اور غیر مادی تحصیلات سے۔ اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے، اس کی صنعت و دستکاری سے، اس کے نظام اخلاق سے، اس کے رسم و رواج سے، اس کی سماجی زندگی کے نمونوں سے، اس کے گانوں سے، قصبوں، شہروں کی تنظیمات سے، اس کی موسیقی سے، اس کی مصوری سے، اس کی تعمیرات سے، اس کے کالجوں سے، اس کے کارخانوں سے، اس کی حکومت کے انتظامات سے، اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے۔ غرض اس کی رنگارنگ تخلیقات سے۔

جماعتی تمدن کی یہ ساری مادی اور غیر مادی چیزیں جو نشو نما پذیر دماغ کے لئے غذا کا کام دیتی ہیں۔ خود بھی کسی نہ کسی ذہن انسانی ہی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں یہ روپ لیا ہے، کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں اپنی توانائی کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں انسانی ذہنوں کی بصیرتیں اور آرزوئیں اور کاوشیں ہی تو مضمر ہیں۔ یہ سب کسی متاع ذہنی رکھنے والے کا چھپا خزینہ ہیں، یا کسی سر شوریدہ کی بالین آسایش۔ غرض سب ذہن انسانی کی رہین منت ہیں اور اس لئے سب کی اپنی اپنی ذہنی ساخت ہے۔

جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کی چھپی ہوئی قوتیں آشکار ہوتی ہیں۔ ان میں سوئی ہوئی توانیاں اس نئے ذہن میں جاکر بیدار ہوتی ہیں۔ اس کے لئے یہ دفینے اپنا منہ کھول دیتے ہیں اور پُرسکون بالینوں سے اس کے لئے پھر شور ہائے و ہو اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر تربیت خواہ ذہن کے لئے ہر چھوٹی چیز اپنی مخفی قوتیں پیش نہیں کرتی۔ جسمانی غذاؤں کی طرح ذہنی غذائیں بھی سب کو ایک ہی سی نہیں راس آتیں۔ کسی کو کوئی بھاتی ہے کسی کو کوئی۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ ہر ذہن کو وہی چیز بھاتی ہے جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو۔ یہی تعلیم کا بنیادی گر ہے اس کو بھولنا یا اس کے خلاف چلنا ایسا ہے جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت

دینے کی کوشش جس دماغ کی ساخت ادبی کاوشوں کے نتیجوں سے مطابق ہوا سے صنعتی اشیاء تمدن سے
جس کی ساخت عملی اور نظری چیزوں سے مناسبت رکھتی ہوئے علمی چیزوں سے تعلیم دینا، یا اُس کے
برعکس تعلیم کی اہمیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اصلی ذہنی تربیت کے دروازوں کو بند
کرکے آدمیوں کو طوطوں اور سرکس کے جانوروں کا مرتبہ دینا ہے۔

اچھا تو اس اصول کا تقاضا ۷-۱۰ سال کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے لئے کیا ہے؟ اگر ایسا ہو کہ
ہر لڑکے لڑکی کی تربیت ذہنی الگ الگ تمدنی اشیا ہی سے ہوسکتی تو پھر کسی عام نظام کے بنانے کی
دشواریاں ناممکن کی سرحد تک پہنچ جاتیں عمومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کی خوش بختی ہے کہ اس عمر میں
تفریق ذہنی پیدا ہونے سے پہلے عملی رجحان بچوں میں بہت عام بلکہ یوں کہئے کہ عالم گیر ہوتا ہے۔ اس عمر
میں بچے چاہتے ہیں کہ کچھ بنائیں بگاڑیں، توڑیں جوڑیں۔ ان کے ہاتھ کام کے لئے بے چین ہوتے ہیں
ان کی تربیت ذہنی کے لئے اس عمر میں فطرت کا منصوبہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھوں کی مدد سے سوچیں
چیزوں کو برت کر پہچانیں اور کام کرکے سیکھیں۔ یہ بڑی ہی [illegible] ہے۔ ہم اس عمر کے بچوں کے لئے ذہنی تربیت
کے اس امکان کو یعنی عملی کام کو ان کی تعلیم میں جگہ نہیں دیتے، اور فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرا کر اپنی من مانی
تدبیروں سے اصلی تربیت کی جگہ خالی طمع کاری پر زور دیتے رہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں دو رائی
کی ذرا گنجائش نہیں ہے کہ اس منزل میں عملی کام کو تعلیمی سعی کا مرکز بنانا چاہئے۔

تعلیم پانے والے اور ذریعہ تعلیم میں مطابقت کے علاوہ اس منزل میں ہاتھ کا کام خود ذہنی کام کی،
ذہنی ورزش، اور ذہنی ورزش سے ذہنی نمو کی مفید ترین شکل ہے۔ اس کے ذریعہ جو ہنرمندی اور جو واقفیت
پیدا ہوتی ہے وہ ذہن کو جلا دیتی ہے، جو خالی کتابوں سے حاصل ہو وہ اکثر و بیشتر اس غرض کے لئے بیکار
ثابت ہوتی ہے۔ ہم تعلیم کا کام کرنے والوں کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہر ہنرمندی اور ہر واقفیت ذہنی
تربیت کی وجہ نہیں ہوتی نہ اس کی علامت ہے، نہ اس کا پیمانہ۔ واقفیت بھی دو طرح کی ہوتی ہے اور
ہنرمندی بھی دو طرح کی، ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جس کے لئے دوسرے کام کرتے ہیں ہمیں بیٹھے
بٹھائے مل جاتی ہے۔ خبر کی حیثیت سے۔ ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے

حاصل ہوتی ہے۔ جو نہ ذہن بنتی، نہ ذہن کو روشن کرتی، اس میں تفکر پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح ہنرمندی، میکانکی ہنرمندی ہوتی ہے۔ اس میں سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں، مشقت درکار ہے، کچھ پہلے سے مقرر ہے اس کی تکرار کرنی ہے، پہلے سے کچھ دوسرے نے معین کر دیا ہے اسے پیدا کرتی ہے۔ ایک ہنرمندی میکانکی نہیں ہوتی، ذاتی صلاحیت کی بنا پر نئی اقدار پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے تخلیقی ہنرمندی کہہ سکتے ہیں۔ روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے فیض، اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے نہ روح کو بالیدگی۔ اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لئے ایک خوشنما پردہ ہوتا ہے، یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔ آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربہ سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار، ذہن کو تربیت دیتا ہے۔ روح کو روشن کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشا جاتا ہے۔ یہی حال میکانکی ہنرمندی کے مقابلے میں تخلیقی ہنرمندی کا ہے۔ حقیقی تعلیم یعنی ذہن کی سچی تربیت تجربہ والے علم اور تخلیقی ہنرمندی سے ہوتی ہے۔ تجربہ والے علم اور تخلیقی ہنرمندی دونوں کی خاطر اپنے بنیادی مدرسوں میں ہاتھ کے کام کو داخل کرنا اور اس سے صحیح تعلیمی کام لینا ضروری ہے۔

اس مطالبہ سے بعض لوگ جھٹ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ پھر خبری کتابی علم اور میکانکی ہنرمندی کے لئے مدرسہ میں کوئی جگہ ہی نہ ہونی چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ ذرا عجلت کرتے ہیں اور اصولوں کو زندگی کا خادم نہیں بناتے بلکہ زندگی کو نام نہاد اصولوں کا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ یا ایک صحیح بات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کر کے اُسے مہمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ نہ ہر تخلیقی کام لازماً تعلیمی کام ہوتا ہے نہ ہر میکانکی کام کو تعلیم گاہ سے دیس نکالا دینا ہی لازمی ہے۔ نہ ہر تجربی علم تعلیم ہے، نہ ہی سب کتابوں کو سپرد آتش کرنا ضروری۔ ذرا تامل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمی اعتبار سے بارآور کام وہ ہوتا ہے جس میں پہلے کام کرنے والے کو مسئلہ کا واضح احساس ہو، وہ اپنے کام کا ذہنی خاکہ بنائے، اس کے وسائل سوچے، کام کی ممکن راہوں میں سے کسی ایک کو بوجوہ منتخب کرے پھر اس کام کو کر گذرے۔ کرنے کے بعد اپنے ابتدائی منصوبے اور خاکہ کو سامنے رکھ کر اسے جانچے۔ اس کی خوبی پر خوش ہو، اس کی غلطیوں سے سبق لے اور آئندہ بہتر طریق پر اسے انجام دینے کے لئے آمادہ ہو۔ تعلیمی کام میں یہ منزلیں

ضروری ہیں، یہی اس کام کو تربیتی صفت بخشتی ہیں۔ خبری علم اور میکانکی کام میں یہ منزلیں نہیں ہوتیں، اس لئے وہ صحیح تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہیں بن سکتے لیکن پھر بھی تعلیمی کام میں ان دونوں کے لئے جگہ ہے اور بعض اعتبار سے بڑی اہم جگہ۔ ہوتا یہ ہے حقیقی تعلیمی کام کے سلسلے میں کام کرنے والوں کو بہت سی ایسی واقفیت درکار ہوتی ہے جسے سب کو اگر وہ تجربہ ہی سے حاصل کرنا چاہے تو عمر بیت جائے۔ بہت سے تخلیقی تعلیمی کاموں میں ایسی ہنرمندیوں کی ضرورت پڑتی ہے کہ اگر وہ پہلے سے حاصل کرکے میکانکی طور پر کام میں نہ لائی جاسکیں تو یہ منصوبہ پورا ہی نہ ہوسکے۔ ایسی صورتوں میں میکانکی مہارت اور خبری علم تجربہ اور تخلیق کے منصوبوں میں مددگار کی حیثیت سے شامل ہوجاتے ہیں اور ان کی حیات پرور صحبت میں ان کی مردنی بھی زندگی کی معین ہوکر انھیں زندگی بخش دیتی ہے۔

تعلیمی کام کی جو خصوصی منزلیں میں نے اوپر بیان کیں وہ خالص ذہنی کام میں بھی ہوسکتی ہیں۔ اخلاقی فیصلوں میں بھی، ادبی کاوشوں میں بھی، اور ہاتھ کے عملی کام میں بھی۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن ادنیٰ تامل سے واضح ہوجائے گا کہ ہاتھ کے کام میں یہ منزلیں بہت وضاحت سے کام کرنے والے کے سامنے آسکتی ہیں۔ اس لئے اگر ہم تجربی علم اور تخلیقی ہنرمندی کو حقیقی تعلیم مانیں تو تو اپنے ان بنیادی مدرسوں میں ہاتھ کے کام سے یہ تربیتی خدمت لینے کی تدبیر کرنا اور بھی ضروری ہے۔

یہ جو عمل تعلیم کی ماہیت، تعلیمی کام، تجربی علم اور تخلیقی ہنرمندی کی تربیتی قوت کے تقاضوں سے ہم فرد کی پوری ذہنی نشوونما کی خاطر ہاتھ کے کام کو بنیادی مدرسوں میں رواج دینا چاہتے ہیں حسن اتفاق دیکھئے کہ جماعت کے مفاد کا مطالبہ بھی یہی ہے جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنی زندگی کا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے اس کی تعلیم گاہیں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا، کہاں کی دانشمندی ہے۔ سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سواد اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔ کہیں اور یہ جائز ہو کہ نہ ہو لیکن ایک جمہوری جماعت میں تو یہ ایک ناقابل تصور اقدام ہے۔ ہاتھ کے کام کو مدرسے میں جگہ دے کر یہ جمہوری جماعت دراصل وہ کام انجام دے گی جو اس کا پہلا تعلیمی مقصد ہوسکتا ہے، یعنی کارآمد شہری پیدا کرنا اور اس طرح پیدا کرنا کہ جمہوریت

کی روح، فرد کا احترام باقی رہے، فرد اس طرح کارآمد بنے کہ اپنی انفرادیت کو بھی اسے تجنا نہ پڑے اور اپنے انفرادی ترقی کے امکانات سے بھی محروم نہ کیا جائے۔

اچھا اگر ہم نے فرد اور جماعت کے تعلیمی مطالبوں میں یہ ہم آہنگی پاکر اپنے بنیادی مدرسوں کو کام کا مدرسہ بنادیا اور ان میں تجربی علم اور تخلیقی کام اور ان کے معاون بلکہ خادم کی حیثیت سے کتابی علم اور میکانکی کام کا ایک ایسا آمیزہ تیار کرلیا جس سے ۷ سے ۱۴ سال کے لڑکے لڑکیوں کی ذہنی اور عملی کا کام اچھی طرح انجام پاسکے، تو کیا ہم نے سب کچھ کرلیا جو ان کی تعلیم کے لئے کرنا ہے، خیر سب کچھ تو یوں بھی کوئی کبھی نہیں کرسکتا، لیکن ہم نے تو شاید ابھی اپنا سب سے اہم کام نہیں کیا ہے۔ ہم نے اگر ذہنی قوتوں کو نشو ونما دینے کا انتظام کردیا، اگر ہنرمندیاں پیدا کردیں تو تعلیم کا کام ختم نہیں ہوگیا۔ صلاحیتیں اور ہنرمندیاں نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بری، وہ اچھی اور بری بنتی ہیں۔ ان مقاصد سے جن کی خدمت میں وہ لگائی جاتی ہیں۔ آپ کی عدالتوں میں جھوٹ کو سچ بناکر روپیہ بٹورنے والے، آپ کے تجارتی فرموں میں کالی منڈی کے شکاری اور جماعتی محاصل کے چور، آپ کے عہدہ داروں میں رشوت کا بازار گرم کرنے والے، آپ کے پبلک کام کرنے والوں میں ذاتی غرض پر عام مفاد کو چٹکی بجاتے میں قربان کرنے والے، آپ کے عالموں اور پنڈتوں، آپ کے جوگیوں اور صوفیوں میں عام مخلوق کے جہل اور توہم پرستی سے بے دریغ ناجائز فائدے اٹھانے والے، آپ کے جھوٹے گواہوں کی کامیاب فوج، آپ کے جعل سازوں کے بامراد دل، یہ سب کچھ ذہنی صلاحیتوں اور مہارتوں میں کسی سے پیچھے تو نہیں ہیں کیا ہم اپنے مدرسوں کو ذہنی صلاحیتوں کے چمکانے اور مہارتوں کے پیدا کرنے کے ادارے بناکر ان میں انھیں فوجوں کے لئے رنگروٹ حاصل کرنا چاہیں گے؟ نہیں تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی۔ مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے۔ جمہوری جماعت میں اس حقیقت کو نظرانداز کرنا جماعت کی زندگی کی شرائط سے غفلت برتنا ہے۔ جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت کے لئے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس کی ہنرمندی جماعتی انتشار کا باعث ہوسکتی ہے اور خصوصیت سے جمہوری ریاست میں جو تحقیق و تفتیش کی آزادی ہے، جماعت سازی کی آزادی ہے، تقریر و تحریر

کی آزادی ہے، مشاغل کے انتخاب کی آزادی ہے۔ ان سب سے انفرادیت کی انتشاری قوتیں ابھرتی ہیں۔ جو ان اداروں کی قدر کرتے ہیں اور جمعیتہ کی خاطر انھیں ہاتھ سے دینے کو بہت گراں سودا جانتے ہیں لیکن جنھیں جماعتی زندگی کا انتشار بھی گوارا نہیں۔ انھیں ان آزادیوں کے ساتھ ساتھ ذہن جماعتی کے نشو و نما اور جمعیتہ قومی کے استحکام کی تدبیریں بھی سوچنی چاہئیں۔ انھیں دیکھنا چاہئے کہ مدرسہ ایک جماعتی ادارہ کی حیثیت سے اس باب میں ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ آج تو وہ تعلیم سے انفرادیت کو کچلتا ہے اس لئے کہ سب کے واسطے وہ راہ متعین کرتا ہے جو بہت کم کی صحیح راہ ہو سکتی ہے۔ تعمیر اور تخلیق کے لئے بے چین بچوں کو کتابوں پر جھکاتا ہے، ان اوزاروں کی جگہ جن کی طرف بچوں کی للچائی نظریں تکتی ہیں۔ انھیں قلم دوات دیتا ہے۔ اچھلنے کودنے کے لئے بے تاب بچوں کو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک طرف تو انفرادیت کے ساتھ یہ بے اعتنائی۔ دوسری طرف خود غرضی کی راہوں پر انھیں چلانے کے لئے وہ اہتمام کہ الامان۔ اپنے مدرسوں کے نصاب کو، ان کے کاموں کو ذرا غور سے دیکھئے اور ان کی تحلیل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں شاید ایک ہی کاروبار ہوتا ہے وہ یہ کہ افراد کی ذہانت، ان کی قوت ارادی، ان کی ہنرمندی، سب بس فرد ہی کے لئے نشو و نما پائیں۔ جماعتی محرکات کو نہ بر روئے کار آنے کا موقع ملتا ہے، نہ وہ ابھرتے ہیں۔ نہ تربیت پاتے ہیں، ذہن کو بیدار کیا جاتا ہے، دل کو سلایا جاتا ہے۔ حقوق یاد رہتے ہیں۔ فرائض بھلائے جاتے ہیں انفرادی غرض طلبی کی ڈھلوان شاہراہ پر بچے ڈھکیلے جاتے ہیں، جماعتی بے غرضی اور خدمت کے دروازے بند رہتے ہیں۔ دوسرے کو کہنی مار کر آگے بڑھ جانے کی ہر دم مشق مہیا ہے، ساتھی کو سہارا دے کر آگے بڑھانے کا کہیں نام نہیں، سب اپنے اپنے لئے ہیں۔ سب کے لئے کوئی نہیں۔ ہاں زبان سے کبھی کبھی قومی خدمت، پڑوس کے حقوق، باہمی تعاون کی تلقین ہو جاتی ہے۔ لیکن کرنے کے کام باتوں سے انجام نہیں پاتے، کردار کی عادتیں گفتار سے پختہ نہیں ہوتیں زندگی سے حقیقی تعلق خیال اور احساس کے علاوہ عمل کا طالب بھی ہے۔ جماعت کے لئے اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ خدمت انجام دینے میں اس کی نشو و نما کا راز ہے۔ اچھی جماعت اپنے

فرد کو اس کا موقع دیتی ہے کہ وہ مل کر اس کے لئے کچھ کریں اور اس پر خوش ہو سکیں۔ اچھا مدرسہ بھی جماعتی کام کی مشترک خوشی کے مواقع نکالتا ہے۔ کام کے کامیابی سے انجام پانے پر خوشی تو انفرادی سعی میں بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ جماعتی مقاصد سے بے تعلق ہوتی ہے۔ کام کی اس انفرادی مسرت کو، کہ خود غرضانہ عمل کا انجن ہے، جماعتی مقاصد کی پٹری پر ڈال دینا چاہئے۔ انفرادی عمل کی خوشی کو جماعتی کام کی لگن اور اس پر سرور اور فخر میں بدل دینا چاہئے۔ یوں جماعت سے فرد کا تعلق خود کے لئے وجہ مسرت و افتخار بن جاتا ہے اور فرد اور جماعت کی گتھی فلسفیانہ بحثوں کے بغیر کھل جاتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مشترکہ کام کو یہ مسرت کس قسم کے کام سے حاصل ہو سکتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کام، کام کرنے والے کی صلاحیت، اس کے رجحانات اس کی طبیعت کے جھکاؤ کے مطابق ہو۔ اور صاحبو! آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ یہ صلاحیت کیا ہوتی ہے، اور یہ جھکاؤ کدھر ہوتا ہے۔ کتابوں کی طرف ہوتا ہے، یا عملی کام کی طرف چنانچہ انفرادی رجحان اور قومی مصالح دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے کتابی مدرسے عملی کام کے مدرسے بن جائیں۔ اس پہلے قدم سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے دوسرا قدم یہ ضروری ہے کہ عملی کام کی انفرادی خواہش کو مشترک جماعتی کاموں میں لگانے کا انتظام کیا جائے۔ اور مدرسہ کو کام کی جمعیتہ دے دی جائے۔ اور جب خود غرضانہ عمل کا جذبہ جماعتی خدمت میں منتقل ہو جائے ایک نظم کے ماتحت اپنے کو لانے، دوسرے کی مدد کرنے، دوسرے سے مدد لینے، کی عادت پڑنے لگے اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے تو تیسرا قدم یہ ہے کہ عادتوں کو بصیرتوں میں بدلا جائے۔ اس مشترک عمل کے جماعتی محاسن اُجاگر کئے جائیں، اور شخصی اور جماعتی اغراض کے ساتھ ساتھ پورا ہو سکنے کے امکانات واضح کئے جائیں۔ اور چوتھا قدم یہ ہے کہ متعلمین کے اکثر انتظامات خود ان کے ہاتھ میں دے دئے جائیں۔ ذمہ داری کا احساس اور اپنے کام کو اپنے بس بھر بہترین طور پر انجام دینے کی عادت آزاد اور پیہم عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ مدرسہ کی ہم آہنگ فضا میں مشفقانہ نگرانی اور مشورہ کے ساتھ یہ سب منزلیں خوبی سے طے ہو سکتی ہیں اور مدرسہ اس خود مختار

جمہوری ریاست کا جو اسے چلاتی ہے سب سے مفید ادارہ بن سکتا ہے اور اس ریاست کو بہتر ریاست بنانے میں سب سے زیادہ موثر قوت ثابت ہو سکتا ہے۔

صاحبو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بنیادی مدرسوں میں یعنی اپنی قومی تعلیم کے سب سے اہم حصہ میں اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو بس کرنے کی چیز یہی ہے کہ ان مدرسوں کو خبری علم کے مرکزوں کی جگہ تجربی علم کے مدرسے بنانا چاہیے۔ کتابوں کے مدرسے کی جگہ کام کا مدرسہ بنانا چاہیئے۔ انفرادی خود غرضی کی جگہ بے غرض جماعتی خدمت کی تربیت گاہ بنانا چاہیئے۔ ادبی و نظری یک طرفہ پن کی جگہ ان میں زندگی کے عمل تنوع کو جگہ دینی چاہیئے۔ یہ مشکل کام ہے، مگر ضروری کام ہے۔ ہمارا مستقبل اس منصوبہ کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کام میں آپ کے بہت سے مددگار ہوں گے اور اس سے زیادہ رکاوٹ ڈالنے والے۔ لیکن یہ کام انجام اُسی وقت پا سکتا ہے جب استاد اپنے فرض کو جانیں۔ اور تعلیم کے معاملے میں اپنے منصب کو پہچانیں۔ مجھے یقین ہے کہ نیو ایجوکیشن فلوشپ کے ارکین اس میدان میں اور سب سے آگے ہوں گے۔

پس ماندہ ممالک کی معاشی ترقی

۱۸۱۴ء سے ۱۹۱۴ء تک کے تقریباً سو سالوں میں دنیا نے معاشی حیثیت سے بہت نمایاں ترقی کی۔ اور ہم کئی حیثیتوں سے اس صدی کو غیر معمولی ترقی کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے دنیا کی آبادی میں دگنے کا اضافہ ہوا۔ چیزوں اور صنعات کی پیداوار کی قیمت میں اس سے بھی زیادہ۔ انفرادی اوسط حقیقی آمدنی میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوا لیکن اس معاشی ترقی میں ایک طرف تو یہ کمی رہ گئی کہ قوم کے مختلف طبقوں کو اس میں مساوی حصہ نہ ملا۔ دوسرے مختلف ملکوں کی ترقی کی رفتار یکساں نہ تھی۔ انیسویں صدی کے وسط سے اس کے اختتام تک اشیا کی پیداوار میں جو بہت زیادہ اضافہ ہوا اس سے یوں تو ہر طبقے کے لوگ مستفید ہوئے لیکن معاشی عدم مساوات میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ہاں اس کے بعد مغربی یورپ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں اس بات کی کوششیں شروع کی گئیں کہ محاصل اور دوسرے ذرائع سے معاشرت کے مختلف حصوں میں باہمی مساوات پیدا ہو جائے۔ پھر بھی دولت کی غیر مساوی تقسیم ہماری موجودہ معاشی تنظیم کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن بین الاقوامی نقطۂ نظر سے اس طرح کی کسی کوشش کا دور دور کوئی وجود نہیں ملتا۔ یہ صحیح ہے کہ آمدنی کا اضافہ محض مغربی یورپ تک محدود نہیں تھا ساری دنیا اس میں شریک تھی لیکن اس بڑھی ہوئی دولت میں مختلف قوموں کا حصہ برابر نہ تھا، اس دولت کا بہت بڑا حصہ دنیا کے ایک چھوٹے سے رقبے کے حصے میں آیا۔ بہت سی قومیں اس میں محض نام کے لئے شریک رہیں۔ عملاً آج امریکہ یا برطانیہ عظمیٰ، فرانس اور جرمنی جہاں دنیا کی صرف ۱۴ فیصدی آبادی بستی ہے، دنیا کی نصف دولت پر قابض ہیں۔ اور دنیا کی ۳/۴ آمدنی دنیا کی ۱/۴ آبادی کی ملکیت ہے۔

یہ صورتِ حالات مستقبل کے امن کے لئے سخت خطرناک ہے۔ پس ماندہ ملکوں میں جنھیں
اس معاشی ترقی سے محروم رکھا گیا ہے اپنی عزت اور افلاس کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کا بے پناہ
جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ انھیں مدتوں تک یہ بہلاوا دیا گیا ہے کہ دنیا میں اگر کافی دنوں تک امن و
سکون باقی رہے تو دنیا کی دولت میں نمایاں اضافہ ہوگا اور تب کم از کم مواقع کے لحاظ سے
سب ہی قومیں برابر ہو جائیں گی۔ لیکن عملاً صنعتی اور فنی ترقیوں کے باوجود پچھلے سو بلکہ ڈیڑھ سو سالوں
میں ہم اس منزل سے ابھی اتنی ہی دور ہیں جتنا پہلے دن تھے۔ یہ دنیا کے سامنے محض ایک اخلاقی
سوال نہیں ہے۔ اس کے معاشی اور سیاسی نتائج دور رس اور نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں، کیونکہ
یہ بات آسانی سے ذہن میں آسکتی ہے کہ زندگی کے بہتر امکانات نظر نہ آرہے ہوں تو لوگ انھیں
بدلنے کے لئے خوشی خوشی اپنی جان کی قربانی دینا منظور کر لیں گے۔ اگر ہم واقعی مستحکم امن کا قیام
چاہتے ہیں جس سے ساری دنیا کی خوش حالی کا راستہ کھل جائے تو ہمیں ان قوموں کے لئے کچھ
کرنا ہوگا جو انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب میں پیچھے چھوٹ گئی تھیں۔ "معاشی قوتیں" اور طلب و
رسد کے قوانین کی کارکردگی سو سالوں میں بھی وہ فرائض انجام نہ دے سکی جن کی ان سے اُمید
کی گئی تھی۔ ایک صدی کی مدت کافی طویل ہوتی ہے، اور ہم اگر اس نتیجے پر پہنچیں کہ اس طرح ہم اپنی
امیدوں کو کبھی پورا نہ ہوتے دیکھ سکیں گے تو غلط نہ ہوگا۔ تجربے نے انھیں ناکافی ثابت کر دیا
ہے۔ ممکن ہے دو چار سو سال تک مزید انتظار کیا جائے تو ان ہی کی مدد سے ہماری اُمیدیں
بار آور ہو جائیں، لیکن پس ماندہ ملک اب مزید انتظار کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے اب ضرورت
اس بات کی ہے کہ اس عدم مساوات کو مٹانے اور دنیا کے پس ماندہ علاقوں کو ترقی کا کم سے کم
موقع فراہم کرنے کے لئے بین الاقوامی سرگرمی دکھائی جائے۔ مختلف قوموں کو یکساں ترقی کے
مواقع فراہم کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا معاشرت کے مختلف طبقوں کے مابین دولت کی
زیادہ منصفانہ اور مساوی تقسیم کا کام۔ لیکن یہ کچھ آسان کام نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ "پہلے چند ہزار
پونڈ کا سرمایہ فراہم کرنا ہی سب سے زیادہ ٹیڑھا کام ہے۔" اور "امیر ہی روپے پیدا کر سکتے ہیں"

یہ مقولے جس طرح افراد کے لئے صحیح ہیں قوموں پر اس سے زیادہ صادق آتے ہیں۔ صنعتوں میں سرمایہ کاری غریب ملکوں میں امیر ملکوں سے زیادہ بارآور ہوتی ہے کسی معاشی حیثیت سے ترقی یافتہ ملک میں اگر کوئی نئی صنعت قایم ہو تو اسے کسی مزید خرچ کے بغیر بنیادی صنعتوں مثلاً ذرائع نقل وحمل وغیرہ کی سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ غریب ملکوں میں صنعتی ترقی کے لئے بنیادی صنعتوں کے قیام پر مزید سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ اس طرح صنعتوں کو بڑھانے کے لئے غریب ملکوں سے زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سرمائے کی فراہمی کے لئے بین الاقوامی مدد کی ضرورت ہوگی تاکہ پس ماندہ ملکوں کی ترقی کی راہیں کھل سکیں۔

ایک وسیع معنی میں دیکھا جائے تو دنیا میں پانچ بہت ہی پس ماندہ علاقے ہیں، جو معاشی حیثیت سے بہت غیر ترقی یافتہ ہیں۔ ۱۹۱۰ میں مجموعی طور پر دنیا کی آٹھتی، لوٹے فی صدی آبادی زندگی گذار رہی ہے۔ ان ممالک کی غریب کے مسئلے کی پیچیدگی اور وقت کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو ان میں مشرق بعید کے ممالک ہندوستان اور چین کو سب سے نمایاں جگہ دینی پڑے گی اس علاقے میں دنیا کی تقریباً نصف آبادی بستی ہے۔ اور آبادی کی اوسط آمدنی ۴ سے ۷ شلنگ ہفتہ وار ہے، اس کے بعد نوآبادیاتی سلطنتوں خصوصاً افریقہ کا درجہ ہے۔ کاریبین علاقہ ایک اور مفلس اور بہت زیادہ گنجان علاقہ ہے۔ مشرق قریب کے ممالک بھی اس فہرست میں شامل ہیں گو یہاں افلاس کا حل نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ مشرق اور جنوبی مشرقی یورپ بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ پہلے تین علاقوں کی فی شخص آمدنی بہت ہی کم ہے۔ مشرق وسطی اور جنوبی مشرقی یورپ کی آمدنی بھی گو قلیل ہے لیکن ان تین ملکوں سے بہت زیادہ ہے۔ یہاں آبادی کے ہر شخص کی اوسط آمدنی تقریباً ۱۵ شلنگ فی ہفتہ ہے۔ لیکن ان کے افلاس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انگلستان میں فی کس آمدنی دو پونڈ ہے۔

یوں تو ان پانچوں علاقوں کے مسائل مختلف ہیں لیکن ان میں بعض مشترک خصوصیتیں ہیں، یہ سبھی زرعی ملک ہیں، جہاں کے لوگوں کا خاص پیشہ کھیتی باڑی وغیرہ ہے۔ زمین پہ آبادی کا

بوجہ بہت زیادہ ہے۔ کھیتی کے پرانے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ فی ایکڑ پیداوار مختلف حصوں میں مختلف ہے، لیکن جہاں زیادہ بھی ہے وہاں بھی انگلستان یا ڈنمارک اور ہالینڈ میں فی ایکڑ پیداوار کے ۱/۲ سے زیادہ نہیں۔ ان ممالک میں سے بیشتر میں محنت کی بڑی تضیع ہوتی ہے کیونکہ کھیتی پر زندگی گذارنے والوں میں بہت سے لوگ دراصل یا تو بالکل یا کافی حد تک بیکار رہتے ہیں۔ ویسی معاشیات کے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر اس طرح کے فالتو لوگوں کو کھیت سے نکال کر کسی اور کام میں لگا دیا جائے تو پیداوار میں کمی کے بجائے اضافہ ہوگا۔ لیکن ان ممالک میں ان لوگوں کو کسی اور کام میں لگایا نہیں جا سکتا، کیونکہ ان ملکوں میں مشینوں اور کارخانوں وغیرہ کی کمی ہے، جہاں لوگ کام سے لگ سکیں اور اوزاروں کے بغیر محنت بارور نہیں ہوتی۔ پھر اگر اوزار وغیرہ فراہم بھی ہوتے تو ان علاقوں کی غربت اور ان کا افلاس اتنا بڑھا ہوا ہے کہ زمین چھوڑ کر دوسرے کام میں لگنے کا جو وقفہ ہوتا اس میں غذا کی کمی ایک ناقابل حل دقت ہے۔ سب سے آخر میں ان ملکوں میں مزدوروں کو مختلف کام سکھانے کی سہولتیں ناپید ہیں۔ پس ماندہ ممالک کی بین الاقوامی مدد کے سلسلے میں شاید سب سے زیادہ اہم اسی طرح کی تربیت کی سہولتوں کی فراہمی کا کام ہوگا۔ خود ترقی یافتہ ممالک میں بھی کام سیکھے ہوئے مزدوروں کی قلت ہے اور تربیت کی سہولتیں ضرورت سے کم ہیں۔ پس ماندہ ممالک کی یہ ضرورت مقابلتاً اور بھی زیادہ سخت ہے۔ اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر محض چھوٹے چھوٹے کارخانوں کے مالکوں کی کوششوں سے انجام نہیں پا سکتا۔ مزدوروں کی تربیت پر روپے خرچ کرنے میں ایک کارخانے کے مالک کو ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ خدا جانے وہ اس صرف سے کافی فائدہ بھی اٹھا سکیگا یا نہیں، کام سیکھ لینے کے بعد مزدور اس کی نوکری چھوڑ کر کسی دوسرے کے ہاں مقابلتاً اونچی تنخواہ پر چلا جا سکتا ہے۔ اس طرح کام سکھانے سے ملک اور صنعت کے وسیع تر مفاد کو تو ضرور فائدہ پہنچتا ہے لیکن انفرادی طور پر کسی ایک کارخانے کے مالک کو اس مد میں

کی وجہ سے اس کام پر روپئے صرف کرنے میں جھجک ہوتی ہے۔

ان ممالک کے افلاس کا مسئلہ حل کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ان علاقوں کی فالتو آبادی کو ترقی یافتہ اور مالدار ملکوں میں لے جاکر بسا یا جائے، لیکن یہ قابل عمل معلوم نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ کے حل کا زیادہ موزوں طریقہ یہ ہوگا کہ اوزار یا مشینیں جہاں دستیاب ہوں وہاں لوگوں کو نہ پہنچا سکنے کی شکل میں کوشش یہ ہو کہ آبادی کے لئے ان چیزوں کی فراہمی کا انتظام کیا جائے، دوسرے الفاظ میں ان ممالک کی صنعتی ترقی کی شکلیں پیدا کی جائیں اور ساتھ ہی زراعت کو بہتر بنانے کی کوشش ہو، یہی ان ممالک کے مسئلہ کا حقیقی حل ہے۔

لیکن صنعتی ترقی کی بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ہر علاقہ، ہر ملک بغیر بیرونی مدد کے اپنی صنعتی ترقی کا کام انجام دینے کی کوشش کر سکتا ہے۔ لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ سرمایہ اکٹھا کرنے اور نئی مشینیں نئے اوزار بنانے کے لئے ان ممالک کو جو قیمیں پس انداز کرنی ہونگی اس سے ان کے معیار زندگی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور ان پس ماندہ ملکوں کا معیار زندگی یوں بھی کچھ بہت بلند نہیں ہے۔ پھر ان ملکوں کا افلاس اتنا بڑھا ہوا ہے کہ صنعتی ترقی کے لئے بہت کچھ کاٹ کپٹ کے باوجود ضروری سرمایہ کی فراہمی کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ اس طرح صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست ہوگی اور ان ممالک کے لئے بہت زیادہ سخت، کیونکہ انھیں طویل عرصہ تک اپنے بہت ضروری اخراجات کم کرنا ہوگا۔ تاکہ ضروری سرمایہ فراہم ہو سکے۔ اس حل کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ اس سے دنیا کی موجودہ معاشی زندگی کو صدمہ پہنچیگا۔ کیونکہ بیرونی مدد سے محروم ہو جانے کی شکل میں یہ سب ہی ممالک خود کفالتی بننے کی کوشش کریں گے کہ اپنی ضرورت کی سب ہی چیزیں خود ملک کے اندر تیار کر سکیں۔ دنیا کے وسیع تر مفاد کو سامنے رکھئے تو یہ کچھ اچھا نہ ہوگا۔ قدرت نے مختلف ممالک کو ایک مختلف قسم کی دولت سے حصہ دیا ہے۔ ملکوں کے معاشی ذرائع اور مختلف اشیا کے پیدا کرنے میں ان کی اضافی صلاحیتیں مختلف ہیں۔ سب ملک سب ہی طرح کی چیزیں اتنی ہی سہولت سے تیار نہیں کر سکتے اس لئے دنیا کی بھلائی تو اسی میں ہے کہ ہر ملک

وہی چیزیں بنانے کی کوشش کرے جو وہ کم سے کم دام پر تیار کر سکے اور پھر دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارتی رشتہ قایم کر کے وہ دوسری چیزیں حاصل کرے جنھیں دوسرے ممالک زیادہ آسانی سے بنا سکتے ہوں۔ اگر پس ماندہ ممالک کو صنعتی ترقی کے لئے بین الاقوامی مدد حاصل ہوئی تو دنیا تخصیص کے ان فوائد سے محروم ہو جائے گی۔

صنعتی ترقی کی دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ پس ماندہ ممالک کو بین الاقوامی سرمایہ کی مدد حاصل رہے۔ یعنی ملکوں کی مشینوں اور دوسری ضرورتوں کا کافی حصہ انھیں باہر سے فراہم کیا جائے۔ اس طرح پس ماندہ ملکوں کی معاشی ترقی کی رفتار زیادہ تیز ہو گی اور ان ملکوں کا معیار زندگی مقابلتہً جلد بلند ہو سکے گا۔ ساتھ ہی اس بیرونی مدد کی وجہ سے ان ملکوں کو موجودہ معاشی نظام میں اپنی جگہ حاصل ہو جائے گی۔ اور انھیں قدرت کے خلاف ان چیزوں کے بنانے پر مجبور نہ ہونا پڑے گا جو ان کے بس سے باہر یا ان کے لئے زیادہ مہنگی ہوں گی۔ بین الاقوامی تقسیم کار سے ساری دنیا مستفید ہو سکے گی اور نتیجتہً ساری دنیا کی دولت میں اضافہ ہو گا۔ اس مقصد کے لئے بین الاقوامی سرمایہ کاری دنیا کی معاشی زندگی کو استحکام عطا کرنے کا باعث بنے گی۔ اگر ان سے براہ راست نفع نہ بھی ہو تو بھی دنیا میں امن وسکون اور عالم گیر خوش حالی کے لئے یہ کچھ مہنگا سودا نہ ہو گا۔ لیکن اس اندیشہ کی کوئی وجہ نہیں کہ اس سرمایہ سے نفع نہ ہو گا۔

پس ماندہ علاقوں کی معاشی ترقی کے لئے بین الاقوامی سرگرمی کی مشترک خصوصیات کا ذکر کر چکنے کے بعد اب آئیے ذرا ان علاقوں کی انفرادی خصوصیات کا مطالعہ کر لیں۔ سب سے پہلا مشرق بعید کا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس علاقہ میں دنیا کی تقریباً نصف آبادی رہتی ہے۔ ظاہر ہے اس علاقے کی غربت مٹانا آسان نہیں، اور نیک دلی اور اس علاقے کی ترقی کی زیادہ سے زیادہ پُرخلوص خواہش کے باوجود اس مسئلہ کے حل میں دیر لگے گی۔ یہاں آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کی وجہ سے ایک نہایت ہی پیچیدہ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ معاشی ترقی آبادی میں مستقل اضافہ ہوتے رہنے کی وجہ سے معیار زندگی بلند نہیں کر پاتی بلکہ دولت میں اضافہ کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ معیار زندگی میں ذرا بھی اضافہ ہو تو شرح اموات میں کمی آجاتی ہے، اور نتیجۃً آبادی میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور فی کس آمدنی کا اوسط بلند تر نہیں ہو پاتا۔ ایسی صورت میں یہ بات ظاہر ہے کہ مغربی یورپ یا امریکہ کا مزدور جو یوں اپنی اُجرت کا ایک حصہ ان ممالک میں بسنے والے اپنے غریب اور مفلس ساتھیوں کی مدد کے لئے دینے کو ممکن ہے تیار ہو جائے، محض اس لئے ایک پائی دینے سے بھی انکار کر دے گا کہ ایشیا میں بسنے والا ہر خاندان دس کے بجائے بارہ بچے پیدا کرے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ان ممالک کی ریاستوں کا یہ فرض ہے کہ دولت کے اضافے سے ایک خاصی رقم اس وقت تک عام لوگوں کے ہاتھ میں جانے سے سختی سے بچائے رکھیں۔ جب تک ان ملکوں میں مشینوں اور کارخانوں وغیرہ کی ساری ضرورتیں پوری نہ ہو جائیں۔ بہرحال آبادی کے اضافہ کو روکنے کی کوشش اس علاقے کی معاشی ترقی کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

نوآبادیاتی سلطنتوں میں صنعتی ترقی کو ان کی ترقی کے پروگرام نسبتاً کم اہم جگہ دیتی ہوگی یہاں ضرورت سب سے زیادہ اس بات کی ہے کہ زرعی پیداوار میں تنوع پیدا کیا جائے اور آج کی طرح محض ایک فصل پر بھروسہ ختم کر دیا جائے۔ کاریبین (Caribbean) کا علاقہ بہت سے معاملات میں نوآبادیاتی ملکوں سے ملتا جلتا ہے۔ مشرق قریب کا مسئلہ نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ یہاں معدنی دولت سے اور زیادہ استفادہ اور آبپاشی کی بعض پرانی اسکیموں کو جو امتداد وقت سے مٹ چکی ہیں دوبارہ زندہ کیا جائے تو معیار زندگی میں خاصی بلندی ہو سکتی ہے۔ مشرقی یورپ کا مسئلہ ایک حیثیت سے بہت اہم ہے، دونوں بڑی لڑائیاں اسی علاقہ سے شروع ہوئی ہیں اور بہت سے مدبرین نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مشرقی یورپ پر جس طاقت کا بھی اقتدار قائم ہو جائے گا وہ گویا سارے یورپ پر چھا جائیگا، اس لئے جب تک مشرقی یورپ کا مسئلہ حل نہ ہو جائے یورپ میں مستحکم امن کا قیام نہ ہو سکیگا۔ اس علاقہ کا معیار زندگی دوسرے پس ماندہ ملکوں کے مقابلہ میں کافی بلند ہے اور اس لئے یہاں معاشی ترقی کا کام آسانی سے اور جلد انجام پا سکتا ہے۔

ابوسالم صفا ایم اے

بچوّں کے لئے مناسب غذا

بعض لوگ ہر مسئلہ ، ہر تحریک ، یہاں تک کہ انفرادی کوششوں کو بھی سیاست کی عینک سے دیکھنے کے اس قدر عادی ہو تے ہیں کہ بچوں کی صحیح تربیت ، عوام کی تعلیم و معاشری اصلاح کا کوئی مسئلہ جب کبھی ان کے سامنے لایا جاتا ہے تو ایک "اونہہ" اور شانے کی جنبش کے ساتھ اس کو پرے ہٹا دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سیاسی آزادی کے بغیر یہ ساری کوششیں ہیچ ہیں۔ ان کا یہ کہنا اپنی جگہ پر کافی وزن رکھتا ہے۔ آزادی کی فضا میں اس کی برکتوں کے سایہ تلے یہ کوششیں بہت جلد بارآور ہوسکتی ہیں لیکن کیا جب تک آزادی نہیں ملتی تعلیم و تربیت اور اصلاح کے کام کرنے والے اپنی دوکان بڑھا کر اس وقت کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ اور پھر ان لوگوں کا یہ سمجھنا کہ ایسے لوگ اپنے ان کاموں کے ذریعے ملک کو آگے نہیں بڑھا رہے ہیں ، ان لوگوں کی بھول معلوم ہوتی ہے ، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں یہ بالواسطہ کوششیں ہیں۔ سارے ملک والوں کا عام سیاسی تحریکوں میں کود پڑنا تو ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اس صورت میں خود ان حضرات کے نقطۂ نظر سے بھی کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ لوگ جو اپنے علم و فن اور اپنے رجحانات کے لحاظ سے ان ٹھوس ، مفید ، لیکن دیر میں پھل لانے والے کاموں کو پسند کرتے ہیں ، اور ضروری سمجھتے ہیں ، اپنے کام میں لگے رہیں۔

اچھے سماج اور اچھی ریاست کی تعمیر ہمیشہ صاحبِ عقل و تخیل اور قوتِ عمل رکھنے والے افراد کے ہاتھوں ہوتی آئی ہے۔ کمزور قوتِ عمل اور مدبرانہ نظر سے عاری رہنما اور معمار کے ہاتھوں سماج کی جو درگت بن سکتی ہے وہ معلوم۔

آج کل کی سوسائٹی میں خاص طور پر افراد کے سر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ اس لئے جو لوگ

بچوں کی تعلیم و تربیت کے کام میں لگے ہوئے ہیں وہ ایک بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ یہی بچے کل بڑے ہو کر ہمارے سماج کے بنانے یا بگاڑنے والے ہوں گے جیسی ان کی تعلیم و تربیت اور جسمانی صحت ہوگی اسی کے مطابق وہ سماج پر اپنا اثر ڈالیں گے۔ بچے کی تعلیم تو بعد کی چیز ہے، سب سے پہلے اس کی صحت کا ٹھیک ہونا مقدم ہے۔ اور اس کی صحت کی ذمہ داری ماں باپ کے معاشی وسائل سے بچے کو اچھا اور مناسب مقدار میں غذا دینے پر منحصر ہے۔

آج کل کھانے پینے کی بیشتر چیزیں مشین کے ذریعے اور تجارتی مفاد کے پیش نظر تیار کی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے ان کی فطری ہیئت کچھ اس قدر تبدیل ہو جاتی ہے کہ اچھی صحت کے لئے یہ غذائیں ہرگز مفید ثابت نہیں ہوتیں۔ اور یہ انہی غذاؤں، مل مالکوں اور تاجروں کا کرم ہے کہ قبض، بدہضمی، سرطان، ذیابیطس، پتھری وغیرہ کے امراض ہماری موجودہ معاشرت کا ایک جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ جب یہ غذائیں بڑوں کے حق میں اتنی مضر ثابت ہوتی ہیں تو بچوں کے ننھے اور نرم و نازک جسم کے ساتھ یہ جو کچھ نہ کر گذریں کم ہے۔

بڑوں کو تو صرف ایسی غذاؤں کی ضرورت ہے، جو ان کے جسم کو گرم رکھیں، طاقت پہنچاتی رہیں، اور ضایع شدہ نسیجوں کی از سر نو تعمیر کرتی رہیں۔ بچوں کے لئے ایسی غذاؤں کی ضرورت ہے جو ان ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ نئے نسیجوں کو بھی بناتی رہیں تاکہ بچے کا قد اور اس کا وزن بڑھتا رہے۔

ماں باپ کے لئے یہ بہتر ہوگا اگر وہ بچے کے دماغ میں شروع ہی سے یہ بٹھا دیں کہ کھانے پینے کی بعض چیزیں مثلاً چائے، کافی، مٹھائی وغیرہ بڑوں کے لئے ہیں، مگر چھوٹوں کے لئے نہیں خواہ وہ کتنی ہی ضد کیوں نہ کریں، جو چیز ان کے حق میں مفید نہیں اسے ان کو نہ دینا ہی بہتر ہے۔ اس لئے جب ماں دن کا کھانا پکانے بیٹھے تو اس کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ اس میں بچوں کے لئے کیا کیا چیزیں ہوں گی۔

ایسی غذائیں جن میں وہ تمام اجزا شامل ہوتے ہیں جو جسم کے نشو و نما کے لئے ضروری

ہیں، دو قسموں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔

(۱) وہ غذائیں جو جسم کو گرم رکھتی ہیں اور طاقت بہم پہنچاتی ہیں۔

(۲) وہ جو زائل شدہ نسیجوں کی تعمیر کرتی ہیں اور جسم کے نشوونما میں محدو معاون ثابت ہوتی ہیں۔

مقصد نمبر (۱) ان غذاؤں سے پورا ہوتا ہے جن میں کاربوہائی ڈرائٹ اور چربی پائی جاتی ہو۔

کاربوہائی ڈرائٹ ان چیزوں میں بکثرت پائی جاتی ہے۔

دالیں۔ روٹی۔ چاول۔ پھل۔ سبزیاں (خصوصاً آلو) اور گڑ۔

چربی ان چیزوں میں:۔

مکھن۔ ملائی۔ دودھ۔ بناسپتی گھی۔ مچھلی کا تیل وغیرہ۔

مقصد (۲) ان غذاؤں سے پورا ہوتا ہے۔ جن میں پروٹن، معدنیات۔ کلشیم (چونا) فاسفورس۔ لوہا۔ وٹامن ب اور ب۔ وٹامن C اور پانی پایا جاتا ہو۔

اس نقشے سے معلوم ہوگا کہ یہ چیزیں کن غذاؤں میں پائی جاتی ہیں۔

پروٹن	دودھ۔ گوشت۔ مچھلی۔ انڈا۔ (زائل شدہ نسیج اور نئے نسیج کی تعمیر کے لئے بہت ہی مفید ہیں)
معدنیات	دودھ۔ سبزیاں۔ پھل۔ انڈے کی زردی۔ گوشت۔ مچھلی۔ کھڑی دالیں۔ (جسم کو ٹھیک حالت میں قایم رکھنے کے لئے ہڈیوں، دانتوں کے نشوونما اور خون پیدا کرنے کے لئے بہت ہی مفید ہیں۔
کلشیم (چونا)	دودھ (خاص طور پر) سبزیاں۔ (ہڈیوں اور دانتوں کے لئے)
فاسفورس	دودھ۔ انڈا۔ گوشت۔ مچھلی اور دالیں (ہڈیوں، دانتوں اور دوسرے اعضا کے نشو

لوہا	انڈے کی زردی۔ گہرے ہرے رنگ کی سبزیاں (مثلاً پالک) کلیجی۔ تازہ پھل اور کھڑی دالیں۔ (خون پیدا کرنے کے لئے)
وٹامن (حیاتین) ب اور ۂ	سبزیاں۔ کھڑی دالیں اور پھل (جسم کے نشوونما اور بھوک بڑھانے کے لئے)
حیاتین ج	تازہ پھل (خاص طور پر ترش پھل۔ مثلاً سنترے۔ انگور اور لیموں۔ کچے ٹماٹر۔ کرم کلا۔ گاجر اور شلجم۔ (جسم کے نشوونما اور اچھے دانتوں کے لئے)
پانی	پھل۔ سبزیاں۔ دودھ اور خود پانی خون اور نسیجوں کے پیدا کرنے اور جسم میں گرمی کے توازن کو قایم رکھنے کے لئے۔

قدرت کا کچھ ایسا انتظام ہے کہ انہی غذاؤں میں جنھیں ہم عموماً استعمال کرتے رہتے ہیں بچوں اور بڑوں کو تندرست رکھنے کے لئے یہ سارے اجزا موجود ہوتے ہیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ غذاؤں کے استعمال میں توازن برقرار رکھا جائے۔ اگر ہم عرصے تک صرف آلو ہی کھاتے رہیں یا دسترخوان پر محض گوشت ہی گوشت ہو تو جسم کی بہت سی ضرورتیں پوری نہیں ہو پائیں گی۔ جس کا نتیجہ کسی نہ کسی مرض کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

ایک سے لے کر چھ سال کے ایک اوسط بچے کی روزانہ کی خوراک ان چیزوں پر مشتمل ہونی چاہیے

(۱) ایک یا ڈیڑھ پاؤ خالص دودھ

(۲) پھل دو یا ایک بار۔ پھلوں میں ایک سنترہ یا چند انگور یا ایک سیب یا ایک کیلا ہونا چاہیے

(۳) سبزی۔ کوئی گہرے ہرے پتوں والی سبزی بھی ضرور ہونی چاہیے۔ مثلاً پالک۔

(۴) کوئی ایسی ایک سبزی جس میں نشاستہ ہوتا ہو۔ مثلاً آلو۔

(۵) ایک انڈا — (۶) جب بچہ ۱۰ مہینے کا ہو جائے تھوڑا سا گوشت۔ مچھلی۔ اس سے پہلے نہ یا دو سے زیادہ ہفتہ میں تین بار — (۷) دالیں — (۸) روٹی اور مکھن۔ دو یا تین بار۔ (۹) مچھلی کا تیل خاص طور پر دو سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے۔

مشتاق احمد صاحب اعظمی بی اے

بریٹن ووڈز کے راضی نامے

(بسلسلۂ سابق)

(رسالہ جامعہ کے پچھلے نمبر میں تبلایا گیا تھا کہ دنیا میں آج بہت کم ملک ایسے ہیں جو اپنی ضرورت کے تمام سامان خود اپنے ملک میں پیدا کرتے ہوں۔ کسی ملک کو اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے کچے مال باہر سے منگانے ہوتے ہیں تو کسی کو مشینیں۔ کسی کو اپنی مصنوعات باہر بھیجنا ہوتی ہیں تو کسی کو اپنی زراعتی پیداواریں۔ غرض، روزگار اور آمدنی کی سطح کو بلند رکھنے اور ملک کی دولت کے وسائل کو ترقی دینے کے لئے بین الاقوامی تجارت کو بڑھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو بین الاقوامی تجارت کی توسیع کو یہ اہمیت حاصل ہے، دوسری طرف اس کی ترقی کی راہ طرح طرح کی رکاوٹیں حائل کی جاتی ہیں۔ یوں تو ان سب رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے اور اس کام کے لئے ایک بین الاقوامی تجارتی کانفرنس امریکہ کی دعوت پر موسم گرما کے شروع زمانے میں منعقد بھی کی جانے والی ہے۔ لیکن زر کی فراہمی کے سلسلے میں جو رکاوٹیں بین الاقوامی تجارت میں سدِ راہ ہیں، انھیں بریٹن ووڈز کے راضی ناموں کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلی رکاوٹ یہ ہے کہ مختلف ملکوں کے زروں کی شرح مبادلہ میں استحکام باقی نہیں رہا ہے جس کی وجہ سے بین الاقوامی مبادلات میں ظن و تخمین کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ دوسرے زر کے مبادلے کے باضابطہ انتظامات نہیں ہیں بلکہ حکومتیں من مانے طریقوں پر ان کے بارے میں فیصلے کرنے لگی ہیں۔ مبادلات خارجہ پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کی جاتی ہیں، ملکوں کے درمیان روزمرہ کے لین دین کے لئے ادائیوں کا جو نظام رائج ہے اس میں ہم جہتی باقی نہیں رہی ہے بلکہ یہاں دو رخے راضی ناموں کی کارفرمائی ہے۔ زر کی قدر میں فرسودگی پیدا کرنے کے لئے باہمی مسابقت ہوتی رہتی ہے۔ ادائیوں کے

توازن میں جب عدم مطابقت پیدا ہوتی ہے تو اسے دور کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جو قومی اور بین الاقوامی خوش حالی کے لئے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ وغیرہ

ان تمام دشواریوں کو دور کرنے کے لئے زر کا بین الاقوامی ذخیرہ نقد وجود میں آیا ہے اس کے مقاصد، اس کے اراکین کے نسبئے اور چندے اور اراکین کے زروں کی قدر مساوات، کے بارے میں جامعہ کے پچھلے نمبر میں بحث کی جا چکی ہے۔ اس نمبر میں ذخیرہ نقد سے استفادہ کی صورتوں اور دیگر اہم دفعات سے بحث کی جائے گی۔)

ذخیرہ نقد سے لین دین کے طریقے

ذخیرہ نقد کی ایجنسیاں ذخیرہ نقد کے ادارے کا ہر رکن، صرف اپنے خزانے، مرکزی بنک، استحکامی ذخیرہ نقد یا اسی قسم کی کسی اور مالیاتی ایجنسی کے ذریعے ہی سے زر کے بین الاقوامی ذخیرہ نقد سے لین دین کر سکے گا اور یہ ذخیرہ نقد خود بھی ان ہی ایجنسیوں کی معرفت لین دین کر سکے گا۔

ذخیرہ نقد کے کاروبار کی تحدید ذخیرہ نقد کا کاروبار صرف ایک رکن کو دوسرے رکن کا زر فراہم کرنے تک محدود ہوگا اور یہ زر خریدنے والے رکن کی خواہش پر سونے یا اس کے اپنے زر کے معاوضے میں فراہم کیا جائے گا۔

ذخیرہ نقد کے استعمال کی شرائط (الف) ایک رکن اپنے زر کے معاوضے میں دوسرے رکن کا زر حسب ذیل شرائط کے ماتحت خرید سکیگا:-

(ا) جب خریدنے والا ملک یہ ظاہر کرے گا کہ وہ اس زر کے معرفت ایسی ادائیوں کا بھگتان کرنا چاہتا ہے جو اس راضی نامے کے مقاصد کے کسی طرح خلاف نہیں ہیں۔

(اا) جب ذخیرہ نقد نے اس بات کا اعلان نہ کیا ہوگا کہ جس زر کے خریدنے کی خواہش کی جا رہی ہے اس کا ذخیرہ اس کے پاس کمیاب ہو گیا ہے۔

(iii) جب مجوزہ خریداری کی وجہ سے ذخیرہ نقد کے پاس خریدار ملک کا زر، خریداری کی تاریخ پر ختم ہونے والے بارہ مہینوں میں اس کے نسبیے سے ۲۵ فی صدی زیادہ نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے نسبیئے سے دو سو فی صدی زیادہ ہوگا۔ لیکن ۲۵ فی صدی کی یہ پابندی صرف اس حد تک منطبق کی جاسکے گی جب کہ رکن مذکور کے زر کا ذخیرہ اگر وہ ۵۰ فی صدی سے کم ہوگا اس حد تک ملیا جاچکا ہوگا۔

(iv) جب ذخیرہ نقد نے پہلے سے اس بات کا اعلان نہ کیا ہوگا کہ خریدار ملک کو، خریداری کا حق ہی حاصل نہیں ہے۔

(ب) ذخیرہ نقد کی اجازت کے بغیر کوئی رکن پیشگی مبادلہ کے لین دین کے نقصان کی تلافی کے لئے ذخیرہ نقد سے حاصل کرکے دوسرے ملک کے زر پر قبضہ نہیں جما سکے گا۔

مندرجہ بالا شرائط سے دست کشی

ذخیرہ نقد اپنے اختیار تمیزی سے کام لے کر اور اپنے مفاد کا پورا تحفظ کرنے کے بعد مندرجہ بالا شرائط کے حصہ (الف) سے دست کش بھی ہو سکتا ہے خصوصاً ایسے ارکین کی خاطر جن کا رکارڈ یہ رہا ہو کہ یہ ذخیرہ نقد کے وسائل سے زیادہ اور مسلسل کام لینے سے جہاں تک ممکن ہے اجتناب کرتے ہیں۔ دست کشی کرتے وقت دست کشی کے خواہش مند ارکین کی میعادی یا غیر معمولی ضرورتوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ نیز اگر کوئی رکن ضمانت کے طور پر سونا، چاندی، تمسکات یا ایسے دیگر اثاثے گرو رکھنے کے لئے رضامند ہوگا جن کی قدر، ذخیرہ نقد کی رائے میں اس کے مفاد کے تحفظ کے لئے کافی ہوگی تو اس بات کو بھی دست کشی کرتے وقت ملحوظ رکھا جائے گا۔

سونے کے معاوضے میں زروں کی خریداریاں

ہر رکن جو براہ راست یا بالواسطہ دوسرے رکن کا زر سونے کے معاوضے میں خریدنا چاہے گا وہ اُسے سونا فروخت کرکے ذخیرہ نقد سے خرید سکے گا

....

ذخیرہ نقد کے پاس کسی رُکن کا جو اپنا زرموجود ہو گا اُسکی بازیافت

(الف) ایک رکن کے نسبیہ سے زیادہ جتنا بھی اس کا اپنا زر ذخیرہ نقد کے پاس ہو گا اس کے جبقدر حصے کو بھی رکن مذکور چاہے گا اپنے سونے کے معاوضے میں ذخیرہ نقد سے دوبارہ خرید سکے گا۔

(ب) ہر مالی سال کے اختتام پر ایک رکن اپنے اس زر کو جو ذخیرہ نقد کے پاس ہو گا سونے یا انتقال پذیر زروں کے معاوضے میں مقررہ شرائط کے ماتحت دوبارہ خرید سکے گا۔ لیکن اس طریقے پر جو بھی لین دین کئے جائیں گے انھیں اس نقطہ تک نہیں لے جایا جا سکے گا کہ جہاں:۔

(i) کسی رکن کا زر محفوظ اس کے نسبیہ سے کم ہو جائے گا۔

(ii) ذخیرہ نقد کے پاس اس کا اپنا زر اس کے نسبیہ کے ۷۵ فی صدی سے کم ہو جائیگا یا

(iii) ذخیرہ نقد کے پاس اس زر کا ذخیرہ جو مطلوب ہے رکن متعلقہ کے نسبیہ سے ۷۵ فی صدی زیادہ ہو جائے گا۔

ذخیرہ نقد کے دستور سے مندرجہ بالا اقتباسات، محض بطور نمونہ درج کئے گئے ہیں تاکہ ہمارے قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ بین الاقوامی ذخیرہ نقد کیا ہے۔ اسی قسم کا ایک دستور بین الاقوامی بنک کا بھی ہے۔ لیکن یہ مسائل خاصے پیچیدہ ہیں۔ اور ان کی تمام جزئیات پر ایک مختصر مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے اس تعارفی مضمون کو زیادہ طویل نہ کروں بلکہ اسے سر آرچی بالڈ رولینڈس وزیر مالیات ہند کی اُس تقریر کے چند اقتباسات پر ختم کر دوں جو انھوں نے برٹین ووڈز کے راضی ناموں کے سلسلے میں مرکزی اسمبلی میں ۲۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو کی تھی۔ انہوں نے ان راضی ناموں کے مقاصد کو مختصر طور پر حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"چونکہ معاشی اعتبار سے سب قومیں ایک واحد دنیا میں سکونت پذیر ہیں اور کوئی ملک اس وقت تک خوشحال نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ معاشی عزلت گزینی پر عامل ہے اس لئے یہ دونوں ادارے (یعنی بین الاقوامی ذخیرہ نقد اور بین الاقوامی بنک) چاہتے ہیں کہ جہاں تک زر کی فراہمی کے ذریعہ

اس کام کو انجام دیا جاسکے۔ بین الاقوامی تجارت میں اور اس کی معرفت دنیا کی خوش حالی میں اضافہ کیا جائے۔

"بین الاقوامی ذخیرہ نقد کا راضی نامہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اول تو بین الاقوامی مبادلات میں تنظیم و استحکام کو داخل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ وہ کسی غیر تغیر پذیر نظام کا حامی ہے۔ دوسرے رواں کھاتے کے لین دین میں بہ جہت ادائیوں کے لئے سہولتیں فراہم کرنا چاہتا ہے۔ تیسرے کسی ملک کی بین الاقوامی ادائیوں میں عارضی طور پر جو عدم توازن پیدا ہوتا رہتا ہے اس پر قابو پانے کے لئے اضافی مبادلات خارجہ کا بندوبست کرنا چاہتا ہے تاکہ متعلقہ ملک اس لالچ کا شکار نہ ہو جائے کہ اپنے عدم توازن کو دور کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں وہ اپنے زر کی قدر میں زیادہ فرسودگی پیدا کرلے۔ یہ خصوصیت دونوں بڑی جنگوں کے درمیانی وقفہ میں بہت نمایاں ہوگئی تھی، اور اس نے بین الاقوامی تجارت کو تباہ کر ڈالا تھا۔

"بین الاقوامی بنک کا مقصد ان ملکوں کو سرمایہ فراہم کرنے میں سہولت پیدا کرنا ہے جو یا تو جنگ کی وجہ سے برباد ہو گئے ہیں یا جن کے وسائل ابھی غیر ترقی یافتہ ہیں تاکہ ان کی زندگی کا معیار بلند کیا جاسکے۔ ہندوستان اگر یہ چاہتا ہے کہ کم مدت میں اپنے صنعتی امکانات کو پوری طرح ترقی دے سکے تو اُسے باہر کے ملکوں سے بہت سا قرضہ لینا ہوگا اور اس بنک کے ذریعہ اُسے موقع ملے گا کہ وہ ہندوستان کی صنعتوں پر غیر ملکی سرمایہ داروں کا اقتدار قائم کرائے بغیر قرضہ حاصل کرسکے۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ یہ راضی نامے اپنی تمام جزئیات کے لحاظ سے مکمل ہیں۔ جن راضی ناموں کے تیار کرنے میں چالیس قوموں نے حصہ لیا ہو ان کے بارے میں کوئی شخص بھی یہ توقع قائم نہیں کرسکتا کہ وہ سب کے لئے اطمینان بخش ہوں گے۔ چنانچہ ان راضی ناموں پر اعتراض کئے جاسکتے ہیں اور تین اعتراض خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ راضی نامے قبل از وقت ہیں۔

کیونکہ ان پر موثر طریقہ پر عملدرآمد اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کی تائید میں تجارتی پالیسی کے سلسلے میں کوئی بین الاقوامی راضی نامے پہلے سے کئے جا چکے ہوں۔ یہ اعتراض میری رائے میں اس حد تک بالکل درست ہے کہ ان راضی ناموں کے لئے بین الاقوامی تجارتی انتظامات کی ضرورت لازمی ہے۔ اور ان کو ہرگز ان کا بدل نہیں سمجھا جا سکتا۔

"لیکن تمام بین الاقوامی راضی نامے ایک ساتھ نہیں کئے جا سکتے، کسی نہ کسی نقطہ سے ہمیں اپنے کام کا آغاز کرنا ہوتا ہے۔ اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ ان راضی ناموں کے بعد ایک تجارتی راضی نامہ بھی ہونا چاہیئے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے بین الاقوامی تجارت، اور روزگار کے اضافہ کے لئے کچھ تجویزوں کو پیش بھی کیا ہے اور اس سال موسم گرما کے شروع زمانے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی اس پر غور اور بحث کرنے کے لئے طلب کی ہے۔ ہندوستان کے پاس ان مباحث میں شرکت کے لئے دعوت نامہ آیا تھا جس کو قبول کر لیا گیا ہے۔

"دوسرا اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے کہ یہ راضی نامے چل نہیں سکیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے جن ذخائر نقد کا انتظام کیا گیا ہے وہ بہت ناکافی ہیں۔ یہ دلیل بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن سب سے اول تو یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ان راضی ناموں کے ذریعے جن ذخائر نقد کو فراہم کیا جائے گا وہ مقروض ملکوں کے لئے صرف ایک واحد یا ایک خاص ذریعہ مبادلات خارجہ کی فراہمی کا نہیں ہوں گے۔ اس قسم کا مفروضہ راضی ناموں اور بین الاقوامی ذخیرہ نقد کی بالکل غلط تعبیر ہوگی۔ عام طور پر ملکوں کو حسب سابق مبادلات خارجہ کی معمولی رسد کے لئے اپنے مال اور خدمات کی برآمد اور تمسکات کی منڈی پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک ایسے اضافی ذریعہ سے جیسا کہ بین الاقوامی ذخیرہ نقد ہے کوئی مدد نہیں ملے گی یا یہ پسندیدہ چیز نہیں ہے علاوہ جس زر کے کمیاب ہونے کا امکان ہے وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ڈالر ہے اور جب ذخیرہ نقد کے ناقابل عمل ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ اس کے پاس ڈالروں کی صرف ایک محدود مقدار ہے لیکن اس راضی نامے میں اس محدود رسد کے بڑھانے کا انتظام رکھا گیا ہے جب کوئی زر کمیاب ہوگا جیسا کہ زیر بحث مثال میں ڈالر کو فرض کیا گیا ہے تو اس کی تقسیم راشن کے ذریعے

کی جائے گی اس بات کا مجھے اعتراف ہے کہ یہ اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل نہیں ہے کیونکہ وقت گذرنے پر ہی یہ بات معلوم ہو سکے گی کہ یہ ذخیرہ نقد کافی ہے یا ناکافی اور اس بات کا بہت کچھ انحصار ان معاہدوں پر ہو گا جو قومیں محاصل کروڑ گیری خصوصاً امریکہ کے محاصل کروڑ گیری اور تجارتی پالیسی کے بارے میں باہم کرینگی اور امریکہ کے لوگ غیر ملکوں میں سفر کے دوران میں جتنا روپیہ خرچ کریں گے اس پر ہو گا۔ لیکن ذخیرہ نقد کی مخالفت میں مجرد یہ بات کہ مستقبل کے بعض حالات میں اعتبار کی موجودہ رسد ناکافی ثابت ہو سکتی ہے کوئی وزنی دلیل نہیں بن سکتی۔

آخر میں اعتراض یہ ہے اور یہ بہت اہم اعتراض ہے کہ ذخیرہ نقد سے جو فوائد حاصل ہوں گے ان سے اس نقصان کی تلافی نہیں ہو گی جو زر کے معاملات میں ملک کے اقتدار اعلیٰ پر پابندی قبول کرنے کی وجہ سے لازماً رونما ہو گا۔ لیکن اگر ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جن میں ہم مبتلا ہیں تو اس قسم کی پابندی کو تو قبول کرنا ہی ہو گا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ سب قومیں برابر کی پابندی قبول کریں۔ یہ نہ ہو کہ دوسرے سب ملک تو پابندی قبول کرلیں لیکن کوئی ایک ملک غیر محدود اقتدار اعلیٰ کا حسب سابق مالک رہے۔

"یہ راضی نامے ہندوستان کے لئے موقعے فراہم کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسے لمحہ میں جو ساری دنیا کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے ایک نئی عالمی تنظیم میں شرکت کر سکے اور اس طرح دنیا کے زر کی تاریخ کے آئندہ راستے کی تشکیل کر سکے۔ اگر ہندوستان نے ذخیرہ نقد اور بنک میں شرکت نہیں کی تو اس کی وجہ سے صرف یہی خطرہ پیدا نہ ہو گا کہ ایسے فیصلے کئے جا سکیں گے جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہوں گے اور اور وہ ان نئے اداروں کے فوائد سے محروم ہو جائے گا۔ یہ خطرہ اپنی جگہ پر اہم ہے۔ لیکن میرے نزدیک فیصلہ کن نہیں ہیں۔ فیصلہ کن بات یہ ہے کہ ہندوستان اس وقت ایشیا میں سب سے زیادہ مضبوط اور معاشی حیثیت سے سب سے زیادہ منظم ملک ہے اور اُسے یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ایشیا کی رہنمائی صرف اُسی کا مخصوص حق ہے۔"

سہارنپور کی قریش برادری

اس برادری کی تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ الشیوخ مرتبہ حافظ امام الدین صاحب اکبرآبادی۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قصائیوں کی نسل کا سلسلہ عرب کے قریش سے ملتا ہے۔ اس کتاب کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"بنی قصی میں تعلیم کی کمی ہے اور یہ کمی صرف تجارت کی وجہ سے ہے عرب چونکہ ایک آزاد قوم تھی وہ کسی کی ملازمت کو غلامی سے بدتر سمجھتی تھی اس لئے ابھی آزادی کا اثر اب تک اس فرقے میں مسلسل چلا آرہا ہے۔ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اگر غور سے دیکھا جائے تو اس فرقے میں بمشکل فی ہزار ایک یا دو ملازم پیشہ نکلیں گے باقی تمام تجارت پیشہ نظر آئیں گے۔

"ہم جانتے ہیں کہ یہ فرقہ اپنی تجارتی حساب وکتاب کی ضرورت کو محسوس کرکے، صرف ابتدائی تعلیم پر اکتفا کرتا رہا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتوں کا فقدان ہے۔ اگرچہ عالم وفاضل حکیم ڈاکٹر وکیل وبیرسٹر اور تحصیلدار و ڈپٹی کلکٹر وغیرہ وغیرہ نیز انگریزی فوجوں کے لفٹیننٹ تک اس فرقے میں موجود ہیں، لیکن میری اس سے تسکین نہیں ہوسکتی کیونکہ آج ہندوستان کے ہر شہر وقصبہ اور گاؤں میں یہ جماعت بحیثیت مجموعی لاکھوں کی تعداد میں ہے جن میں فی صدی ۶ یا ۷ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں باقی تمام مبتدی یا اَن پڑھ ہیں۔

"زمانے کا سخت تقاضہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی جائے کیونکہ بغیر اعلیٰ تعلیم کے تجارت بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ دس سال میں اس علاقہ کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں اب

لہ سہارنپور کی قریش برادری کے حالات تمام تر محمد یامین صاحب کے ذریعہ معلوم ہوئے جو ضلع جمعیۃ القریش کے سکریٹری مجلس احرار کے خاص رکن، میونسپل تعلیمی کمیٹی کے رکن وغیرہ ہیں۔ میں اس سلسلے میں ان کا بہت ممنون ہوں۔

ذاتی مدرسے اور قصبات میں مکتب قایم ہو چکے ہیں اور طلباء کی تعلیمات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ قومی کاموں میں دریا دلی کے ساتھ سب سے زیادہ چندہ دینا یہ سب کچھ ہے لیکن جس فرقہ کی ہندوستان میں کم و بیش ساٹھ لاکھ آبادی ہو اس کے لئے چند مدرسوں یا مکتبوں کا قیام کافی نہیں ہے۔ اس جماعت کی تباہی و بربادی کا اصلی راز اور حقیقی سبب نہ تو اس کا پیشہ ہے اور نہ ذات بلکہ صرف تعلیم کا فقدان ہے اور بس

"شہر آگرہ میں برادران قریش کی ہندوستان کے تمام مقامات سے زیادہ تعداد ہے۔ قریباً ۴۰ ہزار اور یہاں کے اکثر خاندانوں کے پاس شاہی کاغذات بھی ہیں اور جن کے پاس نہیں ہیں ان کو اپنا شجرہ تقریباً حفظ یاد ہے۔"

برادری کے تین اخبار نکلتے ہیں۔ "القریش" (امرت سر) "قریشی" (سونی پت، رہتک) "ندائے قریش" بہار سے۔ ۱۹۲۶ء میں جب آل انڈیا جمعیتہ القریش کا قیام ہوا تو تقریباً ہر صوبے سے رسالے اور اخبار نکالے گئے تھے۔

سہارنپور میں ان کی کل تعداد تقریباً ۲۰ ہزار ہے۔ ان کی زیادہ تعداد محلّہ موہانی سرائے اور محلّہ ڈھولی کھال میں ہے۔ جہاں یہ اکثریت میں ہیں اور ان کے علاوہ محلّہ داؤد سرائے، محلّہ قطب شیر، محلّہ مٹیا محل محلّہ نواب گنج، محلّہ ہرن ماران، محلّہ کلکڑ گنج، محلّہ نیا بانس، محلّہ کھالہ پار (میر کا کوٹ) اور محلّہ خواجہ زادگان میں پائی جاتی ہے۔ اوپر کے محلّوں میں سے صرف کلکڑ گنج میں ان کی تعداد کم ہے۔

برادری کے اکثر لوگ ذبیحہ اور چمڑے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے پڑچون کی دکان کا بھی کام کرتے ہیں۔ برادری میں جُفت فروش، پارچہ فروش، کُلاہ فروش، پان فروش، میوہ فروش (پھل کی دوکان) بھی ہیں۔ پھل کی آڑت کا کام بھی کرتے ہیں۔ فروٹ مرچنٹس میں ایک کا شمار اچھی آڑت میں کیا جاتا ہے پڑچون کی دوکانیں متوسط پیمانہ کی ہیں۔ آڑت نہیں ہے۔ بازار میں اچھی دوکانوں میں شمار ہوتا ہے۔

چمڑے اور مویشی کی تجارت کرنے والے لوگ خوش حال ہیں۔ کلاہ فروش اور سگریٹ کی ایجنسی والے بھی خوش حال ہیں۔ کلاہ فروشی کی اس شہر میں صرف دو ۲ دکانیں ہیں اور دونوں اسی برادری کی ہیں۔

چمڑا کانپور بھیجا جاتا ہے اور کچا بھیجا جاتا ہے۔ ہڈی بھی باہر بھیجتے ہیں اور بال بھی۔ آخر جنگ سے بیشتر

جاتی تھی، اب نہیں جاتی۔ مویشی کی تجارت میں گائے بھینس، پنجاب یا یو۔پی کے دوسرے اضلاع مثلاً بجنور اور مظفر نگر سے لاتے ہیں اور بیلوں کی بھی تجارت کرتے ہیں، بھیڑ بکری کی بھی تجارت [illegible] ہیں اور ان کی آڑھت بھی ہے۔ اکثر پنجاب سے آتی ہیں اور بہار سے بذریعہ ریل آتی ہیں۔ یہ مال دہرہ دون میں فروخت کرنے کے لئے منگایا جاتا ہے۔ اون کی بھی تجارت کرتے ہیں۔

گائے بھینس کی کھال کی تجارت کا کام پورا قریش برادری کے ہاتھ میں ہے۔ بھیڑ بکری اور کھالوں کی تجارت کا کام تین چوتھائی قریش برادری کے ہاتھ میں ہے اور ایک چوتھائی میں دوسرے اور لوگ ہیں جن میں بڑا کام راجپوت برادری کے یامین خاں محلہ داؤ دسرائے کے ہاتھ میں ہے۔ اون کا کام زیادہ تر ٹھیک کرتے ہیں۔

تندرستی کی حالت بہت اچھی ہے۔ کسرت اور پہلوانی کا سلسلہ برادری میں عرصہ سے چلا آرہا ہے اور عام طور پر شوق ہے۔ اُتن پہلوان سارے ہندوستان میں مشہور رہ چکے ہیں اور اس وقت بھی ایک مشہور پہلوان شریف احمد ہیں جن کی کاروباری حالت بہت اچھی ہے۔

تعلیم کا فقدان ہے، گریجویٹ ایک بھی نہیں ہے۔ انٹرمیجٹ دو ہیں۔ میٹرک بیس کے قریب ہوں گے جن میں ایک محمد یامین صاحب خود ہیں جنہوں نے یہ سب حالات لکھائے ہیں، دو مولوی بھی ہیں ایک مولوی منظور صاحب اور دوسرے مولوی حبیب صاحب۔ مولوی منظور صاحب منصوری کی مسجد میں پیش امام ہیں اور مولوی حبیب صاحب مدرسہ مظاہر العلوم میں مدرس ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب مفتی شفیع صاحب دیوبندی کی کتاب "نجابت النسب" کی تردید میں لکھی ہے۔

شراب رنگ کی صرف دو تین کو لت ہے۔ گانا سننے کی البتہ لوگوں کو عادت ہے۔ سینما کا زیادہ تھیٹر وغیرہ کا بھی شوق ہے۔ شادی بیاہ سختی کے ساتھ برادری کے اندر ہی ہوتا ہے اگرچہ تین چار مثالیں اس کے خلاف بھی موجود ہیں۔ رشتہ کے وقت بہت ٹھوک بجا کر دیکھا جاتا ہے کہ اس خاندان میں باہر کا تو کوئی میل نہیں ہے، اس لئے اس ڈر کی وجہ سے باہر سے کوئی عورت نہیں لاتے۔

پنچایت کا نظام بہت سختی کے ساتھ رائج ہے۔ تمام شہر کی پنچایت ایک ہے۔ البتہ اس کے

دو فریق بن گئے ہیں اور یہ فریق پنچ کے خاندانی جھگڑے کی وجہ سے بنے ہیں۔ برادری میں چار چودھری ہیں اور چار اُن کے مشیر ہیں۔ یہ سلسلہ موروثی چلتا ہے۔ اِن کا انتخاب نہیں ہوتا۔ چودھری حسب ذیل ہیں۔

۱۔ چودھری رشید احمد صاحب مونسپل کمشنر۔

۲۔ چودھری محمد اسحٰق صاحب۔

۳۔ چودھری عبدالحفیظ صاحب۔

۴۔ چودھری عزیز الدین صاحب۔

علیحدہ علیحدہ کسی چودھری کو کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ چاروں پنچ مل کر تمام معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔ تقریباً تمام تقریبوں کے ذمہ دار کلّی طور پر چودھری ہوتے ہیں وہ اس بات کو طے کرتے ہیں کہ کتنے آدمیوں کی دعوت کی جائے اور کس کو برادری میں رکھا جائے۔ کوئی تنازعہ ہوتا ہے تو عدالت کے پاس بہت کم جاتا ہے، عموماً پنچ ہی فیصلہ کر دیتے ہیں۔

ایک انجمن جمعیتہ القریش کے نام سے ہے۔ اِس کا الحاق آل انڈیا انجمن سے ہے۔ اس نے شادی بیاہ کے موقع پر ناچ کو بند کرا دیا ہے۔ دعوت میں خشکہ چاول پکتا تھا جس کو کر لعائے کا کھانا کہتے تھے یہ عشاء کے وقت سے صبح تک چلتا رہتا تھا۔ یہ بھی انجمن کی کوشش سے اب ختم ہو گیا ہے۔ نکاح بہت پہلے ہو جاتا ہے اور مکلاوا (یعنی رخصت) بعد میں ہوتی ہے۔ یہ رسم باوجود کوشش ختم نہیں ہو سکی۔ اس کے علاوہ اور رسوم کی اصلاح کی بھی بہت کوشش کی گئی ہے لیکن کوئی ختم نہیں ہوئی۔

برادری کے نظام میں ابھی تک کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اپنی جگہ پر قایم ہے بھاجی (یعنی دعوت) دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کچّی یا چھوٹی بھاجی اور دوسری پکّی یا بڑی بھاجی۔ کچّی بھاجی میں چاول دال پاؤ سیر فی کس کے حساب سے تقسیم کی جاتی ہے جس کا سلسلہ اب ختم ہو گیا ہے۔ پکّی بھاجی میں مٹھائی آدھ سیر فی کس کے حساب سے بانٹی جاتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر سَو من مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ جب سے دو فریق ہو گئے ہیں، ایک فریق میں ستّر من اور دوسرے میں تیس من بٹنے لگی ہے۔ چودھری کے خاندان سے تو پوری سَو من دونوں فریقوں میں تقسیم

کی جاتی ہے۔ لیکن باقی لوگ اپنے اپنے فریق کے لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

پیدائش سے موت تک تقریباً تین چار سو رسمیں ہوتی ہیں اور ان کی پابندی لازمی ہے۔ عوام اور مستورات کی مخالفت کی وجہ سے باوجود کوشش ان رسموں کو ختم نہیں کیا جا سکا ہے۔

برادری کے ممتاز ترین لوگ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ چودھری عبدالمجید صاحب مرحوم خلافت کمیٹی کے سکریٹری تھے اور مونسپل کمشنر تھے انہوں نے ہی اس شہر میں برادری کی عزت کو بڑھایا۔ ایک قومی مدرسہ انوار الاسلام کے نام سے شروع کیا تھا، یہ مڈل درجہ تک پہنچ گیا تھا اسی کی وجہ سے برادری میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔

۲۔ محلہ داؤ دسرائے میں چودھری رشید احمد صاحب دس سال سے مونسپل کمشنر ہیں۔ چھ سال جونیر وائس چیرمین رہے۔ دو سال سینیر وائس چیرمین رہے۔ اس سال میونسپل پبلک ورکس کے چیرمین ہیں۔ چمڑے اور آنت کی تجارت کرتے ہیں۔ سکنائی جائداد ہے لیکن کرایہ پر نہیں ہے ضلع جمعیتہ القریش کے صدر ہیں۔ ساتویں، آٹھویں سے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ برادری میں بہت زیادہ ہر دلعزیز ہیں۔ مراسم قبیحہ کے بہت خلاف ہیں۔ ہمیشہ اصلاح کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ ان کی حیثیت ساٹھ ستر ہزار کے قریب ہے۔

۳۔ محلہ چوابرادران میں شیخ رشید احمد، ان کا تعلق دوسرے فریق سے ہے۔ نوجوان آدمی ہیں، چمڑے کا کام کرتے ہیں، بہت پرانی اور مشہور فرم ہے۔ چودھری اللہ رکھا اور محمد یامین کے نام سے ہے، ان کی مالی حیثیت تقریباً ۵۰ ہزار کے قریب ہوگی۔ باغات ہیں صحرائی جائداد بھی ہے۔ چمڑے کا بہت بڑا کام ہے۔ ہڈی کا کام کرتے ہیں ان کے چھوٹے بھائی جن کا نام عبدالحسیب ہے، بریلی میں کام کرتے ہیں۔ ان کے ماموں محمد یامین مرادآباد میں چمڑے کا کام کرتے ہیں اور کچھ عرصہ پہلے دہرہ دون میں بھی کام کرتے تھے۔

۴۔ محلہ ڈھولی کھال میں چودھری عزیز الدین صاحب۔ بزرگوں میں سے بس ایک ہیں۔ تہتر سال کے قریب عمر ہے۔ ان کی حیثیت بھی پچاس ساٹھ ہزار ہے۔ سکنائی صحرائی جائداد کافی ہے باغ بھی ہیں۔ مویشی کا کام کرتے ہیں۔

۵- اسی محلہ میں حبیب احمد محمد یامین چمڑے کا کام کرتے ہیں۔ باہر مظفر نگر سے آئے ہیں پچاس ساٹھ ہزار کی حیثیت ہے۔ چمڑے کی دباغت کے کام کا ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی قایم کیا ہے۔ ان کے دو لڑکے ہیں مقبول احمد صاحب اور منظور احمد صاحب۔ یہ دونوں تحصیلدار ہیں۔ ایک بافیت میں ہیں۔

(نوٹ) دہرہ دون، منصوری، چکروتہ میں سب آبادی سہارنپور برادری کی ہے۔

سہارنپور ہی کے ایک عبدالحکیم صاحب بلند شہر میں ہیں۔ پٹرول کی ایجنسی ہے اور پندرہ سولہ لاریاں ہیں۔ سکنائی جائداد بہت پیدا کرلی ہے۔ یہاں جائداد کوئی پیدا نہیں کی۔

۶- اسی محلہ میں محمد یامین صاحب بھی ہیں۔ میٹرک پاس ہیں۔ نوجوان مخلص قومی کارکن ہیں ضلع جمعیۃ القریش کے سکریٹری ہیں۔ مونسپلٹی کی تعلیمی کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اچھے شاعر ہیں۔ "پیکر ادب" آپ کا خطاب ہے۔ مجلس احرار کے خاص رکن ہیں۔ محمد علی لائبریری کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ادبی انجمن بزم آزاد کے بھی جو آزاد انصاری سہارنپوری مرحوم کی یادگار میں قایم کی گئی ہے، آپ سکریٹری ہیں۔ مضمون نگار بھی ہیں۔ افسانے وغیرہ بھی لکھتے ہیں۔ اس تحقیقات کے کام میں آپ سے بہت مدد ملی۔

۷- محلہ خواجہ زادگان میں شیخ محبوب الٰہی صاحب۔ محبوب الٰہی۔ محمد یٰسین فرم کے مالک ہیں امپیریل ٹوبیکو کمپنی کے ضلع سہارنپور، مظفر نگر اور دہرہ دون کے لئے ایجنٹ ہیں۔ چھ سات لاکھ کا بزنس ہے اور حیثیت ایک لاکھ کی ہے۔ ان کی ایک اور فرم حاجی محمد یعقوب محمد اسحٰق کے نام سے ہے یہ جنرل مرچنٹس ہیں۔ زیادہ تر ٹوپی لیکن چھتری اور دوسری چیزوں کا بھی کام کرتے ہیں۔ حافظ بھی ہیں۔ نہایت سادہ مزاج اور خلیق نوجوان ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی شیخ مقبول الٰہی جمعیۃ القریش کے جائنٹ سکریٹری ہیں۔ محمد علی لائبریری کے منیجر اور مجلس احرار کے سرگرم رکن ہیں۔ یہ آل انڈیا، صوبہ اور ضلع تینوں کے رکن ہیں۔

۸- محلہ گلکڈ گنج میں منشی نور محمد صاحب، صاحب دیوان شاعر ہیں، ان کے تین دیوان ہیں، دو شایع ہوچکے ہیں، ایک زیر طبع ہے۔ عموماً گیت کہتے ہیں۔ "میرے مولا بلالو مدینے مجھے"۔ اور "بولی اماں محمد علی کی" انہی کی نظمیں ہیں۔ فخر سہارنپور کا خطاب ملا ہوا ہے۔ مالی حالت بیس پچیس ہزار۔ سکنائی جائداد اور باغات ہیں۔ بھائی ٹوپیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔

۹۔ اسی محلہ میں محمد یونس صاحب ٹھیکیدار ہیں، ان کی حیثیت تقریباً پچاس اور ستر ہزار کے درمیان ہے۔ سہارنپور کی سبزی منڈی کے ٹھیکیدار ہیں۔

۱۰۔ شریف احمد صاحب۔ ایک مشہور پہلوان ہیں۔ ان کی کاروباری حالت بھی اچھی ہے مویشی کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ دہرہ دون کالج میں کشتی سکھلانے کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ایک فرلانگ تک رسے کے بل چل سکتے ہیں۔ ان کا سلسلہ تلمذ گاما پہلوان سے ہے۔ سال میں پانچ چھ مہینے باہر گزارا کرتے تھے لیکن جب سے کاروبار شروع کیا ہے سہارنپور میں مستقل طور پر رہنے لگے ہیں۔

۱۱۔ محلہ لوہانی سرائے میں شریف صاحب ہیں جن کی بھیڑ بکری کی آڑت ہے۔ ان کی واحد آڑت ہے۔ ان کی پچاس ہزار کی حیثیت ہوگی۔ دہرہ دون، منصوری، چکروتہ، رڑکی اور بعض اوقات انبالہ تک کے لوگ ان ہی کے یہاں سے مال خریدتے ہیں۔

۱۲۔ جو لوگ ملازمت کر رہے ہیں ان میں بابو محمد یعقوب صاحب ڈھولی کھال والے پوسٹ آفس میں بہت عرصہ سے کلرک ہیں۔

۱۳۔ اسی محلہ کے بابو عبدالعزیز صاحب دیوانی میں کلرک ہیں۔

۱۴۔ اور محلہ لوہانی سرائے کے بابو عبدالحفیظ صاحب آج کل کالکا میں گارڈ ہیں۔

برادری میں ایسے لوگ جن کی حیثیت پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان ہے صرف چار پانچ ہوں گے۔ ایسے لوگ جن کی حیثیت دس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان ہے بیس پچیس ہوں گے اور ایک ہزار اور دس ہزار کے درمیان حیثیت رکھنے والے لوگ بہت سے ہوں گے۔

برادری کے لوگوں میں صرف تین آدمیوں کا سرمایہ صحرائی جائداد میں لگا ہوا ہے ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جن کا سرمایہ سکنائی جائداد میں لگا ہوا ہے۔ ایک شخص کا سرمایہ دباغت کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں بھی لگا ہوا ہے۔ باقی تجارت کے کام میں سب لوگوں کا تھوڑا بہت سرمایہ لگا ہوا ہے گورنمنٹ کے قرضہ میں صرف وار بانڈ میں ہے، اس کے علاوہ نہیں ہے۔ زیور کا سب کو شوق ہے۔ کھانے کا خرچ اچھا رہتا ہے چار پانچ لوگ ایسے ہیں جن میں مغربی فرنیچر ریڈیو وغیرہ کا رواج ہو گیا ہے

سوٹ وغیرہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔

برادری کے لوگوں کی طرف سے تعمیر کرائی ہوئی پانچ مسجدیں ہیں، سیاسی تحریکوں میں بھی چندہ وغیرہ دیتے ہیں۔ مدرسوں کے لئے بھی چندہ دیتے ہیں اسلامیہ اسکول میں دس روپیہ یومیہ سے زیادہ چندہ دیا جاتا ہے، اور یہ مذبح میں ایک آنہ فی راس کے حساب سے پہلے مقرر تھا۔ مدرسہ مظاہر العلوم کو بھی چندہ دیتے ہیں۔ سات آٹھ سو مکانوں سے مدرسہ مظاہر العلوم کے طالب علموں کو کھانا دیا جاتا ہے

پیر پرستی نہیں ہے۔

اپنے پرانے کام کے علاوہ تجارت کی طرف اس برادری کے لوگ مائل ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں۔

شہر سہارنپور کے علاوہ ضلع سہارنپور میں صاحب اقتدار برادری جوالاپور اور رڑکی میں ہے سب متوسط درجے کے کھاتے پیتے لوگ ہیں اور زیادہ تر چمڑے کا کام کرتے ہیں اور گوشت کے کنٹریکٹر ہیں۔ لکڑی کے ٹھیکے کا کام بھی کرتے ہیں۔

جوالاپور میں بابو عبدالعزیز صاحب سابق مونسپل کمشنر، آل انڈیا جمعیۃ القریش کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر، بہت بڑے قومی کارکن ہیں۔ پہلے چمڑے کا بڑا کام کرتے تھے اب لکڑی کا کام کرتے ہیں تاریخ قریش کے ناشر یہی ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ غالباً انٹر پاس ہیں۔ "بیدار"۔ ماہنامہ جوالاپور "ملت" ہفت روزہ لاہور، اور "کعبہ" روزنامہ دہلی کو ۱۹۳۶ء میں برادری کی تنظیم اور بیداری کے لئے نکالا کرتے تھے۔

جوالاپور میں برادری کا اسکول ہے جس کی تعلیمی حالت اچھی ہے اور جس میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہے

جوالاپور میں ایک مولانا فیض محمد صاحب کوکب ہیں جو بڑے سیاسی کارکن ہیں۔ مجلس احرار جوالاپور کے صدر رہ چکے ہیں اور متعدد مرتبہ سیاسی تحریک کے سلسلے میں جیل بھی جا چکے ہیں۔ "بیدار" "ملت"۔ اور "کعبہ" کے چیف ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور دوسرے اخبارات میں بھی ایڈیٹوریل بورڈ میں کام کر چکے ہیں۔ قومی شاعر بھی ہیں۔ رونق صدیقی جوالاپوری کے استاد ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے انہی سے اصلاح لی ہے۔

جوالاپور کی مونسپلٹی میں مخلوط انتخاب تھا، انہوں نے بڑی کاوش سے جداگانہ انتخاب جاری کرایا اور برادری کے

لئے دو نشستیں حاصل کیں۔ کوکب صاحب جنگلات کا بھی ٹھیکہ لیتے ہیں۔ ان کی حیثیت دس پندرہ ہزار کی ہے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔

اسی قصبہ میں طفیل احمد صاحب سابق میونسپل کمشنر بھی ہیں۔ ان کا اچھا خاصا کاروبار ہے۔ چمڑے کا کام کرتے ہیں۔ دس پندرہ ہزار کی حیثیت ہے۔

دیوبند کی برادری تعلیمی معاملات میں پیچھے تھی، کاروبار بھی اچھا نہیں تھا، اب پہلے کی نسبت سے بہت بہتر ہوگئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب وہاں کی برادری نے تجارت کی طرف توجہ شروع کردی ہے۔ چمڑے کی تجارت اور چاول اور جوتوں وغیرہ کا کام شروع کیا ہے، باغ اور پھلوں کا کام بھی کرتے ہیں، یہاں کوئی ممتاز آدمی نہیں ہے۔ دیوبند والوں نے برادرانہ تنظیم کا کام بہت کیا ہے اور تمام رسوم قبیحہ کو تقریباً ختم کردیا ہے اور ضیافتی نظام میں بھی بڑی تبدیلی پیدا کردی ہے۔

تحصیل نکڑ میں برادری جاندار ہے اور لوگ خوب کھاتے پیتے ہیں۔ گنگوہ میں رمضانی، کانگریسی خیال کے ایک میونسپل کمشنر ہیں۔ چمڑے اور مویشی کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت تیس چالیس ہزار کی ہوگی۔ دس، بارہ سال سے مونسپل کمشنر ہیں۔

مختار صاحب چمڑے کا کام کرتے ہیں۔ جمعیۃ القریش تحصیل نکڑ کے سکریٹری ہیں حیثیت دس ہزار کی ہوگی۔

چلکانہ میں محمد یسین صاحب چمڑے اور مویشی کا کام کرتے ہیں، مونسپل کمشنر ہیں۔ حیثیت دس پندرہ ہزار کی ہے۔ عبدالرزاق صاحب بھی یہی کام کرتے ہیں اور ان کی حیثیت بھی اتنی ہی ہے۔

نوٹ:۔ سہارنپور ضلع کے تقریباً ہر قصبہ اور دیہات میں برادری کے لوگ موجود ہیں۔

دوسرے شہروں میں سہارنپور کی برادری کے کام کرنے والے صاحب حیثیت لوگ حسب ذیل ہیں

۱۔ دہرہ دون میں بابو عبداللطیف صاحب گورنمنٹ کنٹریکٹر ہیں۔ انٹرمیڈیٹ پاس ہیں۔ دہرہ دون میں سب سے بڑا کام آپ ہی کا ہے۔ دو دکانیں گوشت کی ہیں۔ سکنائی جائداد بہت کافی ہے۔ دس پندرہ مکانات ہیں۔ ان کی حیثیت پچاس ہزار کی ہوگی۔

نوٹ:۔ دہرہ دون میں اس برادری کے آدمی سات سو آٹھ سو سے زیادہ نہیں ہوں گے سب سہارنپور کے ہیں اور متوسط درجے کے لوگ ہیں۔

۲۔ منصوری میں بابو محمد ابراہیم صاحب رئیس منصوری ہیں۔ لنڈھورا بازار اور کلہڑی بازار میں سکنائی جائداد ہے پچیس تیس ہزار کی حیثیت ہوگی۔ یہ کوئی کاروبار نہیں کرتے ہیں۔

۳۔ شیخ عبدالغنی عبدالمجید صاحبان مچھلی کا کام کرتے ہیں، بہت بڑے پیمانہ پر۔ تقریباً تمام چھاؤنی کی یہی تنہا سپلائی کرتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی معاشرت کو خوب اختیار کر لیا ہے، ان کی حیثیت تیس[۳۰] چالیس[۴۰] ہزار کی ہوگی۔

۴۔ محمد یامین صاحب۔ ان کی تین بڑی دکانیں کباڑ خانہ کی ہیں، ان میں پرانا مال ہر قسم کا ریڈیو سیٹ فرنیچر وغیرہ فروخت ہوتا ہے۔ بیس پچیس ہزار کی حیثیت ہے۔

۵۔ شیخ کالا صاحب چھاؤنی منصوری اور ہائی اسکول اور کالجوں کے گوشت کے کنٹریکٹر ہیں۔ دس پندرہ ہزار کی حیثیت ہے۔ ایک شاندار بلڈنگ لنڈھورا بازار میں ہے۔

۶۔ چکراتہ میں بابو محمد یوسف گورنمنٹ کنٹریکٹر ہیں۔ پچھلی جنگ میں کام کیا تھا۔ چکراتہ اور سہارنپور میں جائداد ہے۔ صحرائی اور سکنائی دونوں قسم کی۔ حیثیت دس پندرہ ہزار ہے۔ پہلے ان کی حیثیت ایک لاکھ کی ہوگی۔ پہلگام (مدراس) میں بھی ان کا ٹھیکہ ہے۔

۷۔ عزیز احمد محمد یامین عرف بھورا ٹھیکیدار گوشت، انڈا، مرغی سبزی وغیرہ کا ٹھیکہ ہے۔ بیس[۲۰] پچیس[۲۵] ہزار سے زیادہ کی حیثیت ہوگی۔

۸۔ شملہ میں حاجی محمد اسمٰعیل صاحب سکنائی جائداد بہت کافی ہے۔ چھ سات بلڈنگ ہیں اور اپنا کام بھی کرتے ہیں۔ ان کی ایک دکان جنرل مرچنٹس کی بھی ہے۔ ریڈیو انجینئرنگ کا کام بھی کرتے ہیں۔ سینما بھی ہے۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی حیثیت ہے۔

۹۔ حاجی نصیر الدین صاحب آرمی کنٹریکٹر ان کی حیثیت چار پانچ لاکھ کی ہوگی۔ آٹھ دس بلڈنگ ہیں۔

ہندوستان کے ممتاز ترین قریش جن کا ذکر رسالہ "تاریخ الشیوخ" میں کیا گیا ہے اور جن کی تصاویر بھی شایع کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں :-

۱- مولانا محمد امام اکبرآبادی صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا جمعیتہ القریش۔

۲- صاحبزادہ حاجی شیخ بھیا محمد رشید الدین احمد میرٹھ صدر اعظم آل انڈیا جمعیتہ القریش۔

۳- خان بہادر مولوی بدرالدین صاحب او- بی- ای رئیس اعظم گڑھ۔

۴- خان صاحب مولوی جان محمد صاحب رئیس پونہ پریسیڈنٹ انجمن اتحاد اسلام پونہ۔

۵- صاحبزادہ شیخ حافظ رفیع الدین صاحب رئیس اعظم گڑھ۔

۶- حافظ عبدالغفار صاحب رئیس اجمیر و نائب صدر جمعیتہ القریش صوبہ راجپوتانہ۔

۷- شیخ بابو محمد ابراہیم خاں صاحب رئیس منصوری۔

۸- شیخ جان محمد صاحب سکریٹری ڈسٹرکٹ جمعیتہ القریش سیالکوٹ۔

۹ و ۱۰- شیخ محمد یعقوب و محمد ظہور صاحبان رئیس مرادآباد۔

۱۱ و ۱۲- حکیم عبدالعزیز صاحب و شیخ عبدالحکیم صاحب وکیل سیالکوٹ۔

۱۳ و ۱۴- ابوالمنیر مشتاق و حضرت کے- عبدالغفار صاحب خلیق رئیس بنگلور۔

۱۵- شیخ رحمانی عبدالرحمٰن صاحب فیضی متولی مسجد اعظم بنگلور۔

۱۶- شیخ منشی رحیم بخش صاحب مختار ریاست کلسیہ۔

۱۷- عبدالعزیز صاحب مالک اخبار "ملت" و ناشر "تاریخ الشیوخ"۔

۱۸- بابو ظفر حسین صاحب آرمی کنٹراکٹر و سپہ سالار رضا کاران جمعیتہ القریش۔

۱۹ و ۲۰- حاجی ظفر احمد صاحب و بابو منظور احمد صاحب امروہوی۔

رفتارِ عالم

بعض دریا اچانک اپنا راستہ بدلتے ہیں۔ بعض آہستہ آہستہ کناروں کو کاٹتے ہیں۔ سیاست کا طریقہ بھی یہی ہے، کبھی جنگ اور انقلاب، کبھی خاموش کام۔ آج کل زمانہ خاموشی سے کام کرنے کا ہے لڑائی سے تھک گئے ہیں، سوائے کومن تانگ اور کومیونسٹ چینی فوجوں کے، سیاسی سرگرمیاں جاری ہیں۔ روس اور چین کی قومی حکومت میں کئی مہینے ہوئے ایک معاہدہ ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ روس نے چینی کومیونسٹوں کی حمایت کا خیال چھوڑ دیا ہے، اور کومیونسٹ اور قومی حکومت میں سمجھوتا کرانا چاہتا ہے۔ حال میں مانچوریا سے روسی پیش قدمی کی جو خبریں آئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ روس نے صرف مصلحت سے معاہدہ کیا تھا، اپنے اوپر کوئی مستقل اخلاقی پابندی عاید نہیں کی تھی۔ متحدہ اقوام کی مجلس کے جلسے سے پہلے روس اور متحدہ ریاستوں کے درمیان بھی ایک سمجھوتا ہوا تھا جس سے مسٹر برنز بہت مطمئن تھے، اور اسی وجہ سے انہوں نے برطانیہ اور روس کی بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اب متحدہ ریاستوں کی حکومت سوچ رہی ہے کہ سمجھوتہ واقعی سمجھوتا تھا یا محض غلط فہمی، اور بعض با اثر لوگ کہہ رہے ہیں کہ ایک حد مقرر کر دینا چاہئے، کہ روس اس کے آگے بڑھے تو اس سے باز پُرس کی جائے۔ متحدہ ریاستوں کی حکومت سب کو نصیحت کرنے کے بعد کہ خفیہ معاہدے نہ کرنا چاہئے ایسے معاملے کرنے لگی ہے جن کا حال کسی کو بتایا نہیں جاتا، اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ روس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں۔ روس کو ملزم ٹھہرانے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہاں کی حکومت سوشلسٹ ہے اور مصلحت سے کام لیتی ہے۔ بہر حال چین کو امن نصیب ہوتا نظر نہیں آتا۔ اب وہاں قومی حکومت اور کومیونسٹ غیروں کے آلۂ کار نہیں گے، جب تک کہ ایشیا والوں کے سامنے مشترک خوش حالی کی قسم کا کوئی اور منصوبہ پیش کرنے والا پیدا نہ ہو۔ فرانسیسی ہند چینی کی قومی تحریک اب اس درجہ بے بس ہو گئی ہے کہ اس ملک سے برطانوی اور برطانیہ کی ہندوستانی فوجیں بیشتر ہٹالی گئی ہیں اور فرانسیسی

پورے طور پر مسلط ہو گئے ہیں۔ انڈونیشیا میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے تھا لیکن وہاں سامراجیت کا کھیل شروع ہی سے کچھ بگڑ گیا۔ انڈونیشیا کی قومی حکومت پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ جاپانی تسلط کی یادگار ہے، یہ الزام بالکل غلط ثابت ہوا، اور قومی حکومت ان انتہا پسندوں پر بھی غالب آگئی جو برطانوی فوج سے الجھنا چاہتے تھے برطانوی فوج نے جاپانیوں کے ہتھیار لے لئے اور اتحادی قیدیوں کو رہا کر کے محفوظ مقاموں پر پہنچا دیا تو اس کے پاس اور کوئی فرض ادا کرنے کو نہیں رہا، ہولینڈ کی فوجوں اور ان کے سامان کو انڈونیشیا لے جانے کی خاصی شدید مخالفت آسٹریلیا اور برطانیہ کی بندرگاہوں پر کی گئی۔ اور ہولینڈ کی جو فوجیں انڈونیشیا پہنچیں ان کا رویہ ایسا تھا کہ برطانوی فوج کے انگریز اور ہندوستانی سپاہی دونوں ان سے نفرت کرنے لگے۔ یہ سب اس کی علامتیں ہیں کہ انڈونیشیا برطانیہ کی مدد سے فتح نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بھی کچھ بہت امکان نہیں کہ وہ دلفریب وعدوں کے ذریعے قابو میں کر لیا جائے۔ ہالینڈ کی طرف سے کوئی ایک مہینہ ہوا یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ انڈونیشیا کو تاج کے ماتحت آپ اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق دیا جائے، اور جب انڈونیشی قوم کو حکومت کی مشق ہو جائے تو اسے ہالینڈ کے سامراج سے الگ ہونے کا اختیار ہو۔ اس تجویز کو انڈونیشیا کے قومی لیڈروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہالینڈ کی طرف سے ڈاکٹر فان موک گئے اور برطانیہ کی طرف سے ایک بہت ہی تجربہ کار سیاست داں سر آرچیولڈ کلارک کر۔ اس موقع پر انڈونیشیا کے قومی لیڈروں میں اختلاف ہو سکتا تھا، اور ہوا بھی، لیکن آخری خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی تحریک کے وہ رہنما جو اعتدال پسند سمجھے جاتے ہیں اپنے انتہا پسند بھائیوں کو اس کا یقین دلانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان مقصد کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اور دونوں کا طریق کار بھی ایک سا ہو جائے گا اگر اس گفتگو سے جو اب ہونے والی ہے انڈونیشیا کو آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر فان موک کی کامیابی کے لئے یہ شگون اچھا نہیں ہے کہ انہیں جواب کے لئے اتنے دن تک انتظار کرنا پڑا، اور اس درمیان میں کسی با اثر فرقے یا شخصیت نے اپنا سودا الگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انڈونیشیا کی قومی حکومت کا انتظار کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ اب ڈاکٹر سلطان شہریار اس اعتماد کے ساتھ

گفتگو کریں گے کہ ان کی قوم متحد ہے او ہان کے ساتھ ہے۔ اور جہاں کے شوقین ہیں، جیسے کہ انگریزی میں کہتے ہیں، احتیاط اور مصلحت کو ہوا میں اڑا دے گی۔

ہالینڈ کا سامراج کمزور ہے اور تسلط حاصل کرنے کے نئے اور زود اثر طریقوں سے واقف نہیں۔ برطانیہ نے بھی جنگ کے دوران میں استقلال پیدا کرنے کے نئے طریقے نہیں سیکھے اور اس کی قدامت پسندی نے مشرقی دنیا میں اس کے وقار کو خاصا صدمہ پہنچایا ہے۔ اس کے حامی بھی اسی کی طرح قدامت پسند ہیں جو صورت حال کو قایم رکھنے کے سوا دل بہلانے کے لئے بھی اور کوئی تصور پیش نہیں کرسکتے۔ برطانیہ کے مخالف اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ میدان جنگ میں اس کے مقابلے پر آسکیں ہندچینی کا قصہ ختم ہوگیا ہے، انڈونیشیا میں بھی ہالینڈ کی اس طرح مدد کی جاسکتی ہے کہ بالآخر وہ کامیاب ہوجائے، ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کی عداوت میں بڑے امکانات ہیں، مصر کی بے چینی بندوق سے دور کی جاسکتی ہے اور متحدہ اقوام کی مجلس کو یقین دلایا جاسکتا ہے کہ برطانیہ نے ہر موقع پر انصاف اور حق پرستی کے اعلیٰ معیار پر عمل کیا۔ لیکن روس نے یہی طریقہ اختیار کیا تو کیا ہوگا؟ روسی بڑی بیدردی سے اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی سیاست بھی بڑی آزاد ہے۔ جو رویہ برطانیہ کا انڈونیشیا، ہندوستان اور مصر میں ہوگا، وہی روس کا ایران اور ترکی میں ہوگا، اور برطانوی سامراج کا ایک محاذ مضبوط کیا گیا، تو دوسرا اسی نسبت سے کمزور ہوجائیگا، بحر روم، نہر سوئیز، بحر اخضر اور بحر عرب کا راستہ ایک طرف سے محفوظ کیا گیا تو دوسری طرف روسی اس کے مورچوں کو توڑ دیں گے۔ ایران سے ۱۹۴۲ء میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق اب برطانیہ اور روس دونوں کو اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لینی چاہئیں، برطانیہ نے معاہدوں کی پابندی کی ہے۔ روسیوں نے شمال مشرقی اور شمالی ایران کو خالی کردیا ہے، مگر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک موجودہ بے چینی کی کیفیت باقی ہے وہ کہیں کہیں اپنی فوجیں رکھیں گے۔ ان کے اس اعلان نے ایرانی حکومت کو پریشان کردیا ہے، اور برطانیہ اور متحدہ ریاستیں غور کررہی ہیں کہ اس اعلان کا کیا جواب دیا جائے جمہوری ریاستوں نے دنیا میں اپنا اقتدار غیر مہذب قوموں کو تہذیب سکھانے، غلاموں کو آزادی، اور خود مختاری کے قابل بنانے کا بہانہ کرکے پھیلایا، اب لوگ سمجھ گئے ہیں کہ یہ جادو اثر نسخہ کتنا اور کس کے

بجائے ان اقلیتوں کو جن کی اپنی الگ زبان اور تہذیب ہے، آزاد کرنے کے لئے مداخلت کی جاتی ہے، اور تسلط قائم کیا جاتا ہے، جادوگر سے بہتر منتر کی تاثیر سے کون واقف ہوگا۔ برطانیہ کو معلوم ہے کہ ظلم سے بچانے کا عذر روس کے لئے کتنا کارآمد ہو سکتا ہے۔ برطانوی سامراج کے اندر، اور خصوصاً ہندوستان اور مصر میں "بے چینی کی کیفیت" بھی اکثر پیدا ہو چکی ہے، اور برطانوی سیاست دان اس کے مطلب بھی خوب سمجھتے ہیں۔ روس نے اپنا رویہ اور اپنی اصطلاحیں نہ بدلیں تو برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو "مجبوراً" اپنا طریقہ بھی بدلنا ہوگا، اور چین اور مشرق قریب کی ریاستیں مقابلے کا میدان بن جائیں گی۔

ہمارے ذہن کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ ہم ایک فریق کو اچھا اور دوسرے کو برا کہے بغیر کسی معاملے کو سمجھ نہیں سکتے، چنانچہ روس اور برطانیہ کی آویزش میں بھی ہم ایک فریق کو اچھا اور ایک کو برا کہہ کر مغالطے میں پڑے رہیں گے جو برطانیہ کے مخالف ہیں وہ کہیں گے کہ برطانیہ سامراجیت، سرمایہ داری، قدامت پسندی، ریاکاری کا نمونہ ہے، اور کوشش کریں گے کہ روس کے طرزِ عمل کو کسی نہ کسی اعتبار سے صحیح ثابت کریں۔ جو لوگ روس کو برا سمجھتے ہیں وہ برطانیہ کی تعریف تو نہیں کر سکتے، کیونکہ پھر ان کی بات پر کوئی یقین نہ کرے گا، لیکن وہ روس کو برا کہہ سکتے ہیں، اور کہیں گے، اور اس طرح برطانیہ کی طرفداری کو حق بجانب ثابت کریں گے۔ دنیا کے ہر ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کمیونسٹ ہیں یا سرمایہ داری یا اپنے ملک کے حالوں کی بے بسی اور پست حوصلگی سے بیزار ہیں، اور اس وجہ سے وہ روس کے بہی خواہ ہیں، اور اس کی ہر کامیابی کو اپنی ناکامیابی سمجھتے ہیں، ایسے لوگوں کی وجہ سے سیاست اور خصوصاً ایشیائی سیاست کے مسائل کو سمجھنا اور بھی دشوار ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ روس کو اپنا اور اپنی امیدوں کا دوست مانتے ہیں، اور ان کے دل سے یہ خیال نکالا ہی نہیں جا سکتا کہ روسی سیاست کے ہر منصوبہ کا مقصد کمیونزم کی اشاعت اور دنیا کا فائدہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے مشہور نامہ نگار لوئس فشر نے ایک ترقی پسند رسالے کے ادارہ سے قطع تعلق کر لیا۔ اس بنا پر کہ ادارہ ہر معاملے میں روس کے رویہ کو حق بجانب فرض کر کے اسے مناسب اور صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایشیائی ملکوں کے مصلحت اندیش لوگوں کو بھی ترقی پسندی کی ان تحریکوں سے علیحدہ ہونا پڑے گا جو اپنی رائے اور اپنے عمل کو روسی سیاست کا پابند کر لیں، یا پھر

یہ سمجھنا کہ ترقی صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان کا ملک روسی اشتراکی وفاق میں شامل ہو جائے انھیں اس کی تدبیر کرنا ہوگی کہ روس کا اقتدار جلد سے جلد پھیلے۔ دوسروں کی صنعتی ترقی کا جواب ہماری اپنی صنعتی ترقی ہے سرمایہ داری کا توڑ سرمایہ داری ہے تو روسی اشتراکیت کا علاج عالم گیر اشتراکیت سے کیا جا سکتا۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ اس پر بھی راضی نہ ہوں گے، روس کی حمایت اس لئے کریں گے کہ روس کو اچھا سمجھتے ہیں یا برطانیہ کے اقتدار کو اس لئے گوارا کریں گے کہ انہیں کمیونزم سے نفرت ہے۔ اپنی مصلحت کا خیال آیا تو اس وقت آئے گا جب علم اور بصیرت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ رہے گا۔

حال ہی میں مسٹر چرچل نے امریکہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جنگ کے جو نتائج وسطی یورپ میں نظر آ رہے ہیں ان کے لئے ہم نے جنگ نہیں کی تھی۔ اور اب جو روسیوں نے شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظموں میں ایسی دلچسپی لینا شروع کی ہے جس کی حد اور صحیح نوعیت معلوم نہیں تو امریکہ والے بھی دیکھتے ہیں کہ مداخلت کی وہی صورتیں پھر پیدا ہو رہی ہیں، جو جنگ سے پہلے متحدہ ریاستوں کے لئے ایک خطرہ بن گئی تھیں، اور امریکہ میں اس بات سے کسی کو تسلی نہیں ہو سکتی کہ مداخلت کرنے والی قوت کمیونسٹ ہے نازی نہیں۔ مسٹر چرچل کا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ روس نئی جنگ کی تیاری نہیں کر رہا ہے بلکہ اس لڑائی سے جو جیتی جا چکی ہے زیادہ سے زیادہ جلد سے جلد فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر خالی زحمت اٹھانے کی خاطر کوئی جنگ میں شریک ہوا نہیں تھا۔ ممکن ہے یورپ اور امریکہ کی جمہوری ریاستیں خود غرض ہوں اور حقیقت یہ ہو کہ روس کے فائدے ہی میں سب کا فائدہ ہے۔ لیکن کوئی ریاست اپنے مفاد کو روس کی مرضی پر منحصر نہیں کر سکتی، اور اگر روسی مدبر تصادم کے امکانات کو نظر انداز کرتے رہے تو ممکن ہے تصادم ہو جائے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

۱۔ قاعدہ ۲ر ۲۔ دس سبق ۳ر

۱۔ نماز ۳ر
۲۔ حکایتیں اول ۳ر
۳۔ 〃 دوم ۲ر
۴۔ حبیب خدا ۲ر
۵۔ نظمیں ۳ر
۶۔ میونسپلٹی ۲ر
۷۔ صدیق اکبر ۳ر
۸۔ خط کتابت ۲ر
۹۔ ضلع کا انتظام ۲ر
۱۰۔ قومی گیت ۳ر
۱۱۔ غزلیں ۳ر
۱۲۔ ہمارا ہندوستان ۲ر
۱۳۔ ہم بھی پڑھینگے ۳ر
۱۴۔ عمر فاروقؓ ۲ر
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ۳ر
۱۶۔ شہید کربلا ۲ر
۱۷۔ ہماری دنیا ۲ر
۱۸۔ ایشیا ۲ر
۱۹۔ یورپ ۳ر
۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب ۲ر
۲۱۔ مثنوی میر حسن ۲ر
۲۲۔ گل بکاؤلی ۲ر
۲۳۔ چار درویش اول ۲ر
۲۴۔ 〃 〃 دوم ۲ر
۲۵۔ 〃 〃 سوم ۲ر
۲۶۔ چار درویش چہارم ۲ر
۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ۲ر
۲۸۔ 〃 〃 دوم ۲ر
۲۹۔ 〃 〃 سوم ۲ر
۳۰۔ 〃 منصور موہنا ۲ر
۳۱۔ 〃 فردوس بریں ۲ر
۳۲۔ 〃 لیلیٰ مجنوں ۳ر
۳۳۔ شگفتہ ۲ر
۳۴۔ تانگے والا ۲ر
۳۵۔ بہشتی ۲ر
۳۶۔ صوبے کی حکومت ۲ر
۳۷۔ حکومت ہند ۲ر
۳۸۔ جمہوریت ۲ر
۳۹۔ دوہے ۲ر
۴۰۔ دلچسپ شعر ۳ر
۴۱۔ مرثیے ۳ر
۴۲۔ مسدس حالی ۲ر
۴۳۔ حالی کی نظمیں ۲ر
۴۴۔ گنتی ۳ر
۴۵۔ بڑی گنتی ۲ر
۴۶۔ پہاڑے پیلنے ۲ر
۴۷۔ اجرت کا حساب ۲ر
۴۸۔ تنخواہ کا حساب ۲ر
۴۹۔ چاند تارے ۲ر
۵۰۔ نزلہ زکام ۲ر
۵۱۔ حالات قرآن مجید ۳ر
۵۲۔ تعلیمات (عقائد) ۳ر
۵۳۔ 〃 (عبادات) ۲ر
۵۴۔ 〃 (اخلاق) ۳ر
۵۵۔ 〃 (معاملات) ۲ر
۵۶۔ قصص قرآن مجید ۱ ۲ر
۵۷۔ 〃 〃 ۲ ۲ر
۵۸۔ کعبہ شریف ۲ر
۵۹۔ حدیث شریف ۲ر
۶۰۔ عثمان غنیؓ ۲ر
۶۱۔ علی مرتضیٰؓ ۳ر
۶۲۔ صحابۂ کرام ۱ ۳ر
۶۳۔ 〃 〃 ۲ ۲ر
۶۴۔ 〃 〃 ۳ ۲ر
۶۵۔ 〃 〃 ۴ ۳ر
۶۶۔ 〃 〃 ۵ ۲ر
۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۲ر
۶۸۔ حضرت غوث پاک ۲ر
۶۹۔ اجمیری خواجہ ۲ر
۷۰۔ نظام الدین اولیا ۳ر
۷۱۔ گوتم بدھ ۲ر
۷۲۔ کرشن کنہیا ۲ر
۷۳۔ رام کہانی ۱ ۲ر
۷۴۔ 〃 〃 ۲ ۲ر
۷۵۔ افریقہ ۲ر
۷۶۔ امریکہ ۲ر
۷۷۔ جنوبی امریکہ ۲ر
۷۸۔ سرزمین ہند ۲ر
۷۹۔ صوبے ۲ر
۸۰۔ دیسی ریاستیں ۲ر
۸۱۔ داستان امیر حمزہ ۱ ۲ر
۸۲۔ 〃 〃 ۲ ۲ر
۸۳۔ 〃 〃 ۳ ۲ر
۸۴۔ 〃 〃 ۴ ۳ر
۸۵۔ 〃 〃 ۵ ۲ر
۸۶۔ کہاوتیں ۲
۸۷۔ پہیلیاں ۲ر
۸۸۔ گرونانک ۳ر
۸۹۔ مثنوی میر حسن ۲ر
۹۰۔ گلستان ۲ر
۹۱۔ حمد خاں دوکاندار ۲ر
۹۲۔ عبدالرحمٰن راج ۳ر
۹۳۔ نصیب خاں حجام ۲ر
۹۴۔ ختا خدمتگار ۲ر
۹۵۔ پیارے خاں درزی ۲ر
۹۶۔ حنیف خانساماں ۳ر
۹۷۔ جن بڑھئی ۲ر
۹۸۔ محمد حلوائی ۲ر
۹۹۔ میرا نتھا ۳ر
۱۰۰۔ ہندوستان ۵ ہزار برس پہلے ۲ر

مکتبہ جامعہ دہلی

As one nears the shores of America, coming from across the Atlantic, one of the most inspiring sights is the Statue of Liberty. It not only serves as a cheering beacon to the mariner, but also symbolises the hopes of millions of downtrodden humanity who have left the Old World for the freedom of a new life in a new clime—freedom from want, from fear and from oppression.

Of all freedoms, however, the greatest is the freedom from disease. The healthiest—rich or poor—for want of this freedom are changed to sick and diseased whose lives become useless to themselves and to the world. Freedom from disease is therefore the greatest freedom which everyone should strive for.

Cipla Laboratories are devoting their full time and attention to the production of high quality drugs and medicines for the relief of mankind, thus striving for Freedom from disease. In quality, efficacy and high standard of production of drugs and medicines Cipla is equal to the world's best. Scientific methods of production and constant research lead to perfection. This is the motto followed by Cipla.

EQUAL TO WORLD'S BEST

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم، اے

جلد ۴۱ - نمبر ۷	بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب ۔ بی اے (آکسن) جید برقی پریس دہلی

قواعد کی ابتدا

لسانی مطالعہ کو سائنس کا مرتبہ حاصل ہو جانے کی وجہ سے قواعد کے مسئلہ کو بھی ایک مخصوص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ لسانیات انیسویں صدی میں آ کر ایک باقاعدہ اور منتظم علم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور اسی صدی میں ہمیں آفاق گیر قواعد اور تقابلی قواعد (comparative grammar) کے تصورات جنم لیتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ سوال کہ قواعد کب، کیسے، کیوں عمل میں آئی کچھ اور پیچھے جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

قواعد تیار کرنے کی پہلی کوشش غالباً اشوریہ میں کی گئی۔ اہلِ بابل کی زبان عکادی سترھویں صدی قبلِ مسیح سے پہلے ہی فنا ہو چکی تھی۔ لیکن فنا ہونے سے پہلے وہ اپنی تہذیب و ثقافت کے قابلِ قدر خزینے ایک نئی نسل یعنی اشوریوں کو سونپ گئی۔ اشوری اس کے مطالعہ میں بڑے خلوص سے منہمک ہو گئے۔ اس سلسلے میں لغات، قواعدوں اور درسی کتب کی بھی ضرورت پیش آئی، چنانچہ نینوا کی خاکی تختیوں میں نہ صرف یہ کہ اشوری زبان میں بین السطوری ترجمے ملتے ہیں بلکہ فرہنگ اور ہجے، محاوروں کی کتابیں اور قواعدیں بھی نظر آتی ہیں۔

ہندوستان میں قواعدی کارنامے چھٹی صدی قبلِ مسیح سے شروع ہوتے ہیں۔ وہ اتنے بلند ہیں کہ اب تک کوئی قوم اُن پر سبقت نہیں لے جا سکی ہے۔ پوری زبان کو مادّوں کی ایک قلیل تعداد میں مختصر کر کے رکھ دینے کے خیال سے برہمن سنہ ق م سے ہی خوب آشنا تھے۔ مشہور سنسکرت قواعد داں پانِنی نے ایک ایک لفظ ایک ایک آواز کا تجزیہ کر کے رکھ دیا ہے یہ درست ... کہ موقع کی نزاکت نے انھیں یہ بات سمجھائی تھی اور یہ سب قلعہ بندیاں پسپا ہوتی ہوئی سنسکرت کے تحفظ کے لئے تھیں لیکن اس سے ان کے لسانی مشاہدہ کی زبردست صلاحیت

تو کوئی حرف نہیں آتا۔ سنسکرت قواعد ہندی فطانت کا غالباً بلند ترین مظاہرہ ہے۔

لیکن ایشیا میں قواعد کی تاریخ ماضی کے دبیز دھندلکوں میں چھپی ہوئی ہے۔ صحیح اور واضح طور پر یہ بتانا کہ قواعد کی بنا کب، کیسے اور کیوں پڑی مشکل ہے۔ البتہ یورپ کی قواعد کی تاریخ زیادہ واضح ہے۔ اور اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قواعد کی پیدائش دوسرے تمام علوم کی طرح فطری و عملی ضروریات کی مرہون منت ہے۔ پہلا عملی قواعد داں پہلا معلم السنہ بھی تھا۔ قواعد کے آغاز کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ کس زمانے میں کن حالات کے ماتحت لوگوں میں غیر زبانوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یورپ میں پہلی عملی قواعد اسی زمانہ میں ملے گی۔ یونانیوں کا غیر زبان سیکھنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ انہوں نے انسانوں کی دو برادریوں میں بانٹ رکھا تھا: یونانی اور غیر مہذبین۔ غیر مہذبین کی زبان کیونکر قابل اعتنا ہو سکتی تھی۔ یہ بات تو بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ اپنی زبان کے علاوہ بھی کسی زبان میں اظہار خیال ممکن ہے۔ ایک یونان پر ہی کیا ہے ساری دنیا کی یہی حالت تھی۔ لفظ Agglossos (بے زبان) کے مترادفات اکثر قوموں کی زبانوں میں ملتے ہیں۔ پولینڈ والے ہمسایہ جرمنوں کو گونگا (Nimiec) کہتے تھے۔ جرمنوں نے اپنے ہمسایہ سیلٹوں کو Walh کا لقب دیا۔ Walh اور سنسکرت کا ملیکھ متحد الاصل ہیں۔ اس کے ابتدائی معنی ایسے شخص کے ہیں جس کی گفتگو صاف نہ ہو۔ عرب والے مدت تک عرب سے باہر والی دنیا کو عجم سمجھتے رہے۔

یونانیوں نے جب غیر قوموں سے تبادلۂ خیال کی ضرورت کو محسوس بھی کر لیا اور ان کے محاوروں کو سیکھنے کے بھی عادی ہو گئے تو بھی مسئلہ جہاں کا تہاں رہا۔ جب دونوں گروہ اپنی اپنی زبان بولنے پر تلے رہیں تو غیر زبان کیونکر سیکھی جا سکتی ہے۔ ترجمان اور مفسرین رکھنے کا خیال غالباً تجارت کا آفریدہ ہے۔ ہیروڈوٹس کا کہنا ہے کہ یونانی سوداگروں کے قافلوں میں جو وولگا کی راہ سے ہو کر کوہ یورال کی سمت چلتے تھے سات زبانوں کے مفسرین (Interpreters.) ہوتے تھے۔

فارس سے جو لڑائیاں ہوئیں اس سے یونانیوں کو یہ معلوم ہوا کہ دوسری قومیں بھی واقعی زبانیں رکھتی ہیں۔ تھومسٹو کلیز (Themistocles) اسی زمانے میں ہوا ہے۔ اس نے فارسی پڑھ رکھی تھی۔

سیکھی اور اتنی مہارت حاصل کر لی کہ بڑی روانی سے بولتا تھا۔ سکندری معرکوں سے یہ میلان اور تقویت پا گیا۔ جب یہ سکندر برہمنوں سے ملاقات کے لئے گیا تو ان کے جوابات کو ترجمہ و تاویل کرنے والے اتنے مفسرین تھے کہ ایک برہمن بول اٹھا کہ ہماری باتیں تو ایسا پانی بن جائیں گی کہ جو بہت سے نالوں میں بہہ کر نکلا ہو۔

سکندر کی مشرقی فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ غیر مہذب الاصل ادیب یونانی کے مطالعہ کی طرف مائل ہو گئے۔ لیکن یونان نے پھر بھی کسی دوسری زبان کے سیکھنے پر توجہ نہ کی۔ لیکن اسکندریہ میں جا کر ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف دیوتاؤں میں عقیدہ رکھنے والی قوموں کے افراد ایک جگہ نظر آتے ہیں۔ ان کا اولین مقصد تو کچھ اور تھا لیکن یہ قدرتی بات ہے کہ جب فرصت کے اوقات میں وہ مل جل کر بیٹھتے ہوں گے تو ان کا اپنے اپنے ملکوں، بادشاہوں، دیوتاؤں اور شاعروں کا ذکر ضرور آتا ہوگا۔ پھر ایسے یونانی علما بھی یہاں موجود تھے جو قدیم کے مطالعے میں معروف تھے اور غیر ممالک سے آنے والوں سے تبادلہ خیال کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ ژند اوستا کا ترجمہ غالباً اسی زمانے میں ہو گیا تھا۔ غیر ممالک کے ادب میں اتنی دلچسپی کے باوجود اس قسم کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ان کی زبانیں بھی سائنٹیفک تحقیق کا موضوع بن چکی تھیں۔ تنقیدی اور لسانیاتی مطالعہ کی منزل تک یونانی جس راستے سے ہو کر پہنچے وہ غیر زبانوں کا نہیں بلکہ خود ان کی زبان کی قدیم بولیوں کا مطالعہ تھا۔ یونانی بولیوں کے تنقیدی مطالعہ کا آغاز سکندریہ میں ہوا اور اس کی بنیاد بالخصوص ہومر کی تصانیف پر ہے۔ قواعد کا ایک خام سا عام خاکہ تو پہلے ہی یونانیات میں معرض وجود میں آ چکا تھا۔ افلاطون اسم اور فعل کو کلام کے دو ترکیبی اجزا کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ارسطو نے اس میں المعرفہ اور حروف عطف (Artikel u. Conjunctionen) کا اضافہ کیا۔ عدد اور حالت (Casus) کا بھی اس نے مشاہدہ کیا لیکن انہیں یونہی بے ترتیبی کی حالت میں چھوڑ دیا تھا۔ کلی قوانین کے ماتحت معین ترتیب دینے کا فرض اسکندریہ اسکول نے ادا کیا۔ یہاں ہومر کی تصانیف کے صحیح متن کی اشاعت پر توجہ صرف کی جا رہی تھی۔ اور اسی سلسلے میں یونانی قواعد کی اشکال بھی معرض بحث میں آ گئیں۔ اسکندریہ

میں پہلی بار یونانی کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا۔ یعنی انہوں نے زبان کا تجزیہ کیا، اسے عام ابواب میں ترتیب دیا، الفاظ کے مختلف کاموں کے لئے قابل اصطلاحات اختراع کیں، کلاسیکی اور عامیانہ اشکال کے مابین تفریق قائم کی اور ان موضوعات پر طویل اور دقیق مقالات لکھے۔ ان کے کارناموں کو علم اللسان کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن یونانی کی ایک واقعی، عملی یا ابتدائی قواعد کے وجود میں آنے کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھنے کی ضرورت تھی۔ اور اس قسم کا اقدام کرنے والا ڈائنسس تھرکس (Dionysus Thrax) تھا۔ لیکن اسکندریہ سے یکایک روما میں پہنچ جانا غالباً بڑی لمبی جست ہوگی۔ بیچ کی کڑیوں کو نظر انداز نہیں کیا سکتا۔

ڈائنسس قواعد کا پہلا مصنف ہے لیکن روما میں یونانی زبان کا پہلا معلم نہیں ہے۔ وہاں پہلے ہی سے یونانی کے طوطی بول رہے تھے۔ وہاں اس کی اس زمانہ میں وہی حیثیت تھی جو آج کے ہندوستان میں انگریزی کی ہے۔ شرفا کے بچوں کو پہلے ہی یونانی سکھائی جاتی تھی۔ یونانی سے واقفیت ہی شریف ہونے کے مترادف تھی۔ نوجوان طبقہ میں یونانی کتابیں پڑھی جاتی تھیں، اسی میں وہ باتیں کرتے تھے، اسی میں لکھتے تھے۔ روما کی پہلی تاریخ پکٹر (Fabius Pictor) نے سنہ ۲۰۰ ق م میں یونانی زبان میں لکھی۔ کیٹو (Cato) کی لاطینی میں لکھی ہوئی تاریخ غالباً اسی حالت کا ردعمل ہے۔ تو یہ تھی اُس زمانے کے روما کی ذہنی فضا جس جوش اور ولولہ کے ساتھ وہاں چوٹی کے علما یونانی قواعد کے مطالعہ کے لئے بیٹھے اسے سمجھنے کے لئے اس فضا کو نظر میں رکھنا ازبس ضروری ہے۔ کریٹز اولین قواعد دانوں میں سے ہے۔ وہ اٹیلس کے سلطان کا سفیر بن کر روما آیا، جہاں اس کا بڑا پرجوش استقبال کیا گیا۔ یہاں ایک حادثہ میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے اسے یہاں ذرا زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا پڑا۔ یہاں اس نے قواعد پر جو تقریریں کیں ان کو سیوٹونیز (Suetonius.) روما میں مطالعہ قواعد کی تاریخ کی ابتدا قرار دیتا ہے۔ ان تقاریر کے بعد وہاں قواعد اور لسانیات کے مطالعہ سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جانے لگا۔ چار سال بعد کارنیڈیز (Carneades.) اسی طرح سفیر بن کر آیا اور اس نے بھی اسی قسم کی تقریریں کرنی چاہیں لیکن کیٹو کی وجہ سے وہ اس

ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکا اس کے چند سال بعد الگزنڈر پولسٹر (Alexander Polyhistor) لاطینی پر تقریریں کرتا ہے۔ ویرو (Varro) لوشیلز (Lucilius) اور سسرو اسی کے شاگرد ہیں۔ ویرو نے لاطینی زبان پر چوبیس کتابیں لکھیں جن میں سے چار سسرو کو معنون ہیں۔ لوشیلز نے اپنی طنزیات کی نویں جلد ہجا کی اصلاح کے لئے وقف کر دی۔ سسرو کی ایسی کوئی تصنیف نہیں ملتی لیکن قواعدی مسائل کے سلسلے میں اس کے حوالے بطور سند ویرو کی کتاب میں نظر آتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ قیصر نے خود لاطینی قواعد پر ایک کتاب لکھی جو سسرو کے نام نامی سے معنون ہے۔ یہ کتاب گیلک جنگ کے دوران میں لکھی گئی۔ قیصر کی ایک تجویز یہ تھی کہ روما میں ایک یونانی و لاطینی کتب خانہ قایم کیا جائے۔ لائبریرین کے لئے اس نے ویرو سے درخواست کی تھی حالانکہ ویرو اس کے خلاف پومپی کی معیت میں لڑا تھا۔

اب ہم اس زمانہ میں آ پہنچے ہیں جب ڈائنسس کی پہلی یونانی قواعد شائع ہوتی ہے۔ یہ شخص تھریس کا باشندہ تھا۔ اس کی ذہنی نشو و نما اسکندریہ میں ہوئی تھی، اس کے بعد وہ روما پہنچا۔ پومپی کے زمانے میں وہاں وہ ایک معلم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا تھا اور اب یہاں لسانیات کی تاریخ میں ایک نیا باب کھلتا ہے۔ ایک یونانی معلم اپنے طلباء کے فائدہ کے لئے یونانی زبان کی ایک عملی قواعد تصنیف کرتا ہے۔ ڈائینسس کو قواعد کا موجد تو نہیں کہا جا سکتا۔ افلاطون سے لیکر ارسٹارکس تک اس کے متقدمین نے قواعد کا ہیولیٰ تیار کر دیا تھا لیکن وہ پہلا شخص ہے جس نے فلسفیوں اور نقادوں کے نتائج کو یونانی کی تعلیم کے عملی اغراض کے لئے استعمال کیا۔ اور اہم بات یہ ہے کہ یہ قواعد یونانیوں کے لئے تیار نہیں کی گئی۔ وہ تو زبان جانتے تھے بس اپنی زبان کے ایک نظریہ کے خواہاں تھے۔ ڈائینسس کے پیش نظر تو ان رومی طلباء کا مفاد پیش نظر تھا جو یونانی زبان سیکھتے تھے۔ اس طرح پہلی قواعد عملی ضروریات کے ماتحت ظہور میں آئی اور اس لئے کہ ایک غیر زبان کو سیکھنے کا سوال درپیش تھا۔ پھر یونانی قواعد کے نظام اصطلاحات کا ترجمہ لاطینی میں ہوا اور اپنے نئے لاطینی لباس میں تقریباً دو ہزار سال کی مدت تک

اس نے تمام مہذب دنیا کا سفر کر لیا۔

ڈائی تھریکس کے بعد کے مصنفین نے قواعد کو ترقی و تکمیل تو ضرور بخشدی لیکن وہ اس میں کسی نئی بات کا اضافہ نہ کر سکے۔ ڈائی تھریکس سے آج تک کی قواعدی علم کی تاریخ مسلسل دکھائی جاسکتی ہے۔ پہلی صدی میں ویریاز فلاکس (Varrius Flaccus) اور کوئنٹلین (Quintilian) دو قواعد داں ملتے ہیں۔ دوسری صدی میں سانز (Saunus) ایپولونیز (Apollonius) ڈائسکولز (Dyscolus.) اور ہیروڈینیز (Herodianus) کے نام مشہور ہیں۔ چوتھی صدی میں پروبس (Probus) ڈونیٹس (Donatus) مختصین بہت نمایاں ہیں۔ جب رومی سلطنت کا دارالخلافہ روما سے قسطنطنیہ میں منتقل ہوا تو قواعدی علم کو وہاں کی لاطینی میں نیا گھر مل گیا۔ قسطنطنیہ میں جو لاطینی اور یونانی قواعد داں جمع تھے ان کی تعداد ۲۰ سے کم کسی حالت میں نہ تھی۔ چھٹی صدی میں شاہ جسٹینین کے زیر سرپرستی پرزکینیز (Priscianus) کے نام نے قواعدی مطالعہ کو نئی رونق بخشدی۔

یورپ سے ایک مرتبہ پھر ایشیا کی سمت آئیے۔ یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ قواعد وضع کرنے کی پہلی کوشش بابل و اشوریہ میں کی گئی لیکن بابل کے زوال کے ساتھ ساتھ ان کوششوں کا اثر بھی زائل ہو گیا۔ اگرچہ یہودی علما بابل اور دوسرے مقامات پر اس پر مجبور تھے کہ اپنے مقدس صحائف کی مٹی ہوئی عبرانی کو تفسیروں اور فرہنگوں سے سنبھالیں لیکن ان کا کوئی کام قواعدی کارنامہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ البتہ چھٹی صدی میں مکتبہ عدلیہ کے قیام کے ساتھ ساتھ عراق میں بابل کی روایت کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئیں۔ شام کے نصاریٰ اپنے مذہبی اغراض کی خاطر یونانی کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ انہوں نے کوشش کر کے بالآخر ایک شامی قواعد مرتب کر لی۔ یعقوب عدلیہ (م ۷۰۰ء) نے ذرا اور پھیلا کر ایک معیاری قواعد تیار کر ڈالی۔ شامی ہمسایوں کو دیکھ کر عرب بھی متاثر ہوئے۔ ویسے بھی ان کے یہاں قرآن کے متن کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا۔ ابوالاسود (متوفی ۶۸۸ء) پہلا عربی قواعد داں ہے۔ لیکن

ایک روایت یہ ہے کہ اس نے قواعدی مسائل میں حضرت علیؓ سے تعلیم لی تھی۔ اس صورت میں عربی قواعد کا بانی حضرت علی کو کہنا چاہئے۔ لیکن نہ حضرت علی کو اور نہ شروع میں ابوالاسود کو یہ خیال آیا کہ قوعدی مسائل اور اصولوں کو قلمبند کر دیا جائے۔ ابوالاسود تو بلکہ ان باتوں کو لوگوں سے ارادتاً پوشیدہ رکھتا تھا۔ لیکن قرآنی آیات کی غلط قرات نے اسے چونکا دیا اور وہ نحوی اصول قلمبند کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس طرح گویا ساتویں صدی کے اخیر میں عربی قواعد کا آغاز ہوگیا۔ ابوالاسود کی تقلید میں بصرہ اور کوفہ کے مدرسوں میں بڑے انہماک سے کام کیا گیا۔ اور سیبویہ (سنہ ۷۹۶ء) کے وقت تک عربی قواعد تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ اگر علامہ سیوطی کی بات پر اعتبار کیا جائے تو پندرھویں صدی میں جن ماہرین قواعد نے عربی ادب میں نام پیدا کر لیا تھا۔ ان کی تعداد پچیس سو سے کم کسی حالت میں نہ تھی۔

انتظار

———۰———

سوویٹ روس کا ایک مدرسہ

ڈینا لیون۔ ایک انگریز خاتون ہیں جنہوں نے روس میں کچھ عرصہ قیام کر کے وہاں کے طریقۂ تعلیم کا قریبی طور پر مشاہدہ کیا اور اپنے اس مشاہدہ کی بنیاد پر انہوں نے ایک کتاب "سوویٹ روس کے بچے" کے نام سے تصنیف کی۔ جناب برکت علی صاحب فراقؔ بی۔ اے (جامعی) نے اُن کی اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ ہم ان کے اس ترجمے کے پہلے باب کو اپنے قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کرتے ہیں۔

(مدیر)

میں اشتراکی روس میں ۱۹۳۳ء میں اس ارادے سے آئی کہ کچھ عرصہ قیام کر کے سوویٹ نظامِ تعلیم کا غور سے مطالعہ کروں۔ اس سلسلے میں میں نے ماسکو کے متعدد مدرسوں کو دیکھا اور بہت سے ماہرینِ تعلیم سے گفتگو کی۔ مگر مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا رہا کہ ان تمام مفید باتوں اور دلچسپ اعداد و شمار کے باوجود جو مجھے اس طرح حاصل ہو رہے تھے، میری حیثیت صرف ایک تماشائی کی ہے اور میرے سامنے سوویٹ نظامِ تعلیم کا پورا پورا نقشہ نہیں ہے۔ اگرچہ میں نے ایک ایک مدرسے میں پورا پورا دن صرف کیا مگر وہ بات کہاں؟ یہی تشنگی تھی جس کے زیرِ اثر ماسکو میں کچھ عرصے ٹھہر کر اور کسی مدرسے میں کام کر کے مطالعہ کرنے کا خیال میرے دماغ میں پختہ ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا اور اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔

میری ایک دوست نے مشورہ دیا ــــــــ "آپ اینگلو امریکن اسکول میں کیوں نہ تشریف لے جائیں؟ وہاں معلموں کی ضرورت بھی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ وہاں کام کر کے خوش ہوں گی۔"

"مگر میں تو کسی اصلی سوویٹ اسکول میں کام کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ یہ مدرسہ باہر والوں کے لئے ہے، اس لئے یہ نمونے کا مدرسہ نہیں ہو سکتا۔"

"وہ بھی اصلی ہی سوویٹ اسکول ہے۔" میری دوست نے جواب دیا۔ "مگر بہرحال آپ اسے جا کر دیکھئے اور خود فیصلہ کیجئے" اور مجھے اس اسکول کا پتہ نوٹ کرا دیا۔

دوسرے دن میں اینگلو امریکن اسکول پہنچی۔ میرا خیال تھا کہ مدرسہ خواہ کیسا ہی ہو بہرحال دلچسپ ہوگا۔ اس کی عمارت ماسکو کے قدیم طرز کے ایک دو منزلہ مکان میں تھی، جو پہلے کسی مالدار سوداگر کے تصرف میں تھا۔ اس کی کھڑکیاں کشادہ تھیں اور صحن نہایت خوشنما اور درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب اس میں پانی بھر کر اُسے اسکیٹنگ کے لئے برف کے ایک تختے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت اس میں بہت سے بچے درختوں کے جھرمٹ میں اسکیٹنگ کر رہے تھے۔

میں اندر گئی اور پرنسپل سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھ سے ایک ہنس مکھ اور جوان عورت نے کہا کہ میں اپنا کوٹ اور لمبا بوٹ اتار دوں۔ اور اُس کے ساتھ ہو لوں، وہ شاید میری ٹوٹی پھوٹی روسی سمجھتی تھی، اگرچہ میں خود اس کی زبان کو سمجھنے سے قاصر تھی جو وہ بڑے فراٹے کے ساتھ بولتی تھی۔

ہم ایک دہلیز سے گذرے۔ ادھر اُدھر سے خوش گپیوں اور ہنسنے کھیلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ چھٹی کا دن ہے، مگر جب میں نے دیکھا کہ اتنے بہت سے لڑکے جماعتوں کے اندر اور باہر اچھل کود رہے ہیں اور بظاہر بہت مصروف نظر آتے ہیں تو میں حیران رہ گئی۔ دہلیز سے ہو کر ہم ہال میں آئے۔ یہاں بچوں کی ایک ٹولی نیکر اور قمیص پہنے رسیوں پر جھول رہی ہے اور ہوا میں قلابازی کھانے کی مشق کر رہی ہے۔ ان کے قہقہوں

اور شور وغل سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بہت خوش ہیں، انہیں میں سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا یہ ان کا استاد تھا۔

پرنسپل کا کمرہ ہال کے باہر کھلتا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور میری مدرسہ دیکھنے کی درخواست کو بڑی دلچسپی اور غور سے سنا۔ میں نے بتایا کہ میں ایک معلمہ ہوں، اور تعلیم کے کام میں مجھے سات سال کا تجربہ ہے۔ مجھے سوویٹ نظام تعلیم سے بڑی دلچسپی ہے اور اس کا قریب سے مطالعہ کرنے کی غرض سے کسی سوویٹ اسکول میں کچھ عرصے تک کام کرنے کا مجھے بہت اشتیاق ہے۔

"میں آپ کو اسکول بڑی خوشی سے دکھاؤں گی"۔ پرنسپل کہنے لگی۔ "شاید آپ کو معلوم ہو آج بچے چھٹی منا رہے ہیں، اس لئے دوسرے اسکولوں کی طرح ہمارا اسکول بھی ایک کلب کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ آئیے دیکھئے بچے کیا کر رہے ہیں"۔

ہم ایک کمرے میں گئے، جہاں بچوں کی ایک ٹولی جس میں زیادہ تر لڑکے تھے شطرنج ڈرافٹ اور اسی طرح کے دوسرے فرشی کھیل کھیل رہے تھے۔ "یہ کمرہ فرشی اور خاموش کھیلوں کے لئے ہے"، پرنسپل نے تشریح کی۔ "اور وہ جو لانبے قد کا سانولا لڑکا ہے وہ اس وقت ان بچوں کا نگراں ہے۔ اس وقت شطرنج کا ٹورنامنٹ ہو رہا ہے"۔

یہاں سے آگے چل کر ایک اور کمرے میں پہنچے، جہاں کچھ بچے آپس میں مل کر میکینو (Meccano) سے کوئی چیز بنا رہے تھے۔ اور کچھ ننھے بچے ایک لکڑی کے کھلونے سے کھیل رہے تھے۔ اس کمرے میں جہاں تک میری نگاہ نے کام کیا، مجھے کوئی نگراں نظر نہیں آیا، مگر اس کے باوجود یہاں مکمل سکون تھا۔ اور تمام بچے اپنے اپنے کام میں کھوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں نے ننھے بچوں میں سے ایک سے پوچھا۔ "تم یہ کیا کر رہے ہو"۔ "ہم وانگا کے ایک نئے پل کا ماڈل بنا رہے ہیں جو ابھی بن رہا ہے، ہم نے اس کے متعلق سب کچھ اخباروں میں پڑھ لیا ہے، ہم اپنے ماڈل کو نمائش میں رکھیں گے"۔ ایک نو دس سال کی لڑکی نے جواب دیا۔

میں حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھی کہ اس نے پھر کہا: "اپنے ضلع کی نمائش میں۔ اس نمائش میں تمام مدرسے اپنے یہاں کے بچوں کے کام بھیجیں گے۔"

ہم نے انھیں چھوڑا اور وہاں سے مدرسے کی لائبریری اور دارالمطالعہ دیکھنے گئے جو ایک استاد کے زیر صدارت قائم تھا۔ دارالمطالعہ کی دیواروں پر ہیبت سے نہایت دلچسپ چارٹ، نقشے اور تصویریں آویزاں تھیں جنھیں دیکھنے کو بے ساختہ جی چاہتا تھا۔ یہ چیزیں دیکھتے ہوئے ہم ایک کمرے سے گذرے جہاں چند لڑکے بڑے جوش کے ساتھ ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی کے زیر ہدایت کسی ڈرامے کی مشق کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم دفتر واپس لوٹ آئے۔

دفتر میں تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پرنسپل نے مجھ سے کہا: "کیا آپ ہمارے ساتھ مدرسے میں کام کرنا پسند کریں گی؟" میں نے اینگلو امریکن اسکول کے بارے میں اپنے شبہات ظاہر کئے اور کہا: "میں سوویٹ اسکول کے خاص مرکز میں رہ کر کام کرنا چاہتی تھی، اس لئے سوچا تھا کہ اگر کسی روسی اسکول میں انگریزی پڑھانے کا کام مل جاتا تو بہتر تھا۔"

"آپ کا یہ خیال بالکل غلط فہمی پر مبنی ہے۔" پرنسپل کہنے لگی: "یہ بھی بالکل اُسی طرح کا سوویٹ اسکول ہے جیسے ماسکو کے دوسرے اسکول، سوویٹ گورنمنٹ اپنے قومی نقطہ نظر کے مطابق جس علاقے کی جو زبان ہوتی ہے، اُس علاقے میں اُسی زبان میں تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔ آپ دیکھیں گی کہ ماسکو میں متعدد تاتاری زبان کے مدرسے ہیں، ایک جرمن زبان کا مدرسہ ہے۔ ایک چینی اسکول ہے، اور ان کے علاوہ اور بہت سے مدرسے ہیں جہاں مختلف قومی زبانوں میں تعلیم ہوتی ہے۔ سوویٹ یونین میں امریکہ اور انگلینڈ سے بہت سے مزدور اور ماہر کام کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ان کے بچے روسی زبان نہیں جانتے، لہذا روسی زبان میں تعلیم حاصل کرنا ان کے لئے بہت مشکل ہے، پھر خود روس کے بہت سے لوگ دوسرے ملکوں میں کام کرتے ہیں۔ ان کے بچے بعض اوقات اپنی وطنی زبان سے زیادہ انگریزی جانتے ہیں۔ وہ [illegible] اسکول [illegible] واپس ہوتے ہیں، تو اپنی تعلیم انگریزی میں جاری رکھ سکتے ہیں [illegible]

"ہمارے مدرسے میں بالکل اُسی طریقے اور نہج پر کام ہوتا ہے جس پر ماسکو کے دوسرے اسکولوں میں۔ وہی ایک نصاب ہے اور وہی کتابیں جنھیں خاص ہمارے لئے روسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے اور جو سوویٹ یونین میں چھپی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ ہمارے اسکول میں کام کرنے کا فیصلہ کریں گی تو آپ کو پورے تعلیمی نظام کا قریب سے مطالعہ کرنے کا بہت زیادہ موقع ملے گا۔ یہ چیز کہ یہاں تعلیم انگریزی میں ہوتی ہے، بجائے رکاوٹ پیدا کرنے کے آپ کے مطالعے میں سہولت پیدا کر دے گی۔"

یہ دلیلیں مجھے بہت معقول نظر آئیں اور میں نے وعدہ کیا کہ میں دو ایک روز میں سوچ کر جواب دوں گی۔ حالانکہ سوچنے کی ایسی کچھ زیادہ ضرورت نہ تھی، اس لئے کہ فیصلہ میں نے تقریباً کر لیا تھا۔ وہ جگہ اپنے ماحول کے لحاظ سے مجھے بہت پسند تھی۔

بالآخر طے یہ پایا کہ چھٹیوں کے بعد ۱۰ جنوری سے میں تیسری جماعت کا چارج لے لوں۔ اس لئے کہ اس کی موجودہ معلّمہ چار مہینے کے لئے زچگی کی رخصت پر جانے والی تھیں۔ اس کے علاوہ ریاضی کی معلّمہ بھی گرمی کے موسم میں جانے والی تھیں اور اس طرح خزاں کے سیشن میں مجھے ان کی جگہ کام کرنا تھا۔ اس اثنا میں مجھے دعوت دی گئی کہ میں بچوں کے ساتھ ایک اکسکرشن میں شامل ہوں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اس لئے کہ اس طرح جماعت میں جانے سے پہلے اپنے شاگردوں سے میری ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ میں بچوں کے ساتھ اپنی پہلی سیر کی تاریخ کا انتظار کرنے لگی۔ سیر ایک پارک میں ہونے والی تھی اور ہمارے سامنے ایک پورے دن کا پروگرام تھا۔

دوسرے دن صبح کو ہم سب مدرسے میں جمع ہوئے۔ چھوٹے بڑے ملا کر سب ۲۴ بچے تھے جن میں سے دس سال کے بھی تھے، ۱۲ کے بھی ۱۴ کے بھی، وہی نوجوان لڑکی جسے میں نے پہلے ڈرامے کی مشق کراتے ہوئے دیکھا تھا، ان کی نگراں تھی۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ وہ اسکول کی پائنیر لیڈر تھی۔ اس نے ہر بچے سے تھوڑے سے پیسے اکٹھا کئے جو پارک تک جانے اور آنے کے لئے ٹریم کا خرچ تھا۔ اور خرچ بھی اس سیر میں صرف یہی ایک تھا۔ ہم مدرسے سے

روانہ ہوئے اور پچیس منٹ کے اندر ہی اندر پارک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر برف پر پھسلنے کی کھڑاویں لینے کے لئے ہم لوگ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ہمیں اپنے پیروں کی مناسبت سے کھڑاوؤں کا ایک ایک جوڑا ملا جسے اپنے جوتوں میں فٹ کر کے ہم نے کرکری برف پر پھسلنا شروع کر دیا۔

یہ پارک پہلے ایک بڑے نواب صاحب کی شکارگاہ تھی جس کی جھاڑیاں اب تک جوں کی توں محفوظ رکھی گئی تھیں۔ درختوں کے جھرمٹ میں تھوڑی دیر تک مزے لے لے کر پھسلنے کے بعد خوب بھوک لگ آئی تھی اور دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے اب ہم بالکل تیار تھے۔ ہم نے کھڑاویں واپس کیں اور ایک بڑے مکان کا رُخ کیا جو پھاٹک کے قریب ہی واقع تھا۔ وہاں وہ تین سو بچے اور جمع تھے۔ ہم بھی انھیں میں شامل ہو گئے اور ایک بہت بڑے ڈائننگ روم میں بیٹھ گئے۔ بھوک خوب لگی تھی، خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ پاس کے ایک کلب میں گئے جہاں ہمیں بچوں کا ایک فلم دکھایا گیا۔ فلم دیکھ کر بچے اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ یہ دن ان کے لئے بڑی خوشی کا دن تھا۔

مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ اس قسم کے اکسکرشن یہاں کے اسکولوں کا معمول ہیں۔ اس سلسلے میں ایک عجیب وغریب بات یہ معلوم ہوئی کہ تمام مقامی سوویٹ چھٹی کے زمانے میں بچوں کی دلچسپیوں اور تفریحوں کے لئے پروگرام بنانے میں مدرسے کا ہاتھ بٹاتے ہیں چھٹیوں میں پارک، سینما، عجائب خانے، تھیٹر وغیرہ بچوں کے لئے مخصوص کر دئے جاتے ہیں اور ان کے خالی اوقات کو اس طرح پر منظم کیا جاتا ہے کہ کوئی بچہ گلیوں میں اور سڑکوں پر بیکار نہیں پھرتا اور نہ گھر پر اپنے والدین کی غیر موجودگی میں شرارت کرتا ہے۔ چھٹی کے زمانے کی دلچسپیوں میں شرکت کرنا بالکل اختیاری ہوتا ہے مگر خود دلچسپیاں اتنی دلکش ہوتی ہیں کہ بچوں کی بڑی تعداد ان میں شریک ہوتی ہے۔

بچوں کو پہلی بار دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت چست وچالاک اور ذہین تھے۔ اور اتنے

جو شیلکہ دیکھتے رہیئے۔ اس احساس نے مجھے اپنی جماعت کے بارے میں جو مجھے ملنے والی تھی، سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوچا دس دس گیارہ گیارہ سال کے تیس تیز طرار بچوں کو ایک جماعت کے طور پر پڑھانا؟ میں ایسے مدرسوں میں پڑھانے کی عادی تھی، جہاں بچوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر یا ڈالٹن پلان کے مطابق، بچوں کو بدل بدل کر تعلیم دینے کا چلن تھا، اور جہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بچے کی نشو ونما کے لئے آزاد ماحول بہم پہنچانے کے یہی اور صرف یہی طریقے ہوسکتے ہیں۔ ہمارا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ جماعت وار طریقۂ تعلیم سے ایک ہی سانچے کے بچے نکلتے ہیں، اسی طرح جیسے مشین سے ایک ہی ناپ اور ایک ہی شکل صورت کی چیزیں نکلتی ہیں۔
دراصل میں اس وقت تک نام نہاد "ترقی پسند" اور "آزاد تعلیم" پر پورا پورا ایمان رکھتی تھی مگر یہاں آکر بچوں کو جماعت وار طریقے سے پڑھانے کا نظریہ میرے تمام نظریات پر سبقت لے گیا۔

"آپ کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی، وہ مدرسے کے نگراں سے ملے گی" پرنسپل نے کہا۔" وہ میری مددگار ہیں، اور نصاب کو چلانے کا کام اُن کے سپرد ہے۔"

نگراں کامریڈ ہالینڈ تھیں، وہ مدرسہ کھلنے سے چند روز پہلے ہی میرے پاس بیٹھ کر مجھے بتایا کہ اپنے کام کو مجھے کس طرح ترتیب دینا چاہیئے۔ ہر مضمون کے لئے نصاب چھپا ہوا موجود تھا، جسے ایک سال میں پورا ہونا تھا۔ ترتیب دیتے وقت مجھ سے امید کی گئی تھی کہ اپنے ہفتہ وار پروگرام میں تفصیل کے ساتھ مجوزہ اسباق کی ترتیب اور طریقۂ کار بتا دوں۔ مواد کو پیش کرنے کے معاملے میں مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ البتہ یہ شرط لگا دی گئی تھی کہ ہر ہفتے کام وقت پر ضرور پورا ہو جائے۔

کامریڈ ہالینڈ جب مجھے کام اور اس کے طریقے سمجھا چکیں تو آخر میں کہنے لگیں: "دیکھئے آپ کو جب کوئی دقت پیش آئے تو میرے پاس ضرور تشریف لائیے۔ میرا کام ہی یہ ہے، کہ میں طریقۂ درس اور نظم قائم رکھنے کے معاملے میں آپ کی مدد کروں۔ میں کبھی کبھی سبق کے دوران میں بھی آپ کی جماعت میں آیا کروں گی۔ یہ بھی میری ذمہ داریوں کا ایک پہلو ہے۔ بُرا نہ مانئے گا۔"

میں نے انھیں خدا حافظ کہا اور دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ کم سے کم نظم قایم رکھنے کے معاملے میں تو مجھے ان کے پاس نہ جانا ہوگا۔ اس باب میں مجھے پہلے کبھی کوئی دقت نہیں پیش آئی تھی۔ مگر اپنی نئی جماعت کے بارے میں مجھے کسیقدر دقت پیش آنے کا اندیشہ تھا، اس لئے کہ اس طرح کے مسئلے سے میں پہلے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ مجھے بڑی حیرت تھی کہ کامریڈ ہالینڈ نے مجھے نظم قایم رکھنے کے مسائل میں بھی مشورہ لینے کی تاکید کی تھی۔ میں اس قسم کی باتوں کو اب تک استاد کے لئے توہین سمجھا کرتی تھی اور سمجھتی تھی کہ یہ چیزیں جہاں تک ممکن ہو حکام سے پوشیدہ رکھنی چاہئیں۔

اسکول کھلنے سے ایک روز پہلے اسٹاف کا جلسہ ہوا جس میں دوسری استانیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ سب بڑے خلوص اور محبت سے پیش آئیں۔ ان میں متعدد امریکن استانیاں تھیں۔ ایک انگریز استانی تھی جو امریکہ میں بہت عرصے تک رہ چکی تھی اور یہاں جرمن اور حساب سکھاتی تھی۔ انھی میں آسٹریلیا کی بھی ایک صاحبہ تھیں۔ غرض ایک اچھی خاصی بین الاقوامی جماعت تھی۔

جلسے میں سال کے نصف ثانی کے کام نہایت صفائی کے ساتھ سمجھائے گئے۔ ماحصل یہ تھا کہ کوئی بچہ جماعت میں دوسرے سال نہ رہ جائے۔ ہمیں پڑھائی کے کام میں ایک بلند معیار سامنے رکھنا چاہئے اور اس میں کامیابی حاصل کرنا چاہئے۔ ہمیں چاہئے کہ نصاب پر حاوی ہونے میں ہر بچے کی مدد کریں۔ اس کے بعد گذشتہ میقات کے چند نقائص اور ان کے اسباب پر غور شروع ہوا۔ نگران نصاب نے کامریڈ بولش پر بڑی سخت تنقید کی اور کہنے لگیں کہ وہ دوسری جماعت کے بچوں کے ساتھ ٹھیک طریقے سے پیش نہیں آتیں، وہ بہت زیادہ سخت گیر ہیں۔ یہ ان کی سخت گیری ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ بچے ان سے ڈرتے ہیں۔ ڈر کے مارے وہ بیچارے نہ ان سے کوئی سوال کرسکتے ہیں اور نہ مدرسہ ختم ہونے کے بعد ان کے سامنے اپنی مشکلات بیان کرسکتے ہیں۔ کامریڈ بولش تو اچھی خاصی بڑی عمر کی استانی ہیں، انھیں تو ایسا ہونا چاہئے کہ بچے اپنی تمام مشکلات ان سے بے کم وکاست بیان کردیں۔ ان کا احترام کریں اور محبت سے پیش آئیں۔ مگر انھوں نے اپنے اور بچوں کے بیچ میں ایک بہت بڑی دیوار کھڑی کردی ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتیں کہ بچے انھیں اپنے ہی میں کا

ایک شخص سمجھیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اُن سے بہ حیثیت استاد کے بہت ڈرتے ہیں۔ کولیا کی مثال لے لیجئے۔ وہ بہت تیز لڑکا ہے لیکن چونکہ اس کے ساتھ صحیح طریقے سے پیش نہیں آیا جاتا، اس لئے وہ عذاب بن رہا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے بچے اسکول سے نکال دئے گئے ہیں۔ یہ سب سوویٹ کے چلن نہیں ہیں۔ اگرچہ ہمارے یہاں جماعت وار طریقہ تعلیم رائج ہے۔ تاہم ہمیں انفرادی طور پر ہر بچے کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہم کو انھیں سمجھنا اور اُن سے محبت کرنا چاہئے۔ ہمارا مقصد ضبط نفس پیدا کرنا ہے، جو صرف محبت اور عدل کے ماحول میں ترقی کر سکتا ہے۔

میں ایک کھلے جلسے میں اس طرح کی بے لاگ تنقید سن کر سناٹے میں آگئی اور کامریڈ بولٹن کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی کہ ان کے اوپر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ کچھ نہیں بولیں۔ اگرچہ جلسے کے تیور سے میں نے سمجھا تھا کہ لوگ اُن کی رائے سننے کے مشتاق تھے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ کامریڈ بولٹن سوویٹ یونین میں بالکل نووارد تھیں اور اپنے آپ کو وہاں کے حالات کے مطابق ڈھالنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ وہ کہیں باہر کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں جہاں انھیں بچوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔ اور ظاہر ہے اس کام کے لئے انھیں بہت زیادہ سختی کرنی پڑتی ہوگی۔

جلسے کی ایک کارروائی جاری رہی۔ ایک کامریڈ ینگ تھے جو اونچی جماعتوں کو انگریزی پڑھاتے تھے کہنے لگے: "پانچویں جماعت میں مجھے بہت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ چھٹی اور ساتویں جماعت کے بچے تو اچھی طرح پڑھتے ہیں، گھر سے کام کرکے لاتے ہیں اور اپنے کام سے ہر طرح دلچسپی لیتے ہیں، مگر پانچویں کے لڑکے اُف! تو شور بہت مچاتے ہیں۔ اور گھر سے سبق بھی تیار کرکے نہیں لاتے۔ گذشتہ میقات کے آخر میں تو ان کی حالت بہت ابتر ہوگئی تھی۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اس سلسلے میں میری مدد کریں گے اور اپنے مشوروں سے مجھے سرفراز فرمائیں گے۔" اس دفعہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کھلے جلسے میں سب کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور اس انداز سے جیسے زبان سے بے ساختہ کوئی بات نکل آتی ہے!

بہت سے مشورے تجویز کئے گئے اور متعدد داستانیوں نے مدد کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ نصاب کی نگراں نے وعدہ کیا کہ میں انگریزی کے گھنٹوں میں اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ آیا کروں گی اور اس چیز کا اصل سبب تلاش کرنے میں آپ کی مدد کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنا طریقہ بدلنا چاہئے، ظاہر ہے کہ یہ جماعت خاص توجہ کی محتاج ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا مواد صحیح طریقے سے سامنے نہ آتا ہو۔ بہرحال، ہم آپ کی مدد کریں گے اور اگلے ماہانہ جلسے میں اس خاص مسئلے پر ایک رپورٹ پیش کریں گے۔"

میں اس چیز سے بہت زیادہ متاثر ہوئی کہ جلسے میں جو کوئی بھی سوال اٹھتا، اس سے پورا اسٹاف دلچسپی لیتا تھا۔ سب کی سب سخت تنقید کرتی تھیں مگر بالکل دوستانہ انداز میں۔ پھر جس پر تنقید ہوتی تھی۔ وہ بھی اُسے دوستی اور خلوص پر مبنی سمجھتی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح تنقید کرنے والی سمجھتی تھی۔ مدرسے کے طریقِ کار کا یہ ایک معمول تھا۔ جلسے کی ہر کارروائی کے نوٹ بڑی پابندی اور احتیاط سے لئے جاتے تھے اور جس کارروائی کے متعلق رزولیوشن کی ضرورت ہوتی تھی اُسے منظور کیا جاتا تھا۔

جلسے کے بعد میرے پاس ایک بوٹے قد کی سُنہرے بالوں والی عورت میرے پاس آئی اور مدرسے کے مترجم کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ مدرسے کی ٹریڈ یونین کمیٹی کی صدر بھی تھی وہ کہنے لگی کہ "اگر آپ چاہیں تو داستانیوں کے لئے روسی زبان کی ایک جماعت ہے، اس میں شریک ہوسکتی ہیں۔ اور دیکھئے، اگر آپ کو کوئی ضرورت پڑے یا اپنے کام میں آپ کسی قسم کی دقت محسوس کریں تو بلا تامل میرے پاس چلی آئیگا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور نوٹ کر لیجئے کہ اگر آپ مدرسے کے انتظام میں کوئی نقص دیکھیں تو مجھے اس کی اطلاع ضرور کیجئے گا۔ آپ نئی نئی آئی ہیں ممکن ہے آپ کی نظر کسی نقص کو بھانپ لے اور دوسرے بھی اُسے مان لیں"۔

ٹریڈ یونین کمیٹی کا کام یہ ہے کہ مدرسے کے نقائص کو دور کرنے میں مدد کرے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ اسٹاف کے ممبروں کے آرام و راحت کا خیال رکھے اور یہ دیکھتی رہے کہ انھیں اطمینان

اور سکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے۔ انھیں تفریح کی امکانات سے باخبر رکھے جیسے تھیٹر ہے، سینما ہے، اکسکرشن ہیں، جسمانی کھیلوں کے مظاہروں کی شرکت ہے۔ غرض جس چیز سے بھی انھیں دلچسپی ہو۔"

جب میں اپنی قیام گاہ پر واپس آئی تو میرا دماغ متعدد قسم کے تاثرات وخیالات کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ "تو سوویٹ کے معلم اپنی کمزوریوں تک کا اعتراف کر لیتے ہیں! اور وہ بھی سب کے سامنے! کیا یہ ترقی کی راہوں سے کہیں زیادہ اچھی راہ نہیں؟ پورے نظام میں تعاون اور باہمی امداد و اعانت کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ اور یہ ٹریڈ یونیں تو محبت اور ہمدردی کی دیوی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے تقریباً تہیہ کر لیا تھا کہ کل اگر اپنی جماعت کے سلسلے میں مجھے کوئی دشواری پیش آئی تو خود جا کر مدد کی درخواست کروں گی، اور مشورہ طلب کروں گی.........."

جب میں پہلے ہفتے کے کام کا خاکہ مرتب کرنے بیٹھی تو شبہات سے گھر سی گئی۔ ایک بنے تلے وقت میں تمام بچوں سے پورا پورا کام کس طرح کراؤں گی؟ ہم لوگوں کو تاکید کی گئی تھی کہ کوئی بچہ کچا نہ رہنے پائے اور ہر بچہ نصاب پر اچھی طرح حاوی ہو جائے۔ جو بچے سست ہوں گے، اُن کا میں کیا کروں گی؟ اور جو تیز ہوں گے اُن کو معروف کس طرح رکھا جا سکیگا؟ اور پھر تمام بچوں میں ایک ہی وقت دلچسپی کیسے پیدا کروں گی؟ کیا اچھا ہوتا اگر جلسے میں ان تمام مسائل پر پرنسپل یا نگراں سے اچھی طرح بحث کر لیتی۔ لیکن تب جلسے میں ہر شخص کے دوستانہ طرزِ عمل کا خیال آیا تو میرے تمام تردّدات کافور ہو گئے۔ اور اطمینان ہو گیا، کہ خواہ مجھے کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں انھیں، حل کرنے میں مجھے ضرور مدد ملے گی۔

درونِ سینہ و بیرونِ وے

فلسفہ کیا ہے؟

میں نے اس پر اپنی زندگی کا ایک حصہ صرف کر دیا ہے، لیکن ہمیشہ ترقی و تجاوز کے
استفسار کی سعی رہی ہے۔ میں نے کتابیں کھنگالیں، علم کے صحرائی ذروں کو چھان ڈالا، لیکن فلسفہ
کہاں تھا؟ کسی نے کہا یہ علوم کے تاروں سے اپنی قبا بنتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں اگر تار
ہی کچے ہوں تو قبا کیسی ہوگی؟ کوئی کہتا ہے، یہ کل کی روشنی میں جزو کا مطالعہ کرتا ہے۔ میں ہنس دیتا
ہوں اور لفظ روشنی کاٹ کر سایہ لکھ دیتا ہوں کیونکہ انجام ہمیشہ مبہم، غیر واضح اور غیر شفاف ہوتا ہے۔
ہاں اتنا اب میں ضرور جان گیا ہوں کہ فلسفہ کب آتا ہے۔ یہ شباب زندگی سے پہلے اور فارغ البالی
کے بعد آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ فقط فکری وقائع نگاری ہے۔

پھر میں خیالی تتلیوں کے قریب آرام کرسی ڈال دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ تخیل اور
حقیقت کی درمیانی خلیج کو کیونکر پاٹا جائے؟

چودہ برس تک میں نے علم کی جبہ سائی کی۔ تب کہیں میں علوم متعارفہ کی ابتدائی منزل طے
کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد جب میں [illegible] نظر ڈالی تو فلسفے نے
مجھے اپنی طرف کھینچا۔ جب میں اس کے قریب [illegible] حکمت کی طلائی دیوی نے میرے دل کو بالکل
ہی موہ لیا۔ لیکن جس وقت میں اس کے باغ میں داخل ہونے لگا تو منطق کے خاردار کانٹوں نے
میرے پاؤں چھلنی کر دیے۔ میں سخت مایوسی کی حالت میں پلٹنے ہی والا تھا کہ پھر خیال آیا کہ ہر بہار سے
پہلے خزاں آتی ہے اور پھر کامیابی کی راہ پیچ و بل کھاتی ہوئی منزل تک پہنچتی ہے۔ میں اپنی کاوش
میں پھر کوشاں ہو گیا اور جلد ہی اس مرحلے کو بھی طے کر لیا۔ اس کے بعد ایک نئی منزل سامنے

آئی۔ یہ ذرائع علم[۱] "EPISTEMOLOGY" کی بحث تھی۔

میں نے اسے دیکھا اور دماغ کھولانے کے لئے ایک نیا الاؤ تیار پایا۔ اس میں مادہ و فواد[۲] کی جنگ تھی۔ یونانی دیموقریطس[۳] نے نہایت بھولے پن کے ساتھ مادیت کی عمارت میں عینیت[۴] کو بٹھا دیا اور یورپی دیکارتے[۵] نے اپنے طلسم خیال کو ایچ زیست کا مرہون سمجھ کر نئی مادیت کی بنیاد رکھ دی، اب موضوعیت و معروضیت[۶] کی بحث شروع تھی۔

جب یہ معاملہ دیکھا تو میری ہمت بالکل ہی پست ہو گئی۔ میں نے اپنے دماغ کے لئے یہ سب الاؤ بہت زیادہ گرم پائے۔ اس لئے بہتر یہی سمجھا کہ کسی صاحب علم کے پاس چلا جاؤں۔

چنانچہ میں نے اپنا رخت سفر باندھا اور مغرب کی راہ لی۔ مدت ہوئی سب مغرب نے مشرق سے نظر و مشاہد چھین لئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرق کی سرزمین کچھ ایسی زرخیز بھی نہیں رہی۔ وہاں پہنچتے ہی خوش قسمتی سے مجھے ایک ایسا رہبر مل گیا جو سراپا علم تھا۔ اس نے میری شکل و صورت دیکھ کر سمجھ لیا کہ میں فی الواقع علم کا خواہاں ہوں۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا "تم مادہ کو خیر کائنات سمجھتے ہو یا فواد کو؟"

---

[۱] Mind اردو زبان میں لفظ دل Mind کا کسی طور پر مرادف تو ہے لیکن عربی کا لفظ فواد اس سے زیادہ قریب تر ہے۔ چنانچہ خود قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے وہ قریب قریب انہی معانی میں ہے جن معانی کے لئے لفظ Mind استعمال ہوتا ہے۔ فلسفے کی اصطلاح میں ... قوت کا نام ہے جو حواس ظاہری کی اطلاعات (Reason) سے ... استخراج کرتی ہے۔ فواد کا فعل صرف حواس ظاہری کی اطلاعات ... کی امداد ہی پر منحصر نہیں بلکہ جہاں حواس ظاہری اپنی سپر ڈال دیتے ہیں وہاں یہ فواد ... کام کرتا ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو برگسان کے نزدیک ... زمان و مکان کے پردے پھاڑ کر ابدی آن ETERNAL کی ... بن جاتی ہے۔ اور قرآن نے تو اسکا درجہ بڑھا کر ... کی کسوٹی اور قوانین ... VIPR... کا ادراک کرنے والی قوت قرار دیا ہے۔ اس کہانی میں فواد صرف انہی معانی میں استعمال ہوا ہے جو حواس ظاہری کی اطلاعات سے نتائج کا استخراج کرتا ہے۔ [۲] Democritus (۴۶۰ سے ۳۷۰ ق م) نظریہ ایٹم کا پہلا علمبردار۔ بڑا خوش طبع تھا اس نے اسے ہنسنے والے فلسفی کا خطاب دیا جاتا ہے۔ [۳] عینیت Idealism [۴] Descartes دیکارتے فرانس کا مشہور فلسفی اور ریاضی داں گنا جاتا ہے۔ اس کے سارے فلسفے کا نچوڑ اس کا یہ مشہور قول ہے I THINK THEREFORE I EXIST میں سوچتا ہوں اسی لئے کہ میں زندہ ہوں۔ [۵] Objectivism [۶] Subjectivism

میں نے کچھ توقف کیا، پھر کہا: "اگرچہ دنیا میں رہتے ہوئے مجھے کئی برس گذر گئے ہیں اس کے باوجود میں خود حیران ہوں کہ گرمی کو سورج کا رہینِ منت سمجھوں یا اس کی غیر مرئی شعاعوں کا۔"

وہ زیر لب مسکرایا، وہ کہنے لگا: "تمہاری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟"

اعترافِ شکست سے میں نے کہا: "مادہ"

"تو پھر ایسی گتھی میں محبوس ہونے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ ہر چیز واضح ہے۔" اس نے اپنے فلسفے کی کڑی اٹھائی: "یہ صرف مادی وجود ہی ہے جو اشیا کا ادراک کر رہا ہے۔ تمہاری آنکھیں ہی تو ہیں جو سورج کی روشنی اور الوان کی بوقلمونی کو دیکھتی ہیں۔ تمہارے کان ہی تو ہیں جو موسیقی کی میٹھی لہروں کو وصول کرتے ہیں اور سماعت کی ایک فردوس تمہارے لئے بچھا دیتے ہیں۔ تمہارا ہاتھ اٹھتا ہے اور اشیا کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ تمہارے قدم اٹھتے ہیں اور کائنات کی وسعتوں پر گھوم جاتے ہیں۔

"پھر ذرا تم اپنے عصبی نظام پر ایک نظر ڈالو۔ بیرونی دنیا کی ہلکی سی جنبش تمہارے جسم میں کپکپی پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیا یہ فواد کی کارفرمائی ہے؟ اگر فواد ہی احساسِ کائنات کا مہبط ہوتا تو جب تمہاری داڑھ دکھ رہی تھی اور طبیب نے تمہارے مسوڑوں کو مخدر کر دیا تھا تو تمہارے درد کیوں بند ہو گئے؟ وہ درد کہاں [illegible] گئے؟ کیا وہ تمہارے جسم ہی کے پیدا کردہ نہ تھے؟ اسی مادے میں وہ اسرار پنہاں ہیں کہ دماغ جیسی عظیم الشان چیز پیدا ہو گئی۔ جدید دریافتیں اور تجربات ظاہر کر رہے ہیں کہ حیات کا بنیادی ذرہ (تخم مایہ) کس طرح ترقی کرتے کرتے اس منزل پر پہنچ گیا۔ اگر تم فواد کو ماننے پر بہت ہی مصر ہو تو اتنا کہہ لو کہ وہ دماغ، جو مادہ کی کامیاب تخلیق ہے، ارتقائی زینے طے کرتا ہوا فواد کی پیچیدہ منزل پر پہنچ گیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جس کو تم نے سفر کے پہلے سنگِ میل پر دیکھا تھا۔ تمہارا فواد کوئی ایسی آزاد شے نہیں جو تمہارے وجود پر حکمراں ہو بلکہ محض ایک غلام حلقہ بگوش جس کو کوتاہ بینوں نے بھڑکیلی پوشش میں ملبوس دیکھ کر شاہ سمجھ لیا۔"

اس کے الفاظ میرے کانوں پر اس طرح پڑ رہے تھے جیسے رم جھم پھوار پڑ رہی ہو۔ میں نے

دبی زبان سے کہا۔" لیکن ظاہر میں ایسا دکھائی دیتا ہے، گویا فواد ایک حاکم کی حیثیت سے ہمارے وجود پر متمکن ہے۔ حتیٰ کہ اگر روزمرّہ کو دیکھا جائے تو اس میں اس قسم کے محاورات اور الفاظ بکثرت مل جائیں گے جو اسی خیال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔"

وہ پھر مسکرایا لیکن اب کے ترش طنز اس کی مسکراہٹ میں اپنی جھلکیاں دکھا رہی تھی۔

"جب جسم بیمار ہوتا ہے تو اس وقت تمہارا دل مسرور ہوتا ہے؟"

یہ سوال واقعی ٹیڑھا تھا۔ میں نے آنکھیں جھکالیں۔ یکایک میں نے محسوس کیا۔ گویا اس کی نظریں میری گردن میں پیوست ہو رہی ہیں۔

" لیکن کوئی مضائقہ نہیں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔" ایسے شبہات ہر شخص کے دماغ پر قدرتی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دراصل مادہ ہی فاعل کل ہے، وجود کی جنبش و حرکت ہمارے ہر فعل و عمل کا باعث ہے۔ محبت جیسی لطیف شے بھی وجود کی تہیج کے بغیر ناممکن ہے۔ کم از کم میں نے تو کسی آختہ کو محب و محبوب بنتے نہیں دیکھا۔ بھوک شہوت غرض کسی جذبے کو لو اس کے پردے میں وجود کا وہی غیر مرئی ساز بج رہا ہوگا۔"

اس کے علم و دانش سے میں اسقدر متاثر ہوا کہ جب میں بازار میں آیا تو ہجوم کا شور و شغب بھی مجھے متشکل دکھائی دینے لگا۔ رات جب میں مطالعہ کرنے کی بجائے بستر پر دراز ہو گیا تو یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں تو پکا مادہ پرست ہو گیا ہوں۔ صبح میں نے اپنے تمام نظریات کی دوبارہ قطع و برید کی اور جوں جوں میں نے حقیقت کا تجزیہ کرنا شروع کیا مجھے یقین واثق ہوتا گیا کہ خالق حق اصل میں مادہ ہی ہے۔

میں اس موقف پر مضبوطی سے جما رہا۔ حتیٰ کہ ایک ضیافت میں میری ملاقات ایک سائنسداں سے ہوگئی۔ باتوں باتوں میں ہمارا موضوع کلام اسی طرف جھک گیا۔ میں نے مادیت کی پُرزور حمایت کی۔ اس پر اس نے میری طرف تحیّر کن نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔" آپ اس وقت غالباً اسی بات کو دُہرا رہے ہیں جس کو سائنس نے عرصہ ہوا فضول بے کار سمجھ کر کاٹ دیا تھا۔ میرے خیال میں آپ

سالمے کی تازہ ترین خبروں سے ہنوز لاعلم ہیں۔

مجھے اپنی کم مائگی کا اعتراف کرنا پڑا۔

"غیر سائنس نے جب پہلی پہل سالمے کے وجود کی دریافت کی تو مادیت نے اسی وقت اپنی فتح کا ڈنکا بجادیا اور تمام اہل علم کو تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کی اساس مادہ ہی ہے۔ لیکن جب تجربات کا ہاتھ سالمے کا بھی جگر چاک کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے پایا کہ اس کے اندر تو صرف ایک توانائی ہی کام کر رہی تھی۔ ان حالات کے تحت پرانے نظریئے کا جانبر ہونا سخت دشوار ہوگیا۔ ایک یہودی حکیم کی اضافیت اور برق کے کوانٹم اس پر پے در پے ضربیں لگا رہے تھے۔ اور آخرکار مادیت کی خاک سے ایک ایسا ہیولیٰ اٹھا جس کے اندر ایک ریاضی داں روح کام کر رہی تھی"

میں بڑا اسٹ پٹایا۔ میں نے بڑی گرما گرم بحث کی لیکن وہ حقائق سے مسلح کسی صورت بھی جھکنے کو تیار نظر نہ آتا تھا۔ لہذا مجھے ہی جھکنا پڑا۔

اب میں نے عینیت کا منظم مطالعہ شروع کردیا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ فواد میرے تحت الشعور کے چور دروازے کے راستے سے دبے پاؤں گھس رہا تھا۔ عین پرستوں کے دلائل مجھے روز بروز لبھاتے جارہے تھے۔ مدعیان عین بالکل بجا تھے جب وہ کہتے کہ "آخر مادہ کیسے درد محسوس کرسکتا ہے؟

مادہ پرست کے لئے یہ بات لوہے کے چنے تھی۔

اس کے بعد عین پرست مزید استفسار کرتا "اس تصور کی توجیہ تم کیسے کرتے ہو، جو مادے کی کثیف چادر پھاڑ کر مکان وزمان کی حدود سے بلند پرواز کرنے لگتا ہے؟"

مادہ پرست اپنے مخصوص انداز ڈھٹائی میں اسے بھی مادہ کی انتہائی بلندی کہہ سکتا تھا لیکن مسئلہ شعور[1] اس کے دل میں تیر کی طرح چبھتا رہتا۔ بڑے بڑے مادہ پرستوں کو بھی شعور کے نام پر کان دبا کر چلنا پڑتا۔

---

[1] شعور (Consciousness) فلسفے کی اصطلاح میں احساس گردوپیش کو کہتے ہیں جو ہم میں ایک بیداری ہے (دیکھو صفحہ آئندہ)

پھر عین پرست کہتا "روشنی چڑھتی ہے اور ڈھلتی ہے۔ صبح کے وقت رنگ کچھ ہیں اور جلوہ دکھاتا ہے، اور رات کو اور۔ پھر کون سا رنگ اصلی ہے؟ حیوانی اور انسانی بصارت میں اختلاف[۱] عظیم ہے، پھر کون اشیاء کا صحیح ادراک کرتا ہے؟ وجود کی بے بسی کا تو یہ حال ہے کہ آنکھ کے ڈھیلے کو ذرا دباؤ تو نیلگوں تارے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔ یرقان اصفر کا مریض ہر شے کو بسنتی جلوہ میں دیکھتا ہے، پھر ہاتھوں کو آزماؤ جن کو تم لمس کا سنگم سمجھتے ہو۔ ایک ہاتھ گرم پانی میں ڈالو اور دوسرا سرد پانی میں، پھر دونوں نیم گرم پانی میں ڈالو۔ گرم پانی والا ہاتھ خنکی محسوس کرے گا اور سرد پانی والا ہاتھ گرمی۔ آخران "جاہل عالموں" پر اعتماد کرکے کوئی کیونکر صداقت کو پا سکتا ہے۔ انسانی حس وادراک کا تخالف بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایک چیز کو زید ایک نظر سے دیکھتا ہے تو بکر دوسری نظر سے"۔

عین پرست اپنے زور بیان پر مسرور ہوتا ہے، پھر مادیت پر آخری ضرب لگاتے ہوئے کہتا ہے "یہ فواد ہی تو ہے جو نظر کو روشنی، کان کو آواز اور ہاتھ کو لمس بخشتا ہے۔ یہی اشیاء کا خالق ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تھکے ماندے مسافر کے لئے ایک گز بھی ایک میل کے برابر ہے، اور منتظر عاشق کے لئے ایک دقیقہ بھی سال سے بڑھ کر ہے"۔

اب میں نے اپنی تحقیق فواد پر ختم کی اور عملی دنیا میں داخل ہوا چاہتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مجھے اس دلیل سے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا کہ "دنیا کی ہر چیز نامکمل ہے، اور اپنی تکمیل کے لئے اپنا جوڑا چاہتی ہے۔ دو ہاتھ مل کر ایک کام کرتے ہیں، اور دو پاؤں کی حرکت سے

(بقیہ صفحہ ماقبل) جو ہمیں ماحول کے تہیجات و محرکات سے آگاہ رکھتی ہے۔ پھر ہم ان محرکات (Stimuli) کا جواب دے کر اپنے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ یہی زندگی ہے، شعور کی موت دراصل زندگی کی موت ہے، اسلام اسی سے ان تمام نشیات اور مسکرات کو ممنوع قرار دیتا ہے جو انسان کے شعور کو سلا دیتی ہیں۔ برگساں نے عالم فلسفہ میں پہلی دفعہ شعور کی اہمیت جتائی اور اس کی ماہیت و نوعیت کے اسرار کھولے۔

[۱] تجربات سے یہ بھی معلوم ہے کہ کتے کو اشیاء بڑی نظر آتی ہیں۔ بلی کو الٹی اور مکھی کو جالی دار (باقی اللہ ہی بہتر جانتا ہے)

ایک قدم اٹھتا ہے۔ جب پہلی بار میں نے اپنی بیوی دیکھی تو میں کچھ وقفہ کے لئے مبہوت رہ گیا۔ وہ باغِ ارم کی پری تھی یا صبح بہار کی پہلی کلی۔ میں نے اسے روکنا چاہا لیکن کوئی آ گیا، میں نے پھر کتاب اٹھائی اور اس میں اپنی توجہ کو جکڑنا چاہا۔ لیکن نہیں، میری آنکھوں کے سامنے الفاظ ناچنے لگے، اور پھیلتے پھیلتے اس کی تصویر بن گئے۔ دل میں ایک جذبہ بگولے کی طرح اٹھ رہا تھا، میں نے آنکھوں کے سامنے دلیل پیش کی کہ وہ حقیقت میں فواد کی تخلیق ہے لیکن آنکھیں تھیں کہ ماننے کو تیار نہ تھیں، اور کتاب سے بدستور بھاگ رہی تھیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرے سامنے پھر کھڑی تھی۔ وہ میری طرف سیاہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، میں کچھ عرصہ تک عالم سکوت میں ڈوبا رہا۔ مجھے محسوس ہوا، گویا کائنات کچھ وقت کے لئے ساکن کھڑی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا پھر فواد کی طرف، پھر آنکھوں کو ٹٹولا ہر چیز اپنی جگہ پر قایم تھی۔

"دور ہو مادہ پرست اور صین پرست۔ مادہ اور فواد دونوں قایم ہیں" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا جس نے مجھے اس بھول بھلیوں سے نکالا۔

اب میں اس بات پر یقین واثق رکھتا ہوں کہ ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر نامکمل ہے۔

جیلانی

کوریا کی تحریکِ آزادی

کوریا کی تحریک آزادی کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس پچیس سالہ جدوجہد کا مرکز ملک سے باہر رہا ہے۔ کوریا کی آزادی کے لئے سب سے پہلے یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو ملک کے طول و عرض میں مظاہرہ کیا گیا۔ مظاہرین کی تعداد بیس لاکھ تھی۔ مگر جاپانیوں نے بہت جلد اس پر قابو حاصل کر لیا۔ اس سلسلے میں کوریا کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً پچاس ہزار قید ہوئے اور سات ہزار کام آئے۔ کوریا کے بہت سے رہنما جلاوطن ہوئے۔ بہت سے کوریائی آزاد فوج میں شریک ہو گئے، اور بہتوں نے شنگھائی میں پناہ لی، جہاں سنہ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں ملک سے باہر پہلی مرتبہ کوریائی حکومت قایم کی گئی تھی، جس کے صدر ڈاکٹر سنگ مین ری YNGMAN RHEE ہیں۔

کوریائی جلاوطنوں کی کثرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہر بیس میں سے ایک جلاوطن ہے۔ تقریباً ساڑھے بارہ لاکھ منچوریا میں ہیں، تیس ہزار کے قریب چین میں، چالیس ہزار روسی سائبیریا میں اور تقریباً دس ہزار ہوائی (Hawaii) اور ریاست ہائے متحدہ کی نوآبادیات میں۔ کوریا کی خفیہ جدوجہد کو جاپانی حکومت ختم کرنے میں کبھی کامیاب تو نہیں ہوئی مگر جاپانی دباؤ اور سختیوں کی وجہ سے کبھی اسے بڑھنے اور ترقی کرنے کا مناسب موقع نہیں ملا جس کی وجہ سے کوریا کی انقلابی جدوجہد کو جو کچھ ترقی اور عروج حاصل ہوا، وہ تمام تر کوریائی جلاوطنوں کی ممنون احسان ہے۔

تجربہ جلاوطنوں کی بعض جماعتیں اپنے وطن سے تعلق قایم نہ رکھ سکیں، اس لئے اپنے وطن کی آزادی کے لئے خارجی حکومتوں کی امداد حاصل کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اس سلسلے میں قابلِ ذکر کوریا کی موجودہ عارضی حکومت ہے، جو منچوریا کی کفالت میں قایم کی گئی ہے۔ ان گروہوں میں ـــ

قدامت پرست ہیں، انہوں نے نہ تو کبھی گوریلا جنگ کو منظم کرنے کی کوشش کی اور نہ کبھی کوریا کے باہر یا اندر عوام کی مدد اور ہمدردی حاصل کرنے کی۔ انتظامی تجربہ بھی نہیں رکھتے کہ آزاد کوریا کی حکومت کے چلانے میں ان سے کوئی مدد مل سکے گی، البتہ خارجی خصوصاً چینی اور امریکی حکومتوں سے ان کے بہت اچھے تعلقات ہیں اس لئے اس سلسلے میں ان سے قابلِ قدر امداد اور مشورے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ دوسرا قابلِ ذکر گروہ وہ ہے جس نے حصول آزادی کے لئے نسبتہ سخت طریقے اختیار کئے اور کوریائی عوام سے نہایت گہرا تعلق رکھا، اس میں کوریائی کمیونسٹ پارٹی شریک ہے جو سنہ ۱۹۱۸ء میں قایم ہوئی اور بایاں بازو۔ اس گروہ نے منچوریا، چین اور خود جاپان میں اپنے مرکز قایم کئے اور مجاہدوں اور دہشت پسندوں کو باقاعدہ منظم کیا۔ ان میں سے بہت سے چینی کمیونسٹ اور کومن تانگ کے اتحاد کے زمانے میں سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء کے چینی انقلاب میں شریک ہوئے اور دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء میں جب کینٹن کمیون (Canton Commune) کو دبایا گیا تو ان میں سے بہت سے رہنما کام آئے۔

پارٹیوں کے اختلافات

اس میں شبہ نہیں کہ کوریا کے مختلف گروہوں، حلقوں اور پارٹیوں کا اس کی تحریک آزادی کے قیام و ترقی میں ممتاز اور نمایاں حصہ ہے، مگر ان کے باہمی اختلافات سے الجھاؤ اور مشکلیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً جب سوال چینی انقلاب میں نمایاں حصہ لینے، ریاستہائے متحدہ میں پروپیگنڈا کرنے، مقاصد اور طریق کار کے تعین میں قدامت پرستوں اور ترقی پسندوں کے اختلافات طے کرنے، جاپان کی متشددانہ اور جابرانہ پالیسی اور کوریائی مسائل سے خارجی حکومتوں کی بے اعتنائی اور سرد مہری کے خلاف جد وجہد کو جاری رکھنے، غرض اسی طرح کے دوسرے بے شمار اہم مسائل کے حل کرنے کا اٹھتا ہے تو مختلف جماعتوں کا الجھاؤ آڑے آتا ہے۔ مشرقی ایشیا کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا بھی کوریا کی تحریک آزادی نے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ چین کی انقلابی تحریک جس وقت بہت مضبوط تھی اس وقت اسے فروغ حاصل ہوا اور سنہ ۲۷ء میں جب چین کے متحدہ محاذ میں انتشار پیدا ہوا

تو یہ تحریک بھی ناکامی سے دوچار ہوئی، اسی طرح جاپان کے حملے کے وقت، چین کے ترقی پسند عناصر نے متحدہ محاذ کا مطالبہ کیا اور سنہ ۳۶ و ۳۷ء میں جب کومن تانگ اور کمیونسٹوں میں تھوڑے عرصے کے لئے سمجھوتہ ہوگیا تو اس سے کوریا کی تحریک آزادی کو بھی غیر معمولی تقویت پہنچی، غرض جس وقت چین کے اتحاد میں انتشار پیدا ہوتا اور کومن تانگ اور چینی جمہوریت پسندوں میں ذرا بھی کشیدگی ہوتی تو چین اور منچوریا کے کوریائی رہنما بھی اسی لحاظ سے بٹ جاتے۔ قدامت پرستوں نے جن کی ریاستہائے متحدہ کی منظوری اور مدد پر ہمیشہ نظر ہوتی تھی، جاپانی حکومت کے خلاف متحدہ جدوجہد کرنے کی بجائے سنہ ۱۹۴۰ء میں چنکنگ کی کفالت میں کوریائی عارضی حکومت کی دوبارہ طرح ڈالی اور اتحادیوں کی فتح کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ دوسری طرف کوریائی کمیونسٹ اور بائیں بازو نے شمالی چین اور منچوریا میں گوریلا جنگ کی تنظیم شروع کی اور ینان (Yenan) کے چینی کمیونسٹوں سے نہایت گہرا تعلق پیدا کیا اسی کے ساتھ کوریا میں بھی مختصر مگر ترقی پذیر خفیہ جدوجہد کی بنیاد رکھی۔

کِم کو کی حکومت

کوریا کی عارضی حکومت، چینی حکومت کی کفالت اور مالی امداد سے سنہ ۱۹۴۰ء سے کِم کو (Kim Koo) کی ماتحتی میں کام کر رہی ہے اس کے ماتحت ایک آزاد فوج بھی ہے، جو جنرل لی چنگ چن (Li Chung Chan) کی ماتحتی اور چینی قومی مدافعت کونسل کی ہدایت اور رہنمائی میں کام کرتی ہے۔ ۷۰ سال کے سن رسیدہ ڈاکٹر سنگ مین رہی (Syngman Rhee) عارضی حکومت کے صدر ہیں۔ اگرچہ امریکہ نے صدر یا ان کی گورنمنٹ کو کبھی سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا ہے، مگر واشنگٹن میں وہ عارضی حکومت کے نمائندہ ہیں۔ ڈاکٹر رہی کی سیاسی جدوجہد کیتلی کے جوش کی طرح ہنگامہ خیز مگر وقتی ہوتی ہے محض طویل سیاسی خدمات اور ریاستہائے متحدہ سے غیر معمولی تعلق اور واقفیت کی وجہ سے انھیں یہ عزت اور منصب حاصل ہے، ورنہ آزاد کوریا میں انھیں شاید کوئی جگہ نہ مل سکے گی۔

متحدہ محاذ؟

ابتدا میں کوریا کی عارضی حکومت کلیتہً آزاد پارٹی کے ہاتھ میں تھی جس میں

سن ۱۹۱۹ء کے مفرور انقلابی شامل تھے۔ مگر اسے کوریا کی زیادہ سے زیادہ نمائندہ حکومت بنانے کے لئے سنہ۴۲ء میں دوسری جماعتوں کو بھی مناسب نمائندگی دی گئی۔ خصوصاً کوریائی قومی انقلابی پارٹی کو جس میں کمیونسٹ دہشت پسند اور انارکسٹ بھی شامل ہیں۔ اکتوبر سنہ۴۲ء میں کوریائی پارٹی کانگریس کی نظر ثانی کی گئی اور اس میں حسب ذیل پارٹیوں کو نمائندگی دی گئی :-

آزاد پارٹی ۳۳ ، قومی انقلابی پارٹی ۱۲ ، غیر جانب دار ۵ ۔

کوریا کی تمام قوم پرور جماعتوں کا متحدہ محاذ قایم کرنے کے لئے یہ عملی اقدام چنکنگ کی سیاسی فضا کے منافی تھا۔ اس لئے کہ کوریائی آزاد پارٹی پر، کومن تانگ کے رجعت پرستوں کا قبضہ تھا اور وہی اس کی مالی امداد کرتے تھے اور وہ ریڈیکل اور کمیونسٹ پارٹی کے اقتدار کو ایک لمحہ کے لئے گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، چنانچہ جب انقلابی پارٹی کے نمائندوں کو جگہ دی گئی تو رجعت پرستوں نے اپنی گرفت کو اور مضبوط کر لیا جس کی وجہ سے مجبور ہو کر نیشنل انقلابی پارٹی کے ممبر چنکنگ سے ینان بھاگے اور کوریا کے ان باشندوں میں جا ملے جو یا تو کوریا سے بھاگ کر آئے تھے یا چین کی جاپانی فوج سے ۔

ینان میں ان کوریائی انقلابیوں نے چینی کمیونسٹ اور جاپانیوں کی عوامی آزاد لیگ PEOPLE'S EMANCIPATION LEAGUE کے ساتھ ملکر کام شروع کیا، مگر سنہ۴۴ء کے اوائل ہی جاپانیوں کی طرح انہوں نے کوریائی باشندوں کی ایک الگ عوامی آزاد لیگ قایم کی اور مزدوروں اور کسانوں کے لئے اسکول کھولے جاپان کی شکست سے کچھ پہلے انھوں نے دو ہزار ممبروں کے ذریعے شمالی چین کے کوریوں کے اندر نہایت وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے کا کام شروع کیا اور منچوریا اور کوریا کے گوریلا لڑائی لڑنے والوں سے تعلق پیدا کیا۔ سنہ۴۵ء کے موسم بہار میں کوریائی لیگ نے ایک مینوفسٹو شایع کیا تھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ تمام ممالک کے کوریائی کسی ایک جمہوری تنظیم کے ماتحت جمع ہو جائیں اور جاپانیوں کے خلاف تمام پارٹیاں متحدہ محاذ قایم کریں۔ مینی فسٹو میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس نئے ادارہ کو چاہیئے کہ وہ مسلح فوج تیار کرے جو اتحادیوں کے ساتھ مل کر لڑے۔ اس لڑائی اور جدوجہد کا مقصد کوریا کی جمہوری حکومت کا قیام ہوگا۔

جب اس نئے ادارے کی تنظیم شروع کی گئی تو کوریا کے باشندوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے سوائے اس کے اور

کوئی چارہ نہیں تھا کہ کوریا کے مفروروں سے مدد لی جائے، چنانچہ ۱۹۴۵ء کے شروع میں اس کے مطابق کام شروع ہوا دنیا کے مختلف صوبوں سے لوگ کوریا واپس آنے لگے اور خفیہ جد و جہد کو منظم کرنے اور جاپانیوں کے خلاف مضبوط محاذ بنانے کی کوشش میں لگ گئے۔ جاپانیوں کی غیر معمولی کوششوں کے باوجود، گوریلا دستے جاپانی رسل و رسائل میں خلل پیدا کرنے اور جنگی صنعتوں کو تباہ و برباد کرنے میں خاصے کامیاب ہو گئے۔ ایک دستہ پندرہ ہزار آدمیوں پر مشتمل KINJIH-HSING کی سرکردگی میں چین کی آٹھویں روٹ آرمی CHINESE EIGHT TH ROUTEARMY سے جا ملا۔ آزاد لیگ EMANGIPATION LEAGUE کے رہنما منچوریا کے کوریائی مجاہدوں اور چینی گوریلا دستہ سے تال میل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

کام کی صحیح بنیاد

آزاد لیگ کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر کو دیکھ کر کوریائی آزاد حکومت (چنگنگ) کو اپنا وجود خطرہ میں نظر آیا، اس لئے کچھ ممبروں نے کوریائی جمہوری پارٹی کے نام سے ایک نئی جماعت قایم کی۔ یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو اس نئی جماعت کے سیاسی مطمح نظر، طریق کار اور غرض و غایت کا اعلان کیا گیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ عارضی حکومت کے لیڈر بھی کوریا کی آزادی اور جمہوری حکومت کے قیام کے لئے لڑنے مرنے کے لئے بےچین اور ہمہ وقت تیار ہیں۔ مینی فسٹو میں اس پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہ کوریائی رہنماؤں نے لڑائی کی کوششوں میں کوئی ٹھوس مدد نہیں دی اور نہ آزاد حکومت کے قیام کے لئے انہوں نے کوئی ٹھوس خاکہ پیش کیا۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "خالی خولی سیاسی طاقت کے حصول میں ہم نے پارٹی بازی، جتھہ بندی، فریب دہی اور مبالغہ آمیز پروپگنڈوں میں لگے رہے۔ کریمیا کانفرنس نے پولینڈ اور یگوسلانیہ کے متعلق جو فیصلے کئے ہیں، ان میں ایشیا کے آزاد کرائے ہوئے ملکوں میں جو کچھ ہوگا، اس کی طرف کافی اشارے ہیں۔ کون اس بات کی ضمانت کر سکتا ہے کہ آج لندن کی پولی حکومت کا جو حشر ہوا، وہی کل چنگنگ کی کوریائی عارضی حکومت کا حشر نہیں ہوگا۔ اگر ہم نے ٹھوس بنیادوں پر کام کیا اور صحیح جمہوریت قایم کی گئی، تو یقیناً ہماری قسمت کا فیصلہ وہ نہیں ہوگا جو پولی حکومت کا ہوا۔"

عبداللطیف اعظمی

بنجاروں کی برادری

بنجارے[1] کھتری نسل سے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں۔ یو۔پی میں اس برادری کے لوگوں کو بنجارا کہتے ہیں۔ پنجاب میں خوجہ۔ لفظ بنجارا ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں تو ان کی ایک ہی قسم ہے۔ لیکن ہندوؤں میں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خانہ بدوش ہیں جو پیلی بھیت کی طرف خانہ بدوشی کی حالت میں پھرتے رہتے ہیں دوسرے ٹانڈے والے ہیں جو ایک جگہ بس جاتے ہیں۔ خانہ بدوش ہندو بنجارے سیر کی بنڈ: کہلاتے ہیں۔ اپنے تمام گائے بیل اور سامان اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت مالدار لوگ ہیں، لیکن ایک جگہ سکونت اختیار نہیں کرتے۔

تجارت کا دار و مدار شاہانِ اسلام کے وقت میں اسی قوم پر تھا۔ ایک ایک بنجارے کی پانچ پانچ چھ چھ ہزار بیلوں کی گونیں لدتی تھیں۔ سہارنپور سے چاول بھرا، مظفرنگر، میرٹھ ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ وہاں سے چاول کے ساتھ دوسری اجناس لے کر علی گڈھ، آگرہ چلے جاتے تھے آٹھ مہینے باہر رہتے تھے اور چار مہینے برسات کے گھر پر گذارتے تھے۔

کاٹھیاواڑ کے خوجے بھی نسل کے اعتبار سے بنجارے ہی ہیں۔ انہوں نے سود کے لین دین کو جائز قرار دے لیا ہے۔

اس برادری کے لوگ بجنور، مرادآباد، رامپور، بریلی پیلی بھیت، بدایوں، لاہور، امرتسر قصور، جالندھر، سیالکوٹ، انبالہ میں آباد ہیں۔ ان کے ماسوا بنجارا قوم سے کوئی ضلع یو۔پی اور پنجاب کا خالی نہ ہوگا۔ بہار اور بنگال کا علم نہیں ہے۔

شہر سہارنپور میں ان کی تعداد نو سو ہے۔ زیادہ تعداد میں صرف ایک محلہ بنجاران میں ہیں یعنی

---

[1] اس برادری کے بارے میں حالات عبدالرحیم صاحب سے معلوم ہوئے جو برادری کے ایک مخلص اور ہمدرد کارکن ہیں اور مدرسہ فیضان القرآن کو قائم کر کے اسے چلا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ محلہ بانزداران میں ۵۰۔ محلہ گنپت سرائے میں ۲۵۔ محلہ شیوپوری منڈی میں ۱۲۔ محلہ سرائے شاہجی میں ۱۲۵ ہیں۔

شہر کے علاوہ دیہات میں ۱۶یا ۱۷ بستیاں اور ہیں۔ قصبہ چلکانہ میں ۷۰، قصبہ سرساوا میں ۱۲۵، قصبہ رامپور میں ۱۲۵، قصبہ نکڑ میں ۴۰۰، قصبہ گنگوہ میں ۵۰، قصبہ تیتروں میں ۱۵۰، قصبہ دیوبند میں ۷۰، قصبہ جوالاپور میں ۳۰۰، قصبہ پیران کلیر میں ۲۰، قصبہ بھگوان پور میں ۸۵، قصبہ جھبن پور میں ۴۰، قصبہ حلوانہ میں ۱۲، قصبہ ہبروڑا میں ۸۰، قصبہ اہیڑی میں ۳۰، قصبہ تلہیڑہ میں ۸۰، قصبہ کولکی میں ۴۰، قصبہ بلجورا میں ۸، قصبہ کروندی میں ۱۲۰۔

شہر کے بنجاروں میں اگر شاہ جی کی سرائے کے ۱۲۵ لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو باقی پوری برادری کے تقریباً آٹھ سو لوگ ایک زنجیر میں منسلک ہیں۔ یہ آٹھ سو سب کے سب تجارت پیشہ ہیں۔ صرف ایک شخص ملازمت کرتا ہے اُسے ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ تجارت مندرجہ ذیل چیزوں کی ہے:۔ پنسارہٹہ، غلہ، کپڑا، پیتل تانبا، لاک، موم، گوند، ٹمبر (عمارتی لکڑی) کپاس فروٹ (پھل) کی آڑت۔ غلہ میں کچی آڑت کا کام ہوتا ہے۔ ایک دوکان شہر سہارنپور کے سب بیوپاریوں میں چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان فوقیت لئے ہوئے ہے۔ اگر بازار میں دو سو دکانیں کچی آڑت کی ہیں تو ایک چوتھائی کام صرف اس کے ہاتھ میں ہے اور باقی تین چوتھائی کام ایک سو ننانوے بقیہ دُکانوں کے ہاتھ میں ہے۔

پنسارہٹہ میں بھی ایک دُکان ایسی ہے جو پہلے ہندو مسلمان دونوں میں نمبر ایک کی تھی لیکن اب دوسرے نمبر پہ ہے، ایک اور مسلمان بھائی اس سے بڑھ گیا ہے۔ پنسارہٹہ میں مسلمانوں کی تھوک فروشی کی تین دوکانیں ہیں۔ اوّل نمبر کی تو ایک دوسرے مسلمان کی ہے۔ دوسرے نمبر پہ بنجارا برادری کے ایک شخص کی اور تیسرے کی حیثیت اس سے کم ہے۔

کپڑے میں بنجارہ برادری کی صرف دو دکانیں ہیں۔ ہندوؤں کے مقابلے میں حیثیت کم ہے۔ ایک دوکان کی حالت اچھی ہے۔ دوسری اس کے بھائی کی دوکان ہے۔ اس کی حالت

بھی اچھی ہے۔ یہ دونوں دوکانیں حیثیت والی ہیں جائداد والے اور آبرودار لوگوں کی
پیتل تانبے کی چار پانچ دوکانیں کھرتج (خوردہ فروشی) کی ہیں لیکن کچھ اچھی حالت پر نہیں۔
لاک کا کام سوائے اس برادری کے شہر میں کوئی دوسرا نہیں کرتا۔ تھوک کام ہے
اور تقریباً سب بنجاروں کے ہاتھ میں ہے۔

موم، گوند کا کام ہندوؤں کے ہاتھ میں ایک آنہ ہے تو اس قوم کے ہاتھ میں پندرہ
آنے ہے۔ اس برادری کے لوگ چونکہ دیہات میں گھومتے رہتے ہیں اس لئے اکٹھا کر لاتے ہیں
—— مونجھ کے باند اور بھابڑ کے باند اور مونجھ اور بھابڑ کی تجارت ہندوؤں کے مقابلے
میں بنجارہ قوم کے ایک آدمی کے ہاتھ میں تیسرے نمبر پر ہے اس کے علاوہ پانچ سات معمولی دوکانیں
ہیں۔ روئی، کپاس کا کام پہلے تو بمبئی کلکتہ کا کرتے تھے، لیکن اب بہت معمولی پیمانے پر ہے۔
تھوک کام بنجاروں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

فروٹ کمیشن ایجنٹ کی ایک دوکان بنجاروں کی ہے۔ اچھی حیثیت ہے۔ صاحب جائداد
لوگوں کے ہاتھ میں یہ کام ہے۔

برادری کے سب لوگ تجارت پیشہ ہیں، مزدور پیشہ نہیں ہیں۔ آٹھ دس برس کی عمر کا جب
بچہ ہو جاتا ہے تو اس کو آٹھ دس روپے کا سودا دے کر کہہ دیا جاتا ہے کہ دیہات میں گھومو،
اور اپنا کام چلاؤ۔

یہ قوم صرف مذہبی تعلیم کو پسند کرتی ہے اور یہ تعلیم ان میں ہے۔ قرآن شریف۔ نماز۔
روزے کے مسائل، معمولی اردو حساب۔ یہ چیزیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اپنا حساب کتاب عام طور پر
خود ہی کر لیتے ہیں۔ بڑی دوکانوں میں صرف ایک پر ہندو منیم کام کرتے ہیں۔ پنسار ہٹہ کی ایک
دوکان پر مسلمان منیم کام کرتے ہیں۔ باقی پنسار ہٹہ اور فروٹ کی دوکانوں پر مالک خود ہی کام کرتے
ہیں۔ لڑکیوں کو گھروں میں عورتیں پڑھاتی ہیں یا مدرسہ میں ایک جماعت تعلیم نسواں کے لئے علیحدہ
قایم کر دی گئی ہے۔ سینا پرونا، کھانا پکانا گھر ہی پر سیکھ لیتی ہیں۔ نئی تعلیم میں کوئی حصہ نہیں لیتے

صرف دو تین افراد ایسے ہیں جو انگریزی پڑھے ہوئے ہیں۔ ایک انٹرنس فیل ہیں اور دو نے پرائیوٹ انگریزی پڑھی ہے۔ ایک انٹرنس پاس ہیں، لیکن ان کا دماغ صحیح نہیں ہے۔

تندرستی کی عام حالت مردوں عورتوں کی اچھی ہے۔

برادری کی نئی نسل میں بعض بری عادتیں پائی جاتی ہیں۔ ۱۷ اور ۲۷ برس کے نوجوانوں میں کچھ لوگوں کو شراب، جوئے کی لت ہے، اور دو چار چوری میں بھی ہیں۔

سوائے محلہ سرائے شاہ جی کے باقی تمام آٹھ سو لوگوں کا ایک ہی بندھن ہے اور صرف شہر کے لوگوں میں آپس میں شادی بیاہ ہوتا ہے۔ محلہ شاہ جی کی سرائے کے لوگ قصبات کے ساتھ وابستہ ہیں۔

برادری کی پنچایت ہے۔ اس کے فیصلے سب تسلیم کرتے ہیں۔ اب دیانت اور حیا شرم اٹھ جانے کی وجہ سے اثرات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ معاملات کے فیصلے کے تین طریقے ہوتے ہیں۔ شریعت، پنچایت اور قانون۔ ان میں سے لوگ جسے اپنے مفید مطلب دیکھتے ہیں اس کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں۔ برادری میں شادی بیاہ کھانے پینے کے بندھن ابھی تک قایم ہیں اس لئے برادری کا نظام قایم ہے، لیکن پہلے کے مقابلے میں سربرآوردہ لوگوں کے اثرات کم ہوگئے ہیں۔ برادری کے چودھری اب بھی ہیں۔ تمام محلوں کی منظوری سے چودھری منتخب کئے جاتے ہیں۔ آجکل محمد اسمٰعیل صاحب چودھری ہیں۔ ان کے نیچے چار پانچ چکڑات یعنی نائب چودھری ہیں۔

برادری کے ممتاز لوگ حسب ذیل ہیں:-

(۱) حافظ مختار احمد و شریف احمد۔ غلے کی کچھ آڑت کا کام کرتے ہیں۔ اب ان کا کام صرف گائے بیل کی دم کے بال اور گھوڑے کے بال کا ہے، اور جائداد کی آمدنی ہے۔ یہ ذاتی طور پر جائداد کے پیدا کرنے والوں میں ہیں اور اچھے پیمانے پر جائداد پیدا کی ہے۔

(۲) حافظ حاجی مختار احمد ٹمبر کا اور غلے کی کچھ آڑت کا کام کرتے ہیں۔

(۳) محمد کامل صاحب۔ یہ لاک کی تجارت کے ذریعے بڑھے ہیں۔

(۴) حاجی محمد اسحٰق صاحب کپڑے کی تجارت میں ہیں۔

(۵) محمد یامین محمد یعقوب۔ فروٹ مرچنٹس ہیں، اور غلہ کی آڑھت بھی ہے۔

(۶) عبدالرحیم صاحب مدرسہ فیضان القرآن قایم کیا۔ وقف کی جو ایک جائداد موجود تھی اس کا اجراء ۱۹۴۳ء سے دوبارہ ہوگیا ہے۔ فی الحال اس مدرسہ کا سو روپئے ماہوار کا خرچ ہے۔ اس کا ذریعہ آمدنی صرف محلے کے لوگ تھے۔ اب اینٹی کے ذریعے سے کچھ اور آمدنی کا سلسلہ ہوگیا ہے طلباء کی تعداد ۱۴۰ ہے۔ چار معلم ایک معلمہ ہے۔ بیس طلباء کے لئے ایک دارالاقامہ بھی ہے عمارت زیر تعمیر ہے جس میں مکمل ہونے کے بعد سو طلباء کے لئے جگہ نکل آئے گی۔ عبدالرحیم صاحب قوم کے بہت ہمدرد ہیں۔ اس تحقیقات کے کام میں انہوں نے بہت مدد فرمائی۔

برادری کے لوگوں کی حیثیت کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا۔ لیکن انہوں نے اس ڈر سے کہ کہیں اس سے برادری کے لوگوں کو نقصان نہ پہنچے اس کا جواب دینا مناسب سمجھا

برادری کا سرمایہ نہ صحرائی جائداد میں ہے نہ فیکٹری اور نہ کارخانہ میں۔ صرف سکنائی جائداد اور کاروبار میں روپیہ لگا ہوا ہے۔ سود نہ لیا جاتا ہے نہ دیا جاتا ہے۔ یہ شکل تو ہو جاتی ہے کہ جب دہلی، کلکتہ، بمبئی، کراچی میں سودا خریدا جاتا ہے اور روپیہ چونکہ نقد باندھ کر نہیں لے جایا جاتا۔ اس لئے دس پانچ دن کے لئے بیوپاری لائن کا سود لگ جاتا ہے۔ یہ سود پونے آٹھ آنے سینکڑہ پر لگتا ہے لیکن حساب کے موقع پر گھٹ کر ۴ ر فی صدی ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ مستقل طور پر مکمل حساب کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی دیتا ہے خیرات کا کوئی معیار نہیں، حسب توفیق دی جاتی ہے۔

زیورات کی طرف بھی رجحان ہے۔ اچھے گھروں میں کھانے پر بھی اچھا خرچ رہتا ہے ورنہ معمولی خرچ اخراجات ہیں۔ سیر تفریح کا رجحان آٹھ سے ستائیس کی عمر کے لوگوں میں ہے سینما وغیرہ جاتے ہیں۔ پڑھا آدمی کوئی نہیں جاتا۔ محلہ بخاران میں صرف دو مسجدیں ہیں۔ ان کے موذنوں اور اماموں کا کھانا قوم کے افراد دیتے ہیں اور تنخواہ وقف کی آمدنی سے دی جاتی ہے۔ جس سے دو قومیں

مسجدیں قوم کی تعمیر کی ہوئی ہیں اور ان کے لئے جائداد وقف کر دی گئی ہے۔ پیر پرستی نہیں ہے اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے دلوں میں علماء کا احترام کافی ہے۔

جنگ کی وجہ سے جیسی جن کی حیثیت ہے ویسی ہر شخص کی آمدنی میں ترقی ہوگئی ہے۔ جو حرفہ پیشہ ہیں ان کی آمدنی بھی اچھی ہوگئی ہے لیکن جنگ سے پہلے برادری کی اقلیت کی حالت تو اچھی تھی۔ اکثریت کی خراب تھی، اس زبوں حالی کا سبب یہ تھا کہ کاروبار کم چلتے تھے اور آمدنیاں اسی نسبت سے کم تھیں۔

برادری کے خرچ کا معیار بند شوں میں جکڑا ہوا ہے، جس وقت سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ بچہ پیدا ہوگا اسی وقت سے اخراجات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور جب تک بچہ کی شادی نہ ہو ہزار آٹھ سو کے قریب اس پر قبل از شادی خرچ ہوجاتا ہے۔ آگے شادی میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک سب اس کے یہاں مدعو ہوتے ہیں۔ مرد اس کے مکان پر دعوت کھانے جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے لئے گھر پر کھانا بھیجا جاتا ہے۔ برادری کی اکثریت ایک کھانا دیتی ہے۔ کوئی صرف پلاؤ کر دیتا ہے کوئی دال چاول کر دیتا ہے کوئی زردہ پلاؤ کرتا ہے، ان سب کا شمار ایک روٹی میں ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی شکر پورا، کوئی صرف مٹھائی بھی کر دیتا ہے۔ ایک روٹی بیٹی والے کو دینی پڑتی ہے اور ایک روٹی بیٹے والے کو۔ رسم ختنہ کے موقع پر بھی برادری کو ایک روٹی دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور رسومات بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ ان کے ازالہ کی عبدالرحیم صاحب نے کوشش بھی کی لیکن اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ رسوم کے پورا کرنے کے سلسلے میں قرض لینے کی نوبت نہیں آتی، چونکہ بیوپاری اللہ میں ہیں دیہاتوں میں پینٹھوں میں جاکر بھی برادری کے لوگوں کا مال فروخت کرتے ہیں اس لئے سو دو سو اپنی کمائی کے موجود ہوتے ہیں۔ سو، دو سو مال والا لگا دیتا ہے۔ اس طرح کام چل جاتا ہے اس طرح جو روپیہ مال والے لگاتے ہیں اس کا سود قطعی نہیں لیا جاتا۔

محلہ بنجاران میں دو خاندان آباد ہیں۔ شہر کے دوسرے محلوں میں بھی لوگ اسی محلہ سے گئے ہیں، اور آٹھ سو آدمی کی یہ برادری ایک دوسرے کی رشتہ دار ہے۔ رشتے کے قرب و بُعد کی وجہ سے اُنسیت میں کمی ہو سکتی ہے لیکن ہیں سب ایک دوسرے کے رشتہ دار۔

بنجاروں کو ہندوؤں سے مقابلہ کرنے میں کبھی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ عبدالرحیم صاحب نے جب پیتل تانبے کے برتنوں کی دوکان کھولی تو ان کا بیان ہے کہ ابتدا میں ۹ مہینے تک ہندوؤں نے ان سے مقابلہ کیا لیکن بعد کو انھیں نیچا بتایا اور پنچایت کے قوانین انھیں سے بنوائے۔

اسی طرح غلے کے کام میں بھی ابتدا میں مقابلہ ہوا لیکن آخر میں شکست اٹھانا پڑی۔ عبدالرحیم صاحب کے قول کے مطابق کامیابی کا راز ہے مستقل مزاجی اور اصول تجارت سے واقفیت۔ مال کی فراہمی میں بنئے خود بنجارا قوم کے محتاج ہیں۔ بنجارا قوم ان کی محتاج نہیں ہے۔ پنسار ہٹہ میں بھی بنجارا قوم ان کی محتاج نہیں ہے۔

پینٹھ میں نمک مرچ بیچنے کے لئے بنجارا قوم دیہات دیہات گھومتی ہے اس لئے سب سے واقفیت رکھتی ہے۔ ہفتہ وار پینٹھ ہوتی ہے اور یہ لوگ ان میں جاتے ہیں۔ لوگ ان سے خوب واقف ہیں اور تعلقات ہیں، اس لئے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اکثر ایک بیل کی مخصوص وضع کی گاڑی میں گھومتے پھرتے ہیں۔

غلہ۔ گڑ۔ شکر۔ کپاس وغیرہ کو بھی دیہات سے لانے کا انتظام کرتے ہیں۔ گھر کی گاڑیوں میں بھی اور کرایہ کی بھی۔

اس قوم کی دو مسجدیں سہارنپور میں ہیں۔ ان کی نو سو روپیہ سالانہ کی آمدنی جائداد سے ہے مدرسہ فیضان القرآن احاطہ پیر غلام مصطفےٰ صاحب میں واقع ہے اور اس کے اخراجات کی کفیل بنجارہ برادری ہے۔ مدرسہ روبہ ترقی ہے۔ عمارات جدید یعنی کتب خانہ اور دارالطلبہ بنانے کی تجویز ہے۔

محلہ شاہ جی کی سرائے کے بنجارے دوسرے قصبات کے ساتھ وابستہ ہیں قصبات میں روزگار کے لحاظ سے چار قسم کے لوگ ملتے ہیں۔ تجارت پیشہ، زراعت پیشہ، مزدور پیشہ اور زمیندار۔

تجارت پیشہ غلہ، پنسار ہٹہ اور پیتل تانبے کی تجارت تک محدود ہیں، بعض کپڑا بھی فروخت کرتے ہیں۔ زراعت پیشہ لوگوں کے پاس صحرائی جائدادیں بھی ہیں اور صاحب حیثیت لوگ بھی ہیں۔

پچاس سال پہلے محلہ بنجاران کے لوگوں میں اور دیہات کے لوگوں میں شادی بیاہ کے سلسلے میں لین دین ہوتا تھا، لیکن اب نہیں ہوتا۔ دس بارہ سال پہلے یہاں لڑکے زیادہ ہوگئے تھے اور لڑکیاں کم۔ اس وقت یہ کوشش کی گئی تھی کہ لین دین شروع ہو جائے لیکن شہر و دیہات کے فرق کی وجہ سے مثلاً پردے کی پابندی اور معاشرت کے فرق کی وجہ سے یہ کام آگے نہیں بڑھ سکا۔

رفتارِ عالم

مانچوریا، انڈونیشیا اور ایران کئی مہینے سے مدبروں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں لیکن اب تک مسائل کو سلجھانے اور دشواریوں کو رفع کرنے کی کوئی یقینی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب حالت چین کی ہے۔ جاپان کی شکست کے بعد اندیشہ تھا کہ چینیوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائیگی مگر روس نے جو چینی کمیونسٹوں کا سرپرست بن سکتا تھا، کیومن تانگ یعنی قومی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کر لیا۔ اور پھر متحدہ ریاستوں کی حکومت نے جنرل مارشل کو بھیج کر کمیونسٹ پارٹی اور کیومن تانگ میں صلح کرا دی لیکن اس کے باوجود کمیونسٹوں اور قومی حکومت کی فوجوں کے درمیان لڑائیوں کی خبریں آتی رہیں، کبھی وسط چین میں کبھی شانگ ہائی کے آس پاس کبھی شانگ تنگ میں اب مانچوریا اس کشمکش کا میدان ہے جو صلح کے بعد پیدا ہوئی۔ یہاں جھگڑے میں روسی بھی شریک ہیں انہوں نے آخر وقت میں جاپان کے خلاف اعلان جنگ کسی سمجھوتے کی بنا پر کیا تھا جس کی پوری تفصیل معلوم نہیں ہے۔ لیکن انھیں دنوں میں جب کہ جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا گیا، ایک امریکی فوج مانچوریا کے ساحل پر اتری اور اس سے روسیوں کو خیال ہوا کہ متحدہ ریاستوں نے ان کے ساتھ جو سمجھوتہ کیا ہے اس کی پابندی نہیں کی جائے گی۔ چین کی قومی حکومت مانچوریا کو اپنے وطن کا ایک حصہ مانتی ہے۔ اور اس سے کسی طرح دست بردار ہونے پر راضی نہیں۔ مگر اس کے پاس اتنی فوج نہیں تھی کہ جاپانیوں سے ان کے ہتھیار وصول کرتی، اس وجہ سے متحدہ ریاستوں نے اس کی آدمیوں اور سامان سے مدد کی۔ روسیوں کو جیسے ہی اس کا علم ہوا انھوں نے مانچوریا میں اپنا رویہ بدل دیا، پہلے انھوں نے مطالبہ کیا کہ مانچوریا میں جو بھاری جنگی اور صنعتی سامان ہے وہ ان کو دیدیا جائے، اور ایک روایت ہے کہ وہ کئی کارخانوں کی مشینیں وغیرہ اٹھا بھی لے گئے۔ پھر انہوں نے عذر کیا کہ وہ اپنی فوجیں مانچوریا سے ہٹا نہیں سکتے اس لئے کہ سپاہیوں کو لے جانے کا انتظام نہیں کیا جا سکتا

اس کے بعد انہوں نے مکڈن اور چند اور بڑے شہروں سے فوج کو ہٹا کر ایسے مقاموں پر جمع کر لیا جہاں سے وہ پورے مانچوریا کو قابو میں رکھ سکتے تھے۔ اب شاید وہ ملک کو چھوڑ رہے ہیں۔ مگر ان کا مطلب بھی حاصل ہو گیا ہے، کیونکہ اب کمیونسٹ فوجیں کافی تعداد میں پہنچ گئی ہیں، اور اس کی تدبیر کی جا سکتی ہے کہ مانچوریا قومی حکومت کے حوالے نہ کیا جائے بلکہ کمیونسٹوں کے۔ غالباً اب اس ملک کی وہ صنعتی اہمیت بھی نہیں رہی ہے جو جنگ کے زمانے میں تھی، اور اگر کمیونسٹ اس پر قبضہ نہ رکھ سکے تب بھی وہ اپنی موجودہ حالت میں رہتے ہوئے کسی جنگ کے لئے صنعتی مرکز کا کام نہ دے سکے گا۔ اگر متحدہ ریاستوں نے قومی حکومت کو مدد دے کر اسے پھر ایک صنعتی مرکز بنانے کی کوشش کی تو روسی فوراً سمجھ جائیں گے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ متحدہ ریاستوں کی حکومت نے اپنے نزدیک روس سے طے کر لیا تھا کہ چین اس کے حلقے میں شامل ہوگا، اور اب روس کا رویہ اسے صریحی وعدہ خلافی اور دغابازی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ چین پر کسی قسم کا قدرتی یا اخلاقی حق متحدہ ریاستوں کو بھی نہیں ہے اور روس سے معاملہ صرف سامراجی کاروبار کے سلسلے میں کیا گیا تھا اس لئے روس کے طرزِ عمل پر متحدہ ریاستوں کی حکومت کو اور بھی غصہ آ رہا ہے۔ اسی وجہ سے مجلس تحفظ کے اجلاس میں جو اس وقت ہو رہا ہے روس سے ایران کے معاملے میں باز پرس برطانیہ نہیں کر رہا ہے بلکہ متحدہ ریاستوں کے نمائندے۔ معلوم ہوتا ہے روسی اب تک سامراجی کاروبار کے نکتوں کو نہیں سمجھتے۔ ان کے ساتھ سنہ ۱۹۱۷ء کے بعد سے جو برتاؤ کیا گیا وہ انہیں اچھی طرح یاد ہے اور ان کے دل سے یہ اندیشہ دور نہیں کیا جا سکتا کہ سرمایہ دار قومیں موقع پاتے ہی اس اشتراکی نظام کو درہم برہم کرنا چاہیں گی جو روس نے قائم کیا ہے۔ متحدہ ریاستیں چین کو تجارتی فائدے کی خاطر اپنے اثر میں رکھنا چاہتی ہیں، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ شمالی چین روس کے خلاف جنگ کا محاذ نہ بنایا جائے گا۔ اس کا ثبوت دیا بھی جائے تو کیسے ؟ روسیوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا، خصوصاً جب متحدہ ریاستوں کی حکومت بار بار اس کا اعلان کر چکی ہے کہ وہ روس کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھنا چاہتی ہے، اور متحدہ قوموں کا ایک ایسا نظام قائم کیا جا چکا ہے جو جنگ کا سد باب کر سکتا ہے۔ لیکن روسی دیکھتے ہیں کہ ابھی تک ساری دنیا میں سامراجیت کی اغراض کارفرما ہیں، اور ان سے دوستی کرنے کی خواہش ظاہر کرنے کے ساتھ برطانیہ اور متحدہ ریاستیں ان کی تنبیہ

بھی کرتی رہتی ہیں۔ ابھی ایک طویل جنگ ختم ہوتی ہے، لوگ لڑتے لڑتے عاجز آ گئے ہیں لیکن روسی سوچتے ہوں گے کہ جب برطانیہ اور متحدہ ریاستیں ذرا سستا لیں گی تو غنیمہ کا انداز بدل جائے گا اور جنگ کی دھمکیاں دی جانے لگیں گی، پھر وہ کیسے سمجھ لیں کہ اس وقت کی دوستی ہمیشہ قایم رہے گی اور روسی سرحدوں کی مورچہ بندی کرنے کی ضرورت نہیں۔

روسی مدبروں کی مزاجی کیفیت اس بات سے کچھ اور بگڑ ہی جائے گی کہ ایران میں روسی سیاست کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ شاید روسیوں کا اصل مطالبہ صرف یہ تھا کہ انھیں شمالی ایران میں تیل نکالنے کا اجارہ ملے اور وہ اس کی تدبیر بھی کرنا چاہتے تھے کہ ایران کی حکومت جس کی کمزوری کا سب کو علم ہے، آلۂ کار بنے تو ان کا بنے، کسی اور کا نہ بنے۔ اسی وجہ سے انہوں نے آذربائیجان میں آزادی کی تحریک کو سہارا دیا۔ مگر وہ سامراجی سیاست کے فن سے ناواقف ہیں، جو کام انھیں ایران کے دوست اور سرپرست بن کر نکالنا چاہئے تھا اسے انھوں نے اپنے حق کا مطالبہ بنا لیا، ہر طرح سے ظاہر کیا کہ وہ زبردست ہیں، معاہدے کی صریحی خلاف ورزی کی اور گفتگو اس انداز سے کرتے رہے کہ گویا انھیں کسی کی رضامندی اور خوشنودی کی پروا نہیں۔ چاہے وہ ایرانی ہو یا برطانیہ۔ اسی وجہ سے ان کی ہر قدم پر گرفت کی گئی، اور وہ اس پر مجبور ہو گئے کہ یا تو اپنے منصوبے کو ترک کر دیں یا متحدہ اقوام کی ناکر لیں۔ مجلس تحفظ میں روس کے نمائندے مسٹر گرومیکو اصرار کرتے رہے کہ ایران کے مسئلے پر بحث ملتوی کی جائے اور جب بحث کو ملتوی کرنے کی کوئی امید نہیں رہی تو وہ باضابطہ طریقہ پر اجلاس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ آخری خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس تحفظ روسی نمائندے کی عدم موجودگی میں بھی ایران کے معاملے پر غور کر کے کوئی فیصلہ کرے گی، اور ممکن ہے کہ یہ بہت ہی نازک سوال پیدا ہو کہ فیصلے کو نافذ کیسے کیا جائے۔ لیکن دوسری طرف روسی شمالی ایران کو خالی کر رہے ہیں، ایرانی حکومت کو انھوں نے اپنے اس ارادے کی اطلاع دے دی ہے، اور ساتھ ہی اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایرانی حکومت سے حسب منشا سمجھوتہ ہو جائے، قبل اس کے کہ آخری روسی فوجیں ایران چھوڑیں اور مجلس تحفظ اپنے لئے عمل کی کوئی راہ نکال سکے۔ ایرانیوں کو اب تک گفتگو کرنے میں عذر یہ تھا کہ روسی فوج ایران میں موجود ہے، روسیوں نے ایک عرصے تک ان کی شکایت کا خیال نہیں کیا اور

اب ایرانی اسے مروت نہیں بلکہ مصلحت اور خاص طور پر مصلحت سمجھیں گے کہ روسی فوج ہٹالی گئی ہے۔ مگر ایرانیوں کو معلوم ہو کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستیں کس حد تک ان کی حمایت کریں گی تب بھی ان کے لئے روس کی عداوت سے بچنا ضروری ہوگا اس لئے کہ ایران جیسا کمزور ملک کسی طاقتور پڑوسی کی عداوت برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ایرانیوں کو بہرحال معلوم ہے کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستیں تیل کے متعلق ان سے کوئی معاملہ کرنا چاہتی ہیں، اور انھیں یہ معاملہ کرنا ہی ہوگا۔

انڈونیشیا میں ڈچ، برطانوی اور قومی نمائندوں کے درمیان گفتگو جاری ہے لیکن یہ صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ بحث کن مسائل پر ہو رہی ہے۔ برطانیہ نے انڈونیشیا میں جو رویہ اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ڈچ حکومت کو فوجیں تیار کر کے جاوا اور اس کے پاس دو ایک جزیروں میں بھیجنے کا موقع مل گیا۔ اور قومی لیڈروں نے ڈچ حکومت کی تجویزوں کو منظور نہ کیا تو پھر یہ فوجیں ہالینڈ کا تسلط قایم کرنے کی کوشش کریں گی۔ شروع میں قومی تحریک پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے جاپانیوں سے مدد حاصل کی ہے، پھر وہ اس الزام سے بری کر دی گئی ہے۔ اب یہ خبریں پھر آنے لگی ہیں کہ قریب بیس ہزار جاپانی سپاہی جنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں وسط جاوا کے جنگلوں میں چھپے ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انڈونیشیا کے قوم پرستوں کا ساتھ دے رہے ہیں، اور قوم پرستوں سے لڑنا اتنا ہی ضروری اور ثواب کا کام ہے جتنا کہ جاپانیوں کے خلاف لڑنا۔ جاوا میں کہیں نہ کہیں قوم پرستوں کی برطانوی یا ڈچ فوج سے جھڑپ ہوتی رہتی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈچ حکومت جاوا میں آہستہ آہستہ اپنے قدم جما رہی ہے۔ حال میں ڈاکٹر سوئیکارنو کے خلاف ایک سازش بھی ہوئی، مگر وہ ناکامیاب رہی اور اس کے علاوہ قوم پرستوں میں اور کسی بڑے اختلاف کی خبر نہیں آئی ہے۔ برطانیہ نے جو کچھ کیا ہے اور ڈچ حکومت جو کچھ کر سکتی ہے اس کے باوجود انڈونیشیا کی قومی تحریک اپنا مقصد حاصل کرے گی، اگر قوم میں اتحاد قایم رہا۔

امریکہ کے ایک مشہور رسالے "لائف" میں ان مناظر کی خیالی تصویریں دی گئی ہیں جو آئندہ جنگ میں دیکھنے میں آئیں گی۔ تصویروں کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ کے نئے آلات اور نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے اور ان کی مشق کی جاتی رہی تو اگلی جنگ میں جو قوم متحدہ ریاستوں پر اچانک حملہ کرے گی

وہ ملک کے تمام بڑے شہروں کو برباد اور آبادی کے تقریباً چوتھے حصے کو ہلاک کر دے گی مگر اس کے
بعد جب مقابلہ شروع ہوگا تو متحدہ ریاستیں دشمن کو کہیں زیادہ نقصان پہنچا کر جنگ میں کامیاب ہو جائیں گی
یہ مضمون بظاہر محض شاعرانہ بلکہ تفریحی معلوم ہوتا ہے مگر اس کی اشاعت میں اور مقاصد بھی ہیں۔ متحدہ
ریاستوں میں بہت سے بااثر لوگ ہیں جو روس اور متحدہ ریاستوں کی جنگ کو صرف ایک امکانی حادثہ
نہیں سمجھتے بلکہ اپنی قوم کو اس کے لئے تیار کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے یہ کہا جا سکتا تھا کہ جب لڑائی ہوگی جب
دیکھا جائے گا۔ اب اس طرح کا اطمینان مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایٹم بم بنانے کا طریقہ ابھی متحدہ ریاستوں
کے باہر کسی کو معلوم نہیں ہے اور اس بنا پر امید کی جا سکتی ہے کہ کسی قوم کو متحدہ ریاستوں کے خلاف
لڑنے کی ہمت نہ ہوگی لیکن اسی وجہ سے روسیوں کو یقین ہو گیا ہے کہ ایٹم بم انھیں دھمکانے اور
قابو میں رکھنے کا ایک ذریعہ بنایا گیا ہے، اور انھیں متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی دوستی پر اعتبار نہیں
رہا ہے۔ عام طور پر ہر حکومت کا ایک خفیہ اطلاعات کا محکمہ ہوتا ہے جو دوسرے ملکوں کی ان تمام کارروائیوں
کا پتہ چلاتا ہے جنھیں صیغۂ راز میں رکھنا سیاست یا جنگ میں مفید ہوتا ہے۔ روسیوں کو ایٹم بم بنانے کا
طریقہ نہیں بتایا گیا تو انھوں نے جاسوسوں کے ذریعے اسے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے
میں کینیڈا کی پولیس نے کئی آدمیوں کو گرفتار کیا ہے جنھوں نے راز کی باتیں روسی حکومت کو بتلائیں،
اور اس کی وجہ سے روسیوں کی بڑی بدنامی ہوئی، اگرچہ روسیوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو دوسرے
نہیں کرتے ہیں۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں میں روس کے مداح اب بھی بہت ہیں اور جرمنی کو شکست
دینے میں روسیوں نے جو مدد کی اس کا احسان بھی مانا جاتا ہے۔ لیکن اب دل صاف نہیں رہے ہیں
اور بدگمانی اسی رفتار سے بڑھتی رہی جیسے کہ پچھلے چند مہینوں میں تو روس کا لحاظ کرنے کا جو رہا سہا
میلان ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔

امتحان کے بعد

زندگی میں کوئی ہلچل نہیں باقی اے دوست!
جیسے رُک جائے سمندر کوئی طوفان کے بعد

ہر قدم پر تھی تمناؤں کی دُنیا آباد
جو ملے آ کے مچلتے تھے ہمارے دل میں
دوڑ جاری تھی پہنچنے کی خوشی کے ہمراہ
زندگی ولولہ آگیں تھی رہِ منزل میں

اب کوئی جوش نہیں کوئی حرارت ہی نہیں
یہ سکوں ہے کہ مری زیست کی بے کیفی ہے
لطف جو جد و جہد میں تھا کہاں ہے باقی؟
راحتیں کیا ملیں بے جان مری ہستی ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

بادشاہ

اٹلی کے مشہور سیاسی مفکر نکولو میکیاولی کی شہرۂ آفاق تصنیف پرنس کا اردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں ایم۔ اے پی، ایچ، ڈی میکیاولی نے سیاسی اخلاق کا ایک نیا مجموعہ تیار کیا تھا جس کی بنیاد سیاسی مصلحت پر رکھی تھی۔ میکیاولی نے اس نئے اخلاق کے اصولوں کو ایک مستقل نظام میں منسلک کرنے کی کوشش کی، جہاں ریاست کی زندگی اور موت کا سوال ہو، اور عام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھنے سے کام نکل سکتا ہو تو اس کے خیال میں اسے اختیار کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہی ایک اصول ہے جس کی پابندی فرض ہے۔

قیمت ۱۲؎

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

(ان پڑھ بالغوں کے لئے)

۱۔ قاعدہ

۲۔ درس سبق

۱۔ نماز
۲۔ حکایتیں اول
۳۔ ″ دوم
۴۔ حبیب خدا
۵۔ نظمیں
۶۔ میونسپلٹی
۷۔ صدیق اکبر
۸۔ خط کتابت
۹۔ ضلع کا انتظام
۱۰۔ قومی گیت
۱۱۔ غزلیں
۱۲۔ ہمارا ہندوستان
۱۳۔ اماں بھی پڑھنے لگیں
۱۴۔ عمر فاروق
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ
۱۶۔ شہید کربلا
۱۷۔ ہماری دنیا
۱۸۔ ایشیا
۱۹۔ یورپ
۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب
۲۱۔ مثنوی میر حسن
۲۲۔ گل بکاؤلی
۲۳۔ چہار در[illegible]
۲۴۔ [illegible]
۲۵۔ [illegible]

۲۶۔ چہار درویش چہارم
۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول
۲۸۔ ″ ″ دوم
۲۹۔ ″ ″ سوم
۳۰۔ ″ منصور موہنا
۳۱۔ ″ فردوس بریں
۳۲۔ ″ لیلیٰ مجنوں
۳۳۔ شکنتلا
۳۴۔ تانگے والا
۳۵۔ بہشتی
۳۶۔ صوبے کی حکومت
۳۷۔ حکومت ہند
۳۸۔ جمہوریت
۳۹۔ دوہے
۴۰۔ دلچسپ شعر
۴۱۔ مرثیے
۴۲۔ مسدس حالی
۴۳۔ حالی کی نظمیں
۴۴۔ گنتی
۴۵۔ بڑی گنتی
۴۶۔ پہاڑے پیلنے
۴۷۔ اجرت کا حساب
۴۸۔ تنخواہ کا حساب
۴۹۔ چاند تلک
۵۰۔ نزلہ زکام

۵۱۔ حالات قرآن مجید
۵۲۔ تعلیمات (عقائد)
۵۳۔ ″ (عبادات)
۵۴۔ ″ (اخلاق)
۵۵۔ ″ (معاملات)
۵۶۔ قصص قرآن مجید ۱
۵۷۔ ″ ″ ۲
۵۸۔ کعبہ شریف
۵۹۔ حدیث شریف
۶۰۔ عثمان غنی
۶۱۔ علی مرتضیٰ
۶۲۔ صحابہ کرام ۱
۶۳۔ ″ ″ ۲
۶۴۔ ″ ″ ۳
۶۵۔ ″ ″ ۴
۶۶۔ ″ ″ ۵
۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز
۶۸۔ حضرت غوث پاک
۶۹۔ اجمیری خواجہ
۷۰۔ نظام الدین اولیاء
۷۱۔ گوتم بدھ
۷۲۔ کرشن کنہیا
۷۳۔ رام کہانی ۱
۷۴۔ ″ ″ ۲
۷۵۔ افریقہ

۷۶۔ امریکہ
۷۷۔ جنوبی امریکہ
۷۸۔ سرزمین ہند
۷۹۔ صوبے
۸۰۔ دیسی ریاستیں
۸۱۔ داستان امیر حمزہ ۱
۸۲۔ ″ ″ ۲
۸۳۔ ″ ″ ۳
۸۴۔ ″ ″ ۴
۸۵۔ ″ ″ ۵
۸۶۔ کہاوتیں
۸۷۔ پہیلیاں
۸۸۔ گرو نانک
۸۹۔ مثنوی میر حسن
۹۰۔ گلستاں
۹۱۔ احمد خاں دکاندار
۹۲۔ عبدالرحمٰن ملاح
۹۳۔ نصیب خاں حجام
۹۴۔ ختا خدمتگار
۹۵۔ پیارے خاں درزی
۹۶۔ حفیظ خانساماں
۹۷۔ بین بڑھئی
۹۸۔ محمد حلوائی
۹۹۔ میر انتھا
۱۰۰۔ ہندوستان ہزار برس پہلے

مکتبہ جامعہ دہلی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴۱ نمبر ۸	بابت ماہ مئی ۱۹۴۶ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ /

فہرست مضامین

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) جامعہ پریس دہلی

پندرھویں صدی کا ایک بدنام سیاسی مفکر

نکولو میکیاویلی اب سے کوئی پانچ سو برس پہلے ۳ مئی ۱۴۶۹ء کو اطالیہ کے مشہور شہر فلورنس میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام برنارڈو دی نکولو میکیاویلی تھا۔ باپ خاصا کامیاب وکیل تھا بہت دولت مند نہ سہی عالی خاندان تھا۔ نکولو کی ماں بھی شریف گھرانے سے تھی۔ نکولو اپنے ماں باپ کا منجھلا بیٹا تھا۔

میکیاویلی کے بچپن کے بارے میں معلومات بہت محدود ہیں مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ ریاست فلورنس کا وہ عروج کا زمانہ تھا لورنزو برسر اقتدار تھا۔ اس کی حکومت کے زمانے میں فلورنس کی شہرت کو چار چاند لگے میکیاولی نے تاریخ فلورنس میں ان نوجوانوں کا نقشہ کچھ اچھے الفاظ میں نہیں کھینچا ہے جو عالم نوجوانی میں اس کے ہم مشرب اور لنگوٹیا یار تھے۔

میکیاویلی کی عملی زندگی خاندان میڈیچی کی حکومت کے خاتمہ کے بعد شروع ہوتی ہے ۱۴۹۴ء میں میڈیچی حکومت ختم ہوئی اور فلورنس میں جمہوری نظام قائم ہوا۔ یہ جمہوری دور ۱۵۱۲ء تک جاری رہا۔ ۱۴۹۸ء میں پہلی دفعہ میکیاولی کو سرکاری ملازمت ملی۔ کچھ دنوں وہ صیغہ عدالت میں محرر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا رہا۔ پھر ۱۴۹۸ء میں مجلس دوسری (جس کے ذمہ خارجی سیاست تھی) اس کا معتمد مقرر ہوا۔ یہ ایک اہم عہدہ تھا اور معتمد کی حیثیت سے کئی حکومتوں کے ساتھ گفت و شنید کے لئے بھیجا گیا۔ اس طرح بیرونی ممالک کی سیاست کے مطالعہ کا بھی اسے موقع ملا اور دوسری اطالوی ریاستوں کے حالات کو دیکھنے بھالنے کا بھی۔

۱۵۰۰ء میں اس نے فرانس کا سفر اختیار کیا۔ لوئی دوازدہم سے پیسا کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا صلہ حاصل کرنا مقصود تھا۔ اس بادشاہ کا ذکر میکیاویلی کی کتاب "بادشاہ" میں کئی جگہ آیا ہے۔ ۱۵۰۲ء میں میکیاویلی سیزر بورژیا کے پاس بھیجا گیا۔ میکیاویلی کی سیاسی زندگی میں پاپائے سکندر اور اس کے بیٹے سیزر بورژیا کو ایک طرح کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۵۰۲ء میں جب میکیاویلی اس کے پاس سفارت لے کر گیا ہے، اس وقت وہ فرانسیسی اور پاپائی فوجوں کی مدد سے رومانا اور سرحدی علاقوں کو اپنے ماتحت لا کر متحد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے جسے میکیاویلی کا چشم دید واقعہ کہنا بے جا نہ ہوگا، کہ جب کرائے کی فوجوں کے چار سردار بورژیا کا ساتھ چھوڑ گئے تو بورژیا نے جھوٹے سچے وعدے کر کے انھیں اپنے پاس بلایا اور جب وہ اس کے چنگل میں آ گئے تو انھیں ہڑپ کر گیا۔ بہرحال میکیاویلی پر بورژیا کی شخصیت کا گہرا اثر ہوا اور "بادشاہ" میں اس نے غالباً بورژیا ہی کو نمونہ کے طور پر سامنے رکھا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میکیاویلی اس کے ہر فعل کو سراہتا ہے یا اس کی ہر ادا کا دلدادہ ہے۔ "بادشاہ" میں بورژیا کو اس شخص کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جس کا عروج اور زوال دوسروں کے عروج و زوال سے وابستہ ہو، جس کا ہر فعل عاقلوں اور داناؤں جیسا ہو اور پھر بھی وہی ایک راستہ اختیار نہ کر سکے جس میں اس کی نجات پنہاں ہو، جو ہر امکانی خطرہ کا پہلے سے کاٹ کر سکے سوائے اس خطرہ کے جو پیش آنیوالا ہو، اور جب اس کی ساری قابلیت کے باوجود اس کا بیڑا پار نہ ہو پائے تو وہ یوں پکار اٹھے کہ اس کی ناکامی میں اس کی اپنی ذمہ داری کوئی نہیں کسی ناگہانی آفت کو دخل ہے۔

جب ۱۵۰۳ء میں پائس سوم کا انتقال ہوا تو میکیاویلی کو روما اس غرض سے بھیجا گیا کہ پوپ کے انتخاب کے موقع پر ہوا کا رخ دیکھے۔ یہاں پر اس نے بورژیا کو زبردست دھوکا کھاتے دیکھا۔ جولیس دوم کا پوپ کی حیثیت سے منتخب ہونا بورژیا کے لئے بہت ہی برا تھا۔ بورژیا کا یہ خیال کہ نئی مہربانیاں پرانی جفاؤں کو بھلا دیتی ہیں سراسر غلط تھا۔ جولیس نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک سیزر بورژیا کو تباہ نہ کر ڈالا۔

پھر ۱۵۰۶ء میں میکیاویلی جولیس دوم کے پاس فلورنس کی حکومت کا نامہ و پیام لے کر گیا۔ میکیاویلی پہنچا ہے تو جولیس نے بولونا پر دھاوا بولا ہی تھا جس میں اسے پوری کامیابی ہوئی! اسی اور بھی بہت سی مہموں میں اسے فتح نصیب ہوئی۔ جولیس کی کامیابی کا راز اس کی تیزی و تندی اور اس کی پُرجوش طبیعت تھی۔ چنانچہ جہاں میکیاویلی قسمت اور عورت میں مناسبت بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ شجاع انسان نہ کہ ڈرپوک لوگ ان دونوں کو قابو میں لا سکتے ہیں، وہاں میکیاویلی دراصل جولیس دوم کی زندگی سے اخلاقی نتیجہ اخذ کر رہا ہے۔

اسی طرح میکیاویلی نے اور بھی کئی سفر کئے جن میں جرمنی کا سفر شامل ہے۔ ان سفارتوں سے میکیاویلی نے بہت کچھ سیکھا اور بعد میں اپنی تصانیف میں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جس وقت تک جمہوری حکومت قائم رہی میکیاویلی کو فلورنس کی سیاست میں خاصی اہمیت حاصل رہی۔ میکیاویلی کی ملازمت کا سلسلہ ۱۵۱۲ء تک جاری رہا۔ ۱۵۱۲ء میں جمہوریت کا خاتمہ ہوا اور ہسپانیوں کی مدد سے میڈیچی پھر فلورنس کے مالک بنے۔ میڈیچی آئے، تو نہ صرف میکیاویلی کی ملازمت گئی۔ اسے چند ہفتے تک قید بھی بھگتنی پڑی۔ رہائی ہوئی تو میکیاویلی نے عملی سیاست کو خیرباد کہا۔

میکیاویلی اکثر اس مسئلہ پر غور کیا کرتا تھا کہ انسانی معاملات میں خود انسان کا کیا ہاتھ ہے، اور قسمت کو کتنا دخل ہے۔ یہ خیال کہ قسمت ہی پر انسانی ترقی اور عروج کا انحصار ہے میکیاویلی کو ذرا نہ بھاتا تھا۔ لیکن اسے یہ بات بھی صاف نظر آتی تھی کہ بڑے سے بڑا سورما دنیا میں ذرا بھی نام پیدا نہیں کر سکتا اگر قسمت اس کا ساتھ نہ دے اور وہ گھڑی نہ آن پہنچے جب کہ وہ اپنے ہنر کو ظاہر کر سکے۔ اس مقالہ کی صحت خود میکیاویلی کی زندگی سے بھی عیاں ہے۔

اگر میڈیچی کی واپسی کے بعد میکیاویلی کو عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار نہ کرنی پڑتی تو دنیا اس کی تصانیف سے محروم رہتی۔ آج کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا۔ میکیاویلی کے لئے یہ گوشہ نشینی کا زمانہ زحمت کے بھیس میں رحمت ثابت ہوا۔ ۱۵۱۳ء میں میکیاویلی نے اپنی مشہور تصنیف بادشاہ تیار کی۔ میکیاویلی کی تصانیف میں بادشاہ بلاشبہ سب سے مشہور اور سب سے اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے

لکھنے سے مکیاویلی کا جو مقصد تھا اسے خود مکیاویلی نے اپنے ایک خط میں جو اس کے دوست فرانسسکو ویتوری کے نام ہے اور ۱۰ دسمبر ۱۵۱۳ء کو لکھا گیا ہے، ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

"ادھر شام ہوئی اور میں گھر واپس آیا اور مطالعہ کے کمرہ میں داخل ہوگیا۔ داخل ہونے سے پہلے میں گرد و غبار سے اٹے ہوئے دیہقانی کپڑے اتار ڈالتا ہوں اور شریفانہ درباری لباس پہن لیتا ہوں۔ جب اس طرح مناسب لباس پہن کر قدیم درباروں میں حاضری دیتا ہوں تو یہاں لوگ مجھ سے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور مجھے وہ غذا نصیب ہوتی ہے جو مجھے بہت مرغوب ہے۔ میں ان سے اپنے دل کی باتیں کہنے سے ذرا نہیں جھجکتا۔ انھوں نے اپنی زندگیوں میں جو کچھ کیا اس کا ان سے سبب دریافت کرتا ہوں۔ اور وہ مجھ پر کچھ ایسے مہربان ہیں کہ مجھے سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ اس طرح چار گھنٹے گذر جاتے ہیں اور تکان ہے کہ مجھے چھو نہیں جاتا۔ اتنی دیر کے لئے میں اپنی ساری مصیبتیں بھول جاتا ہوں، افلاس کا خیال مجھے پریشان نہیں کرتا۔ موت کے خیال سے مجھے ذرا دہشت نہیں ہوتی۔ اتنی دیر بس ان عظیم الشان شخصیتوں کا دھیان میرے ذہن پر پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے۔ دانتے نے کیا خوب کہا ہے: "علم کا انحصار ان معلومات پر ہے جو انسان (اپنے حافظہ میں) محفوظ رکھ سکے۔ باقی فضول ہیں" چنانچہ ان عالی ... اشخاص کے ساتھ مکالمہ سے مجھے جو کچھ حاصل ہوا وہ میں نے سپرد قلم کر ڈالا ہے اور اس ... پر ایک تصنیف تیار کی ہے۔ اس کتاب میں میں نے موضوع کے ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ ریاست کیا ہے، اس کی کتنی اقسام ہیں، وہ کس طرح حاصل کی جاتی ہے اور کس طرح برقرار رکھی جا سکتی ہے، وہ کیونکر ضایع ہوتی ہے اور اگر اس سے پہلے کبھی بھی تم نے میرے خیالات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہوگا تو یقین ہے کہ یہ کتاب تمھیں ناپسند نہ آئے گی۔ ... بادشاہ، خاصکر نئے بادشاہ تو انھیں تو اس کتاب کا خیر مقدم کرنا چاہئے یہی وجہ ہے کہ میں اسے ژیولیانو کے نام سے معنون کر رہا ہوں .... اس مختصر سی کتاب کے پڑھنے

۱؎ واضح ہو کہ کیاویلی شروع میں اپنی کتاب کا نام PRINCIPALITIES رکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں PRINCE رکھا۔ اسی طرح انتساب بھی بدلا۔

تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ پندرہ برس جو میں نے آئین جہان بانی کے مطالعہ میں صرف کئے وہ رائیگاں گئے۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا (بادشاہوں کے) خدام وہی بھلے جنھوں نے دوسروں سے سبق حاصل کیا ہو۔ رہی میری وفاداری تو اس میں شبہ کی گنجائش نہیں جس شخص نے وفا کی ہو وہ کیونکر دغا دے سکتا ہے۔ میری طرح وفادار اور ایماندار شخص بھلا اپنی فطرت بدل سکتا ہے اور میرا افلاس میری ایمانداری کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔"

کتاب مکمل ہونے سے پہلے اس میں بہت کچھ ردّ و بدل ہوتا رہا جس زمانہ میں کتاب زیر تصنیف تھی اس وقت مختلف اثرات کار فرما تھے۔ چنانچہ اس کا نام بدلا، انتساب میں تبدیلی ہوئی اور آخر میں لورنزو دی میدیچی کے نام معنون ہوئی کتاب منسوب تو کر دی گئی مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ لورنزو کی خدمت میں باقاعدہ طور پر پیش کی گئی یا نہیں اور اس کی نظر سے گذری بھی کہ نہیں، یقینی بات اتنی ہے کہ مکیاویلی کو اس کا کچھ صلہ نہ ملا۔ سرکاری ملازمت پر مکیاویلی جان دیتا تھا، مگر وہ ملنی تھی نہ ملی۔ کتاب مکیاویلی کی زندگی میں شایع بھی نہ ہو پائی گو لوگوں کو اس کا علم ضرور تھا اور مکیاویلی کی زندگی میں اس سے سرقہ بھی کیا گیا۔ اس کی اصل عبارت کے متعلق آج تک اختلاف کا سلسلہ جاری ہے۔ کتاب پہلی مرتبہ ۱۵۳۲ء میں مکیاویلی کی موت کے پانچ برس بعد شایع ہوئی۔

مکیاویلی کی اور بھی تصانیف ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر اس کے "مقالات" DISCOURSES ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ "بادشاہ" کے ساتھ ضروری ہے۔ مکیاویلی کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں جو "بادشاہ" کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہیں وہ "مقالات" کے مطالعہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ یہ کتاب ۱۵۲۱ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے ذریعہ مکیاویلی نے جمہوریتوں کی وہی خدمت انجام دینی چاہی ہو جو "بادشاہ" کے ذریعہ بادشاہوں کی کتاب کیا ہے جمہوریتوں کے لئے نصائح کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے اس میں خاص طور پر قدیم روما کے عروج اور ترقی کے اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

۱۵۲۰ء میں مکیاویلی نے "فن جنگ" پر ایک رسالہ لکھا۔ اس رسالہ میں ایسی کوئی خاص

معلومات نہیں ہیں جو "بادشاہ" میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔

"تاریخ فلورنس" بھی مکیاویلی کی تصانیف میں خاصی اہم ہے۔ یہ سنہ ۱۵۲۵ء میں مکمل ہوئی اس کا جو حصہ پندرھویں صدی کی تاریخ سے متعلق ہے وہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ مکیاویلی نے ایک رسالہ فرانس اور جرمنی کی سفارت سے متعلق بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ناول لکھے ہیں۔ مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں اور نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

یہ تمام تصانیف اس زمانہ میں تیار ہوئیں جب میڈیچی فلورنس کے دوبارہ مالک ہو چکے تھے اور مکیاویلی راندہ درگاہ تھا۔ میڈیچی حکومت کا سلسلہ سنہ ۱۵۱۲ء سے لے کر تقریباً پندرہ سال تک قایم رہا۔ سنہ ۱۵۲۷ء میں وہ دوبارہ فلورنس سے نکالے گئے۔ اس زمانے میں مکیاویلی بطور مصنف اور سیاسی مفکر کے غیر معمولی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اور اگر اس کی عمر وفا کرتی تو شاید میڈیچی کے زوال کے بعد اس کے دن پھرتے۔ گو یقینی نہیں مگر بہت ممکن تھا کہ وہ پھر مجلس دوسری کا معتمد مقرر ہو جاتا یا کسی اور اہم عہدہ پر فائز ہو جاتا اور اس کی دلی مراد بر آتی۔ مگر میڈیچی کو رخصت ہوئے چند ہفتے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ مکیاویلی اس دنیا سے سدھار گیا (۲۲ رجون سنہ ۱۵۲۷ء) موت کے وقت مکیاویلی کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔ دوبارہ سیاست میں قدم رکھنے کی جو آرزو تھی وہ دل کی دل ہی میں رہی۔

مکیاویلی "بادشاہ" کے مصنف کی حیثیت سے صدیوں سے مورد لعن وطعن اور آماجگاہ دشنام رہا ہے۔ یہاں تک کہ یورپی زبانوں میں لفظ "مکیاویلیت" شیطنت کا مرادف سمجھا جانے لگا کسی کو مکیاویلی یا اس کا پیرو کہنا گویا اسے گالی دینا ہے۔ خود مکیاویلی کی زندگی میں اس پر لے دے شروع ہو گئی تھی اور اس کی موت کے بعد "بادشاہ" کے متعدد جواب لکھے گئے۔ شاہ پروشیہ فریڈرک اعظم نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں "رد مکیاویلی" ANTI MACHIAVELLI کے نام سے "بادشاہ" کا جو جواب لکھا وہ خاص طور پر مشہور ہوا، گو اپنی حکومت کے زمانے میں خود اس کا طرز عمل ایسا تھا کہ اسے مکیاویلی کا صحیح معنوں میں شاگرد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مثلاً اگر فریڈرک کو

مکیاویلی کا زمانہ ملا ہوتا تو یقین ہے کہ اطالیہ کے ایک معمولی سے فرماں رما کی بجائے وہ فریڈرک اعظم
کو اپنے سامنے بطور نمونہ کے رکھتا! بہرحال مکیاویلی پر یہ لے دے آج تک جاری ہے۔ چنانچہ
اسلامی ہند کے سب سے بڑے شاعر نے بھی اسی انداز میں کچھ کہا ہے:-

آں فلارنساوی باطل پرست　　　سرمہ او دیدہ مردم شکست
فطرت او سوئے ظلمت برد رخت　　　در گل ما دانہ پیکار کشت!
مملکت را دین او معبود ساخت　　　فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد　　　نقد حق را بر عیار سود زد
باطل از تعلیم او بالیدہ است　　　حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

لیکن انیسویں صدی آئی تو مکیاویلی کو خاص طور پر اطالیہ میں ایک نئے نقطۂ نظر سے
دیکھا جانے لگا۔ اطالیہ میں اتحاد اور آزادی کی تحریک اٹھی تو اس کے ابتدائی علمبرداروں میں
مکیاویلی کا نام بھی شمار ہونا شروع ہوا اور مکیاویلی قومی ہیرو کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اس زمانہ
میں جرمنی میں جو اطالیہ کی طرح ایک خاص سیاسی دور سے گذر رہا تھا مکیاویلی کے مداح پیدا
ہو گئے۔ اور اس طرح اس کی تعلیمات کی جواب تک ذلیل و خوار سمجھی جاتی تھیں نئی نئی تعبیریں ہونے
لگیں ؎ شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔

مکیاویلی دنیا کے لئے ایک معما سا بن کر رہ گیا۔ گذشتہ سو سوا سو سال میں مکیاویلی اور
خاص طور پر اس کی کتاب "بادشاہ" پر لوگوں نے جو اظہار رائے کیا ہے اسے اگر مجموعۂ اضداد
کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کسی نے مکیاویلی کو شیطنت کا مجسمہ سمجھا اور کسی نے ایک زبردست
محب وطن۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی کتاب دنیا پر شاہی جبروت و ستم کو برقرار رکھنے کا ایک
آلہ ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ نہیں یہ تو مکیاویلی کی محض ستم ظریفی ہے جو اس نے گفتگو کا یہ انداز
اختیار کیا ہے۔ اس کا مقصد تو جابر بادشاہوں پر ایک خطرناک طنز ہے! وہ دراصل بادشاہوں
کے خلاف قوم کو ابھارنا چاہتا ہے! کوئی مکیاویلی کو جدید فلسفۂ سیاست کا پہلا امام گردانتا ہے

جس نے مذہب کو سیاست سے جدا کر کے علم سیاسیات کی روش ہی بدل دی اور کوئی اس کی تعلیمات کو سرے سے نکمّی نہایت مضرت رساں اور شرارت پر مبنی قرار دیتا ہے۔ ایک اس کی شرافت کا قائل ہے اور اس کی نجی اور سیاسی زندگی کا مداح اور ایک اس کا دل کھوٹا اس کا دماغ ٹیڑھا اور اس کی روح خبیث بتلاتا ہے اور ثبوت کے طور پر کہتا ہے کہ ایسا نہ ہوتا تو وہ سیزر بورژیا کو جس کے ہاتھ ایسی بری طرح خون آلودہ تھے کیونکر اپنے سامنے نمونہ کے طور پر رکھتا۔

مکیاویلی کے بارے میں اتنا شدید اختلاف رائے بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مکیاویلی کی شخصیت واقعی بڑی پیچیدہ شخصیت ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس کا زمانہ خود بڑا پیچیدہ زمانہ ہے۔ یہ زمانہ بڑی مشکلات، اختلافات اور تضادات کا زمانہ ہے۔ یوں یہ سمجھ میں آنے کی بات نہیں کہ جو مصنف ایک صفحہ پر آزادی اور حبِ وطن کے گیت الاپتا ہے۔ وہ دوسرے صفحے پر دغا اور فریب کی کیونکر تعلیم دے سکتا ہے جس شخص کا مقصد اطالیہ کو متحد کرنا ہو وہ کیونکر قتل و غارتگری کو سراہ سکتا ہے جس کے مقاصد ایسے اعلیٰ ہوں وہ ایسے ادنیٰ ذرائع کو کام میں لانے کی کیونکر تلقین کر سکتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا اگر ان حالات سے بخوبی واقفیت ہو جن میں مکیاویلی کی زندگی گزری۔ مکیاویلی اپنے زمانے کا صحیح نمائندہ ہے۔ اس کی تعلیمات کو پندرھویں اور سولھویں صدی کی اطالوی تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس زمانے کی تاریخ کو سمجھے بغیر مکیاویلی کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس مختصر سے مقدمہ میں اس کی گنجائش نہیں کہ تاریخی حالات مفصل لکھے جائیں، تاریخ کے دو تین پہلوؤں کی طرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سلطنت روما کے زوال کے بعد اطالیہ میں واحد قومیت کی روح بالکل فنا ہو چکی تھی بار بار سارے ملک میں ایک حکومت قایم کرنے کی کوششیں ضرور ہوئیں مگر یہ سب ناکام رہیں۔ پندرھویں صدی کا آخری اور سولھویں صدی کا ابتدائی حصہ وہ زمانہ ہے جبکہ متعدد ریاستوں

میں منقسم تھا جن میں پانچ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میلان۔ وینس۔ فلورنس۔ ریاستہائے پاپائی اور نیپلس۔ ان ریاستوں میں آپس میں غضب کی چشمک رہتی تھی اس صورت میں آزادی کیونکر برقرار رہ سکتی تھی۔ ان پانچوں میں سے ایک بھی ریاست اس قابل نہ تھی کہ دوسروں کو نیچا دکھا کر ملک کو ایک جھنڈے تلے جمع کر سکتی۔ پھر آپس میں رقابت اس بلا کی تھی کہ وفاقی یا اس قسم کا کوئی دوسرا دستور اختیار کرنے کا کسی کو خیال بھی نہ آسکتا تھا غرض قومی مفاد خطرہ میں تھا۔ اور ان پانچ ریاستوں کے سوا جو بے گنتی چھوٹی موٹی ریاستیں تھیں وہ ہمیشہ سازشوں میں مبتلا رہتی تھیں کبھی ایک ریاست کے ساتھ ساز باز کبھی دوسری کے ساتھ۔ دھوکے اور دغا پر بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد تھی۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بیرونی بادشاہ اطالیہ کو قسمت آزمائی کے لئے ایسی آسانی سے منتخب کر لیتے تھے۔ اطالیہ دوسری اقوام کے حملوں کا شکار بنا ہوا تھا۔ اپنی مدافعت ان ریاستوں کے لئے کیسے ممکن تھی بس لئے تقریباً تمام اطالوی ریاستوں نے اپنی حفاظت کرائے کے سپاہیوں کے سپرد کر رکھی تھی۔ پھر کیوں نہ ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن اور سوئسستانی فوجیں ملک کو تاراج کرتیں؟ اطالوی ریاستوں میں سے کسی میں قابل ہوتا نہ تھا کہ فرانس یا ہسپانیہ کی روک تھام کر سکے۔ کرائے کے ٹٹوؤں سے بھی کہیں ملکوں کی مدافعت ہوئی ہے؟ پھر ایسا نفاق، ایسی رنجشیں، ایسی نااتفاقی اس دور میں اطالیہ کا قومی وجود ختم ہو چکا تھا اور اطالیہ محض ایک جغرافیائی اصطلاح بن کر رہ گیا تھا۔ حُبِ وطن کا جذبہ مفقود ہو چکا تھا، اور لوگ نفسی نفسی میں مبتلا تھے۔ مقصد اطالیہ کی عظمت نہیں، کسی طرح اپنی جان بچانا تھا۔

ایسی صورت میں غیروں کی نظریں اطالیہ پر نہ پڑیں یہ کیسے ممکن تھا؟ چارلس ہشتم، شاہ فرانس نے ۱۴۹۴ء میں اطالیہ پر حملہ کیا۔ اس نے اطالوی ریاستوں کے آپس کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ خود میلان کے حاکم نے چارلس کو اطالیہ پر حملہ کرنے اور نیپلس کو نیچا دکھانے کی دعوت دی۔ چارلس نے اطالیہ کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ فلورنس کے حاکم پیرو کو بعد آخر شرائط قبول کرنے پر مجبور کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلورنس کے لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے

پیرو نے وینس کی راہ پکڑی۔ فلورنس میں چارلس خود داخل ہوا اور وہاں سے روما کا رخ کیا۔
پاپائے روما جو اب تک نیپلس کو ہر طرح کی مدد دیتا رہا تھا گھبرایا اور چارلس سے بہت کچھ دے
دلا کر معاملہ کر لیا۔ اب نیپلس کی باری آئی۔ اور جس طرح اب تک چارلس کو کامیابی ہوتی رہی تھی وہ
نیپلس میں بھی ہوئی تب جا کر بعض اطالوی ریاستوں کی آنکھیں کھلیں اور وینس کی "لیگ" قائم ہوئی
جس میں میلان، وینس اور پوپ سب شامل تھے۔ چارلس کی فتوحات کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئیں
اور جب ۱۴۹۵ء میں وہ اطالیہ سے واپس ہوا تو اس کی فتوحات بھی غائب ہو گئیں۔ ۱۴۹۸ء میں
چارلس ہشتم کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس کے انتقال کے بعد بھی اطالیہ پر حملوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا
اس کے جانشین لوئیز دوازدہم نے میلان پر حملہ کا فیصلہ کیا۔ پاپائے روما (الگزانڈر) اور ریاست
وینس نے "لیگ" سے کنارہ کشی اختیار کی اور فرانس کے ساتھی بنے۔ ریاست میلان کیونکر اکیلے
مقابلہ کر سکتی تھی۔ لودو ویچو نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، پر ایک بنائے نہ بنی۔ اور اگست ۱۴۹۹ء
میں فرانسیسی اطالیہ میں داخل ہو گئے۔ اُدھر وینس نے بھی حملہ کر دیا۔ لودوویچو کو راہ فرار اختیار کرنی
پڑی، اور میلان پر فرانسیسیوں اور اہل وینس کا قبضہ ہو گیا۔ مگر کچھ ہی دنوں میں نئے حاکم بہت
ہی غیر ہر دلعزیز ہو گئے اور اس سے فائدہ اٹھا کر لودوویچو نے فرانسیسیوں کو شکست دی
گو آخر میں جیت فرانسیسیوں ہی کی رہی۔ میلان پر قبضہ جمانے کے بعد فرانس اور ہسپانیہ نے
نیپلس کے بارے میں آپس میں سمجھوتہ کر لیا اور یہ دونوں حکومتیں نیپلس سے ۱۵۰۲ء میں برسر پیکار
ہوئیں اور ۱۵۰۳ء کے صلحنامہ کی رو سے نیپلس، ہسپانیہ اور فرانس میں تقسیم ہو گیا۔ مگر یہ صلحنامہ جس
روشنائی سے لکھا گیا تھا وہ ابھی سوکھی بھی نہ پائی تھی کہ ہسپانیہ و فرانس میں پھر جنگ چھڑ گئی اور فرانس کو نیچا
دیکھنا پڑا۔ مگر فرانس کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ اب بھی نہ ہوا۔ پوپ الگزانڈر ششم اور اس کے
بیٹے سیزر بورژیا اپنے جی میں روما پر قبضہ جمانے کی ٹھان چکے تھے اور اس سلسلے میں فرانس کو
اطالوی معاملات میں برابر دخل اندازی کا موقع ملتا رہا۔ اُدھر وینس کی بڑھتی ہوئی طاقت دوسری
اطالوی حکومتوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ شاہ فرانس، شہنشاہ ماکسی میلین، پاپائے روما

اور بعض دوسری چھوٹی چھوٹی اطالوی ریاستیں آپس میں مل گئیں اور وینس پر دھاوا بول دیا غرض اطالیہ پندرھویں صدی کے اخیر اور سولھویں کے شروع میں بری طرح آپس کی خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت کا شکار تھا۔ اس افراتفری کا مکیاویلی پر ایک خاص اثر ہوا۔

ان حالات پر غور کرنے سے مکیاویلی اس نتیجے پر پہنچا کہ اطالیہ کی نجات اسی میں پوشیدہ ہے کہ ملک کو ایک بڑی ریاست میں متحد کیا جائے اور ایک قومی فوج تیار کی جائے جس میں غیر ملکیوں کو اطالیہ سے نکال باہر کرنے کی صلاحیت ہو۔ اگر ایک طرف "بادشاہ" کو لورنزو کے نام منسوب کرنے سے مکیاویلی کا یہ مقصد تھا کہ میدیچی کو اپنی طرف مائل کرے اور ان کی ہمدردی حاصل کرے تو دوسری طرف وہ لورنزو کے سامنے ایک ایسا پروگرام بھی پیش کرنا چاہتا تھا جس کی مدد سے ملک کو بیرونی حکومت اور اندرونی کشمکش سے نجات دلائی جاسکے۔ اس مقصد کے نیک اور اعلیٰ ہونے میں کسی قسم کی گنجائش نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مکیاویلی اس کے حصول کے لئے ایسے رکیک اور ادنیٰ ذرائع کیوں تجویز کرتا ہے۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شخص کا مقصد خدمت قوم و وطن ہو وہ کیونکر چالبازی، دغا اور فریب کو اس کے حصول کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ مگر یہ گتھی بھی مکیاویلی کے زمانے کے سیاسی اخلاق پر نظر دوڑانے سے کھل جاتی ہے۔

مکیاویلی کے زمانے کی معاشرتی حالت کو دیکھنے سے خاص طور پر دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک یہ کہ قوم پر آزادی کے لوٹے جانے اور آپس کی نااتفاقیوں کا بہت ہی برا اثر پڑا تھا۔ دوسرے تعیش اور مذہبی زوال نے اخلاق کو بگاڑ دیا تھا۔ عہد وسطیٰ ختم ہوا تو اس دور کے تمام اداروں اور روش زندگی کو سخت دھکا لگا۔ پرانا گھر گر چکا تھا۔ نئے کی تعمیر ابھی نہیں ہونے پائی تھی۔ دورِ جدید کے شروع میں خاص طور پر اطالیہ میں اخلاق کے مسلمہ اصولوں کی بجائے وجدان کو لوگوں نے اپنا رہنما بنایا تھا۔ پھر بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اطالیہ میں بداخلاقی کا دور دورہ تھا اور ہر شخص اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ادنیٰ طبقوں میں نجی زندگی اب بھی بہت سے پرانے اخلاقی اصولوں کی پابند تھی۔ اعلیٰ طبقوں کی اور بات تھی۔ اور جن کا سیاست سے کچھ بھی تعلق تھا ان کے متعلق تو کچھ کہنا ہی فضول ہے نتیجہ

یہ تھا کہ اطالوی سیاسیین پر دوسرے ممالک میں ذرا اعتبار نہ کیا جاتا تھا مگر اطالوی تاجروں اور بیوپاریوں کی ساکھ میں اب بھی ذرا فرق نہ آیا تھا۔ پھر اس تضاد کے علاوہ جو مختلف طبقوں کی زندگیوں میں پایا جاتا تھا خود اعلیٰ طبقے کی زندگی میں تضاد موجود تھا۔ نجی زندگی اور باہمی تعلقات اب بھی کسی حد تک مسیحی اخلاقیات کے زیر اثر تھے مگر سیاسی زندگی میں ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا فلورنس میں جہاں سیاسی اختلافات حد سے بڑھ چکے تھے آپس کے تعلقات بدگمانی، حسد اور نفرت جیسے جذبات کے زیر تحت تھے۔ ایمانداری، وفا اور بھلمنساہت کا اس زمانے کی سیاست میں کام نہ تھا۔ حاکم یا تو اخلاق کے اصولوں کو عزیز رکھ سکتے تھے یا ریاست کو۔ میلان اور نیپلس میں جہاں سیاسی آزادی نام کو باقی نہ رہی تھی مظلوموں کے پاس بس وہی ہتھیار تھے جو غاصب اور ظالم حکام یا فرماں رواؤں سے انہوں نے حاصل کئے تھے یعنی سازش اور خفیہ قتل چھوٹی ریاستوں میں حالات اور بھی ناگفتہ بہ تھے۔ اس صورت میں طاقت حاصل کرنا بجائے خود ایک مقصد ہو گیا تھا۔ ذرائع میں اچھے برے کی تمیز اٹھ گئی تھی۔ سیاست میں ریاست کو بچانے کی خاطر اخلاق کو اکثر بالائے طاق رکھا جاتا تھا۔

مختصر طور پر یہ تھا وہ سیاسی، اخلاقی اور ذہنی ماحول جس کا عکس ہم مکیاویلی کے خیالات میں پاتے ہیں۔ مگر ان خیالات کا اصل سبب دریافت کرنا ایک چیز ہے اور انھیں صحیح تسلیم کرنا اور بات ہے۔

مکیاویلی کی تعلیمات انسانی فطرت کے بہت ہی پست تصور پر مبنی ہیں۔ انسان شاید ایک حد تک ایسا ہی ہے جیسا کہ مکیاویلی کو وہ نظر آتا ہے: ناشکرگذار، دھوکہ باز، ڈرپوک اور حریص مگر مکیاویلی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ سب انسان ایسے نہیں۔ پھر مکیاویلی کو یہ نہ بھولنا چاہئے تھا کہ جو انسان اس کی عام تعریف پر پورے بھی اترتے ہیں ان سے بھی کبھی کبھی شرافت اور سخاوت کے اوصاف ظاہر ہوتے ہیں۔

مکیاویلی کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ گو اس نے یہ تو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اخلاقیات

کے اصولوں کی سیاسی زندگی میں کوئی جگہ نہیں مگر اس نے یہ نہ بتلایا کہ جس سیاست کی بنیاد دغا اور فریب پر ہوگی وہ کبھی پھلنے پھولنے والی نہیں۔ ایسی سیاست کی بنیادیں بالکل کھوکلی ہوں گی، جھوٹ اور دغا سے صرف اس وقت تک سیاست میں کام لیا جاسکتا ہے جب تک وہ پردہ راز میں ہیا راز کھلا اور کام خراب ہوا۔

گڑ کی بات یہ ہے کہ اگر کیاویلی صرف یہ کہتا کہ سیاست میں چال بازی دغا اور فریب سب سے کام لیا جاتا ہے تو کسی کو اس سے پرخاش نہ ہوتی۔ دنیا میں یہ ہوتا ہی چلا آیا ہے اور شاید ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ اس نے کہہ دیا کہ سیاست میں ان ہتھیاروں سے کام لینا چاہئے بس یہی زیادتی کی۔

اس طرح کیاویلی نے سیاسی اخلاق کا ایک نیا مجموعہ تیار کیا جس کی بنیاد سیاسی مصلحت پر رکھی۔ انگریزی میں اسے REASON OF STATE کہا جاتا ہے۔ کیاویلی کو اس کا بانی کہنا تو صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ نہ صرف سیاستین کا اس اصول پر ہمیشہ سے عمل رہا تھا بلکہ بڑے مفکروں نے بھی اس کا پہلے ذکر کیا تھا[1]۔ مگر کیاویلی نے اس نئے اخلاق کے اصولوں کو ایک مستقل نظام میں منسلک کرنے کی کوشش کی۔ جہاں ریاست کی زندگی اور موت کا سوال ہو اور عام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھنے سے کام نکل سکتا ہو تو کیاویلی کے خیال میں اسے اختیار کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہی ایک اصول ہے جس کی پابندی فرض ہے۔

———— *(*)* ————

---

[1] اس خیال کی تاریخ فریڈرش مائنیکے FRIEDRICH MEINECKE کی غیر معمولی کتاب DIE IDEE DER SRATSRASON میں مفصل درج ہے۔

ضلع سہارنپور کے زمیندار اور کاشتکار

ضلع سہارنپور کے زمیندار

ملک کے دوسرے حصوں کی طرح سہارنپور کی بھی زیادہ تر آبادی کا ذریعہ معاش زمینداری اور کاشتکاری ہے۔ اس لئے سہارنپور کی معاشی حالت کا جائزہ لیتے وقت یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ مسلمانوں کی نمائندگی ان پیشوں میں کس طرح پر ہے اور گذشتہ سالوں میں اس میں کس طرح کی تبدیلیاں ہوئیں ہیں۔ اس تحقیقات کے لئے شائع شدہ اعداد و شمار سرکار کی بندوبست رپورٹوں میں ملتے ہیں۔ سہارنپور میں آخری بندوبست سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا اس لئے مجبوراً اسی کے اعداد پر بھروسہ کرنا پڑا۔

ضلع سہارنپور میں مختلف ذاتوں کے مالکان زمین کا تناسب اور اس میں گذشتہ بندوبست سنہ ۱۸۹۰ء کے مقابلہ میں کمی بیشی

نام ذات	مجموعی رقبہ ایکڑوں میں	تناسب فی صدی	تبدیلی کا تناسب فی صدی
۱۔ مہاجن (ہندو)	۳،۱۷،۴۸۳	۲۷،۲	اضافہ ۱۲،۹
۲۔ گوجر (اس میں ½ مسلمان اور ½ ہندو شامل ہیں)	۲،۰۵،۳۸۷	۱۷،۶	کمی ۱۱،۱
۳۔ راجپوت (" " " ")	۱،۸۹،۱۸۸	۱۶،۲	......
۴۔ شیخ اور شیخ زادے (مسلم)	۵۶،۱۸۴	۴،۸	اضافہ ۳،۴
۵۔ تگا (اس میں مسلمان ہندو دونوں شامل ہیں)	۴۹،۹۳۹	۴،۳	اضافہ ۷،۵

۶۔ پٹھان مغل اور پیرزادہ (مسلم)	۳۹,۵۱۴	۴٫۲	کمی ۱٫۶
۷۔ برہمن (ہندو)	۳۷,۰۷۶	۳٫۴	اضافہ ۱۰٫۴
۸۔ گاڑا (مسلم)	۳۴,۸۷۷	۳٫۰	" ۷٫۱
۹۔ جاٹ (ہندو)	۳۱,۵۰۸	۲٫۷	کمی ۱۰٫۰
۱۰۔ یورپین (عیسائی)	۲۳,۷۰۴	۲٫۰	کمی ۲۰٫۰
۱۱۔ سید (مسلم)	۱۶,۹۶۷	۱٫۵	کمی ۱۱٫۸
۱۲۔ فقیر، جوگی گوشائیں (ہندو)	۱۹,۰۳۵	۱٫۷	اضافہ ۲۷٫۶
۱۳۔ چمار۔ (ہندو)	۱۵,۲۰۹	۱٫۳	اضافہ ۱۸٫۴
۱۴۔ کولی (ہندو)	۸,۸۷۰	۰٫۸	اضافہ ۴۳٫۳
۱۵۔ کھترّی (ہندو)	۸,۱۶۹	۰٫۷	کمی ۳٫۰
۱۶۔ اہیر (ہندو)	۷,۷۵۴	۰٫۷	اضافہ ۱۶٫۷
۱۷۔ سینی ومالی (اس میں مسلمان ہندو دونوں شامل ہیں)	۸,۱۰۱	۰٫۷	کمی ۲۲٫۲
۱۸۔ روڑھ (ہندو)	۷,۸۶۰	۰٫۷	کمی ۱۲٫۵
۱۹۔ سادھ (ہندو)	۶,۹۴۵	۰٫۶	کمی ۱۴٫۳
۲۰۔ جھوجھا (مسلم)	۶,۸۱۸	۰٫۶	اضافہ ۲۰٫۰
۲۱۔ دیگر	۳۶,۹۴۲	..	..
۲۲۔ سرکاری ملکیت	۲۲,۶۷۸	۱٫۹	اضافہ ۳۵٫۷
میزان	۱۱,۶۵,۵۰۴	۱۰۰	

سہارنپور گزیٹیر مطبوعہ سنہ ۱۹۲۰ء میں سنہ ۱۸۹۰ء کی بندوبست رپورٹ کی بنا پر ضلع سہارنپور کے زمینداروں کے بارے میں حسب ذیل باتیں لکھی گئی ہیں:-

"زمین کے زیادہ تر رقبہ کے مالک ہمیشہ سے چھوٹے زمیندار چلے آرہے ہیں اور بڑی

جائدادوں کی تعداد یہاں محدود ہے اگرچہ حال کے سالوں میں ساہوکار پیشہ طبقوں کے قبضہ کی وجہ سے اس میں نمایاں ترقی ہوگئی ہے۔ ان طبقوں کے پاس اب مجموعی رقبہ کا تقریباً ایک چوتھائی حصّہ پہنچ چکا ہے اور ان کی ملکیت میں سب سے زیادہ زمینیں ترائی کے علاقہ میں ہیں جہاں انہوں نے سرکاری جنگلات کے اکثر عطیات کو خرید لیا ہے۔ ان کے بعد گوجروں کا نمبر ہے اور اس میں لنڈھورا کی بڑی ریاست بھی شامل ہے۔ ان کے بعد راجپوتوں کا نمبر ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ ان کی خاص بستی اس علاقہ میں ہے جسے کتھا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ضلع کے دوسرے حصّوں میں بھی خصوصاً پہاڑ کے دامن کے ساتھ ساتھ ان کی کئی طاقتور اگرچہ چند افراد کی جمعیتیں ہیں اور ان میں اور کتھا کی برادری میں یہ فرق ہے کہ یہ لوگ اپنے ذات کے قاعدوں کی پابندی زیادہ سختی کے ساتھ کرتے ہیں اور ہل کو ہاتھ لگانے سے جہاں تک ہو سکتا ہے گریز کرتے ہیں دوسری ذاتیں نسبتاً کم ہیں۔ تازہ ترین اعداد آخری بندوبست کے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاجنوں کی ملکیت میں ۲۲،۳ فی صدی زمین ہے۔ گوجروں کے پاس ۲۰،۷ فی صدی راجپوتوں کے پاس ۱۶،۴ فی صدی شیخوں کے پاس ۱۴،۴ فی صدی تگوں کے پاس ۴،۳ فی صدی پٹھانوں کے پاس ۳،۷ فی صدی جاٹوں کے پاس ۳،۱ فی صدی برہمنوں کے پاس ۳،۱ فی صدی یورپینوں کے پاس جن کی نمائندگی پاول کا خاندان کرتا ہے ۳،۰ فی صدی گاڑوں کے پاس ۲،۸ فی صدی سیدوں کے پاس ۲،۲ فی صدی چماروں، کھتریوں، کلوروں، گوشائیوں اور سینیوں میں سے ہر ایک کے پاس دس دس ہزار ایکڑ سے زیادہ رقبہ تھا اور ان کے بعد کولیوں، روڑوں، کائستھوں، پیرزادوں اہیروں، جھوجھوں اور فقیروں کا نمبر تھا اور ان میں سے ہر ایک کے پاس پانچ پانچ ہزار ایکڑ سے زیادہ رقبہ تھا........

جب ان اعداد کا مقابلہ سنہ ۶۱ء کے اعداد سے کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیس سال کے دوران میں مہاجنوں نے ۹۵ ہزار ۳۰۵ ایکڑ اور شیخوں نے دو ہزار ۲۹۱ ایکڑ زائد رقبہ پر اپنی ملکیت قائم کی۔ کسی دوسری ذات نے سوائے کمبوہوں، جوگیوں، تیلیوں اور چند دوسری ذاتوں

کے جن کے قبضہ میں بہت حقیر رقبہ ہے۔ ان کے مساوی تناسب سے اپنی زمینداری نہیں بڑھائی سب سے زیادہ نقصان راجپوتوں اور گوجروں کو پہنچا جن کی جائدادیں علی الترتیب ۲۴ ہزار ۹۳۸ اور ۲۳ ہزار ۹۹۵ ایکڑ کی کمی ہوگئی۔ ان کے علاوہ نسبتی لحاظ سے زیادہ کمی روڑوں، تگوں، جاٹوں گاڑوں اور سینیوں کی زمینداری میں بھی ہوئی۔"

ذیل میں سہارنپور کے چند بڑے بڑے زمینداروں کے بارے میں کچھ تفصیلی حالات سہارنپور گزٹیر سے درج کئے جاتے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ کیا جاسکے کہ یہاں کے زمینداروں کے طبقہ امراء میں مسلمانوں کی نمائندگی کتنی اور کس طرح کی ہے:۔

"ریاست لنڈھورا۔ گوجروں کی اس ریاست کے پاس سابق رقبہ کا صرف ایک حصہ رہ گیا ہے لیکن اب بھی یہ ضلع کی سب سے بڑی جائداد ہے۔ اس ضلع میں اس ریاست کے ۴۹ پورے مواضعات ہیں اور ۲۴ مواضعات میں اس کے قبضہ میں جزوی حصے ہیں اور یہ سوائے گنگوہ کے باقی ہر پرگنہ میں ہیں۔ ان کا مجموعی رقبہ ۳۹ ہزار ۵۳۰ ایکڑ ہوتا ہے جس کی مالگزاری ۳۷ ہزار ۷۰۹ روپیہ ہے۔ ضلع سہارنپور کے علاوہ اس ریاست میں ضلع میرٹھ کی زمینیں جن کی مالگزاری ۴۲ ہزار ۱۴۲ روپیہ ہے۔ ضلع بجنور کی زمینیں جن کی مالگزاری دس ہزار ۸۲۳ روپیہ ہے۔ مظفر نگر کی زمینیں جن کی مالگزاری ۷ ہزار ۹۴۵ روپیہ ہے اور بلند شہر کی زمینیں جن کی مالگزاری دو ہزار ساٹھ روپئے ہے شامل ہیں۔"

جین زمیندار:۔ سب سے اہم زمینداروں میں کئی ایک اگروال برادری کے جین فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، سب سے دولت خاندان وہ ہے جس کے نمائندے آج کل حسب ذیل ہیں:۔

جمبو پرشاد متبنٰی مترا سین	یہ سب سہارنپور میں رہتے ہیں۔ لیکن ان میں ان جھگڑوں
آتما رام پسر گنگا رام	اور مقدمہ بازیوں کی وجہ سے جو تبنیت کے سوال
گومتی کنور بیوہ اگر سین	پر پیدا ہوئے ہیں مغائرت پیدا ہوگئی ہے۔
روپ چند پسر بارو مل	- - - - - - - - - - - - - - - -

لالہ جمبو پرشاد کی ملکیت میں اس ضلع میں بیس پورے گاؤں ہیں اور ۸۶ گاؤں میں ان کا حصّہ ہے۔ ان کے پاس کل رقبہ ۲۱ ہزار ۲۴۰ ایکڑ ہے جس کی مالگزاری ۲۵ ہزار ۱۱۱ ہوتی ہے اس کے علاوہ منظفر نگر میں یہ ایک ہزار تین روپئے کی مالگزاری ادا کرتے ہیں۔

لالہ آتما پرشاد کے پاس ضلع کے مختلف علاقوں میں ۲۲ حصّے ہیں جن کا کل رقبہ ۳ ہزار ۸۰ ایکڑ اور مالگزاری ۴ ہزار ۲۰۷ روپئے ہوتی ہے

لالہ گومتی کنور کے پاس آٹھ پورے گاؤں ہیں اور ۲۰ حصّے ہیں۔ جن کا کل رقبہ ۶ ہزار ۳۷ ایکڑ اور مالگزاری ۹ ہزار ۳۷ روپئے ہوتی ہے۔

لالہ روپ چند کے پاس پانچ پورے گاؤں ہیں اور تیس حصّے ہیں جن کا کل رقبہ ۷ ہزار ۶۱۸ اور مالگزاری ۹ ہزار ۶۶۶ روپئے ہوتی ہے۔

۲۔ جینیوں کا دوسرا مشہور خاندان وہ ہے جس کے نمائندے بدری داس اور جنیشوری داس پسران لالہ پارس داس ہیں۔ یہ سہارنپور میں ایک ممتاز شخصیت رکھتے تھے۔ میرٹھ اور شملے میں سرکاری خزانچی اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ان دونوں کے پاس مجموعی طور پر دو سالم گاؤں اور ۱۹ حصّے ہیں جن کا رقبہ ۳ ہزار ۱۱۶ ایکڑ اور مالگزاری ۵ ہزار ۴۷۴ روپئے ہے۔

۳۔ جینی زمینداروں میں لالہ آتما رام متبنّیٰ لالہ دیپ چند بھی شامل کئے جاسکتے ہیں جن کے پاس دو سالم موضعے ہیں اور ۱۹ حصّے ہیں جن کا مجموعی رقبہ ۳ ہزار چھ سو ایکڑ اور مالگزاری چار ہزار ۳۱۵ روپئے ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ حسب ذیل جینی زمیندار ہیں:-

۴۔ رائے دھول کیرت سہارنپوری ہ۔ دو سالم گاؤں اور ایک حصہ مالگزاری ۲ ہزار چھ سو روپئے۔

۵۔ رائے پرکاش چند نانوتہ والے۔ دو سالم گاؤں اور ۹ حصّے مالگزاری ۲ ہزار ۶۹۶ روپئے۔

۱۰- کلونت سلطے اور سکھ پال رائے ننگڑ والے ۔ ایک سالم گاؤں اور ۹ حصے مالگزاری دو ہزار ۲۴۲ روپئے۔

بنئے زمیندار:۔ سہارنپور کے زمینداروں میں ویشوں یا بنیا اگروالوں کی حیثیت بھی بہت ممتاز ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور لالہ جوتی پرشاد پسر لالہ نبی لال جگادھری ضلع انبالہ والے ہیں۔ یہ انبالہ، سہارنپور، رڑکی، میرٹھ اور کسولی میں سرکاری خزانچی ہیں اور ان کے بھائیوں کے پاس یہاں اور پنجاب میں بڑی جائدادیں ہیں۔ اس ضلع میں ان کی جائداد میں ۸ ہزار ۳۰۴ ایکڑ رقبہ ہے جس کی مالگزاری ۱۲ ہزار ۱۳۰ روپیہ ہے اور اس میں ۱۴ سالم گاؤں اور ۱۲ حصے شامل ہیں۔

۲- لالہ مرلی لال پسر لالہ گنیشی لال بھگت سہارنپور والے جو اپنی نیکی اور فیاضی کے لئے اتنے ہی مشہور تھے جتنے اپنی دولت کے لئے تھے۔ یہ پیشے کے اعتبار سے ساہوکار ہیں اور آنریری مجسٹریٹ ہیں اور میونسپل اور ڈسٹرکٹ دونوں بورڈوں کے ممبر ہیں۔ ان کی جائداد میں پانچ سالم گاؤں اور ۱۱ حصے شامل ہیں جن کا مجموعی رقبہ ۸ ہزار ۱۶۰ ایکڑ اور مالگزاری ۹ ہزار ۲۸۸ روپئے ہوتی ہے۔

۳- پرگنہ ہرورا میں کوٹہ خاندان کے نمائندے اس وقت لالہ بارومل پسر جیون داس ہیں جو ایک بڑے ساہوکار اور غلے کے تاجر ہیں۔ ان کے پاس دس سالم گاؤں اور ۲۴ حصے ہیں جن کا مجموعی رقبہ ۵ ہزار ۱۴۵ ایکڑ اور مالگزاری ۸ ہزار ۲۲۹ روپئے ہوتی ہے۔

۴- لالہ شمبھو ناتھ پسر سرت لال سہارنپور والے آنریری مجسٹریٹ اور میونسپلٹی کے ممبر ہیں۔ ان کے پاس ۸ سالم گاؤں اور دس حصے ہیں جن کا مجموعی رقبہ ۶ ہزار ۹۰۶ ایکڑ اور مالگزاری ۴ ہزار ۴۵۰ روپیہ ہوتی ہے۔

۵- دیوبند والوں میں لالہ سہنام سنگھ متبنٰی لالہ جوتی رام ہیں۔ یہ آنریری مجسٹریٹ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر اور دیوبند میونسپل بورڈ کے ممبر ہیں۔ ان کی جائداد میں تین گاؤں اور ۴۲ حصے شامل ہیں جن کا رقبہ ۲ ہزار ۲۷۵ ایکڑ اور مالگزاری ۳ ہزار ۹۲۰ روپئے ہوتی ہے۔

۶- لالہ شنکر لال اور سندر لال پسران لوک رام سہارنپور والے کے پاس ایک گاؤں

اور پانچ حصے ہیں جن کا رقبہ ۲ ہزار ۳۰۷ ایکڑ اور مالگزاری دو ہزار ۹۲۷ روپئے ہوتی ہے۔

۵۔ لالہ رام گوپال بھگوانپور میں رہتے ہیں ان کے پاس ۱۸ حصے ہیں جن کی مالگزاری دو ہزار ۸۱۰ روپئے ہوتی ہے۔

۶۔ لالہ چمن لال املی کھیڑہ والے کے پاس ۱۲ حصے ہیں جن کی مالگزاری ۲ ہزار ۶۸۰ روپئے ہوتی ہے

۷۔ لالہ کندن لال لندھورے والے کے پاس ۱۴ سالم گاؤں اور ۶ حصے ہیں جن کا مجموعی رقبہ ۲ ہزار ۵۸۲ ایکڑ اور مال گذاری ۲ ہزار ۲۶۳ روپئے ہوتی ہے۔ ان کے پاس ضلع مظفرنگر میں بھی دو ہزار روپئے کی مال گذاری کی زمینیں ہیں۔

مسلمان زمیندار: مسلمان زمینداروں میں سب سے اول نمبر پر خاں صاحب نعیم خاں کیلاس پور والے ہیں۔ یہ گگر زئی پٹھان ہیں۔ ان کے بزرگوں میں شہباز خاں شاہجہاں کے زمانۂ حکومت میں قندھار سے آئے تھے اور اس علاقے میں بس گئے تھے۔ موجودہ رئیس کے دادا محمد عثمان خاں نے غدر کے زمانے میں سرکار کی خدمت کی اور اس کے انعام میں تین ہزار ۵۵ روپئے مال گذاری کے تین سالم گاؤں دئے گئے اور اول الذکر کو اعزازی تلوار بھی عطا کی گئی۔ محمد نعیم خاں آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ گاؤں کے منصف ہیں اور سہارنپور کے میونسپل اور ڈسٹرکٹ دونوں بورڈوں کے ممبر ہیں۔ ان کو ۱۹۰۳ء میں دہلی دربار کے موقع پر خانصاحب کا خطاب دیا گیا۔ ان کی جائداد میں ۱۴ سالم گاؤں اور ۲۹ حصے شامل ہیں، جن کا رقبہ ۶ ہزار ۳ ۸۶ ایکڑ اور مال گذاری دس ہزار ۴۰۲ روپئے ہوتی ہے۔ ان کے پاس ضلع مظفرنگر میں بھی تھوڑی سی جائداد ہے۔

۲۔ ایک دوسرے پٹھان زمیندار کنج پورہ ضلع کرنال کے ابراہیم علی خاں ہیں۔ یہ سہارنپور میں نہیں رہتے لیکن ان کے پاس ضلع سہارنپور میں تین سالم گاؤں ہیں جن کا رقبہ ۲ ہزار ۳ ۱۱۱ ایکڑ اور مالگذاری ۳ ہزار ۵ ۳۲ روپئے ہوتی ہے۔

۳۔ انبیٹھ کے پیرزادے جو مشہور بزرگ شاہ عبدالمعالی کی اولاد ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں ان کی نمائندے آج کل شاہ فخرالدین اور شاہ مسعود احمد ہیں۔ ان کے پاس ۲۲ معافی کے

گاؤں تھے جنھیں ان کے مورث شاہ محمد باقر کو محمد شاہ نے عطا کیا تھا لیکن ۱۸۴۷ء میں ان مواضعات کو بندوبست میں شامل کر دیا گیا اور ان پر مال گزاری لگائی گئی۔

۴۔ پیرزادوں کا ایک دوسرا خاندان بیہٹ پرگنہ فیض آباد میں رہتا ہے۔ یہ لوگ بہاء الدین زکریا ملتانی کی اولاد میں سے ہیں اور ان کے مورث کو جو بیہٹ میں بہلول لودی کے زمانے میں بس گئے تھے کئی گاؤں کا عطیہ ملا تھا۔ ان کے وارثوں نے کاشتکار کی حیثیت سے بہت سی زمینیں حاصل کیں لیکن ان میں سے بہت سی ضایع ہوگئیں، اگرچہ اس خاندان کے خاص افراد یعنی شاہ غلام صابر اور شاہ زاہد حسین کا گرد و نواح میں بہت اثر ہے۔ ہر دو کے پاس بارہ بارہ حصے ہیں۔ اوّل الذکر کے پاس تین ہزار ۳۱۸ ایکڑ رقبہ ہے جس کی مال گزاری ۵ ہزار ۲۱۰ روپئے ہے اور موخر الذکر کے پاس تین ہزار ۵۰۵ ایکڑ رقبہ ہے جس کی مال گزاری ۴ ہزار ۱۴۱ روپئے ہے۔

۵۔ لکھنوتی کے ترکمانوں کے پاس ایک زمانے میں بڑی جائداد تھی لیکن اب ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے اور ان کے قبضے میں بہت تھوڑی زمین ہے

۶۔ یہی بات جھبیر پرگنہ سلطانپور کے پٹھانوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جن کا تعلق خضر زئی رہیلوں سے ہے۔ ان کے نمائندے آج کل فضل الرحمٰن خاں ہیں جو ایک ہزار ایک سو روپئے کی مال گزاری سہارنپور میں اور دو سو روپئے کی انبالہ میں ادا کرتے ہیں۔

۷۔ راجوپور کے شیخ زادے بھی بہت گھٹ گئے ہیں۔ ان کے مکھیا برکت علی خاں مشہور شیخ کلن کے بھتیجے ہیں۔ یہ بھوپال میں بندوبست افسر تھے اور اب راجوپور میں رہتے ہیں، جہاں ان کی کچھ زمینداری ہے۔

۸۔ دوسرے خاندان نسبتاً زیادہ حال میں پیدا ہوئے ہیں۔

سید آغا حیدر سہارنپور والے بیرسٹر اور سبا بجہ کار۔ پسر میر احسان علی جو سرکاری وکیل تھے ان کے پاس ۱۶ حصے ہیں جن کا رقبہ ۲ ہزار ۵۰۳ ایکڑ اور مال گزاری ۳ ہزار ۵۸۰ روپئے ہوتی ہے

۹۔ خواجہ مظاہر حسن سہارنپور کے انصاری شیخ زادے ہیں اور مسلم قوم میں سب سے زیادہ

با اثر آدمی ہیں۔ یہ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل بورڈ کے ممبر ہیں۔ ان کے والد خواجہ احمد حسن تحصیلدار تھے اور ان کے بھائی خواجہ طاہر حسن بھی اس عہدے پر ہیں۔ ان کے پاس سات حصے ہیں۔ جن کی مال گزاری ۲ہزار ۱۷۱ روپئے ہے۔

۱۰۔ فضل الرحمٰن اور محمد عسکری سہارنپور کے شیخ۔ ان کے پاس دو سالم گاؤں اور تین حصے ہیں جن کا رقبہ ۳ہزار ۲۵۰ ایکڑ اور مال گزاری تین ہزار ۳۰۰ روپئے ہوتی ہے۔

۱۱۔ حکیم محمد یوسف سہارنپور والے۔ ان کے پاس دو سالم گاؤں اور ۱۹ حصے ہیں جن کا مجموعی رقبہ دو ہزار ۳۰۵ ایکڑ اور مال گزاری ۳ہزار ۰۸۰ روپئے ہوتی ہے۔

۱۲۔ سکڑودہ اور کھیڑی کے راؤ مسلمان پنڈیروں کی اولاد ہیں جنہوں نے رڑکی اور بھگوان پور کے پرگنوں میں بہت جائداد پیدا کر لی تھی۔ لیکن اس کا زیادہ تر حصہ منضبط میں شامل کرکے جنگلات کے عطیوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ ان کی جائداد کی اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

سکڑودہ کے راؤ محمد علی خاں کا انتقال ۱۸۷۶ء میں ہوا۔ ان کے کوئی اولاد پسری نہیں تھی۔ ان کی جائداد ان کی لڑکی، بیواؤں اور بہنوں کو ملی۔ بدانتظامی کی وجہ سے قرضہ رونما ہوا اور زیادہ تر زمین فروخت کر دی گئی۔ اگرچہ کچھ حصہ ان کے داماد راؤ فتح محمد خاں اور اُن کے بھتیجے معصوم علی خاں کے پاس اب بھی باقی ہے۔

کھیڑی کے نمائندہ راؤ فرزند علی خاں ہیں جن کے مایوس کن حد تک مقروض ہونے کی وجہ سے جائداد تقریباً بالکل غائب ہو گئی ہے۔

ان کے علاوہ غیر مسلموں میں پادل کی یوریشین جائداد اور ہندوؤں کی دوسری ذاتوں کی چند زمینداریاں ہیں جن کو طوالت کے ڈر سے نظر انداز کیا جاتا ہے

لوگوں کی عام حالت کے عنوان کے ماتحت گزیٹیر میں زمینداروں کے سلسلے میں حسب ذیل عبارت درج کی گئی ہے:۔

"زمینداروں کی عام حالت اچھی ہے، اگرچہ خانگی فضول خرچی۔ یا بیش مصارف مقدمہ بازی کی وجہ سے کئی جائدادیں نیلام پر چڑھ گئی ہیں اور اس طرح ساہوکاروں کی ملکیت میں اضافہ ہوگیا ہے مسلمان چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر عام طور پر ہندوؤں کے مقابلے میں کم خوش حال ہیں خصوصاً نانوتہ، گنگوہ، منگلور اور جلالہ جیسے دور کے قصبات میں جہاں عمدہ گھروں کے کھنڈرات زبانِ حال سے ان کی دولت و ثروت کے زوال کی شہادت دیتے ہیں اور یہ زوال ناگزیر نتیجہ ہے مسلمانوں کے قوانین وراثت کا، تعدد ازدواج کا، تجارتی اہلیت کی کمی کا اور فضول خرچی کے ناقابلِ اصلاح رجحان کا۔"

اوپر کے ان بیانات سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی زمینداریوں کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان زمینداریوں اور جائدادوں کے موجودہ وارثوں اور ان کے موجودہ قرضوں اور ان کی عام حالت کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھی نہیں کی جاسکیں، لیکن عام شہرت یہی ہے کہ مسلمانوں میں دو ایک کے سوا جن میں بہٹ کے شاہ زادہ حسن صاحب مرحوم کا سیف اور خوش انتظامی ممتاز حیثیت رکھتی تھی باقی تمام زمیندار قرض سے خالی نہیں ہیں اور بعض بڑی جائدادیں تو بری طرح قرض کے بار میں دبی ہوئی ہیں۔

۲۔ ضلع سہارنپور کے کاشتکار

سہارنپور کے گزیٹیر میں یہاں کے کاشتکار پیشہ ذاتوں کے بارے میں حسب ذیل باتیں درج کی گئی ہیں۔

"دیوبند کے سوا، جہاں راجپوتوں کی تعداد گوجروں سے کچھ زیادہ ہے باقی ہر تحصیل میں گوجروں کو کاشتکاری میں غلبہ حاصل ہے۔ بحیثیت جماعت یہ لوگ اچھے کاشتکار نہیں ہوتے لیکن بہت سے مقاموں سے ان کی محنت ترقی پر ہے اور ان کے بہت سے گاؤں میں عمدہ کاشت کی مثالیں نظر آجاتی ہیں۔ یہی بات ہندو اور مسلم دونوں طرح کے راجپوتوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے اگرچہ ان لوگوں کی برہمنوں کی طرح مصیبت یہ ہے کہ جماعت میں اونچا درجہ رکھنے کی وجہ سے انھیں ہل کو ہاتھ لگانے سے منع کیا گیا ہے۔ ان کے بعد تعداد کے لحاظ سے

گاڑوں اور سینیوں کا نمبر ہے جو بہت اعلیٰ قسم کے کاشتکار ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر نہایت نمایاں طور پر محنتی اور با مہارت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کا مقدمہ بازی کا شوق بہت سے زمینداروں کی نگاہ میں انھیں ناپسندیدہ بنا دیتا ہے۔ تگا بھی ان کے برابر محنتی ہوتے ہیں لیکن ان میں مہارت کم ہوتی ہے۔ اس کے بعد چماروں کا نمبر ہے جو کسان سے زیادہ زراعتی مزدور کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ جاٹوں کا شمار بھی اوّل درجہ کے کسانوں میں کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی تعداد یہاں بہت محدود ہے۔ برہمن اکثر صورتوں میں محض نام کے لئے کاشتکار ہوتے ہیں۔ چوہان تمام تر رُڑکی تحصیل تک محدود ہیں لیکن ان میں نمایاں طور پر اچھی کھیتی کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ جھوجے جو اسی تحصیل میں پائے جاتے ہیں بلا شبہ بہترین کاشتکار ہیں۔ دوسری ذاتیں شمار میں تو بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔ ان میں سب سے کم نمائندگی پٹھانوں، کہاروں کوریوں، اہیروں، بنجاروں، تیلیوں، روڑوں اور کمبوہوں کی ہے۔"

سہارنپور کے لوگوں کی عام معاشی حالت کے بارے میں گزیٹیر میں حسب ذیل باتیں لکھی گئی ہیں، جن سے کاشتکار پیشہ طبقہ کی حالت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ضلع کے عام مرفہ الحالی میں حال کے سالوں میں بہت اضافہ ہوا ہے (انگریزی حکومت سے) الحاق کے وقت عام حالت بہت افسوسناک تھی۔ اس کی کچھ وجہ تو مرہٹوں کا مستاجری کا طریقہ تھا اور کچھ وجہ سکھوں کے مسلسل اور غارتگرانہ حملے تھے۔ اس کے بعد بھاری مال گزاری اور مسلسل کساد بازاری کا دور شروع ہوا جس کی وجہ سے بہت سی زمینداریاں تباہ و برباد ہو گئیں۔ پھر باقاعدہ بندوبست کے ذریعہ جب اصلاح ہوئی تو اس کا فائدہ قحط سالیوں اور ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے ظاہر نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے بعد کے تیس سالوں میں نمایاں طور پر بہتری پیدا ہوئی۔ آرام کا معیار بڑھ گیا۔ مزدوروں کی اجرت میں اضافہ ہوا اور کفایت شعاری اور محنت میں واضح طور پر ترقی ہوئی۔ ۱۸۹۰ء کے بندوبست کے بعد سے ترقی اور بھی زیادہ جاذب توجہ ہو گئی۔ مزروعہ رقبہ میں بہت توسیع اور آبپاشی میں بے انتہا ترقی ہوئی جس کی وجہ سے

اب اس ضلع کے بہت کم حصے ایسے باقی رہے ہیں جنھیں غیر محفوظ کہا جا سکتا ہے اور یہ بات محض نہروں کے نظام کی ترقی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس میں محکمہ زراعت کی ان کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے جو وہ کنوؤں میں نل لگانے کے سلسلے میں کر رہی ہے۔ پانی کی نکاسی کا انتظام بھی بہت بہتر کر دیا گیا ہے اب ٹھہرے ہوئے پانی کی شکائتیں بہت کم سننے میں آتی ہیں اور ریلوے کے نظام کی ترقی سے بھی بے شمار فائدے پہنچے ہیں۔ سڑکوں کے معاملے میں ضلع ابھی تک کچھ پیچھے ہے۔ لیکن تعمیر کے بڑے مصارف کے باوجود خصوصاً شمال میں جہاں بہت سے پُل بنانے کی ضرورت ہوتی ہے ترقی آہستہ آہستہ ہو رہی ہے اور کم از کم پیداوار کو ریلوں اور منڈی تک پہنچانے کے لئے کافی راستے موجود ہیں......... کاشتکاروں کے لگان میں جس نسبت سے اضافہ ہوا ہے قیمتوں میں اس سے زیادہ اضافہ اور آبپاشی میں اس سے زیادہ ترقی ہو گئی...... ..... اور بصورت مجموعی کسان کو عام خوش حالی میں سے اس کا واجبی حصہ ملتا رہا ہے۔"

تحقیقات کے وقت کسانوں کی معاشی حالت کیا تھی۔ افسوس ہے اس کے بارے میں مجھے ذاتی تحقیقات سے اندازہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ البتہ ۱۹۳۱ء کی قیمتوں کے مطابق ایک نمونہ کے ایک ایکڑ کی خام پیداوار کی قیمت سہارنپور کی تازہ ترین رینٹ ریٹ، اور اسسمنٹ رپورٹوں میں تخمینہ کی گئی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے (لگان اس کا ½ مقرر کیا جاتا ہے)

۱۔ نمونہ کے ایک ایکڑ کی خام پیداوار کی قیمت تحصیل سہارنپور میں ۳۸،۰۵ روپے سے لے کر ۴۸،۰۴ روپے تک (جہاں گنے کی کاشت زیادہ ہے وہاں خام پیداوار کی قیمت زیادہ ہے)

۲۔ نمونہ کے ایک ایکڑ کی خام پیداوار کی قیمت تحصیل رڑکی میں ۲۷،۴۴ روپے سے لے کر ۶۱،۹۷ روپے تک (جہاں گنے کی کاشت زیادہ ہے وہاں خام پیداوار کی قیمت زیادہ ہے)

۳۔ نمونہ کے ایک ایکڑ کی خام پیداوار کی قیمت تحصیل نکڑ میں ۲۴،۰۶ روپے سے لے کر ۵۶،۰۸ روپے تک (جہاں گنے کی کاشت زیادہ ہے وہاں خام پیداوار کی قیمت زیادہ ہے)

۴۔ نمونہ کے ایک ایکڑ کی خام پیداوار کی قیمت تحصیل دیوبند میں ۳۰،۹ روپے سے لے کر ۴۸،۰۲

روپے تک (جہاں گنے کی کاشت زیادہ ہے وہاں خام پیداوار کی قیمت زیادہ ہے)

ذیل میں ایک نقشہ ۱۹۲۰ء کی بندوبست رپورٹ سے نقل کیا جاتا ہے۔

ضلع سہارنپور کے کاشتکاروں کی ذات و مذہب کا نقشہ

نمبر شمار	ذات و مذہب		نقد لگان			[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
			رقبہ ایکڑوں میں	لگان روپیوں میں	[illegible]				
۱	گوجر	ہندو	۷۳،۵۱۷	۳،۹۱،۸۱۳	۶،۶	۵،۷۶۲	۷۱،۳۸۸	۳،۷۲۹	۱،۵۵،۴۹۶
		مسلمان	۲۰،۲۹۵	۱،۲۳،۷۲۴	۶،۰	۴،۲۴۴	۱۱،۰۹۱	۱،۰۳۷	۶۳،۹۹۷
۲	راجپوت	ہندو	۳،۳۰،۵۴۶	۲،۱۳،۹۵۷	۶،۳	۶،۰۵۸	۵۳،۴۳۰	۲،۲۲۱	۹۶،۲۲۵
		مسلمان	۱۴،۱۴۰	۷۸،۵۸۳	۵،۶	۱،۴۷۳	۱۶،۷۲۴	۱،۱۱۵	۲۳،۴۷۲
۳	مالی و سینی	ہندو	۶۰،۷۲۸	۳،۳۵،۵۱۵	۷،۲	۱۴،۷۹۳	۴،۱۹۶	۲۰۵	۸۰،۲۲۲
		مسلمان	۸۷۳	۷،۶۸۱	۸،۸	۵۸	۲۱۶	۲۳	۱،۱۴۹
۴	گاڑا (مسلمان)		۵۲،۵۱۷	۳،۷۱،۷۷۵	۷،۱۴	۵،۳۶۱	۲۰،۹۳۷	۱،۱۷۳	۷۹،۹۸۸
۵	تگا	ہندو	۱۴،۱۷۷	۱،۰۱،۹۷۴	۷،۲	۳۵۶	۲۸،۸۵۲	۹۵۶	۴۴،۳۴۱
		مسلمان	۲۰،۹۳۵	۱۸،۹۴۹	۶،۷	۲۴	۲،۰۴۷	۱۲۵	۵،۰۳۴
۶	چمار (ہندو)		۳۱،۳۵۷	۲،۶۳،۲۲۰	۸،۴	۹،۱۲۶	۱۳۹	۶۵۳	۴۱،۴۱۵
۷	جاٹ (ہندو)		۱،۴۱،۸۲۴	۱۱،۰۷،۵۸۸	۷،۴	۱،۲۴۳	۱۵،۶۳۹	۷۸۵	۳۲،۴۸۱
۸	برہمن (ہندو)		۱۳،۹۴۲	۹۳،۸۸۲	۶،۷	۱،۸۰۵	۷،۹۵۸	۳،۱۴۳	۲۶،۸۴۸
۹	کولی (ہندو)		۷،۸۴۶	۴۶،۰۷۴	۵،۹	۹۰	۵،۲۶۲	۱۹۴	۱۴،۳۹۴
۱۰	جھوجھا (مسلمان)		۴،۷۵۸	۶۱،۹۲۰	۷،۱۱	۳۹۷	۲،۶۱۸	۱۲۵	۱۱،۹۳۴
۱۱	اہیر (ہندو)		۴،۷۹۲	۳۲،۱۷۶	۶،۷	۲۴۱	۴،۳۰۱	۲۴۴	۹،۶۳۸
۱۲	دیگر		۱،۰۹،۴۱۷	۸،۱۰،۸۴۵	۷،۸	۲۶،۵۵۶	۴۴،۵۸۶	۹،۰۱۱	۱،۸۴،۵۷۰
	میزان		۸،۴۵،۱۰۴	۴۱،۷۶،۸۷۵	۷،۳	۷۷،۹۰۴	۲،۸۹،۲۴۴	۲۲،۱۲۹	۸،۵۴،۹۹۰

چوب فروشوں کی برادری

چوب فروشوں[1] کی برادری کی ایک انجمن ہے جس کا نام انجمن تنظیم القوم ہے۔ اس کی سالانہ روئداد بابت سال ۴۲-۱۹۴۱ء میں اس برادری کی تاریخ کے بارے میں کچھ حالات درج ہیں جنھیں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

"ہماری قوم کو متعدد جگہ کلال کہا جاتا ہے جو قطعاً بے بنیاد ہے اور غلط ہے۔ لہذا اصل شجرہ و نسب کی تلاش و تحقیق ضروری تھی۔ خصوصاً جب کہ یہ امر انجمن کے اغراض و مقاصد میں سے بھی ایک ہے۔ لہذا اس انجمن نے اس کے تلاش کی فکر کی جو کہ ہنوز جاری ہے۔ اس سلسلے میں خان بہادر شیخ قربان احمد صاحب نے جو کہ اس انجمن کے صدر تھے، نہایت سخت کاوش کے ساتھ تحقیقات کی۔ انھوں نے خود ایک اشتہار بعنوان "ہماری قوم" آپ لوگوں کی اطلاع و آراء کے لئے شائع کیا۔ اس میں انھوں نے یہ بتلایا کہ ہماری قوم کے جد امجد حضرت سید امیر کُلال تھے جن کا سلسلہ نسب اہل قریش سے جا کر ملتا ہے۔ ہمارے بزرگوں کو شیخ کا خطاب شاہانِ مغلیہ نے بوجہ ان کے تقدس اور اعلیٰ مدارج کے عطا کیا تھا اور خان بہادر موصوف نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم قریشی سید ہیں اور ہماری قوم اپنے جد امجد کے نام پر کلالی ہے اور جس طرح شاہ ہارون پور کثرت استعمال سے مسخ ہو کر سہارنپور ہو گیا لفظ کلالی بھی اسی طرح کلال ہو گیا اور اکثر حاسدین قوم نے

---

[1] اس برادری کے حالات شیخ مہربان احمد صاحب کے ذریعہ معلوم ہوئے جو سہارنپور کی چوب فروشوں کی برادری کے ایک ممتاز رکن ہیں اور قومی اور سماجی معاملات میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور چوب فروشوں کی انجمن تنظیم القوم سہارنپور کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

لفظ کلال کو کلال کر دیا۔ کلال کے معنی اصطلاح عام میں فی زمانہ شراب بیچنے والے کے لئے جاتے ہیں حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ شراب بیچنے والے کو کلال نہیں بلکہ کلار کہتے ہیں۔ انھوں نے گورنمنٹ کی تحریر کردہ اور مصدقہ تاریخ میرٹھ کا حوالہ دے کر بتایا کہ اس میں تحریر ہے کہ کلال قوم باشندہ ملک غیر ہے اور لفظ کلال کے معنی محافظ دفتر یا محافظ مال کے ہیں۔ جو ترکی زبان کا لفظ ہے"

اسی سالانہ روئید کے صفحہ ۳ پر درج ہے کہ "ہماری قوم کے تقریباً دو لاکھ افراد بلکہ زائد ہندوستان میں دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، میرٹھ، مراد آباد، آگرہ، مظفر نگر، علی گڈھ، شیر کوٹ، کرنال، پانی پت، ریاست حیدر آباد، بھوپال، رامپور اور دیگر جگہ ایک منتشر شیرازہ کی صورت میں موجود ہیں لیکن انسانی الوالعزمی اور ترقی کے شعبوں میں تقریباً ناپید اور جماعتی حیثیت سے قطعاً مفقود"

اسی صفحے پر ایک دوسری جگہ درج ہے کہ "اگر ہم اپنی اس قوم پر نگاہ ڈالیں جس نے علی برادران و حافظ فضل حق اور شیخ خدا بخش جیسی ہستیاں پیدا کیں" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی برادران کا تعلق بھی ریاست رامپور کی اسی برادری سے تھا۔

روئیداد کے صفحہ ۱۸ پر شہر سہارنپور میں برادری کی کل آبادی ۱۰۱۹ افراد معہ خورد و کلاں بتلائی گئی ہے جس میں ذکور کی تعداد ۵۲۱ اور اناث کی تعداد ۴۹۸ ہے۔

روئیداد کے صفحہ ۲۰ پر برادری کے موجودہ افراد کو ان کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلائے گئے ہیں تاکہ ان کے اندر حُبِّ قومی کا جذبہ پیدا ہو۔ اور بزرگوں کی مثال سے سبق حاصل کریں۔ لکھا گیا ہے کہ "وہ قوم جو عدل و انصاف، خلوص، قومی ہمدردی، خودداری و نیک نیتی میں اپنی نظیر آپ ہی تھی، جس کے افراد نے اپنی ذاتی خواہشات کو برادرانہ مفاد پر قربان کر رکھا تھا، بلا امتیاز امیر و غریب، عزیز و غیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر کاربند تھے ان کے دل حبِّ قومی سے کہیں زیادہ وسعت حاصل کئے ہوئے حُبِّ ملی سے سرشار تھے جس کا تاریخی ثبوت ان کی تعمیرات اور اس سے بھی زائد ان کے اوقاف ہیں جو انھوں نے کارِ خیر کے لئے کئے تھے ابھی تک موجود ہیں۔ مسجد املی والی محلہ کھالہ پار۔ مسجد بھوانی۔ سرائے مسجد

تیلیوں والی، مسجد بہادران والی، محلہ مبارک شاہ، مسجد چھوٹی محلہ ہندوستانیاں، مسجد معروف نیم تلے والی۔ مسجد املی تلے والی۔ مسجد معروف شیخ کلو والی محلہ چوب فروشان۔ مسجد متصل مزار شاہ ہارون چشتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ۔ مسجد نیچہ بنداں، مسجد وچاہ نیل گراں، مسجد منور میاں، مسجد اندرون ٹولی حجامان۔ مسجد اندرون احاطہ دلّی والاان، دو مساجد محلہ کوٹری ٹیلہ متصل دلی والان و مسجد اسلامیہ ہائی اسکول و نیز عیدگاہ کا غربی حصہ (شیخ خدا بخش مرحوم کا بنوایا ہوا ہے) جامع مسجد سہارنپور کی تعمیر میں بھی اس قوم نے زیادہ سے زیادہ پیش کش کی۔"

روئیداد کے ان اقتباسات کے بعد اب میں اپنی ذاتی تحقیقات کے نتائج کو پیش کرتا ہوں یہ معلومات زیادہ تر شیخ مہربان احمد صاحب کی فراہم کی ہوئی ہیں جو انجمن تنظیم القوم کے صدر رہ چکے ہیں تعلیم کا اوسط لڑکے اور لڑکیوں میں ابتدائی تعلیم بیس فی صدی اور اعلیٰ تعلیم مغربی اور مذہبی دو فی صدی کے قریب ہے۔

اس برادری کے لوگ ملازمت میں بہت کم ہیں۔ تقریباً تمام تر تجارت اور دیگر آزاد پیشے اور مزدوری کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ساٹھ فی صدی کا پیشہ لکڑی کا کاروبار ہے۔ جس میں چالیس فی صدی کا کاروبار بہت اچھا ہے۔ اور بیس فی صدی کا کاروبار معمولی ہے۔ پانچ فی صد دوسرے آزاد کاروبار مثلاً وکالت، سگریٹ کی ایجنسی وغیرہ کا کام کرتے ہیں جنرل مرچنٹ بھی ہیں (حاجی بہار احمد صاحب) بقیہ پینتیس فی صدی محنت مزدوری وغیرہ کرتے ہیں۔ حیثیت سب کی اچھی ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں نکلے گا جس کے گھر پر دو تین ہزار کا زیور نہ ہو۔ عام طور پر بُری عادتیں نہیں ہیں بلکہ لوگ متمول طبقہ کے بُری عادتوں میں بھی پڑے ہوئے ہیں۔ پہلے بیاہ شادی صرف آپس ہی میں ہوتا تھا۔ اب باہر کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ لیکن اپنے کفٔ میں ہوتا ہے غیر کفٔ والے سے برادرانہ تعلقات منقطع کرلئے جاتے ہیں۔ انجمن تنظیم القوم کی سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء کی روئیداد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برادری سے باہر شادی کے مسئلے نے پچھلے دنوں برادری کے لوگوں کے باہمی تعلقات میں بہت ناخوشگواری اور تفرقہ پیدا کردی تھی جس کی وجہ سے

انجمن کے اراکین میں برادری کے کئی ممتاز لوگ شامل نہ ہوسکے تھے۔ انجمن کے اغراض ومقاصد کی دفعہ ۳ یہ ہے کہ "اپنی قوم میں غیر قوم کے ازدواجی تعلقات اور میل کے خلاف اس کو مذموم حرکت سمجھ کر ہر ممکن جد وجہد کرنا"

برادری کا انتظام قایم ہے بلکہ اس میں ترقی بتلائی جاتی ہے۔ برادری کی ایک انجمن تنظیم القوم کے نام سے ہے۔ جس کا ذکر آخر میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ برادری کے ممتاز لوگ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ولی والوں کا خاندان ان کا تفصیلی حال نیچے درج کیا گیا ہے۔

۲۔ شیخ عبدالرحیم صاحب۔ شیخ عبدالعزیز صاحب اور شیخ عبدالحکیم صاحب ان سے بڑا لکڑی کا کاروبار اس وقت سہارنپور میں کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

۳۔ مولوی ظہور الحق صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی۔ وکیل۔

۴۔ مولوی محمد ایوب صاحب۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل۔

۵۔ شیخ منظور احمد صاحب۔ لکڑی کا کاروبار۔

۶۔ شیخ نثار احمد صاحب۔ رئیس میونسپل کمشنر۔

۷۔ شیخ رشید احمد صاحب۔ سب انسپکٹر (باہر ہیں)

۸۔ شیخ مختار احمد صاحب۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں اہلمد ہیں۔

ولی والوں کا خاندان نہایت ممتاز اور مشہور رہ چکا ہے، اور ہے۔ اس خاندان کو شیخ ولی محمد صاحب نے ترقی دی جنہوں نے دہرہ دون کے پہاڑوں میں لکڑی کا ٹھیکہ لیا جس میں انھیں بہت کامیابی ہوئی۔ اور اس کام کو ان کی اولاد نے بھی ترقی دی۔ اس کام میں انھوں نے بہت روپیہ کمایا۔ ولی محمد صاحب کے موجودہ ورثا کا بیان ہے کہ ان کے بزرگوں اور لالہ پدم جین کمار جین کے بزرگوں میں تعلقات بہت اچھے تھے اور دونوں ساتھ ساتھ جائدادیں خریدتے تھے۔ یہاں بھی ترازو سے روپیہ تلتا تھا، اور وہاں بھی اور حیثیت مساوی تھی لیکن اب لالہ پدم جین کے پاس سوا لاکھ روپئے سالانہ کی آمدنی کی جائداد ہے۔ اور وہ ایک شاندار محل نما مکان میں رہتے ہیں

جس پر ایک مسلح گورکھا سنتری پہرہ دیتا اور گھڑیال بجاتا ہے۔ ان کی جائداد کیک جارہی۔ اس لئے ترقی کرتی رہی ولی محمد صاحب کی تقسیم ہوگئی، اس لئے کم ہوگئی۔ لالہ پرد ہن کمار کے یہاں بھی اب زیادہ تر زمیندارا ہے، ساہوکارا کم رہ گیا ہے۔

شیخ ولی محمد صاحب کے خاندان کا سلسلہ حسب ذیل طریقہ پر پھیلا ہے

ولی محمد صاحب (تجارت ٹھیکہ لکڑی)

حاجی خدا بخش صاحب (تجارت اور زمینداری)

حکیم محمد یوسف صاحب (تجارت زمینداری۔ ٹھیکہ داری۔ تمام شہر کے نمبرداران کے وقت سے برطانیہ کے درباری بنے اور گزیٹیڈ رئیس میں شمار ہوا)

مولوی گل محمد صاحب (تجارت اور زمینداری)
مولوی طاہر محمد صاحب زمیندار، رئیس، ادھیڑ عمر میں کالج جا کر ... ایک صاحبزادی والدہ شیخ غالب رسول صاحب

حافظ طفیل احمد صاحب (رئیس)
شیخ غالب رسول صاحب ایم، ایل، اے میونسپل کمشنر (مسلم روساء میں سب سے بہتر حالت ہے، تجارت کا سلسلہ نہیں ہے)

خان بہادر شیخ سلطان احمد صاحب رئیس آنریری مجسٹریٹ میونسپل کمشنر

شیخ مہربان احمد صاحب (زمیندار) - شیخ نوشیرواں احمد صاحب (رئیس و زمیندار) - شیخ دلشاد احمد صاحب (رئیس و زمیندار) - خان بہادر شیخ قربان احمد صاحب (اٹھارہ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے اب آنریری اسسٹنٹ کلکٹر اور چیرمین پنچ آنریری منصفان)

برادری کے لوگوں میں دس لاکھ اور پچاس لاکھ کے درمیان حیثیت رکھنے والے لوگوں میں شیخ غالب رسول صاحب ہیں جن کی حیثیت تقریباً پندرہ لاکھ ہوگی۔ ایک لاکھ اور دس لاکھ کے درمیان حیثیت شیخ مہربان احمد صاحب، شیخ نوشیرواں احمد صاحب اور حافظ زندہ حسن صاحب کی ہوگی۔ پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان شیخ ذیشان احمد، شیخ عبدالرحیم صاحب، شیخ عبدالعزیز صاحب اور

شیخ عبدالکریم صاحب کی ہوگی۔ اور دس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان بہت سے نکل آئیں گے۔
ہماری برادری میں دتی والوں کا سرمایہ صحرائی میں زیادہ اور سکنائی جائدادیں اس سے کم لگا ہوا ہے فیکٹریوں کارخانوں میں بالکل نہیں ہے، تجارتی کاروبار میں برادری کے ایک فرد جنرل مرچنٹ ہیں اور باقی اکثر لکڑی کا کاروبار کرتے ہیں۔ سرمایہ بلوں کے حصوں اور سرکاری قرضوں میں بالکل نہیں، البتہ آج کل وار بانڈس میں لگا ہوا ہے روپئے کا سودی کاروبار بظاہر نہیں کرتے۔ شاید ایک دو چھپ کر کرتے ہوں گے، عورتوں کے کپڑوں اور زیوروں پر روپیہ بہت لگایا جاتا ہے۔ اور اسی میں یہ قوم برباد ہے۔ نقد روپیہ بھی بعض لوگوں کے پاس ہے۔ ایسے بہت زیادہ ہوں گے، جن کے پاس دو تین ہزار ہوگا۔ اور ایسے بھی بہت سے ہوں گے جن کے پاس دس ہزار ہوگا اور ایک شخص کے پاس بہت زیادہ نقد روپیہ ہے۔ موٹر کار مولوی محمد ایوب صاحب وکیل، شیخ غالب رسول صاحب اور نوشیروان احمد صاحب کے پاس ہے۔ مکان کے ساز و سامان فرنیچر برتن وغیرہ کا شوق زیادہ نہیں ہے۔ مستورات کے کپڑے اور زیوروں پر خرچ زیادہ کیا جاتا ہے کھانے کا خرچ بھی زیادہ ہے۔ عام معاشرت پُرانی ہے۔ چارپائی پر بیٹھتے ہیں، مکان کے ساز و سامان پر صرف ۲ فیصدی خرچ کرتے ہیں، دو ایک کے پاس گھوڑا گاڑی بھی ہے۔ بچوں کی تعلیم پر اب پہلے سے زیادہ خرچ کرنے لگے ہیں، تفریحی مشاغل کچھ نہیں ہیں۔ حافظ زندہ حسن صاحب کے صاحبزادے کو کسرت کا شوق ہے۔ گھر ہی میں کسرت کرتے ہیں، خیر خیرات قریب قریب سب ہی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ نکالتے ہیں، محتاجوں کو پوشیدہ طور پر دیتے ہیں۔ قومی اداروں کو چندہ صرف چند آدمی دیتے ہیں۔ اور یہ خیراتی فنڈ سے نہیں دیا جاتا، برادری کا ایک مدرسہ چل رہا ہے، اس کے لئے بھی چندہ الگ سے دیا جاتا ہے، خیراتی مد سے نہیں دیا جاتا۔ مدرسہ مظاہر العلوم وغیرہ کو بھی چندہ دیا جاتا ہے۔ مسلم لیگ اور ہر کام کرنے والی انجمن کو شیخ مہربان احمد صاحب چندہ دیتے رہتے ہیں۔ شیخ غالب رسول صاحب کے یہاں اس کے لئے ایک علیحدہ وقف موجود ہے۔ مساجد کو بھی چندہ دیا جاتا ہے مہمانداری کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے کاروباری لوگوں کے یہاں مہمان کاروباری سلسلے میں

بھی آتے رہتے ہیں۔ حج کا شوق زیادہ ہے۔ کلیر شریف بھی جاتے ہیں، اگرچہ کچھ لوگ عرس کے دوران میں جانا پسند نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت کے خرچ ابھی بہت زیادہ ہیں لیکن اصلاحی کوششیں ہو رہی ہیں جن کا ذکر انجمن تنظیم القوم کے عنوان کے ماتحت آخر میں کیا گیا ہے، ہر ریاست کے ساتھ ملازم ہیں، دوسرے لوگوں کے یہاں زیادہ نہیں ہیں۔ علاج اب زیادہ تر ڈاکٹری کیا جانے لگا ہے۔ بیماری کے سلسلے میں اور تبدیلی آب و ہوا کے لئے پہاڑ پر جانے کا رواج شروع نہیں ہوا ہے۔ شیخ مہربان علی صاحب کو شکار کا شوق ہے، اور شیخ قربان علی صاحب کو بھی تھا۔ چار پانچ آدمی ایسے بھی ہیں جن کے پاس ایک مختصر سا کتب خانہ ہے، رسائل و اخبار بھی بہت سے لوگ خریدتے رہتے ہیں، تعمیر مساجد کا بھی شوق ہے۔ ولی والوں اور کوچہ ولی والوں کی مسجد تک ولی محمد صاحب نے بنوائی تھیں۔ اسلامیہ اسکول کی مسجد اور اسی طرح اور دوسری مسجدیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، برادری کے لوگوں نے بنوائی ہیں، پیر پرستی زیادہ نہیں ہے۔ لوگ علماء کے معتقد ہیں، کچھ لوگ مولانا اشرف علی صاحب کے مرید ہیں اور کچھ مولانا حسین احمد صاحب کے، لیکن مرید کم اور معتقد زیادہ ہیں۔

برادری کے اعلیٰ طبقہ میں تجارت نہ ہونے کی وجہ سے بظاہر ترقی نہیں ہے لیکن اب لوگ بیدار ہوتے جارہے ہیں اور کسی قدر آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے، جو لوگ تجارت کرتے ہیں ان کی حالت ظاہرا طور پر ترقی کی طرف مائل ہے۔ نیچے کا طبقہ اٹھتا جا رہا ہے، آج جو لوگ تجارت میں متوسط الحال نظر آرہے ہیں، انھوں نے پچھلے بیس سالوں میں ترقی کی ہے، اور دوسرے لوگ بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔ آج کل جنگی مدافعت کے سلسلے میں لکڑی کا مال جا رہا ہے اس سے کچھ نفع کی صورتیں نکل آئی ہیں، اس کے علاوہ کوئی اور نیا کام برادری کے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آرہا ہے۔ لکڑی کی تجارت میں اب ہندو اور پنجابی داخل ہو رہے ہیں، لیکن ابھی تک ان کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ ان کو مال لانے میں ہزاروں روپئے خرچ کرنا پڑتے ہیں، اور برادری کے لوگ صرف زبان کے اعتبار پر مال لے آتے ہیں۔ لیکن خیال یہ ہے کہ اس پندرہ سال میں

یہ لوگ اس تجارت میں ایک چوتھائی ضرور گھس جائیں گے۔ ان لوگوں کو اب اس کام کا ذوق ہو گیا ہے، ہردوار میں ہندوؤں کا دس دس بیس بیس لاکھ کا شہتیر کا کاروبار ہے۔ وہاں جو لوگ واقف ہو گئے ہیں وہی دوسرے لوگوں کو سہارنپور میں بھی سکھاتے ہیں، ابھی تک برادری نے لوگوں کو کاروبار چلانے کے لئے سرمایہ کی امداد کی ضرورت پیش نہیں آئی ہے۔ خود ہی اپنا کام چلاتے رہتے ہیں لیکن انجمن تنظیم القوم کے مقاصد میں کاروبار کا تحفظ کرنا بھی شامل ہے۔ کاروبار میں جتنا روپیہ لگایا جاتا ہے۔ وہ آپس ہی کے لوگوں کا ہوتا ہے۔ بنیوں سے قرض نہیں لیا جاتا۔

ٹمبر کی بڑی تھوک آڑھت دہرہ دون میں ہے، جہاں اس کام کو مسلمان چلا رہے زیادہ کرنے لگے ہیں۔

سہارنپور کی تھوک آڑت شیخ عبد الصمد صاحب کے پاس ہے، جن سے لوگ یہیں آکر مال لے جاتے ہیں، ان کے آدمی باہر نہیں ہیں، کچھ لوگ برادری کے ایسے بھی ہیں جو دلال کا کام کرتے ہیں، اور باہر کے آدمیوں کو مال خریدنے میں امداد دیتے ہیں۔ برادری کے غریب آدمی بھی سوختنی لکڑی باہر سے خرید کر اور شہر میں لاکر فروخت کر کے دو تین روپے پیدا کر لیتے ہیں۔ لکڑی کا بڑا اسٹاک بھی جمع رہتا ہے۔

شیخ عبد العزیز صاحب بڑے اسٹاک رکھنے والے لوگوں میں سے ہیں۔

برادری میں مقروض لوگ نہیں ہیں۔

ایسی مثالیں بہت کم ہیں جن میں جائداد نکل کر بنیوں کے پاس پہنچ گئی ہو۔

چوب فروشان کی اصلاح کے لئے انجمن تنظیم القوم نے حسب ذیل کام انجام دئے ہیں

ا۔ تعلیم :- ناشر العلوم۔ ایک ادارہ قایم کیا جس کے زیر اہتمام ایک مدرسہ کوئی ڈیڑھ سال سے چلایا جا رہا ہے۔ اس میں ابتدا میں تین طالب علم تھے، لیکن اب چالیس ہیں۔ نصاب میں اردو، فارسی اور حفظ کلام مجید تجوید وغیرہ، حساب، عربی کی ابتدائی کتابیں داخل ہیں۔ درجہ بندی نہیں ہے۔ ایک حافظ صاحب ہیں، ایک مولانا ہیں، جو قاری، حافظ اور مولوی

ہیں۔ اس مدرسہ کو شادی بیاہ کے موقع پر برادری کے افراد عطیات دیتے ہیں جس سے مدرسہ کا ایک فنڈ جمع ہو گیا ہے۔ اس مدرسہ کے نصاب کے سلسلے میں تجویز یہ تھی کہ اس میں فی الحال ایک درجہ کلام مجید اور دینیات کا ہوگا۔ ایک اردو حساب کتاب کا اور ایک درجہ صنعت و حرفت کا، لیکن ابھی طلبا کی تعداد کی کمی کی وجہ سے کام پوری طرح شروع نہیں کیا جا سکا۔

۲۔ قبرستان کمیٹی:۔ اس سال سے مجلس شوریٰ اس کو قایم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے

۳۔ تقریب کمیٹی:۔ اس کا پروگرام اصلاح رسوم کے لئے حسب ذیل ہے:۔

موجودہ صورت	مجوزہ اصلاحات
۱۔ منگنی:۔	۱۔ منگنی
کئی خوان مٹھائی کے اور ایک دو زیور دئے جاتے ہیں۔ اور عورتیں اکٹھی ہوتی ہیں	مٹھائی پانچ سیر صرف
۲۔ درمیانی تہواروں کے موقع پر لڑکے والے کی طرف سے مہندی چوڑی جاتی تھی۔	۲۔ درمیانی تہواروں میں لڑکے والے کی طرف سے سب موقوف، البتہ لڑکی والے کی طرف سے پانچ سیر مٹھائی اور پانچ روپیے تک بھیجے جا سکتے ہیں۔
۳۔ تاریخ مقرر کرنے کی مٹھائی جاتی تھی اور لوگ اکٹھا ہوتے تھے۔	۳۔ موقوف۔
۴۔ بری منگیاں جاتی تھیں، اہم جوڑے میوہ وغیرہ ہوتا تھا اور زیورات۔	۴۔ سب موقوف محض سات جوڑے اور زیورات بدستور
۵۔ نکاح گیارہ بجے رات کو ہوتا تھا،	۵۔ اب عصر و مغرب کے درمیان نکاح بھی اور رخصت بھی
۶۔ منڈھے کے بتاشے ہوتے تھے۔	۶۔ موقوف۔
۷۔ چھوہارے پہلے لڑکی والا دیتا تھا۔	۷۔ اب لڑکے والا لڑکی والے کے یہاں جاکر

	تقسیم کرے گا۔
۸۔ صدر کا طباق۔ نکاح کے بعد مٹھائی وغیرہ رکھی جاتی تھی۔	۸۔ موقوف
۹۔ دولھا کے رشتہ داروں کے جوڑے	۹۔ موقوف۔ محض دولھا کا ایک جوڑا۔
۱۰۔ زیورات۔	۱۰۔ بدستور
۱۱۔ برتنوں کی تعداد پہلے کئی سو تک پہنچتی تھی۔	۱۱۔ اب محض ۵۱۔
۱۲۔ پیٹے کا خرچ لڑکے والا لڑکی کے کمینوں کو دیتا تھا۔	۱۲۔ کو نجڑے اور بھٹیارے کو دونوں نصف نصف دیں گے۔ باقی خرچ کمینوں کا فریقین خود اپنے اپنوں کو دیں گے۔
۱۳۔ بکھیر۔	۱۳۔ موقوف۔ اس کی بجائے فقرا کو دیا جائے
۱۴۔ کھانا رخصت کا ایک لڑکی والے کے ذمہ ہوتا تھا۔	۱۴۔ یہ لازمی کر دیا گیا۔ کل برادری کو دیا جائے چاہے زیورات اور دوسری چیزیں موقوف کر دی جائیں۔
۱۵۔ ولیمہ۔	۱۵۔ یہ بھی لازمی کر دیا گیا۔ تمام برادری کا
۱۶۔ مکلاوا۔	۱۶۔ موقوف۔

انجمن تنظیم القوم کے اغراض و مقاصد حسب ذیل مقرر کئے گئے تھے:۔

(۱) ان سرات کا جو کہ شہر سہارنپور میں اہل برادری سے ہیں، ایک رجسٹر مردم شماری مرتب کرنا، و نیز پیدایش و اموات کا اس میں اندراج۔

(۲) اپنی قوم کے شجرہ نسب کی تحقیق کرنا۔ اور مہیا ہو جانے پر طبع کرا کر اس کا ریکارڈ محفوظ

(۳) اپنی قوم میں غیر قوم کے ازدواجی تعلقات اور میل کے خلاف اس کو مذموم حرکت سمجھ کر

ہر ممکن جد و جہد کرنا۔

(۴) برادری کی اشیا منقولہ وغیر منقولہ کی حفاظت اور نگہداشت کرنا۔

(۵) برادری کے قبرستان کی صفائی وغیرہ کا معقول انتظام کرنا۔

(۶) سابقہ کاغذات و رجسٹران متعلقہ قوم و قومی روپیہ کی وصول یابی اور اس کا حساب۔

(۷) قومی غربا، یتامیٰ و بیواؤں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی امداد و نگہداشت کرنا۔

(۸) شرعی نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مروجہ رسومات قبیحہ و منکرات کی برادری میں سے بیخ کنی کرنا۔

(۹) برادری میں باہمی نفاق و خلفشار کو دور کرنے اور اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش اور نیز برادری کے کسی فرد کی خوشی اور غمی میں کثیر تعداد میں شرکت کرنا۔

(۱۰) کسی امر کی اطلاع کے لئے کوئی اشتہار دینا۔ سالانہ یا کسی عرصہ کی روئداد شایع کرانا اور وقت آنے پر حسب استطاعت کسی قومی رسالہ کا اجرا، اور اس کے کاموں کو فی الحال شہر سہارنپور تک محدود رکھنا۔

ہم نے چوب فروشوں کی برادری کی انجمن تنظیم القوم کے حالات کو بیان کرنے میں قصداً غیر ضروری طوالت سے کام لیا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ خود برادری کے اندر جو اصلاحی تحریکیں اٹھ رہی ہیں ان کی نوعیت اور اہمیت کو نمایاں کیا جائے۔ اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے۔ اس انجمن کی متذکرہ بالا سالانہ روئداد کو چھبیس ۲۶ صفحوں میں شایع کیا گیا ہے لیکن اس کا تقریباً نصف سے زیادہ حصہ اس جھگڑے کے تذکرے کے لئے وقف کر دیا گیا ہے، جو برادری کے ایک فرد کے اس قصور سے پیدا ہوا تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کی شادی غیر کفو میں کر دی تھی۔ برادری کے کچھ ممتاز لوگ چونکہ ان صاحب کے حمایتی بن گئے تھے اس لئے اس معاملے نے فرقہ بندی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قصور وار صاحب اور ان کے حمایتیوں کو انجمن تنظیم القوم سے باوجود اس کے کہ انھیں اس کے دوسرے مقاصد سے ہمدردی اور دلچسپی معلوم ہوتی تھی، علیحدہ رہنا پڑا۔ اس سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برادری کی اصلاحی کوششوں میں کن چیزوں کی کتنی اہمیت کیا ہے۔

ترکی جمہوریت کی اصلاح و ترقی کے تئیس سال

سرزمین ترکی کی یہ ایک بڑی بدنصیبی ہے کہ اس ملک میں سیاحت کے لئے جو غیر ملکی آتے ہیں وہ جب یہاں سے لوٹتے ہیں اور واپسی پر اپنے ہم وطنوں کو ترکی کے چشم دید حالات سناتے ہیں تو ان کے بیان کرنے میں توازن اور بے تعصبی کو قایم نہیں رکھ سکتے۔ ترکی کی مبالغہ آمیز تعریف اور مذمت کا یہ سلسلہ گلیڈ اسٹن اور ڈزرئیلی کے زمانے سے چل رہا ہے، جو کام اپنے وقت میں یہ دونوں سیاسی حریف انجام دیا کرتے تھے اب وہی کام ایسی کتابیں، مقالے اور دیگر تصنیفیں انجام دے رہی ہیں جن کی بیشتر تعداد کھلے طور پر موافقت یا مخالفت کرنے کے لئے شایع کی جاتی ہے جنگِ عظیم اوّل اور جنگِ عظیم ثانی کے درمیانی سالوں میں ترکی کے مداحوں کو غلبہ حاصل رہا اور کمالی انقلاب کی کارگذاریوں کی اتنی مدح سرائی کی گئی کہ وہ مضحکہ خیز بن گئی۔ چنانچہ ترکی کی تعریف میں یہ کہا گیا کہ وہ ایک لبرل جمہوری اور صنعتی ملک بن گیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اس کی وہی حیثیت ہوگئی ہے جو شمالی یورپ میں سوئڈن اور ناروے کی ہے۔ دوسری طرف کچھ ایسی تصنیفیں بھی شایع ہوتی رہیں جن میں کہا گیا کہ ترکی نے ظاہری لباس تو ضرور تبدیل کرلیا ہے لیکن باطن میں نئی جمہوریت کی قبا کے نیچے ترکی کی درندگی بددیانتی اور نااہلیت، اپنے محکوم علاقوں اور قوموں پر حکومت کے معاملے میں بالکل ویسی ہی ہے جیسی مرکزی ایشیا کے کسی خانہ بدوش قبیلے سے توقع کی جاسکتی ہے۔ پچھلے چند مہینوں سے ان دونوں متضاد تصویروں میں کچھ سیاسی رنگ آمیزی بھی نظر آنے لگی ہے۔ اب اگر ایک طرف ترکی کو ایک بہادر آزادی پسند چھوٹی سی جمہوریت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو اپنے زبردست، ہمہ گیر شُروسی یعنی بالشوک روس کی ناواجب مداخلتوں کے مقابلے پر ڈٹی

ہوئی ہے تو دوسری طرف اُسے فاشستی ڈکٹیٹر شپ سے بھی نامزد کیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تو نازی جرمنی کی پوشیدہ طور پر حلیف رہ چکی ہے۔ مملکت متحدہ روس کے خلاف جو سازشیں گوئبلز اور ربن ٹراپ کر رہے تھے، ان کی تمام روایات اور طریقہ کار کا سارا ترکہ تو اسی ترکی کو ملا ہے۔

یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ سب تصویریں یکساں طور پر غلط اور تعصب پر مبنی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت ترکی نے سماجی اور معاشی اصلاح کے سلسلے میں بڑا زبردست کام کیا ہے لیکن پھر بھی ترکی کی ترقی ابھی اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکی ہے کہ اُسے مشرق کے سوئڈن کا نام دیا جاسکے۔ نہ اسی طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ ترکی میں چنگیزی حکومت نئے انتظام کے ساتھ چلائی جا رہی ہے، ترکی میں پارلیمانی ڈماکریسی اس مفہوم کے ساتھ جو مغربی یورپ میں اس کا سمجھا جاتا ہے موجود نہیں ہے اگرچہ اب کچھ دنوں سے مغربی یورپ میں بھی ڈماکریسی کی تعریف کرنا بہت دشوار کام ہوگیا ہے۔ ذیل میں ترکی میں جو صورتِ حال واقعی ہے اسے بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور اس میں ترکی کے خارجی تعلقات کے مسائل سے جن کی وجہ سے بہت سے مشاہدہ کرنے والوں کی رائے پر اثر پڑتا ہے کوئی سروکار نہیں رکھا جائے گا۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے اختیار کر کے ترکی کے جمہوری دورِ حکومت کے تیئیس سالہ وجود کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا معقول طریقہ پر جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

ترکی کی جمہوریت جب ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو قایم ہوئی تو ملک کی حالت بہت افسوسناک تھی۔ اس کی معاشی اور سیاسی زندگی دس سال سے زاید کی جنگ، خانہ جنگی، غیر ملکی قبضہ اور انقلاب کی وجہ سے مکمل طور پر درہم اور برہم ہو چکی تھی، ترکی میں تباہی اور افلاس کا دور دورہ تھا، محنت کرنے والے مردوں کی کمی تھی، وسائل دولت منتشر ہو گئے تھے۔ جو تھوڑی بہت صنعت و تجارت باقی تھی وہ تقریباً تمام کی تمام غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی، سماجی اور تمدنی سطح بڑی حد تک وہ ہو گئی تھی جو عہدِ وسطیٰ میں مطلق العنان حکمرانوں کے دور میں پائی جاتی تھی۔

۱۹۲۳ء سے ۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء تک جب مصطفےٰ کمال اتاترک کی موت واقع ہوئی، ملک کی رہنمائی ان ہی کے مضبوط ہاتھوں میں رہی، کیونکہ یہی انقلاب کے بانی اور جمہوریت کے صدر اوّل تھے۔ جس طریقہ حکومت کو انھوں نے قایم کیا اس کی ظاہری شکل تو جمہوریت کی سی تھی لیکن عملاً اس میں مطلق العنانی پائی جاتی تھی۔ اس بات پر اکثر مشاہدہ کرنے والوں کا اتفاق ہے کہ شروع کے اس زمانے میں اس طریقہ حکومت کے علاوہ ملک میں کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہی نہیں تھا۔ ان سالوں میں اصلاح کی نہایت زبردست کوششیں کی گئیں۔ عورتوں کی آزادی (یعنی پردے اور تعدد ازدواج کا خاتمہ، اور عورتوں کا بہت سے پیشوں اور ملازمتوں میں داخلہ) سرکاری اور تمدنی زندگی میں دین کی جگہ دنیا کا غلبہ واستیلا، رومن رسم خط کا رواج، حکومت کے انتظام میں قومی بنک کاری اور قومی صنعت کی ترقی۔ یہ چند وہ کارنامے ہیں جن کا سہرا کمالی دورِ حکومت کے سر ہے۔ اتاترک کی قایم کی ہوئی بنیادوں کے مضبوط ہونے کا سب سے بڑا ثبوت شاید یہ ہے کہ اتاترک کے انتقال کے بعد بھی جمہوریت کو قایم رکھا جا سکا اور ملک میں وہ بدنظمی اور انتشار رونما نہیں ہوا جو ایک طاقتور آدمی کے مرنے کے بعد عام طور پر ہوتا ہے۔ اتاترک کے بعد عصمت انونو کو جمہوریت کا صدر بنایا گیا اور یہ ابھی تک اس عہدے پر فائز ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت کی اس تبدیلی سے کوئی فوری تبدیلی نہیں ہوئی لیکن پھر بھی کئی سال گذر جانے کے بعد اب ان باتوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جن میں عصمت انونو کی پالیسی مصطفےٰ کمال سے مختلف رہی

پچاس لاکھ آدمی بے زمین ہیں

ترکی میں ابھی تک زراعت کے پیشے کو غلبہ حاصل ہے۔ ترکی کی حکومت کی طرف سے جو اعداد شایع کئے گئے ہیں ان کے مطابق تقریباً اسی فی صدی آبادی کا ذریعہ معاش زراعت ہی ہے۔ ملکیت آراضی کا انتظام کئی طرح کا ہے، اور ایک پٹہ دار کے قبضہ میں جو رقبہ ہوتا ہے وہ اکثر ایسے قطعات پر مشتمل ہوتا ہے جسے وہ مختلف مالکوں (مثلاً سرکار، مذہبی ادارے، میونسپلٹی گاؤں یا زمیندار) سے پٹہ کی مختلف شرطوں پر حاصل کرتا ہے ترکی میں چونکہ اعداد و شمار اور دستاویزات بہت کم ہیں اس لئے آج وہاں جو صحیح صورت حال ہے

اسے بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن ترکی ماخذوں سے جو حسب ذیل اعداد لئے گئے ہیں انھیں خاصا قابلِ اعتماد سمجھا جاسکتا ہے۔ ترکی کے مزرعوں کو تین عنوانوں کے ماتحت رکھا جاسکتا ہے:۔

(الف) چھوٹے مالکوں کے مزرعے:۔ یہ ایک سو پچیس ایکڑ تک کے ہوتے ہیں۔ ان کا اوسط رقبہ چالیس ایکڑ سمجھنا چاہئے لیکن ملک کے بعض حصوں میں یہ پانچ ایکڑ تک کے بھی ہیں۔ چھوٹے مالکوں کے یہ مزرعے کل تعداد کا ستانوے فی صدی ہیں۔

(ب) درمیانی مزرعے:۔ یہ ایک سو پچیس سے ایک ہزار دو سو پچیس ایکڑ تک کے ہوتے ہیں۔ ان کی کل تعداد پانچ ہزار سات سو ہے۔ اور یہ کل کا صرف ۲،۳ فی صدی ہیں۔

(ج) بڑے مزرعے:۔ یہ وہ مزرعے ہیں جن کا اوسط رقبہ پونے چار ہزار ایکڑ ہے اور یہ پانچ لاکھ ایکڑ پر مشتمل ہیں۔ ان مزرعوں کے مالک عام طور پر گاؤں میں نہیں رہتے۔ یہ یا تو اپنے کارندوں اور اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں سے اپنا کام کراتے ہیں یا پھر اپنی زمینوں کو چھوٹے رقبوں میں بانٹ دیتے ہیں اور پھر کسان ان کی جتائی بٹائی پر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مؤخرالذکر طریقہ بہت عام ہے۔

ان تین خاص عنوانوں کے علاوہ مذہبی اور سرکاری زمینیں بھی ہیں اور یہ بھی عام طور پر بٹائی پر کسانوں سے کاشت کرائی جاتی ہیں اور کچھ سرکاری مزرعے بھی ہیں۔ یہ عام طور پر یا تو سائنٹفک طریقے کے فارم ہیں یا نمونے کے فارم یا زراعتی اسٹیشن، یا پودوں کے انتخاب کے اسٹیشن وغیرہ۔

ترکی کی کاشت کا عام معیار بہت پست ہے ترکی کے کسانوں کا ایک بڑا حصہ بے زمین ہے۔ چھوٹے مقبوضہ قطعات اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ ان کے قابض چاہے وہ مالک ہوں یا پٹہ دار وہ مجبور ہوتے ہیں کہ روزی کے کم ترین وسائل فراہم کرنے کے لئے پڑوسی کے کسی بڑے زمیندار کے یہاں جاکر کام کریں یا پاس کے شہر میں کبھی کبھی فیکٹری کا کام کریں۔ ترکی کی حکومت کی طرف سے حال میں جو اعداد شائع ہوئے ہیں ان میں کسانوں کے بے زمین خاندانوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سات سو دی گئی ہے۔ ان میں آٹھ لاکھ بہتر ہزار ان خاندانوں کو بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے

جن کی مقبوضہ زمین اتنی کم ہے کہ وہ شخص اس کی آمدنی پر گذر نہیں کرسکتے۔ ان دونوں کی مجموعی تعداد ملا کر پچاس لاکھ ہوتی ہے یعنی ترکی کی مجموعی دیہی آبادی کا تقریباً ایک تہائی۔

حکومت کی طرف سے اگرچہ بہت سی کوششیں کی گئی ہیں لیکن پھر بھی ترکی کی زراعت کے فنی طریقے ابھی تک بہت ابتدائی ہیں اور گاؤں میں سماجی اور حفظانِ صحت کی سہولتوں کا تو قطعی فقدان ہے۔ اس کے اسباب یہ ہیں کہ رقبہ وسیع ہے۔ ذرائع نقل وحمل خراب ہیں اور ملک کی آبادی ضرورت سے کم ہے۔ محاصل کا بوجھ بھی ترکی کسان کی کمر پر بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک طویل زمانے سے اس بات کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ ترکی کے دیہاتوں میں جدید طریقے رائج کئے جائیں۔ ترقی کی رفتار اگرچہ سست ہے لیکن پھر بھی ترقی کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اصلاحِ زمین کا قانون

زراعت کے میدان میں سب سے زیادہ انقلابی قدم اصلاحِ زمین کا قانون ہے۔ اس کے سودے کو طویل بحث ومباحثہ کے بعد ترکی پارلیمنٹ نے منظور کرلیا اور ۱۱ر جون ۱۹۴۵ء کو یہ قانون بن گیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ترکی کی سرزمین کو آزاد چھوٹے زمینداروں کا مسکن بنا دیا جائے اس میں تجویز کی گئی ہے کہ زمین کسانوں کسان خاندانوں کو عطا کی جائے جن کے پاس اب بالکل نہیں ہے یا بہت کم ہے اور ان نئے زمینداروں کو بے سود کا قرض اس غرض سے دیا جائے کہ وہ اصل کو ترقی دے سکیں اور سامان اور مویشی وغیرہ کو فراہم کرسکیں۔

توقع یہ کی جاتی ہے کہ اس اسکیم کے ماتحت ۵۰ لاکھ آدمیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس سے ملک کا مزروعہ رقبہ بڑھ جائے گا، کارکردگی اور پیداوار میں اضافہ ہوگا اور زندگی کا معیار بلند ہوجائے گا۔

اس کام کے لئے سرکاری غیر مستعملہ اور مذہبی اداروں کی زمین، گاؤں کی ناپید زمین میونسپلٹیوں کی زمین نامعلوم مالکوں کی زمین، بازیافت زمین اور نجی معزز و دسے حاصل کی ہوئی زمینیں استعمال کی جائیں گی۔ ان زمینوں سے پرانے مالکوں کو لازمی طور پر بے دخل کردیا جائے گا۔ جن زمینداروں کی ملکیت ساقط کی جائے گی انہیں مجموعی رقبہ کے مطابق گھٹنے اور بڑھنے والی شرح سے معاوضہ ادا

کیا جائے گا اور یہ معاوضہ چار فی صدی کے سرکاری تمسکات کی صورت میں دیا جائے گا جنھیں بیس سالانہ قسطوں میں جاری کیا جائے گا۔ جن لوگوں کو اس قانون سے فائدہ پہنچے گا وہ علی الترتیب حسب ذیل ہوں گے:۔

(۱) پٹہ دار اور بٹائی پر کاشت کرنے والے جو اس وقت زمین کے مالک نہیں ہیں۔

(۲) ایسے چھوٹے قابضان آراضی جن کے پاس ناکافی زمین ہے۔

(۳) پرانے زراعتی مزدور جن کے پاس زمین نہیں ہے۔

(۴) خانہ بدوش اور راجع بہ وطن مہاجر۔

(۵) زراعتی مدرسوں کے گریجویٹ جن کے پاس یا تو زمین نہیں ہے یا کم ہے۔

(۶) وہ دوسرے آدمی جنھیں زراعت کی وزارت موزوں سمجھے۔

فائدہ اٹھانے والے سب آدمیوں کے لئے تُرک ہونا اور سب کا خود کاشت کرنا لازمی ہوگا

اس تجویز پر پارلیمنٹ اور پریس میں خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ بائیں بازو نے کہا کہ یہ نازی اصولوں پر مبنی ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی پیداوار کم ہو جائے گی۔ دائیں بازو نے اس کی مخالفت یہ کہہ کر کی کہ اس میں کمیونزم کا رنگ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر اس قانون پر حسب منشا عمل درآمد کیا گیا تو اس کی وجہ سے ترکی میں بڑا زبردست انقلاب رونما ہو جائے گا۔ اس کی کامیابی کا انحصار حسب ذیل باتوں پر ہوگا۔ اول تو خود کسانوں کے جوابی عمل اور تاثر پر، دوسرے اس ایمانداری اور مستعدی پر جس کے ساتھ سرکاری ذمہ دار افسر اپنے اس عظیم الشان فریضہ کو انجام دیں گے، اور تیسرے ان ذرائع نقل و حمل نیز طریق فروخت کے انتظامات وغیرہ کی فراہمی پر جن کے بغیر ترکی کی زراعتی ترقی کی تمام اسکیمیں لازماً ناکام ثابت ہوں گی۔

تجارت اور صنعت

تجارت اور صنعت کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ دونوں مشترکہ طور پر دس فی صدی سے زاید آبادی کے لئے ذریعہ معاش فراہم کرتی

انقلاب کے وقت صنعت کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا اور تجارت تقریباً تمام یا تو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی یا غیر ترکی دیسی اقلیتوں کے ہاتھ میں۔ تمام ماہر مزدور، محققین اور کاروباری آدمیوں کا تعلق بھی انہی طبقوں سے تھا۔

۱۹۲۳ء کے بعد سے ترکی کی حکومت نے صنعتی ترقی میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے مختلف بنکوں کے ذریعہ اور حکومت کی نگرانی میں ڈائرکٹریٹ قایم کر کے اس نے ایک پروگرام شروع کیا جس میں ریلوں کی تعمیر، سوتی کپڑوں کی صنعت کی ترقی اور لوہے اور فولاد کا کارخانہ جسے ستمبر ۱۹۳۹ء میں کارابک میں قایم کیا گیا شامل تھے۔ اس کے علاوہ دوسری صنعتوں (مثلاً کاغذ، گتّے، سیلولوس مصنوعی ریشم وغیرہ) کو بھی ترقی دی جارہی ہے اور نجی انتظام میں چلنے والے کارخانوں کا بھی آغاز ہو گیا ہے ترکی کی تجارت میں اقلیتوں کا حصّہ ابھی تک زیادہ ہے لیکن اسے آہستہ آہستہ ایک طرف تو سرکاری شاخوں کو قایم کر کے اور دوسرے امتیازی قوانین بنا کر کم کیا جارہا ہے۔

ترکی کی معاشی زندگی پر جنگ کا اثر بہت نقصان رساں ثابت ہوا ہے۔ ملک کے وسائل کو کئی سال تک جنگ کی تیاری کے لئے وقف کئے رہنے اور جنگ کے زمانے کے تجارتی حالات اور تجارت خارجہ کی پالیسی میں دورخہ حساب کے نظام کا جس پر ترکی عملدرآمد کرتی رہی ہے نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک کی معیشت میں سخت ابتری رونما ہو گئی ہے قیمتیں ایسی بلندی پر پرواز کر رہی ہیں جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک طرف ترکی کی برآمد میں رکاوٹ پیدا ہوئی دوسری طرف ملک کے اندر افراطِ زر کی وجہ سے پیچیدہ معاشی اور سماجی مسئلے پیدا ہو گئے ہیں۔ راشننگ اور نگرانی قیمت کے جو طریقے جاری کئے گئے وہ بہت محدود رہے ہیں اور اکثر بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ ترکی کی حکومت اب افراطِ زر کے مسئلے کو حل کرنے اور ترکی کی قیمتوں کو دنیا کی منڈیوں کی قیمتوں کے برابر کرنے کی ایک اور کوشش کر رہی ہے۔ اگر اس میں اسے کامیابی ہوئی تو اس سے اس چور بازار، رشوت ستانی اور بے اطمنانی میں بہت کمی ہو جائے گی جس نے جنگ کے سالوں میں جمہوریت کی اندرونی صحت مندی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

سیاسی منظر

ترکی جمہوریت کے جس دستور کو مصطفےٰ کمال نے قایم کیا تھا وہ پارلیمانی اور ڈیماکریٹک طرز کا تھا اور اس میں ایک منتخب شدہ مقننہ اور عام جمہوری سہولتوں کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن عملی طور پر ترکی ایک ہی سیاسی جماعت کی آمرانہ حکومت تھی اور اس میں صرف ایک سرکاری "جمہوری عوام کی جماعت" کو کام کرنے کی اجازت تھی ہمیں مصطفےٰ کمال اتاترک کے ارادوں کے جمہوری ہونے میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے کئی مرتبہ مخالف پارٹی کو آزادی سے کام کرنے کی اجازت دینے کی کوشش کی لیکن ملک کی جیسی پس ماندہ اور غیر مستحکم حالت تھی اس میں یہ چیز چل نہیں سکی اور ۱۹۳۰ء میں مصطفےٰ کمال اتاترک نے ایک دستوری مخالف جماعت کو پیدا کرنے کی کوشش کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد سے ڈیماکریسی سے بالواسطہ اور تدریجی لگاؤ رہا۔ کتابوں اور رسالوں کو آزادئ رائے کی بہت خاصی اجازت حاصل رہی لیکن روزانہ اخباروں پر وزارت داخلہ کے محکمہ تحفظ کی سخت نگرانی رکھی گئی۔ "جمہوری عوام کی جماعت" کے اندر ایک مختصر مخالف جماعت کو سرکاری سرپرستی میں سیفٹی والو کے طریقے پر پیدا کیا گیا اور اسے پارلیمنٹ میں ایک مقررہ تعداد حاصل کرنے کی اجازت دی گئی جو تیس تک پہنچ گئی۔ انتخابات میں صرف سرکاری امیدواروں کو کھڑے ہونے کی اجازت دی جاتی تھی لیکن بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ سرکاری امیدواروں کی تعداد نشستوں سے زیادہ رکھی جاتی تھی اور اس طرح انتخاب کنندگان کو سیاسی انتخاب کا تو نہیں لیکن شخصی انتخاب کا موقع مل جاتا تھا۔ "جمہوری عوام کی جماعت" کے دونوں بازوؤں اور پارلیمنٹ کی کارروائیاں راز میں رکھی جاتی تھیں کسی منظم سیاسی جماعت کی اجازت نہیں تھی اور آزادئ خیال کی جو محدود اجازت تھی اسے بھی اس حد تک نہ بڑھنے دیا جاتا تھا کہ وہ نظام حکومت کے لئے ایک خطرہ بن جائے۔ مثال کے طور پر مارکسیت اور لینینی لٹریچر چھاپنے اور فروخت کرنے کی اجازت تھی لیکن کمیونسٹوں کو گروہ بندی کی ممانعت تھی۔ اس نظام حکومت کی تائید میں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ سیاسی مخالفوں پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاتا تھا نہ ان کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ فسادی پڑھے لکھے لوگوں کو وسطی یا مشرقی اناطولیہ کے ویران

اور غیر دلچسپ علاقوں میں منتقل کر دیا جاتا تھا یا انھیں غیر ملکوں کو روانہ کر دیا جاتا تھا لیکن اس سے زیادہ سختی بہت کم کی جاتی تھی لیکن کمالی دور کی نہایت اہم خصوصیت شاید یہ تھی کہ حقیقتاً اس کی کوئی واقعی مخالفت تھی ہی نہیں، جب قدیم رجعت پسندوں کو جن کا واحد مقصد سلطنت عثمانیہ اور خلافت کو دوبارہ قایم کرنا تھا ختم کر دیا گیا تو کمال پسندوں کے مقابلہ میں کوئی ایسی حریف منظم جماعت باقی ہی نہیں رہی جو اس قسم کی پوشیدہ مخالفت کرتی جیسی کہ مستبد حکومتوں کے خلاف کی جاتی ہے اس اقلیت کے علاوہ جو سلطان کو دوبارہ تخت خلافت پر بحال کرنا چاہتی تھی اور جس کی تعداد تیزی سے گھٹتی جا رہی تھی۔ اس بات کو ماننا پڑے گا کہ ترکوں کی وہ غالب اکثریت جو کچھ سیاسی فکر و شعور رکھتی تھی، کمالی دور حکومت کی پالیسیوں اور طریقوں سے بڑی حد تک مطمئن تھی۔

مصطفےٰ کمال آتاترک کی جگہ جب انونو نے لی تو اس کی وجہ سے کوئی فوری تبدیلی رونما نہیں ہوئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جنگ کے آغاز کے بعد جب ہنگامی صورت حال رونما ہوئی تو اس میں حکومت کی مطلق العنان خصوصیات اور زیادہ بڑھ گئیں۔

لیکن تقریباً ۱۹۴۲ء کے بعد سے پالیسی میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ اس وقت سے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، ترکی آزادی اور ڈیماکریسی کی طرف زیادہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اس میلان کو متعدد راہوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غالباً ان میں سب سے زیادہ نمایاں روزانہ اخباروں کی اظہار خیال کی آزادی ہے۔ ترکی اخبارات میں اب رائے کے اختلاف میں ایسی وسعت پیدا ہو گئی ہے جیسی پہلے کبھی نہیں تھی۔ اب یہ حکومت پر تنقید کر سکتی ہے اور کرتی ہے اور بعض موقعوں پر اس نے حکومت سے استعفےٰ کا بھی مطالبہ کیا ہے (اس کا ایک دلچسپ خسانہ اعتراضوں کی اس بوچھار کو بھی سمجھنا چاہئے جو حال کے مہینوں میں اخباروں کی آزادی کی کمی کے خلاف جاری ہے) پارلیمنٹ کی کارروائیوں کی رپورٹ اب اخباروں میں چھپنے لگی ہے اور اب منتخب شدہ نمائندوں کو حکومت کے اراکین اور ان کی پالیسیوں پر اعتراض کرنے کی خاصی آزادی حاصل ہو گئی ہے ۔ ۱۹۴۵ء کے موسم خزاں میں استنبول یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے جو ترکی کے ایک ممتاز ادیب بھی ہیں۔ ترکی حکومت کی پالیسی کی پرزور

مذمت اولاً تمدنی معاملات میں اور ثانیاً وسیع تر معاملات میں کی۔ اس تنقید کا لب و لہجہ اتنا سخت تھا جتنا بہت عرصے سے نہیں سنا گیا تھا اور اس کی اہمیت اس لئے زیادہ تھی کہ تنقید کرنے والا شخص ایک ممتاز اور وقیع حیثیت کا مالک تھا۔ پروفیسر کا "جمہوری عوامی جماعت" سے اخراج کر دیا گیا اور اس بات کے لئے یہ عذر پیش کیا گیا جو نامعقول نہیں تھا کہ ان کے خیالات ایسے ہیں جو کنیت کے منافی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو کسی طرح نشانہ ظلم نہیں بنایا گیا اور نہ ان کی تحریروں اور تقریروں کو ضبط کیا گیا۔

اس بات سے یہ مبالغہ آمیز نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ ترکی میں اظہار رائے کی پوری آزادی ہے۔ اخباروں کو اب بھی وقتاً فوقتاً معطل کر دیا جاتا ہے اور ناگوار باتوں کو شایع کرنے کی پاداش میں ایڈیٹروں پر جرمانے کئے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ داخلی آزادی کی طرف ایک میلان پایا جاتا ہے اور اس جانب خاصی ترقی کی جا چکی ہے۔

ترکی میں کمیونسٹ فاشسٹ اور لبرل

زمانے کے نئے رجحان کی ایک اور نشانی یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ایک اصلی مخالف جماعت بلکہ متعدد مخالف جماعتیں بن رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کمیونسٹ ہے یا کمیونسٹ کے قریب بائیں خیال کی جماعت ہے۔ ظاہر ہے یہ ابھی تک نیا سی جماعت تو نہیں بن کی ہے لیکن ایک مکتب خیال کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے پیرو تعلیم یافتہ حلقوں اور طالب علموں میں ملتے ہیں۔ ان میں صباح الدین علی جو ترکی کا بہترین ناول نویس اور افسانہ نگار ہے اور ناظم حکمت ایک ممتاز شاعر جس کا نوجوانوں پر بہت اثر ہے خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ روزانہ اخبار "تان" اسی مسلک کی ترجمانی کرتا ہے۔

کمیونسٹ اگر ایک انتہا پر ہیں تو ان کے بالمقابل دوسری انتہا پر اتحاد تورانیاں کی حامی جماعت ہے۔ یہ ایک نسلی فاشسٹ جماعت ہے جو نہایت انتہا پسند قومیت کی حامی ہے اور اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ یورپ سے چینی ترکستان تک ایک ترکی کنفیڈریشن قایم کر دی جائے۔ اس تحریک میں بھی زیادہ تر طلبہ اور اساتذہ ہی شامل ہیں اور فوج اور سرکاری عہدہ داروں میں بھی اس کے کچھ پیرو ملتے

۱۹۴۴ء کے آخری حصے میں حکومت نے اتحاد تورانیاں کی تحریک کو اہمیت دینا شروع کر دی اور تینس آدمیوں پر جن میں اس تحریک کے رہنما بھی شامل تھے، ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اسی زمانے میں کمیونسٹ کے خلاف بھی کارروائی کی گئی

تعلیم یافتہ ترکی نوجوانوں میں اتحاد تورانیاں اور کمیونسٹ تحریک کی ترقی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اب خالص قومیت کا پروگرام سیاسی طور پر باشعور نئی نسل کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں رہا ہے، کیونکہ روایتی قومیت کے جتنے مقاصد ہو سکتے ہیں وہ ترکی میں حاصل کئے جا چکے ہیں۔ شاید موجودہ ترکی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ نئی نسل کے سیاسی خیالات کی سمت کیا ہوگی۔

ان دو انتہا پسند فرقوں کے علاوہ جن کی ترقی ابھی تک بہت محدود ہے۔ لبرل، ڈیماکریٹک مخالفت کی ترقی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ تحریک متوسط عمر کی اس نسل میں پائی جاتی ہے جس کی تعلیم مغربی خیالات اور اداروں کے اثر کے ماتحت ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ سے اس قسم کی افواہ گرم تھی کہ ایک نئی جماعت تعمیر کی جانے والی ہے اور اس سلسلے جلال بایار سابق وزیر اعظم اور استوراس سابق وزیر خارجہ اور لندن کے سفیر کے نام پیش کئے جاتے تھے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں بایار کی رہنمائی میں ایک ڈیماکریٹک پارٹی" کے قیام کا اعلان کیا گیا اور ترکی میں صرف ایک سیاسی جماعت کی حکومت ختم ہو گئی۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ابھی اس بات کا اندازہ کرنا بہت قبل از وقت ہے کہ دو جماعتوں کا یہ : . ترکی میں کس طرح کام کرے گا۔

قومی اقلیتیں سیاسی منظر سے نگاہ ہٹانے سے پہلے ایک اور سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے یعنی اقلیتوں کا مسئلہ کیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب غیر ترکی علاقہ حوالہ کر دئے گئے تو ترکی قریب قریب ایک جنس مملکت ہو گئی تھی لیکن پھر بھی کچھ اقلیتیں ترکی میں باقی رہ گئی ہیں اور انھیں دو عنوانوں کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے اول تو کرد ہیں۔ یہ سنی : . اور نیم خانہ بدوش آبادی ہیں جن کی تعداد بیس لاکھ کے قریب ہے اور یہ اناطولیہ کے جنوب مشرقی صوبوں میں آباد ہیں۔ ترکی کی پالیسی ان کے ساتھ یہ رہی ہے کہ ان کو ترک بنا لیا جائے لیکن اس کوشش میں ابھی تک انھیں کامیابی

نہیں ہوئی ہے۔ کُردوں کی بغاوتیں سنہ ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۹ء اور سنہ ۱۹۳۶ء میں دبائی گئیں اور بہت سالوں سے مشرقی اضلاع فوجی انتظام کے ماتحت ہیں اور انھیں سرحد کی طرف سے بھی خطرہ لگا ہوا ہے۔ سرحد کے پار ایرانی کُردستان کا جو رقبہ روسیوں کے قبضہ میں ہے وہاں کُردوں کے قومی رجحانات کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جس کے اثرات ترکی کے کُردوں تک بھی ضرور پہنچیں گے اور مستقبل قریب میں ہوسکتا ہے کہ اس سے اقلیت کا ایک پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو جائے۔

دوسرے عنوان کے ماتحت ۳ لاکھ یونانیوں ۸۰ ہزار یہودیوں اور پچاس ہزار آرمینوں کو رکھا جاسکتا ہے۔ ان میں سے اکثر استنبول اور دوسرے بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔

ترکی جمہوریت کا رویہ ان اقلیتوں کی طرف بصورت مجموعی اچھا رہا ہے۔ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء میں صرف ایک مرتبہ مشرقی تھریس میں یہودیوں کے خلاف فساد ہوا تھا جسے مصطفیٰ کمال نے بہت تیزی اور قوت کے ساتھ دبا دیا تھا۔

اتاترک کے انتقال کے بعد سے اقلیتوں کے ساتھ ترکوں کے رویہ میں کچھ خرابی رونما ہوگئی ہے۔ نظری طور پر تو تمام اقلیتیں قانون کی نگاہ میں مساوی ہیں لیکن عملاً غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ مثلاً فوجی عہدوں سے انھیں تقریباً محروم کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اکثر سرکاری عہدے ان کو نہیں دئے جاتے۔ غالباً نسلی اور مذہبی تعصب کی بدترین مثال نومبر سنہ ۱۹۴۲ء کے محصول سرمایہ کو سمجھنا چاہئے جب کہ یونانیوں، یہودیوں اور آرمینیوں کی جائداد پر غیر منصفانہ محاصل تشخیص کئے گئے اور ان میں سے بہت سے وہ لوگ جو محصول ادا نہیں کر سکے انھیں اناطولیہ کی سڑکوں پر جبریہ محنت کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ محصول سرمایہ کا حقیقی مقصد دراصل یہ تھا کہ اقلیتوں کو تجارت و صنعت سے خارج کر کے مسلم ترکوں کے لئے جگہ نکالی جائے۔ جب ملک کے اندر اور باہر اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا تو یہ سکیم آہستہ آہستہ ترک کر دی گئی۔ سنہ ۱۹۴۳ء کے آخر اور سنہ ۱۹۴۴ء کے شروع میں جلاوطن کئے ہوئے لوگوں کو آزاد کیا گیا اور غیر وصول شدہ محاصل معاف کر دئے گئے۔

خاتمہ: اس تمام بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ترکی اس وقت ایک چوراہے پر کھڑا ہے

ابھی تک بہت سی باتوں میں وہ اپنی مشرقی خصوصیات پر قایم ہے۔ اس کی آبادی میں پس ماندہ زراعتی طبقہ کی اکثریت ہے۔ مزدور سبھائیں آزاد امداد باہمی کی انجمنیں اور اسی طرح کی دوسری تحریکیں جو مغرب میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں یہاں سرے سے غائب ہیں۔ آبادی ابھی تک بڑی حد تک ناخواندہ، یا کم سے کم جز تعلیم یافتہ ہے۔ ایک نیم استبدادی طرز حکومت ہے۔ نسلی اور مذہبی منافرت کی خطرناک علامتیں موجود ہیں لیکن ان سب کے باوجود اس کے اندر آگے کی طرف حرکت کرنے کی اہم صلاحیت موجود ہے۔

ترکی کی جمہوری تحریک خطروں سے خالی نہیں ہے۔ مطلق العنانی میں جو محدود دکمی کی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ لوگوں کی لگام ڈھیلی ہوگئی ہے اور انہوں نے اس قسم کی رشوت ستانی اور دوست پروری شروع کر دی جو عثمانی حکومت کی خصوصیت تھی اور جسے کمالی حکومت نے تقریباً ختم کر دیا تھا لیکن یہ باتیں بڑی حد تک جنگ کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے بھی رونما ہوئی ہیں اور ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ جب معاشی حالات معمول پر آئیں گے تو ان کو آسانی سے دور کیا جا سکے گا۔

———— * (*) * ————

رفتارِ عالم

مارچ میں روس پر معاہدے کی خلاف ورزی اور ایک کمزور قوم کے ساتھ زبردستی کرنے کا الزام مجلس تحفظ کے جلسے اور دنیا کے تمام اخباروں میں لگایا گیا۔ روسی برابر کہتے رہے کہ یہ الزام غلط ہے لیکن جب ایرانی حکومت خود الزام لگانے میں شریک ہوگئی تو روسیوں کی بات کو کون مان سکتا تھا پھر روسی حکومت نے اچانک اعلان کیا کہ اس کی فوجیں شمالی ایران کو خالی کر رہی ہیں، اور شمال مشرقی ایران سے جہاں ان کی موجودگی سیاست اور تجارت کے لئے کچھ ضروری نہ تھی، وہ ہٹ بھی آئیں معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی مخالفت کا کچھ اثر ہوا ہے، اور روس نے زبان سے نہیں تو اپنے عمل سے اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خبر آئی کہ روس اور ایران کے درمیان معاہدہ ہوگیا ہے، روس کو شمالی ایران میں پچاس برس تک تیل نکالنے کا حق ہوگا، اور اس کاروبار میں پچیس برس تک ۴۹ فی صدی کا ایران اور ۵۱ فی صدی کا روس حصہ دار ہوگا پچیس برس کے بعد روس کا حصہ ۴۹ فی صدی ہو جائے گا، ایران کا ۵۱ فی صدی، روسی فوجیں چھ ہفتے کے اندر ایران کو بالکل خالی کردیں گی تاکہ نئی مجلس کا انتخاب ہوسکے (ایرانی دستور کی رو سے مجلس کا انتخاب عمل میں نہیں آسکتا جب تک کہ کسی غیر قوم کی فوجیں ایرانی سرزمین پر ہوں) اور یہ نئی مجلس چھ مہینے کے اندر معاہدے کو منظور کردے گی۔ ایرانی حکومت نے اس کا بھی وعدہ کیا کہ وہ آذربائجان کی اسی حکومت سے جو روس کی سرپرستی میں قائم ہوئی ہے ایسا معاملہ کرے گی کہ آذربائجان کی صوبجاتی خود مختاری محفوظ رہے۔

اس کارروائی سے کیا نتیجے نکالے جائیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران اس وقت برطانیہ روس اور متحدہ ریاستوں کے مقابلے کا میدان ہے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کا مطالبہ تھا کہ اس مقابلہ میں فوجی قوت کی نمائش سے کام نہ لیا جائے، روسی جانتے تھے کہ "آزاد" مقابلے میں وہ نقصان میں

رہیں گے اس لئے کہ ان کے پاس نقد روپئے کی کمی ہے، اور انگریز اور امریکن دے دلا کر اپنا مطلب
حاصل کرلیں گے۔ اس لئے انھوں نے اپنی فوجوں کی موجودگی کو کاروبار کا اثاثہ بنالیا۔ یہ سمجھ کر کہ ایرانی
حکومت اسی سے معاملہ کرے گی جو زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈال سکے۔ اس خیال کی تصدیق برطانوی
پارلیمنٹ کے ان اراکین نے کی ہے جو اپنے طور پر تحقیق کرنے کے لئے اسی زمانے میں ایران گئے
تھے۔ ان کی رائے ہے کہ ایرانی حکومت اس بات پر مجبور ہے کہ روس اور متحدہ ریاستوں اور برطانیہ
کے درمیان مسلسل مقابلہ کراتی رہے۔ اس لئے کہ وہ خارجی اثرات کی کشش کی بدولت ہی قایم رہ سکتی
ہے۔ ایرانی مجلس تحفظ کا سہارا نہ لیتی تو روسی سیاست انھیں اپنی رَو میں بہالے جاتی، اور آئندہ بھی ایران
کی دوستی اور بے اتفاقی کا مقصد توازن قایم کرنا ہوگا، مگر برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین کا یہ بھی خیال
ہے کہ روس نے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے نامناسب طریقے اختیار کئے۔ اور انھوں نے ایرانی
حکومت پر الزام لگایا ہے کہ وہ فرائض سے بے پروا ہے، اور ہر طرح کی بے عنوانی کو گوارا کرتی ہے۔ سیاست
میں ایسے الزام بہت لگائے جاتے ہیں اور دوسروں کے عیب جس خلوص اور نیک نیتی سے برطانوی مدبر
بیان کرتے ہیں اس کا جواب کہیں نہیں ملتا۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس وقت ایرانی حکومت کمزور بہت
ہے۔ اور وہ طبقے جو اس کے رویہ یا کارگذاری سے مطمئن نہیں ہیں تھوڑی سی قوت بھی پیدا کرلیں تو اس کے
استقلال کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ آزربائجان "تودہ" پارٹی کا مرکز بن گیا ہے جس نے صوبجاتی خود
مختاری کے نام سے اپنی مورچہ بندی کرلی ہے، اور اب اس کی کوشش کررہی ہے کہ آزربائجان کے
باہر بھی ان تمام عناصر کو متحد کرلے جو موجودہ سیاسی اور معاشی نظام کی مخالفت پر آمادہ کئے جاسکتے ہیں۔
یہ پارٹی اس وقت وجود میں آئی جب روس کا شمالی ایران پر تسلط تھا، اور مخالف خیال کے لوگوں نے
بارہا کہا ہے کہ روس کی سرپرستی اور مدد کررہا ہے۔ جب کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں میں کمیونسٹ
پارٹیاں ہیں جو روزمرہ کی تفصیلات میں بھی روسی حکومت کی ہدایتوں پر عمل کرتی ہیں تو یہ کوئی تعجب کی
بات نہیں کہ ایران میں روسی فوج کے سائے میں ایک پارٹی قایم ہوگئی ہے جس کا مقصد روس کی مصلحتوں
پر عمل کرنا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایران کے ترقی پسند عناصر نے روسیوں کی موجودگی سے فائدہ

اٹھاکر اپنی تنظیم کرلی ہو، اور رفتہ رفتہ وہ روس کے اثر سے آزاد ہوکر اپنی قومی زندگی میں نئی جان ڈال دیں۔
ایران میں روسیوں نے جو کچھ کیا اس سے دنیا میں ان کی عزت نہیں بڑھی، لیکن برطانوی سامراجیت
کا کھیل بہرحال بگڑ گیا۔ انڈونیشیا میں صورت بالکل مختلف تھی اور وہاں ڈچ اور برطانوی سامراجیت خاموشی
اور اطمینان سے اپنا کام کرتی رہی ہے۔ کہا یہ گیا تھا کہ برطانوی فوج انڈونیشیا میں اس لئے ہے کہ جاپانیوں
کے ہتھیار وصول کرے اور ڈچ اور برطانوی قیدیوں کو چھڑائے۔ یہ دونوں کام بھی ایک حد تک کئے
گئے ہیں، لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کا اصل مقصد انڈونیشیا پر دوبارہ تسلط حاصل کرنا
تھا۔ برطانوی فوج نے جاپانیوں کے فوجی سامان پر قبضہ بے شک کیا، مگر اسی سلسلے میں انڈونیشی "انتہا
پسندوں" سے بھی لڑتی رہی۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو برطانوی فوج ہٹائی جانے لگی، مگر اس کے ساتھ ڈچ
فوجیں بھی جاوا میں اتاری جانے لگیں، اور چونکہ ان کی تعداد اور قوت فی الحال ناکافی ہے۔ اس لئے جاپانی
سپاہیوں کو دوبارہ ہتھیار دے کر انڈونیشیا میں امن قایم کیا جارہا ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں جرح
کی گئی تو وزیر جنگ کو اس کا اقبال کرنا پڑا کہ انڈونیشیا کی اتحادی فوج کا قریب ایک تہائی حصہ جاپانی ہے اور
یہ برطانوی اور ہندوستانی فوج کے پہلو بہ پہلو انڈونیشیا کے "انتہا پسندوں" اور "دہشت انگیزوں" سے لڑ رہا
ہے۔ برطانوی اور ڈچ حکومتیں ایک طرف انڈونیشیا کی "جمہوری" حکومت سے گفتگو کر رہی تھیں اور دوسری
طرف ان کی فوجیں آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہی تھیں۔ جاوا کے کئی شہروں پر "اتحادیوں" کا قبضہ ہو گیا ہے
اور دو تین شہروں پر قبضہ کرنے اور میدانوں کو فتح کرنے کا فخر جاپانیوں کو حاصل ہوا ہے۔ برطانیہ
کے ایک ممتاز اخبار "نیوز کرونیکل" کے نامہ نگار نے لکھا ہے: "کیا ایسے شرمناک کام برطانوی قوم
کے نام سے کئے جاتے رہیں گے اور کوئی آواز احتجاج کی سنائی نہ دے گی؟ کیا ہم وہی جرم کرتے
رہیں گے جو ہمارے دشمنوں نے کئے ہیں۔ دنیا کی نظروں میں اپنی عزت کو خاک میں ملتے دیکھنا اور اپنے
ضمیر کی ملامت گوارا کرتے رہیں گے؟" لیکن ڈچ حکومت کا انداز گفتگو اب بدل گیا ہے، انڈونیشیا کا وفد
جو ہولینڈ گیا تھا تقریباً ناکام واپس آیا ہے، اور غالباً معاملات کی اخلاقی جانچ پڑتال اس وقت کی جائے گی
جب اس سے سیاسی مقاصد میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ نہ رہے گا۔

اخلاقی بحث کے لئے موقع بھی اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی غرض نہ اٹکی ہو۔ روس نے یونان
اور انڈونیشیا کے معاملے میں اخلاق کا حوالہ دیا۔ ایران میں اسے صرف اپنے کام سے مطلب رہا۔ اسی طرح
برطانیہ اور متحدہ ریاستیں پولینڈ اور بلغاریہ کے معاملات کو اخلاق کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں، اور مسائل
میں عام طور پر اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ فلسطین کے مسئلے کی کوئی اخلاقی حیثیت نہیں ہے۔ اسے برطانیہ
کا ایک فوجی بحری اور ہوائی مرکز بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس لئے کہ اب مصر کو خالی کرنا ضروری ہو گیا
ہے۔ لیکن ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف یہودیوں اور دوسری طرف عربوں کی انتہا پسندی
برطانیہ کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر رہی ہے۔ سنہ ۳۹ء کے شاہی کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر یہ طے کیا گیا
تھا کہ پانچ سال تک یہودیوں کی ایک مقررہ تعداد کو فلسطین میں آکر آباد ہونے کی اجازت دی جائے
اور اس کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا جائے۔ زمین کی خریداری پر پابندیاں لگا دی گئیں تھیں تاکہ یہودی ساری
زمین کے مالک نہ بن جائیں۔ اس فیصلے پر یہودی بہت برافروختہ ہوئے تھے اور جب سنہ ۴۵ء میں فلسطین میں
جا کر آباد ہونے کی ممانعت کر دی گئی تو انہوں نے ایک طرح کی قزاقانہ جنگ شروع کر دی۔ اسی کے ساتھ
امریکہ کے یہودیوں نے اپنی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس معاملے میں دخل دے، اور دونوں طرف
کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک برطانوی امریکی کمیشن فلسطین کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔
اس کمیشن کی رپورٹ پہلی مئی کو شائع ہوئی۔ اس میں سفارش کی گئی ہے کہ عربوں کے ذہن نشین کر دیا جائے
کہ فلسطین میں ان میں سے کسی ایک کی حکومت نہ ہوگی، اور کسی ایک کے لئے فلسطین کا کوئی حصہ مخصوص نہ کر دیا
جائے گا۔ فی الحال وہاں برطانیہ کی عملداری رہنا چاہئے جب تک کہ متحدہ اقوام کی مجلس تولیت کی ذمہ داری
قبول کرنے پر تیار نہ ہو۔ کمیشن نے یورپ کے یہودیوں کی مصیبتیں بیان کر کے، اور یہ کہہ کر یورپ کے
وہ سارے یہودی جن کو نازی اور فاشسٹ حکومتوں نے ملک اور گھر بار سے محروم کر دیا ہے
فلسطین میں نہیں سما سکتے۔ یہ سفارش کی ہے کہ ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت
دے دی جائے۔ یہ بات صاف طور پر تو نہیں کہی گئی ہے کہ یہ ایک لاکھ یہودی ان زمینوں پر آباد
ہوں گے جو اس وقت عربوں کی ملکیت ہیں، مگر اس سفارش کا کہ زمین کو بیچنے، رہن رکھنے اور منتقل کرنے

پہ جو پابندیاں سنہ ۱۹۳۹ء میں لگائی گئی تھیں ہٹالی جائیں، مطلب یہی ہے، لیکن پھر عرب کیا کریں گے؟ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ عربوں کو تعلیم دینے اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی تدبیریں کی جائیں۔ یہودیوں کے تعصب نے عربوں کو اپنی زندگی سے اس طرح خارج کر دیا تھا کہ بہت سے اداروں نے اپنے اوپر پابندی لگا دی تھی کہ وہ یہودیوں کے سوا کسی کو ملازم نہ رکھیں گے، اور کسی سے اُجرت پر کام نہ کرائیں گے۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ عربوں کو "لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے" کے ادنی کاموں سے محروم نہ کیا جائے، اور نسلی تعصب کی بنا پر جو قانون بنے ہیں وہ منسوخ کر دئے جائیں۔ کمیشن کی سفارشوں پر عمل نہ کیا جا سکے گا۔ اگر یہودی اور عرب اپنے مطالبوں کو منظور کرانے کے لئے تشدد سے کام لیتے رہے، اس لئے کمیشن نے مشورہ دیا ہے کہ تشدد کی سختی کے ساتھ بیخ کنی کی جائے۔

فلسطین کے یہودی محسوس کرتے ہیں کہ کمیشن نے ایک حد تک ان کی مرضی اور مفاد کے مطابق فیصلے کئے ہیں اور وہ قزاقانہ جنگ کو ملتوی کرنے پر تیار ہو جائیں گے اگر کمیشن کی سفارشوں پر مستعدی کے ساتھ عمل کیا گیا لیکن اب عرب مقابلے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ مسٹر اٹیلی نے متحدہ ریاستوں کو دعوت دی ہے کہ برطانیہ کے ساتھ شریک ہو کر فلسطین میں نیا نظام زندگی قایم کرے اور اس کے لئے ضروری فوج اور سامان مہیا کرے۔ کہا جاتا ہے کہ فلسطین میں ایک لاکھ یہودیوں کو آباد کرانے کی تجویز پریسیڈنٹ ٹرومین نے خود مسٹر اٹیلی کے سامنے پیش کی اور ان سے منظور کرالی، مگر غالباً وہ اپنی قوم کو اس پر آمادہ نہ کر سکیں گے کہ ان یہودیوں کو آباد کرانے کے لئے روپئے اور جانیں صرف کرے امریکہ کی مدد کے بغیر برطانیہ بھی کوئی نئی پالیسی اختیار نہ کر سکے گا۔ اور فلسطین میں جو بے چینی اس وقت ہے وہ ایک عرصہ تک رہے گی۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

(ان پڑھ بالغوں کے لئے)

۱۔ قاعدہ — ۲۔ دس سبق

۱۔ نماز
۲۔ حکایتیں اول
۳۔ 〃 دوم
۴۔ حبیبِ خدا
۵۔ نظمیں
۶۔ میونسپلٹی
۷۔ صدیق اکبر
۸۔ خط و کتابت
۹۔ ضلع کا انتظام
۱۰۔ قومی گیت
۱۱۔ غزلیں
۱۲۔ ہمارا ہندوستان
۱۳۔ امامی بھی پڑھنے لگے
۱۴۔ عمر فاروق
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ
۱۶۔ شہید کربلا
۱۷۔ ہماری دنیا
۱۸۔ ایشیا
۱۹۔ یورپ
۲۰۔ قصہ فسانہ عجائب
۲۱۔ مثنوی میر حسن
۲۲۔ گل بکاؤلی
۲۳۔ چار درویش اول
۲۴۔ 〃 〃 دوم
۲۵۔ 〃 〃 سوم
۲۶۔ چار درویش
۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول
۲۸۔ 〃 〃 دوم
۲۹۔ 〃 〃 سوم
۳۰۔ منصور و موہنا
۳۱۔ فردوس بریں
۳۲۔ لیلیٰ مجنوں
۳۳۔ شکنتلا
۳۴۔ سنگھ والا
۳۵۔ بہشتی
۳۶۔ صوبے کی حکومت
۳۷۔ حکومت ہند
۳۸۔ جمہوریت
۳۹۔ دوہے
۴۰۔ دلچسپ شعر
۴۱۔ مرثیے
۴۲۔ مسدس حالی
۴۳۔ حالی کی نظمیں
۴۴۔ گنتی
۴۵۔ بڑی گنتی
۴۶۔ پہاڑے پیمانے
۴۷۔ اجرت کا حساب
۴۸۔ تنخواہ کا حساب
۴۹۔ چاند تارے
۵۰۔ نزلہ زکام
۵۱۔ حالات قرآن مجید
۵۲۔ تعلیمات (عقائد)
۵۳۔ 〃 (عبادات)
۵۴۔ 〃 (اخلاق)
۵۵۔ 〃 (معاملات)
۵۶۔ قصص قرآن مجید
۵۷۔ 〃 〃
۵۸۔ کعبہ شریف
۵۹۔ حدیث شریف
۶۰۔ عثمان غنی
۶۱۔ علی مرتضیٰ
۶۲۔ صحابہ کرام
۶۳۔ 〃 〃
۶۴۔ 〃 〃
۶۵۔ 〃 〃
۶۶۔ 〃 〃
۶۷۔ خلیفہ بن عبدالعزیز
۶۸۔ حضرت غوث پاک
۶۹۔ اجمیری خواجہ
۷۰۔ نظام الدین اولیاء
۷۱۔ گوتم بدھ
۷۲۔ کرشن کنھیا
۷۳۔ رام کہانی
۷۴۔ 〃 〃
۷۵۔ افریقہ
۷۶۔ امریکہ
۷۷۔ جنوبی امریکہ
۷۸۔ سرزمین ہند
۷۹۔ صوبے
۸۰۔ دیسی ریاستیں
۸۱۔ داستان امیر حمزہ
۸۲۔ 〃 〃
۸۳۔ 〃 〃
۸۴۔ 〃 〃
۸۵۔ 〃 〃
۸۶۔ کہاوتیں
۸۷۔ پہیلیاں
۸۸۔ گرو نانک
۸۹۔ مثنوی میر حسن
۹۰۔ گلستان
۹۱۔ احمد خان دکاندار
۹۲۔ عبدالرحمٰن راج
۹۳۔ نصیب خاں حجام
۹۴۔ خدمتگار
۹۵۔ پیارے خاں دردی
۹۶۔ حفیظ خانساماں
۹۷۔ جن پڑھتی
۹۸۔ سید حلوائی
۹۹۔ میرا منا
۱۰۰۔ ہندوستان کے مشہور بزرگ

مکتبہ جامعہ دہلی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲

Freedom from Suffering

As one nears the shores of America, coming from across the Atlantic, one of the most inspiring sights is the Statue of Liberty. It not only serves as a cheering beacon to the mariner, but also symbolises the hopes of millions of downtrodden humanity who have left the Old World for the freedom of a new life in a new clime—freedom from want, from fear and from oppression.

Of all freedoms, however, the greatest is the freedom from disease. The healthiest—rich or poor—for want of this freedom are changed to sick and diseased whose lives become useless to themselves and to the world. Freedom from disease is therefore the greatest freedom which everyone should strive for.

Cipla Laboratories are devoting their full time and attention to the production of high quality drugs and medicines for the relief of mankind, thus striving for Freedom from disease. In quality, efficacy and high standard of production of drugs and medicines Cipla is equal to the world's best. Scientific methods of production and constant research lead to perfection. This is the motto followed by Cipla.

EQUAL TO WORLD'S BEST

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے

سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر	بابت ماہ جون ۱۹۴۶ء	جلد ۴۱ نمبر ۶

فہرست مضامین

[illegible] پریس دہلی

مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم نے ۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو ۷۸ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ سادگی، خلوص، انکسار، ہمدردی اور مروّت کا ایک زندہ مجسمہ تھے۔ انھیں خاموشی کے ساتھ کام کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ نمود و نمائش، جلوس و ہنگامہ، دھوم دھماکا، واہ واہ سے ان کو طبعی طور پر کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ ایک گمنام گوشہ میں بیٹھ کر ٹھوس، دیرپا اور وسیع الاثر کام کرنا چاہتے تھے۔ ان میں وہ صفات تھیں جو سچے مبلغین میں پائی جاتی ہیں، اور جن کا ہماری قوم میں بہت کال ہے۔ وہ اپنے اندر ہندوستان کے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا ایک بے پایاں درد رکھتے تھے۔ علیگڑھ تحریک سے ابتدائی عمر میں وابستہ ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ان کا یہ تعلق آخری دم تک باقی رہا۔

علی گڈھ تحریک کے جس پہلو اور جس روایت کی مولانا نمائندگی کرتے تھے اس کا سلسلہ سرسید کی ظاہری عقل پسندی کی بجائے ان کی باطنی دردمندی سے ملانا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس میں عوام کی خدمت اور جمہور کی اصلاح و ترقی زیادہ غالب نظر آتی تھی۔ مولانا شبلی اور وقار الملک کے دلوں میں بھی شاید اسی قسم کا جذبہ تھا، لیکن اس نے کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی۔ دراصل علی گڈھ تحریک کے اس رُخ کو علی گڈھ کے ارباب حل و عقد نے ہمیشہ نرخش نما اور نظر فریب لیکن نہایت موٹے اور تاریک پردوں میں چھپائے رکھا۔ اس رُخ پر سے پردہ ہٹا کر ہلکا سا ایک جلوہ دکھلانے کا کام اگر کسی نے کچھ انجام دیا ہے تو وہ مولانا طفیل احمد مرحوم کی ذاتِ گرامی صفات ہے۔ اس کام میں انھیں اپنے حلقۂ احباب یعنی* جہل مرکب کے ارکین سے کافی مدد ملی لیکن دراصل اس سلسلے کا زیادہ تر کام خود مولانا مرحوم ہی کو انجام دینا پڑا۔

* جہل مرکب کے ارکین میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم، مولوی نظام الدین حسن صاحب

بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین، خان بہادر بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر اٹاوہ، ولایت حسین صاحب، مولوی حبیب اللہ خاں صاحب، میر محمد حسین صاحب مرحوم، میر نثار حسین صاحب مرحوم، سید جعفر حسین صاحب مرحوم اور انوار احمد صاحب مرحوم شامل تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب بھی اس میں شریک رہے لیکن غالباً برائے نام کیونکہ جتنی شد و مد کے ساتھ اور جس قدر مستقل طریقہ پر اس حلقہ کے بعض اراکین نے ڈاکٹر ضیاء الدین کی مخالفت کی ہے اتنی کسی دوسرے نے نہیں کی ہوگی۔

علی گڑھ کی امارت پسندی کے مقابلے میں "جہل مرکب" کے حلقہ کو جمہوریت پسند قرار دیا جاسکتا ہے اس کی نظر مسلمانوں کے زوال زدہ، کم حیثیت اور غریب طبقوں کی جانب تھی۔ یہ تعلیم کے فیض کو محدود رکھنے کی جگہ عام کرنا چاہتا تھا۔ اس حلقے کے افراد علی گڑھ اور علیگیوں کی فضول خرچ اور عیش پرست زندگی کے خلاف ایک چلتی پھرتی صدائے احتجاج تھے، وہ مسلمان نوجوانوں کو کفایت شعار اور عاقبت اندیش دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کے اندر معاشی آزادی اور خود مختاری پیدا ہو لیکن علی گڑھ کے سوٹ بوٹ اور شیروانی اور ترکی ٹوپی سے آراستہ سرکاری ملازمت کے بھوکے بدمست کھلنڈروں میں "جہل مرکب" کے مصلحین کی تبلیغ کا حشر وہی ہوتا تھا جو نقار خانے میں طوطی کی آواز کا ہوتا ہے۔ میر نثار حسین صاحب مرحوم (نانی لارڈ) کی اصلاحی تقریریں تو خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ کے بے فکروں کے لئے تفریح و تفنن کا سامان مہیا کرتی تھیں۔ دوسرے بزرگ بھی اپنے موٹے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں دقیانوسی داڑھیوں اور قدیم وجدید وضع کی بے تکی آمیزش کے ساتھ ایسے نظر آتے تھے جیسے اصحاب کہف اپنے غار سے نکل آئے ہوں۔ ان میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے بجا طور پر بہت سی توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں لیکن ان کے لئے حالات نامساعد ثابت ہوئے اور وہ ناکامی اور مایوسی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے لوگ بھی علی گڑھ میں کچھ زیادہ اثر پیدا نہیں کر سکے اگرچہ اپنے اپنے مقامات پر تعلیمی ترقی اور قومی اصلاح کے گراں قدر کام انجام دیتے رہے لیکن ان سب میں اگر کوئی شخص اپنی کرادی بات کو وقار و تمکنت کے ساتھ منوا سکا اور اپنے خلوص اور خدمت، تعمیری تنقید اور مفاہمت پسندی، انکسار اور وضعداری کے خاص تناسب اور ذوق

ظرافت کے ذریعہ دوستوں اور ہمدردوں ہی کا نہیں بلکہ حریفوں اور مخالفوں کی عزت کا ہمیشہ مستحق بنا رہا تو وہ مولانا موصوف ہی تھے۔

۱۸۷۵ء میں سرسید نے اپنے مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور ابھی اسے جاری ہوئے چوتھا ہی سال تھا کہ مولوی طفیل احمد صاحب آٹھویں یعنی آج کل کی تیسری جماعت میں داخل ہوئے ۱۸۸۶ء میں انٹرنس پاس کیا۔ اور ۱۸۸۹ء میں ایف، اے کیا۔ اس کے بعد بی۔ اے کلاس میں داخل ہوئے، لیکن آنکھوں کی شکایت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے مجبوراً فورتھ ایر میں تعلیم کو چھوڑنا پڑا۔

مولوی صاحب مرحوم کا علی گڈھ کے اسکول اور کالج میں بارہ سال قیام رہا۔ علی گڈھ میں طلبہ کے لئے جو عہدے اور اعزاز باعثِ امتیاز و افتخار سمجھے جاتے ہیں وہ سب مولانا نے حاصل کئے۔ طالبعلمی کے زمانے میں یونین کی کیبنٹ کے رکن اور سکریٹری ہوئے۔ انجمن الفرض (غریب طلبہ کو مدد دینے والی انجمن) کے خادم بنائے گئے اور مولانا شبلی مرحوم کی انجمن اخوان الصفا کے ابتدائی رکن بنے تقریر کرنے میں مہارت حاصل کی، البیرونی پر ایک مضمون لکھ کر ایک اشرفی انعام میں حاصل کی۔ اس بات کا بہت کم لوگ یقین کریں گے کہ سادگی اور مشرقی وضع کے پابند یہ مولوی صاحب" چھ سال تک علی گڈھ کی کرکٹ ٹیم میں بھی رہے اور اس کے بہت ہی مشہور اور نامور وکٹ کیپر سمجھے جاتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مولوی صاحب اس زمانے کے کھلنڈروں کی جماعت "چلم پارٹی" کے سرگرم کارکن تھے۔

زمانہ طالب علمی کے بعد اولڈ بوائز کی رکنیت اختیار کی لیکن محض اس پر قناعت نہ کر کے انھوں نے ڈیوٹی شاپ کو چلایا تاکہ اس کے ذریعہ ملک میں مفید لٹریچر نشر کر سکیں اور اس کے نفع سے کالج کے غریب طلبہ کی امداد بھی کر سکیں۔ اولڈ بوائز کی ایک ڈائرکٹری ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۸۹۵ء تک کی مرتب کی جس میں تمام طلبۂ قدیم کے حالات (خواہ وہ اسکول کے ہوں یا کالج کے) درج کئے گئے تھے۔ اس ڈائرکٹری کو بعد میں انھوں نے ۱۹۳۱ء کے زمانے تک پہنچایا۔

چونکہ کام ایسا چاہتے تھے جس سے آنکھوں پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اسی لئے سب سے پہلے

تحصیل جلالاں میں سب رجسٹرار مقرر ہوئے، بعد میں دوسرے مقامات پر تبدیل ہوتے رہے لیکن جہاں جاتے لوگوں کو علی گڈھ کالج کی تحریک سے قریب لانے کی کوشش کرتے۔ اپنے اور دوستوں کے اخبار کلب میں لے جاتے جہاں مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی اور یہ کلب بعض جگہ مسلم لائبریری کی شکل اختیار کرتے اور کہیں ترقی کرتے کرتے مسلم اسکول تک پہنچ جاتے۔ مولانا علی گڈھ کے غیر رسمی سفیر تھے جہاں جاتے اس کے مقاصد کی تبلیغ کرتے اور مخالفین کو علی گڈھ کے بارے میں رائے بدلنے پر مجبور کرتے۔

علی گڈھ کی تحریک کو چلانے کے لیے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی گئی تھی۔ مولانا شروع سے آخر عمر تک اس کانفرنس کے زبردست ستون بنے رہے۔ کانفرنس کو مسلمانوں میں مقبول بنانا، جگہ جگہ اس کی شاخیں کھولنا، اس کے اجلاس منعقد کرانا انہی کا کام تھا لیکن اس سے بڑھ کر اس کی مختلف کمیٹیوں کے لئے ٹھوس مواد اکٹھا کرنا اور مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے نقشے اور اعداد و شمار تیار کرنا۔ یہ لوہے کے چنے بھی مولانا ہی کو چبانے پڑتے تھے۔

سب رجسٹراری کے زمانے میں مولانا نے مسلمانوں کی جائدادوں کی روزافزوں کمی، تعرض قرقی کی زیادتی کے دردناک مناظر دیکھے تھے، جس کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جب تک مسلمان روپئے کو بچانا اور بڑھانا نہیں سیکھیں گے اس وقت تک ان کی حالت نہیں سدھرے گی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر مسلمان سود دینا گوارا کرتے ہیں تو ان کو سود لینا بھی جائز سمجھنا چاہیئے۔ جواز سود کے بارے میں انہوں نے ذاتی تحقیقات سے بہت کچھ مواد اکٹھا کیا اور علمائے کرام سے اس کے بارے میں فتوے حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مسلمانوں کے معاشی زوال کی روک تھام کے لئے جگہ جگہ جلسے کئے۔ مظفرنگر کے جلسے میں خصوصیت کے ساتھ علمائے کرام کو بلوایا اور مسلمانوں کی تباہ حالی کا مرقع ان کے سامنے رکھا۔ رائے عامہ کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے رسالہ نسود مند ۱۹۲۵ء میں جاری کیا اور ۱۹۳۱ء تک تنہا اس کو چلاتے رہے۔ اس رسالے کے سرورق پر اس کے حسب ذیل پانچ مقاصد درج کئے جاتے تھے:-

(۱) افرادِ قوم کو ترغیب دینا کہ وہ سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کریں کہ مسلمانوں کو افلاس و گداگری کی مصیبت سے نجات دلائیں۔

(۲) مسلمانوں کو آمادہ کرنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ انجمن ہائے امداد باہمی و قومی اور ملکی بنکوں اور ہر قسم کے کاروبار میں لگائیں جس سے عام شرح سود گھٹ کر ملک سے ربا کو جو برباد کن اور حرام ہے مٹا دے۔

(۳) فضول اور برباد کن رسم و رواج کی اصلاح کرنا اور کفایت شعاری کے طریقے بتانا۔

(۴) مختلف مقامات کے مسلمانوں کی اقتصادی اور کاروباری حالت کے متعلق معلومات پیش کرنا اور مختلف کاروبار اور تجارتوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔

(۵) مسلمانوں کی صحت جسمانی و ذہنی ترقی اور عام بہبودی کے متعلق مضامین شائع کرنا۔

اس رسالہ کا انداز تحریر نہایت دلچسپ، دل نشین اور پُر از معلومات ہوتا تھا۔ رسالہ کی سات جلدوں میں ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۱ء مسلمانانِ ہند کی معاشی حالت کے بارے میں جس قدر مواد یکجا کیا گیا اور اصلاح و ترقی کے لئے جو قیمتی مشورے دئے گئے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ملتے۔

۱۹۲۶ء میں آپ نے ملازمت سے پنشن لے لی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ قبول کر لیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک صوبہ یو پی کی کونسل کے ممبر رہے۔ ممبری کے زمانے میں صوبہ کی عام خواندگی بڑھانے کا کام آپ نے خاص طور پر کیا۔ آپ نے سائمن کمیشن کی مخالفت کی اور اسی وقت سے قوم پرور گروہ میں داخل ہو گئے۔ آپ نے مسلمانوں کی سیاست کے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ مخلوط انتخاب کی تائید میں آپ کا ایک رسالہ اردو اور انگریزی میں موجود ہے جس میں آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کی اور ملک کی ترقی میں حائل ہے۔

آپ کی سب سے زیادہ معرکۃ الآرا تصنیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ہے جس میں آپ نے مرثیہ کی جگہ رجز کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا شمار اپنی بیش بہا معلومات اور گراں قدر جذبات و خیالات دونوں کے لحاظ سے اس صدی کی بہترین کتابوں میں

کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اور اس کے جواب یا نقل میں کئی اچھی کتابیں مسلمانان ہند کی تمدنی اور سیاسی تاریخ پر دوسرے نقطہ ہائے نگاہ سے بھی لکھی گئی ہیں لیکن مسلم قوم پرستوں اور ترقی پسندوں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی جس جوش اور یقین کے ساتھ اس کتاب میں کی گئی ہے وہ کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔ اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن کی انہوں نے اپنی بیماری کے زمانے میں نظر ثانی کی تھی اور نفسی حالت میں "روح روشن مستقبل" جو عام فہم زبان میں پہلی کتاب کا ضروری خلاصہ ہے اس وقت شایع کی تھی جب کہ جدید انتخابات ہو رہے تھے اور مسلمانوں کو قوم پرست مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے واقف کرنے کی ضرورت درپیش تھی۔

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے کام سے آپ کو بے انتہا شغف تھا۔ صوبہ متحدہ میں مشکل ہی سے کوئی اسلامی درس گاہ ایسی ہوگی جس نے اپنی ترقی کی کسی نہ کسی منزل پر پہنچ کر مرحوم کی امداد اور رہنمائی سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ شہر کے غریب طلباء کے لئے مسلم یونیورسٹی سٹی اسکول کو آپ ہی نے قائم کیا۔ اور آخری دم تک اس کے مہتمم رہے۔ مسلم یونیورسٹی کے آفتاب ہوسٹل کے قائم کرنے میں بھی آپ شریک رہے یہ ہوسٹل اپنی جمہوری خصوصیات کے لحاظ سے مسلم یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے صوبے کی مسلم ایجوکیشن کمیٹی کے آپ ایک مشہور رکن تھے۔ آپ نے اسلامیہ مکتبوں کے درجہ کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کام کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ یہ مکاتب صوبہ کی درس گاہوں کا ایک مفید [illegible] عنصر بن جائیں۔

ایسے سچے، خاموش اور ٹھوس کام کرنے والوں کی مسلمانوں میں بہت کمی ہے لیکن قوموں کا عروج ایسے ہی لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہمیں مرحوم کے لئے مغفرت کی اور اپنے لئے کشش، ہدایت اور استقامت کی دعا کرنا چاہئے تاکہ جو کام مرحوم نے شروع کیا وہ وسعت تک جاری اور قایم رکھا جا سکے۔

مولانا طفیل احمد مرحوم کا آخری پیغام

(۱) سب سے مقدم یہ ہے کہ اعلاء کلمتہ اللہ کو اپنا مقصد اوّل قرار دیا جائے۔ اپنے پاک مذہب کی اشاعت کی تبلیغ کرنا اور شریعت اسلامی کے قیام واجراء کی ہر امکانی کوشش کرنا اپنا فرض قرار دیا جائے۔

(۲) ہندوستان میں کامل جمہوری حکومت قایم کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہئے تاکہ ملک کا سرمایہ جو غربا کی محنت ومشقت سے پیدا کیا جاتا ہے ملک سے باہر جانا بند ہو جائے۔ ملک کا سرمایہ جب باہر جانا بند ہوکر خود اس ملک میں صرف ہو سکے گا تو حسب ذیل کاموں کو ترقی دی جا سکے گی

(الف) زیادہ سے زیادہ روپیہ لوگوں کو خواندہ بنانے میں صرف ہوگا، جب کہ دوسرے ملکوں میں خواندوں کی تعداد نوّے سے سو فی صدی تک ہے۔ ہندوستان میں صرف دس فی صدی کے قریب ہے، اور خواندگی کی ترقی کی جو موجودہ رفتار ہے اس سے ایک ہزار سال سے قبل کل ملک خواندہ نہ ہو سکے گا۔ غیر ملکی حکومت اس میں کسی طرح زیادہ روپیہ نہیں لگا سکتی کیونکہ یہ اس کے مفاد کے خلاف ہے اور عوام کے پاس اتنا روپیہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ خود اپنی تعلیم کا انتظام کر سکیں۔

(ب) قومی حکومت کا فرض یہ ہو کہ ملک میں صنعت وحرفت عام طور پر جاری کرکے اسے اس اعلیٰ مرتبے پر لائے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے قبل تمام دنیا کے ممالک کے مقابلے میں حاصل تھا یہ بھی صرف اسی وقت ہو سکے گا جب کہ کامل جمہوری حکومت قایم ہو سکے گی۔

(ج) ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے کاشتکاروں اور کاریگروں مزدوروں اور عوام الناس کو بہتر اور کافی مقدار میں کھانا اور کپڑا ملے اور ان کا معیار زندگی بلند کرکے ان میں امراض کا مقابلہ کرنے

قوت پیدا ہو اور ملک کی صحت عامہ کو ترقی دینے کے لئے طبی کاموں پر کثیر رقم صرف کریں تاکہ دیہات تک میں امراض کے جراثیم کو ہلاک اور فنا کیا جا سکے۔ یہ کام بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک سے روپیہ جانا بند نہ ہو۔ موجودہ حالت میں تو ہندوستان میں روپیہ اور غلہ کی کمی نہیں مگر یہاں کی زرعی پیداوار سے اہل یورپ کی شکم پری کر کے ان کی صحت عامہ کو ترقی دی جاتی ہے اور ان کا معیار زندگی مسلسل بڑھایا جاتا ہے جب کہ خود اس ملک کے کروڑوں آدمی فاقہ کشی سے مرے جاتے ہیں۔

(د) سب سے آخر مگر اس اعتبار سے کہ اس کے بغیر مندرجہ بالا امور پر عمل کرنا مشکل ہے موجودہ طریقہ انتخاب کی تبدیلی اوّل ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور لبرل خیال کے انگریز مسٹر بریلس فورڈ نے ہندوستان کی کونسلوں اور اسمبلیوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہاں تو وزیروں اور ممبروں کا کام یہ ہے کہ وہ عہدوں اور منافع کے کام کو آپس میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ انھیں فرقہ وارانہ انتخاب نے نفع عامہ کے کاموں سے مستغنی اور بے پروا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہندو امیدوار ممبری کو اس وقت زیادہ ووٹ ملتے ہیں جب وہ یہ ظاہر کرے کہ وہ ان کے مذہب اور کلچر کی حفاظت کے لئے مسلمانوں سے لڑے گا۔ اسی طرح مسلمان امیدوار کو یہ کہہ کر زیادہ ووٹ ملتے ہیں کہ ہندو سے لڑے گا۔ یہ حالت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ امیدواروں کی خوش بختی سے اگر انتخاب کے قریب کوئی ہندو مسلم فساد ہو جاتا ہے تو دونوں کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ سے دونوں فرقوں کے عوام کی توجہ مذہبی اختلافات اور فسادات کی طرف رہتی ہے اور دونوں قوموں کے نفع عامہ کے کاموں مثلاً کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کی مالی حالت کی بہتری کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ اب رہی عوام کی مذہبی حفاظت وہ اس سے ظاہر ہے کہ مذہبی بلووں اور فسادات کی زیادتی سے دونوں قوموں کے مذہبی حقوق اور مراسم اور عبادت خانے جس قدر غیر محفوظ اب ہو گئے ہیں وہ کبھی نہیں ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ ووٹروں اور ممبروں کے درمیان فرقہ وارانہ یا جداگانہ طریق انتخاب کی وجہ سے منافع کی تقسیم عملاً اس طرح ہوگئی ہے کہ عوام کے حصے میں تو مذہبی اختلافات کی وجہ

سر پھوڑنا اور عبادت خانوں کی توہین اور تذلیل ہے اور ممبروں کے حصہ میں جملہ قسم کے دنیوی منافع آتے ہیں جو ہندو اور مسلم ممبران خوش دلی اور اتحاد عمل سے آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ اب عوام کی حق تلفیوں کا علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ہندوستان کو کاٹ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو ملک علیحدہ علیحدہ بنا دئے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو شمالی پاکستان میں چونکہ ۴۰ فی صدی اور مشرقی پاکستان میں یعنی بنگال میں ۴۶ فی صدی ہندو ہوں گے، ہندو بھی وہ جو سرمایہ داری اور تعلیم کی وجہ سے زور دار ہوں گے اس لئے وہ کسی طرح وہاں کے مسلمانوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے اور انھیں اس قابل نہ رکھیں گے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں کے پندرہ بیس فی صدی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مظالم اور دست برد سے بچا سکیں۔ یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ محض انگریزوں کے زیر سایہ حکومت ملنے کے نشے کے خیال میں کیا جا رہا ہے۔

پس جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس نازک حالت سے نکلنے کا علاج یہی ہے کہ معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کر کے ووٹروں کو باعتبار حق کے ممبروں کے برابر کے درجہ پر لایا جائے۔ یہی وہ صورت ہوگی جس سے جملہ اقوام کے عوام الناس ہندو اور مسلمان ممبروں سے مطالبہ کر سکیں گے کہ انہوں نے کونسلوں اور اسمبلیوں میں کسانوں اور کاریگروں، مزدوروں اور غریبوں کی بھلائی کے کیا کام کئے ملکی مصنوعات کی ترقی کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے — آیا ملک کا سرمایہ باہر جانے سے روکا۔ عوام الناس کا معیار زندگی بلند کیا یا نہیں۔ عوام کی تعلیم اور صحت عامہ کی ترقی کا کیا انتظام کیا۔ جب صورت حالات یہ ہوگی اسی وقت ملک کی اصلی اور حقیقی ترقی ہو سکے گی اور پھر ایک بار ہندوستان دنیا میں اپنے اس بلند مرتبے پر پہنچے گا جس پر کہ وہ ہزارہا سال سے رہ چکا ہے۔ آمین۔

———— ✻ ————

دہلی کی قوم پنجابیان

برادری کی تاریخ

اس برادری کے بارے میں مقررہ سوال نامہ کے مطابق محمد عمر الٰہی صاحب جامعی اور ان کے چھوٹے بھائی محمد عبد الالٰہی صاحب جامعی کے ذریعے حالات معلوم کئے گئے۔ یہ دونوں بھائی صدر بازار میں فضل الٰہی، محبوب الٰہی سوت والوں کی دوکان اور یو۔ اے فیمن اینڈ کمپنی کے سوت گولے کے کارخانے کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ پنجابی برادری کی سب سے بڑی قومی تنظیم، انجمن وکیل قوم پنجابیان کے نہایت سرگرم عہدہ دار ہیں۔ یہ جائزہ اپریل سنہ ۴۳ء میں لیا گیا تھا۔

برادری کی تاریخ کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ برادری ہندو سے مسلمان ہوئی کس زمانہ میں مشرف باسلام ہوئی؟ اس کے بارے میں کچھ ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس برادری کے آبا و اجداد دہلی میں اورنگ زیب کے زمانے میں آئے۔ اس سے پہلے پنجاب میں ہندو تھے۔ زیادہ تر ملتان سے آئے تھے اور ان کا تعلق کھتری ہندوؤں سے تھا۔ یہ لوگ گنگا جمنا کے اضلاع کے اطراف سے آئے تھے۔ دہلی کے کسی بزرگ نے انھیں مسلمان کر لیا۔ لیکن برادری کی کسی مستند تاریخ کا پتہ نہیں چلتا نہ اس کی تحقیقات ہمارا اصل موضوع ہے۔ ہمارے لئے اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ ایک نو مسلم برادری ہے اور مذہب اسلام کے ساتھ دلی تعلق رکھتی ہے اور اس کی بقا اور ترقی کے لئے برابر کوشش کرتی رہتی ہے۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں آبادی کی تقسیم

اس برادری کے افراد سب سے زیادہ دہلی میں ہیں۔ ا... س کے بعد دوسرا بڑا مرکز کلکتہ ہے جہاں زیادہ تر دہلی ہی ...

لوگ تجارت کرنے گئے ہوئے ہیں۔ دوسرے صوبوں میں زیادہ آبادی یو۔پی میں ہے۔ جہاں یہ لوگ میرٹھ، بریلی، مرادآباد، ہاپڑ، امروہہ، سہارنپور، آگرہ، بنارس، علی گڈھ، کانپور اور لکھنؤ میں ہیں۔ آنولہ میں بھی بڑے بڑے لوگ ہیں۔ پنجاب میں انبالہ اور لدھیانہ میں ہیں۔ جہاں رہتے ہیں وہیں کے پنجابیوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ البتہ دہلی والوں کا ہاپڑ اور میرٹھ کے لوگوں سے تعلق ہے۔

دہلی کے مختلف محلوں میں تقسیم دہلی میں ان کی کل آبادی تقریباً پندرہ ہزار ہے۔ کچھ محلے پورے کے پورے ان کے ہیں اور کچھ میں ان کی اکثریت ہے۔ غدر سے پہلے ٹبلوں والی گلی (موری گیٹ) میں رہتے تھے وہیں سے بعد میں ساری دہلی میں پھیل گئے جو محلے سارے کے سارے ان کے ہیں وہ یہ ہیں:۔ (۱) پھاٹک حبش خاں (۲) حویلی حسام الدین حیدر۔ اور (۳) احاطہ کالے صاحب۔ پھاٹک حبش خاں میں ان کے حسبِ ذیل دس ذیلی محلے ہیں:۔ (الف) گلی ہنگا بیگ۔ (ب) دھوبیوں کا کٹرا (ج) رنگ محل (د) چمن والا خورد و کلاں (ہ) گلی زکریا والی (و) گلی باقر والی (ز) کٹرہ گھی (ح) بارہ دری نواب وزیر (ط) کٹرہ شفیع (ی) طوطا مینہ (ک) کشن گنج (ل) باغیچی اچھے جی۔

: جن محلوں میں ان کی اکثریت ہے وہ یہ ہیں:۔ ۱ شیش محل۔ ۲۔ نواب گنج۔ ۳۔ نیا محلہ۔ ۴۔ باغ بیری والا۔ ۵۔ باڑہ ہندو راؤ۔ ۶۔ فیاض گنج۔

باڑہ ہندو راؤ میں ان کے حسبِ ذیل چھ محلے ہیں۔ الف۔ باغیچی اچھے جی۔ (ب) باغیچی ایشوری پرشاد (ج) پکی گلی (د) کوٹھی میم (ہ) چمنی مل (و) احاطہ کدارا۔

ان سب محلوں میں جن مکانات میں رہتے ہیں وہ یا تو اپنے ذاتی ملکیت میں ہیں یا اپنے کسی دوسرے بھائی کے ہیں اور یہ کرایہ پر رہتے ہیں۔ کسی غیر برادری کے مکان میں غالباً کوئی نہیں رہتا۔ عقیدہ کے لحاظ سے زیادہ تر حنفی مسلمان ہیں۔ کچھ اہلِ حدیث بھی ہیں۔

پیشے اور کام یہ تجارت پیشہ قوم ہے۔ اور شروع زمانے سے تجارت ہی کرتی چلی آرہی ہے۔ اب ان کے یہاں ڈاکٹر بھی ہو گئے ہیں وکیل بھی ہیں۔ گورنمنٹ سروس میں بھی آگئے ہیں۔ لیکن آئی سی۔ ایس اور پی سی ایس میں ابھی تک کوئی نہیں ہے۔ اسپیشل ایگزیکٹیو سروس میں بھی

تھے لیکن اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ سکریٹریٹ میں سپرنٹنڈنٹ اور انفیریر دونوں سروسوں میں ہیں۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتروں میں بھی ہیں اور میونسپلٹی میں بھی۔ جائداد کی آمدنی پر بھی بہت سے لوگ گذر کرتے ہیں کچھ لوگ فوج میں بھی ممتاز عہدوں پر ہیں۔

تجارت کے کام میں لوگ حسب ذیل طریقے پر لگے ہوئے ہیں:۔

۱۔ بساط خانہ کے کام میں۔ اس میں کنگھی کنگھا، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ پاؤڈر، ٹوتھ برش، چاقو، تالہ، اسٹیشنری، خوشبوئیں، ویسلین کریم، سنگار کا دوسرا سامان، تاشس، شیونگ کا سامان، بلیڈز، ہر قسم کے بٹن، ریل، سوئی، کروشیا، نیٹنگ کی سلائیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جو چیز بھی فروخت کے قابل ہو جائے اسے بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ دہلی میں بساط خانہ کا جتنا کام ہوتا ہے اس کا پچھتر فی صدی حصہ اس برادری کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے پہلے سو فی صدی کام اس برادری کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اب ہندوؤں اور دوسری برادریوں کے لوگوں کے ہاتھ میں بھی چلا گیا ہے۔

۲۔ ہوزری کے کام میں:۔ اس میں موزہ، بنیان، رومال، دستانے اور چھتریاں شامل ہیں یہ کام پچیس فی صدی اس برادری کے پاس ہے سوائے ایک ہوزری نٹنگ مل کے باقی تمام کارخانے چونکہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں اس لئے وہ اپنی ایجنسیاں ہندو دوکانداروں کو دیتے ہیں یا خود قایم کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود دوکانیں پچاس فی صدی مسلمانوں کی ہیں لیکن اس تجارت میں ان کا تناسب بصورت مجموعی پچیس فی صدی ہی سمجھنا چاہئے۔ پہلے جب مال جاپان سے آتا تھا تو اس برادری کے لوگوں کا تناسب تجارت میں پچھتر فی صدی کے قریب تھا۔

۳۔ گلاس ویری کے کام میں:۔ اس میں شیشہ، چینی، تام چینی کے برتن، پنکھے، کانٹے چھریاں، لالٹین، اسپرٹ لمپ، اسٹوو، آئس کریم کی مشین اور دوسری گھریلو مشینیں شامل ہیں۔ یہ کام تقریباً سو فی صدی اسی برادری کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ دیسی مال کے کارخانے ہندوؤں کے ہیں۔ البتہ ایک کارخانہ خیشل ذیل ورکس کے نام سے اس برادری کے ہاتھ میں ہے۔

۴۔ خوراکی سامان کے کام میں:۔ اس میں بسکٹ، ٹافی، چائے، چاکلیٹ، مکھن، جام۔

پریزروڈ فروٹ مچھلی، سگریٹ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کام پچھتر فی صدی اس برادری کے ہاتھ میں ہے
کشمیری دروازے اور کناٹ پلیس کے ہندو دوکاندار بھی چلنے والی چیزیں صدر بازار ہی سے لیتے
ہیں۔ یہ کام پہلے بھی پچھتر فی صدی اس برادری کے ہاتھ میں تھا۔ ایک فیکٹری، پیراڈائز بسکٹ فیکٹری
کے نام سے برادری کے ایک شخص کی ہے اور کاٹیج انڈسٹری کے طور پر جام جیلی وغیرہ کے بہت
سے کارخانے ہیں۔

۵۔ **سوت گولے کے کام میں:** یعنی سوت کا ریل اور پیچک بنانا جو سلائی کی مشین وغیرہ
میں کام آتا ہے، اسی میں مرسرائز کیا ہوا کڑھائی بنائی کا گولہ بھی شامل ہے۔ یہ کام اس برادری کے
پاس پچھتر فی صدی ہے۔ اس کام کے بارے میں ایک نہایت اچھا مضمون "دہلی کی سوت گولے کی
صنعت" کے عنوان سے ماہنامہ پنجابی گزٹ دہلی بابت نومبر ۱۹۴۴ء میں محمد عمر الٰہی صاحب نے اپنی ذاتی
واقفیت، تجربہ اور تحقیقات کی بنا پر شایع کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بتلایا ہے کہ سوت
کا گولہ پہلے انگلستان سے آیا کرتا تھا۔ ہندوستان میں سوت گولہ بنانے کا کام سب سے پہلے بیسویں صدی
کے آغاز میں دہلی کی پنجابی مسلمان برادری نے شروع کیا اور جنگِ عظیم اوّل کے زمانے میں اس کام سے
انھوں نے خوب نفع حاصل کیا۔ بعد میں ہندو برادرانِ وطن بھی اس صنعت میں شریک ہو گئے لیکن
ابھی تک اس کا پچھتر فی صدی کام پنجابی برادری ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کام ابتداءً کاٹیج انڈسٹری
کے طور پر شروع کیا گیا تھا لیکن جنگِ عظیم اوّل کے بعد سے اس نے اچھے خاصے کارخانہ کی صورت
اختیار کر لی ہے۔ پہلے دہلی کے کارخانے والے موٹا سوت ہندوستان سے اور باریک سوت انگلستان
سے حاصل کیا کرتے تھے لیکن ۱۹۳۰ء میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مشترکہ ملکیت میں کوہ نور مل
بمبئی کے قایم ہو جانے کے بعد باریک سوت بھی ہندوستان ہی سے حاصل کیا جانے لگا۔

عمر الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ "انگلستان کے سوت گولے، ریل پیچک بنانے والے کارخانوں
کو جب ہندوستان کے مارکیٹ میں شکست ہوئی تو انھوں نے ایک منظم اسکیم کے مطابق ۱۹۳۶ء میں
دہلی اور بمبئی میں اپنے دو کارخانے جبنا تھریڈ مل کے نام سے قایم کئے اور ان میں ہر ہی اقسام بنانی شروع

گئیں جو دہلی کے کارخانے بنارہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کارخانوں کے لئے چودہ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا تھا جب کہ دہلی کے تمام چھوٹے بڑے کارخانوں کا کام میں آنے والا سرمایہ (ورکنگ کیپٹل) قبل از جنگ بمشکل اس کے برابر تھا لیکن چونکہ اس انگلستان کی کارخانہ کا قیام ایک انتہائی انتشار کے دور میں ہوا تھا اس لئے دہلی کی صنعت پر یہ ابتدا میں اثر انداز نہ ہوسکا۔

۱۹۳۹ء کی جنگ عظیم ثانی نہ صرف دہلی کے بڑے بلکہ گرتے ہوئے متوسط درجے کے کارخانوں کے لئے امید اور زندگی کا پیغام لے کر آئی۔ سوت کی سپلائی کے سب سے بڑے مرکز کوہ نور مل کے مال کا بیشتر حصہ جنگی ضروریات کے لئے مخصوص ہوگیا۔ سوت بمشکل اور کمی کے ساتھ دستیاب ہونے لگا اس کمی کے سبب مسلسل قیمتیں بڑھتی گئیں۔ کمیابی کے اس دور میں جمنا تھریڈ مل کے انگریزی کارخانے نے جس کی شاخیں دہلی اور بمبئی میں قایم تھیں خوب ہاتھ پیر پھیلائے۔ اس نے اپنے خاص اثر و رسوخ سے کوہ نور مل سے زیادہ سے زیادہ سہولیت حاصل کی۔ سنا ہے کہ بمبئی کے ایک دوسرے مل کو بھی اپنے سرمایہ کی قوت پر اپنے لئے اچھے قسم کا سوت بنانے کے لئے تیار کیا اور اپنے کارخانے کی پیداوار بڑھاتا چلا گیا۔ دہلی کے سوت گولے کے کارخانہ دار اس بات پر مگن رہے کہ ان کی پیداوار کم ہورہی ہے تو پرواہ نہیں نفع تو کافی ہوجاتا ہے۔ اس غفلت سے اس انگریزی کارخانے نے بڑا فائدہ اٹھایا اور نسبتاً ان سے کچھ کم نرخ پر ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی منڈی میں اپنا مال بھیجتا اور جڑ پکڑتا رہا۔ اسی عرصہ میں انکی تھریڈ مل لمیٹیڈ کے نام سے بمبئی میں ایک اور انگریزی کارخانہ قایم ہوا اور ۱۹۴۳ء سے خود کوہ نور مل نے سوت کے ٹیوب ریل بنانا شروع کر دئے۔"

سوت گولے کی صنعت میں ان نئے اور خطرناک حریفوں کے داخلہ کی طرف توجہ دلانے کے بعد عمر الہٰی صاحب نے اپیل کی ہے کہ "آج دہلی کے بکھرے ہوئے سوت گولے کے چھوٹے بڑے کارخانوں کو اپنی حالت کا جائزہ لینا اور آنے والی کل کے لئے ان لکھ پتی کروڑ پتی جمنا تھریڈ مل انکی تھریڈ مل اور کوہ نور مل جیسے اداروں سے مقابلہ کے متعلق نہ صرف غور کرنا بلکہ تیار ہونا ہے......

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس ضمن میں آج ہماری غفلت نہ صرف دہلی کی مرکزیت، ہندوستان کے قومی

سرمایہ۔ بلکہ ہماری انفرادیت تک کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گی .... یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جنگ کے بعد سوت گولے کی صنعت چند ہزار روپئے سے قایم نہیں رکھی جاسکتی اس کے لئے مشترکہ سرمایہ سے بڑے بڑے اداروں سے قایم کرنے کی ضرورت ہے .... آج کی صنعت اور آج کی تجارت سیاسی دماغ اور سیاسی چالوں سے قایم رکھی جاسکتی ہے۔ سوت گولے کی صنعت میں منڈیوں کی جنگ شروع ہو چکی ہے .... آج ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ سوت والوں کو ایک ایک کر کے فنا کے گھاٹ اُترنا ہے یا متحد ہو کر مشترکہ سرمایہ سے اپنی صنعت و تجارت کو برقرار رکھنا ہے۔"

غرض عمر الٰہی صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہر چند موجودہ جنگ کے زمانے میں سوت گولے کے کام سے پنجابی برادری کے لوگوں نے خوب نفع کمایا ہے اور ابھی تک ان کا حصہ اس کام میں پچھتر فی صدی کے قریب ہے۔ لیکن آئندہ کے لئے کچھ ایسے خطرناک حریف پیدا ہو گئے ہیں جن کی طرف سے ڈر ہے کہ اگر یہ کام حسب سابق کم سرمایہ سے بکھرے ہوئے طریقہ پر جاری رکھا گیا تو کہیں اس برادری کے لوگوں کو مقابلہ میں ناکام نہ ہونا پڑے۔

۶۔ الکٹرک گڈز اور ٹارچ کا کام:۔ اس برادری کے پاس دس فی صدی ہے۔

۷۔ کھلونے کا کام:۔ اس برادری کے پاس ساٹھ فی صدی ہے۔

۸۔ ٹاٹا کے کارخانہ کی بنائی ہوئی ٹین کی پلیٹس کے سول ایجنٹ اسی برادری کے ایک صاحب ہیں۔

۹۔ فیتے، چین اور ربن تیار کرنے اور ان کے اور بیلوں کے فروخت کرنے کا ستر فی صدی کام اسی برادری کے ہاتھ میں ہے۔

۱۰۔ سائکل کا کام:۔ پندرہ فی صدی اس برادری کے ہاتھ میں ہے۔

۱۱۔ لوہے اور پیتل کا:۔ پانچ فی صدی کام اس برادری کے ہاتھ میں ہے۔

۱۲۔ ٹائل، پائپ، سینٹری گڈز، باتھ روم کا سامان اور گلاس:۔ چالیس فی صدی

کام اس برادری کے ہاتھ میں ہے۔

۱۳۔ پینٹ اور وارنش:۔ پچاس فی صدی کام اس برادری کے ہاتھ میں ہے۔

۱۴۔ چمڑے۔ کا دس فی صدی کام۔

۱۵۔ چھاپے خانہ کا دو فی صدی کام۔

۱۶۔ ایمونیشن کا پچہتر فی صدی کام۔

کپڑے، بیل، فیتے اور چین کو برادری کے کچھ لوگ پھیری کر کے بھی بیچتے ہیں۔ ان کے علاوہ تجارت کی دوسری لائنوں کو بھی آزما رہے ہیں۔ کچھ نے غلہ کا کام بھی چھوٹے پیمانے پر شروع کر رکھا ہے۔ کچھ نے پنساری کا کام، حلوائی کا کام، عمارتی لکڑی، لکڑی کی ٹالیں۔ انگریزی دوائیں۔ پٹرول پمپ۔ جوتے کے کارخانے۔ گوٹے کے کارخانے۔ زردوزی کے کارخانے مشین کی کڑھائی کے کارخانے۔ ڈیری، گھڑی کا کام اور ہوٹل کا کام بھی شروع کر رکھا ہے فلم ڈسٹری بیوٹری کا کام بھی کچھ لوگوں نے کیا تھا اور اب بھی بعض حضرات اس لائن میں سرمایہ لگاتے رہتے ہیں۔

کل پندرہ ہزار آبادی میں سے اندازاً چار ہزار آدمی دوکانوں اور کارخانوں کے کام سے لگے ہوئے ہیں۔ کچھ اپنے ہم قوم پنجابیوں کی دوکانوں اور کارخانوں میں شاپ اسسٹنٹ اور کلرک وغیرہ کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ کچھ لوگ اپنے ہاتھ سے صابن، برش، پالش، پرفیومری چمڑے کے بٹوے وغیرہ بنانے کا کام کرتے ہیں۔ پنجابی برادری کی کل چھ سو فرمیں[1] ہیں جن میں سے تین سو کے قریب دوکانیں اور کارخانے صدر بازار میں ہیں اور تقریباً اتنے ہی دوسرے بازاروں میں ہیں۔ صدر بازار میں تین سو پنجابی فرموں کے علاوہ ڈھائی سو ہندو فرمیں اور ستر اسی مسلم فرمیں ہیں جن کا تعلق پنجابی برادری سے نہیں ہے۔ لیکن یہ زیادہ تر چھوٹا کام کرتے

---

[1] یہ اعداد [illegible] جاتا ہے کہ اس کے بعد سے ان فرموں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے تقریباً دوگنی ہو گئی ہیں، اسی نسبت سے اس فن کے دوسرے تمام اعداد کو بھی دوگنا کیا جا سکتا ہے۔

ہیں۔ صرف کچھ ایسے ہیں جو تھوک کا بڑا کام بھی کرتے ہیں۔

پنجابی برادری کے کارخانے پنجابی برادری کی مندرجہ بالا چھ سو فرموں میں سے تقریباً سو کارخانے ہیں: دہلی میں سوت گوٹے کے کل باون کارخانے ہیں جن میں سے تیس کارخانے پنجابی قوم کے ہاتھ ہیں۔ دس صابن کے کارخانے بھی اس برادری کے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے علاوہ نواڑ۔ لالٹین کی بتی۔ بابن ڈوری۔ فیتا لیس، ہوزری اور کپڑے کے بھی کارخانے ہیں، ان میں سے بعض کی حیثیت فیکٹریوں کی ہے۔ مثلاً بابن، لالٹین کی بتی اور نواڑ کی فیکٹریاں ہیں جن میں سے ایک ایک میں پچاس سے اسی ہزار کے درمیان سرمایہ لگا ہوا ہے تیس چالیس مزدور روزانہ کام کرتے ہیں۔ بجلی سے مشین چلتی ہے۔ پنجابی برادری کے ہاتھ میں لالٹین کی بتی کی تین فیکٹریاں ہیں اور نواڑ کی دو اور بابن کی ایک فیکٹری ایسی ہے جس میں بابن، نواڑ فیتا تیار کیا جاتا ہے اور سوت پر گلیزنگ بھی کی جاتی ہے۔ یہ سوت پتنگ اڑانے کے کام میں آتا ہے۔ ایک اور فیکٹری کاملین لیس مل کے نام سے ہے۔ ایک ہوزری نٹنگ مل بھی ہے اور ایک پنجابی کلاتھ مل ہے جس کا کام پہلے چھوٹے پیمانے پر تھا لیکن رفتہ رفتہ ترقی کر رہا ہے۔ اس میں صرف بنائی کا کام کیا جاتا ہے اور کرگھے چلانے کے لئے الکٹرک پاور استعمال کی جاتی ہے لیکن سوت باہر سے لیتے ہیں اور سوتی اور ریشمی ملا کر کپڑا تیار کرتے ہیں۔ کل بڑے کارخانے سوت کے کارخانوں کے علاوہ دس کے قریب ہیں جن میں دس سے پندرہ لاکھ کے درمیان مجموعی طور پر سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے کارخانے چلائے جا رہے ہیں مثلاً چق، پھندے، کرسے، جھنجھنے، گلٹ کے زیورات اور تالوں کے کارخانے۔ بیٹری کے ٹھیک کرنے اور دیسی بیٹری کے تیار کرنے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ پیتل اور لوہے کے سامان کے سرکاری ٹھیکے اور بجلی کے کام کے ٹھیکے بھی لیتے ہیں اور کاریگروں سے جو اپنے گھر پر کام کرتے ہیں۔ مال تیار کرا کے فراہم کرتے ہیں۔

دیگر پیشے برادری میں دس بارہ وکیل ہیں، دس بارہ حکیم ہیں۔ ایک ڈاکٹر ہیں۔ الکٹرک میڈیکو

ابد گمڑی کے مستری تقریباً سو کے قریب ہیں۔

دیگر شہروں میں برادری کے کارخانے

سہارنپور میں:- دو ہوزری فیکٹریاں جو بڑے پیمانے پر دیہاتی ضروریات کا مال بناتی ہیں۔

علی گڈھ میں:- تالے کے کارخانے۔

کلکتہ میں:- تیل صاف کرنے کا کارخانہ۔ ادویات کے دو بڑے کارخانے جس میں نہ صرف ادویات بلکہ فنائل کی گولیاں وغیرہ بھی تیار ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک فرم کے مالک حاجی محمد اللہ صاحب ہیں جو علم کیمیا سے غیر معمولی شغف رکھتے ہیں اور سماجی اور تعلیمی کاموں کے لئے فیاضی کے ساتھ روپیہ دیتے ہیں۔

برادری کا انتظام اور اس کی انجمنیں

برادری کا نظام بہت اچھی طرح قایم ہے۔ صرف نصف فی صدی موقع ایسا ہوتا ہے کہ برادری سے باہر شادی ہوتی ہے ورنہ باہر شادی نہیں ہوتی۔ جن لڑکیوں کی شادی کہیں باہر ہو جاتی ہے وہ ان کی اولاد برادری میں ایک طرح سے اچھوت سی بن جاتی ہے اور برادری کی انجمنوں سے ان کو کسی قسم کی امداد نہیں ملتی اور نہ برادری کے لوگ عام طور سے ان کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ باہر کی لڑکی اگر اتفاق سے آجاتی ہے تو وہ رفتہ رفتہ برادری میں شامل ہو جاتی ہے اور اس کے بچوں کے ساتھ تو کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ برادری میں باہر شادی نہ کرنے کا یہ رجحان صرف معاشی وجوہ سے ہے۔ یعنی اس لئے کہ جائداد اور پیسہ برادری سے باہر نہ جانے ورنہ دوسرے تمام تعلقات و معاملات میں کسی دوسری برادری کے لوگوں کو پنجابی برادری کے لوگ اپنے سے کم تر یا بہتر نہیں سمجھتے۔

برادری کی صرف ایک انجمن ہے یعنی انجمن وکیل قوم پنجابیان۔ یہ انجمن ان اوقاف کا انتظام کرتی ہے جو اس کی نگرانی میں دے دئے جاتے ہیں۔ انجمن کے انتظام میں جو اوقاف ہیں اور انجمن کی خریدی ہوئی اور بنائی ہوئی جو جائداد ہے ان سب کی مالیت تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ ہوتی ہے اور

ان سے سالانہ مستقل آمدنی تقریباً بارہ ہزار روپیہ کی ہے اس آمدنی سے مدرسے چلائے جاتے ہیں۔ اور امداد بیوگان کا کام کیا جاتا ہے اور قبرستان کا انتظام نیز مستحق لوگوں کے لئے مفت کیا جاتا ہے۔ پنجابی اسکول سے میٹرک پاس کر کے جو پنجابی طلباء اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کو وظائف دیئے جاتے ہیں جس کے لئے پانچ سو روپیہ سالانہ کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے اس فنڈ میں اس وقت کافی روپیہ جمع ہے، جو لوگ صنعت کا کام شروع کرتے ہیں ان کی بھی سرمایہ سے امداد کی جاتی ہے اور اس کی صورت ابھی تک عطیہ کی رہی ہے۔ شادی کے موقع پر غربائے قوم کی لڑکیوں کو ضروریات شادی کے لئے امداد دی جاتی ہے۔ یہ انجمن سنہ ۱۹۰۶ء میں قائم کی گئی تھی اور اس نے پنجابی اسکول کو سنہ ۱۹۰ء میں قائم کیا تھا۔

برادری سے خارج کرنے کا کام انجمن نہیں کرتی۔ نہ خاندانی جھگڑے انجمن طے کرتی ہے قوم کے بزرگ انفرادی طور پر ان جھگڑوں کا تصفیہ کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص اگر برادری سے باہر شادی کرتا ہے تو انجمن اس میں بحیثیت انجمن دخل نہیں دیتی۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ اٹھے جس کا برادری پر بحیثیت قوم اثر پڑتا ہو یا برادری کے تجارتی کاروبار پر اثر پڑتا ہو تو انجمن ارباب حکومت سے خط وکتابت کر کے یا شورش کر کے قوم کے جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔

پیدائش شادی اور موت کے اندراجات کرنے کے لئے انجمن کی طرف سے تین رجسٹر رکھے جاتے ہیں۔ ان اندراجات کو مکمل کرنے کے لئے منشی گھومتے رہتے ہیں۔ شادی کے لئے کوئی باقاعدہ قاضی نہیں ہوتے بلکہ جس مولوی سے عقیدت ہوتی ہے ان سے نکاح پڑھوالیا جاتا ہے۔ مہر عام طور پر گیارہ سو روپئے سے اکیاون سو روپئے تک ہوتا ہے اور یہ موجل ہوتا ہے

اس بڑی انجمن کے علاوہ کچھ اور دوسری اصلاحی انجمنیں بھی ہیں مثلاً (۱) یوتھ لیگ جس کے ساتھ ماہنامہ پنجابی گزٹ منسلک ہے (۲) بزم ادب جس کے ساتھ پنجابی پبلک لائبریری منسلک ہے اور (۳) انجمن ضیاء الادب جس کے ساتھ نیشنل پبلک لائبریری منسلک ہے۔

(۱) پنجابی یوتھ لیگ۔ یہ سنہ ۱۹۱۰ء میں لغو اور فضول رسوم کی اصلاح کے لئے جو برادری

تھیں خلاف شرع اسلام رائج ہوگئی تھیں اور جو گھن کی طرح برادری کے سرمایہ کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔
ایک انجمن پنجابی لیگ کے نام سے بنائی گئی تھی ۱۹۳۰ء میں اس لیگ کا کام بہت زور شور سے
چلا لیکن ۱۹۳۳ء میں یہ ختم ہوگئی اور اس کے بعد سے اس کی جگہ ابھی یک یوتھ لیگ کام کر رہی ہے
اس نے بہت سی رسومات کے سلسلے میں خرچ کی حد بندی کر دی ہے کہ اس سے زیادہ ان پر
برادری کا کوئی رکن خرچ نہیں کر سکتا۔ ذیل میں اس کی کچھ پابندیوں کو بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

زیور میں اسراف کو دور کرنے کے لئے ۱۹۱۰ء میں اسی تولہ سونا بیٹے والے اور ساٹھ تولہ
سونا بیٹی والے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ایسے سات آٹھ جوڑوں کی جگہ جن کی لاگت ڈھائی ڈھائی سو
پانچ پانچ سو فی جوڑہ سے کم نہیں ہوتی تھی اور صرف دیکھنے کے لائق ہوتے تھے دو جوڑے کر دئے
گئے تھے۔ اس کے بعد بھی برابر اصلاح ہوتی رہی اور بہت سی رسمیں بند ہوتی رہیں ۱۹۳۰ء میں ان
رسموں کے خلاف پورے طور پر کارروائی شروع کی گئی۔ لیگ نے تین بنیادی باتیں پیش کی تھیں

(۱) زیور میں زیادہ سے زیادہ سونا بیٹے والا چالیس تولہ اور بیٹی والا تیس تولہ دے سکتا تھا

(۲) جوڑے سو روپئے کی لاگت کے اندر دئے جائیں۔ اس حد کے اندر جتنے چاہیں جوڑے دے سکتے ہیں۔

(۳) "برا تا کھانا" بند کر دیا گیا۔ یہ کھانا پوری برادری کو کھلایا جاتا تھا اور اس میں دو ہزار
روپئے کے قریب خرچ ہو جاتے تھے۔

جو لوگ ان قاعدوں کی خلاف ورزی کرتے تھے ان کے یہاں پکٹنگ کی جاتی تھی اور ان سے
جرمانہ وصول کیا جاتا تھا۔ پنجابی لیگ نے جو جرمانے وصول کئے ان کی رقم کو پنجابی اسکول کے بلڈنگ
فنڈ کے لئے مخصوص کیا گیا۔ ان سختیوں کی وجہ سے برادری کے لوگ پنجابی لیگ کے مخالف ہوگئے
اور اس نے اس مخالفت کو برداشت نہ کرکے اپنا کام چھوڑ دیا۔ اس لیگ کے کارکن بڑی عمر کے
لوگ تھے۔ ان سے جھگڑا کھانے کی مخالفت پر ہوا تھا جس میں عبدالسلام صاحب کو بھی تھپڑ وغیرہ
کھانے پڑے تھے۔ غرض اس طرح پنجابی لیگ ٹوٹ گئی۔

اس کے بعد یوتھ لیگ نے جو نوجوانوں پر مشتمل تھی اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ یوتھ لیگ نے کھانے کی مکمل بندش پر تو زور نہیں دیا۔ البتہ یہ پابندی لگادی کہ ساری برادری کو صلائے عام نہیں ہوگی بلکہ جن کو دعوت دی جائے گی وہی لوگ دعوت میں آئیں گے۔ اب پانچ من کا کھانا پکوایا جاتا ہے اور صرف ایک کھانا پکوایا جاتا ہے۔ پہلے دس دس قسم کے کھانے ہوتے تھے اور ساری برادری کے لوگ چاہے انھیں بلاوا ہو یا نہ ہو آجاتے تھے اور زیادہ کھانے میں باقاعدہ باہمی مقابلہ ہوتا تھا۔ برادری کے نائی ڈوم برات کے کھانے کا اعلان کرتے تھے برات کا کھانا دینے کے لئے اب ایک شرط لگادی گئی ہے وہ یہ کہ جو برات کا کھانا دے وہ پچاس روپیہ پنجابی اسکول کو چندہ بھی دے۔

زیور کے سلسلے میں یوتھ لیگ نے بیس تولہ سونا بیٹے والے اور پندرہ تولہ سونا بیٹی والے کے لئے مقرر کردیا ہے۔ باقی سب رسوم شادی سے قبل، شادی کے دوران اور شادی کے بعد کی یکسر موقوف کردی گئی ہیں۔

۲۔ بزم ادب: پنجابی نوجوانوں کا ادبی شعبہ ہے جہاں نہ صرف قوم کے نوجوان مختلف عنوانات پر تبصرے اور تقریریں باقاعدہ جلسوں کی صورت میں کرتے ہیں بلکہ ملک کے اہل علم اور ممتاز مقررین سیاسی معاشی اور ادبی موضوع پر نہ صرف بزم ادب کے اراکین بلکہ علاقہ کے نوجوانوں کے سامنے تقریریں کرتے ہیں۔ اس بزم کے ساتھ پنجابی پبلک لائبریری بھی وابستہ ہے جس کے پاس تقریباً چار ہزار کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ روزنامہ، ہفتہ وار اور ماہانہ رسائل تقریباً چالیس آتے ہیں۔ یہ ادارہ ۹۹ فی صدی پنجابی قوم کے نوجوانوں اور بزرگوں سے عطیات لے کر چلایا جاتا ہے اس کے لئے میونسپلٹی سے امداد لینے کی کوشش جاری ہے۔ اس کتب خانہ کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عورتوں کی دلچسپی کی کتابوں کی ایک خاص فہرست علیحدہ تیار کی گئی ہے تاکہ عورتیں گھر بیٹھی کتابیں منگاسکیں۔ اسی طرح بچوں کی کتابوں کی فہرست بھی علیحدہ ہے۔ اس کی آمد فی پندرہ سو روپیہ سالانہ ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۳۳ء سے قائم ہے۔

(۴) اسی قسم کے کام انجمن ضیاء الادب بھی کر رہی ہے۔ لیکن اس کے کتب خانہ یعنی نیشنل پبلک لائبریری کے پاس کتابوں کا ذخیرہ زیادہ ہے۔ پنجابی پبلک لائبریری کے مقابلہ میں اس کی تقریباً سب چیزیں ڈیوڑھی ہیں۔ نیشنل پبلک لائبریری کو تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ میونسپلٹی سے امداد بھی ملتی ہے۔

غرض برادری کا انتظام اپنی جگہ پر قایم ہے اور اس کی انجمنیں اس نظام کو نئی ضرورتوں کے مطابق کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

محلوں اور گھروں کی صفائی سوائے پھاٹک حبش خاں کے اور تمام محلے جن میں پنجابی برادری کے لوگ آباد ہیں، عموماً صاف رہتے ہیں، ہر محلہ میں محلہ کمیٹی ہوتی ہے اور وہ صفائی کا یا تو خود انتظام کرتی ہے یا میونسپلٹی سے کراتی ہے۔ ہر محلے میں ورزش، ہریڈ والنٹیر کور، اسکاوٹ وغیرہ کا بھی انتظام رکھا جاتا ہے[۱]۔ حویلی حسام الدین اور کالے صاحب میں اسکاوٹس کا انتظام زیادہ باقاعدہ ہے۔ برادری کے لوگوں کے گھر بھی دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ صاف رہتے ہیں، گھر کی عورتیں گھر کو بہت صاف رکھتی ہیں۔ کپڑے چاہے سادہ ہوں لیکن گھر کو بہت صاف رکھا جاتا ہے۔

تندرستی تندرستی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ کیونکہ کھاتے پیتے تو زیادہ ہیں لیکن ورزش زیادہ نہیں کرتے۔ ان کا دوکان پر یا گھر میں بیٹھنے کا کام ہوتا ہے، صحت کی خرابی، صفائی کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ورزش کی کمی کی وجہ سے ہے۔ پردہ بھی بہت سخت ہے۔ سوائے مخصوص رشتہ داروں کے سب سے پردہ کیا جاتا ہے۔ خالہ کے بیٹوں، شوہر کی بہن کے شوہر سے بھی پردہ کیا جاتا ہے۔ چچا کے بیٹوں سے بھی پردہ کیا جاتا ہے۔ ڈولی میں، موٹر میں، تانگے میں پردہ لگاکر جاتی ہیں۔ لیکن جاتی ہر جگہ ہیں۔ سیر تفریح کے مقامات پر بھی جاتی ہیں لیکن برقعہ اور پردہ ضرور ہوتا ہے۔ برقعے عموماً سادہ ہوتے ہیں۔ بچوں کی تندرستی کو بہتر کرنے کی کوشش جاری ہے۔ پنجابی اسکول میں گیمس کا انتظام اچھا ہے۔

---

[۱] یہ کام جنگ کے ہنگامی زمانہ میں جب تحقیقات کی گئی تھی باقاعدگی سے کئے گئے تھے۔ اب یہ سب ختم ہوگئے ہیں۔

تعلیم | پنجابی قوم میں عورتوں اور مردوں کی تعداد تقریباً برابر ہے۔ یعنی تقریباً سات سات ہزار ہے ان سات ہزار مردوں میں سے تقریباً ۳۵ سو کی عمر پچیس سال سے زیادہ اور ۳۵ سو کی پچیس سال۔ سے کم ہے۔ جن مردوں کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ ہے ان میں تعلیم کا تناسب حسب ذیل ہے:۔

ناخواندہ = ۲۳ فی صدی۔ خواندہ = ۷۷ فی صدی۔ میٹرک = ۵ فی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ = ۲ فی صدی

جن مردوں کی عمر پچیس سال سے کم ہے ان میں تعلیم کا تناسب حسب ذیل ہے

ناخواندہ = ۵ فی صدی۔ خواندہ = ۹۵ فی صدی۔ میٹرک = ۴۰ فی صدی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ = ۵ فی صدی

پنجابی ہائی اسکول مکمل طور پر پنجابی برادری کی نگرانی میں اور اس کے علاوہ فتحپوری مسلم ہائی اسکول اور صدیقیہ مڈل اسکول پنجابیوں ہی کی نیم نگرانی میں چل رہا ہے۔ مارس گائر کی اسکیم میں پنجابی ہائی اسکول ہائر سکنڈری اسکول کی اسکیم میں شامل ہو گیا ہے۔

عربی مدارس جو پنجابی قوم کی سرپرستی میں چلتے ہیں ان میں اہلِ حدیث کے مدرسوں کو سو فی صدی پنجابی قوم چلاتی ہے۔ ایسے بارہ مدرسے چلتے ہیں جن میں چھ سو طلبا رباہر کے پڑھتے ہیں۔ ان مدرسوں میں کھانے رہنے سب چیزوں کا انتظام اہلِ حدیث کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ احناف کے مدرسوں کی تعداد اہلِ حدیث سے زیادہ ہے۔ طلبار کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ لیکن ان کا پورا بار پنجابی قوم پر نہیں ہے۔

میونسپلٹی کے مدرسوں میں پنجابی قوم کے لڑکے بہت کم پڑھتے ہیں۔ قرآن خوانی کے مکتب ہر محلہ اور مسجد میں ہوتے ہیں لیکن ان میں پنجابی کی تخصیص نہیں ہوتی۔ حافظ بے انتہا ہیں۔ پالی ٹیکنک میں پنجابی قوم کے دس بارہ سے زیادہ بچے نہیں ہوں گے۔ گریجویٹ دو سو ہوں گے: ایم اے پانچ ہیں۔ وکیل پندرہ یا بیس ہیں۔ ایک کیمسٹ ہیں۔ اور ایک عالم بھی ہیں۔

عورتوں میں تعلیم کا تناسب مردوں سے کم ہے۔ نوجوان لڑکیوں میں خواندہ کا تناسب ۶۰ فی صدی ہوگا۔ عمر رسیدہ عورتوں میں بیس فی صدی۔ قرآن شریف پڑھی ہوئی تقریباً سو فی صدی

ہوتی ہیں۔ میٹرک تیس چالیس ہیں۔ گریجویٹ بھی ایک دو ہیں۔

لڑکیوں کے لئے تین مدرسے ہیں۔ ایک بڑا اسکول محلہ کالے صاحب کے سامنے امینہ گرلز اسکول کے نام سے ہے اس کے لئے دو لاکھ روپئے کی جائداد وقف کر دی گئی ہے اور اس سے یہ مدرسہ ہر قسم کی امداد سے بے نیاز ہو کر چلتا رہتا ہے۔ اس کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہے۔ اس کی صدر محمد امین صاحب سنگاپور والے کی بیگم ہیں جنہوں نے دو لاکھ روپئے کی جائداد اس کے لئے وقف کی ہے۔ اس کے سکریٹری ممتاز الدین صاحب چشمہ والے ہیں اور اراکین میں کچھ مرد اور عورتیں ہیں اس میں تین سو لڑکیاں پڑھتی ہیں اور دہلی کے ہر کونے سے رکشاؤں اور ڈولیوں میں یہاں پڑھنے کے لئے لڑکیاں آتی ہیں۔ استانیوں اور استادوں میں پنجابی قوم کی کوئی قید نہیں ہے۔ صرف پنجابی ہندی سکھانے کے لئے ایک پنجابی استاد مقرر رکھا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے لئے امینیہ کے علاوہ دو مدرسے اور ہیں۔ ایک حافظ حمید اللہ کا قائم کیا ہوا محلہ کشن گنج میں اور دوسرا اہلیہ فضل الرحمن کا قائم کیا ہوا بارہ دری نواب وزیر میں مالک [illegible] خاں ہیں۔ لیکن ان کا بار ان دونوں حضرات کی ذات پر ہے۔ ان کے لئے کوئی مستقل وقف نہیں ہے۔

عورتوں اور لڑکیوں میں یہ رجحان ہے کہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کی جائے لیکن مردوں میں عورتوں کی تعلیم کا احساس ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم کا معیار بھی مردوں کے برابر ہو۔

اخلاقی حالت پنجابی قوم میں من حیث القوم تو برائیاں نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں میں ضرور برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن رائے عامہ ان کے اس قدر خلاف ہے کہ ان کو یہ برائیاں چھوڑنا پڑتی ہیں۔ نوجوانوں میں اصلاح کا اتنا جذبہ ہے کہ وہ لوگ عام طور پر سگریٹ پینے کے روادار نہیں ہیں۔ چند گوٹوں میں کچھ لوگ رنگین مزاج ہیں لیکن نوجوانوں میں بالکل نہیں ہیں۔ [illegible] ہو کے ایک [illegible] جاتا۔

اعزازی عہدے پنجابی قوم میں چار خاں بہادر ہیں اور ایک خان صاحب ہیں۔ جو میونسپل کمیٹی کے ممبر [illegible] کمیٹی کے معاملات میں ان کا خاصہ دخل رہتا ہے۔ تیجۂ

ممبروں میں سے پانچ پنجابی منتخب ہوئے۔ ایک نمائندہ انجمن وکیل قوم پنجابیان کی طرف سے قسطنطنیہ میں پہنچا۔ مقامی مسلم لیگ کے سکریٹری عبدالسلام صاحب بی۔ اے بھی اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں

برادری کے ممتاز لوگ

برادری میں تین حیثیتوں سے لوگ ممتاز سمجھے جا سکتے ہیں۔ کچھ سوشل کام کرنے کی وجہ سے۔ کچھ پولٹیکل کام کرنے کی وجہ سے اور کچھ لٹریری کام کی وجہ سے۔

سوشل کام کرنے والوں میں جس میں تعلیم بھی شامل ہے خان بہادر حافظ محمد صدیق صاحب ملتانی۔ خان بہادر حاجی رشید احمد صاحب اور حاجی کرم الٰہی صاحب گلٹ والوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ درمیانی عمر کے لوگوں میں شیخ عبدالسلام صاحب بی۔ اے۔ شیخ عطاءاللہ صاحب چشمہ والے۔ شیخ محمد عمر صاحب لیس والے اور فضل حسین صاحب کے کام لائق ذکر ہیں۔ نئی عمر کے لوگوں میں محمد رفیع صاحب کپڑے والے۔ محمد عمر الٰہی صاحب اور محمد عبدالالٰہی صاحب لائق ذکر ہیں

پولٹیکل کام کرنے والوں میں ہر خیال کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مسلم لیگی بھی ہیں جمعیتہ العلما کے ماننے والے بھی ہیں اور چند کانگریسی بھی ہیں اور چند کمیونسٹ بھی ہیں۔ کانگریس اور جمعیتہ العلماء کے خدمت کرنے والے بڑی عمر کے لوگوں میں محمد عثمان صاحب گھڑی والے۔ جمعیتہ العلماء ہند اور شیخ محمد تقی صاحب وکیل کانگریس سے تعلق رکھتے ہیں، اور خان بہادر محمد جان صاحب آل انڈیا مسلم مجلس کے جائنٹ سکریٹری ہیں۔ مسلم لیگ سے دلچسپی لینے والوں میں بوڑھے سے بچے تک تقریباً نوے فی صدی مرد اور عورتیں ہیں جن میں عبدالسلام صاحب بی۔ اے کا نام خاص شہرت کا مالک ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کچھ کمیونسٹ بھی ہیں۔ ان میں محمد یامین صاحب جامعی دہلی کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری ہیں۔

لٹریری کام کرنے والوں میں صرف نئی نسل کے نوجوان ہیں جو اچھا خاصہ لکھ لیتے ہیں۔ بڑی عمر اور درمیانی عمر کے لوگوں میں اس قسم کا ذوق نہیں ہے۔ ان میں لائق ذکر نام مسترت کلام صاحبہ اور مونس شبیر صاحبہ کے خواتین میں ہیں۔ اور نوجوان مردوں میں محمد احمد صاحب، منظور احمد صاحب عمر الٰہی صاحب، جمیل الرحمٰن صاحب، عبدالالٰہی صاحب اور سلطان احمد صاحب کے ہیں۔ شعرا میں

حافظ محمد صدیق صاحب رئیس اعظم کانپور اور شیخ محمد صالحین صاحب انبالے والے کے نام قابل ذکر ہیں۔

برادری کی مالی حیثیت[1]

برادری میں کم سے کم ایک کروڑپتی ہیں۔ چھ سات پچاس لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان حیثیت رکھتے ہیں دس لاکھ اور پچاس لاکھ کے درمیان حیثیت رکھنے والے پچاس کے قریب ہیں۔ ایک لاکھ اور دس لاکھ کے درمیان ڈیڑھ سو سے زیادہ ہیں۔ پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان تین سو سے زیادہ ہیں۔ دس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان ایک ہزار کے قریب ہیں اور ایک ہزار اور دس ہزار کے درمیان ہر اس شخص کو سمجھنا چاہیے جس کی شادی ہو گئی ہے۔ کیونکہ تقریباً ایک ہزار کا تو جہیز ہی مل جاتا ہے اور اس کے نیچے بقیہ سب ہیں۔

برادری کا سرمایہ مختلف کاموں میں

برادری کا سرمایہ صحرائی جائداد میں بہت کم لگا ہوا ہے اندازاً دو فی صدی، شہری جائداد میں تقریباً پچاس فی صدی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ فیکٹری اور کارخانوں میں پندرہ فی صدی۔ دوکانوں وغیرہ میں ۳۰۵ فی صدی، اس میں سے ملوں کے حصوں اور سرکاری قرضوں میں ایک فی صدی سے کم سمجھنا چاہیے۔ چار پانچ آدمی سود کا لین دین بھی غیروں کے ساتھ کرتے ہیں لیکن قوم میں ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس میں سے پانچ فی صدی فوجوں میں کافی کی دکانوں کے اور ہیں۔ قسم ملیٹری کے کنٹریکٹر بھی ہیں۔ سونا اس برادری کے پاس کافی رہتا ہے۔ لیکن جواہرات وغیرہ بہت کم ہیں۔ جن لوگوں کی حیثیت ایک لاکھ سے زائد ہے وہ موٹر بھی رکھتے ہیں۔ عورتوں کے کپڑوں کا خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کافی قیمتی کپڑے ہوتے ہیں اور بعض وقت حیثیت سے زیادہ ہوتے ہیں۔ گھروں میں تانبے کے برتن استعمال کئے جاتے ہیں۔ چینی، تام چینی اور شیشوں کے برتن کا استعمال کم ہوتا ہے۔ عورتیں کفایت شعار ہوتی ہیں۔ آسائش کے سامان میں قالین، دری، چاندنی، پلنگ پوش وغیرہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کوئی گھر چاندنی اور دری سے خالی نہیں ہوتا۔ موسیقی میں گراموفون اور ریڈیو کا استعمال ہوتا ہے۔ قلمی کتابیں اد۔

---

[1] یہ صورت حالات [illegible] تھی اس کے بعد قیمتوں کے غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے لوگوں کی مالی حیثیت میں بہت زیادہ نسبتاً ترقی ہو گئی ہے۔

نوادر بہت کم ہیں۔ قرضہ کاروبار کی ضرورت کے لئے دوسروں سے لیا جاتا اور دیا جاتا ہے۔ لیکن دوسروں کے روپے پر قوم انحصار نہیں کرتی۔

برادری کے چار پانچ افراد ولیوں کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔

برادری کے فیملی بجٹ پنجابی برادری میں متمول، اوسط اور غریب ہر ایک طبقہ کے افراد عام طور سے اپنے اپنے کنبہ والوں کے ساتھ مل جل کر مشترکہ کنبوں کی صورت میں نہیں رہتے بلکہ چھوٹے چھوٹے خاندان کی صورت میں علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ باپ اور بیٹا، بیٹے کی شادی ہوجانے یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ اولاد ہوجانے کے بعد علیحدہ ہوجایا کرتے ہیں۔

برادری کا غریب طبقہ پنجابی برادری کے غریب طبقہ سے مراد ایسے اہل و عیال والے افراد ہیں جو بیس روپے ماہوار سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار[1] تک نوکری یا کسی دستکاری سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی آمدنی اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں جو نہایت کفایت شعاری سے اسے خرچ کرتی ہے۔ مرد سوائے کبھی کبھی بائسکوپ جانے کے اور اپنے برابر والوں سے گپ شپ کرنے کے کوئی خاص شوق نہیں کرتے۔ بازار میں کھانا پینا عیب نہیں تو کچھ اچھا بھی نہیں سمجھتے۔ مرد پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بہت سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ ان کی پوشاک پر اوسطاً تین چار روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہیں ہوتا عورتیں کپڑوں پر کافی خرچ کرتی ہیں۔ عام طور سے ولایتی بدیسی کپڑا پہنا جاتا ہے۔ گھر میں سفید وائل، چکن اور تقریبات کے موقع پر کریپ، جارجٹ، نشہ وغیرہ پہنا جاتا ہے۔ غذا میں گوشت بہت کافی کھایا جاتا ہے۔ پنجابی عورتیں کھانا پکانے میں بڑی ماہر ہوتی ہیں۔ مرد عام طور سے اپنی حیثیت کو سمجھتے ہیں لیکن عورتیں برادری کے مظاہروں میں مالدار خواتین کے آگے اپنی کم مائیگی کے اظہار کے مواقع نہیں آنے دیتیں۔ ان سب کے

---

[1] یہ اعداد اپریل ۱۹۳۵ء کے ہیں جب تحقیقات کی گئی تھی اس کے بعد آمدنی اور خرچ میں زر کی قوت خرید کے کم ہوجانے کی وجہ سے اضافہ ہوگیا ہے۔

ماہوار خرچ کا اوسط حسب ذیل ہوتا ہے:۔

برادری کا متوسط طبقہ | خوراک ۴۰ فی صدی۔ کپڑا ۲۵ فی صدی۔ رہائش ۲۵ فی صدی۔ رسوات ۵ فی صدی۔ علاج ۳ فی صدی۔ پس انداز ۲ فی صدی۔

متوسط طبقے سے ایسے خاندان مراد ہیں جن کے وسائل آمدنی ایک سو سے دوسو روپے ماہوار تک ہیں۔ پنجابی برادری میں یہ طبقہ تعداد میں دوسرے دونوں طبقوں سے زیادہ ہے۔ یہ اپنی آمدنی کا ۵ فی صدی حصہ اپنی شریک زندگی کو دیتے ہیں جو جملہ اخراجات آمدنی کے تناسب سے کرتی ہیں۔ البتہ رسوات کے موقع پر کسی تناسب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ان کے گھروں میں گھریلو کام کے لئے، بچے کھلانے کے لئے۔ بازار کا سودا سلف لانے کے لئے بوڑھے یا کم عمر لڑکے ملازم ہوتے ہیں۔ گھر کی صفائی اور روٹی پکانے کے لئے نوکرنیاں مقرر ہوتی ہیں۔ عام طور سے متوسط طبقہ کی عورتیں ہنڈیا خود ہی پکاتی ہیں۔ ان کا کام محض نگرانی کرنا اور کام کرانا رہ جاتا ہے اور یہ بیٹھے بیٹھے حکم چلانے کی عادی ہوجاتی ہیں۔ مکان بہت صاف، فرنیچر اور فرش فروش سے آراستہ ہوتے ہیں سفید چاندنیاں بچھی ہوتی ہیں، جن پر ریشمی غلافوں کے تکئے لگے ہوتے ہیں۔ چینی کے ظروف طاقوں میں سجے ہوتے ہیں۔ عورتوں کو شادی بیاہ سے خاص دلچسپی ہوتی ہے اور عام طور سے ان کا موضوع بحث یہی ہوتا ہے۔ موقع آنے پر اپنی بساط سے زیادہ اور مستقبل کے نتائج سے بے پرواہ ہوکر خرچ کیا کرتی ہیں۔ مرد سادہ لباس لیکن صاف پوش ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا مشغلہ محض کاروباری اور گھریلو سیاست ہوا کرتا ہے۔ البتہ اس طبقہ کے نوجوانوں میں ادبی اور سماجی خدمت کرنے کا کافی حوصلہ موجود ہے اور وہ اس میدان میں کام بھی کرتے ہیں۔ لڑکیاں پڑھی لکھی ہوتی ہیں لیکن ان کو کوئی اعلیٰ تعلیم نہیں دلائی جاتی۔ عورتیں سلیقہ مند ہوتی ہیں۔ گھروں میں صاف مگر سادہ لباس پہنتی ہیں۔

اس طبقہ کے اخراجات کا تناسب عموماً حسب ذیل ہوتا ہے:۔

خوراک ۳۰ فی صدی۔ کپڑا ۲۵ فی صدی۔ آرائش ۱۲ فی صدی (مکان عام طور سے ذاتی ہوتے ہیں) رسوات ۱۳ فی صدی۔ علاج و تعلیم ۱۰ فی صدی۔ پس انداز ۱۵ فی صدی۔

برادری کا طبقہ امراء

تیسرے طبقے یعنی امراء کے افراد پنجابی برادری میں طبقہ غربا اور طبقہ متوسط سے کم پائے جاتے ہیں۔ اس طبقہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جو بڑے پیمانے پر تجارت کر رہے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو محض جائداد پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں اور کوئی کام نہیں کرتے۔ گروہ اول کی کمزوری یہ ہے کہ وہ زمانے کی رفتار کے مطابق صنعت کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ گروہ دوم کے افراد عضو معطل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے افراد عام طور پر کسی کلب کے ممبر ہوتے ہیں اور اکثر صبح سے شام تک کسی کلب کی فضا میں اپنا وقت گزار دیتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ گروہ اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہے۔ البتہ اس کے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور صنعت و تجارت کی طرف متوجہ ہیں۔

طبقہ امرا کی ماہانہ آمدنی تین سو[1] روپئے سے ہزار ڈیڑھ ہزار روپئے تک اور کہیں اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ گھریلو اخراجات کہیں بھی چار سو سے زیادہ نہیں ہوتے۔ خرچ کا تناسب وہی رہتا ہے جو متوسط طبقہ کا اوپر بیان کیا گیا ہے۔ گھریلو زندگی بھی بڑی حد تک متوسط طبقہ سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ البتہ اس میں عیش پرستی اور کاہلی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ گھریلو ساز و سامان میں چپہ چپہ پر ٹائل لگے ہوتے ہیں۔ کمروں کے دروازوں پر ریشمی پھول دار پردوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ مکان میں مختلف ضروریات کے لئے کمرے مخصوص ہوتے ہیں اور مختلف مناظر کی تصاویر ان میں آویزاں ہوتی ہیں، ریڈیو اور گراموفون ان کی ضروریات زندگی میں شامل ہوتا ہے۔

برادری کی عام حالت پر تبصرہ

بساطخانہ کی تجارت اس برادری کی خصوصیت ہے اور ہر پنجابی بچے کو بساطخانہ کا کام شروع ہی سے سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے محلوں میں چھوٹے چھوٹے بچے خوانچے میں سامان بیچتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تجارت [illegible] پہلے تو تقریباً تمام تر مال انگلستان، جرمنی، جاپان اور امریکہ سے آتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے درمیان کاروبار میں ایک زلزلہ سا آیا۔ مال کے بنانے والے بہت سے دیسی لوگ پیدا ہو گئے

---

[1] یہ اعداد اپریل ۱۹۳۵ء کے ہیں جب تحقیقات کی گئی تھی۔

اور انہوں نے اپنے مال کے فروخت کرنے کے لئے اپنے ذاتی دوکاندار مقرر کر دیئے۔ اس لئے سول ایجنٹ ہونے کا جو فائدہ اس برادری کے لوگوں کو ملا ہوا تھا وہ باقی نہیں رہا مقامی کام میں بھی بہت سے ہندو شریک ہو گئے اور دوسرے اضلاع کے لوگوں نے دہلی کے تھوک فروشوں سے مال منگانے کی جگہ براہِ راست ہندوستانی کارخانوں کے ہندو ایجنٹوں سے چیزیں منگانا شروع کر دیں۔ جب دیسی مال شروع میں چلا تھا تو کچھ کارخانے والوں نے اپنا مال صدر بازار کے پنجابی دوکانداروں کو دینا چاہا تھا لیکن انھوں نے یہ خیال کرکے کہ یہ مال چلنے والا نہیں ہے اور انگلستان امریکہ اور جاپان کے مال مہیا کرنے والوں سے بگاڑ کرنا ٹھیک نہیں ہے مال کو قبول نہیں کیا تھا دوسرے ہندو کارخانہ داروں نے بھی فرقہ پرستی کے جذبہ کے ماتحت ان کو مائل کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی۔ اس لئے ہندو کارخانہ داروں کے ہندو دوکاندار پیدا ہو گئے اور ان کا مال بھی چل نکلا چنانچہ اب صدر بازار اور چاندنی چوک کے مسلمان دوکانداروں کو بھی دیسی مال منگانا پڑتا ہے لیکن کارخانہ سے براہِ راست ان کے پاس مال نہیں آتا اور نہ اس کے وہ سول ایجنٹ ہیں۔ اس لئے اس مال کی تھوک تجارت ان کے ہاتھ میں زیادہ نہیں ہے، صرف مقامی تجارت ہے اور اس میں بھی ہندوؤں کا مقابلہ ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی حالت بہت گر گئی ہو فرق یہ ہوا ہے کہ ان کی پرانی دوکانیں تو اپنی جگہ پر قایم ہیں اور تقریباً اتنا ہی بلکہ زیادہ کما رہی ہیں۔ جتنا پہلے کماتی تھیں لیکن ان کے ساتھ نئی دوکانیں ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کی قایم ہو گئی ہیں کاروبار کا پیمانہ بڑھ گیا ہے پہلے اگر مجموعی بیوپار بیس لاکھ کا تھا تو اب ایک کروڑ روپیہ کا ہو گیا ہے پہلے سارے کا سارا تقریباً ان کے ہاتھ میں تھا۔ تو اب اس میں دوسرے بھی ان کے شریک ہو گئے ہیں یعنی ان کا نسبتی حصہ کم ہو گیا ہے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں پہلے بساط خانہ میں ان کا تناسب تقریباً سو فی صدی تھا تو اب پچھتر فی صدی رہ گیا ہے۔ لیکن صدر بازار کی جائداد کے مالک ابھی تک مسلمان ہی ہیں اور ہندو کرایہ دار کی حیثیت سے ان کے مکان میں اپنی دوکان کرتے ہیں۔ جائداد میں پنجابی برادری نے خاصا اضافہ کر لیا ہے۔ تجارت سے زیادہ اب اس برادری کا روپیہ جائداد میں لگا ہوا ہے۔

رہنے کے ذاتی مکانوں کے علاوہ صدر بازار کی دوکانیں، کشمیری دروازہ کی آدھی دوکانیں، نئی دہلی کی بہت سی کوٹھیاں، کارونیشن ہوٹل، امپیریل سینما ہوٹل، حوض قاضی کے پاس کی بڑی عمارت، کلاں محل وغیرہ، یہ سب مکان پنجابی برادری کے لوگوں کے پاس ہیں۔ بس برادری کے بڑے سرمایہ دار لوگ اب صنعت کی طرف بھی مائل ہیں۔ البتہ جو لوگ محض مکانوں کے کرایہ یا جائداد کی آمدنی پر تکیہ کئے ہوئے ہیں وہ اپنے زائد اخراجات اور کم آمدنی کی وجہ سے پنجابی کی
اوسط طبقہ کی تعداد زیادہ ہے لیکن اونچے درجے کے ان لوگوں کی دولت جو تجارت اور صنعت کرتے ہیں بڑھ رہی ہے۔ اب ۱۹۱۴ء کے مقابلہ میں ملازموں (یعنی دوکان پر ملازم کی حیثیت سے کام کرنے والوں) کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے، اسباب جو ہر جگہ ہیں وہی یہاں بھی کام کر رہے ہیں۔ دوکان کے کام میں اب سرمایہ لگانے کی ضرورت زیادہ ہونے لگی ہے۔ پہلے صورت یہ تھی کہ دوسرے ملکوں کا مال منگایا جاتا تھا اور جو شخص بازار میں ایک دفعہ ساکھ پیدا کر لیتا تھا اُسے پھر کاروبار میں اپنا زیادہ روپیہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مال اعتبار پر آتا رہتا تھا اور وہ اسے تھوک فروخت کرکے سہولت کے ساتھ دام ادا کرتا رہتا تھا اور درمیان میں اپنی آڑھت کا حق کماتا رہتا تھا اسی طرح لوگوں نے بغیر زیادہ روپیہ لگائے خوب نفعے کمائے اور اپنے خرچ بھی اپنی آمدنی کے لحاظ سے خوب بڑھائے اور یہ سمجھا کہ جو مالی حالت آج ہے وہ ہی ہمیشہ رہے گی لیکن جب باہر کا مال چلنا بند ہوگیا اور ملکی کارخانوں کا مال چلنے لگا تو ایک طرف تو اس کے حاصل کرنے کے لئے زیادہ روپیہ لگانے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ کارخانے نقد ادائی چاہتے تھے اور دوسری طرف خوردہ کے دوکانداروں نے جن کے ہاتھ مال فروخت کیا جاتا تھا اُدھار خریدنے کا مطالبہ کرنا شروع کیا اور اس طرف بھی روپیہ لگانا ضروری ہوگیا اس کی وجہ سے صرف روپیہ والے لوگ ہی کام کو اپنے ہاتھ میں رکھ سکے اور دوسرے لوگوں نے اپنا کام بند کرکے ان روپیہ والوں کی ملازمت کرنا شروع کردی یہی حال سوت گوٹہ والوں میں بھی ہوا لیکن اوسط درجے کے جو لوگ ختم ہوئے ان کے کاروبار کو برادری سے باہر نہیں جانے دیا گیا بلکہ برادری کے لوگوں ہی کے ہاتھ میں ان کا کاروبار گیا اور آج جو لوگ ان دوکانوں پر ہیڈ منشی کا کام کرتے ہیں وہ کسی زمانے میں اپنا ذاتی کاروبار خود کیا کرتے تھے۔

ضمیمہ متعلق بہ سکنائی جائداد

زیادہ جائداد والے لوگ اس برادری میں زیادہ جائداد والے لوگوں میں حسب ذیل نام ممتاز اور قابل ذکر ہیں (۱) محمد امین صاحب سنگاوری (۲) سراج الدین صاحب کلکتہ والے (۳) محمد اسمٰعیل صاحب (۴) سلطان احمد صاحب جاپان والے (۵) حبیب الرحمٰن عبدالوہاب صاحبان (۶) حافظ محمد صدیق صاحب لاہور والے (۸) افضل الدین صاحب لیس والے (۹) حافظ حمید اللہ صاحب چھاپڑے (۱۰) ایس ایم عبداللہ صاحب اسی طرح کے اور بھی درجنوں ہیں۔

دہلی شہر میں سکنائی جائداد کی قیمت میں اضافہ جائداد کا بھاؤ چاندنی چوک میں تقریباً ۳۰ روپیہ سینکڑہ ماہانہ ہوگیا ہے۔ عام طور پر بر سر راہ اچھی جائدادیں ۴ر ماہوار پر فروخت ہوجاتی ہیں۔ شہر کے محلّوں کے مکان ۶ر تک اور دور افتادہ جگہ کے ۸ر تک۔ پہلے ۸ر معمولی بات تھی اب ۸ر بھی بہت کم رہ گیا ہے۔

جائدادوں سے اس زمانے میں لوگوں نے خوب روپیہ کمایا ہے لیکن یہ کرایہ کی آمدنی سے نہیں اس لئے کہ کرایہ کے کنٹرول کی وجہ سے کرایہ میں اضافہ کرنا ممکن نہیں تھا بلکہ مکانوں کو بیچ کر۔ لوگوں کے پاس جنگ کے زمانے میں روپے کی افراط ہوگئی تھی اور روپے کے خرچ کرنے یا کاروبار میں لگانے یا نئے مکان تعمیر کرنے کے مواقع کم ہوگئے تھے۔ روپے کی قیمت تیزی سے گر رہی تھی۔ لوگ قیمت کے زوال سے بچنے اور کاغذی نوٹ کی جگہ ٹھوس جائداد رکھنے کے خیال سے سکنائی جائداد خریدنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دو ہزار کی جائداد بارہ ہزار تک میں فروخت کی گئی اور اس سے لاکھوں روپیہ لوگوں نے کمالیا۔

پہلے کے اوسط کے مقابلے میں اب جائداد کی قیمت میں اوسطاً چار گنا اضافہ ہوگیا ہے[1]۔

—— ✻(✻)✻ ——

---

[1] یہ اعداد اپریل ۱۹۴۵ء کے ہیں جب تحقیقات کی گئی تھی۔

تعلیم اور سماج

"تعلیم اور سماج" کے نام سے ایک کتاب جناب سعید انصاری صاحب کی عنقریب شایع ہو رہی ہے، جس میں آپ نے میکسیکو کے دیہی تعلیم کے ایک نادر تجربہ کا حال بیان کیا ہے۔ یہ حصہ اسی کتاب کا ایک باب ہے جو موصوف نے خاص ہمارے رسالے کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ اس کتاب میں آپ نے بتایا ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء کے انقلاب کے بعد جب حکومت میکسیکو نے اپنے ملک میں تعلیم کو عام کرنا چاہا تو کس طرح اس کا تعلق سب سے پہلے سماج سے جوڑا اور اس کے لئے اس نے کیا کیا طریقے اختیار کئے۔ انھیں طریقوں میں ایک طریقہ "تمدنی مبلغین" کا بھی تھا۔ جس کا حال آپ کو اس مضمون میں ملے گا۔

مدیر

تمدنی مبلغین

حکومت میکسیکو نے جب اپنے دیہاتوں میں تعلیم عام کرنے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے اس غرض کے لئے اسے اچھے، تربیت یافتہ استادوں کی ضرورت پیش آئی۔ یہ ضرورت اس نے تین طریقوں سے پوری کی۔

(۱) استادوں کے مدرسے قایم کرکے (۲) مرکزی حکومت کی طرف سے نگرانی کا طریقہ اختیار کرکے (۳) تمدنی مبلغین کے ذریعہ۔ تمدنی مبلغین کا طریقہ۔ ان تینوں طریقوں میں نئی

نوعیت کے اعتبار سے سب سے اچھوتا اور نیا طریقہ تھا جس سے سب سے بڑے پیمانے پر کام لیا گیا۔

اس طریقے سے کام لینے کی ضرورت مختلف وجوہ کی بنا پر پیش آئی۔ ایک یہ کہ اب تک جتنے مدرسین کام کرتے تھے ان کی ایک تو علمی استعداد بہت کم تھی، اور دوسرے یہ کہ ان کی تعلیمی تربیت بھی بہت ناقص تھی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ انھیں اپنے کاموں سے علیحدہ کئے بغیر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ان کی علمی کمی بھی پوری ہو جائے، اور دوسرے ان کی تربیت بھی ہو جائے تیسرے یہ خیال تھا کہ ان مدرسین کو مروّجہ طریقوں پر تعلیم دلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ ان نئے قومی مقاصد میں کوئی مدد نہیں پہنچا سکتے ہیں۔ پھر چوتھے یہ کہ جتنی بڑی تعداد میں اس وقت مدرسین کی ضرورت تھی، وہ کسی طریقے سے بھی اس قلیل مدت میں پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نئے کام کے لئے نئے طرز کے مدرسین کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تمدنی مبلغین ہی کا واحد طریقہ تھا جو عمل میں آیا۔

تمدنی مبلغین حقیقت میں نہایت سرگرم کام کرنے والوں کی ایک جماعت تھی جو مرکزی حکومت کی طرف سے اس غرض کے لئے مقرر کی گئی تھی کہ وہ جگہ جگہ گھوم پھر کر لوگوں کو مرکزی حکومت کا پیغام پہنچائے اور ان کی تمدنی اصلاح اور تربیت کرے۔ مرکزی حکومت نے ایسی متعدد جماعتیں قایم کی تھیں جن میں سے ہر ایک کا ایک [illegible] مقرر ہوتا تھا۔ یہ علاقہ مختلف مرکزوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ اور ہر مرکز پر یہ جماعت اس علاقے کے تمام مدرسین کو یک جا کر کے ایک مختصر سا نصاب دیتی تھی۔ یہ مدرسین آس پاس کے تمام گاؤں اور قصبوں سے آتے تھے اور اس مرکز پر جمع ہو جاتے تھے۔ سب ایک ہی جگہ قیام کرتے اور ایک ہی مطبخ سے کھانا کھاتے۔ یہ اپنے اپنے بستر اور کھانے پینے کے برتن ساتھ لاتے۔ کل نصاب زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کا ہوتا اور روزانہ ۶ بجے صبح سے لے کر شام کے ۶ بجے تک معروفیت رہتی۔

مبلغین کی یہ جماعت مختلف قسم کے کام کرنے والوں پر مشتمل ہوتی تھی اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن کا ماہر ہوتا تھا۔ مثلاً ایک زراعت اور کھیتی باڑی سے متعلق کاموں کا ماہر ہوتا

دوسرا مختلف دستکاریوں کا واقف کار جس میں مٹی کے برتن بنانا، کتائی بنائی، صابن سازی چمڑے کا کام وغیرہ شامل ہوتا۔ تیسرا موسیقی، ڈراما اور آرٹ وغیرہ کے کاموں کا جاننے والا ہوتا۔ چوتھا تربیت جسمانی کا ماہر جس کے ذمہ تفریحات اور کھیل کود کا پروگرام ہوتا۔ پھر ایک یا ایک سے زیادہ نرسیں جو تمیں جو بستی کے لوگوں کی صحت کی دیکھ بھال کا کام انجام دیتیں۔ سب سے آخر میں اصلاح دیہات کا کام جاننے والا ہوتا، جو ان سب سے زیادہ اہم شخص ہوتا تھا، امورِ خانہ داری، بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال، زندگی سے متعلق جملہ امور کی تعلیم و تربیت سب اسی اصلاح دیہات کے کام جاننے والے شخص کے ذمے ہوتی تھی۔

تمدنی مبلغین کی اس جماعت کے لئے کسی خاص علمی قابلیت یا تعلیمی سند کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ یہ خیال ضرور رکھا جاتا تھا کہ کم سے کم اس جماعت کے ارکان کی عام تعلیم اتنی ہو کہ وہ ان مدرسین کی تعلیم و تربیت کا کام انجام دے سکیں۔ بعض وقت وہ کاروباری اور تجارت پیشہ لوگوں میں سے ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں جس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا وہ یہ کہ ان میں دوسروں کی اصلاح اور رہبری کا مادّہ موجود ہو، اور وہ تعلیم کو اصلاح معاشرت اور عام فلاح و بہبود کا ایک موثر ذریعہ سمجھتے ہوں۔ ان پر روز بروز اس بات کی ذمہ داری بڑھتی جا رہی ہے کہ وہ لوگوں میں سماجی اور معاشی زندگی کا ایک اعلیٰ نصب العین پیدا کر سکیں اور ان کی زندگیوں کو ہر اعتبار سے بہتر بنا سکیں۔

مبلغین کا انتخاب اور تقرر مرکزی حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ حکومت کے مرکزی محکمۂ تعلیم میں اس کا ایک خاص شعبہ ہے جو ان مبلغین کے کاموں کی نگرانی اور دیکھ بھال رکھتا ہے۔ جب ان مبلغین کا نصاب شروع ہوتا ہے تو اس حلقہ کے افسرانِ تعلیم کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ بھی اس نصاب میں شریک ہوں اور اپنے حلقہ میں ان اصولوں کی اشاعت اور ان طریقوں پر [illegible] کا کام شروع کریں۔

۱۹۲۷ء میں مرکزی حکومت کی طرف سے ان مبلغین کو تعلیم دینے والوں کے لئے چھ

ہفتہ کا ایک نصاب شروع کیا گیا۔ ان کے نصاب میں جن مضامین کی تعلیم کا خاص طور پر التزام رکھا گیا تھا، وہ یہ تھے:۔

۱۔ اصول تعلیم (جس میں دیہی اور شہری دونوں طرح کی تعلیم کے اصول تھے)
۲۔ نفسیات تعلیم۔
۳۔ طریقہ تعلیم۔
۴۔ انتظام مدرسہ
۵۔ حفظانِ صحت و صفائی۔
۶۔ دیہی معیشت۔
۷۔ بچوں کا ادب۔

عورتوں کے لئے امور خانہ داری سے متعلق ان کے نصاب میں حسب ذیل چیزیں شامل تھیں:۔

۱۔ بچوں کی غذا اور ان کی پرورش اور دیکھ بھال۔
۲۔ کپڑے بنانا۔
۳۔ صحت و صفائی۔
۴۔ دیہی زندگی۔

اس طرح تربیت جسمانی سے متعلق ان کے نصاب میں حسب ذیل چیزیں داخل تھیں:۔

۱۔ کھیل کود اور ورزش
۲۔ اصلاح جسم
۳۔ ہم آہنگ ورزش۔
۴۔ علم الابدان و حفظان صحت
۵۔ تنظیم کھیل۔

زراعت سے متعلق حسب ذیل امور رکھے گئے تھے:۔

۱۔ زرعی مسائل۔

۲۔ دیہی قرضے۔

۳۔ گھریلو صنعتیں۔

۴۔ دیہی زندگی۔

خانگی دستکاریوں اور گھریلو صنعتوں میں حسب ذیل چیزوں کی نظری اور عملی دونوں قسم کی تعلیم شامل تھی:۔

۱۔ صابن بنانا

۲۔ چمڑا سجھانا۔ -

۳۔ پھل اور سبزیاں سکھانا۔

۴۔ دوسری دستکاریاں۔

۵۔ ڈیری کا کام۔

جیسا کہ اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ ان جماعتوں کا ایک ایک حلقہ ہوتا ہے اور ہر حلقہ میں کم سے کم سال میں ایک نصاب ہونا ضروری ہے۔ ہر حلقہ کم وبیش ۱۰۰ مربع میل پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض حلقے آبادی اور وسعت کے لحاظ سے چھوٹے بڑے بھی ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ایسی کل بارہ سفری جماعتیں تھیں اور ۲ مستقل قیام کرنے والی۔ انھوں نے تقریباً تمام میکسیکو کو چھان ڈالا۔ یہ تعداد اگرچہ آبادی اور وسعت کے لحاظ سے کافی نہیں ہے۔ پھر بھی مالی حالات کے بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ امید ہے کہ ان میں مزید اضافہ بھی ہوتا جائے گا۔

مرکزی محکمہ تعلیم کو ان جماعتوں اور ان کے کاموں کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ محکمہ کی طرف سے ان کے طریق کار کے متعلق وقتاً فوقتاً ہدایتیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک نصاب کے موقع پر اس کے کام کرنے والوں کے متعلق جو ہدایتیں محکمہ تعلیم سے موصول ہوئیں ان کا خلاصہ

درج ذیل ہے جس سے ان کے کاموں اور ان کی نوعیت کے متعلق بہت کچھ روشنی پڑے گی۔

اصلاح دیہات کا کام کرنے والوں کے متعلق ہدایات:-

ا۔ استادوں کے ساتھ کام کرنے والوں کے لئے:-

(ا) حفظانِ صحت، جس میں ابتدائی دوا علاج اور عام بیماریوں کے انسداد سے متعلق باتیں شامل ہیں:-

(ب) اصولِ تغذیہ۔ جس میں متوازن غذا کا پروگرام، کھانا پکانے کی ترکیب اور کھانا پکانے کے طریقے شامل ہیں۔

(ج) بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال۔

(د) سینا پرونا اور اس قسم کے دوسرے کام۔

(ہ) چند ایسے اسباق جن سے بستی کے لوگوں میں کام کرنے کے طریقے معلوم ہوں۔ یہ کام لوگوں کی تنظیم، امداد باہمی، گھروں کی درستی اور اصلاح سے متعلق ہوں گے۔

۲۔ بستی کے اندر کام کرنے والوں کے لئے:-

(ا) صحت وصفائی، بیماریوں کا انسداد، معمولی مرہم پٹی، ٹیکے وغیرہ سے متعلق باتیں۔

(ب) امورِ خانہ داری، مثلاً کھانا پکانا، سینا پرونا وغیرہ۔

(ج) بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال۔

(د) گھروں کی اصلاح اور درستی۔

(ہ) جلسے اور تفریحات۔

(و) لوگوں کی تنظیم۔ یا ان کے تفریحی کلب اور دوسرے قسم کی انجمنیں بنانا۔

(۳) بچوں میں کام کرنے والوں کے لئے۔

(ا) ٹیکے کی ضرورت اور ان کا لگوانا۔

(ب) صحت وصفائی اور امورِ خانہ داری سے متعلق باتیں۔

گھریلو صنعتوں کے استادوں کے لئے ہدایات:۔

ا۔ استادوں اور بستی کے لوگوں میں کام کرنے والوں کے لئے۔

(ا) چمڑے سجھانا اور اُسے خراب ہونے سے بچانا۔ پھل اور سبزیاں سکھانا۔ صابن بنانا۔ دستکاریاں اور ڈیری کا کام۔

(ب) دستکاری اور حرفہ کے کاموں کے نمونے تیار کرنا۔

(ج) بستی والوں کو مختلف دستکاریوں کے سکھانے کا انتظام۔ ان کی دشواریوں اور دیگر مسائل کا حل۔

زراعت کا کام سکھانے والے استادوں کے لئے ہدایات:۔

شہد کی مکھیاں پالنا، سبزی بونا۔ پھل اور پھول کے باغ لگانا وغیرہ شامل ہیں۔ نصاب میں مدرسین اور طلباء دونوں شریک ہوں، بالخصوص مشاہدہ کے کاموں میں۔ لہٰذا بستی کے اندران کاموں کے کچھ نمونے ہونے چاہئیں اور تمام تعلیم عملی ہونی چاہئے اور سب کام مشترکہ طور پر کئے جانے چاہئیں۔

تربیت جسمانی کے اُستادوں کے لئے ہدایات:

ا۔ مدرسین کی تعلیم کے سلسلے میں۔

(ا) کھیل کود اور جسمانی ورزشیں۔

(ب) مدرسوں میں رائج کرنے کی غرض سے کھیل کود۔

(ج) جسمانی مقابلے۔

۲۔ بچوں کے ساتھ کام کرنے کے سلسلے میں۔

(ا) ایسے کھیل کود اور جسمانی مقابلے جن سے کوئی تعلیمی مقصد حاصل ہوتا ہو۔

(ب) نمونے کے اسباق۔

۳۔ گردونواح کے علاقہ میں کام کرنے کے سلسلے میں۔

اس علاقے کو چھوڑنے سے قبل ایک کھیل کود کی انجمن اور ایک کھیل کود کے لئے میدان ضرور چھوڑ جانا چاہئے۔

ان جماعتوں کے قیام کے سلسلے میں مرکزی حکومت نے جن مقاصد کا تعین کیا ہے، وہ بھی انہی کے لفظوں میں سننے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر ہم کو صرف نظری طور پر مسائل کا سمجھانا اور ان کے متعلق تعلیم دینی ہوتی تو ہمارے لئے زیادہ بہتر تھا کہ اس قسم کے نصاب ہم شہروں یا بڑی بڑی آبادی کے مرکزوں میں رکھتے اور استادوں کو وہیں بلاتے، نہ کہ اس کے بجائے یہ جماعتیں قایم کرتے اور ان جماعتوں کو استادوں کے پاس بھیجتے۔ لیکن ہمارا مقصد یہ نہ تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ جماعتیں خود ان استادوں کے پاس جائیں اور انھیں ان حالات کے اندر جن میں انھیں کام کرنا پڑتا ہے، تعلیم دیں۔ نیز ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ جماعتیں خود بھی ان حالات کا اور ان مسائل کا جو ان حالات میں پیدا ہوتے ہیں مطالعہ کریں۔ اس بنا پر کوئی مثالی دیہی زندگی کا تصور یا دوسرے نظری اصولوں کو پیش نظر رکھنا بے کار تھا۔ ہر گاؤں میں ایک مدرسہ اور اس کے ساتھ اس کا ضروری سامان اور لوازمہ ہوتا ہے۔ اس جماعت کو اس ساز و سامان کی مدد سے اس مدرسہ کو ایسا بنانا ہے کہ وہ گاؤں کا ایک مفید اور موثر ادارہ بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسہ کی حیثیت اس جماعت کے لئے ایک معمل یا دار التجربہ کی ہوتی ہے۔"

۱۹۲۳ء میں سب سے پہلی بار مبلغین کی ایک جماعت نے کام شروع کیا۔ پھر اس کے بعد سے جماعت کی تعداد اور اس کے کام میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ اندازہ ہوا کہ اس کام سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ جب پہلے پہل اس جماعت نے استادوں کی تعلیم کا کام شروع کیا تو بستی کے لوگوں نے جماعت کے زراعت، دستکاری اور امور خانہ داری سے متعلق کاموں میں بہت دلچسپی لینا شروع کی۔ بستی والوں کے خیال سے اس جماعت کے کام کو زیادہ سے زیادہ عملی بنانے کی کوشش کی گئی اور جلد ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ لوگوں میں مرکزی حکومت کے اس تعلیمی پروگرام سے دلچسپی روز مرہ بڑھتی جارہی ہے اور مبلغین کی یہ جماعت بستی کے لوگوں،

سماجی زراعتی اور خانگی زندگی کو بہتر بنانے میں بہت مدد دے رہی ہے، اور وہ بستی کے اندر ان تمام سماجی اور تمدنی وسائل کا پتہ لگا رہی ہے جو تن تنہا مدرس کی دست رس سے باہر ہے۔ نیز اس جماعت کو اپنے وہ تمام وسائل مرکزی حکومت کے پاس لانے میں تاکہ یہاں ان سے سال بہ سال مدرسوں کے کاموں کو بہتر بنانے میں مدد دی جاسکے

مرکزی حکومت کی عام پالیسی یہ ہے کہ وہ گاؤں اور مدرسہ دونوں کو اس جماعت کے لئے معمل کے طور پر استعمال کئے جانے کے موقعے دے تاکہ یہاں کے حالات سے ایسے نتائج مرتب کریں جو عام طور پر استعمال ہوسکیں۔ ان سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ بستی کے اندر اپنی کوئی مستقل یادگار بھی چھوڑ جائیں گے، مثلاً سبزیوں کا باغیچہ، کھیل کا میدان، کوئی تفریح کی جگہ۔ کھلی ہوا کا تھیٹر، صحت وصفائی کا کوئی نمونہ وغیرہ۔ بستی کے انھی کاموں کی غرض سے مبلغین کی یہ جماعت جب اپنے نصاب دینے کے لئے آتی ہے تو وہ عموماً وقت سے کچھ پہلے آتی ہے تاکہ وہ سب سے پہلے اس بستی یا علاقہ کا ایک سرسری جائزہ لے لے، اور مدرسہ اور بستی کے لوگوں سے تعارف اور ملاقات حاصل کرکے اس قسم کے اصلاحی کاموں کا ایک پروگرام بنائے۔

مدت کے ختم پر جب جماعت اپنا کام پورا کرلیتی ہے تو آخری دن ایک بہت بڑی تقریب منائی جاتی ہے۔ جس میں بستی کے تمام لوگ اور وہ سب مدارس شریک ہوتے ہیں جن کے مدرسین نصاب میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔ تولا قدیم میکسیکو کا ایک بہت پرانا اور مشہور شہر ہے، یہاں اس جماعت نے ایک سال کام اپنا شروع کیا۔ نصاب کے ختم پر جس میں راقم الحروف کو بھی شریک ہونے کا موقع ملا تھا تمام بستی کے لوگوں میں ایک چہل پہل اور ہر طرف ایک خاص رونق نظر آتی تھی۔ مکانات پر جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ سڑکوں اور بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت سے ایک میلہ معلوم ہو رہا تھا۔ بچے، نوجوان مرد اور عورتیں سب نصاب کے اختتام کی تقریب میں حصہ لینے اور مختلف چیزوں کی نمائش دیکھنے کے لئے آجا رہے تھے۔

اس نصاب کے دوران میں خود مبلغین کی جماعت نے بھی کافی سامان تیار کیا تھا جو مختلف

اسکولوں کے مدرسین کے لئے نمونہ کا کام دیتا تھا۔ نمائش کی چیزوں میں ان کے باغیچے کی سبزیاں اور پھل۔ دستکاری کے سامان میں میز، کرسیاں، ٹوکری اور دوسری بہت سی استعمال کی چیزیں تھیں۔

اس تقریب میں سامان کی نمائش کے علاوہ بہت سے کھیل تماشے اور تفریح کی چیزیں بھی ہوئیں۔ مثلاً ورزشوں کے مقابلے، ڈرامے، گانے اور دیہاتی ناچ وغیرہ۔ ان سب میں بستی کے لوگوں نے بڑے ذوق وشوق سے حصہ لیا۔ ان سب کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ مدرسین جب یہاں سے فارغ ہوکر واپس جائیں تو ان سب چیزوں کو بھی اپنے اپنے مدرسوں میں رائج کریں۔

ٹولا کے اس نصاب کا ایک مختصر خاکہ ڈائرکٹر تعلیمات دیہی نے اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔

ٹولا شہر میکسیکو سے ایک تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ان دنوں ایک جماعت اپنا کام کر رہی ہے۔ اس نے ۵ رجولائی سے اپنا کام شروع کیا اور ۳۱ راگست کو جاکر ختم کیا۔ یہ جماعت جس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے ان میں ایک تو اصلاح دیہات کا کام جاننے والا شخص ہے۔ ایک زراعت کا واقف کار ہے۔ ایک دیہی صنعتوں کا ماہر ہے۔ ایک تربیت جسمانی کا استاد ہے۔ ایک موسیقی سکھانے والا ہے۔ ایک آرٹ اور حرفہ کا استاد ہے۔ اور ایک ان سب کا امیر جماعت یا سردار ہے۔ ان لوگوں نے ان چار ہفتوں میں جو نصاب دیا ہے اس سے اس بستی کے تمام لوگوں کی اصلاح وترقی کی امید بندھتی ہے۔ ان تمام مدرسین نے جو آس پاس کے مدارس سے آتے ہیں، ان کے ساتھ مل جل کر کام کیا ہے اور اس عرصہ میں ان تمام مسائل کا حل تلاش کیا جو وقتاً فوقتاً ان کے سامنے پیش آتے رہے انھوں نے اپنے تعلیمی پروگرام کو بہتر بنانے کے لئے ان سے تازہ مواد حاصل کئے اور اپنے عملی کاموں سے یہ بات سیکھی کہ لوگوں میں احساس اور بیداری کے پیدا کیا جا سکتا ہے جس سے وہ خود اپنی اور اپنی بستی کے لوگوں کی حالت درست کرسکیں۔ ان مدرسین نے تعلیم کے نئے نئے اصول اور تدریس وتنظیم کے نئے نئے طریقے بھی سیکھے۔ نیز یہ بات بھی حاصل کی کہ وہ اپنے مدرسوں کو بستی کے لوگوں کی خدمت کا مرکز کیسے بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے مختلف حرفے اور دستکاریاں بھی سیکھیں اور اس کے ساتھ

... اپنے علاقہ کی مقامی صنعتوں اور دستکاریوں کو کس طرح ترقی دی جاسکتی ہے۔ تولا میں
... نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا کام کیا ہے۔ کوئی شخص بھی وہاں آکر یہ دیکھ سکتا
... ان مدرسوں کی تعلیمی اور سماجی خوبیوں کو بڑھانے کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ یہ تعلیم
... تو ہم اپنے دیہاتی مدرسین کو پرانی لکیر کا فقیر رکھتے۔ جن میں نہ تو کوئی اپج ہوتی اور نہ کوئی

ان فنی جماعتوں کے علاوہ دو اور مستقل جماعتیں بھی ہیں، جن میں سے ایک ایکسٹوپان میں
... رہی ہے جو شہر میکسیکو سے تھوڑے فاصلے پر ہے اور دوسری پیرآشو میں کام کر رہی ہے جو
ذرا اور فاصلے پر ہے۔ یہ جماعتیں اساتذہ طلبار اور بستی کے عام لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کر رہی
ہیں اور ان کا کام تعلیم سے متعلق تمام ضروری معلومات کا فراہم کرنا اور ایسے مشاغل کا ایک جا کرنا ہے
ان سے بستی کے لوگوں کی سماجی، معاشی اور تمدنی حالت کے درست کرنے میں مدد ملے۔ ان میں سے
ایکسٹو پان کی ایک جماعت کا مختصر سا حال ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ایکسٹوپان کی جماعت نے اپنے کام کے تین سال ختم کر لئے ہیں۔ اس جماعت میں ایک زراعت کا
ماہر ایک حرفہ اور دستکاریوں کا ماہر ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک تربیت جسمانی کا استاد۔ ایک دو مدرسین
ایک تفریحی پروگرام کا چلانے والا۔ اور ایک ان سب سے اہم اور مرکزی حیثیت رکھنے والا اصلاح دیہات
کا کام چلانے والا ہوتا ہے۔ یہ جماعت آس پاس کے دیہاتوں میں جاتی ہے اور لوگوں کو اپنی حالت
بہتر بنانے کی طرح طرح سے ترغیب دیتی ہے۔ جس علاقہ میں یہ جماعت کام کر رہی ہے وہاں کے لوگ
حد سے زیادہ غریب، جاہل اور پست ہیں اور اس پر ستم یہ کہ ان پر اب تک کوئی توجہ نہیں ہوئی
ہے حالانکہ ان میں ترقی کے امکانات بہت زیادہ موجود رہے ہیں۔ اس جماعت نے ان میں تھوڑے
دنوں کے کاموں سے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ لوگ اب بہت بہتر ہو گئے ہیں اور ان میں
تمام سماجی اور تمدنی خوبیوں کے علاوہ یہ بات بھی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اپنی زمین سے زیادہ سے
زیادہ پیداوار حاصل کرنے لگے ہیں۔ ان کی خراب و خستہ صورتوں سے جو صدیوں سے تباہ حال

چلی آرہی تھیں۔ اب اطمینان اور خوشی کی کیفیتیں نظر آرہی ہیں۔ یہ سب کچھ اس جماعت کے بدولت ہے جو مذہبی مبلغین جیسی سرگرمی اور خلوص کے ساتھ کام کر رہی ہے اور جس نے ان کی دینوی زندگی کو کم سے کم اس قدر بہتر بنادیا ہے۔"

ان مبلغین جماعتوں کے علاوہ جن کا اس قدر تفصیل سے ذکر ہوچکا ہے، اور تحقیقی جماعتیں بھی ہیں جو بعض مسائل کی تحقیق و تفتیش کا کام انجام دے رہی ہیں۔ ان میں سے ایک جماعت تو وہاں کے رسم و رواج، ان کی زبان، ان کی عادات و اطوار کے متعلق تحقیق کا کام کر رہی ہے۔ اور دوسری جماعت بھی حالات کا مطالعہ کر رہی ہے جو سردست اٹومی نسل کے ہندیوں تک محدود ہے جن کی آبادی ملک کے بیشتر حصہ میں پھیلی ہوئی ہے۔

ان تمام جماعتوں کے کاموں سے یہ توقع ہے کہ میکسیکو میں دیہی تعلیم کا ایک مستقل فلسفہ بن جائے گا اور اس کے سائنٹیفک اصول اور طریقے ہاتھ آجائیں گے۔ اب تک دیہی تعلیم کا تجربہ محض قیاسی اصولوں پر ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب یہ بہت مضبوط بنیادوں پر ہو رہا ہے۔ ان سب سے زیادہ بڑی بات یہ کہ ان جماعتوں کے ذریعہ تعلیم اور سماج کے درمیان ایک نہایت گہرا تعلق قایم ہوگیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

سہارنپور کی کمبوہ برادری

سوال نامہ متذکرہ کے جواب میں اس برادری کے حالات مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے۔ایل ایل۔بی وکیل نے جو سہارنپور کے نہایت ممتاز وکیلوں میں سے ہیں اور کانگریس کے سرگرم کارکن ہیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اور اپنے دستخطوں کے ساتھ عنایت فرمائے ہیں، جو بجنسہ ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو حالات برادری کے ایک اور ممتاز رکن حکیم عبدالخالق صاحب سے معلوم ہوئے ہیں (یہ اپنے بھائی عبدالمالک صاحب کے ساتھ قدیم یونانی دواخانہ کے مالک ہیں) ان کو اس کے بعد درج کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں کچھ حالات شیخ عبدالرب صاحب گھڑی ساز نے بھی تبلائے ہیں ان کے ضروری اقتباسات کو بھی بعد میں درج کردیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا تحریری بیان:۔

اس برادری کا تعلیم یافتہ طبقہ جو بیشتر میرٹھ، مارہرہ، امروہہ، وغیرہ اضلاع یو۔پی میں آباد ہے۔ اس بات کا مدعی ہے کہ یہ قوم حضرت زبیرؓ کی اولاد سے ہے۔ چنانچہ اسی نسبت کو یہ حضرات اپنے ناموں کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں تاریخی مواد کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس پر کافی لٹریچر موجود ہے۔ حضرت زبیرؓ کی شہادت کے بعد جو انتشار پیدا ہوا اس کے باعث ان کی بیشتر اولاد عرب چھوڑ کر ایران، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان میں آباد ہو گئی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ان ممالک میں اب تک کمبوہ قوم کے افراد اور خاندان آباد ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے ہر دور میں عموماً اور شاہان مغلیہ کے زمانہ میں خصوصاً اس کے بعض افراد نے سیاسی اور ملکی معاملات میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ مولانا محمد حسین صاحب آزاد نے دربار اکبری میں کئی جگہ شہباز خاں کنبوہ و شیخ عبدالنبی کنبوہ و دیگر ممتاز افراد کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اس نام کی برادری اہل ہنود

میں موجود ہے۔ یہ مسئلہ اب تک مابہ النزاع ہے کہ آیا ہندوستان کے مسلمان کنبو (کمبو) عرب کے باشندے ہیں یا ہندوستان کے وہ ہندو کمبو ہیں جو وقتاً فوقتاً مسلمان ہوتے رہے جیسا کہ راجپوت، جاٹ اور گوجر برادریوں کا حال ہے۔ موضع پٹی ضلع لاہور کا تعلیم یافتہ کمبو طبقہ بھی نظریہ زیربحث کی تائید میں ہے اور یہ اخبار و رسائل و کتب کے ذریعہ اس مضمون پر کبھی کبھی قلم اٹھاتا رہتا ہے۔

کمبو برادری بیشتر یوپی اور پنجاب میں پائی جاتی ہے۔ میرٹھ، مارہرہ، امروہہ، سنبھل، مراد آباد اور اٹاوہ وغیرہ کے کمبو اکثر تعلیم یافتہ ہیں اور چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں پر مامور ہیں۔ کچھ زمینداری طبقہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اور بعض ڈاکٹری اور وکالت کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور کچھ تجارت اور دوکانداری کر رہے ہیں۔ سہارنپور میں یہ برادری کافی تعداد میں ہے۔ ان کی مردم شماری ڈیڑھ دو ہزار کے درمیان ہے۔ مجموعی حیثیت سے تعلیم سے قطعی بے بہرہ ہیں۔ دو تین فیصدی انگریزی لکھے پڑھے ہیں اور دس پندرہ فی صدی کا یہ امتیازی درجہ ہے کہ وہ معمولی اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ مستورات کو اعراب کے ساتھ قرآن پڑھا دیا جاتا ہے۔ اور ابتدائی مسائل کی چند کتابیں ازبر کرا دی جاتی ہیں۔ اس خوش قسمت تعداد کی نسبت بھی برادری میں پندرہ بیس فی صد سے زیادہ نہیں۔ سہارنپور کے مسلمان کمبو بیشتر محلہ لکھی دروازہ، محلہ منڈی شیو پری، گنپت سرائے، چوہٹہ روغن گراں میں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں، آباد ہیں۔ اس کے علاوہ کافی تعداد میں سرائے ٹوپیہ و نخاسہ و محلہ خواجہ زادگان میں رہتے محلہ قاضی میں چند گھر اس برادری کے ہیں، یہ عموماً میرٹھ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔

سہارنپور میں اس برادری کی ایک پنچایت ہے۔ جو قدیم رسم و رواج کے مطابق ان لوگوں کو چلاتی رہتی ہے۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے پنچ لوگ قابو یافتہ تھے۔ مگر اب ان کے پنجے ڈھیلے ہو گئے ہیں دھڑا بندی زور پکڑتی جا رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانا نظم ٹوٹ رہا ہے۔ لیکن ابھی تک اس کی بجائے کسی نئے دستور نے جنم نہیں لیا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر مختلف چیزوں کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں کرتے ہیں۔ جیسے پرچون، پنسار ہٹہ، نال سوختہ، نقشین لکڑی کی چھوٹی دوکانیں بھی موجود ہیں۔ بعض اپنے گھروں ہی میں یہ کام کرتے ہیں۔ دو چار دوکانیں بزازے کی ادنےٰ پیمانے پر ہیں۔ کچھ درزی بھی ہیں۔ دو تین

گھڑی سازوں کی بھی دوکانیں ہیں، جن میں سے خصوصیت سے شیخ عبدالرب گھڑی ساز مشہور ہیں۔ پھر عطاری کی دوکانیں بھی چند خاندان کرتے ہیں خصوصیت سے قابل ذکر حاجی عبدالمالک و عبدالخالق مالکان قدیم یونانی دواخانہ ہیں۔ جو بازار نخاسہ میں اپنی ذاتی دوکانوں میں یہ کاروبار نہایت آب و تاب اور چمک دمک سے کر رہے ہیں۔ میوہ اور پھل کی بیشتر تجارت اسی برادری کے ہاتھ میں ہے۔ کئی کمبوہ میوہ فروشی کی دوکانیں کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں، اور کئی دوکانیں آڑھت میوہ کی ان کے قبضے میں ہیں۔ عبدالمالک و عبدالخالق سہارنپور میں سب سے بڑے فروٹ کمیشن ایجنٹس ہیں وہ تمام میوہ بازار پر چھائے ہوئے ہیں۔ پھلوں کا ہر موسم میں ہزار ہا روپئے روزانہ کا بیوپار ان کی دوکان پر ہو جاتا ہے۔ یہ تین بھائیوں اور چند قریبی رشتہ داروں کی فرم ہے۔ پنسار ہٹہ میں شیخ محمد صادق محلہ منڈی والے مشہور ہیں۔ ان کی دوکان نہایت کامیاب ہے۔ یہ بزرگ زمیندار اور برادری کے پنچ بھی ہیں۔ رس پیلنے کے کولھوؤں کے کئی کارخانے ہیں۔ سب سے بڑا کارخانہ حاجی محمد ابراہیم عرف نواب کا محلہ شاہ بہلول میں ہے۔ آس پاس کے دیہاتی لوگ اس کارخانہ سے کرایہ پر کولھو لے جاتے ہیں۔ اس کاروبار میں ان کو ہزاروں روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے۔ کارخانہ میں دو تین مستری مشینوں کی مرمت کے لئے بارہ مہینہ کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں دھان کوٹنے کی کئی کئی مشینیں اچھے پیمانے پر برسوں تک چلتی رہیں اور ہزار ہا روپیہ سالانہ اس کاروبار سے کمایا۔ مگر اب ٹریڈ کے بعض جولاہوں کے مقابلے کے باعث دھان کوٹنے کی مشینیں گذشتہ سال سے بند کر دی ہیں بعض خاندان بانس، بلّی اور چونے کا کاروبار کرتے ہیں خصوصیت سے حاجی مشتاق احمد شہید گنج والے اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے بیٹے پوتے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بازار شہید گنج کی ذاتی دوکانوں اور کارخانوں میں اس کاروبار کو کرتے ہیں۔ سیکڑوں روپئے کی خرید و فروخت روزانہ ہو جاتی ہے۔ حاجی مشتاق احمد کا شمار برادری میں بطور اہل ثروت کے ہوتا ہے۔ شہر کے ڈاک خانہ کی عمارت ان کی ملکیت کے مکان میں ہے۔ جو گورنمنٹ نے کرایہ پر لے رکھی ہے اس کے علاوہ بہت سی دوکانوں اور مکانوں کے مالک ہیں جو کرایہ پر چڑھتے رہتے ہیں۔ سیکڑوں روپیہ

ماہوار کرایہ کی آمدنی ہے۔ آپ کا ایک باغ اور بنگلہ دہرہ دون سڑک پر کپتان پولس کی کوٹھی کے قریب ہے جو سرکاری حکام کے پاس کرائے پر رہتا ہے۔ محلہ اور راہل برادری میں سب سے زیادہ انکم ٹیکس دیتے ہیں۔ ہر سال باقاعدہ زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانہ پر سرّاً وعلانیہ طور پر خیرات کرتے رہتے ہیں۔ موصوف ایک معزّز اور نیک قسم کے بزرگ ہیں۔ برادری کے پنچ بھی ہیں۔ چونے کے کارخانہ داروں میں خصوصیت سے قابل ذکر حافظ عبدالسلام صاحب و حاجی عبدالعزیز صاحب ہیں۔ جو دہرہ دون میں اپنے باپ دادا کے زمانے سے چونہ پھونکنے کے کارخانے نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں ان کا مال سہارنپور، ہردوار، جوالاپور، رڑکی بہت آتا ہے۔ سہارنپور میں ان لوگوں نے چونہ بیچنے کی دوکانیں بھی قایم کر رکھی ہیں۔ دو تین آڑتیں غلہ کچی مٹھائی، مثل گڑ، شکر راب وغیرہ سے متعلق بھی اس برادری کے قبضہ میں ہیں بعض لوگ خالص چاول کی دوکانیں کرتے ہیں اب کچھ عرصے سے دودھ اور مٹھائی کی دوکانیں بھی کرنے لگے ہیں۔ مرمت بائسکل وغیرہ کی بھی ایک دو دوکانیں موجود ہیں۔ پانچ چھ افراد سودی قرضہ کا لین دین بھی کرتے ہیں۔ مگر ان سب کا سرمایہ اس لین دین میں پندرہ بیس ہزار روپے سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اب سے کچھ پہلے بعض افراد برادری حمالی یا بلّہ داری کا کام بھی کرتے تھے لیکن یہ سلسلہ اب موقوف ہو گیا ہے۔ غالباً موٹر ٹرکس کی بہا ہمی سے یہ جانباز ہمت ہار بیٹھے۔ اور شرف انسانی کے ابتدائی دور کا یہ آسان و دشوار شغلہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ سوائے ایک دو کے اب اس کام سے کوئی روزی نہیں کماتا۔ اس برادری کے چند افراد افیون و شراب و جوئے کے بھی عادی ہیں۔ مگر ان کا شمار صرف انگلیوں پر ہو سکتا ہے اس برادری میں پیر پرستی مطلق نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی خوش قسمت فرد ایسا ہو جس نے کسی شیخ یا پیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہو۔ اس برادری کے بہت افراد حاجی اور حافظ ہیں۔ معاشرت معمولی، مگر کھانے پینے پر خوب خرچ کرتے ہیں۔ اور مہمان نوازی سے شوق رکھتے ہیں۔ عورتوں میں پردے کا رواج ہے۔ مگر غیر برادری سے پردہ شاید و باید ہے بیاہ شادی اب تک اپنی ہی برادری میں کرتے ہیں۔ اگر کوئی من چلا کبھی کبھار کسی غیر برادری میں رشتہ ناتہ جوڑتا ہے تو طعن و تشنیع کا نشانہ بن جاتا ہے جسمانی اعتبار سے صحیح سالم اور خوب تندرست ہیں۔

اس برادری کے لوگ پنجاب میں انبالہ کرنال، ریاستہائے پٹیالہ و نابہ و جیند میں بہت آباد ہیں سرہند، لدھیانہ، امرتسر اور لاہور کے ارد گرد بھی موجود ہیں۔ بٹی ضلع لاہور کے کمبوہ تعلیم یافتہ ہیں اور بعض افراد اخبار نویسی و تصنیف کتب و رسائل کا شغل رکھتے ہیں۔

سہارنپور میں دو تین خاندان ایسے ہیں جو ایک لاکھ سے زائد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چند پچاس ہزار اور ایک لاکھ کی درمیانی حیثیت کے مالک ہیں۔ پھر چند خاندان ایسے ہیں جو دس ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان ہیں۔ اکثریت ایک ہزار اور دس ہزار کے درمیان ہے۔ اکثر افراد برادری کے پاس اپنے اپنے ذاتی مکانات ہیں۔ پچاس ساٹھ آدمی ایسے بھی ہیں جو کرایہ پر رہتے ہیں صحرائی جائداد کے مالک بہت کم ہیں۔ خال خال خاندان زمیندار ہیں کچھ کھیتی پیشہ بھی ہیں۔ سہارنپور میں کمبوہان میرٹھ کے چند خاندان بھی موجود ہیں۔ جو محلہ قاضی کے آس پاس رہتے ہیں۔ یہ لوگ بسلسلہ ملازمت سرکاری یہاں آباد ہوئے۔ اور کچھ کی زمینداری ہے جیسے مولوی محمد میاں۔ ڈاکٹر مقصود حسن صاحب چودہ پندرہ برس ہوئے کہ میرٹھ سے آکر سہارنپور آباد ہوئے آپ بازار شہید گنج میں کامیابی کے ساتھ اپنی میڈیکل پریکٹس کر رہے ہیں۔ آنکھوں کے علاج میں بالخصوص مشہور ہیں۔ معز حسین خاں وکیل جو عرصہ ہوا مرحوم ہو چکے ہیں، میرٹھ سے تعلق رکھتے تھے وہ بسلسلہ کاروبار وکالت سہارنپور آئے۔ یہاں پر ان کی کافی جائداد موجود ہے۔ ان کی بیوہ اور بھتیجے یہاں رہتے ہیں۔

اپنی برادری کے بارے میں حکیم عبدالخالق صاحب کا بیان حسب ذیل ہے:۔

اس برادری کے کچھ افراد اپنے آپ کو شیخ کمبوہ، مغل کمبوہ اور سید کمبوہ بتلاتے ہیں۔ اور اکثریت صرف کمبوہ بتلاتی ہے۔ صرف کمبوہ بتلانے والا گروہ حق بجانب اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے ہندو افراد بھی بہ کثرت قریب قریب ہر شہر میں پائے جاتے ہیں۔

ضلع سہارنپور میں اس برادری کے افراد کی تعداد کم و بیش دس ہزار ہے۔ تعلیم کی طرف انہیں زیادہ رجحان ہوا ہے۔ چنانچہ بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔

یہ لوگ عام طور پر تندرست اور قوی ہیکل ہوتے ہیں۔ چند غیر تعلیم یافتہ زمانہ کی بڑھتی ہوئی بربادی میں حصہ لیتے ہیں لیکن برادری میں مذہبی اثر غالب ہونے کی وجہ سے یہ کچھ افراد من مانی حرکات نہیں کرنے پاتے

شادی بیاہ باہر بھی ہوتے ہیں لیکن عام طور پر آپس ہی میں کئے جاتے ہیں۔

پرانے رسم و رواج کے مطابق ابھی تک پنچایت قایم ہے۔ اور اس کے احکامات کی پابندی سختی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک انجمن بھی قایم ہے، جو ضرورت کے موافق اصلاح و بہبودی کے لئے جد و جہد کرتی ہے۔ پنچایت کے بزرگوں سے تکرار پیدا نہیں کرتی بلکہ ہر امکانی کوشش مصلحت بینی پر صرف کرتی ہے جس کی وجہ سے برادری کا انتظام نہایت مستحکم ہے۔

سہارنپور میں اس برادری کے ممتاز حضرات حسب ذیل ہیں:۔

پرانے لوگوں میں حاجی شاہ محمد، حاجی افضل محمد اور حاجی جیون گذرے ہیں۔ جنہوں نے اپنی جد و جہد سے لاکھوں روپیہ اور جائداد پیدا کی اور شہر کے ذی اثر طبقے میں امتیاز پیدا کیا۔ ایک اور صاحب گذرے ہیں جن کا خاندان بھولے والوں کے خاندان کے نام سے مشہور ہے۔

موجودہ دور میں حاجی مشتاق احمد صاحب، حاجی محمد یامین صاحب اور حاجی نواب محمد ابراہیم صاحب اس برادری کے ممتاز حضرات ہیں۔

سہارنپور کی برادری میں اس وقت چند خاندان لکھ پتی ہیں۔ دس بارہ خاندان چالیس پچاس ہزار روپے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی برادری کا نصف حصہ خوش حال کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ نصف حصہ غریب اور دستکار ہے۔ دستکاروں میں زیادہ تر لکڑی کی نقاشی کا کام کرتے ہیں۔

برادری کا سرمایہ صحرائی جائداد میں دس فی صدی اور شہری جائداد میں ۴۰ فی صدی ہے۔ اشیاء چوبی نقشین میں جو سہارنپور کی خاص صنعت ہے، دس فیصدی، سامان تجارت میں تیس فی صدی اور سرکاری قرضوں میں ایک فی صدی تین فی صدی ۲۱ [illegible] زیورات کی صورت میں پانچ فی صدی سواری اور مکان کے ساز و سامان کی صورت میں ایک فی صدی۔

عبدالخالق صاحب نے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ طبقہ کا ایک ایک سالانہ فیملی بجٹ بھی اپنے اندازے اور تخمینہ سے بنا کر دیا تھا، لیکن وہ مجھے کچھ زیادہ معتبر نہیں معلوم ہوا۔ اس لئے اسے شامل نہیں کیا گیا۔

اعلیٰ طبقہ کی مالی حالت اپنی قدیم جگہ پر قایم ہے۔ درمیانی طبقہ تجارت میں حصہ لینے کی وجہ سے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر رہا ہے اور ادنیٰ طبقہ ملازمت اور دستکاری کرکے اپنا کام چلا رہا ہے۔ اس برادری کے افراد کا رجحان تقریباً ملک کی ہر تجارت کی طرف ہے۔ ہر تاجر سال میں کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتا ہے۔ ننانوے فی صدی لوگ مقروض نہیں ہیں۔

شیخ عبدالرب صاحب نے برادری کے کاموں کے سلسلہ میں بتلایا کہ برادری کے لوگ کاشتکاری کرتے ہیں۔ باغات کی فصل خریدتے ہیں۔ چونے کا کاروبار کرتے ہیں۔ بانس اور بلّی کا کاروبار ہے اور یہی لوگ جنگلات کا بھی ٹھیکہ لیتے ہیں۔ مزدوری پیشہ بھی ہیں اور میوہ کی آڑت کا بھی کام کرتے ہیں، ایک آدمی کے پاس غلّہ کی کچی آڑت بھی ہے۔ ایک دوکان گھڑی، چشمہ اور ٹارچ وغیرہ کی ہے۔ ایک وکیل یعنی مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔ ایک دواخانہ ہے۔

برادری کے ممتاز لوگوں میں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حاجی چودھری مشتاق احمد صاحب بانس اور بلّی کا کاروبار کرتے ہیں صحرائی جائداد اور بنگلہ وغیرہ سے بھی آمدنی ہے۔ صرف کرایہ کی آمدنی غالباً ایک ہزار ہوگی، پانچ چھ لاکھ سے کم کی حیثیت نہیں ہوگی

۲۔ حاجی چودھری محمد یامین صاحب، غلّہ کی آڑت ایک لاکھ روپئے سے کم حیثیت نہیں ہوگی۔

۳۔ چودھری محمد ابراہیم صاحب۔ آٹا پیسنے کی چکی، دھان کوٹنے کی مشین اور کرایہ پر کولھو انجن بھی چلتا ہے۔ ان کی حیثیت بھی تقریباً ایک لاکھ ضرور ہوگی۔

۴۔ حاجی عبدالمالک صاحب، مالک قدیم دواخانہ ان کے بڑوں سے یہ کام ہوتا چلا آرہا ہے تیس چالیس ہزار کی حیثیت ہوگی۔

۵۔ حاجی عبدالعزیز صاحب۔ چونے کا کاروبار (۶) اور ان کے بھتیجے۔

۷۔ مخدوم بخش صاحب۔ بانس بلّی کا کاروبار۔ زمیندار بھی ہیں۔ باغات بھی ہیں۔

۸۔ مولوی عبدالحق صاحب وکیل۔

جامعہ

زیرِ ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے

سالانہ چندہ ۵ر، فی پرچہ ۸ر	بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء	جلد ۴۲ نمبر ۱

فہرست مضامین

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) اوبال پریس دہلی

مسلمانانِ ہند کی معاشی حالت کا جائزہ

(مسلمانوں کا مسئلہ آج ملکی سیاست کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس مسئلہ کا کوئی معقول حل اس وقت تک نہیں نکالا جاسکتا جب تک ہمیں مسلمانوں کے بارے میں صحیح حالات اور واقعات معلوم نہ ہوں، ہمیں مسلم آبادی کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کن عناصر پر مشتمل ہے۔ اس کی تعلیمی، اخلاقی اور سماجی حالت کیسی ہے اس کی معاشی حالت جس پر جملہ اصلاح اور ترقی کا دارومدار ہے۔ کیا ہے۔ یہ واقعات اگر پورے ہندوستان کے بارے میں جمع ہوسکیں تو سب سے افضل و بہتر ہے۔ ایسا اگر آسانی سے ممکن نہ ہو تو چند محدود رقبوں کا جائزہ لے کر نمونے کے حالات جمع کرنا چاہئیں اور ان کی بنیاد پر بقیہ تمام لوگوں کی حالت کے بارے میں قیاس کرنا چاہئے۔ اعداد و شمار کی اصطلاح میں اسے نمونے کے جائزے سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی کسی بڑے ڈھیر یا منہ بند تھیلے یا ذخیرے میں سے ایک مٹھی بھر چیز نکال لینا اور اسی سے پورے انبار کے بارے میں قیاس کرنا۔

رسالہ جامعہ میں سہارنپور، علی گڈھ اور دہلی کی مسلمان برادریوں اور پیشہ وروں کے بارے میں جو تفصیلی حالات تقریباً ایک سال سے شایع کئے جارہے ہیں انھیں اسی مقصد کے ماتحت جمع کیا گیا تھا۔ ممکن ہے پوری تصویر سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اشاعت ہمارے بعض قارئین کے لئے الجھن اور بیزاری کا سبب بن گئی ہو ہمیں امید ہے ذیل کا مضمون ان کے لئے تشفی بخش ثابت ہوگا۔)

مدیر

جائزہ کے محرکات ۱۹۳۴ء میں ایک رسالہ "مسلمانوں کے افلاس کا علاج" شائع ہوا تھا۔ یہ اس کمیٹی کی رپورٹ تھی جسے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور ۱۹۳۲ء میں مسلمانان ہند کے مسئلہ افلاس کا حل تجویز کرنے کے لئے مقرر کیا تھا، یہ کمیٹی مولوی طفیل احمد صاحب، حافظ محمد ابراہیم صاحب اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پر مشتمل تھی۔ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ مسلمان اپنے برادران وطن کے مقابلے میں ہر میدان میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں لیکن یہ رپورٹ بہت مختصر تھی اور مسئلہ کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالتی تھی، ضرورت ایک زیادہ باقاعدہ جائزہ لینے کی تھی، چنانچہ جولائی ۱۹۳۴ء کے رسالہ جامعہ میں اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ارباب قوم کو اس طرف متوجہ بھی کیا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں میری نظر سے ایک کتاب "خون کے آنسو" مرتبہ اشفاق حسین صاحب گنڈری جس میں مسلمانوں کی حالت کا بہت دردناک نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس کے بیانات مجھے مبالغہ سے خالی نہیں معلوم ہوئے لیکن میرے پاس اس کی تردید یا تائید کے لئے کوئی معتبر شہادت موجود نہیں تھی، اس وقت سے میرے دل میں برابر خلش رہی کہ اس مسئلہ سے متعلق اپنی معلومات کو ذاتی تحقیقات کے ذریعہ بڑھاؤں لیکن اس کے لئے کوئی موقع نہیں نکل سکا۔

اکتوبر ۱۹۴۲ء میں میں نے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کام کے لئے مجھے چھ مہینے کی رخصت تعلیمی دلوادیں۔ انہوں نے میری درخواست منظور فرمائی اور میں نے اپنا کام شروع کردیا لیکن موضوع اتنا وسیع اور غیر محقق تھا کہ چھ مہینے کا یہ زمانہ ابتدائی مراحل ہی کے طے کرنے میں بسر ہو گیا۔ بہر حال اس جد وجہد کی روداد بجائے خود سبق آموز ہے، اس لئے ذیل کے صفحات میں اس کو پیش کرتا ہوں۔

ماہروں سے مشورہ تحقیقات کا ارادہ کر لینے کے بعد دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس کے حدود کیونکر متعین کیا جائے۔ اس سلسلے میں میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر صاحب سے مشورہ کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ تحقیقات کا کام بالکل خالی الذہن ہو کر کیا جائے اور پہلے سے قائم کی ہوئی

مایوں کو بالکل اشتعال نہ ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ مواد چونکہ جمع کیا ہوا موجود نہیں ہے اور تنہا ایک آدمی کے لئے تفصیلی مواد پورے ہندوستان کے لئے اکٹھا کرنا ممکن نہیں اس لئے تفصیلی تحقیقات کو بڑے رقبہ پر پھیلانے کی جگہ ایک یا چند چھوٹے رقبوں تک محدود رکھا جائے اور اس سے نمونے کا کام لیا جائے۔ اگر اس محدود مطالعہ سے طبیعت مطمئن نہ ہو اور تحقیقات کو عمومی رنگ دینا ضروری ہی سمجھا جائے تو اول تو ایک صوبے کے لئے ایسی معلومات فراہم کی جائیں جن کا حاصل کرنا ممکن ہو، اور پھر اسی طرح کا ایک سرسری جائزہ کل ہندوستان کے حالات کا لیا جائے اور ہر موقع پر تحقیقات کے حدود کی وضاحت کر دی جائے۔

اس سلسلے میں دوسرا مشورہ میں نے دہلی یونیورسٹی کے معاشیات کے پروفیسر وی۔ کے آر، وی، راؤ صاحب سے لیا، یہ قوم پرست خیال کے بزرگ ہیں۔ انھیں یہ فرقہ وارانہ مطالعہ پسند نہیں آیا، اور اس میں انھیں پاکستانی سیاست کی جھلک نظر آئی، انہوں نے کہا کہ معاشی زندگی میں فرقہ وارانہ حدود کا قایم کرنا مشکل ہے۔ بعض معاشی کاروبار ضرور ایسے ہیں کہ جو بہت زیادہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ مثلاً چمڑے کی تھوک آڑت کا کام۔ بعض ایسے ہیں جو زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں مثلاً کپڑے اور غلہ کی تھوک تجارت کا کام۔ بڑے پیمانے کی صنعت اور بنک کاری میں بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کا غلبہ ہے لیکن بقیہ بہت سے کاموں میں ہندو اور مسلمان کم وبیش یکساں طریقے پر شریک ہیں۔ ان میں معاشی بنیاد پر ایک ہی طبقہ اور حیثیت کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی تصادم پیدا نہیں ہوتا اور مذہبی تفریق، معاشی تفریق کا موجب نہیں ہوتی۔ کاروبار نفع طلبی کے ماتحت چلایا جاتا ہے، اس میں نہ مذہبی اختلاف مزاحم ثابت ہوتا ہے، نہ مذہبی اتحاد معاون۔

انہوں نے کہا۔ اس قسم کی تحقیقات کو یا تو مقامی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے یا پیشہ کی بنیاد پر اور ان دونوں بنیادوں میں معاشی حدیں مذہبی حدوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ پیشہ کے لحاظ سے ہندوستان میں کسی جگہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمان تمام کے تمام کاشتکار، مزدور یا مقروض ہوں۔ اور

ہندوستان کے سارے زمیندار، آجر اور ساہوکار ہوں، موخرالذکر مسلمان بھی ہوتے ہیں اور ہندو بھی۔ اگر کہیں کہیں مسلمان زمینداروں، آجروں اور ساہوکاروں میں زوال نظر آتا ہے، تو دوسری طرف ہندو زمیندار، آجر اور ساہوکار بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ عروج و زوال مذہب کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض معاشی صلاحیتوں یا عدم صلاحیتوں کی وجہ سے ہوتا ہے جن لوگوں میں مناسب صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ قطع نظر اس سے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان ترقی کرتے ہیں۔ اور جن میں وہ صلاحیتیں نہیں وہ زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں نے اقتدار کی جگہوں پر کوئی مذہبی اجارہ قایم نہیں کر رکھا ہے اور مسلمانوں کو ان سے بے دخل کرنے کی کوئی منظم سازش نہیں کر رکھی ہے، وہ مسلمانوں کے ساتھ کھلے مقابلے میں شریک ہیں اور محض اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے اس مقابلے میں ہارتے یا جیتتے رہتے ہیں۔ اس مقابلہ میں انصاف کے اصول کی پابندی کرانے کی ذمہ داری انگریز حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اور ان کے بارے میں یہ ہرگز فرض نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ دوسری طرف ماتحت طبقوں پر جب نگاہ ڈالی جاتی ہے تو وہاں بھی ایک مسلم کاشتکار اور ہندو کاشتکار ایک مسلم مزدور اور ہندو مزدور، ایک مسلم مقروض اور ہندو مقروض کا معاشی مفاد مشترک نظر آتا ہے۔ دونوں کو مساوی طور پر ایک سخت گیر زمیندار، آجر یا ساہوکار کے استحصال اور نا ئندستانی کا شکار بننا پڑتا ہے، کوئی زمیندار، آجر یا ساہوکار اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ محض مذہبی اشتراک کی بنا پر، سوا اس صورت کے کہ وہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کر رہا ہو۔ ترجیحی سلوک نہیں کرتا۔

اسی طرح مقامی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مسلم اور ہندو آبادیاں، علیحدہ علیحدہ مکانی بالذات رقبوں میں بٹی ہوئی نہیں ہیں، بلکہ ہندو اور مسلمان عموماً ساتھ ساتھ رہتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ معاشی تعلقات قائم رکھنے کے لئے مجبور ہیں اور یہ معاشی تعلقات ان کے اتحاد کو قایم رکھنے کے لئے ان جذباتی اختلافات کے مقابلہ میں جن کو فرقہ پرست رہنما بھڑکاتے

سکتے ہیں، زیادہ گہری اور پائدار بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ میرے یہ اعتراض تو اس تحقیقات کے مقاصد سے متعلق تھے لیکن اس کی عملی دشواریاں اسے اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض بنا دیتی ہیں۔ سرکاری رپورٹوں میں عموماً مذہبی بنیاد پر معاشی اعداد و شمار اکٹھے نہیں کئے جاتے۔ یہاں تک کہ حالیہ مردم شماری کی رپورٹوں میں پیشوں کی تقسیم کو بھی مذہبی بنیاد پر فراہم کرنا ترک کر دیا گیا ہے ایسی صورت میں جب تک مخصوص طور پر مسلمانوں کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرنے کا محکمہ قایم نہ کیا جائے کسی نتیجہ خیز اور لایق وثوق تحقیقات کو شروع نہیں کیا جاسکتا اور یہ کام نہ صرف یہ کہ انتہائی درجہ دشوار ہے بلکہ انتہائی درجہ عبث اور بے کار بھی ہے

میرے ان تمام اعتراضوں کے باوجود اگر آپ کا فرقہ وارانہ جذبۂ خدمت آپ کو اس قسم کی تحقیقات کرنے کے لئے مجبور کرتا ہو۔ تو پھر میرا آپ کو یہ مشورہ ہوگا کہ آپ دو قسم کی تحقیقاتوں کو شروع کریں کہ وہ ایک طرف تو قابلِ انتظام ہوں گی اور دوسری طرف آپ کے لئے بارآور اور آپ کے فرقہ کے لئے فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہیں۔ اوّل تو یہ معلوم کریں کہ ان کاموں میں جن میں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ مثلاً چمڑے کی تھوک تجارت میں ان کی فوقیت کے کیا اسباب ہیں اور ان کو کس طرح قایم رکھا اور بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ دوسرے ان خاص خاص کڑیوں کی نوعیت کے بارے میں تفتیش اور تحقیق کریں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو معاشی زنجیر میں منسلک کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً جہاں ہندو زیادہ تر آجر اور مسلمان مزدور ہیں، ہندو ساہوکار اور مسلمان مقروض ہیں، ہندو زمیندار اور مسلمان کاشتکار ہیں۔ ہندو سرکاری یا غیر سرکاری دفتروں اور محکموں میں عہدے دار اور مسلمان ان کے ماتحت ہیں۔ اگر ان جگہوں میں مذہب کے اختلاف کی وجہ سے کوئی مخصوص انتفاع ناجائز جبر و ظلم یا مذہبی تعصب اور جانبداری کی مثالیں نظر آئیں تو ان کو منظرِ عام پر لائیں۔ اور ان کی اصلاح و ازالہ کی تدبیر بتلائیں۔

پروفیسر راؤ سے ملاقات کرنے کے بعد میں مولانا طفیل احمد صاحب سے ملنے کے لئے علی گڑھ گیا مولانا صاحب نے اس سلسلے میں جو بے بہا خدمات انجام دی ہیں، اور معلومات کا جتنا اچھا ذخیرہ

محض اپنی ذاتی کوشش سے یکجا کر دیا ہے۔ وہ بہت زیادہ لائقِ تعریف ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے رسالہ "سودمند" کے تمام پرانے مجلدات اور بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے مجھے عنایت فرمائے جن سے میری معلومات میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ مولوی صاحب نے بتلایا کہ مسلمانوں کی معاشی اصلاح کے بارے میں جو رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے ۱۹۳۲ء میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے لئے ان کی کمیٹی نے نہ تو کوئی مفصل تحقیقات کرائی تھی۔ نہ کسی قسم کے اعداد و شمار ذاتی طور پر جمع کئے تھے اور نہ کہیں شہادتیں قلم بند کی تھیں بلکہ مردم شماری، بندوبست اور امداد باہمی کے محکموں کی رپورٹوں اور چند مخصوص کتابوں میں جو معلومات موجود تھیں۔ انہی کی بنا پر چند روز کی محنت کے بعد ایک مختصر سی رپورٹ تیار کر دی گئی تھی، مولوی صاحب نے مشورہ دیا کہ سب رجسٹرار کے دفتر سے گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے لئے، کہ اتنے سالوں ہی کا رکارڈ موجود مل سکے گا اگر جائداد غیر منقولہ کے اعداد و شمار جمع کئے جا سکیں تو بہت مفید ہوگا کیونکہ اس کے ذریعہ پتہ چل سکے گا کہ مسلمانوں کی جائداد کے انتقال کا رجحان کیا رہا۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب نے رکارڈ سے ذاتی واقفیت کی بنا پر، کہ وہ خود سب رجسٹرار رہ چکے ہیں حسب ذیل ہدایتیں فرمائیں:۔

(۱) انڈکس ۱ کے خانوں میں جائداد غیر منقولہ ہوتی ہے، اور نام فریقین دستاویز۔ ان ناموں سے معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے کتنی جائداد خریدی، فروخت کی یا رہن رکھی، دستاویز کی نوعیت اور مالیت وغیرہ بھی درج ہوتی ہے اور جس رجسٹر میں اصل دستاویز نقل ہوتی ہے اس کا بھی پورا پتہ ہوتا ہے تاکہ اصل رجسٹر کا مطالعہ کیا جا سکے جس دستاویز کو آپ دیکھنا چاہیں وہ آپ رجسٹر ۱ کو لے کر دیکھ سکتے ہیں۔

(۲) آپ شہر کول کی دستاویزات دیکھنا چاہیں تو انڈکس ۲ میں صرف ک میں شہر کول دیکھ سکتے ہیں، اس طرح ہر سال کے انڈکس میں آپ کو صرف چند صفحات دیکھنے پڑیں گے اور ایک نشست میں آپ بہت سے سالوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

(۳) دفتر رجسٹری میں آپ کو بجز رجسٹر ۱ اور انڈکس ۲ کے اور کسی رجسٹر کے دیکھنے کی ضرورت

ضرورت نہیں ہے۔ یہ دونوں غیر منقولہ کے متعلق ہیں۔

(۴) البتہ اگر تمسکات سادہ دیکھنے ہوں تو رجسٹر ۴ مع اس کی انڈکس کے دیکھنا چاہئے۔

علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں مجھے اپنے استاد، مسلم یونیورسٹی کے معاشیات کے پروفیسر ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر صاحب سے بھی مشورہ کرنے کا موقع ملا۔ صاحب موصوف نے مجھے چارلس رسٹ کی مرتبہ کردہ ایک کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی ہوئی عنایت فرمائی۔ اس کتاب میں فرانس کی معاشی اور معاشرتی حالت کا جائزہ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد کے زمانہ کو پیش نظر رکھ کر لیا گیا تھا انہوں نے مجھے اس کتاب کو اپنا نمونہ بنانے کی ہدایت فرمائی، اور مشورہ دیا کہ میں اپنی تحقیقات کو کسی چھوٹے مقام علی گڈھ تک محدود رکھوں، اور کام کو زیادہ پھیلانے کا حوصلہ نہ کروں، کہ اس کا انتظام ایک تنہا آدمی کے لئے ناممکن ہے۔ اس کتاب کے ابواب یہ تھے :۔ پہلا باب خود چارلس رسٹ کا لکھا ہوا مقدمہ تھا جس میں فرانس کی معاشی اور معاشرتی حالت کے ارتقا سے بحث تھی اس کے بعد کے بابوں میں جو دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے تھے، ملکی ساخت، آبادی کی ساخت پیشوں کی ساخت، زرعی ساخت، صنعتی ساخت، تجارتی ساخت۔ اقدام و انتظام کرنے والوں کی ساخت، زر کی ساخت قیمتوں، بنک کاری کے طریقوں کی ساخت، قومی دولت اور قومی آمدنی .... بحث کی ساخت، نوآبادیاں اور مادری وطن، خارجی مبادلہ، دوسرے ملکوں سے مقابلہ وغیرہ سے بحث کی گئی تھی۔

اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ پہلے سے بنائے ہوئے کسی نقشے پر کام شروع کرنا مناسب نہ ہوگا، کیونکہ ہم کو ابھی تک اپنے موضوع ہی سے واقفیت نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کے بارے میں باتیں بہت بناتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ مسلمان کیا ہیں۔ ہمیں ان سے رابطہ اور قریبی تعلق پیدا کرنا چاہئے۔ ان کی زندگی کا نزدیک سے مشاہدہ خود بخود سوالات کو پیدا کرے گا اور یہ سوالات اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ تحقیقات کا نہج کیا ہونا چاہئے اس لئے مسلمانوں سے ملو، انہیں قریب سے دیکھو۔ یہ سب سے پہلا کام ہے، مسلمان ہی تمہیں بتلائیں گے

کی تحقیقات کے عنوانات کیا ہو سکتے ہیں۔ اپنے استاد کی یہ بات سب سے زیادہ میرے دل کو لگی، میں نے ارادہ کر لیا کہ تحقیقات کے آخری حدود کا تعین تو جب ہی کروں گا جب کسانوں سے رابطہ قایم اور ان کا قریب سے مشاہدہ کر لوں گا لیکن کام کی ابتدا کرنے کے لئے مجھے عارضی طور پر کچھ نقشے بنانے پڑے، جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

کتابوں کی تلاش

ان ماہروں سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے ان کتابوں کی تلاش شروع کی جو میری تحقیقات میں مدد دے سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے اول لایق ذکر کتاب ولیم ہنٹر کی ہے جس کا نام ہے "ہمارے ہندوستانی مسلمان کیا انھیں ایمانداری کے ساتھ ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے کا حق حاصل ہے" یہ کتاب سنہ ۱۸۷۱ء میں لکھی گئی تھی، اور اس میں مسلمانوں کی تباہ حالت دکھلا کر حکومت کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ان کی طرف سے اپنی پالیسی کو بدلے اور انھیں حکومت کی ملازمتوں آزاد پیشوں اور تعلیم میں زیادہ شریک ہونے کا موقع دے، دوسری کتاب تھوربرن کی "مسلمان اور ساہوکار" ہے اس کتاب میں مسٹر تھوربرن نے یہ دکھلایا تھا کہ کس طرح سندھ اور پنجاب کی زمینیں مسلمان زمینداروں کے ہاتھ سے نکل کر ساہوکاروں کے ہاتھ میں پہنچتی جارہی ہیں، اور اس انتقال کی ذمہ داری برطانوی قانون اور عدالت کے طریقوں پر کتنی زیادہ آتی ہے۔ اسی کتاب کی اشاعت کا نتیجہ تھا کہ پنجاب کے لئے سنہ ۱۹۰۱ء میں قانون انتقال اراضی منظور ہوا، اور دوسرے اسی قسم کے اور قانون بھی منظور ہوئے جن میں کاشتکاروں اور زمینداروں کو ساہوکار کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان دو بنیادی کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابوں اور رپورٹوں میں بھی مفید مواد نظر آیا

مسٹر ڈارلنگ کی کتاب "پنجاب کا کسان، قرض اور خوش حالی کی حالت میں" ہندوستان

اور اس کے صوبوں کی مردم شماری کی جلد رپورٹیں۔

ہندوستان کے امپیریل اور ضلع وار جلد گزیٹیر میں۔

ہندوستان کے بندوبستی اضلاع کے جلد بندوبستوں کی رپورٹیں مع تحصیلوں کی رینٹ

اور اسسمینٹ رپورٹس۔

کل ہندوستان اور اس کے محکمۂ تعلیم اور تعلیمی کمیشنوں اور کمیٹیوں کی رپورٹیں۔

محکمۂ انجمن ہائے امداد باہمی کی رپورٹیں۔

تحقیقات دستور کے مختلف شاہی کمیشنوں اور کمیٹیوں کے سامنے مسلمانوں کے بارے میں شہادتیں۔

محکمۂ تجارت و صنعت یو۔پی کی شائع کردہ "یوپی کی تجارتی ڈائرکٹری برائے ۱۹۳۴ء"

یو۔پی کی صنعتوں کے بارے میں ضلع وار مونوگرافس شائع کردہ محکمہ صنعت یو۔پی۔

یوپی کی صنعتوں کے بارے میں نوٹ۔ مرتبہ اے، سی، چٹرجی۔

صنعتی پنجاب، مصنفہ اے، لطیفی۔

بمبئی، کلکتہ، مدراس اور کل ہندوستان کی ان ویسٹرس ایئر بک۔

ٹھیکرسے کی ڈائرکٹری، انڈسٹری ایئر بک اینڈ ڈائرکٹری اور دی ٹائمس آف انڈیا ایئر بک اینڈ ہوز ہو۔

بھارت کے دیسی پاریوں کا پرچنے (ناشر کمرشل بک پبلشنگ ہاؤس بھان پورہ)

اگروال جاتی کا اتہاس (ناشر اگروال ہسٹری آفس خان پورہ ریاست اندور۔

The States Estates & Whos Who in India & Burma

مرتبہ کھوسلہ۔ ناشر امپیریل پبلشنگ کمپنی لاہور

مرکزی اور صوبجاتی مجالس قانون ساز کے مباحثوں کی روداد اور اراکین کے سوالوں کے جواب۔

مزدوروں کے شاہی کمیشن کی رپورٹ اور اس کے سامنے شہادتیں۔

عربوں کی جہاز رانی، مصنفہ سید سلیمان ندوی۔

عرب و ہند کے تعلقات، " " "

ڈاکٹر اشرف کی کتاب۔ مسلمانوں کے ابتدائی زمانہ حکومت میں معاشی اور معاشرتی حالات۔

مورلینڈ کی کتابیں "ہندوستان اکبر کے انتقال کے وقت" اور "اکبر سے اورنگ زیب تک"۔

نائی نس کی کتاب "ہندوستانی مسلمان"۔

سرڈینزل ایبٹسن کی کتاب "پنجاب کی ذاتیں" اور اس کی مرتب کی ہوئی ۱۸۸۱ء کی پنجاب کی مردم شماری رپورٹ۔

مسٹر روز کی "پنجاب کے قبائل اور ذاتوں کی تشریحی فہرست" اور اس کی مرتب کی ہوئی سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری رپورٹ۔

سر ہربرٹ رسلے کی سنہ ۱۹۰۱ء کی کل ہند مردم شماری رپورٹ۔

ایمیلے سنارٹ کی کتاب "ذات کا نظام"۔

مسلم چیمبر آف کامرس کلکتہ کی رپورٹ۔

تحقیقات کا ابتدائی خاکہ میں نے اپنی تحقیقات کی ابتدا کرنے کے لئے حسب ذیل عنوانات مقرر کئے:۔

۱۔ مسلم آبادی۔ اس کی مختلف صوبوں اور علاقوں میں تقسیم، شرح پیدائش، شرح اموات، متوقع عمر کا اوسط، عورتوں اور مردوں کا تناسب، شادی شدہ و غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی تعداد۔ شادی عموماً کس عمر میں کی جاتی ہے۔ عمر کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم مختلف عمر کے لوگوں میں شرح اموات، مختلف نسل اور پیشہ ورانہ گروہوں میں آبادی کی تقسیم۔ آبادی کی بصورت مجموعی اور مختلف عمر کے لوگوں کی عام صحت و توانائی۔ آبادی کے مائل بہ ترقی یا مائل بہ تنزل ہونے کے بارے میں عام نتیجہ۔

۲۔ مسلمانوں میں ذاتوں اور برادریوں کی اہمیت۔ آبادی کی برادری کے لحاظ سے

تعلیم کون سی برادریاں بحیثیت برسر اقتدار ہیں، کونسی گری ہوئی حالت میں ہیں۔ آئندہ کے لئے رجحانات کیا نظر آتے ہیں۔

۳۔ مسلمانوں میں تعلیم، عام، فنی، ابتدائی، ثانوی، یونیورسٹی کی، عورتوں کی، بالغوں کی، مذہبی وغیرہ

۴۔ سرکاری سول، فوجی اور پولس کی اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔ اس میں مرکزی، صوبجاتی، میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈوں، پورٹ ٹرسٹوں، کارپوریشنوں سب قسم کی ملازمتیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں مرکزی اور صوبجاتی مجالس مقننہ کے ممبران میونسپل کمشنر، ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر آنریری مجسٹریٹ۔ آنریری اسسٹنٹ کلکٹر وغیرہ بھی شامل ہیں

۵۔ اعلیٰ علمی پیشوں میں مسلمانوں کی نمائندگی مثلاً قانون، طبقہ علما، تعلیم، طب، انجینیری سائنس، موسیقی، ادب، شاعری، نقاشی، مجسمہ سازی، ڈرامہ نگاری اور صحافت وغیرہ میں ان کی نمائندگی۔

۶۔ مسلم والیان ریاست۔

۷۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے زمیندار و تعلقہ دار۔ اس میں مسلمان خطاب یافتہ لوگ بھی شامل ہیں۔

۸۔ مسلمانوں میں شہر کی زمینوں اور مکانوں کے بڑے بڑے مالک۔

۹۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے صنعتی، آجر و منتظم یعنی بڑی کمپنیوں کے منیجنگ ایجنٹ اور ڈائرکٹر۔

۱۰۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے تھوک فروش اور مال کی رسد مہیا کرنے والے

۱۱۔ مسلمانوں میں عمارت کے اور دوسری قسم کے بڑے بڑے ٹھیکہ دار۔

۱۲۔ مسلمانوں میں ذرائع نقل و حمل اور خبر رسانی کے بڑے بڑے مالک۔

۱۳۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے ساہوکار اور سرمایہ فراہم کرنے والے لوگ۔

۱۴۔ اوپر کے تمام نجی کاروباروں میں جو اعلیٰ منیجر اور اعلیٰ ملازم ہیں ان کے اندر مسلمانوں کی نمائندگی۔

۱۵۔ مسلمانوں میں سرمایہ دارانہ اقدام پر ایک عام تبصرہ

۱۶۔ نمبر ۴ سے نمبر ۴ تک کے متوسط درجہ کے کاموں میں مسلمانوں کی نمائندگی یعنی

(i) متوسط درجہ کے سرکاری، میونسپل، ڈسٹرکٹ بورڈ اور نجی ملازموں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

(ii) علمی پیشوں کے متوسط حیثیت کے لوگوں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

(iii) متوسط حیثیت کے زمینداروں، مالکان مکان اور کمپنی کے حصہ داروں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

(۱۷) متوسط درجہ کے صنعتی تاجروں میں مسلمانوں کی نمائندگی، یعنی (۱) تالے، اور دھات کے سامان بنانے والوں میں۔ (۲) روئی اوٹنے اور اس کے گٹھے بنانے والوں میں (۳) مشین سے تیل پیڑنے والوں میں (۴) برف بنانے والوں میں (۵) مشین سے آٹا پیسنے والوں میں (۶) سوتی کپڑا اور دری بُننے والوں میں (۷) عمارتیں تعمیر کرنے والوں میں (۸) جوتے تیار کرنے والوں میں (۹) کتابیں تیار کرنے اور چھاپنے والوں میں (۱۰) کھوں لبکٹ اور دوسری صنعتوں میں۔

(۷) متوسط درجہ کے تاجروں میں مسلمانوں کی نمائندگی، یعنی (۱) غلہ، تلہن، روئی، گڑ، شکر، گھی، چاول، دال، آٹا اور تیل کے تاجروں میں (۲) گرم مسالے، خشک میوہ اور رنگوں کے تاجروں میں (۳) کپڑے کے تاجروں میں (۴) دھات کے سامان کے تاجروں میں (۵) دھات کے برتنوں کے تاجروں میں (۶) ابنا طاقانہ کے تاجروں میں جس میں موزے جراب، آرائش و زینت وغیرہ کے سامان فروخت کرنے والے شامل ہیں (۷) جوتے کے تاجروں میں (۸) ٹوپی کے تاجروں میں (۹) چمڑے، کھالوں، ہڈی اور روغن کے تاجروں میں

(۱۰) تلث پھلوں کے تاجروں میں (۱۱) ترکاری کے تاجروں میں (۱۲) تالے اور دھات کے چھوٹے سامان کے تاجروں میں (۱۳) عمارت سازی کے سامان کے تاجروں میں جن میں سیمنٹ، چونے، پنٹ وارنش وغیرہ کے تاجر شامل ہیں (۱۴) عمارتی لکڑی کے تاجروں میں (۱۵) سوختنی لکڑی اور کوئلہ کے تاجروں میں (۱۶) مٹی کے تیل کے تاجروں میں (۱۷) دوا فروشوں میں (۱۸) پٹرول کے تاجروں میں (۱۹) کارتوس، بندوق وغیرہ کے تاجروں میں (۲۰) کتابوں اور اسٹیشنری کے تاجروں میں (۲۱) فرنیچر کے تاجروں میں (۲۲) گوشت کے تاجروں میں (۲۳) تیار کھانے کے تاجروں میں جس میں مٹھائی، کیک، پیسٹری وغیرہ بھی شامل ہیں (۲۴) سوڈا واٹر کے تاجروں میں (۲۵) آلات موسیقی کے تاجروں میں جس میں ریڈیو، گراموفون وغیرہ بھی شامل ہیں (۲۶) سامان تفریح کے تاجروں میں مثلاً سینما وغیرہ (۲۷) شراب اور منشیات کے تاجروں میں (۲۸) سائیکلوں کے تاجروں میں (۲۹) زیورات کے تاجروں میں (۳۰) خیاطی کے کام کرنے والوں میں (۳۱) گھڑی کے تاجروں میں۔ (۳۲) ہوٹل چلانے والوں میں (۳۳) بھوسہ اور چارہ فروخت کرنے والوں میں (۳۴) چھپر کا سامان تیار کرنے والوں میں (۳۵) موٹر کے تاجروں میں (۳۶) عمارتی پتھر کے تاجروں میں وغیرہ وغیرہ

(vi) متوسط درجہ کے نقل وحمل کے مالکوں میں مسلمانوں کی نمائندگی، مثلاً لاری کے مالکوں میں۔

(vii) متوسط درجہ کے ساہوکار اور قرض دہندوں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

(viii) متوسط درجہ کے دوسرے پیشوں میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

(۱۷) پٹہ دار کسانوں اور چھوٹے مالکان سیر خود کاشت کے طبقوں میں مسلمانوں کی نمائندگی

(۱۸) کاریگر، ماہر مزدور، چھوٹے خوردہ فروش، تانگہ اور ٹھیلہ کے مالک اور ان کے چلانے والوں کے طبقہ میں مسلمانوں کی نمائندگی۔ ان میں فٹر، الکٹریشن، موٹر کو چلانے اور اس کی مرمت کرنے والے بھی شامل ہیں۔

(۱۹) بری، بحری اور ہوائی فوجوں اور پولیس اور دوسرے سرکاری دفتروں میں معمولی سپاہی

حیثیت سے مسلمانوں کی نمائندگی۔

۲۰۔ مسلمان زراعتی مزدور کی حیثیت سے۔

۲۱۔ مسلمان شہر کے معمولی غیر ماہر مزدور کی حیثیت سے

۲۲۔ مسلم عورتیں، روزی کمانے والوں کی حیثیت سے۔

۲۳۔ مسلمان، غیر دولت آفریں پیشوں میں۔

۲۴۔ مسلمانوں میں عورتوں کی عام حیثیت اور حالت۔

۲۵۔ مسلمانوں کی عام اخلاقی حالت اور مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج۔

۲۶۔ مسلم آبادی کے مختلف طبقوں کے فیملی بجٹ۔

۲۷۔ مسلم حکومت کی ابتدا میں مسلمانان ہند کی عام معاشی اور معاشرتی حالت۔

۲۸۔ مسلم حکومت کے انتہائی عروج کے زمانے میں مسلمانان ہند کی عام معاشی اور معاشرتی حالت۔

۲۹۔ مسلم حکومت کے زوال کے بعد طوائف الملوکی کے زمانہ میں مسلمانوں کی عام معاشی اور معاشرتی حالت۔

۳۰۔ برطانوی حکومت کے زمانہ میں غدر سے پہلے تک مسلمانوں کی عام معاشی اور معاشرتی حالت۔

۳۱۔ غدر سے ایم، اے، او، کالج کے قیام تک مسلمانوں کی عام معاشی اور معاشرتی حالت

۳۲۔ ایم، اے، او، کالج سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام تک مسلمانوں کی عام معاشی اور معاشرتی حالت۔

۳۳۔ ۱۹۱۹ء کی سیاسی اصلاحات کے بعد سے اب تک مسلمانوں کی عام معاشی اور معاشرتی حالت۔

۳۴۔ آخری تبصرہ اور خاتمہ۔

سوال نامے تحقیقات کا ابتدائی خاکہ مرتب کرنے کے بعد دوسرا کام سوال نامے تیار کرنا تھا تاکہ ان کے ذریعہ سے مسئلہ کے زیادہ اہم پہلوؤں پر مختلف جگہوں اور مختلف خیال کے لوگوں کی شہادتیں جمع کی جاسکیں، ذیل میں پہلے ان سوال ناموں کے عنوانوں کو اور بعد میں اصل سوال ناموں کو درج کیا گیا ہے۔

(۱) تحقیقات کی عام نوعیت کے بارے میں سوال نامہ۔

(۲) مسلم برادریوں کے بارے میں عام سوال نامہ۔

(۳) بڑی صنعت، تجارت کے بارے میں عام سوال نامہ۔

(۴) چھوٹی صنعتوں کے بارے میں سوال نامہ

(۵) زمینداروں کے بارے میں عام سوال نامہ (الف)۔

(۶) زمینداروں کے بارے میں سوال نامہ (ب)

(۷) طبقہ متوسط کے معیار زندگی کا تعین کرنے کے لئے سوال نامہ

(ان سوال ناموں کو طوالت کے خوف سے یہاں حذف کر دیا گیا ہے)۔

آزمائشی تحقیقات ماہروں سے مشورہ اور کتابوں کی تلاش کرنے اور تحقیقات کا ابتدائی خاکہ اور سوال نامے تیار کرنے کے بعد تین جگہوں یعنی سہارنپور، علی گڑھ، اور دہلی میں آزمائشی تحقیقات کا کام شروع کیا گیا۔ ان جگہوں کا انتخاب کسی اصول کو نہیں بلکہ محض آسانی کو سامنے رکھ کر کیا گیا لیکن ویسے ان مقامات کو اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علی گڑھ مسلمانوں کی جدید تعلیم اور تمدن کا سب سے بڑا مرکز ہے ضلع علی گڑھ میں مسلمانوں کی آبادی بصورت مجموعی صوبہ یو. پی کے عام تناسب کے مطابق ہے لیکن شہر میں ان کی آبادی خاصی ہے اور تالے اور دھات کی صنعت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علی گڈھ کا انتخاب مدرستہ العلوم قائم کرنے کے لئے سرسید نے غالباً اس وجہ سے بھی کیا تھا کہ یہاں مسلمان زمینداروں کے بہت سے ممتاز خاندان آباد تھے۔ سہارنپور کی حیثیت بھی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مرکز ہونے کی وجہ سے بہت زبردست ہے۔ یہاں مدرسہ مظاہر العلوم اور دارالعلوم دیوبند

واقع ہیں۔ شہر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دیہات میں بھی ان کی نمائندگی بہت اچھی ہے۔ کاشتکاروں کے طبقہ میں بھی بہت سے مسلمان شامل ہیں۔ دہلی کو مسلمانوں کی زندگی میں مختلف وجوہ سے جو اہمیت حاصل رہی ہے اور اب بھی ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔

ان تین جگہوں کی بجز ئی اور آزمائشی تحقیقات سے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ اگر صحیح طریقہ پر لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسے ہمدرد قوم اصحاب کی کمی نہیں ہے جو اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر نہ صرف تحقیقات کرنے والے کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں بلکہ تحقیقات کا پورا بوجھ تک اپنے اوپر لینے کے لئے آمادہ کئے جا سکتے ہیں، اور ان کے اشتراک عمل سے وہ قیمتی معلومات مہیا کی جا سکتی ہیں جو کسی طبع شدہ کتاب یا رپورٹ میں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ لوگوں میں بیداری پائی جاتی ہے۔ انھیں اپنے نقصان کا احساس ہے۔ وہ اپنی کمی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اصلاحی انجمنیں بنا رکھی ہیں۔ ان کے نوجوان کارکنوں میں مستعدی اور جوش عمل موجود ہے۔ ضرورت صرف رہنمائی اور تنظیم کی ہے۔ سہارنپور، علی گڈھ اور دہلی میں تحقیقات کے جن مختلف طریقوں کو میں نے اختیار کیا ان کی تفصیل اور ان کی افادی اہمیت کو میں نے ان علاقوں کی تحقیقات کی رپورٹ کے ساتھ مناسب موقع پر درج کر دیا ہے۔

تحقیقات کی باقاعدہ تنظیم کا خاکہ

اس آزمائشی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کام کو باقاعدہ طور پر تنظیم دینے کے لئے مسلمانان ہند کے معاشی جائزہ کا ایک مرکزی دفتر قایم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مرکزی دفتر کی نگرانی میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہونا چاہئے جس میں اس موضوع سے متعلق تمام مطبوعہ کتب و رسائل اور رپورٹیں اکٹھی کی جائیں۔ مرکزی دفتر کا یہ کام ہونا چاہئے کہ وہ ہندوستان کے تمام علاقوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرے، انھیں مناسب ترتیب کے ساتھ فائلوں میں جمع رکھے، اور ہندوستان کے ہر صوبے، ریاست، ضلع اور شہر کے ایسے معتقدر، بارسوخ، اہل علم اور ہمدرد قوم اصحاب سے تعلقات قایم کرے۔ جو رضاکارانہ طریقے پر اپنے علاقے کے بارے میں ان سوالناموں کے مطابق جو وقتاً فوقتاً

دفتر سے جاری ہوتے ہیں، معلومات فراہم کر کے روانہ کریں۔ اپنے علاقے کے لئے نامہ نگار بن سکیں۔ اور سلسلہ مراسلت اور ملاقات کو جاری رکھ کر تحقیقات کے کام کو آگے بڑھا سکیں اس کے علاوہ چند تربیت یافتہ محققوں کی ضرورت ہے جو دورہ کر کے مقامی اصحاب کی حاصل کردہ معلومات کو مناسب شکل میں مکمل کر سکیں۔ اس پورے کام کے لئے سرمایہ اور کسی بڑے قومی ادارے کی سرپرستی کی ضرورت ہے اگر قوم سیاسی اور تعلیمی رہنما اس طرف متوجہ ہوں تو کام کو انجام تک پہنچانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اپنے محدود وسائل کے ساتھ جو کچھ مجھ سے بن سکا میں نے کیا ؎

"من کردہ ام آغاز بہ پایاں کر رساند"

غذا کی کمی سے نجات

کیا دنیا کے سب آدمیوں کو مناسب غذا، کافی مقدار میں فراہم کی جاسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب دنیا کی چوالیس قوموں کے نمائندوں نے جو دنیا کی اسّی فی صدی آبادی کی نمائندگی کر رہے تھے، ہاٹ اسپرنگس (ورجینیا) کی عالمی کانفرنس میں، جو غذا کی ترقی و اصلاح کے لئے سنہ ۱۹۴۳ء کے موسم گرما کے آغاز میں منعقد کی گئی تھی، اثبات میں دیا تھا۔ انھوں نے متعدد قرار دادیں منظور کی تھیں جن سے ایک انقلابی نقطۂ نگاہ کا پتہ چلتا تھا۔ ان کے منشور کی ابتداء ان پُر امید الفاظ کے ساتھ کی گئی تھی۔

"یہ کانفرنس جو ایک ایسی جنگ کے دوران میں منعقد کی جارہی ہے جو دنیا کی عظیم ترین جنگ ہے، فتح پر پورا بھروسہ رکھتے ہوئے اور غذا اور زراعت کے عالمی مسئلوں پر غور و خوض کرنے کے بعد، اپنے اس یقین کا اعلان کرتی ہے کہ دنیا کی ساری قوموں کی تندرستی اور طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے موزوں غذا کی جس کافی مقدار میں ضرورت ہے اس کو فراہم کیا جاسکتا ہے اور دنیا کو غذا کی کمی سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔

"یہ صحیح ہے کہ ابھی تک لوگوں کی صحت کو قایم رکھنے کے لئے کافی غذا کبھی بھی میسر نہیں آسکی ہے۔ لیکن اب اس کی ذمّہ داری قدرت کی بے دردی یا انسان کی عدم واقفیت پر نہیں رکھی جاسکتی۔ غذا کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے اور ہم کو ان ذرائع کا علم حاصل ہو چکا ہے جس سے اس کام کو کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت صرف تخیل اور مضبوط ارادے کی ہے تاکہ ہر حکومت اور ہر قوم اس علم سے فائدہ اٹھاسکے

"فاقہ اور خرابی غذا کا پہلا سبب افلاس ہے۔ زیادہ غذا پیدا کرنا بیکار ہوگا اگر

افراد اور قومیں اس کے خریدنے کے لئے منڈی فراہم نہ کرسکیں گی۔ پوری عالمی معیشت کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ قوت خرید مہیا ہوسکے جس سے کافی غذا کی خریداری کو قایم رکھا جاسکے ....“

سب لوگوں کے لئے بہتر غذا کی ضرورت اور اس کو پورا کرنے کا امکان کوئی بالکل نیا خیال نہیں ہے۔ لیگ آف نیشنس نے ۱۹۳۵ء میں اس بات کو تسلیم کرلیا تھا، اور اس کی بعض کمیٹیوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ ابتدائی کام کر بھی لیا تھا لیکن پھر بھی ہاٹ اسپرنگس کی کانفرنس نے ترقی کی جانب ایک بڑا قدم اٹھایا اول تو اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ پیداوار کے استعمال کو عالمگیر وسعت دینا بہت ضروری ہے اس نے اس بات کو پر زور طریقہ پر بیان کیا کہ غذا پیدا کرنے والوں (مثلاً چین اور ہندوستان کے کسانوں) کا افلاس ہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے غذا کی مجموعی پیداوار اور اس کا استعمال ناکافی رہتے ہیں (سادہ الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے حصوں کے کسان اتنے غریب ہیں کہ وہ زمین کی کاشت مناسب طریقہ پر نہیں کرسکتے اور اگر کسی طرح غذا پیدا بھی کرلی جائے تو وہاں کے مزدور اتنے غریب ہیں کہ وہ اسے کافی مقدار میں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے) دوسرے ہاٹ اسپرنگس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ دنیا کی قوموں کے درمیان محض جنگ کے زمانے میں نہیں بلکہ امن کے زمانہ میں بھی اشتراک عمل لازمی ہوگیا ہے۔

ناکافی غذا

قبل اس کے کہ یہ بیان کریں کہ ہاٹ اسپرنگس کے اعلان کو کس طرح عملی شکل دی جاسکتی ہے آئیے موجودہ صورت حال کا ایک سرسری جائزہ لے لیں۔

جن لوگوں کی آنکھیں دنیا کی مصیبتوں کی طرف سے بند نہیں ہیں، ان کے حافظہ میں یہ بات ابھی تک تازہ ہوگی کہ ۱۹۴۳ء کے قحط میں ہندوستان کے پندرہ لاکھ مرد عورت اور بچے مکھیوں کی طرح مرگئے برطانوی ہندوستان میں غذا کی کمی کی جو حالت دائمی طور پر موجود ہے اس قحط کو اس کی ایک شدید تر صورت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ملک کی آبادی جو ۱۸۵۷ء میں بیس کروڑ تھی اب بڑھکر چالیس کروڑ ہوگئی ہے۔ آبادی کے اس تمام اضافہ کو کم وبیش زراعت کے پیشے ہی سے لگنا پڑا ہے اور اپنا گذارا

محض اس قلیل پیداوار ہی سے چلانا پڑا ہے جو کاشت کے دقیانوسی طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے
سنہ ۱۹۳۳ء میں انڈین میڈیکل سروس کی طرف سے ایک تحقیقات کی گئی تھی جس سے پتہ چلا تھا کہ ہندوستان
میں چالیس فی صدی گاؤں ایسے ہیں جن کی آبادی غذا کی رسد کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ دودھ اور گوشت
کی رسد بہت قلیل ہے۔ سال کے کچھ مہینوں میں پھل اور ترکاری کا شمار ضروریات کی جگہ تعیشات میں
کیا جانے لگتا ہے۔ جن علاقوں میں چکنا کیا ہوا چاول استعمال کیا جاتا ہے وہاں بیری بیری کا مرض عام
ہے لیکن سنسنی خیز بیماریوں کے علاوہ دوسری بیماریاں بھی غذا کے معیار کی پستی کی وجہ سے پیدا ہوتی
رہتی ہیں۔ کچھ لوگ وٹامین الف کے غذا میں نہ ہونے کی وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں، کچھ وٹامین (ب)
کی کمی کی وجہ سے کاہل اور مجہول نظر آتے ہیں۔ غذا کی کمی ہی کی وجہ سے امراض کے مقابلہ کے لئے قوت
مدافعت بھی ہندوستان میں بہت کم پائی جاتی ہے۔

چین کے عام حالات ہندوستان سے کچھ بہتر ہیں لیکن یہاں بھی دودھ اور گوشت بہت کم ملتا
ہے اور آبادی کی بیشتر تعداد کو سبز ترکاری میسر نہیں آتی۔ غذا کا بہت زیادہ تناسب اناجوں پر مشتمل ہوتا
ہے۔ جنوبی چین میں چاول کا استعمال کیا جاتا ہے اور عام طور پر یہ چکنا کیا ہوا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے
کہ یہاں بھی بیری بیری کا زور ہے۔

جنوب مشرقی یورپ کے کسانوں کی غذا میں بھی اناج کا دخل بہت زیادہ ہے۔ رومانیہ میں
خاص طور پر مکہ کا استعمال کیا جاتا ہے اور ان کا "قومی مرض" پلاگرا ہے۔

دنیا کی آبادی کا دو تہائی حصہ کسان ہیں اور یہ تقریباً سب کے سب بس اتنا کماتے ہیں
کہ جس سے صرف پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ کسی سال اگر فصل خراب ہو جاتی ہے تو پیٹ سے پتھر باندھنا
اور موت سے ہم آغوش ہونا پڑتا ہے۔ مرنے والوں میں ان کو خوش قسمت سمجھنا چاہیے جن کی موت
کا تذکرہ دولت مند ملکوں کے اخباروں میں ہو جاتا ہے۔

پھر یہ افلاس اور غذا کی خرابی پس ماندہ ملکوں کے کسانوں اور مزدوروں تک ہی محدود نہیں ہے
امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں جنگ سے پہلے جو سیاہ فام لوگ یا غریب سفید نسل کے لوگ کپاس کے

خطہ میں کام کرتے تھے وہ زیادہ تر دوکان کی خریدی ہوئی غذا یعنی مکہ، سور کے موٹے چربی دار گوشت اور شیرہ پر گذر کرتے تھے۔ چونکہ مکہ کے ساتھ باریک ریشہ کا گوشت، دودھ، ترکاری اور پھل کم کھائے جاتے تھے اس لئے یہ لوگ بھی رومانیہ کے لوگوں کی طرح بلاگرا کی بیماری میں مبتلا رہتے تھے سنہ ۱۹۲۷ء میں امریکہ کی تیرہ جنوبی ریاستوں میں جو اموات اس سبب سے واقع ہوئیں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ایسے آدمیوں کی تعداد تو لاکھوں تک پہنچتی تھی جو کاہلی، جمود اور بدہضمی میں مبتلا تھے کیونکہ ان کو وٹامین کافی مقدار میں میسر نہ تھے۔

اس معاملہ میں صنعتی علاقوں کو بھی جاہل کسانوں کے مقابلہ میں کوئی تفوق حاصل نہیں ہے۔ جنگ سے پہلے مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کے صنعتی علاقوں میں بیس تیس فی صدی کے درمیان ایسی آبادی تھی جسے کافی غذا میسر نہ تھی۔ چنانچہ طبقوں کے لحاظ سے جو شرح اموات شایع کی گئی ہیں ان کے دیکھنے سے اس بات کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں برطانیہ میں پڑھے لکھے پیشوں میں اگر دس بچے فوت ہوتے تھے تو غیر ماہر مزدوروں میں ان کی تعداد تئیس ہوتی تھی۔ تپ دق سے اموات کا تناسب غیر ماہر مزدوروں میں علمی پیشوں کے مقابلہ میں دوگنا زیادہ تھا۔

بچوں کو دودھ کی ضرورت ہے۔ اسے ایک بدیہی حقیقت کے طور پر سب تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کو ہمیشہ دودھ نہیں ملتا۔ شمالی انگلستان میں جنگ سے پہلے فی ہفتہ اوسطاً صرف ڈیڑھ پنٹ فی کس دودھ ملتا تھا سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء میں فی کس دودھ کے استعمال کا جو جائزہ یارک شائر کے مغربی رائڈنگ میں لیا گیا اس سے ۲ء۴ پنٹ کے اوسط کا پتہ لگا اور جہاں چار سے زیادہ بچے ایک خاندان میں تھے وہاں اوسطاً ۲ء۰ پنٹ دودھ بچوں کے حصہ میں آیا۔

کیمبرج جیسے خوش حال شہر کے غریب گھروں میں بھی کسی خاندان کے بچوں کی تعداد جب دو سے زیادہ ہوجاتی ہے تو غذا کی کمی کی وجہ سے بچوں کا قد چھوٹا اور ان کے اندر خون کی کمی نظر آنے لگتی ہے والدین دو سے زیادہ بچوں کے لئے کافی غذا مہیا نہیں کرپاتے۔

خاندانوں کی طرح قوموں میں بھی اسی قسم کا اختلاف دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر ہندوستان کے شیر خوار

بچوں کی شرح اموات انگلستان کے برابر کم ہوتی تو یہاں نو لاکھ اسی ہزار بچے سالانہ زیادہ زندہ رہتے اگر یہ شرح نیوزی لینڈ کے برابر کم ہوتی تو بارہ لاکھ مزید بچے زندہ رہتے۔

اگر تپ دق کی شرح اموات رومانیہ میں وہی ہوتی جو انگلستان میں ہے تو رومانیہ میں شرح اموات ۳۵ ہزار تک کم ہو جاتی۔

مغربی یورپ امریکہ اور نیوزی لینڈ میں دس بچوں میں سے نو بچے بیس سال کی عمر تک ضرور پہنچتے ہیں۔ لیکن بلغاریہ میں تین میں سے صرف دو بچے اور ہندوستان میں سو میں سے پچاس مرجاتے ہیں پچاس زندہ رہتے ہیں۔

نیوزی لینڈ کے کسی عمر کے آدمیوں کو لیا جائے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ان کے درمیان شرح اموات کم ملے گی۔ تپ دق سے بھی وہاں کم لوگ مرتے ہیں اور وہاں متوقع عمر کا اوسط امریکہ یا یورپ کے زیادہ تندرست ملکوں کے برابر یا اس سے زیادہ ہے۔

غرض دنیا کی صورتِ حال یہ ہے اور اسی کی روشنی میں ہمیں آئندہ کے لئے اپنی اصلاحی تجویزیں مرتب کرنا ہوں گی۔

نصب العین ہاٹ اسپرنگس کی کانفرنس نے سر دست ایک نصب العین مقرر کیا تھا۔ اس نے سستا سب اور کافی غذا کی دو طرح کی فہرستیں تیار کی تھیں۔ ان میں سے ایک نسبتاً سستی اور دوسری نسبتاً مہنگی تھی۔ غذا کی ضرورت کو پہلے حراروں، لحمیات، حیاتین اور معدنی اجزا کی صورت میں درج کیا گیا تھا اور پھر واقعی اشیاء غذا کی صورت میں۔ ذیل میں ان فہرستوں کو درج کیا جاتا ہے۔ ان کی مقدار میں فی کس فی ہفتہ کے حساب سے دی گئی ہیں:۔

	منصوبہ اول	منصوبہ ثانی
	کم خرچ	بیش خرچ
اناج سے تیار کی ہوئی چیزیں (روٹی نشاستہ کی چیزیں وغیرہ)	چار پونڈ چھ اونس	سوا تین پاؤنڈ
دودھ	$7\frac{1}{2}$ پینٹ	۸ پینٹ
نشاستہ سے بھری ہوئی گٹھریاں پھل اور جڑیں (مثلاً آلو)	$3\frac{1}{2}$ پونڈ	۲ پونڈ چودہ اونس

سیم، مٹر، گری دار پھل	۶ اونس	۴ اونس
حیاتین والے پھل (مثلاً سنترے، اسٹابیری، ٹماٹر وغیرہ)	۱½ پونڈ	ایک پونڈ تیرہ اونس
پتے والی سبز اور زرد ترکاریاں	۱½ پونڈ	تین پونڈ
دوسری ترکاریاں اور پھل	۲¾ پونڈ	۳¼ پونڈ
گوشت، مچھلی، مرغی	ایک پونڈ بارہ اونس	۲¼ پونڈ
انڈے (تعداد میں)	چار	پانچ
شکر	گیارہ اونس	گیارہ اونس
چکنائی (مکھن، نقلی مکھن، سور کی چربی)	ایک پونڈ	ایک پونڈ

غذا کے اعتبار سے یہ دونوں فہرستیں اچھی ہیں۔ لیکن لاگت کے لحاظ سے دولت مند ملکوں میں بھی ان کی پابندی صرف طبقہ متوسط ہی کے لوگ کر سکتے ہیں، انھیں فی الحال صرف مطمح نظر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ متفقہ کوشش سے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ انھیں فوراً عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ ان کے حصول کے لئے لمبی مدت کا ایک منصوبہ بنانا ہوگا، اور صبر و استقلال اور اتحاد عمل کے ساتھ جد و جہد کرنا ہوگی۔ بعض چیزوں کو دنیا میں ہر جگہ فراہم نہیں کیا جا سکے گا۔ مثلاً دودھ اس پیمانہ پر جس کا ان فہرستوں میں مطالبہ کیا گیا ہے منطقہ حارہ کے ملکوں میں پیدا نہیں کیا جا سکے گا۔

یہ منصوبے اس لحاظ سے تو اچھے ہیں کہ ان سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارا آخری مقصد کیا ہونا چاہیئے لیکن ان کے علاوہ ایک لائق حصول ابتدائی منزل کا تعین کرنا بھی ضروری ہے اور موجودہ حالات میں وہ منزل یہ ہو سکتی ہے کہ ہم فاقہ کا ازالہ کریں اور ایسے حالات پیدا کریں کہ کسی شخص کا پیٹ خالی نہ رہے۔ یورپ میں تو یہ کام جنگ کے بعد کے عبوری زمانہ میں بطور امداد کے کرنا ہوگا۔ لیکن ہندوستان میں اور آخر میں چین میں یہ کام ایک کہنہ مرض کے علاج کے طور پر کرنا ہوگا۔

رکاوٹیں | سوال یہ ہے کہ اس کام میں کون سی رکاوٹیں حایل ہیں؟

[illegible] لوگوں کے لئے کافی [illegible] کرنے کے لئے زراعتی پیداوار [illegible]

دینا ہوگی۔ اس کا ماہروں نے تخمینہ کیا ہے۔ اس کی اہم مدوں کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اناج:۔ اس میں میعادی قحط سالیوں کے تدارک کے لئے اور ہندوستان جیسے ملک کی مستقل قلت غذا کے ازالہ کرنے کے لئے پچاس فی صدی اضافہ کرنا ہوگا۔

گوشت، انڈا اور مرغی:۔ اس میں سو فی صدی اضافہ کرنا ہوگا۔

دودھ، مکھن، پنیر:۔ ڈیڑھ سو فی صدی اضافہ۔

پھل اور ترکاریاں:۔ تین سو فی صدی اضافہ۔

یہ بات واقعی امید افزا ہے کہ جنگ کے زمانہ میں جب وسائل کی طلب جنگ کے کاموں کے لئے بہت زیادہ تھی کناڈا اور امریکہ میں غذا کی پیداوار کو بھی بہت بڑھایا گیا۔ امریکہ میں غذا کی پیداوار میں جنگ سے قبل کے سال کے مقابلہ میں حسبِ ذیل اضافے ہوئے۔ گوشت میں (سنہ ۱۹۴۲ء) ۱۳ فی صدی گیہوں میں (سنہ ۱۹۴۳ء) ۱۴ فی صدی آلوؤں میں ۲۸ فی صدی سیموں اور مٹروں میں ۹۴ فی صدی۔ اس کے علاوہ ان پیداواروں میں جو جانوروں کے چارہ کے طور پر کام آتی ہیں اضافہ مکہ میں ۳۵ فی صدی سے لے کر ۲۸۰ فی صدی سویابین میں اور ۲۷۰ فی صدی السی میں ہوا۔ کناڈا میں گوشت کا اضافہ دس فی صدی اور سنہ ۱۹۴۲ء میں گیہوں کا اضافہ ۹۸ فی صدی ہوا۔ یہ اضافے اس لئے بھی قابلِ توجہ ہیں کہ یہ ان ملکوں میں کئے گئے جہاں کاشت کے طریقوں کا معیار پہلے سے بلند تھا، ان ملکوں میں نہیں ہوئے جنہیں اپنے کاشت کے طریقوں کو بہتر کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

لیکن دنیا کی ضرورت کے مقابلہ میں جب ان اضافوں کو دیکھا جاتا ہے تو یہ اونٹ کی داڑھ میں زیرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں پیداوار کے اضافے کے جو امکانات جنگ کے زمانے میں دریافت کئے گئے ہیں ان سے پوری طرح کام لینے سے بھی ہندوستان کی غذا کی خرابیاں دور نہ کی جا سکیں گی۔ ہندوستان کو ہم نے دنیا کے حاجت مند ملکوں کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے ورنہ اس طرح کے اور بھی بہت سے ملک ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ کا بڑا اور بنیادی حل تو یہی ہو سکتا ہے کہ خود ان محروم ملکوں کی کسانوں کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور بقیہ دنیا سے اس کی توقع قایم نہ کی جائے کہ وہ ان کو بچا رہے

ترس کھاکر ان کے لئے برابر غذا فراہم کرتی رہے گی

ان پس ماندہ ملکوں کی پیداوار فی ایکڑ بہت کم ہے۔ اوسط پیداوار اکثر صورتوں میں انگلستان کے اوسط کے نصف سے بھی کم ہے۔

۱۹۳۵-۳۹ء میں گیہوں کی پیداوار یورپ کے اندر ڈنمارک اور نیدرلینڈ میں ۴۵ بشل فی ایکڑ برطانیہ میں ۳۴، بلغاریہ میں ۲۱ اور رومانیہ میں ۱۵ تھی۔ ہندوستان کی پیداوار اس کے مقابلے میں صرف گیارہ بشل تھی۔ امریکہ، کناڈا، ارجنٹینا، آسٹریلیا اور سوویٹ یونین میں کاشت بڑے رقبے پر کی جاتی ہے اور وہاں کاشت عمیق کا رواج نہیں ہے لیکن وہاں بھی امریکہ میں دس بشل اور آسٹریلیا میں تیرہ بشل پیداوار تھی۔

کسانوں کے علاقہ میں پیداوار فی ایکڑ کی کمی کے اسباب آخر میں معاشی ہی نکلتے ہیں اوّل تو ان کے مزرعے اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ ان پر کفایت سے کام نہیں کیا جا سکتا۔ چین میں ہر سو مزرعوں میں چالیس ایسے ہیں جن کا رقبہ ۱½ ایکڑ سے کم ہے جاپان میں دو تہائی مزرعے ۱½ ایکڑ سے کم ہیں۔ ہندوستان میں تین چوتھائی مزرعے دس ایکڑ سے کم ہیں اور دس فی صدی ایسے ہیں جو ایک ایکڑ سے بھی کم ہیں، رومانیا، یوگوسلاویا میں نوے فی صدی ۲۵ ایکڑ سے کم ہیں اور ان کی زیادہ تر تعداد ۵ ایکڑ کی ہے۔ بلغاریہ میں اوسط ۱۲½ ایکڑ کا ہوتا ہے۔

پیداوار کی کمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں ابھی تک کاشت ایسے چھوٹے چھوٹے قطعوں میں کی جاتی ہے جن کے بیچ میں دوسرے لوگوں کی زمین آجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے بڑی عجیب و غریب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پنجاب میں کچھ کھیت ایک بڑے کمرے کے برابر ہیں یعنی تقریباً ۸ امربع گز۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے کسان کی بہت محنت اور وقت ضایع ہوتا ہے اور مناسب آلات کا اگر اتفاق سے وہ موجود ہوئے استعمال نہیں کیا جا سکتا لیکن واقعہ دراصل یہ ہے کہ مناسب آلات سرے سے موجود ہی نہیں ہیں اور دقیانوسی اوزاروں سے کام چلایا جاتا ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کسان ملکوں میں بس ایک ہی فصل یعنی اناج کی ہر سال ایک ہی کھیت میں

کاشت کی جاتی ہے۔ مویشی کے لئے کوئی جڑدار فصل نہیں بوئی جاتی اس لئے فصلوں کا الٹ پھیر نہیں ہوتا اور زرخیزی مستقل طور پر کم ہوتی رہتی ہے۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ مصنوعی کھاد استعمال نہیں کئے جاتے۔ زندہ دھن چونکہ کم ہے اس لئے اس کا کھاد بھی کم ملتا ہے۔

پھر آبپاشی بھی کم ہے اور پانی کے تحفظ کا بہت کم انتظام کیا جاتا ہے۔ سال کے ایک موسم میں بارش خوب ہوتی ہے لیکن اس کا پانی بہ کر فوراً دریاؤں میں پہنچ جاتا ہے اور ضائع ہو جاتا ہے میعادی خشک سالیاں صرف منطقہ حارہ تک ہی محدود نہیں ہیں۔ رومانیہ میں دریائے ڈینیوب کا میدان قدرتی طور پر زرخیز ہے لیکن آبپاشی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کھیتی کے کل رقبہ کا انحصار بارش پر ہے اور کسانوں کی قسمت پوری طرح موسم کی تلون پسندی کے ہاتھ میں ہے۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ فصلوں کے الٹ پھیر کے رواج نہ ہونے کی وجہ سے زمین کی ساخت بدل جاتی ہے اور وہ سفوف جیسی بن جاتی ہے۔ اس لئے بارش میں آسانی سے بہ جاتی ہے ہوا سے اُڑ جاتی ہے اور بدنصیب کسان بالائی سطح کے نیچے جو غیر زرخیز مٹی ہوتی ہے اس پر کاشت کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ زمین کا کٹاؤ ایسی مصیبت ہے جو عالمگیر ہے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ زمین کے ایک چوتھائی ایسے حصہ کو جس پر کاشت کی جا سکتی ہے نقصان پہنچ چکا ہے اور اس سے کہیں زیادہ رقبہ کی زرخیزی کو جس میں اضافہ جاری ہے اس سے نقصان پہنچ رہا ہے۔

زمین کے کٹاؤ کے معاملہ میں صرف غریب پس ماندہ کسان ہی دولت مند ملکوں کی امداد کے محتاج نہیں ہیں بلکہ مغرب وسطی اور مشرقِ قریب کے کسان بھی اس کی وجہ سے برباد ہو گئے ہیں اگرچہ امریکہ میں اس مرض کا علاج کیا گیا ہے اور نقصان زدہ علاقوں کی پیداوار کو ۲۵ فی صدی بڑھایا جا سکا ہے۔

ہاٹ اسپرنگس کی کانفرنس کا یہ اعلان کرنا بالکل بجا اور درست ہے کہ اگر علمی واقفیت سے کام لیا جائے تو زمین ضروری غذا کو فراہم کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن علم کو عملی جامہ پہنانے

کے لئے بڑی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ ان علاقوں میں جسے "کسانوں کے منطقہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مزرعوں کے رقبے میں اضافہ کرنا معاشی لحاظ سے ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس نئی تنظیم کے ساتھ بڑے پیمانہ پر آبپاشی کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ عراق عرب کے جو علاقے آج ویران اور بنجر پڑے ہوئے ہیں وہاں کبھی توریت کا باغ عدن موجود تھا۔ جدید طریقے کی آبپاشی سے اس شادابی کو دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ڈینیوب کے میدان کا تیس ملین ایکڑ رقبہ جو ہنگری۔ بلغاریہ اور رومانیہ میں پھیلا ہوا ہے ایسا ہے جس کی پیداوار کو منصوبہ بند آبپاشی کے ذریعہ دوگنا کیا جا سکتا ہے۔

جدید طرز کی مشینوں کی بھی ضرورت ہے لیکن یہ بجائے خود کوئی تریاق نہیں ہے۔ کچھ مقامات برطانیہ کے اندر بھی ایسے موجود ہیں جہاں جدید قسم کے ٹریکٹر کا استعمال کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اگر مشین کے استعمال میں قوت تمیز سے کام لیا جائے اور اس کے ساتھ فصلوں کے الٹ پھیر کو علمی طریقہ پر کیا جائے کھاد مہیا کئے جائیں اور اوزاروں، بیجوں اور کسان کی زاید پیداوار کے معاوضہ میں گھریلو سامانوں کو منتقل کرنے کے لئے نقل و حمل کا انتظام کیا جائے تو کھیتی کے معیار کو برطانیہ کے معیار تک بلند کیا جا سکتا ہے۔

کیڑے مکوڑے بھی جو پاسپورٹ لے کر سفر نہیں کرتے بہایت مختلف معیشت والے ملکوں کے لئے یکساں طور پر ایک عذاب بن سکتے ہیں اور ان کا علاج بھی اشتراک عمل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ٹڈیوں نے نو سال میں مشرقی افریقہ کی پیداوار کو جتنا نقصان پہنچایا اس کی مالیت کم سے کم ۴۳ ملین پونڈ ہوتی ہے ان کا علاج اب مشترکہ کوششوں سے کیا جانے لگا ہے۔ ان کے خلاف جو مہم ایران، عرب، مشرقی افریقہ، سمرنیکا اور شمالی افریقہ میں شروع کی گئی اس میں انگریز، سوویٹ، امریکن، فرانسیسی، ہندوستانی ایرانی اور مصری ماہروں نے حصہ لیا۔

حیوانی بیماریوں کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً برطانیہ سے اگر گایوں کی تپ دق میٹیٹس اور وبائی استقاط حمل کو ختم کر دیا جائے تو برطانیہ کے دودھ کی پیداوار ۲۵ فی صدی بڑھ جائے گی۔ سائنس نے غیر ضروری گھاس پات کو ختم کرنے کے لئے بھی ایک چیز میتھوکسون تیار کی ہے اس سے غلہ اور اصل گھاس پر کوئی خراب اثر نہیں ہوتا۔

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی کا اقتدار فطرت پر کتنا بڑھتا جا رہا ہے۔ اب اس سے اگر مناسب طریقہ پر فائدہ اٹھایا جائے تو جن چیزوں کی ضرورت ہے ہم ان کو حاصل کر سکتے ہیں۔ زمین کی کیمیات، پودوں کی نسلیات اور دیگر علوم سے بہت فائدے حاصل کئے گئے ہیں اور آئندہ کئے جا سکتے ہیں۔ زمین کی کیمیات کا مطالعہ ایک سو سال سے جاری ہے اور اس کے نتائج بہت عمدہ ہیں۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ زمین بے جان کیمیاوی عناصر کا مرکب نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی جداگانہ زندگی ہوتی ہے اور فصلوں کی کامیابی کا دارومدار زمین کی ساخت اور ان باریک زندہ اجسام پر ہوتا ہے جو یا تو زراعت کے لئے مفید یا پھر مضر ہوتے ہیں۔ پودوں کی نسلیات کے علم کے ذریعہ ایسے پودوں کی نسل کو ترقی دی جا سکی ہے جن میں بیماری یا خشکی کی مدافعت کرنے یا جلد پکنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

جاوا میں ایک گنا تیار کیا گیا ہے جو قریب قریب سب بیماریوں کو دور کر سکتا ہے اور جس کی پیداوار پہلے گنوں سے زیادہ ہے۔ خمیرہ میں ایک قسم کا خمیر پیدا کیا گیا ہے جس کی غذائی صلاحیت گوشت سے بھی زیادہ ہے۔

لیکن طبعی علوم کی اس ترقی کے ساتھ معاشیات کے علم سے بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے طبعیات اور کیمیات غذا کی رسد بڑھانے میں ضرور مددد یں گے لیکن یہ سب کام ایک منصوبہ کے ماتحت ہونے چاہئیں۔ موجودہ زمانہ میں قومی معاشیات کی وجہ سے دنیا میں ابتری اور فساد رونما ہو گیا ہے۔ یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ کناڈا کے وسیع اور کشادہ میدان گیہوں کو کثیر مقدار میں پیدا کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں ہیں اور یورپ کے بعض ان علاقوں کے لئے جن میں آج کل گیہوں بویا جاتا ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ مقامی ضرورت کے لئے جلد خراب ہونے والی غذائیں مثلاً ترکاریاں اور پھل، دودھ اور مکھن، انڈے اور مرغی وغیرہ پیدا کریں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس کی حکومت ۱۹۳۶ء میں اپنے کسانوں کو گیہوں کے لئے وہ امدادی قیمت ادا کر رہی تھی جو لورپول (انگلستان) کی قیمت کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھی اور یہ اس وقت کیا جا رہا تھا جب مانی ٹوبہ (کناڈا) میں زائد گیہوں کے انبار خریداروں کے منتظر تھے۔ دوسری طرف رومانیہ سے گیہوں اس وقت درآمد کیا جا رہا تھا جب کہ

اس کی پیداوار اپنے ملک کی ضرورت کے لئے بھی کافی نہیں تھی۔

زراعت میں جب منصوبہ بندی سے کام لیا جاتا ہے تو اس کے نتائج کتنے شاندار نکلتے ہیں اس کے لئے فلسطین کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ یہاں علمی تحقیقاتوں سے پوری طرح کام لیا گیا عام طور پر قدرتی اور مصنوعی کھاد استعمال کئے گئے پھلی دار پودوں کی کاشت کرکے زمین میں نائٹروجن کا اضافہ کیا گیا۔ گہرے کنوئیں بنا کر آبپاشی کا انتظام کیا گیا۔ ریت کے ٹیلوں پر چیڑ اور ارنڈ کے درخت ان کو قایم رکھنے کے لئے لگائے گئے تاکہ بعد میں ان کو ہموار کر کے ان میں انگور اور لیموں کے درختوں کی کاشت کی جاسکے جنگل لگا کر زمین کے کٹاؤ کو روکا گیا۔ غرض ان تمام طریقوں سے یہودی نوآبادکاروں نے سرجان رسل کے الفاظ میں "ان علاقوں کو جو چند سال پہلے ریت کے ٹیلے ننگی پہاڑیاں اور دلدل تھیں زرخیز زراعتی زمین میں تبدیل کر دیا ہے" انہی تمام باتوں کا نتیجہ ہے کہ یہودیوں کے قبضہ میں جو گائیں ہیں وہ ۷۰۰ گیلن سالانہ دودھ دیتی ہیں، درآں حالیکہ عربوں کی گائیں دو سو گیلن سالانہ دودھ دیتی ہیں۔ مرغیوں کے انڈوں میں بھی اسی قسم کا فرق نظر آتا ہے۔ یہودیوں کی نوآبادیوں میں ان کی تعداد دوگنے سے زیادہ ہے۔ یہودیوں کے مزرعوں میں گیہوں کی پیداوار بھی ۲۶ بشل ہے جو عربوں کے مزرعوں کے مقابلے میں ٹھیک دوگنی ہے۔

نئی تنظیم

بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ دنیا کے لئے غذا پیدا کرنے کی نئی تنظیم کا مفہوم کیا ہے۔ کیونکہ اگر ہم دنیا کے لئے غذا کی پیداوار کا انتظام نہیں کر سکیں گے تو نہ منشور اطلانٹک کو عملی جامہ پہنا سکیں گے نہ دنیا کی قوموں کو زندگی کے ادنیٰ ترین معیار پر قایم رکھ سکیں گے۔ نئی تنظیم کا کوئی منصوبہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ یورپ اور ایشیا کے چھوٹے کسانوں کے زبردست مسئلہ کا کوئی حل تجویز نہ کرے۔ دنیا کے "کسانی منطقے" میں واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی زائد از ضرورت تعداد، ضرورت سے کم غذا کے پیدا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

اس صورتِ حال کا علاج یا تو یہ ہوسکتا ہے کہ چھوٹے مزرعوں کے مالک امداد باہمی کے ماتحت مل کر کاشت کا کام کریں یا ان مزرعوں کو کسی ضلع وار انتظام کے ماتحت لے آیا جائے جب ان کی

لئے ضروری آلات وسامان مہیا کئے جائیں گے اور علمی واقفیت کے معقولیت پسند طریقوں سے کام لیا جائے گا تو لازمی طور پر زراعت پر گذر کرنے والی جو زائد آبادی اس وقت ہے وہ اور زیادہ نظر آنے لگے گی اور اس زاید آبادی کے لئے صنعتی پیشہ فراہم کرنے کی ضرورت اب سے زیادہ شدید صورت اختیار کرے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ پرانے ملکوں کی اس زاید آبادی کو ان نئے ملکوں میں بسانے کی تجویزیں بھی بنائی ہوں گی جہاں ابھی نو توڑ زمینیں زراعت کی ترقی کے لئے بافراط موجود ہیں۔

مشرقی یورپ میں بڑے مزرعوں کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنے کی جو تحریک چل رہی ہے وہ سیاسی اعتبار سے چاہے کتنی ہی مصلحت اور عقلمندی پر کیوں نہ مبنی ہو لیکن معاشی حیثیت سے یہ چیز نقصان رساں ہے۔ جنگ عظیم اول کے بعد اس قسم کی تقسیم رومانیہ اور شمالی یوگوسلاویا میں جاری کی گئی تھی لیکن کسانوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ انفرادی طور پر مناسب اوزار فراہم نہیں کرسکتے اور ان کے مزرعے نفع بخش کاشت کے لئے ناموزوں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے کے مقابلے میں کاشت فی ایکڑ حقیقتاً کم ہوگئی اور جنگ عظیم ثانی تک برابر گرتی ہی چلی گئی۔ مکئی کی پیداوار فی ایکڑ کا اوسط ۱۹۰۹-۱۳ء میں ۳۴ء۳ بشل تھا جو ۱۹۳۰ء میں صرف ۱ء۱۷ بشل رہ گیا۔ اسی طرح جئی کی پیداوار ۲ء۲۸ بشل سے گر کر ۱ء۲۴ بشل ہوگئی۔

سرمایہ عمدہ کاشت کے لئے ہر موقع پر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی نظر میں دنیا کی زراعت کو ترقی دینے کے لئے جتنے سرمایہ کی ضرورت ہے وہ بے انتہا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً برطانیہ ہی کے ڈیری فارموں کے لئے اگر وہ سامان مہیا کئے جائیں جن سے زیادہ اور صاف دودھ حاصل کیا جا سکتا ہے تو اس پر سو ملین پاؤنڈ کا خرچ آئے گا۔ رومانیہ کے مزرعوں کو جرمنی کے معیار تک پہنچانے کے لئے جو برطانیہ کے معیار سے کم تھا دو لاکھ ملین لائی یعنی تین سو ملین پونڈ خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ درآں حالیکہ رومانیہ کا مجموعی قومی قرضہ ۱۹۳۹ء میں صرف ایک لاکھ ۷،۱ ہزار ۴۸ ملین لائی تھا۔ ہندوستان کے مزرعوں کی حالت ان سے بھی زیادہ گری ہوئی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہندوستان کا کسان قرض کے شکنجے میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے۔ بنگال میں کسان کی تقریباً ایک

تہائی آمدنی قرض پر سود ادا کرنے کے نذر ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی سرمایہ کی ضرورت ہندوستان کے کسانوں کو سب سے زیادہ ہے۔ آبپاشی اور مقامی صنعتوں کو قائم کرنے کے لئے بھی سرمایہ کی ضرورت ہوگی تخمینہ لگایا گیا ہے کہ یورپ کے اس رقبہ کے لئے جو جرمنی روس اور اٹلی سے گھرا ہوا ہے اور جس کی آبادی دس کروڑ ہے۔ زراعت کو ترقی دینے کے لئے ایک ارب بیس کروڑ پونڈ کے سرمایہ کی اور صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے چار ارب ۸۰ کروڑ پونڈ کی ضرورت ہوگی یعنی مجموعی ضرورت چھ ارب پونڈ کی ہوگی۔ لیکن اس رقبہ کی سالانہ آمدنی صرف دو ارب پونڈ ہے۔ اس معاملہ میں بھی ہندوستان کا مسئلہ اپنی تاریکی کے لحاظ سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے پاس زمین کے علاوہ دوسرے مالی وسائل بہت کم ہیں۔ ملک کا رقبہ اور آبادی جتنی وسیع ہے اس کے مقابلہ میں کوئلہ اور معدنیات کے ذخیرے بہت کم ہیں۔ پھر ہندوستان اور دنیا کے ان دوسرے علاقوں سے یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس سرمایہ پر جس کا فراہم کرنا ان کی زراعت اور صنعت کو ترقی دینے کے لئے لازمی ہے سود ادا کر سکیں گے؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ نظری طور پر ہو سکتا ہے کہ ان کے معیار زندگی میں سخت کمی کر کے ایسا کیا جا سکے لیکن ایسا کرنا سراسر حماقت ہوگا۔ کیونکہ جس مقصد کے لئے قرض لیا جا رہا ہے وہی فوت ہو جائے گا۔ زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لئے ہی تو یہ تمام منصوبے تجویز کئے جا رہے ہیں اور وہی مقصد اس طرح حاصل نہ ہو سکے گا۔

لیکن یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ جنگ عظیم ثانی نے بین الاقوامی باہمی امداد کے لئے ایک نئے طریقے کو رواج دے دیا ہے یعنی ادھار پٹہ کے راضی ناموں کو جو ایک طرف تو امریکہ اور برطانیہ کے مابین کئے گئے تھے اور دوسری طرف برطانیہ اور روس کے مابین۔

یہ صحیح ہے کہ اربوں کی اصطلاحوں میں گفتگو شروع کرنے سے ان غریب آدمیوں کا دماغ جن کے نزدیک پانچ روپے کے نوٹ ایک بڑی رقم ہے اور ایک ہزار روپیہ چھوٹی موٹی دولت ہے چکرانا شروع کر دیتا ہے لیکن جب وسطی یورپ کو ترقی دینے کے لئے جس میں چھ ارب پونڈ کی ضرورت ہے۔ اس کا مقابلہ برطانیہ کے جنگی خرچ سے کیا جاتا ہے تو یہ رقم اس کے ایک سال کے جنگی خرچ سے بس کچھ ہی زیادہ نظر آتی ہے اور امریکہ کے ایک سال کے

خرچ سے تو یہ بہت کم ہے اس مقابلہ کے بعد بھی یہ رقم کچھ بہت زیادہ نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جنگی خرچ کے باوجود برطانیہ کے لوگوں کی زندگی کا معیار ایسا رہا جو اس ملک کے لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت نہیں تھا اور امریکہ میں تو یہ معیار بہت بلند رہا۔ دنیا کے اور سب باشندوں سے بہت زیادہ بلند۔ اور یہ اس وقت رہا جب وہ برطانیہ اور اشتراکی روس کو ۱۹ ہزار ۱۸۱ ملین ڈالر کی مالیت کی چیزیں اُدھار پٹہ کے راضی نامہ کے ماتحت صرف ۴۴ مہینوں کے اندر اندر روانہ کر رہا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جب ۱۹۳۲ء کی کساد بازاری پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی قومی آمدنی میں یعنی اشیاء کی پیداوار میں جو کمی اس وقت واقع ہوئی تھی اس کی مالیت ۴۲ ہزار ملین ڈالر یعنی ۸ ہزار ملین پونڈ ہوتی تھی اور دنیا کے چوبیس ملکوں میں اس ایک سال میں ساٹھ ہزار ملین ڈالر کی مالیت کی آمدنی کا نقصان ہوا تھا۔ اس کساد بازاری کا اخلاقی اور نفسیاتی نقصان تو یہ تھا کہ دس کروڑ آدمی یہ سوچنے کے لئے مجبور تھے کہ جماعت کو ان کی خدمات کی اس نازک موقع پر کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اس سے قطع نظر امریکہ کی قومی وسائل کی کمیٹی نے تخمینہ لگایا تھا کہ اگر امریکہ کے بیس لاکھ آدمی ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیانی زمانہ میں بیکار نہ رہتے تو قومی آمدنی یعنی اشیاء کی پیداوار چالیس ہزار ملین پونڈ کے بقدر زیادہ حاصل ہو سکتی۔

اس لئے اگر ایک منظم عالمی معیشت کا انتظام کیا جا سکے تو اس کام کے لئے سرمایہ فراہم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ جنگ کے زمانے میں امریکہ نے نازیوں کو شکست دینے کے لئے ادھار پٹہ پر مال مہیا کیا۔ جنگ کے بعد ادھار پٹہ کا مقصد دنیا کے لوگوں کی مرفہ الحالی قرار دیا جا سکتا ہے جس کا فائدہ دینے والے اور لینے والے دونوں کو پہنچیگا اس سے لوگوں کی قوتِ خرید بڑھے گی جب قوتِ خرید بڑھے گی تو استعمالی اشیاء کی زبردست مانگ پیدا ہوگی اور روزگار اور تجارتی خوشحالی کو قائم رکھا جا سکے گا۔

غرض عاقبت اندیشی، فراخ دلی اور امداد باہمی سے اگر کام لیا جائے گا تو نہ صرف دنیا کو غذا کی کمی سے نجات دلائی جا سکے گی بلکہ بے روزگاری کو ختم کر کے دنیا کے سب باشندوں کے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کیا جا سکے گا اور امن کے زمانہ کی فتوحات کو جنگ کے زمانہ کی فتوحات سے کہیں زیادہ شاندار بنایا جا سکے گا

ایک دن

سر ناظم نے آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی۔ کمرے میں کافی روشنی ہو چکی تھی اور باہر کی دنیا سے مختلف قسم کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں جن میں کسی بڑھئی کے لکڑی چیرنے کی آواز اور تالاب کے کنارے دھوبی کی چھوا چھو زیادہ نمایاں تھیں۔ وہ آہستہ سے بیٹھ گیا اور اپنے پلنگ کے گرد زعفرانی رنگ کے پردوں کو ہٹایا جو پلنگ کے چاروں طرف ایک گھنٹی کی شکل میں لٹک رہے تھے۔ پردوں کے ہٹتے ہی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا جو اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا کرتا ہوا روشن دان میں سے باہر نکل گیا۔ کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پھولدار پردوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔

سر ناظم تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے جسم کو کمبل سے خوب ڈھک لیا۔ اس کے ہونٹوں پر خشکی سے پپڑی سی جمی ہوئی تھی۔ اس کے اندر معدے سے لے کر سینے تک اک آگ سی لگ رہی تھی بالکل ایسی جیسی کہ انگیٹھی کے بجھ جانے کے بعد کمرے میں گھٹی گھٹی سی گرمی رہ جاتی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر خشک زبان کو پھیرا لیکن مزا پہلے سے بھی بدتر ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے حلق کے نیچے نیم کا ایک پتّا اتر گیا ہو۔

سر ناظم نے پلنگ کے دائیں طرف دیوار میں لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور تھوڑے ہی وقفہ کے بعد برآمدے میں محتاط قدموں کی دھمک سنائی دی۔

"پانی" امیر آدمی چلایا۔

جب وہ پانی پی چکا تو اس نے قدرے سکون محسوس کیا۔ پانی بھی اگرچہ کڑوا تھا تاہم اس نے

اس کی آگ کو کچھ وقت کے لئے ضرور بجھا دیا۔

سورج کی روشنی اب کھڑکی کے پھولدار پردوں میں سے چھن چھن کر ایرانی قالین پر لوٹ رہی تھی۔ ایک ننھا سا پرندہ کھڑکی میں بیٹھ کر چہچہانے لگا۔

سر ناظم کی نظریں کمرے میں چاروں طرف دوڑ رہی تھیں لیکن اس کا دل صرف ایک ہی خیال میں محو تھا "میری طبیعت میں سکون کیوں نہیں پیدا ہوتا؟" اس کا ہاضمہ پورے دس برس سے خراب تھا اور اسی وجہ سے سفیدی وقت کی سی سرعت کے ساتھ اس کے بالوں میں سرایت کر رہی تھی۔ شاید وہ بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اس کی عمر ابھی کیا تھی؟ صرف پینتالیس سال! اس کی عمر کے لوگ تو عقد ثانی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ طبیب کہتے ہیں ضغطۂ دموی کی زیادتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے پیشاب کے ساتھ شکر آ رہی ہے۔ اور ایک ایورویدک سنیاسی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کثرت ملاعبت اور روغن دار غذاؤں کا نتیجہ ہے

معاً دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟"

"ڈاکٹر!"

"آئیے" اس نے انتہائی جبر و اکرام کے ساتھ اجازت دی۔ اس نے سوچا اب وہ آئے گا اور ایک بے رحم قصاب کی طرح اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھے گا۔ اس کے بعد ایک بیماری کا لمبا سا لاطینی نام لے دے گا۔

ڈاکٹر کا مسرور چہرہ پردوں میں سے نمودار ہوا۔

"صبح بخیر!"

اس نے آتے ہی اپنی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی اور اپنا چھوٹا سا دستی بیگ کھول لیا۔

"رات کیسے گذری؟"

پھر ڈاکٹر نے اسے لٹا دیا اور اس کے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیاں اس کے گرم پیٹ میں پیوست کر دیں۔ ایک جھرجھری سی اس کے جسم میں پیدا ہوئی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی

انگلیاں پکڑ کر مروڑ ڈالے۔ پھر ڈاکٹر نے اس کو زبان باہر نکالنے کے لئے کہا۔

"ہوں" ڈاکٹر نے اپنا آلہ پھر بیگ میں رکھتے ہوئے کہا "زبان سخت گندی ہے۔ رات کیسے گذری؟"

"رات!" رئیس کے چہرے پر جھریاں سی پڑ گئیں، اس کے ذہن میں کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو رات کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ "ایک بے چینی سی رہتی ہے، جو دل سے اٹھتی ہے اور تمام جسم پر طاری ہو جاتی ہے"۔

اس کی زبان پر کڑواہٹ پھر پھیل گئی۔

"کوئی فکر کی بات نہیں۔ شکر کے اخراج سے دل بھی متاثر ہوتا ہے۔ گھوڑے کی سواری جاری رکھئے"۔

ڈاکٹر مسکرایا اور اس کے سفید دانت چمکے۔ روشنی کی ایک پتلی سی لکیر اس کے چمکیلے بالوں میں کھنچی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر زندگی کی رونق برس رہی تھی۔ سر ناظم دل ہی دل میں اس پر رشک کرنے لگا۔

"ڈاکٹر" سر نظام نے نہایت پر یاس لہجے میں کہا "میرے دل سے یقین دن بدن اٹھ رہا ہے مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے گویا دنیا ایک بہت بڑا جھوٹ ہے، جس میں اتفاق سب سے اہم کام کر رہا ہے۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ آپ ڈاکٹر بن گئے اور میں ایک مریض"۔

ڈاکٹر پھر مسکرایا گویا وہ یہ سن کر خوش ہوا کہ اتفاق سے اسے ایک اچھا کام مل گیا ہے "مایوس نہ ہو جئے، سب کچھ جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اب کے موسم گرما آپ کسی پہاڑی مقام پر بسر کریں تو بہتر رہے گا"۔

اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور بیگ لے کر رخصت چاہی۔

اس کے بھاری بوٹ سنگ مرمر کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے چلے۔ جب وہ لکڑی کے زینوں سے نیچے اترا تو زینہ اس کے پاؤں کی دھمک سے چرمرا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ خاموشی پھر چھا گئی۔ صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی جو وقت کے فیتے کو دقیقوں میں کترتی جا رہی تھی

سا دروازہ کھلا اور خادم نے ناشتے کی اطلاع دی۔

"بیگم میز پر پہنچ گئی ہیں؟"

"بس آرہی ہیں حضور"

سرناظم آہستہ سے اپنے بستر سے نکلا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال اس طرح مٹیالے ہو رہے تھے گویا بچوں کے ساتھ دھول میں کھیلتا رہا ہو۔ اس کی بھاری مونچھوں کا بل نکلتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا لیکن ان میں وہ بل پیدا نہ ہوا۔ اس کی کنپٹی کے قریب سفید بالوں کا ایک گچھا بُجھے کے پھوں کی طرح اُبھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں میلی میلی سی نظر آرہی تھیں۔

اس نے کپڑوں کی الماری کھولی اور نیلے لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر اسے خیال آیا! اسے کہیں باہر تو جانا نہیں، یہ سوچ کر اس نے اپنا مخملی گون پہن لیا۔

جب وہ کھانے کے کمرے میں آیا تو میز پر صرف بچے ہی بیٹھے تھے، وہ اپنے باپ کو دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑے اور اس سے لپٹ گئے۔ اس نے دونوں کو چوما اور ان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا

"تمہاری امی کہاں ہیں؟"

"سنگار روم میں"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"ننھے تم نے چمکو ننھے تارا چمکو، کی نظم یاد کی ہے؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

لڑکے نے اپنی بھوری آنکھیں اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور چمچے سے کھیلنے لگا۔ اس کے رخساروں پر ہلکا سا گلابی رنگ دوڑ گیا۔

"ابا جان" لڑکی کرسی پر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "نسیم کل سارا دن ندی کے کنارے کیچڑ میں کیچوے پکڑ تا رہا"۔

"نہیں ابا جان" نسیم نے فرزانہ کی طرف گھور کر دیکھا۔ "فرزانہ ہی نے تو مجھے اس کے لئے کہا تھا"۔

سرناظم نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ اس کے بالوں میں سرخ فیتے کا پھول بندھا ہوا تھا۔ اس کی

جلدی سے اپنے باپ کی بغل میں سر چھپا لیا۔

"شریر لڑکی" اس نے اس کے سر کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ تم نے نظم یاد کی؟"

"ہاں ابا جان" اس نے چہک کر کہا اور نظم سنانے لگی۔ جب وہ نظم سنا چکی تو نسیم نے کہا۔ "اچھا اب تم کوّے اور مور کی نظم سناؤ تو۔"

لڑکی چپ ہو گئی تو نسیم نے کہا۔ "ابا جان میں سناتا ہوں۔"

اتنے میں بچوں کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ لاجونتی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اور اس کے گلے میں موتیوں کا ہار جھلمل کر رہا تھا۔ جونہی وہ کرسی پر بیٹھی ایک مہک سی ہوا میں پھیل گئی۔

"کیا شور مچا رکھا ہے بچو تم نے، اگر چائے پی لی ہے تو اسکول کو بھاگ جاؤ" پھر اس نے خاوند کی طرف دیکھا۔ "آپ سنائیے کیسی طبیعت رہی؟"

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ تیس برس کی عمر میں بھی جوان تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر آنے والی عمر کا ایک نشان بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ابھی تک جوان کلی کی طرح چٹک رہی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں مِس تھامسن کے ہاں جا رہی ہوں، آج اس نے اپنے چند ایک دور کے رہنے والے دوستوں کی ضیافت کی ہے۔ شاید میں چار بجے کی چائے تک نہ لوٹ سکوں۔"

جب وہ بات کر رہی تھی تو اس کے کانوں کے بُندے اس کی آنکھوں کی طرح جگمگا رہے تھے

بچوں نے چائے ختم کر لی تو اپنی کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے اپنے بستے بغل میں دابے اور برآمدے میں سے بھاگتے ہوئے نکل گئے۔ ان کے ہلکے پھلکے قہقہوں کی آوازیں دیر تک ان کے کانوں میں آتی رہیں۔

ماں نے چائے کی پیالی طشتری پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ان کی استانی کل مجھ سے کہہ رہی تھی کہ فرزانہ نسیم سے زیادہ ذہین ہے۔"

"ہاں" سر ناظم نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے سامنے انڈے، دلیا اور دودھ میں ڈبل روٹی کے بھیگے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے لیکن وہ ان میں سے ایک چیز بھی نہ کھا سکا، اس نے دلیے کا ایک چمچہ لیا لیکن فوراً ہی ڈکاریں آنا شروع ہو گئیں اس کے سامنے اس کی پیالی پڑی تھی جس میں چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

"آپ کچھ کھائیں گے نہیں، تھوڑا سا پھل ہی کھائیے"

اس کی بیوی نے سنگتروں کی پلیٹ اس کے سامنے کھسکا دی اور خود ایک سیب چھیلنے لگی۔ سر ناظم نے بیوی کی تالیف قلب کے لئے ایک سنگترہ اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ اس کی نظریں بار بار اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جس پر غازے کی گرد احتیاط اور رہزمندی سے چھڑکی ہوئی تھی۔

جب اس نے سیب چھیل لیا تو ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اپنے خاوند کے سامنے پیش کیا۔

"شکریہ" سر ناظم نے سنگترے کی ایک پھانک کھاتے ہوئے کہا۔

"سیب تو ایسی چیز نہیں جس سے انکار کیا جائے"

اس فقرے نے اس کے ذہن میں یکایک سوئی ہوئی یاد کو بیدار کر دیا۔ پندرہ برس ہوئے جھیل ڈل کے کنارے ایک انگریز نژاد ہندوستانی لڑکی نے اس سے یہی فقرہ کہا تھا۔ وہ بھی کیا وقت تھا۔ اس نے ایک آہ بھر کر سیب لے لیا اور آہستہ آہستہ چبانے لگا۔

پھر اس کی بیوی نے خادم کو بلایا اور چائے کے برتن اٹھا لے جانے کے لئے کہا، اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سر ناظم اٹھ کر کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ نیچے باغ میں مالی کیاریوں کو پانی دے رہا تھا۔ رئیس کو ڈکاریں آنے لگیں۔ زبان پر گدلی سی کڑواہٹ پھیل گئی۔ اور اس کے سینے میں آگ کی ایک ہلکی سی دہلنے لگی۔

وہ جلدی سے پلٹا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

میز پر ڈاک پڑی تھی۔ اس نے پہلا خط اٹھایا۔ یہ روئی کے ایک کارخانے کے مالک کی طرف سے تھا جس میں اس نے اس کی زمینوں کی تمام کپاس کو بازاری نرخ سے دو آنے زیادہ پر خریدنے کی پیشکش کی تھی۔ دوسرا خط ایک دوست کی طرف سے تھا جس میں اس نے مرغابی کے شکار کی دعوت

دی تھی، تیسرا خط ایک کتب فروش کی طرف سے تھا جس میں اس نے اس کے مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک نئی مطبوعہ کتاب کے چند ورق نمونتاً ارسال کئے تھے۔ کتاب کا نام تھا "حسن عالم" اس میں دنیا کے مختلف ملکوں کی عورتوں کے عریاں حسن کی تصاویر دی تھیں۔ سر ناظم نے پمفلٹ میز پر رکھ دیا اور اپنا پائپ سلگایا۔ پھر اپنی دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کر ان تصاویر کو از سرِ نو دیکھنے لگا جب وہ انھیں غور سے دیکھ چکا تو اس نے ان کاغذات پر ایک سُرخ نشان لگا کر میز کے پہلے خانے میں رکھ دیا۔ ان خطوں کے نیچے ایک اخبار تھا جس کے ساتھ ایک کارڈ چپاں تھا۔ کارڈ پر لکھا تھا "ہم احیائے مذہب کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ زمانہ بے حیائی اور جنسی نوضویت ——— "

اس نے کارڈ کو اخبار سمیت ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اس کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں لیکن ایک نیلے لفافے نے انھیں صاف کر دیا۔ اس نے پہلے اس کا پتہ پڑھا۔ پھر خط کو سونگھا۔ اندازِ تحریر زنانہ تھا۔ کچھ لمحات تک وہ مگار کا کش اور لکھنے والے کے متعلق قیاسے لگاتا رہا۔ پھر اس نے نہایت آہستگی سے لفافہ چاک کیا اور خط کی تہیں کھول کر پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ پڑھتا جاتا اس کے چہرے کی شکنیں صاف ہوتی جاتیں۔ یہ خط میجر بروش کی بیوی نے اپنے دوست "بوڑھے نواب" کو لکھا تھا۔ "میں دسمبر کی چھٹیاں تمہارے پاس گذاروں گی ——— اکیلی آرہی ہوں"۔ اس نے خط کو پھر تہ کر کے لفافے میں ڈال دیا اور اس کو اپنی گون کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

دروازے پر ایک دستک پڑی۔

"آجاؤ اندر"۔

سر ناظم کا سکریٹری اپنی پُرانی فلالین کی پتلون اور سرخ کوٹ پہنے اور چھوٹی سی پگڑی باندھے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اکاونٹ بک تھی۔ وہ میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"مجھے امید ہے جناب کی طبیعت رات بہتر رہی ہو گی"۔

"ہاں" نواب نے جلدی سے اس موضوع کو ٹالتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے سکریٹری کے عزت پوچھنے والے لہجے کو ہرگز پسند نہ کرتا تھا ہمیشہ اس میں اس کو ریاکاری اور خوشامد کی بو آتی تھی۔

"درختوں کے ذخیرے کی زیادہ سے زیادہ کیا پیش کش ملی؟

"بارہ ہزار روپیہ دہلی کے ایک سیٹھ کی طرف سے کہا گیا ہے۔ بولی آٹھ ہزار سے شروع ہوئی تھی"

سکریٹری نے جیب سے اپنی عینک نکالی۔ پھر رجسٹر سے ایک پیلا لفافہ نکال کر سامنے رکھ دیا

سرناظم نے لفافے پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا" تو ہمیں فرنیچر اور عمارت کے لئے عمدہ لکڑی کہاں سے دستیاب ہو سکے گی؟"

ہاں جناب مجھے یاد آیا۔ میں نے اس کے متعلق بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ منصوری کی پہاڑیوں پر عمدہ لکڑی ملتی ہے۔ میرا خیال ہے وہیں کے لکڑی کے کسی تاجر سے گفتگو کرنی چاہیے۔

بوڑھا نواب پائپ کے کش لگا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں میری نئی پہاڑی کوٹھی موسم گرما سے پہلے پہلے تیار ہو جائے"

"مجھے امید ہے برف پگھلنے سے پہلے ہی تیار ہو جائے گی"

پھر سکریٹری نے اکاونٹ بک نواب کے سامنے کھول دی۔

"پچھلے ماہ چودہ ہزار سات سو نو روپے دس آنے تین پائی کی آمدنی ہوئی اور سات ہزار چار سو روپے چھ آنے خرچ ہوئے"

نواب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"اس میں مکانوں اور دکانوں کا کرایہ بھی شامل ہے؟"

"جی ہاں" مکانوں اور دکانوں کا کرایہ یہاں درج ہے" سکریٹری نے اپنی سرخ پنسل سے صفحے کے ایک کالم کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا خرچ کی تفصیل؟"

"یہاں درج ہے" سکریٹری نے ورق الٹے۔

بیمار نواب کی آنکھوں کے سامنے خرچ کی لمبی تفصیل موجود تھی۔ اس میں پوڈر کریم، سائڈ بال

بند سے قمیصوں کے کپڑے، گرم کوٹ اور پتلونوں کے کپڑے۔ نئے ٹی سٹ، گارڈن پارٹیوں کے بل، پٹرول، سبزیاں اور ادویات سبھی کچھ تھیں۔ نواب نے غور سے جو ہر چیز کے طلب کرنے والے کا نام پڑھا تو اپنے نام کے سامنے صرف ادویات ہی پائیں۔ اس کے سینے میں یکایک آگ سلگنے لگی۔ اس نے سگار کا ایک کش لیا اور نہایت مکروہ کڑواہٹ اس کے حلق میں اور اس کی زبان پہ پھیل گئی۔ اس نے زور سے تھوکنا چاہا لیکن گھبراہٹ میں کڑوا تھوک بھی حلق سے نیچے اتر گیا۔

"لے جاؤ اس کو" بوڑھے نواب نے جلدی سے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

جب سکریٹری چلا گیا تو اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر رکھ دیا اور چھت کے درمیان لٹکے ہوئے فانوس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بیسویں صدی ہو، انسانی دماغ کی رفعت آسمان کی بلندیوں سے بھی بلند ہو، ہر چیز دست انسانی کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ بطرتی ترقیوں اور اوج کمال کے باوجود اس کے روگ کا کسی کے پاس کوئی علاج نہ ہو؟ کتنی ہی مدت سے اس کے دل میں کوئی خوشی نہ سمائی تھی۔

اس نے ایک نظر گھما کر کمرے میں دیکھا۔ انگیٹھی کے کارنس کے اوپر جو ٹیبل لمپ پڑا تھا اس کا خول نفرنقی شترمرغ کے انڈے کا بنا ہوا تھا اور سات ہزار روپے میں ایک جرمن سے لیا تھا، دیواروں میں جو الماریاں لگی ہوئی تھیں ان پر خالص ہاتھی دانت کی پچی کاری کی گئی تھی لکھنے والی میز کی لکڑی سوئزرلینڈ کے پہاڑوں سے منگائی گئی تھی۔ یہ میز اس نے اپنے پچھلے جنم دن پر خرید تھی۔ انگیٹھی کے قریب ایک صوفہ پڑا تھا جس کی قیمت پورے بارہ سو روپے تھی، اس کے آگے جو قالین بچھا تھا وہ روس سے آیا تھا، اور ایک روسی تاجر سے پورے چار ہزار روپئے میں خریدا گیا تھا، انگیٹھی کے چاروں طرف صندل کی لکڑی کا حاشیہ لگا ہوا تھا۔ اور اس پر سونے کی گھڑی رکھی ہوئی تھی۔ جس کی قیمت بیس ہزار روپئے تھی۔ اس کے ڈائل پر ایک مشہور اطالوی مصور نے ایک محو پرواز پری کی تصویر بنائی تھی۔ آہ یہ سب چیزیں مل کر بھی اس کے لئے خوشی کا ایک لمحہ نہیں بن سکتیں؟

یکایک اپنی پشت پر اس نے ایک مہین آواز سنی: "سخی داتا"

"کون ہے؟" نواب نے اپنی کرسی پر مڑ کر دیکھا۔ پرانے اور گندے سنواری رنگ کے لباس میں ملبوس ایک عورت دروازے کی دہلیز میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اور ایک بالکل عریاں بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا لنگا کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور قالین پر کھڑی ہوگئی۔ اس کے کیچڑ سے لت پت پیروں سے قالین پر بڑے بڑے سیاہ دھبے پڑ گئے۔

"سخی داتا، میں تمہارے ہمسائے میں رہتی ہوں۔ میرا خاوند سبزی فروش ہے، وہ اپنے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے ہر روز کچھ نہ کچھ کما لاتا تھا لیکن آج وہ بیمار ہے اور شاید عنقریب ہی وہ موت کی گود میں پہنچ جائے اگر —— اس کی بر وقت مدد نہ کی گئی"

عورت نے سکون سے پوری بات کہی۔ وہ اپنے سفید ہونٹ چبا رہی تھی جن کا خون مدت سے نچڑ چکا تھا۔ وہ جوان ہی دکھائی دیتی تھی، لیکن اس کی جوانی کہاں تھی؟ وہ اپنی بجھے ہوئے کوئلے کی سی ٹھنڈی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نواب کے سینے سے غصے کا ایک بگولا اٹھا اور اس کے حلق میں اٹک گیا۔

"تمہیں کس نے اندر آنے کی اجازت دی؟" نواب نے سختی سے پوچھا۔

"میں آنکھ بچا کر اندر چلی آئی"

نواب نے غضب آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "نکل جاؤ"

وہ بجائے پلٹنے کے دو قدم اور آگے بڑھ آئی۔ اور اس کے ہر قدم کا نقش قالین پر ثبت ہوتا گیا۔

"اللہ نے تمہیں ہر شے دی ہے "

نواب نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ اس کے ہاتھ میں آیا اس کی طرف پھینک دیا۔ عورت نے بغیر دعا دئے اس کو اٹھا لیا اور باہر نکل گئی۔

جب وہ چلی گئی تو مسز ناظم نے زور سے گھنٹی بجائی۔

دروازے میں ایک نوکر نمودار ہوا۔

"حرام زادے تم اندھے تھے، وہ اندر گھس آئی، قالین صاف کرو" نواب نے پورے زور سے کڑک کر کہا۔ اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نوکر نے جلدی سے قالین صاف کیا اور چلا گیا مگر اس کا دل پھر بھی دھڑکتا رہا۔ نواب نے آہستہ سے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔

"آہ، میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں"

اس نے نیا پائپ سلگایا اور اپنی کرسی کتابوں کی الماری کے قریب کھینچ لی۔ الماری میں ہر قسم اور ہر موضوع کی کتابیں چُنی ہوئی تھیں۔ اس نے تاریخ کی ایک جلد اٹھائی، دو چار ورق الٹے اور پھر اُسی جگہ رکھ دی۔ پھر ایک ناول اٹھایا، ورق گردانی کی لیکن سر چکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کتابوں کی سنہری جلدیں قطار در قطار کھڑی تھیں لیکن اس کا دماغ صرف ایک ہی بات کی ٹوہ میں مصروف تھا "مجھے خوشی کیوں حاصل نہیں ہوتی؟" بڑے بڑے مفکروں نے کہا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ ــــ مسرت کی تلاش: جہاں بھی ملے اسے لے لو۔ لیکن وہ بچارا کیا کرے جو مسرت کو ڈھونڈھ رہا ہے لیکن اسے معلوم ہی نہیں کہ مسرت کس کونے میں چھپی ہوئی ہے؟ کیا اس کی ساری عمر کا مقصد صرف تلاش مسرت ہی رہیگا اور جب وہ بھی خوشی کی نشانی پائے گا تو پھر اس کی موت آجائے گی۔ یہی زندگی ہے کیا؟

پھر اس نے اٹھ کر الماری سے بہترین تصویروں کی کتاب نکال لی اور دیر تک نسوانی حسن کی عریانی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب اس نے کتاب بند کی تو اس کا سر ڈگمگایا، سینے میں ایک انگیٹھی سی دہکنے لگی اور زبان پر کڑواہٹ پھیلنے لگی۔

گھڑی نے چار بجائے اور خادم نے چائے کی اطلاع دی۔

"میں چائے نہیں پیوں گا۔ میں باہر سیر کے لئے جاؤں گا۔ گھوڑا تیار کرو" نواب نے کہا۔

سورج اس وقت افق کو چھوڑ رہا تھا۔ جب نواب سیر سے واپس آیا۔ لوٹتے ہوئے وہ لندن کلب کے قریب گزرا۔ اس کے دوستوں نے اسے وہاں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے اصرار اور التجاؤں کے باوجود نہ رکا جھیل کے اوپر سے چکر کاٹ کر وہ گھر پہنچا۔ اپنی کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے اس کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرات کھڑے تھے جب وہ باغ میں داخل ہوا تو اس کی بیوی نوشابہ کے ساتھ سامنے سے اس کے استقبال کو

نکلی۔ وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور فرزانہ کو گود میں اٹھا لیا۔ پھلواری کے پرلی طرف سے نسیم دوڑتا ہوا آیا
"ابا جان آپ آگئے، میں آپ کو ایک چیز دکھانے آیا ہوں۔ یہ دیکھئے"۔
نسیم نے نزدیک آتے ہی اپنی نئی بندوق سے آسمان کی طرف فائر کیا۔ یکایک جو دھماکا ہوا تو گھوڑا بدکا اور ایک دم باہر کو دوڑا۔
"نوکر"
چار پانچ نوکر گھبرائے ہوئے نکل آئے اور گھوڑے کے پیچھے اٹھ بھاگے۔ نواب خود بھی کوٹھی کے باہر آن کھڑا ہوا اور اضطراب سے گھوڑے کی طرف دیکھنے لگا جو سڑک پر سیدھا سرپٹ جا رہا تھا۔ سڑک کچھ فاصلے پر جا کر یک دم اتنا بل کھاتی تھی کہ دوسری طرف سے آنے والا اس طرف سے آنے والے کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ نواب کی آنکھوں کے سامنے گھوڑا سڑک پر مڑا اور سامنے سے ایک سائیکل سوار بھی نمودار ہوا۔ گھوڑا اس تیزی سے مڑا کہ سائیکل سوار سنبھل نہ سکا۔ اور سیدھا گھوڑے کے پاؤں میں آ رہا۔ گھوڑے کے سُموں سے آگ کے شرارے نکلے اور وہ اس کو روندتا ہوا نکل گیا۔
نواب نے جب یہ دیکھا تو فوراً کوٹھی کے اندر چلا آیا۔ برآمدے میں جا کر بیٹھ گیا۔
سورج اس وقت غروب ہو چکا تھا اور آسمان پر سیاہی چھا رہی تھی جبکہ اس کے نوکر گھوڑے کو پکڑ کر لائے۔ گھوڑے کے جسم پر جا بجا خراشیں آگئی تھیں اور اس کے بائیں گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔
نواب نے فوراً ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا اور جب تک ڈاکٹر کی کار نظر نہ آئی وہ انتہائی اضطراب میں باغ کی روش پر ٹہلتا رہا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ اس نے اپنے میٹھے الفاظ سے اس کی دل جوئی کرنی چاہی لیکن نواب نے سیاہ افق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "امینہ سچ ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی سکھی نہیں، غم ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے"۔
اسی اثنا میں ڈاکٹر کی کار دروازے میں نمودار ہوئی تو نواب ناظم لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے خود کار کا دروازہ کھولا۔
ڈاکٹر نے گھوڑے کو بغور دیکھا اور اس کے زخموں پر مرہم لگایا اور اندرونی طور پر بچانے کے لئے دوائی

بھیجنے کا وعدہ کرکے چل دیا۔

"نواب صاحب آپ متفکر نہ ہوں، گھوڑے کو زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔" ڈاکٹر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر، آپ نہیں جانتے کہ یہ گھوڑا مجھے کتنا عزیز ہے۔ میں نے اسے آٹھ ہزار روپے میں خریدا تھا اور پورے ڈیڑھ سو روپے ماہوار اس کی خوراک کے لئے دیتا ہوں۔ یہ مجھے جان سے زیادہ محبوب ہے"

رات کے کھانے کی اطلاع جب نواب کو دی گئی تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اور سگار سلگا کر کرسی پر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اس کی بیوی آئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی۔ "پیارے آپ نہ کھائیں گے تو میں بھی نہ کھاؤں گی۔"

"آمنہ، ضد نہ کرو۔ میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔" نواب نے ذرا خفگی سے کہا۔

"اچھا تو میز پر چل کر ہی بیٹھ جائیے۔"

چنانچہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ میز پر آکر بیٹھ گیا۔ بڑی خاموشی سے کھانا کھایا گیا، بیوی بچے کھانا کھاتے رہے اور نواب سگار پیتا رہا۔ کھانے کے بعد آمنہ نے بچوں کو انگیٹھی کے پاس کھیلنے کی بجائے بستروں میں دبک کر پڑ جانے کے لئے کہہ دیا۔ نواب کمرے میں آکر بستر میں لیٹ گیا لیکن کھلی کھڑکی میں سے تاریک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ رات میں دوبار اٹھ کر وہ اصطبل میں گیا اور گھوڑے کو پورے غور سے دیکھا دوسری بار جب وہ کمرے میں واپس آیا تو یکایک اس کا جی پھر متلانے لگا۔ معدے سے لے کر سینے تک اک آگ سی لگ گئی اور زبان پر نہایت مکروہ کڑواہٹ پھیل گئی، وہ پھر سوچنے لگا "سچی خوشی کیسے ملے گی؟"

رحمرۂ سر اپل ١٨٩٤

Freedom from Suffering

As one nears the shores of America, coming from across the Atlantic, one of the most inspiring sights is the Statue of Liberty. It not only serves as a cheering beacon to the mariner, but also symbolises the hopes of millions of downtrodden humanity who have left the Old World for the freedom of a new life in a new clime—freedom from want, from fear and from oppression.

Of all freedoms, however, the greatest is the freedom from disease. The healthiest—rich or poor—for want of this freedom are changed to sick and diseased whose lives become useless to themselves and to the world. Freedom from disease is therefore the greatest freedom which everyone should strive for.

Cipla Laboratories are devoting their full time and attention to the production of high quality drugs and medicines for the relief of mankind, thus striving for Freedom from disease. In quality, efficacy and high standard of production of drugs and medicines Cipla is equal to the world's best. Scientific methods of production and constant research lead to perfection. This is the motto followed by Cipla.

EQUAL TO WORLD'S BEST

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

پہلی جماعت میں

کھیل کے ذریعے تعلیم

ہمارے اسکول میں خاص طور پر اور پرائمری اسکولوں میں تعلیم کا جو طریقہ جاری ہے اس کے غلط اور غیر سائنٹیفک ہونے سے کس کو انکار ہے۔ اسکولوں کے نام سے بچے کی روح کانپتی ہے عبدالغفار صاحب مدھولی کی یہ تصنیف وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ کھیل کھیل میں بچوں کو کتنی آسانی سے وہ سب کچھ پڑھایا جا سکتا ہے جس کو پڑھاتے پڑھاتے اور پڑھتے پڑھتے استاد شاگرد دونوں تنگ آ جاتے ہیں۔ قیمت (عہ)

پردہ غفلت (ڈراما) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب عہ
انتخاب میر۔ مولوی نورالرحمن عہ
سیاسیات کی پہلی کتاب ۸ر
بادشاہ ۸ر
نقش آخر (ڈراما) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی عہ

باغبانی پر دستکش۔ اسکولوں کے لئے ۸ر
ہندوستان کی پہلی کتاب ۸ر
انشا کی تعلیم۔ فن مضمون نویسی پر استادوں کے لئے نادر کتاب عہ

جادو کا گھر ۸ر
لومڑی کا گھر ۸ر
بندر اور نائی ۹ر
ہتو جتو ۸ر
پان کھا کر طبلہ بجا کر ۸ر
چل میرے تنکے ٹمک ٹم ۸ر
پکڑ دم کتے کو ۸ر
پھر چگوں کیا خاک ۸ر
تارا دھرتی پارا ۸ر
بچوں کی کہانیاں ۵ر
جنگل کی بلی ۸ر
محنت (ڈراما) ۷ر
شریر لڑکا (ڈراما) ۸ر

چتو متو ۵ر
لال مرغی ۸ر
دو بھائی ۸ر
عقاب ۸ر
ایورسٹ کی داستان ۵ر
تاریخ ہند کی کہانیاں عہ ۷ر
ترکوں کی کہانیاں ۸ر
دنیا کے بچے ۸ر
دنیا کے بسنے والے ۸ر
بجلی کی کہانی ۸ر
مقناطیس کی کہانی ۸ر
بجلی اور مقناطیس کی کہانی ۸ر
سمندر کا عجائب خانہ عہ

عقائد اسلام ۸ر
ارکان اسلام ۸ر
ہمارے نبیؐ ۸ر
ہمارے رسول ۱۰ر
سرکار کا دربار عہ
سرکار دو عالم عہ
رسول پاک عہ
خلفائے اربعہ عہ
دس جنتی ۸ر
نبیوں کے قصے ۸ر
محاسن اسلام عہ
قومی نظمیں ۸ر
بچوں کا کھلونا ۱۲ر

ہمارا مکمل پتہ:۔ **مکتبہ جامعہ دہلی**

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

سالانہ چندہ صہ / فی پرچہ ۸ر	بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۴۶ء	جلد ۳۴ نمبر ۲

فہرست مضامین

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) دیال پریس دہلی

تقابلی لسانیات کا طریق کار

ماضی پارینہ کے وہ معصوم دھند لکے جن میں انسانی لبوں سے شیریں بول بکھر بکھر کر مختلف زبانوں میں منقسم ہو رہے تھے تقابلی لسانیات کے لئے ایک پریشاں کن مسئلہ ہیں۔ یہ کہنا کہ دنیا کی تمام زبانیں ایک ہی زبان سے ابھری ہیں، بڑی جراءت کی بات ہے۔ ام السنہ (Proto-language) کے نظریہ کی پشت پر معقول دلائل اور شواہد نہیں ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ زبانیں منفرد اور منقطع اکائیاں نہیں ہیں۔ ان میں آپس میں تعلقات ہیں۔ رشتے ہیں۔ ان رشتوں کو دریافت کرنا، ان کا تعین کرنا تقابلی لسانیات کا مقصد ہے لیکن اس لفظ رشتہ سے لسانیات میں بعض اوقات بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ لسانیات میں اس کی نوعیت ایک استعارہ کی ہے لیکن بعض لسانیات دانوں نے اس استعارتی اظہار سے متاثر ہو کر ماں، بہن، بیٹی، خاندان وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنے شروع کر دئے۔ ان الفاظ کی فراوانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ رشتہ کے لفظ اور باقی دوسرے لفظوں کو بھی واقعی معنوں میں مراد لینے لگے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اگر ان لفظوں کو واقعی معنوں میں استعمال کیا جائے تو وہ زبان کے معاملہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ مثلاً ہم فرانسیسی زبان کو لاطینی کی بیٹی یا لاطینی کو فرانسیسی کی ماں بہن کہہ سکتے۔ ایک زبان دوسری زبان سے اس طرح پیدا نہیں ہوتی جس طرح ماں بچے کو جنتی ہے کوئی لسانیات داں کسی زبان کے تولد کے وقت کا تعین نہیں کر سکتا۔ یہ کہنا کہ فرانسیسی لاطینی سے پیدا ہوئی یہ کہنا ہے کہ لاطینی نے رفتہ رفتہ صدیوں میں جا کر ایک خاص مقام پر ایک دوسری شکل اختیار کر لی جسے فرانسیسی کے نام سے موسوم کیا گیا لیکن اس ارتقا کا کتنا ہی باریک مطالعہ کیوں نہ کیا جائے۔ یہ ہرگز طے نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں وقت پر لاطینی نے فرانسیسی سے موسوم نئی شکل اختیار کر لی۔ یہ تو لسانی تغیر کی ایک

صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک زبان کئی بولیوں میں بٹ جائے۔ استعارتاً تو انہیں بہنیں کہا جاسکتا ہے لیکن واقعی معنوں میں یہ بہن کا رشتہ ان پر ٹھیک نہیں بیٹھتا۔

لفظ رشتہ کی مختصر وضاحت کے بعد میں اپنی پہلی بات پر آتا ہوں یعنی یہ کہ زبان کے تعلقات اور رشتوں کا تعین کرنا تقابلی لسانیات کا کام ہے۔ اس کے لئے وہ دو قسم کے طریق کاروں (Methods) کا استعمال کرتی ہے۔ تاریخی طریق کار اور تقابلی طریق کار۔

تاریخی طریق کار میں موازنہ کی جانے والی زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جن دو زبانوں کا موازنہ کیا جاتا ہے ان کی گذشتہ تاریخ کے مطالعہ کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ان کی قواعد کے مطالعہ کی۔ تاریخی طریق کار میں موازنہ کی جانے والی زبانوں کی نشو و نما، ارتقا اور انحطاط کا امکانی حد تک سراغ لگایا جاتا ہے۔ ان کے بالترتیب تغیرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کی قدیم شکلوں اور متغیر شکلوں کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس بات کے لئے یہ ضروری ہے کہ زبان ادبی ہو اور اس کی نشو و نما کے مختلف دور، یادگاروں، کتبوں اور کتابوں میں محفوظ ہوں، اگر اس قسم کے شواہد مفقود ہوں تو پھر مروجہ بولیوں کے سادہ موازنہ پر ہی قناعت کرنی پڑتی ہے اور اس سے ان کی مشترک شکلوں کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اس صورت میں بولیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنے ہی قابلِ اطمینان نتائج برآمد ہوں گے، جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے تو موازنہ مشتقوں کا نہیں بلکہ مادوں کا کیا جاتا ہے (اس کی وجہ میں آگے چل کر بتاؤں گا) اور یہ بات خود تاریخی مطالعہ کی طالب ہے جن لفظوں کا باہم جائزہ لیتے ہیں ان کی قدیم تاریخ کا سراغ جہاں تک ہوسکے لگانا چاہئے۔ اس طرح انھیں سادہ ترین شکلوں میں منتقل کیا جاسکتا ہے اور انھیں اس گرد و غبار سے پاک کیا جاسکتا ہے جو امتداد وقت کے باعث ان کے چہروں پر اَٹ جاتا ہے اور ان کی باہمی مشابہت کو پنہاں کر دیتا ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ متحد الماخذ الفاظ مختلف زبانوں میں پہنچکر بالکل مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا وہ باہمی رشتہ نگاہوں سے پنہاں ہو جاتا ہے۔ مختلف الماخذ الفاظ مختلف زبانوں میں پہنچکر یکساں شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور باہم رشتہ دار معلوم ہونے لگتے ہیں پس اگر ایک لفظ کی تاریخ معلوم

نہیں ہے تو اس کے چھوٹنے سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اگر موازنہ کے عمل ہی سے لفظ کی تاریخ معلوم ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے۔

تقابلی طریق کار درحقیقت تاریخی طریق کار کی ہی توسیع شدہ شکل ہے۔ تاریخی طریق کار کا عمل تاریخی ادوار میں محدود رہتا ہے لیکن تقابلی طریق کار تاریخی ادوار سے گزر کر زبان کے ماقبل تاریخ عہد میں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں چونکہ خارجی شواہد مفقود ہوتے ہیں اس لئے خالص داخلی شواہد پر کام کیا جاتا ہے جن زبانوں کا موازنہ کرنا ہوتا ہے ان کی شکلوں کا موازنہ کر کے ان کے پوشیدہ رشتہ اور تعلق کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ اگرچہ لسانیات میں اس طریق کار کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی وجہ سے بڑے بڑے اہم انکشاف ہوئے ہیں لیکن اس میں نقص بھی ہیں۔ اس کا مدار تمام و کمال لسانی اصولوں پر ہے، دوسرے علوم سے اسے مدد نہیں ملتی۔ اگرچہ یہ طریق کار تاریخی طرز کار کی ترقی یافتہ اور توسیع شدہ شکل ہے لیکن پیچیدہ اور متنوع خارجی حالات جو تاریخ کا لوازمہ ہیں وہ انھیں نظرانداز کر جاتا ہے۔ جو باہمی مشابہتیں خود انہی زبانوں میں پائی جاتی ہیں انھیں کے ذریعہ سے ان کے تعلق کا تعین کیا جاتا ہے۔ اور یہ بڑا خطرناک طریقہ ہے۔ زبان کے معاملے میں مشابہتیں بڑی پُرفریب ہوتی ہیں۔ لغت کے معاملہ میں بالخصوص بعض اوقات بڑا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ چند الفاظ صوتی اور معنوی دونوں اعتبار سے باہم مشابہ ہوں اور اس کے باوجود ایسی زبانوں سے متعلق ہوں جو آپس میں بالکل مشترک نہ ہوں چنانچہ عربی اور سنسکرت کے ایسے بہت سے الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں جو آپس میں صوتی اور معنوی اعتبار سے مشابہ ہیں۔ حالانکہ یہ دو زبانیں دو مختلف خاندانوں سے متعلق ہیں۔ عربی لفظ "انتقال" اور سنسکرت لفظ "انت کال" میں صوتی اور معنوی دونوں قسم کی مشابہت ہے۔ حالانکہ اصلاً ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ "اختیار" عربی لفظ ہے، انھیں معنوں میں سنسکرت میں "ادھیکار" کا لفظ مستعمل ہے جس کی اصل بالکل جدا ہے۔ عربی کے "جناب" کا ماخذ "جنب" ہے۔ سنسکرت میں ایک لفظ "جناب" انہی معنوں میں مستعمل ہے لیکن اس کی اصل اور ہے۔ وہ دراصل "جن" ([illegible]، آدمی) اور "او" ([illegible]۔ رکھیا کرنے والا) کا مرکب ہے۔ یہ تو دو مختلف خاندانوں سے متعلق زبانوں کا

معاملہ ہے۔ خود ایک ہی خاندان کی زبانوں کے الفاظ بھی بسا اوقات بڑا دھوکا دیتے ہیں۔ فارسی کا بد انگریزی کے BAD سے صوتی اور معنوی اعتبار سے کتنا قریب ہے لیکن حقیقتاً ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ فارسی کے "جاروب" اور ہندی کی "جھاڑو" میں کتنی مشابہت ہے، حالانکہ یہ دو مختلف الماخذ الفاظ ہیں۔ یہ تو درحقیقت اتفاقی مشابہتیں ہیں۔ ہمارے بہت سے الفاظ کی ابتدا نظریۂ صوتیہ (Onomato Poeic Theory) کے ماتحت ہوئی اس لئے اگر مختلف زبانوں کے الفاظ میں ایسی مشابہتیں پائی جائیں تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے بلکہ ان کا نہ پایا جانا زیادہ تعجب خیز ہوتا۔ اس قسم کی مشابہتیں تو اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان مشابہ الفاظ میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ زبان مسلسل بدل رہی ہے۔ چونکہ اس میں تغیرات خارجی حالات و واقعات کے اثر سے ہوتی ہیں اور یہ خارجی حالات و واقعات مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں مختلف ہوتے ہیں اس لئے اس اعتبار سے ان تغیرات کی سمتیں بھی مختلف ہو جاتی ہیں۔ ایک ہی ماخذ سے نکلے ہوئے الفاظ مختلف آب و ہوا میں پرورش پاکر اس قدر متغیر ہو جاتے ہیں کہ ان کا باہمی رشتہ پہچانا نہیں جاتا۔ "۳" کے لئے فارسی میں "سہ" اور سنسکرت میں "تری" کا لفظ ہے۔ ان میں بظاہر کتنی مغائرت ہے حالانکہ دونوں ژند کے "ترایو" (تین) کا مخفف اور مبدل ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ لغوی مشابہت یا مغائرت تقابلی لسانیات میں کوئی فیصلہ کن چیز نہیں ہے لیکن اگر الفاظ کے موازنہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو مختلف زبانوں کے رشتہ کا کس طرح تعین کیا جائے۔ اور یہ کیسے معلوم ہو کہ ان زبانوں میں کونسی آوازیں یکساں اور مماثل ہیں۔ ہماری رہنما محض قواعد ہے۔ قواعد کے تحت ساخت بھی شامل ہے یعنی فقرہ کی ترتیب و نشست و نیز فقرہ کا تصور۔ زبانوں میں جو اختلاف یا اتفاق ہوتا ہے اس کا مظاہرہ منقطع الفاظ میں نہیں بلکہ فقروں میں ہوتا ہے منقطع و مجرد الفاظ کی یکسانیت سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوتا۔ زبانوں کے موازنہ میں پہلے ان کی قواعد کا موازنہ ہونا چاہئے تقابلی طرز کار کی بنیاد قواعد پر ہے۔ یورپ میں انیسویں صدی سے پہلے کی جماعت بندی اور موازنہ کی کوششیں اسی لئے پروان نہ چڑھ سکیں کہ ان میں قواعد کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاطینی

اور یونانی کا عبرانی سے موازنہ کیا گیا اور عبرانی کو تمام زبانوں کا ماخذ قرار دے دیا گیا۔ ہمارے یہاں مولانا محمد حسین آزاد نے سنسکرت اور فارسی کا موازنہ کیا ہے لیکن اس موازنہ کی بنیاد بھی الفاظ پر ہی ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ پورے آریائی خاندان میں کوئی دو زبانیں آپس میں اتنی مشابہ نہیں جتنی فارسی اور سنسکرت ہیں لیکن ان کے الفاظ کا آپس میں موازنہ کرنا ان کے رشتہ کے تعین کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ آزاد کی جبلت راستی پر ہے لیکن اس کا طرز کار غلط اور گمراہ کن ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ الفاظ کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ نہیں بلکہ انھیں فوقی اہمیت نہ دی جائے۔ اگر ہم دیکھیں کہ دو زبانوں میں قواعدی رشتے ایک ہی طرح کے ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کا ماخذ ایک سا ہے۔ اور اس لئے ان میں ان کے الفاظ کا خزینہ بھی مشترک ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر دونوں زبانوں کی قواعدوں میں کوئی یکسانیت نہیں ہے تو الفاظ یا مادے مشترک بھی ہوں تو انھیں اتفاقی اور حادثاتی چیز سمجھنا چاہیئے۔ "ادہیکار" اور "اختیار" "انتکال" اور "انتقال" کی مشابہتیں اتفاقی ہیں جس چیز نے آریائی لسانی خاندان کے وجود کو ثابت کیا اور اس طرح تقابلی لسانیات کی بنیاد ڈالی، وہ منفرد الفاظ کے مابین مشابہت نہ تھی بلکہ خاندان کے کئی افراد کے مابین قواعدی شکلوں کی مشابہت تھی۔ ایڈلنگ اور ملکہ کیتھرائن نے الفاظ کے بے پناہ ذخیرہ جمع کر دیا تھا لیکن آریائی خاندان کے انکشاف اور قیام کی ذمہ وار بوپ (Bopp) کی تقابلی قواعد ہے۔ جب ایک مرتبہ قواعدی رشتوں کا پتہ چل گیا اور ایک لسانی خاندان ظہور میں آ گیا تو پھر صوتیات میں بھی کام کرنے کے لئے گنجائش نکل آئی چنانچہ تھوڑے عرصہ بعد ہی قانون گرم (Grimms Law) ظہور میں آیا۔

جب قواعدی رشتوں کی یکسانیت ثابت ہو جائے تو اس کے بعد الفاظ کا موازنہ کرنا چاہیئے الفاظ کے موازنہ میں ایک عام اصول ہم یہ قایم کر سکتے ہیں کہ موازنہ مشتقوں کا نہیں بلکہ مادوں کا کرنا چاہیئے۔ جو الفاظ ایک ہی مادہ سے مشتق ہوتے ہیں وہ مختلف زبانوں میں پہنچکر مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اس کے برخلاف مختلف مادوں سے نکلے ہوئے الفاظ مختلف زبانوں میں پہنچکر یکساں شکل اختیار کر لیتے ہیں پس صحیح موازنہ کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ انھیں اس کاہی سے پاک کر لیا جائے جو امتداد وقت سے ان پر جم گئی ہے اور جس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ پھر الفاظ کی

بھی قسمیں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موازنہ کے لئے کون سے الفاظ زیادہ موزوں رہیں گے۔ موازنہ کے لئے الفاظ کی یہ دو قسمیں بہت موزوں مانی گئی ہیں :۔

۱۔ وہ الفاظ جن کے معنی جامد و ساکن ہوتے ہیں۔ جیسے اعداد۔

۲۔ وہ الفاظ، جو بہت زیادہ عام ہیں اور روزمرہ میں شامل ہیں۔

اول الذکر قسم کے الفاظ کے معنی ایک مرتبہ متعین ہوجاتے ہیں۔ اور پھر صوتی تبدیلیاں ان میں ہی ہوجائیں لیکن معنی نہیں بدلتے اور صوتی تبدیلیاں بھی ان میں بہت کم ہوتی ہیں، سنسکرت اور فارسی کی گنتی پر غور کرو۔ کچھ اعداد جوں کے توں موجود ہیں بعض میں تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن بہت کم۔

فارسی	سنسکرت
یک	ایک
دو	دی
پنج	پنچ
شش	شٹ
نہ	نو

ثانی الذکر الفاظ اس قدر عام ہوتے ہیں کہ ان کا عامیانہ پن ہی انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ یہ درست ہے کہ اظہار کے لئے نئے طریقوں کی طرف بھی توجہ ہوتی ہوگی لیکن زیادہ توقع یہ ہے کہ اکثریت قدامت پرستوں کی ہوگی۔ پس جب دو زبانوں میں ان کے اعداد اور مشترک خیالات؟ مظاہر کو ظاہر کرنے والے الفاظ میں مشابہت پائی جائے تو یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ یہ دو زبانیں شروع کی ہیں۔ ضمائر کے موازنہ سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ متواتر اور کثرت استعمال سے گھس گھسا کر (Monosyllable) میں منتقل ہوجاتے ہیں اور پھر وہ اتنے قدیم ہیں کہ ان کی صحیح تاریخ کا دریافت کرنا محال ہے۔

موازنہ میں مفہوم اور آواز کے گہرے تعلق کو نظر انداز نہ کردینا چاہیئے۔ وہ تو ایک ہی چیز کے

اندرونی اور بیرونی پہلو ہیں۔ اگر الفاظ کے معنوں میں تعلق نہیں ہے تو محض صوتی مشابہت پر ان کا رشتہ اسی طرح قایم نہیں کیا جا سکتا جس طرح معنوں میں موافقت کی بنا پر مختلف الصوت الفاظ کا تعلق قایم نہیں کیا جا سکتا بیشک یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زیر موازنہ الفاظ کے معنوں میں مکمل یگانگت ہو کیونکہ لفظوں کے خارجی خول کی طرح داخلی روح بھی تغیر پذیر ہوتی ہے۔ زبان میں صوتی اور معنوی دونوں قسم کی تبدیلیاں آتی ہیں لیکن کم از کم ہم اتنا تو دکھا سکیں کہ ایک معنی دوسرے معنی سے ماخوذ ہے یا یہ کہ دونوں معانی کسی ام المعانی کی یادگار ہیں۔ صوتیات میں بھی تو ہم یہی دکھاتے ہیں کہ ایک آواز دوسری سے یا دونوں آوازیں کسی تیسری مشترک آواز سے مشتق ہیں مثلاً "کف" اور "کپھ" "شنا" اور "سنان"۔

انتظار حسین ایم۔ اے

دیہی افلاس اور گاؤں کی مشترکہ تنظیم

ہماری قوم کے لاکھوں آدمی افلاس میں مبتلا ہیں۔ اس افلاس کا اظہار ہزاروں طریقوں سے ہوتا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک یہ ان کی جان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اس کا اثر زندگی اور طرزِ عمل کے ہر پہلو پر پڑتا ہے۔ ہمارے عوام کو اس سخت عذاب کا روز بروز زیادہ احساس ہوتا جارہا ہے۔ وہ اسے مشیتِ الٰہی سمجھ کر اس پر صبر کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ افلاس ایک ایسی بیماری ہے جسے انسانوں نے پیدا کیا ہے اور اس کا علاج بھی انسانی جماعت ہی کے ہاتھ میں ہے گو ننگے عوام نے اب اس کے نتیجوں کا دھندلا سا نقشہ دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ غریب زیادہ غریب ہوتے جارہے ہیں، غریب اور کمزور کے لئے نہ آزادی ہے اور نہ عزت۔

لیکن زمانہ بدل رہا ہے۔ عوام میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے طلوعِ صبح کا نظارہ دیکھنا شروع کر دیا ہے وہ جان گئے ہیں کہ موجودہ دنیا میں طاقت اور اقتدار عوام ہی کے ہاتھ میں ہے۔ تمام اداروں اور پالیسیوں کا فیصلہ ان ہی کی ضرورتوں اور مفاد کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ جمہوریت کے معنی یہی ہیں۔ لیکن قول اور عمل میں ہمیشہ مطابقت نہیں پائی جاتی۔ جنتا کے رواج کو عملی شکل دی جانا ابھی باقی ہے۔ بہت سے لوگ اس راج کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی کرتے ہیں۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے تین شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے عوام افلاس میں مبتلا نہ رہیں۔ دوسری یہ ہے کہ طاقت کا سرچشمہ واقعی عوام ہی ہوں اور تیسرے یہ کہ ہماری جماعت کے مختلف سیاسی اور معاشی گروہوں اور مختلف آدمیوں کے درمیان عدالت اور انصاف کو قایم کیا جائے۔ یہ تینوں شرطیں ایک دوسرے کے ساتھ قریبی طور پر وابستہ ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے

ظاہر کرنے کے تین مختلف طریقے ہیں۔ افلاس اور سماج کی ناانصافی ساتھ ساتھ رہتے ہیں جب تک عوام کو حقیقی اقتدار حاصل نہیں ہوگا، افلاس اور سماج کی ناانصافی باقی رہے گی۔ ہمارے افلاس کے اسباب بہت سے ہیں، ان میں ہماری موجودہ تنظیم بھی ایک خاص سبب ہے۔ ہم تفصیل کے ساتھ اس کا مطالعہ آگے کریں گے۔ یہاں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے عوام کا افلاس بنیادی طور پر اور نہایت زبردست حد تک ایک دیہاتی مسئلہ ہے۔ ہمارے موجودہ نظام جماعت اور اس کی معاشی تنظیم میں بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے عوام کے افلاس سے لڑائی کرنے کے لئے ہمیں بہت سے موریچوں سے حملہ کرنا ہوگا۔ ہمیں ہر اس خیال اور اس ادارے کے خلاف ایک لابی اور مسلسل جنگ کرنا پڑے گی جو عوام کو سماجی، معاشی یا سیاسی لحاظ سے کمزور کر رہا ہے۔

اس کام میں کامیاب ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے دو شرطوں کو پورا کیا جائے پہلی شرط سیاسی آزادی ہے جس سے عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ عملی تعمیری کام کے لئے آزادی کا فائدہ بالکل وہی ہے جو فصلوں کے لئے سورج کا ہوتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تمام باشندوں میں اتنا اعتماد اور تحفظ کا احساس پیدا ہو جائے کہ حکومت اور اس کے تمام شعبوں میں عوام کی مرضی مسلسل اور موثر طریقہ پر ظاہر ہونے لگے۔ اگر ان شرطوں کی موجودگی فرض کر لی جائے تو عوام کی سماجی اور معاشی آزادی ممکن ہو جائے گی۔

ہر اس شخص کو جو عوام کا فائدہ چاہتا ہے اپنے سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ اگر ایسا سیاسی نظام موجود ہو جسے آبادی کے تمام فرقے قبول کرنے کو تیار ہوں تو پھر ہمیں اپنے عوام کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی۔ شروع ہی سے دو خیالوں کے ماننے والے لوگ ملیں گے۔ کچھ لوگ تو وہ ہوں گے جن کا عقیدہ یہ ہوگا کہ ضروری تبدیلیوں کے کرنے کا بس ایک ہی راستہ ہے یعنی خونی سماجی انقلاب۔ یہ صحیح ہے کہ انقلاب کے ذریعہ بہت سی ایسی طاقت کو آزاد کیا جا سکتا ہے جس سے بجلی اور بھاپ کی طرح بہت مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن انقلاب جہاں چیزوں کو پیدا کرتا ہے وہاں انھیں فنا بھی کرتا ہے اور اس کے نتیجے بہت کچھ اتفاق اور موقع پر منحصر ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں جو حالات اس وقت موجود ہیں ان میں عوام کا بہترین فائدہ اسی میں نظر آتا ہے کہ تیز رفتار اور بنیادی تبدیلی کو پُرامن

طریقوں مثلاً قانون سازی کے ذریعہ سے کیا جائے۔ اس دوسرے خیال کے ماننے والوں کا اعتقاد جمہوری طریقوں پر ہے یعنی اتنی تیز رفتار کے ساتھ اور اتنی دور جانا چاہئے جتنے کے لئے عوام کو راضی کیا جا سکے ایسے ہی سب سے زیادہ عقلمندی کا اور آخر میں سب سے زیادہ تیز رفتار کا طریقہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن ہمیں اپنے راستوں کا انتخاب احتیاط کے ساتھ کرنا چاہئے اور جنگی مصلحت کے ان مقاموں کو سمجھنا چاہئے جہاں ہمیں اپنی طاقت کو مجتمع کرنا ہے۔

ہندوستان میں افلاس کے اسباب اور ان کے علاج ایسے امور ہیں جن کے بارے میں ان لوگوں میں، جو خود غرض نہیں ہیں، قریب باتفاق رائے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا ملک زیادہ تر دیہاتی ملک ہے۔ جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے، ہندوستان کے لوگ گاؤں میں رہتے ہیں۔ اس لئے ہمارا افلاس بھی زیادہ تر دیہات ہی میں نظر آتا ہے۔ شہروں میں جو افلاس ہمیں نظر آتا ہے وہ بڑی حد تک دیہات کے افلاس ہی کا ایک عکس اور نتیجہ ہے۔ دیہات کے افلاس کو ختم کرنے کے لئے ہمیں اپنی قوم کے واسطے ایک نیا سماجی اور معاشی نظام پیدا کرنا ہے۔ یہ کام کس طرح کیا جائے؟

یہ نہایت بنیادی سوال ہے۔ نہ صرف ہمارے ملک کے لئے بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے لئے بھی۔ اس کا جواب دینے سے پہلے ہمیں اپنی دیہاتی سماج کی ایک خاص خصوصیت کو سمجھ لینا چاہئے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دیہات میں ہماری آبادی کی اکثریت مفلس ہے لیکن ان سب کا افلاس ایک ہی قسم اور ایک ہی درجہ کا نہیں ہے چھوٹا کسان جس کے قبضہ میں ناکافی رقبہ ہے وہ بھی ایسی ہی کش مکش میں مبتلا ہے جیسا کہ غیر مستقل پٹہ دار۔ چھوٹے زمیندار کو ہمیشہ یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ اس کی زمین اس کے ہاتھ سے نکل کر پیشہ ور ساہوکار یا ایسے زمیندار کے پاس پہنچ جائے گی جو خود کاشت نہیں کرتا۔ غیر مستقل پٹہ دار کو فصل کا اتنا بڑا حصہ زمیندار کے حوالے کرنا ہوتا ہے کہ اس کو زندگی گذارنا مشکل ہو جاتی ہے۔ دیہات کے مزدور کی زندگی کا سہارا بس اس کی روزانہ کی کمائی ہے۔ اس کی اجرت کم ہوتی ہے اور اس کا کام شاذونادر مستقل اور مسلسل ہوتا ہے اگر دیہات کا مزدور ہریجن بھی ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو معاشی پستی اور سماجی دباؤ مل کر اسے بالکل غلام بنا ڈالتے ہیں۔ جدید صنعت کے مقابلے میں دیہات کا دستکار، چاہے وہ ہندوستانی ہو یا غیر ملکی بالکل

بے بس اور کمزور نظر آتا ہے۔ زمینداری کے علاقوں میں ساری ترقی، زمین پر بالائی حقوق کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے۔

ہر صوبہ اور ریاست میں افلاس کا دَور دَورہ ہے۔ ہر گروہ اپنے دشمن کے نام الگ بتا سکتا ہے یعنی جو اس کے سب سے قریب ہوتا ہے اُسے ہی وہ اپنا دشمن سمجھتا ہے لیکن کسان اور غیر مستقل قسم کے مزدور اور دستکار سب کے مسائل قریبی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ہر گروہ اس خوفناک افلاس کے صرف ایک رُخ کو دیکھتا اور اس کے اثر کا تجربہ کرتا ہے جو ہماری سماج کے نظام کی خصوصیت ہے۔ جیسا اُن کے افلاس کو تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے اسی طرح ان کی خوش حالی کو بھی تقسیم کرنا ممکن نہ ہوگا۔

اس لئے آئندہ کے اچھے پروگرام میں ہمیں ہر گروہ کے بارے میں الگ الگ نہیں سوچنا چاہئے یہ ٹھیک ہے کہ ہر گروہ کے اپنے خاص مسائل ہوتے ہیں اور ان کا ہمیں خیال رکھنا چاہئے لیکن اپنی تصویر کے مرکز میں ہمیں اس حقیقت کو رکھنا چاہئے کہ افلاس جو ایک ہی بنیادی سبب کا نتیجہ ہے ان سب پر حاوی ہے۔ یہی حقیقت ان لوگوں کے لئے بھی جواب فراہم کر دیتی ہے جو ہمارے سماج کے بارے میں اس طرح سوچتے ہیں کہ گویا دو طبقوں کے درمیان جنگ جاری ہے۔ یہ خیال مغرب کی کتابوں سے آیا ہے۔ ہماری سماج اس سے بالکل ناواقف ہے۔ چھوٹے زمینداروں کے دیہات میں ایک اتحاد کا رشتہ موجود ہے۔ گاؤں جو ہماری سماج کی بنیادی اکائی ہے اس میں تمام وہ گروہ شامل ہیں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ یعنی چھوٹے زمیندار بھی اور غیر مستقل پٹہ دار بھی، گاؤں کے مزدور بھی اور ملازم دستکار بھی۔ اس کے علاوہ گاؤں میں دو گروہ اور بھی ہیں۔ ایک ساہوکار اور دوکاندار دوسرے وہ لوگ جو خیرات پر گذر کرتے ہیں۔ گذشتہ سو سالوں میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن گاؤں کے مختلف گروہوں کا باہمی انحصار، اب بھی ہمارے دیہات کی خاص خصوصیتوں میں سے ایک ہے۔

اس لئے ہمارے ہمہ گیر افلاس کا یہ علاج نہیں ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو ختم کر دے بلکہ پُر امن طریقہ پر لیکن تیز رفتار کے ساتھ ایک ایسے نئے سماجی اور معاشی نظام کو تعمیر کرنا ہے جس میں ہر شخص چاہے اس کا تعلق کسی گروہ، فرقہ اور ذات کے ساتھ کیوں نہ ہو، منصفانہ طریقہ پر روزی

کما سکے اور زندگی میں اس کو مساوی موقع حاصل ہو۔ کسی ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہ ملنا چاہئے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زمینداروں اور موروثی کاشتکاروں جاگیرداروں اور پٹہ داروں، ساہوکاروں اور کسانوں، متوسط درجہ کے کسانوں اور چھوٹے کسانوں کسانوں اور مزدوروں۔ سب کے باہمی تعلقات میں بہت سی تبدیلیاں کرنا ہوں گی اور ہر میدان میں انصاف کے اصولوں کو قایم کرنا ہوگا۔

یہ بہت بڑی تبدیلیاں ہیں۔ ہماری دیہی سماج کی، اس ہمہ گیر نئی تعمیر کی کنجی یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کو اس طرح ازسرنو تنظیم دی جائے کہ جماعت ان کا مشترک انتظام کرنا شروع کردے۔ یہ مشترک انتظام ان آراضیات کی جگہ لے لے گا جن کے چھوٹے اور غیر معاشی ہونے کی وجہ سے اس وقت ہماری زراعت غیر نفع بخش بنی ہوئی ہے۔ مشترک انتظام ہمارے دیہات کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوگا اس میں پرانی زمینیں بھی شامل ہوں گی اور نئی بھی۔

مشترک انتظام کے معنی مشترک ملکیت نہیں ہیں۔ یہ انتظام کسانوں کے ملکیت کے حق کو جو انہیں حاصل ہے بجنسہٖ باقی رکھے گا۔ اس کا مقصد سب سے اول یہ ہوگا کہ زمین کے جوتنے والوں کو خوش حال بنادے۔ آج کل کی دنیا میں چھوٹے مزرعے جن میں تنظیم اور سرمایہ کی کمی ہوتی ہے عموماً غیر نفع بخش ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر چھوٹے زمیندار زندہ رہنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں آپس میں متحد ہوجائیں ورنہ روز بروز ان کی زمین بڑے زمینداروں، ساہوکاروں اور سرمایہ دار پٹہ داروں کے پاس کھنچتی جائے گی اور بہت سے چھوٹے زمینداروں کی حیثیت محض اُجرت پر کام کرنے والے مزدوروں جیسی ہوجائے گی۔

شروع میں یہ تبدیلی جس میں چھوٹے زمینداروں کے چھوٹے رقبے، ایک ایسے پنچائتی نظام کے ماتحت آجائیں گے جیسا کہ مشترک انتظام ہے، چھوٹے زمینداروں کے مفاد کے خلاف نظر آئے گی۔ اور ان میں سے بہت سے لوگ اس بات کو اسی طرح محسوس بھی کریں گے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا مالک اور اپنے قطعہ زمین کا حاکم مطلق بنا رہنا پسند کرتا ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتا کہ اسکا

قطعہ چھوٹا سا ہے۔ اس بات میں ایسی آزادی اور عزت سمجھی جاتی ہے جیسی کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوتی یہ بات ٹھیک ہے اور چھوٹے زمیندار کو زمین پر جو حقوق حاصل ہیں ان میں کلام کرنا غلطی ہے لیکن اگر چھوٹے زمیندار ان لوگوں کے پنجے سے آزاد رہنا چاہتے ہیں جو ان کی زمین خریدنے کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں تو وہ چھوٹے قطعوں کو کسی طرح الگ الگ نہیں رکھ سکتے انھیں اپنے رقبوں کو ملا کر بڑے مزرعے بنانا ہوں گے اور اپنے بہترین مفاد کے پیش نظر ان کا مشترک انتظام کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا گاؤں دوبارہ سماجی اور معاشی زندگی کا ایک مضبوط اور صحت مند حصہ بن جائے گا۔ اس بات سے چھوٹے زمینداروں اور گاؤں کے دوسرے کام کرنے والوں کو نئی زندگی نصیب ہوگی۔

مشترک انتظام شاید ایک نیا خیال معلوم ہو لیکن دراصل یہ نیا نہیں ہے۔ سارے ہندوستان میں بہت پرانے زمانہ سے زمینوں کے انتظام کے ایسے طریقوں کا رواج چلا آرہا ہے جو ہمارے مجوزہ طریقہ سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے علاوہ پچھلے تیس چالیس سالوں میں امداد باہمی کا جو کام ہوا ہے، مشترک انتظام اُسی کی ایک قدرتی ترقی یافتہ شکل ہے، امداد باہمی کی آئندہ ترقی سب سے زیادہ امداد باہمی کی کاشت کی ترقی پر منحصر ہے یہ تبدیلی زور اور زبردستی سے نہیں بلکہ سب کی رضامندی سے کرنا ہوگی۔ اس کا فیصلہ چھوٹے زمینداروں کے ہاتھ میں ہوگا۔ شروع میں جہاں حالات موزوں ہوں گے وہاں تجربے کئے جائیں گے اور ان کے نتیجے دیکھ کر چھوٹے زمیندار فیصلہ کرسکیں گے۔ اگر وہ دیکھیں گے جیسی کہ امید ہے کہ وہ ضرور دیکھیں گے کہ مشترک انتظام سے ان گاؤں کی مجموعی پیداوار اور دولت میں اضافہ ہوا ہے جن کو تجربہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا تو وہ اپنے مخصوص حالات اور خواہشات کے مطابق اس کو آزادی کے ساتھ اختیار کرسکیں گے۔

آج کی دنیا میں جو ملک غریب ہوتا ہے اس کی کہیں کوئی سنوائی نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی آئندہ کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے گاؤں کو نئے طریقے اور نئی بنیاد پر بنائیں۔ مستقبل کے گاؤں کے لئے صرف زراعت کی خوش حالی ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس کو صنعتی نظام کے لئے بھی ایک بنیاد بننا چاہئے۔ اس دوہرے مقصد کو جب ہی حاصل کیا جاسکے گا جب گاؤں کو کسی ایسے امداد باہمی کے اصول پر جیسا کہ گاؤں کا مشترک انتظام ہے نئی تنظیم

دی جائے گی۔ موجودہ نظام میں اتنے زیادہ جھگڑے خودغرضانہ مفاد اور کمزوریاں ہیں کہ گاؤں کسی طرح اپنا پورا اثر نہیں ڈال سکتا۔ جب گاؤں سماجی اور معاشی لحاظ سے مضبوط ہو جائے گا تو وہ سیاسی نظام کے لئے بھی ایک بنیاد بن سکے گا اور اس بات سے ہماری دیہاتی آبادی کو صحیح جمہوریت اور طاقت مل سکے گی۔

برسہا برس سے ہم گاؤں کی حالت میں چھوٹی چھوٹی اصلاحوں کے بارے میں سوچتے چلے آرہے ہیں ہم نے چھوٹی چھوٹی باتیں کی ہیں، جدا جدا کام کئے ہیں یا بس باتیں بنائی ہیں۔ اس لئے ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے کہ افلاس ابھی تک ہمارے درمیان موجود ہے اور پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف اگرچہ چند آدمی دولت مند ہوتے ہیں تو ان کے مقابلہ میں ہر سال بہت سے آدمی پہلے سے زیادہ گہرے افلاس میں ڈوب جاتے ہیں۔ چند مستثنےٰ لوگوں کی مثالوں کو چھوڑ کر امیر اور متوسط طبقے کے باقی سب لوگ صرف اپنا فائدہ سوچتے ہیں۔ ہمیں نئے راستے سے اپنے مسئلوں کو حل کرنا ہے اور سماجی قوتوں کے لئے توازن کے حاصل کرنے کے لئے کام کرنا ہے۔ ہمارے کسانوں اور کام کرنے والوں میں ایک نئی روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ اثر و طاقت کا مدار ان ہی پر ہونا چاہئے۔ ہمارے سب بڑے مسئلے چاہے ان کا تعلق افلاس سے ہو یا سماجی انصاف سے، چاہے فرقہ وارانہ مفاہمت سے ہو چاہے جمہوری آزادی سے۔ سب آخر میں ایک ہی محور پر گھومتے ہیں یعنی ہماری سماج کے پورے نظام کی نئی تنظیم پر۔ اس بات کی وجہ سے بہت سے سوال پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ہم صرف ان ہی مسائل سے سرسری بحث کر سکتے ہیں جن کا تعلق ہمارے دیہاتی عوام سے ہے لیکن یہ لوگ ہماری آبادی کا پانچ بٹا چھ حصہ ہیں اس لئے ان کے مستقبل کو سب کا مستقبل سمجھنا چاہئے اور اس مستقبل کی کنجی ہے دیہات کی سماج کی از سر نو تنظیم اور اس کے ساتھ تیز رفتار کے ساتھ صنعت کی ایسی ترقی جس کا منصوبہ عوام کا فائدہ سامنے رکھ کر بنایا گیا ہو اور جس کو ان ہی کے فائدہ کو سامنے رکھ کر عملی جامہ پہنایا جائے۔ ہمیں اس بڑی تبدیلی کو بیس سال کے اندر مکمل کر لینا چاہئے۔ یہی وہ کام ہے جس کے لئے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔

روس کی معاشی ترقی

آج کا روس وہ نہیں ہے جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل رہ چکا ہے۔ اگر ہم قبل انقلاب اور بعد انقلاب کے روس کی دو تصویریں لیں تو شاید ہم یہ نہ بتا سکیں کہ یہ ایک ہی سرزمین کے دو عکس ہیں ایک وہ عکس ہے جس میں سوائے چند روشن نقطوں کے تاریکی ہی تاریکی ہے۔ دوسرا عکس وہ ہے جس میں اگرچہ کہیں کہیں پر سیاہی مائل رنگ کے نقطے نظر آتے ہیں لیکن تصویر میں ایک عام روشنی ایک عام رنگینی اور ایک عام خوشی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ تصویر کیوں کر بدل گئی؟ اس کی سیاسی تاریکی روشنی میں کس طرح تبدیل ہو گئی؟ ہم نے پیش نظر مضمون میں اسی تغیر کے تجزیہ کی کوشش کی ہے۔

قبل انقلاب کے روس کا جب ہم اس زمانہ کے ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ روس زندگی کے ہر گوشہ میں ان سے صدیوں پیچھے تھا انگلستان اور فرانس میں جب بڑے بڑے شہر قایم ہو چکے تھے، دیہاتوں کی آبادی شہروں کو منتقل ہو چکی تھی مشین کا استعمال شروع ہو چکا تھا اور انسان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے تقاضہ سے بڑے پیمانہ کی صنعتیں قایم ہو چکیں تھیں تاکہ زیادہ سستا اور اچھا مال پیدا کریں اور تعلیم و تمدن کو فروغ ہو رہا تھا تو روس کی ۸۰ فی صدی آبادی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بستی تھی اور تعلیم و تمدن اور خوش حالی کی روشنی سے محروم تھی۔ ان کے رہنے کی جگہیں عہد وسطیٰ کے گھاس پھونس کے جھونپڑے اور مٹی اور پتھر کے مکان تھے۔ ان کی کاشتکاری کے اوزار پرانے اور بھدے تھے جن سے آہستہ آہستہ اور بہت کم کام ہو سکتا تھا ان کی دنیا ان کے دیہاتوں یا آس پاس کے دیہاتوں اور قصبوں تک محدود تھی۔ آنے جانے کے لئے ٹوٹے

چھوٹے راستے یا پگڈنڈیاں استعمال ہوتی تھیں۔ نقل وحمل کے ذرائع پرانے زمانے کی گاڑیاں یا گھوڑے تھے۔ ان کی معاش کا ذریعہ صرف زمین تھی جس پر ملک کے بادشاہ، بڑے بڑے جاگیرداروں اور ان حالی موالیوں اور پادریوں کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ کی معاشی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ معدودے چند لوگوں کے لئے ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ دولت پیدا کی جائے اور باقی لوگوں کو اس دولت کے پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ باقی لوگوں کو اس دولت سے صرف اسی قدر خوشہ چینی کا حق حاصل تھا کہ وہ کسی طرح اپنی سانس کی آمدوشد کو جاری رکھ سکیں۔ ان کی حالت گویا اُن باربردار مویشیوں کی سی تھی جن سے شب و روز کام لیا جاتا ہے بغیر اس سے مطلب رکھے ہوئے کہ آیا ان کو پورا چارا بھی ملا یا نہیں۔ ان لوگوں کی زندگی کا قافلہ صدیوں سے ایک منزل پر ٹھہرا ہوا تھا ایک سے دیہات، ایک سی معاشرت، ایک سے رسم و رواج اور ایک سی زندگی۔ اس دَور کے روسیوں کی قدامت پسندی ضرب المثل کے طور پر پیش کی جایا کرتی تھی۔ اپنے باپ دادا کے عقائد میں شمہ برابر بھی تبدیلی کو وہ بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ ان کی بدحالی اور مظلومیت ان کی تقدیر تھی۔ بادشاہ، امیر اور جاگیردار اور پادری خدا کے پیارے بندے تھے۔ اس ذہنی دیوالیہ پن کی بنیادیں اس مذہبی تعلیم پر تھیں، جو اس زمانہ کے پادری دیا کرتے تھے۔ اس دَور کا مذہب دراصل ایک مقدس اور رنگین پردہ تھا جس کے پس پست ناجائز سیاسی اور معاشی مقاصد حاصل کئے جاتے تھے۔ یہ مقدس اور رنگین پردہ عوام کی آنکھوں پر انیسویں صدی کے اواخر تک پڑا رہا لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے اس کی دھجیاں اڑا دیں۔

اس زمانہ کے عوام کی ساری صلاحیتیں مفلوج تھیں اور اس کی وجہ روایات، عقائد اور غلط تمدن کی بندھن تھی اور وہ جاگیرداری تھی جو جونک کی طرح ان کے جسموں کا خون چوس رہی تھی۔ یہ معاشی، معاشرتی اور تمدنی پس ماندگی کی حالت روس پر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک طاری رہی۔ بیسویں صدی میں سرمایہ داری کے آغاز پر شہروں کی آبادی بڑھنا شروع ہوئی لیکن عام لوگوں کی حالت میں زار اور سرمایہ داروں کی خودغرضیوں کی وجہ سے کوئی بین ترقی نہ ہوسکی بلکہ شہروں کی حالت تو

بعض صورتوں میں دیہاتوں سے زیادہ ناگفتہ بہ تھی۔ غرضیکہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل دیہات اور شہر
دونوں روس کے جسم کے بڑے بڑے پھوڑے تھے مہلک، خطرناک اور زہرناک لیکن یہ پھوڑے
اب اچھی طرح پک چکے تھے اور ان کے مادۂ فاسد کے اخراج اور روس کی صحت کے لئے ان کا آپریشن
لازمی تھا۔ آپریشن کے فرائض انقلاب نے انجام دئے۔

انقلاب کے بعد روس سرتاپا بدل گیا۔ اس کا معاشی نظام، اس کی معاشرت اس کی تجارت سب
کچھ بدل گئی اور اس کی بنیادی وجہ اشتراکی نظام ہے جو پچیس سال کے اندر اندر ملک میں اچھی طرح قائم کردیا
گیا۔ اشتراکی نظام میں وسائل دولت پر چند آدمیوں کا قبضہ نہیں ہوتا۔ ساری زمین اور دیگر وسائل کو
ملک کی مشترکہ ملکیت سمجھا جاتا ہے جس کی نگرانی کے فرائض ریاست انجام دیتی ہے۔ ملک کا ہر فرد اپنی حیثیت کے
مطابق کام کرتا ہے اور پیداوار سے اپنا حق حاصل کرتا ہے۔ عقائد میں تنگ نظری، مذہبی تعصب
اور نسلی امتیازات۔ اشتراکیت کے خلاف مزاج ہیں۔ تمام دنیا کے انسان بھائی تصور کئے جاتے
ہیں۔ خیال اور اقدام کی آزادی کا پورا حق ہر فرد کو حاصل ہوتا ہے لیکن اس طرح کہ وہ مشترکہ مفاد
کے خلاف نہ ہو۔

کوئی وجہ نہیں کہ یہ نظام روس کی زندگی میں انقلاب برپا نہ کردیتا۔ ذرا تصور کیجئے اشتراکی
نظام کے تحت موجودہ روس کی زندگی کا اور اس زندگی کا جو زارشاہی کے زمانہ میں تھی۔ ایک طرف
جنت ہے تو دوسری طرف جہنم۔ ایک طرف روشنی ہے تو دوسری طرف تاریکی۔

روس نے پچھلے پچیس سال میں جو معاشی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی ہے، اس کی ایک
اور بڑی وجہ اس کی منصوبہ بند معیشت ہے۔ معاشی ترقی کا یہ طریقہ ایک شعوری طریقہ ہے جس میں
ملک اپنے سارے وسائل کو پیش نظر رکھ کر یہ طے کرتا ہے کہ اسے ایک خاص مدت میں کس قدر
بڑھ جانا چاہئے۔ اس طریقہ کار کی افادیت اب مسلّم ہوگئی ہے اور دوسرے ملکوں نے بھی ڈرتے
ڈرتے اب اس کو اختیار کرنا شروع کردیا ہے۔ انگلستان میں بعد جنگ کی تعمیر کے لئے ایک
پنج سالہ پلان بنایا جارہا ہے۔ امریکہ میں بھی اس سسٹم پر بحث ہو رہی ہے لیکن ان میں سے کسی ملک میں

بھی فی الحال اس کی کامیابی کی امید نہیں کیونکہ یہاں سرمایہ داری اور ذاتی ملکیت موجود ہے۔ اس کے برعکس سوویٹ یونین میں نفع اندوزی اور طبقہ وارانہ تصادم کو ختم کر دیا گیا ہے اور تمام پیداوار عوام خود اپنے لئے پیدا کرتے ہیں۔ مرکزی منصوبہ بندی صرف عوام کی مشترکہ ملکیت اور نگرانی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

موجودہ روس میں ہر شہری اور دیہاتی کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے مناسب ماحول عطا کیا جاتا ہے۔ تعلیم عام اور مفت ہے۔ روسی عورتیں جو انقلاب سے پہلے آبادی کا سب سے مظلوم مجہول اور ناکارہ طبقہ تھیں اب روسی مردوں کے دوش بدوش زندگی کے ہر شعبہ میں حصہ لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے وجود کی برکتوں سے آج کھیت، دفتر، اسکول، کارخانے حتیٰ کہ میدان جنگ تک خالی نہیں۔ حال ہی میں مشہور انگریز ناولسٹ پریسٹلے کی بیوی نے روس کا دورہ کیا۔ انہوں نے ایک مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں روس سے زیادہ عورتوں کو ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔

زراعت و صنعت میں جدید تکنیک کے استعمال نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ صنعتی اور زرعی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ روسی سائنس نے بھی اس عرصہ میں بڑی ترقی کی ہے۔ آج روس میں ایسے گیہوں کے پودوں کو اگایا جاتا ہے جن سے تین تین سال تک فصل کاٹی جا سکتی ہے۔ روس نے جنگ عالمگیر کے آخری دور میں نازیوں کے خلاف جو ٹینک اور توپیں استعمال کیں وہ نازیوں کے ٹینکوں اور توپوں سے بدرجہا بہتر تھیں۔ آج کل کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) کی خبروں نے دوسرے ملکوں کے کان کھڑے کر دئیے ہیں۔

زار کے عہد کے وہ دیہات جہاں گھاس پھوس اور مٹی کے جھونپڑے نظر آتے تھے اب خوبصورت علاقوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ شہر، بڑی بڑی عمارتوں، کشادہ سڑکوں اور پارکوں سے پر ہیں۔ جنوبی اور مشرقی علاقوں کی پسماندہ جمہوریتیں جو زار کے زمانہ میں بدوی اور خانہ بدوش لوگوں کے مسکن تھیں سب بتدریج [illegible] مکمل علاقوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ تعلیم کے عام ہونے کی بدولت

ہے کہ زار کے عہد کے بے پڑھے جاہلوں کو نوشت وخواند سے واقف کرادیا گیا ہے۔ غرض زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس میں پچیس سال کے اندر اندر ایک عظیم الشان اور حیرت انگیز انقلاب برپا نہ ہوگیا ہو آج روس ہر حیثیت سے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہونے کا حقدار ہے۔ اس نے اس جنگ میں فاشزم جیسی خوفناک اور مادی اعتبار سے ٹھوس قوت کو شکست دے کر اپنے ملک کے بہتر نظام اور اس کے لئے اس کے عوام کی محبت اور اعتماد کو ثابت کر دکھایا ہے۔

روس جس تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کل کیا لیل ونہار ہوں گے۔

منہاج محمد خاں

ادبِ اردو کا بہترین سرمایہ

اس زمانے میں لکھنؤ کی شاعری کے معائب کا افسانہ اسقدر بار بار دُھرایا گیا ہے کہ کسی شخص کا خیال لکھنؤ کی شاعری کے محاسن کی طرف رجوع نہیں ہوتا لیکن حقیقتاً یہ یکطرفہ فیصلہ ہے، جو بغیر تحقیق و تفتیش کے کیا گیا ہے۔

لکھنؤ کی شاعری کا اصل دَور شیخ امام بخش ناسخ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ رہی تھی جس کا تمام تر دارُ مدار جدت، لفا اور لطافت پر تھا شاعری بھی ہر دَور کے تمدن کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس سلئے اس تمدنی جدت کا اثر شاعری پر بھی پڑا اور شیخ امام بخش ناسخ نے قدیم اُردو شاعری کا ڈھانچہ بالکل بدل دیا اور شعرائے قدیم کی سادہ روش کو کُلیتہً بدل کر ایک جدید شاعرانہ روش قایم کی جس میں انتہا درجے کی نازک خیالی پائی جاتی ہے۔ لکھنؤ کی ہر چیز جس میں اس وقت جدت پیدا کی جارہی تھی، شیخ ناسخ کی شاعری اس کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

شعر لفظ و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اور شیخ ناسخ نے ان دونوں میں تبدیلی پیدا کی۔ لیکن جہاں تک معنوی تبدیلی کا تعلق ہے وہ اگرچہ عام طور پر پسند نہیں کی گئی تاہم انہوں نے الفاظ و محاورات اور ظاہری قالب میں جو تغیرات پیدا کئے اُس کو تو تمام دنیا نے پسند ہی کیا، اور بعد کی نسل نے شیخ ناسخ ہی کی اصلاح کردہ زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔

اُردو زبان کا اصلاحی دَور اگرچہ شاہ حاتم ہی کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا، اور مصحفی و انشاء کے زمانے تک برابر زبانِ اُردو کی اصلاح کا کام جاری رہا۔ مگر ان اصلاحات

خود ان خطوط کا عمل نہ تھا بلکہ ان کی توجہ زیادہ تر مضامین کی طرف تھی اور جب کوئی نیا مضمون ہاتھ آجاتا تھا تو وہ الفاظ کی بہت کم پرواہ کرتے تھے۔ مگر شعرائے لکھنؤ کے سرتاج شیخ ناسخ نے ہر زمانے کے قابل اصلاح الفاظ کی اصلاح کی اور خود ان اصلاحات پر شدت سے عمل بھی کیا جس لفظ کو انہوں نے اختیار کر لیا ہمیشہ اس کے پابند رہے۔

شیخ ناسخ کی ان اصلاحات نے لکھنؤ کی زبان کو ایک ٹکسالی زبان بنا دیا۔ چنانچہ غالب نے ایک موقع پر دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے متعلق رائے ظاہر کی ہے کہ:۔

"دلی کا مضمون اور لکھنؤ کی زبان مستند ہے۔"

شعرائے دورِ جدید بھی لکھنؤ کی اس فضیلت کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ حسرت موہانی جو دورِ جدید کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگ دلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

اصلاح زبان کے ساتھ ساتھ شیخ ناسخ نے شعر کی ظاہری قالب کو چند اصولوں کے سانچے میں ڈھال کر نہایت سڈول اور خوشنما بنا دیا۔ انہوں نے:۔

۱۔ عروض و قافیہ کے اصول کی کی شدت سے پابندی کی۔

۲۔ علم معانی و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصول کے موافق تنافر و غرابت اور تعقید سے کلام کو پاک کیا۔

۳۔ شعر کی بندش میں زائد اور بھرتی کے غیر ضروری الفاظ سے شدت کے ساتھ اجتناب کیا۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ غزل کی زمینوں میں بھی تصرف کیا اور ردیف کی بنیاد حروف روابط "کا"۔ "کے"۔ "کو"۔ "سے"۔ "نے"۔ "پر"۔ "تک"۔ اور حروف اثبات و نفی "ہے" اور "نہیں" پر رکھی۔ اس لئے قدرتی طور پر نئی نئی شگفتہ زمینیں پیدا ہو گئیں جن پر

خود شیخ ناسخ کو فخر ہے۔

سب زمینیں ہیں نئی، بیتیں بھی اے یار نئی
روز یاں ریختہ کی اٹھتی ہے دیوار نئی (ناسخ)

شیخ ناسخ کے ان احسانات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ جو کچھ ان پر اعتراض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے معنی سے زیادہ لفظی صناعیوں کی طرف توجہ کی، جس کی وجہ سے غزل اپنے حقیقی عناصر یعنی جذبات و احساسات سے بے بہرہ رہ گئی۔ لیکن ناسخ ہی کے مدمقابل اسی زمانے میں خواجہ آتش بھی تھے جنہوں نے اس معنوی کمی کی بہت کچھ تلافی کردی اور غزل میں ایسی اچھی اچھی خصوصیات پیدا کیں جنہوں نے ان کے کلام کو مقبول عام بنا دیا۔

خواجہ آتش رندانہ مضامین کو اس جوش و مستی سے ادا کرتے ہیں کہ خواجہ حافظ کے لب و لہجہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

جہان و کار جہاں سے ہوں بیخبر میں مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم (آتش)

آتش کے کلام میں ایک فقیرانہ و آزادانہ و آزادانہ شان پائی جاتی ہے، اور وہ توکل و قناعت اور فقر و فاقہ کے مضامین کو اس جوش سے ادا کرتے ہیں کہ ان کو سن کر دنیا ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے۔

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پسارئیے (آتش)

ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

ہم فقیروں کو ہے دیوار کا سایہ کافی
خوش رہیں وہ کہ جو خسخانوں میں آرام کریں

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جذبات و احساسات بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے خاص

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

خواجہ صاحب کی اس عام مقبولیت کو دیکھ کر آخر عمر میں شیخ ناسخ نے بھی وہی روش اختیار کر لی، اس لئے ان کے آخری عمر کے کلام میں صفائی، شستگی، سادگی، برجستگی اور جوشِ اثر سب کچھ موجود ہے۔ اب اگر شیخ ناسخ اور خواجہ آتش دونوں کی شاعری کو پیشِ نظر رکھ کر لکھنؤ کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے ان میں خوبیوں کی کوئی کمی نظر نہ آئے گی۔ ناسخ اور آتش کے بعد اُن کے تلامذہ نے بھی بہت سی اصلاحیں کیں مثلاً:۔ ۱۔ عربی و فارسی زبان کے الفاظ و ترکیبوں کو بہت کم استعمال کیا جس سے اُردو زبان بالکل خالص و بے میل ہوگئی۔

۲۔ اُردو زبان میں ہندی الفاظ مصطلحہ و مستعملہ فصحا کو داخل کیا۔

۳۔ "خال وخط"۔ "گل و بلبل" اور "سرو و قمری" وغیرہ کا ذکر کم کیا جس سے اُردو شاعری کو ایرانی اثر سے آزادی کا موقع ملا۔

۴۔ استعارہ اور مبالغہ سے بہت کم کام لیا اور اُردو شاعری میں سادگی پیدا کی۔ رند کہتے ہیں:۔

بہتر جو استعارہ و اغراق سے نہیں
پھر کیوں پسندِ خلق مری سادہ گوئی ہے

۵۔ غزل کے حقیقی معنی کا خیال رکھا۔ اس میں تغزل کا رنگ پیدا کیا اور غزل میں صرف عاشقانہ رنگ کے شعر لکھے ؎

مضمون پیدا رہیں مکروہ اے صبا
اشعار ہر زمیں میں ہیں عاشقانہ فرض (میر وزیر علی صبا)

۶۔ رعایتِ لفظی میں لطافت پیدا کی۔

خواجہ آتش کے ایک شاگرد آغا حجو شرف نے فارسی زبان کے ان تمام متداول الفاظ کو چھوڑ دیا جنہوں نے اردو شاعری کو رندی و ہوسناکی بلکہ الحاد و بے دینی کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ مثلاً انہوں نے "بت، صنم، کلیسا، بت خانہ، برہمن، ناقوس، زنار، زاہد، واعظ، ناصح شیخ، پیرِ مغاں، مغبچہ، ساقی، رند، ساغر و شیشہ، قلقل و مینا اور شراب" جیسے الفاظ کو چھوڑ دیا۔ ان اصلاحات نے خواجہ آتش کے رنگ کو اور بھی شوخ کر دیا، اور تمام شعرائے لکھنؤ اسی رنگ میں کہنے لگے، اور اسی رنگ کی ایک خصوصیت یعنی سلاست و روانی اور برجستگی نے شعرائے دلی میں مومن و غالب اور ذوق کے تلامذہ کو بھی متاثر کیا۔ شیفتہ، میر مہدی حسن مجروح، نواب مرزا داغ اور انور دہلوی کے کلام میں جو صفائی، سادگی اور برجستگی پائی جاتی ہے وہ یقیناً تلامذہ آتش کی تقلید ہی کا فیض ہے۔

اس کے بعد میر انیس و مرزا دبیر نے مرثیہ گوئی کے ذریعہ جو غیر فانی خدمت انجام دی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ انہوں نے اس کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ شاعری کی کسی صنف میں کوئی اگر طبع آزمائی کرنا چاہے تو ان کی سادگی و لطافت، سلاست و روانی اور تشبیہ و استعارہ کی قایم کردہ روش سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکل سکتا۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر لکھنؤ نے اردو زبان کی کوئی خدمت نہ انجام دی ہوتی بلکہ صرف انیس و دبیر کو پیدا کر دیا ہوتا تو ہم بجا طور سے کہہ سکتے تھے کہ "لکھنؤ کی شاعری اردو ادب کا بہترین سرمایہ اور غیر فانی معجزہ ہے"۔

(مشیر الحق۔ بجری آبادی)

آج

یہ کون ادائے خاص سے پہلو نشیں ہے آج
دنیائے حسن عشق کے زیرِ نگیں ہے آج

پامالیوں کو اوجِ ثریا نصیب ہے
قبضے میں مشتِ خاک کے مہر مبیں ہے آج

فیضِ قدم تو دیکھئے کافر جمال کا
کعبے سے بڑھ کے اوج میں دل کی زمیں ہے آج

مہکے ہوئے ہیں ارض و سما بوئے زلف سے
یوں دوش پر وہ سلسلۂ عنبریں ہے آج

شبنم فشاں عرق سے رُخِ لالہ فام ہے
قشقے سے گل فروش بیاضِ جبیں ہے آج

جیسے کنول کا پھول ڈبو دو شراب میں
چہرہ فروغِ بادہ سے یوں احمریں ہے آج

شہد و شباب و شعلہ و شبنم لئے ہوئے
آلودۂ شراب لبِ شکریں ہے آج

پڑتی ہے چھوٹ آئینۂ آفتاب پہ
تابانیِ جمال کی کچھ حد نہیں ہے آج

اللہ رے جوشِ حسن کہ از فرق تا قدم
دیکھو نگاہ بھر کے جہاں دل وہیں ہے آج

"تلخابۂ حیات" میں ہے "چاشنیِ مے"
"زہر آبِ غم" میں "ذائقۂ انگبیں" ہے آج:

دل اُس نگہ کے ناز اٹھانے میں محو ہے
کہہ دو غمِ جہاں سے کہ "فرصت نہیں ہے آج"

چھائی ہوئی ہے قربتِ جاناں کی دل کشی
جس شے کو کائنات کی دیکھو حسیں ہے آج

وہ اور دل کے پاس یہ کیا انقلاب ہے
محور سے اپنے دور تو دنیا نہیں ہے آج

کس راستے کے موڑ پہ دل ہے کسے خبر
منزل کہیں میانِ گمان و یقیں ہے آج

آ موت اور عشق کو اب جاوداں بنا
جینے کی دل میں اور تمنا نہیں ہے آج

سرکشش عسکری۔ طباطبائی

غزل

عیشِ انجامِ غمِ پیہم نہ ہو | پھر مزاجِ زندگی برہم نہ ہو

لذتِ افسانۂ غم کم نہ ہو | زخمِ دل شرمندۂ مرہم نہ ہو

دیکھنا ہے عالمِ صبحِ بہار | خندۂ گل گریۂ شبنم نہ ہو

حسن سرگرمِ نوازش ہو نہ ہو | عشق خود پابندِ کیف و کم نہ ہو

کام آجائیں نہ یہ ناکامیاں | قصرِ امید اور مستحکم نہ ہو

المدد اے جوشِ جذبِ آرزو | ماورائے دل کوئی عالم نہ ہو

غنچۂ ناواقفِ رمزِ حیات | یہ تبسم پردہ دارِ غم نہ ہو

کم نہ ہو یعقوب ذوقِ جستجو

سعیِ لاحاصل ہی حاصل ضم ہو

محمد یعقوب لکچرر عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

شیوخ کی برادری

اس برادری[1] کو سہارنپور کے عوام نومسلموں کی برادری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔لیکن اس برادری کے لوگ پشتہا پشت سے مسلمان چلے آرہے ہیں۔برادری کی تاریخ کو منشی محمد حنیف صاحب حسین پوری نے "نسب نامہ خاندان" کے نام سے مرتب کیا ہے۔اس کتاب میں ان قبائل شیوخ کے نسب نامے درج ہیں جو حسین پور، بنت، عمر پور، مظفر نگر، سہارنپور، کرنال، شاہپور، سراوہ، ہاپڑ، بڈھانہ، گنگوہ وغیرہ میں آباد ہیں۔ اور جن میں باہم رشتہ داری قایم ہے۔اس کے علاوہ رسالہ پیام اتحاد میں بھی جو سہارنپور سے نکلتا تھا، اس برادری کے متعلق حالات چھپتے رہے ہیں۔

یہ سہارنپور کے مسلمانوں میں نہایت تعلیم یافتہ، شائستہ، صالح اور مرفہ الحال برادری ہے۔اس برادری کے لوگ زیادہ تر محلہ کھالہ پار میں آباد ہیں، اس کے علاوہ محلہ چوک میں دو گھر ہیں، محلہ کہیڑہ میں ایک جھوٹے والا میں دو، محلہ میر گنج میں دو، اور محلہ ہرن ماران میں ایک گھر ہے برادری کے افراد کی کل تعداد شہر سہارنپور میں چھ سو ہوگی، جن میں شادی شدہ درج فہرست ممبروں کی تعداد ایک سو پچیس ۱۲۵ ہے۔

لڑکوں کی تعلیمی حالت بہت اچھی ہے۔ ہر گھر میں انٹرنس پاس موجود ہیں۔ جو صاحب وسعت ہیں وہ یونیورسٹی کی تعلیم بھی حاصل کرچکے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد پندرہ سولہ ہے۔برادری

[1] اس برادری کے بارے میں حالات محمد فاروق صاحب، ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول، اور محمد ظفر صاحب وکیل کی معرفت معلوم ہوئے، جو برادری کے سرگرم کارکن اور ممتاز افراد ہیں۔

برادری میں چار حکیم ہیں۔ چھ سول انجینرنگ کے محکمہ میں ہیں۔ (کچھ انجینر، کچھ اوورسیر، کچھ ڈرافٹس مین)۔ عربی مدرسے کے پڑھے ہوئے بھی تین چار ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم دو سال پہلے تک گھروں پر ہی ہوتی تھی۔ اور دینیات اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موجودہ زنانہ مدرسوں کے انتظام سے اہل خاندان کو اطمینان نہیں تھا۔ لیکن دو سال سے ایک اپنا زنانہ اسکول قایم کر لیا گیا ہے۔ جس میں لوئر مڈل کے معیار تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ارادہ اپر مڈل کلاسیں کھولنے کا ہے۔ اب یہ خواہش ہو گئی ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم بھی لڑکیوں کو خاطر خواہ دلائی جائے۔

برادری میں پڑھے لکھے لوگ مردوں میں سو فی صدی اور لڑکیوں میں ننانوے فی صدی ہیں۔ عام طور پر ننانوے فی صد پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ بری عادتیں کوئی نہیں ہیں۔ شادی بیاہ صرف آپس میں ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر شہر کی برادری ہی میں ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی باہر کے ان خاندانوں میں بھی ہوتا ہے جن کا تعلق یہاں سے قایم ہے۔ لیکن عام طور پر باہر رشتہ کرتے ہوئے تامل کرتے ہیں۔

اوسط عمر عورتوں کی ۵۲ سال اور مردوں کی ۵۴ سال ہے۔ تندرستی کی عام حالت اچھی ہے۔ بچوں کی تعداد میں اضافہ ہے۔ بچوں میں شرح اموات کم ہے۔ عورتوں میں زچگی کے زمانہ میں شرح اموات کم ہے۔ پانچ چھ مرد خاندان میں ایسے رہتے ہیں جو اسّی سال کی عمر تک پہنچتے ہیں۔ لیکن عورتیں ساٹھ سال سے زیادہ نہیں بڑھتیں۔

برادری کا نظام پہلے سے زیادہ مستحکم اور مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ برادری کے افراد نظام کو اور زیادہ مستقل بنانے کی کوشش میں ہیں۔ اور رسومات میں اصلاح کر رہے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر رسماً اور اخلاقاً ساری برادری کو دعوت دینی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اور چونکہ ننانوے فی صد صاحبِ استطاعت ہیں، اس لئے سب لوگ ساری برادری کو مدعو کرتے ہیں۔ لیکن برادری کے افراد کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ جو صاحبِ استطاعت نہیں ہیں۔ انھیں معاف رکھا جاتا ہے۔ اس برادری اور اس کی شاخوں نے مل کر ۱۹۲۳ء میں ایک انجمن قایم کی جو چھ سال کام کرنے

کے بعد چند وجوہات کی بنا پر ختم ہو گئی۔ اس کی طرف سے ایک رسالہ "پیام اتحاد" بھی جاری کیا گیا تھا۔ یہ انجمن آل انڈیا حیثیت رکھتی تھی، اور جناب زاہد حسن صاحب جو آج کل گورنمنٹ آف انڈیا کے فنانس ڈیپارٹمنٹ میں ممتاز عہدہ پر ہیں، اس کے روح رواں تھے۔

۱۹۴۰ء میں مقامی طور پر اس انجمن کو "انجمن اتحاد" کے نام سے دوبارہ زندہ کیا گیا اور اس کے تحت میں اسکول، لائبریری، زکوٰۃ فنڈ اور مشترکہ سامان (شادی بیاہ کے موقع کے لئے) امداد بیوگان وغیرہ شامل ہے، جھگڑوں کو بھی عدالت سے باہر طے کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اہل برادری میں باہم اتفاق اور اتحاد کی حتی الوسع ہر ممکن ذرائع سے کوشش کرنا۔

(۲) اہل برادری کے طرز معاشرت کو پابند اسلام بنانے کی کوشش کرنا (۳) ان تمام رسومات اور خصائل کو جو مطابق احکام اسلام نہ ہوں، ترک کرنے کی ترغیب دینا۔ (۴) لڑکے اور لڑکیوں کو جائز دینی اور دنیوی تعلیم دینے کی ضرورت محسوس کرانا (۵) اہل برادری کے لئے تقریبات میں ضروری سامان از قسم ظروف، دری، قالین، سامان روشنی وغیرہ مہیا کرنے کی کوشش کرنا (۶) ضرورت مند افراد برادری کی بشرط گنجائش فنڈ مالی امداد کرنا (۷) بشرط گنجائش فنڈ اہل برادری کے لئے قبرستان کے واسطے آراضی خریدنے کی کوشش کرنا (۸) زکوٰۃ فنڈ قایم کرنا اور اس کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کرنا۔

اس "انجمن اتحاد" کی سالانہ روئدادوں اور مدرسہ تعلیم نسواں کی رپورٹوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کا کام بہت خوبی اور خوش اسلوبی، مصالحت اور ہم آہنگی کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔

اس انجمن سے پہلے کوئی سرپنچ یا میر محلہ نہیں تھا۔ اب انجمن کے صدر ہی یہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

اس برادری کے لوگ زیادہ تر سرکاری ملازم ہیں۔ ملازمتیں ڈپٹی کلکٹری سے لے کر

ڈاک خانہ اور ریلوے کے کلرکوں تک ہر قسم کی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا نمبر زمینداری کا ہے۔ چار وکیل ہیں۔ تجارت کسی خاص بڑے پیمانہ پر نہیں ہے۔ چھوٹے پیمانہ پر صرف چار پانچ دکانیں چلائی جارہی ہیں۔

برادری کے مندرجہ ذیل لوگوں کو ممتاز حیثیت حاصل ہے، اور ان میں سے سب کے پاس کچھ نہ کچھ زمینداری ہے۔

۱۔ مولوی فضل الرحمٰن صاحب چیرمین میونسپل بورڈ، خان بہادر، رئیس صحرائی اور رکنائی جائداد کے مالک۔

۲۔ شیخ محمد عسکری صاحب، رئیس میونسپل کمشنر۔

۳۔ طفیل احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر و رئیس۔

۴۔ محفوظ الحق صاحب ریٹائرڈ نائب تحصیلدار و زمیندار۔

۵۔ محمد رضی صاحب، نائب تحصیلدار و زمیندار

۶۔ اکرام الحق صاحب ریٹائرڈ انجینیر نہر و زمیندار

۷۔ انعام الحق صاحب، رجسٹرار و زمیندار

۸۔ حاجی عبدالجمیل صاحب مختار عدالت۔

۹۔ رضوان الحق صاحب، وکیل۔

۱۰ محمد ظفر صاحب، وکیل۔ جنہوں نے اس تحقیق کے کام میں بہت امداد فرمائی۔

۱۱۔ حافظ عبدالرشید صاحب وکیل۔

۱۲۔ محمد خلیل صاحب، مختار۔

۱۳۔ محمد فاروق صاحب ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول جنہوں نے اس تحقیق کے کام میں بہت امداد فرمائی۔

۱۴۔ طاہر حسین صاحب کوٹلہ، گراموفون کی دوکان۔

۱۵۔ حکیم محمد ادریس صاحب، بہت اچھا نجی مطب ہے۔ اور یونانی شفاخانہ میونسپل بورڈ کے انچارج ہیں۔

۱۶۔ حاجی مسعود حسن صاحب، زمیندار

۱۷۔ حاجی محمد قاسم صاحب۔ زمیندار

برادری کے لوگوں میں دو تین کی حیثیت ایک لاکھ اور دس لاکھ کے درمیان ہے، دو تین کی پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان ہے۔ چھ سات ایسے ہوں گے جن کی حیثیت دس ہزار اور اور پچاس ہزار کے درمیان ہے اور تقریباً سب ایسے ہیں جن کی حیثیت ایک ہزار اور دس ہزار کے درمیان ہے برادری کے افراد کا ۷۰ فی صدی سرمایہ صحرائی جائداد میں لگا ہوا ہے۔ بیس فی صدی سکنائی جائداد میں ہے۔ اور باقی یعنی دس فی صدی زیور، نقدی، سواری اور مکان کے ساز و سامان کی صورت میں ہے۔ برادری کے لوگ نہ کسی کو سود دیتے ہیں نہ کسی سے لیتے ہیں۔

برادری کے لوگوں کا خرچ کرایہ مکان پر مشکل سے ایک فی صد کا ہوگا۔ کیونکہ سب کے پاس ذاتی مکان ہیں۔ آمدنی کا تقریباً ۶۰ فی صد کھانے پر خرچ ہوتا ہے ۲۰ فی صد کپڑوں پر، دس فی صد تعلیم وغیرہ پر اور بقیہ دس فی صد متفرقات پر۔

شادی بیاہ کی تقریبوں میں خرچ کا اوسط لڑکے کے لئے تین چار ہزار اور لڑکی کے لئے پانچ چھ ہزار ہے پیدائش سے موت تک کی تقریبیں بہت محدود ہیں۔ رسومات قبیحہ بہت کم ہیں اور جو ہیں ان کے بھی مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

عام طور پر برادری کے لوگ مقروض نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو آپس کے لوگوں کے قرض دار ہیں۔ مالی حالت کے لحاظ سے برادری کی حالت ایک جگہ ٹھہری ہوئی سی ہے نہ خاص ترقی ہے نہ خاص تنزل نہ کسی خاص جماعت سے مقابلہ ہے نہ باہر کے لوگوں سے لین دین ہے۔ نہ باہر کے لوگوں کے پابند ہیں۔

شیخ زادوں اور سیدوں کی برادری

ہم نے سہارنپور کے شیخ زادوں اور سیدوں کو ایک ہی برادری میں اس لئے رکھا ہے کہ ان کے درمیان مناکحت اور خاندانی تعلقات کا سلسلہ جاری ہے۔ شیعوں اور سنیوں میں بھی تفریق کرنا ہم نے اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ عقائد کے اختلاف کے باوجود شیعوں کے ممتاز خاندانوں کا تعلق اصلیت کے لحاظ سے شیخ زادوں اور سیدوں کی اسی برادری سے ہے، اور بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ سال پہلے تک دونوں کے درمیان مناکحت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سیدوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، اور شیعہ و سنی دونوں طرح کے سید زیادہ تر محلہ مفتیان، محلہ میر کے کوٹ اور محلہ سادات میں آباد ہیں۔ شیعہ شیخ زادے زیادہ تر محلہ انصاریان اور محلہ شاہ ولایت میں اپنے سنی بھائی بندوں کے پہلو بہ پہلو آباد ہیں۔

اس برادری کے عربی النسل ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ اس برادری کے افراد میں مسلمان بادشاہوں کے زمانہ سے اولیاء اللہ، مشائخ، قاضی، مفتی، مفسر، محدث، فقیہ، مجتہد، شاعر، صوفی، طبیب، حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار مثلاً صوبہ دار، جاگیردار اور معافی دار رہتے چلے آئے ہیں۔ برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے بعد بھی اس برادری کے بہت سے افراد ڈپٹی کلکٹر، تحصیلدار، کوتوال، تھانہ دار، سررشتہ دار، عدالت دیوانی و فوجداری، ڈپٹی ممبر سب رجسٹرار، منصف، خان بہادر، آنریری مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کلکٹر، میونسپلٹی کے پریسیڈنٹ، مجلس قانون ساز کے رکن اور گورنمنٹ کے دفتروں میں اور دوسری حیثیت سے ملازم رہے ہیں۔ حیدرآباد بھوپال اور دوسری ریاستوں میں بھی اس برادری کے لوگ بڑی اور چھوٹی ملازمتوں پر مامور رہے

طبابت کے خاندانی سلسلے کو جاری رکھا ہے۔ کامیاب وکیل اور مختار بھی ہوئے ہیں۔ عربی درسگاہوں کے استادوں، یونیورسٹی کے پروفیسروں اور مدرسوں کے معلموں میں بھی ان کی تعداد اچھی رہی ہے۔

اسی برادری کے افراد سہارنپور اور اس کے ملحقہ پرگنات مثل گنگوہ، بیہٹ، منگلور میں ایک مدت سے قاضی چلے آرہے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شاہجہاں یا اس سے پہلے کے زمانے میں یہ لوگ قاضی کے عہدے پر مامور کئے گئے تھے۔ قاضیوں میں لائق ذکر نام قاضی القضاۃ محمد اعظم کا بیان کیا جاتا ہے جن کے نام پر سہارنپور کے محلہ قصاۃ کا نام پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں معافی کی زمینیں اکبر اور جہانگیر کے زمانے سے ملی ہوئی تھیں۔ دوسرا نام شیخ کمال الدین کا بیان کیا جاتا ہے۔ انھیں کے ہم عصر ایک اور بزرگ شیخ امام الدین بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ چوتھا خاندان محمد محسن صاحب کا ہے۔ جس سے سہارنپور کے موجودہ قاضی صاحب کا تعلق ہے۔ ان خاندانوں میں طبیب بھی برابر رہتے چلے آئے ہیں۔ سید اعظم عرف معظم کے خاندان میں شاہجہاں کے زمانے سے مشہور مفتی ہوتے چلے آئے ہیں۔ جس کی وجہ سے جس محلہ میں یہ خاندان آباد ہے اس کا نام محلہ مفتیان ہو گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کے مفتیوں کو شاہانِ دہلی کی طرف سے برابر خلعت ملا کرتا تھا، اور ان کے نام معافیاں اور جاگیریں تھیں۔ اس خاندان میں بھی طبیبوں کا سلسلہ برابر چل رہا ہے۔ محلہ میر کے کوٹ کا نہایت ممتاز، دولتمند اور ذی علم شیعہ خاندان جسے احسان علی والوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اپنی اصلیت کے لحاظ سے اسی مفتیوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شاہ عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ۔ شاہ سید عبدالمعالی صاحب انبیٹھوی حاجی امداد اللہ صاحبؒ۔ مولوی محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی بانی مدرسہ دارالعلوم دیوبند۔ مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی۔ مولوی احمد علی صاحبؒ محدث سہارنپوری مولوی فیض الحسن صاحب فیض سہارنپوری، مولوی طیب صاحب انصاری ناظم دارالعلوم دیوبند

خواجہ مختار حسن صاحب مجتہد، حکیم الطاف حسین صاحب آزاد سہارنپوری کا تعلق بھی اسی برادری سے ہے

اس برادری کے بارے میں محمد احمد صاحب صدیقی رسوا وارثی نے ہمیں کچھ حالات قلم بند کرکے عنایت فرمائے۔ اس کے علاوہ کچھ حالات دوسرے اصحاب مثلاً قاضی ظفر احمد صاحب، قاضی مظہر الحق صاحب، مولوی حاجی محمد کاظم صاحب، حکیم سید محمد حسنین صاحب۔ جناب ظفر علی صاحب، مصاحب خاص نواب صاحب مالیرکوٹلہ۔ بابو ثناء احمد صاحب انصاری، حافظ محمد یوسف صاحب انصاری کے ذریعہ معلوم ہوئے۔ یہ سب حضرات اسی برادری کے ممتاز رکن ہیں۔

اس برادری کے بارے میں ہمارے پاس کافی مواد موجود ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے ہم صرف محمد احمد صاحب صدیقی کے تحریری بیان کو بجنسہ نقل کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ "روایتاً معلوم ہوا ہے۔ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانۂ خلافت میں شیوخ عرب کے بعض غازیان عرب کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور اولاً سندھ کے کسی حصہ میں سکونت پذیر ہوکر یو، پی اور اودھ کے شہروں تک پھیل گئے۔ سرزمین یو، پی و اودھ میں بعہد شاہان مغلیہ ان کو جاگیریں اور قضاۃ کے عہدے عطا کئے گئے۔ جس سے سندھ کی سکونت ترک کر کے یہ برادری کلیتہً یو، پی و اودھ میں آباد ہوگئی۔ اور سندھ میں ان کی برادری کا کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ساتھ ان کی عورتیں بھی عرب سے آئی تھیں۔ لیکن زمانے کے تغیرات کے ساتھ ان میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوتی گئیں۔ جاگیریں ان کی عیش پسندی کے نذر ہونے لگیں۔ اولاد کثرت سے پیدا ہوتی رہی۔ وراثتیں تقسیم ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد وہ مٹھی بھر شیوخ جو روایتاً سات خاندانوں پر مشتمل ہندستان میں عرب سے آئے تھے۔ ایک کثیر برادری کے مالک ہوگئے۔ وراثتوں کی ہر دور میں کثرت تقسیم نے ان میں افلاس کو رونما کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض نے مال و زر کی لالچ میں نومسلم عورتوں سے شادی بیاہ کر لئے اور اس طرح وہ ان شیوخ کی نظروں سے جو اب تک نجیب الطرفین ہی تھے گر گئے اور رفتہ رفتہ اس برادری کی تقسیم تین اقسام پر ہوگئی۔ ایک وہ جو نجیب الطرفین رہے۔ دوسرے وہ جن کی شادیاں نومسلم مستورات سے ہوئیں۔ تیسرے وہ جنہوں نے غربت کی وجہ سے اپنی بیٹیاں

نومسلموں کو بیاہ دیں۔ دوسری قسم والوں نے اس لحاظ سے کہ نسل باپ سے چلتی ہے خود کو اس ہی برادری میں شامل رکھا۔ تیسری قسم کی اولاد کے رشتہ و بیاہ چونکہ دوسری قسم میں ہونے لگے۔ اس لئے وہ بھی شیوخ کی برادری میں شامل ہو کر شیخ زادہ کہلانے لگے۔ یہاں مختصر سی وضاحت اس لفظ شیخ زادہ کی بھی کی جانی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ تاکہ شیخ زادہ کی وجہ اصلی معلوم ہو سکے۔ شاہان مغلیہ کے زمانے میں اور اس سے کچھ پہلے بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی صرف تین برادریوں کا اجتماع تھا جس میں شیخ مغل، اور پٹھان شامل تھے شیخوں کی اولاد کو شیخ زادہ، مغل کو مغل زادہ، پٹھان کو پٹھان زادہ کہا جایا کرتا تھا اور یہ الفاظ محض قومیت کے امتیاز کے نشان تھے۔ رفتہ رفتہ مغل اور پٹھان تو خالص مغل اور پٹھان ہی کہلائے لیکن شیوخ سلف کی اولاد کو برابر آج تک شیخ زادہ کہا جا رہا ہے۔ ان میں اولیاءاللہ وغیرہ بھی پیدا ہوئے۔ اور ہر ولی کا حلقہ بیعت وسیع ہوتا تھا۔ اور اصطلاح طریقت و شریعت میں شیخ، پیر و مرشد کو بھی کہتے ہیں، ان کی اولاد شیخ زادہ کہلائی۔ لیکن شیخ زادہ کا لفظ صرف ہندوستان میں ہی رائج ہے۔ دیگر ممالک اسلامیہ میں یہ کسی قومیت کا نشان نہیں مانا جاتا۔ لفظ زادہ زبان فارسی کا لفظ ہے۔ اس لئے اس کا استعمال ایران میں بھی کسی خاص برادری میں نہیں ہے۔ ایک اور تاویل بھی اس لفظ کی کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ رسول مقبول علیہ التحیۃ والتسلیم نے حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق ارشاد فرمایا۔ کہ ابوبکر و عمر شیخ عادل ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ صدیقی فاروقی ہی۔ اس حدیث کی روشنی میں شیخ زادہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن جائے تعجب ہے کہ ارشاد نبوی تو سرزمین عرب عجم میں ہوتا ہے۔ اور تعمیل ہندوستان میں ہوتی ہے۔ جہاں تک روایات زبانی کا تعلق ہے شیخ زادہ کی وجہ تسمیہ وہی صحیح معلوم ہوتی ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر چونکہ صفحات تواریخ سادہ ہیں۔ اس لئے کوئی حوالہ کسی تاریخ یا تذکرہ کا نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہی حال عرب سے ہندوستان میں شیوخ کے ورود کا ہے۔ تاریخ اس موضوع پر بھی خاموش ہے، اس لئے ہر اس روایت پر جو سینہ بسینہ اب تک چلی آ رہی ہے بجز یقین کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

(الف) یوپی کے قریب قریب ہر شہر اور قصبہ میں یہ برادری پھیلی ہوئی ہے۔ اور اودھ

میں بھی اس برادری کی خاصی تعداد ہے۔ پنجاب میں اس برادری کی قسم سویم کہیں کہیں آباد ملتی ہے۔ سی پی اور دکھن میں بھی یہ برادری پائی جاتی ہے لیکن یہ شیوخ زادگان ہیں جو یو۔ پی اور راوادہ سے بسلسلۂ ملازمت یا تجارت پہنچے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے! ایسے اشخاص کی زیادہ تر شادیاں بھی نومسلموں میں ہوئی ہیں۔

(ب) شہر سہارنپور کے محلہ قاضی، شاہ ولایت، میر کا کوٹ، شاہ بہلول میں یہ برادری آباد ہے۔ گو اس برادری کی کثرت محلّہ قاضی، شاہ ولایت، قضاۃ۔ منڈی۔ گلکڑ گنج۔ شیخ فرح۔ ٹیلہ، انصاریان میں آباد ہے، اور دوسرے محلّوں میں قلّت ہے تاہم ہر محلّہ میں اس وقت تک یہ برادری سربرآوردہ ہے۔ ہر چند مفلس اور نادار ہو چکی ہے لیکن روایات سلف کے اثرات اب تک باقی ہیں۔

(ج) اس برادری کے افراد موجودہ زمانہ میں ملازمت کی طرف بکثرت رجوع ہیں۔ قلّت ان کی نہایت معمولی تجارت بھی کرتی ہے۔ اور زمینداری و کاشتکاری میں بھی حصّہ لے رہی ہے۔ اور ایسے بھی افراد ہیں جو بیکاری سے دوچار ہیں۔ اور ان کا ذریعہ معاش محض اعزا کی امداد ہے۔ اس برادری کے افراد شہر خاص میں تقریباً چار ہزار ہیں۔ اور کل ضلع کی تعداد تمیں پینتیس ہزار ہے۔ پیشۂ ملازمت میں اس برادری کو کوئی خاص طرۂ امتیاز حاصل نہیں ہے۔ خال خال ایسی ملازمتوں پر نظر آتے ہیں جن کی تنخواہیں سات سو آٹھ سو روپئے تک ہیں۔ البتہ قضاۃ ابھی تک ہر شہر اور ہر دیہہ میں ان کے ہی ہاتھوں میں ہے۔ اور دراصل زمانہ موجودہ میں ان کی عزّت کا باعث ایک یہی ذریعہ اعزاز و افتخار کا باقی رہ گیا ہے۔ ورنہ تجارت میں ان کی حیثیت نفی کے برابر ہے۔ زمینداری کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے تاہم اس میں یہ برادری ایک حد تک حصّہ دار ہے۔ لیکن کوئی ممتاز حیثیت حاصل نہیں ہے ضلع ہذا میں سب سے بڑا مالگزار اور قابل تذکرہ زمیندار اس برادری میں صرف ایک خان بہادر شیخ ضیاء الحق ہیں، جن کی آمدنی لگان کے ذریعہ تقریباً چوبیس پچیس ہزار روپئے سالانہ ہے۔ شہر سہارنپور میں اس برادری کا اعزاز ابھی تک ان وقت کی نگاہوں سے ابھی تک گرا نہیں ہے۔ بحالت غریبی بھی اس کے افراد خان بہادری کے خطابات سے ممتاز ہیں۔ اس برادری کو ادب میں اب تک نمایاں شرف حاصل ہے۔ ان کے علماء اور شعراء کا ہندوستان

کی چیدہ ہستیوں میں شمار ہے۔ علماء میں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جن کا وصال ماہ جولائی ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ اور شعراء میں حضرت الطاف احمد صاحب انصاری آزاد سہارنپوری جن کا انتقال اسی سال ہوا ہے۔ اس برادری کے مایۂ ناز سپوت ہیں۔ ان ہستیوں کی بدولت اس برادری کا اعزاز ناداری اور بے روزگاری کے باوجود بھی ابنائے ملک میں جاری اور ساری ہے۔

(ح) اس برادری کے شادی وبیاہ اس وقت تک اپنی ہی برادری میں ہوتے ہیں۔ غیر برادری سے تعلقات ازدواج پیدا کرنے کے اب تک افراد برادری مخالف اور سختی سے اپنی روایاتِ سلف پر عامل ہیں۔ جن کنبوں میں پہلے کوئی میل نومسلم کا ہو بھی ہو چکا ہے۔ وہ افراد بھی غیر برادری میں رشتہ وبیاہ کرنے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہیں بلکہ آپس ہی میں اس فریضہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

(ط) بدقسمتی سے اس برادری کی نہ کوئی انجمن ہے۔ اور نہ ان میں تنظیم ہے۔ گو وقتی ضروریات کے لحاظ سے جب کوئی اجتماع کیا گیا تو ان میں تنظیم کی صلاحیت پائی گئی لیکن بر روئے عمل لاکر مستقلاً تنظیم کر دینے والی کوئی ہستی ابھی تک اس قوم میں پیدا نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوم کسی ایک کے حکم کی تابع نہیں ہے۔ پہلے یہ قوم اپنا سردار قاضی شہر کو سمجھا کرتی تھی اور ہر معاملہ میں ان ہی سے مشورہ کرتی تھی۔ گو کوئی انجمن اس وقت بھی قایم نہیں تھی لیکن پھر بھی اس قوم میں قدرتاً فطرتاً تنظیم تھی۔ زمانہ موجودہ میں ان کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ ہر شخص خود رائے ہے۔ کسی کی رائے کا تابع نہیں ہے۔ عاداتِ خصائل اچھے اور برے ہر زمانے میں مختلف رہے ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اب اس کے افراد خاندان کے خصائل بد سے بدتر ہیں اور پہلے نہیں تھے صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی ہر برادری کے زوال کا سبب ہمیشہ بدخصائل ہی رہے ہیں۔ ان ہی کی کثرت نے سلطنتوں کا تختہ الٹا اور اولاد سلاطین کو دودانہ کا محتاج بنایا ہے۔ اس لئے جب ہم یہ کہیں گے کہ اس برادری کو شاہانِ سلف کے زمانہ میں بکثرت جاگیریں اور مختلف طور کے اعزاز عطا ہوئے اور اب ان جاگیروں اور اعزازات کا نشان بھی باقی نہیں رہا تو ماننا پڑے گا کہ ہمارے زوال کے باعث سوائے ہمارے بدخصائل کے

اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ پہلے سے اب خصلتوں میں کچھ فرق ہیں تو اس کا جواب صاف اسی قدر ہے کہ سرمایہ دار کے بدخصائل سرمایہ داری میں پوشیدہ رہتے ہیں اور نادار کے خصائل الم نشرح ہو جاتے ہیں۔ یہ قوم چونکہ اب نادار کثرت سے ہے۔ اس لئے اس کے خصائل میں بھی آوارگی کہیں کہیں ملتی ہے۔

(۲) خاص شہر سہارنپور اور مواضعات میں اونچی حیثیت کے شیخ زادوں میں ایک تو وہ ہیں جو مقروض ہیں اور ان کی جائدادیں نیلام دائر ہیں۔ ایک وہ ہیں جو قرض کے بارے اس وقت مستثنیٰ ہیں۔ اور بلا شماتت ہمسایہ اپنی زندگی عیش کے ترانے بجا کر گزارتے ہیں۔ ان لوگوں کا حال معرض تحریر میں لانا جو مقروض ہیں فعل عبث کے مترادف ہے۔ البتہ ان ہستیوں کا تذکرہ باعث فخر و عزت ہو سکتا ہے جو کسی کے قرض دار نہیں ہیں۔ ایسی ہستی حسب ذیل اصحاب کی ہے:۔

ا۔ خان بہادر شیخ ضیا الحق صاحب رئیس راجو پور تحصیل دیو بند۔ آپ لائف مجسٹریٹ ہیں۔ اور گورنر کی مجلس قانون ساز کے سابق ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

۲۔ قاضی عبد الولی صاحب رئیس ننگلور۔ آپ بھی گورنر کی کونسل کے ممبر رہے ہیں۔

۳۔ شیخ زادگان میں جہاں ان ہستیوں کا فقدان ہے جو کسی کے قرض دار نہ ہو کر ذی حیثیت ہیں وہاں سوائے ایک ہزار سے دس ہزار تک کی حیثیت کے کسی کی کوئی اونچی حیثیت کروڑپتی یا لکھ پتی کی نہیں ہے۔ البتہ ایک ہزار سے دس ہزار کی حیثیت والی ہستیاں تمام ضلع میں بہت سی ہونگی

۴۔ (الف) چھوٹے اور بڑے زمیندار اس برادری میں ۳۵ فی صد شیخ زادگان ہیں۔

(ب) شہر کی جائداد مکان اور دوکانوں میں اس برادری کا حصہ مختلف ہے۔ مکانات نوے فی صدی کے پاس ہیں۔ اور دوکانات بمشکل پندرہ فی ہزار کے پاس ہوں گی۔

(ج) فیکٹری اور کارخانوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

(د) دوکانوں کے سامان میں بھی ان کا حصہ پانچ فی ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

(ه) سرکاری قرضوں میں کچھ روپیہ لگا ہوا ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ ہر زمیندار اور کاشتکار موجودہ

آرڈیننس کی رو سے قرضہ جنگ دینے پر مجبور ہے۔ اس برادری کا بلحاظ زمینداری اپنی تعداد تنذکرہ صدر اور بلحاظ ملازمت تیس فی صد شیخ زادگان قرضہ جنگ میں حصہ ہے۔

(و) اس برادری کا روپیہ سوائے بنک کے اور کسی طرح سود پر نہیں چلتا ہے۔ اور ایسے روپئے کی تعداد جو بنکوں میں ہے۔ پانچ فی ہزار شیخ زادگان سے زیادہ نہیں ہے۔

(ز) زیورات میں اس برادری کا حصہ بیس فی صد شیخ زادگان اور نقدی میں پانچ فی ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ جواہرات سے یہ برادری ناآشنا ہے۔ قیمتی کپڑے مستورات کے پاس دس فی صد شیخ زادگان سے زیادہ نہیں ہیں۔ کتابوں اور نوادرات کا فقدان ہے۔

(ح) موٹر اس ضلع کی برادری میں صرف تین ہیں۔ مکان کا سامان یا فرنیچر بھی اس برادری میں زیادہ سے زیادہ تین فی ہزار شیخ زادگان ہے۔ برتن علاوہ روزمرہ کی ضروریات کے اس برادری میں زیادہ سے زیادہ تین فی ہزار شیخ زادگان ہیں۔

(۵) اس نمبر کے ماتحت محمد احمد صاحب نے اعلیٰ اور اوسط اور ادنیٰ درجہ کا فیملی بجٹ بصورت جدول دیا تھا جسے ہم زیادہ معتبر نہ سمجھتے ہوئے شامل نہیں کر رہے ہیں۔

(۶) برادری کے اونچے، درمیانی، اور نیچے طبقے کی پونجی اور آمدنی میں روزانہ کمی پیدا ہو رہی ہے جس کا سب سے بڑا سبب برادری میں رسومات کا روز افزوں اضافہ ہے۔ اس برادری کے ہاتھ میں کوئی نیا کام نہیں آرہا ہے بلکہ روزانہ رسومات شادی وغیرہ کے اخراجات کثیر کے باعث اور کچھ معاشرتی کمزوریوں کی وجہ سے قرض داری کی وبا بُری طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جائدادیں مکفول ہیں اور ہر صورت سے اس برادری کو زوال ہی زوال سے رات دن واسطہ ہے۔ اس برادری میں کاروبار کا چونکہ فقدان ہے اس لئے حکومت کے لئے قوانین کا اثر محض ان کی زمینداریوں پر پڑ رہا ہے۔ اس موقع پر یہ کہتے ہوئے کسی قدر شرم آتی ہے کہ یہی وہ برادری ہے جس کی زمینداری سے ساہوکار ساہوکار بنے۔ اس برادری کو کبھی یہ توفیق حاصل نہیں ہوئی کہ دوسروں کو قرض دے۔ پہلے اس کا گزر اس کی آمدنی ہی میں ہوتا رہا لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس پر انقلاب

آتا گیا، یہ مفروض ہوتی رہی اور آج تک بجز خال خال کے تمام برادری اس وبائی تیکار اور مبتلائے مصیبت ہے۔ اس برادری کے مقابلہ پر مسلمانوں کی ہر جماعت ۔۔ جو اس کو ہر صورت سے گرانے کی فکر میں رہتی ہے۔

اس تحریری بیان کے ضمیمہ کے طور پر محمد احمد صاحب نے ایک دوسرا تحریری بیان عنایت فرمایا تھا جس میں برادری کے ان افراد کے اسمائے گرامی معہ مختصر حالات درج کئے گئے تھے جن کے نام پر بعض خاندان اب تک چل رہے ہیں۔

فہرست خاندان شیوخ اور جو کچھ حالات ان کے متعلق معلوم ہو سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ محمد محسن صاحب بن شیخ محمد نظام بن شیخ قاضی محمد ایوب۔

۲۔ شاہ عبدالنبی صاحب جو حضرت عبدالقدوس صاحب گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے تھے

۳۔ شیخ نوازش علی صاحب۔

۴۔ شیخ محمد اعظم صاحب۔

۵۔ شیخ کمال الدین صاحب

۶۔ شیخ شیر علی صاحب۔

۷۔ شیخ نجف علی صاحب

۸۔ شیخ کاظم علی صاحب

۹۔ مولوی احمد علی صاحب محدث۔

۱۰۔ شیخ کریم الدین صاحب

۱۱۔ شیخ الرئیس محمد شفیع صاحب

۱۲۔ شیخ الرئیس محمد معظم صاحب

۱۳۔ شیخ حضرت اکبر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ

۱۴۔ شیخ عبدالرسول صاحب۔

۱۵۔ شیخ عبدالعزیز صاحب۔

(۱) شیخ محمد محسن صاحب جن کے نام سے اس وقت تک محلہ محسنی مشہور اور اس میں ان کی اولاد آباد ہے۔ ان کا زمانہ پیدائش شاہجہاں بادشاہ کا ہے۔ اور وفات عالمگیر کے بیٹے ظفر بادشاہ کے عہد میں ہوئی یہ ملاجیون کے ہم عصر اور قاضی محمد ایوب کے پوتے تھے۔ انھوں نے ایک گاؤں محسن پورہ پرگنہ سہارنپور میں آباد کیا اور ان کو شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں جاگیر عطا ہوئی ان کی زوجہ محترمہ کو بھی پرگنہ فیض آباد ضلع سہارنپور میں عطا ہوا۔ ان کا اصلی مکان سہارنپور میں محلہ میر کے کوٹ میں تھا۔ شاہجہاں بادشاہ کے وقت میں ایک ہندو شہر سہارنپور کا صوبہ دار مقرر ہوا جو اس محلہ میر کوٹ ہی میں قتل ہوا، اس پاداش میں ان کی کل جاگیر وجائداد کی ضبطی اور ان کی جلاوطنی کا حکم ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جب عالمگیر نے سلطنت کی باگ سنبھالی تب ان کی جلاوطنی کے احکامات تو واپس لے لئے گئے لیکن جاگیر واگذاشت نہیں ہوئی۔ شیخ محمد محسن نے میر کے کوٹ سے جلاوطن ہوکر اس مقام کو جو پہلے بن تھا اور اب محلہ قاضی یا محسنیاں کہلاتا ہے آباد کیا۔ شیخ محمد محسن بعہد شاہ عالم سپہ سالار اعظم افواج کے بھی رہے۔ ان کے بیٹے محمد کبیر قاضی مقرر ہوئے اور آج تک اس خاندان میں قاضی ہوتے چلے آرہے ہیں۔ قاضی محمد کبیر کی اولاد میں سے حکیم محمد بخش کو محمد پور معافی ملا، اور مولوی فرید الدین کو جو قاضی محمد کبیر کے پوتے کی اولاد تھے۔ ایک گاؤں گرام غلام قادر روہیلہ نے عطا کیا، جو غدر کے زمانے میں ضبط ہو گیا۔ قاضی محمد کبیر کے پوتے محمد عاشق عرف صدیقی خاں وزیر اعظم رہے۔

۲۔ شیخ عبدالنبی حضرت عبدالقدوس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے۔ ان کے صاحبزادہ ابن النبی نے سہارنپور کی سکونت اختیار کی اور آج تک ان کی اولاد سہارنپور میں آباد ہے۔ ان کے واقعات گزیٹیر میں مفصل موجود ہیں۔ ان کے پاس پانچسو پچاس گاؤں تھے جو بعد میں ضبط ہو گئے۔ ایک مسجد سہارنپور میں اس وقت تک ان کے نام سے موسوم ہے اور ان کی اولاد گنگوہ سہارنپور اور رامپور میں آباد ہے۔

۳۔ شیخ نوازش علی کا خاندان محلہ شاہ ولایت میں آباد ہے۔ ان کے خاندان میں حکیم محمد اسحٰق مرحوم بہت خوبیوں کے آدمی اور صوفی منش گزرے ہیں۔ ان کے حالات اور کچھ معلوم نہیں ہو سکے۔

۴۔ شیخ محمد اعظم صاحب جہانگیر کے عہد میں سہارنپور آئے اور میر کے کوٹ میں آباد ہوئے۔ لیکن ہند و صوبہ دار کے قتل کے بعد ان کی بھی جلاوطنی ہوئی۔ اور انھوں نے بھی ایک بستی کو آباد کیا جو آج تک قضاۃ کے محلہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کو رتنا کھیڑی گاؤں کا کچھ حصہ معافی میں بعہد جہانگیر ملا۔ جو آج تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ یہ اندری ضلع کرنال سے آکر سہارنپور میں آباد ہوئے تھے۔ ایک موضع اعظم پورہ بھی تھا جو ۱۸۳۹ء میں ضبط ہوا۔ یہ شیخ انصاری تھے۔ ان کے آباو اجداد عرب سے ہرات اور وہاں سے جالندھر اور جالندھر سے اندری ضلع کرنال میں آکر اِدھر اُدھر آباد ہوئے۔

۵۔ شیخ کمال الدین جن کی اولاد میں شجاع الدین کے پسری اولاد تو نہیں ہوئی لیکن دختری اولاد آج تک سہارنپور میں قضاۃ شاہ ولایت، مہدی سرائے اور منڈی میں آباد ہے۔ شیخ کمال الدین رئیس تھے۔ ان کو بھی رتنا کھیڑی کا حصہ معافی میں ملا جو آج تک ان کے وارثان کے قبضہ میں ہے۔

۶۔ شیخ شیر علی کے خاندان سے ایک خاندان مشہور ہے جن کی اولاد میں حامد علی ہوئے یہ بعہد گورنمنٹ برطانیہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادہ محمود علی ڈپٹی کلکٹر رہے۔ لیکن اب اس خاندان کا کوئی متنفس کسی عہدۂ جلیلہ پر نہیں ہے۔

۷۔ خاندان شیخ نجف علی۔ شیخ نجف علی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے بعد ان کی اولاد کسی عہدۂ جلیلہ پر نہیں رہی۔ ان کی خود پیدا کردہ جائداد تقریباً دو لاکھ روپئے کی ہے، جس کا آج ان کے بیٹے محمد حسین کے انتقال ہو جانے کے بعد وراثت کا جھگڑا چل رہا ہے اور بہت بے دردی سے یہ ضائع کی جا رہی ہے۔

۸۔ شیخ کاظم علی صاحب کے مورث اعلیٰ صوبہ دار تھے۔ یہ شاہجہاں بادشاہ کا عہد تھا

ان کو جاگیریں عطا ہوئیں اور سلسلہ بہ سلسلہ ان کی اولاد میں تقسیم ہوتی ہوتی آج تک آئیں لیکن اس خاندان کے افراد کی فضول خرچیوں کے باعث اس جاگیر کی اب نمود ہی نمود باقی ہے۔

۹۔ مولوی احمد علی صاحبؒ محدث تھے۔ ان کی زوجہ محترمہ مولوی رائت اللہ صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔ مولوی رائت اللہ صاحب بخارا سے آئے تھے۔ ان کی اولاد کا سلسلہ اب تک جاری ہیں ان کی جائداد خود پیدا کردہ تھی۔ جو اب تک کم وبیش ان کی اولاد میں تقسیم ہو کر موجود ہیں۔

۱۰۔ شیخ کریم الدین صاحب رئیس تھے۔ ان کی اولاد کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ ان کی اولاد میں منشی مجید احمد اب تک سب انسپکٹر پولیس ہیں۔ ان کی جائداد بھی اولاد پر تقسیم ہو کر ہر ایک کے حصہ میں مختصر رہ گئی ہے۔

۱۱۔ شیخ الرئیس محمد شفیع صاحب ایک رئیس تھے۔ ان کے سلسلے میں شیخ گھسیٹا چھٹی پشت میں تھے۔ جن کے نام سے آج تک یہ خاندان مشہور ہے۔ شیخ گھسیٹا سہارنپور سے۔ رامپور منہاران چلے گئے تھے۔ اور تا آخر عمر وہیں رہے۔ وہیں ان کی جائداد بھی تھی۔ جو وارثان کی عدم واقفیت اور کچھ لاپروائی کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

۱۲۔ شیخ الرئیس محمد منعم صاحب۔ یہ شیخ امام علی صاحب کے پردادا تھے۔ ان کی دختری اولاد سہارنپور میں ہے۔ اور پسری اولاد پہلے رامپور منہاران میں رہتی تھی، لیکن اب یہ دہرہ دون میں آباد ہیں۔ محمد منعم صاحب رئیس تھے۔ لیکن ان کی جائداد ان کے وارثان میں تقسیم ہوتے ہوتے اب ختم ہو گئی ہے۔

۱۳۔ شیخ اکبر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ رئیس تھے۔ ان کی اولاد آج کل نکوڑ میں آباد ہے۔ ان کے حالات و واقعات باوجود بسیار تلاش دستیاب نہیں ہو سکے۔"

یہاں محمد احمد صاحب کا بیان ختم ہوتا ہے۔ سہارنپور کے شیخ زادوں کے خاندانوں کی جو فہرست محمد احمد صاحب نے درج کی ہے اُسے ہرگز مکمل نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی حیثیت صرف "مشتے نمونہ از خروارے" کی سی ہے۔ اس کے علاوہ اوپر درج کئے ہوئے حالات کے مطالعے

اس برادری کے بارے میں مایوسی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی بالکل صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس برادری کے لوگ اپنی موجودہ گئی گذری حالت میں بھی تعلیم، زمینداری اور ملازمت میں دوسری برادریوں کے مقابلے میں کچھ کم نہیں ہیں۔ فرق صرف یہی ہے کہ یہ لوگ ترقی کے ان مواقع سے جو نئے حالات نے پیدا کر دئے ہیں جتنا چاہئے اتنا فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں، اس لئے باوجود اس کے کہ ان کی مجرد اور مطلق حالت ابھی تک کچھ بہت زیادہ خراب نہیں ہوئی ہے، پھر بھی دوسروں کے مقابلے میں جو زیادہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ لوگ خاصے پیچھے رہے جا رہے ہیں۔ تجارت وصنعت میں ان کی نمائندگی بمنزلہ صفر کے ہے۔ یہ اپنے روائتی پیشہ ملازمت پر جس کا ایک زمانہ میں انھیں اجارہ حاصل تھا ابھی تک قایم ہیں لیکن زیادہ بڑی ملازمتیں ان کے پاس نہیں ہیں اور چھوٹی ملازمتوں میں بھی دوسری برادریوں کے لوگ ان کے مقابلے پر آتے جا رہے ہیں۔ ملازمت کے حصول کے لئے تعلیمی معیار پہلے کے مقابلے میں بڑھ رہے ہیں جن کو یہ پورا نہیں کر پاتے ہیں۔ ان کی پرانی اور درمیانی نسل فضول خرچیوں اور خراب عادتوں میں مبتلا رہی۔ اس نے اپنے روزمرہ کے مصارف اور شادی وغمی کی تقریبات پر بے اعتدالی اور بدانتظامی سے روپیہ خرچ کیا اور آمدنی کے بڑھانے اور اس کے قایم رکھنے کی تدبیریں نہیں سوچیں اس لئے یہ اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور نفع بخش پیشوں کے دوسرے بیش خرچ مصارف کو برداشت کرنے سے قاصر رہی اس کے علاوہ نئی نسل کی کم ہمتی اور سہل پسندی بھی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔

شیخ زادہ برادری کے اس جائزہ پر میں سہارنپور کی مسلم برادریوں کے جائزہ کو ختم کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس تحقیقات میں سہارنپور کی ان تمام مسلم برادریوں کو جن کا ضلع کے گزیٹیر میں ذکر کیا گیا تھا شامل نہیں کیا جا سکا۔ پٹھان برادری اور مسلم گوجر برادری کے حالات کی کسی خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ میں نے پٹھان برادری کے لئے امتیاز محمد خاں صاحب وکیل سہارنپور سے ایک ملاقات کی تھی اور انہوں نے اشتراک عمل کا وعدہ بھی فرما لیا تھا لیکن اس کے بعد مزید ملاقات کا موقع نہ مل سکا اور مقصود علی خاں صاحب اس زمانے میں شہر میں تشریف نہیں رکھتے تھے اس لئے ان سے بھی ملاقات نہیں کی جا سکی۔ گوجر برادری شہر سہارنپور کے اندر تقریباً بالکل نہیں ہے اور میں دیہات کا دورہ کرنے کے لئے وقت نہیں نکال سکا۔

اس کے بعد میں شہر سہارنپور کی ہندو برادریوں کے بارے میں اپنی کچھ معلومات پیش کروں گا۔

ادارہ تعلیم و ترقی کی کتابیں

(ان پڑھ بالغوں کے لئے)

۱۔ قاعدہ ۲ر (۲) دس سبق ۲ر (۳) نکاح ۲ر

۱۔ نماز ۳ر
۲۔ حکایتیں اول ۳ر
۳۔ " دوم ۲ر
۴۔ حبیب خدا ۲ر
۵۔ نظمیں ۳ر
۶۔ میونسپلٹی ۲ر
۷۔ صدیق اکبر ۳ر
۸۔ خط کتابت ۳ر
۹۔ ضلع کا انتظام ۲ر
۱۰۔ قومی گیت ۳ر
۱۱۔ غزلیں ۲ر
۱۲۔ ہمارا ہندوستان ۳ر
۱۳۔ اماں بھی پڑھیں گی ۳ر
۱۴۔ عمر فاروق ۲ر
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ۳ر
۱۶۔ شہید کربلا ۲ر
۱۷۔ ہماری دنیا ۲ر
۱۸۔ ایشیا ۲ر
۱۹۔ یورپ ۲ر
۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب ۳ر
۲۱۔ مثنوی میر حسن ۳ر
۲۲۔ گل بکاؤلی ۲ر
۲۳۔ چار درویش اول ۲ر
۲۴۔ " " دوم ۳ر
۲۵۔ " " سوم ۲ر

۲۶۔ چار درویش چہارم ۲ر
۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ۲ر
۲۸۔ " " دوم ۲ر
۲۹۔ " " سوم ۲ر
۳۰۔ " منصور موہنا ۳ر
۳۱۔ " فردوس بریں ۳ر
۳۲۔ " لیلیٰ مجنوں ۳ر
۳۳۔ شکنتلا ۳ر
۳۴۔ تانگے والا ۲ر
۳۵۔ بہشتی ۲ر
۳۶۔ صوبے کی حکومت ۲ر
۳۷۔ حکومت ہند ۲ر
۳۸۔ جمہوریت ۳ر
۳۹۔ دوہے ۲ر
۴۰۔ دلچسپ شعر ۲ر
۴۱۔ مرثیے ۲ر
۴۲۔ مسدس حالی ۳ر
۴۳۔ حالی کی نظمیں ۲ر
۴۴۔ گنتی ۲ر
۴۵۔ بڑی گنتی ۲ر
۴۶۔ [illegible] پیمانے ۲ر
۴۷۔ اجرت کا حساب ۳ر
۴۸۔ تنخواہ کا حساب ۳ر
۴۹۔ چاند تارے ۳ر
۵۰۔ نزلہ زکام ۳ر

۵۱۔ حالات قرآن مجید ۳ر
۵۲۔ تعلیمات عقائد ۲ر
۵۳۔ " عبادات ۳ر
۵۴۔ " اخلاق ۲ر
۵۵۔ " معاملات ۳ر
۵۶۔ قصص قرآن مجید حصہ ۱ ۳ر
۵۷۔ " " حصہ ۲ ۲ر
۵۸۔ کعبہ شریف ۳ر
۵۹۔ حدیث شریف ۳ر
۶۰۔ عثمان غنی ۳ر
۶۱۔ علی مرتضیٰ ۲ر
۶۲۔ صحابۂ کرام حصہ ۱ ۲ر
۶۳۔ " " حصہ ۲ ۳ر
۶۴۔ " " حصہ ۳ ۲ر
۶۵۔ " " حصہ ۴ ۲ر
۶۶۔ " " حصہ ۵ ۲ر
۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۲ر
۶۸۔ حضرت غوث پاک ۲ر
۶۹۔ اجمیری خواجہ ۳ر
۷۰۔ نظام الدین اولیاء ۲ر
۷۱۔ گوتم بدھ ۲ر
۷۲۔ کرشن کنھیا ۲ر
۷۳۔ رام کہانی حصہ ۱ ۳ر
۷۴۔ " " حصہ ۲ ۲ر
۷۵۔ " " حصہ ۳ ۲ر

۷۶۔ امریکہ ۲ر
۷۷۔ جنوبی امریکہ ۲ر
۷۸۔ سرزمین ہند ۲ر
۷۹۔ صوبے ۲ر
۸۰۔ دیسی ریاستیں ۲ر
۸۱۔ داستان امیر حمزہ حصہ ۱ ۲ر
۸۲۔ " " حصہ ۲ ۳ر
۸۳۔ " " حصہ ۳ ۳ر
۸۴۔ " " حصہ ۴ ۲ر
۸۵۔ " " حصہ ۵ ۲ر
۸۶۔ کہاوتیں ۳ر
۸۷۔ پہیلیاں ۲ر
۸۸۔ گرو نانک ۳ر
۸۹۔ مثنوی میر حسن ۳ر
۹۰۔ گلستاں ۲ر
۹۱۔ احمد خاں دکاندار ۲ر
۹۲۔ عبدالرحمن راج ۲ر
۹۳۔ نصیب خاں حجام ۲ر
۹۴۔ ختا خدمت گار ۲ر
۹۵۔ پیائے خاں درزی ۲ر
۹۶۔ حفیظ خانساماں ۲ر
۹۷۔ بین بڑھئی ۳ر
۹۸۔ سمدھو حلوائی ۳ر
۹۹۔ میرا نتھا ۲ر
۱۰۰۔ ہندوستان ۵ ہزار برس پہلے ۳ر

مکتبہ جامعہ دہلی

Freedom from Suffering

As one nears the shores of America, coming from across the Atlantic, one of the most inspiring sights is the Statue of Liberty. It not only serves as a cheering beacon to the mariner, but also symbolises the hopes of millions of downtrodden humanity who have left the Old World for the freedom of a new life in a new clime—freedom from want, from fear and from oppression.

Of all freedoms, however, the greatest is the freedom from disease. The healthiest—rich or poor—for want of this freedom are changed to sick and diseased whose lives become useless to themselves and to the world. Freedom from disease is therefore the greatest freedom which everyone should strive for.

Cipla Laboratories are devoting their full time and attention to the production of high quality drugs and medicines for the relief of mankind, thus striving for Freedom from disease. In quality, efficacy and high standard of production of drugs and medicines Cipla is equal to the world's best. Scientific methods of production and constant research lead to perfection. This is the motto followed by Cipla.

EQUAL TO WORLD'S BEST

زیرِ ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

سالانہ چندہ صہ، فی پرچہ ۸ر	بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۹ء	جلد ۲۴ نمبر ۳

فہرست مضامین

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) دیال پریس دہلی

جنگ کے بعد تعلیم

ذیل میں ہم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کی وہ تقریر درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ۲۴ رجون ۱۹۴۳ء کو نشر فرمائی تھی۔ یہ تقریر یہ تین سال سے زیادہ پرانی ہو چکی ہے لیکن اس کی ادبی، دل آویزی اور خیالات کی گہرائی اور پختگی ایسی ہیں کہ اب بھی یہ اتنی ہی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جیسی کہ اُس وقت سُنی گئی تھی۔ یہ اس لئے اور زیادہ موقع کے مطابق ہے کہ اب کانگریسی حکومت برسر اقتدار ہے اور تعلیم کی اصلاح و ترقی کا مسئلہ اس کے زیر غور ہے۔ کانگریس عرصہ ہوا ذاکر حسین کمیٹی کی بنیادی تعلیم کی اسکیم کو ملک کے لئے ضروری قرار دے چکی ہے۔ اس تقریر کے لئے ہم عبدالرؤف صاحب استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اسے محفوظ رکھا اور آل انڈیا ریڈیو دہلی کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی۔ مدیر

آدمی بھی ہے عجیب چیز۔ کبھی دھیان کسی طرف بٹا ہو تو سر پر آئی بلا کو نہ دیکھے اور "ایں دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ" کہہ کر منہ پھیر لے۔ کبھی اوسان ٹھکانے ہوں تو باراں سے پہلے چھتیں پاٹنے اور طوفان سے پہلے سفینے بنانے کی سوچتا ہے۔ بلکہ منجدھار میں پھنس کر بند باندھنے کے منصوبے باندھتا ہے۔ کبھی صلح کو سامانِ جنگ فراہم کرنے کی مہلت جانتا ہے۔ کبھی جنگ کو امن دائمی کا پیش خیمہ بنانے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ اس کی تاریخ پر نظر ڈالئے اور اس کی غفلتوں پر نظر کیجیے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ اب تک اس زمین پر بستا کیسے ہے۔ اور بہتیرے جانوروں کی طرح کبھی کا ناپید کیوں نہیں ہو گیا

کبھی گمان ہوتا ہے کہ اس میں عقل کی پہلی نشانی یعنی تجربہ سے اپنے کو بدلنے اور کھو کر کچھ سیکھنے کی قابلیت نہیں، لیکن پھر اس کی سوجھ بوجھ اور اس کی تدبیر، اس کے آگے کی سوچ، اس کی مستقبل کی خاطر حال کو تج دینے پر آمادگی پر نظر پڑتی ہے تو سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ یہ ساری مخلوق کا سرتاج کیوں ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ گر پڑ کر آخر کو اپنے کو اس منصب کا سچا حقدار ثابت کر دے —— —— دیکھئے نا آج کس بلا میں پھنسا ہے، اور اس کی صدیوں کی محنت کے ثمرے خود اس کے ہاتھوں دیکھتے دیکھتے تباہ و برباد ہو رہے ہیں، اس کی تہذیب کے مرکز مسمار ہو رہے ہیں، اس کی ذہنی اور روحانی زندگی کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں، اور یہ انھیں دیوانہ وار کھود کھود کر پھینک رہا ہے لیکن جنون کے اس دَور میں بھی اسے اپنا مستقبل بالکل بھولا نہیں ہے۔ یہ برابر اس سوچ میں پڑا ہے کہ یہ دَورہ گذر جائے تو زندگی کو کس ڈھنگ پر ڈالوں، کیسی ریاست بناؤں کیسی معیشت۔ کیا سوچوں، کیا مانوں، اور اپنے منصوبوں کو روبراہ لانے کے لئے کیسی تعلیم کا انتظام کروں۔

اس سوچ میں بھی کبھی تو یہ خیال ذہن میں سَن سے گذر ہی جاتا ہے کہ سب کچھ جیسا تھا ویسا ہی رہے گا۔ وہی حماقتیں ہوں گی اور ان کا نتیجہ وہی بربادیاں۔ نہ نیا آدم تیار ہو پائے گا نہ اسکے لئے نئی دنیا۔ انسانی تاریخ میں بہت کچھ ہے جو اس اندیشے کی تائید کرتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ اب کے بھی وہی ہو جو پہلے بارہا ہو چکا ہے لیکن حماقت پر عقیدہ رکھنے سے بہتر عقل پر بھروسہ کرنا ہے۔ نادانی کو تقدیر ماننے سے پہلے دانائی کی کچھ اور آزمائش کئے بغیر بھی اس کا دل نہیں مان سکتا۔ چنانچہ ہم سب کا جی یہی چاہتا ہے کہ موجودہ مصیبت سے نکلنے کے بعد یہ ایک مرتبہ تو پھر سنبھلے۔ اور خود بھی بدلے اور اپنی دنیا کو بھی بدلے اور اس میں برائیوں کو برابر کم کرنے اور خوبیوں کو برابر بڑھاتے رہنے کے سامان کرے۔ اُمید بھی رکھنی چاہیئے کہ ایسا ہی ہوگا۔

میں نے جو ابھی کہا کہ یہ اس مصیبت سے نکلے، تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ جنگ اس طرح ختم ہو کہ آدمی کا آدمی پر بےجا تسلط بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائے۔ قوموں کا قوموں پر، ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ پر۔ جمہوریت کامراں ہو، انسانی

بہ حیثیت انسان کے ایک مستقل قدر مانا جائے۔ آدمیت کا احترام قایم ہو۔ زندگی اور اس کے آداب اور تنظیمیں آدمی کی شخصیت کی پوری نشو ونما میں مدد دیں اور اس میں حارج نہ ہوں۔ انفرادی شخصیت کے نشو ونما میں بھی اور جماعتی اور قومی شخصیت کی تکمیل میں بھی۔ اگر انسان اپنی موجودہ مصیبت سے اس طرح نکلا اور امید تو یہی ہے کہ نکلے گا۔ تو اس کے تمدن کے تمام شعبوں کی طرح تعلیم بھی اس اصول سے متاثر ہو گی۔

آئیے پہلے تو قومی نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ یہ اصول قومی تعلیمی نظاموں میں کس طرح کارفرما ہو گا۔ جیسا کہ ابھی کہہ چکا ہوں کہ جنگ میں جمہوریت کی جیت کے معنی یہ ہوں گے کہ قوم پر قوم کا تسلط ختم ہو جائے گا اور قومی شخصیت کا احترام دنیا میں ایک مسلمہ اصول کی حیثیت سے مانا جائے گا۔ اس لئے اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ جنگ کے بعد بین الاقوامیت اور عام انسانیت اور عالمیت کے تیز دھارے میں قومی خصوصیتیں بہ جائیں گی تو وہ دھوکے میں ہے۔ قومی شخصیت کا احساس قوموں کو اس دھارے میں بھی چٹانوں کی طرح قایم رکھیگا۔ اور قومی شخصیت کا احترام دوسروں کا حوصلہ نہ ہونے دے گا کہ انھیں اپنی جگہ سے ہلائیں۔ ہر قوم اپنے مخصوص ذہنی اور تمدنی ورثہ کو سنبھالے گی اور اس سے جہاں تک ہو سکے گا اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا کام لے گی۔ دوسروں سے بھی مفید اور کارآمد چیزیں لی جائیں گی لیکن اپنا سب چھوڑ کر نہیں۔ جیسے یورپ کی قوموں نے قدیم یونان سے بس اتنا لیا کہ اپنے کو پالیا۔ یہ ٹھیک نہ ہوتا کہ اپنے کو کھو کر نقلی یونانی بننے کی لاحاصل کوشش کرنے لگتے۔ اسی طرح ایشیائی قومیں مغرب سے ضرور سائنس اور صنعت سیکھیں گی اور ان کی تعلیم کو اپنے نوجوانوں میں رائج کریں گی لیکن اپنی قومی زندگی کی جڑوں کو اپنے تمدن اور اپنی روایات کی زندگی بخش طراوت سے محروم کرنے پر راضی نہ ہوں گی۔ ایسا کریں گی تب ہی تمکین اور وقار کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر چل سکیں گی۔ ورنہ بے رنگی کے ویرانے میں بھٹکتی پھریں گی، اپنی قومی شخصیت کھو بیٹھیں گی اور انسانیت کو اپنے مخصوص رنگ سے محروم کر دیں گی۔ انسانیت کے باغ میں بھی لالہ و گل و نسترن کا رنگ جدا جدا ہی ہے۔ ہاں ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے۔

ہاں قومیت کا وہ تنگ سیاسی تصور جس نے آدمی کو آدمی کا دشمن بنا دیا ہے اور جس کی نجاست کے دھبوں کو اس وقت انسانیت اپنے خون سے دھو رہی ہے، اس نئی دنیا میں راہ نہ پائے گا، نہ تعلیم اس شیطانی تصور کے معین و مددگار ہونے کا مرتبہ قبول کرے گی۔ یہ قومیں یا یہ تمدنی جماعتیں اگر اپنی تعلیم میں اپنے مخصوص رنگ سے کام لیں گی تو صرف اس لئے کہ دوسروں کو سمجھنے اور دوسروں سے سیکھنے کے لئے بھی تو اپنی شخصیت کے مرکز کا برقرار رکھنا لابد ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ اس تحفظ کے ساتھ ساتھ نئی دنیا میں دوسروں کی تمدنی زندگی سے واقفیت بہم پہنچانے، اس سے اچھائیاں اخذ کرنے، اس پر اثر ڈالنے اور اس سے متاثر ہونے کے موقعے بھی نظام تعلیم میں کسی کے جبر اور دباؤ سے نہیں بلکہ آزادی اور خوشی سے بکثرت پیدا کئے جاسکیں گے۔

یہ تو قوم قوم کے تعلق کے اعتبار سے ہوا۔ لیکن قومیں جب اپنے نظام تعلیم کو سدھاریں گی تو کیسے؟ کیا جو اب تک ہوتا تھا وہی ہوتا رہے گا۔ یعنی بڑوں کے نزدیک جو واقفیت مفید ہے بس وہ چھوٹوں کو پہنچا دی جائے گی۔ یا کوئی دوسرا اصول نئی تعلیم میں اپنا اثر دکھلائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہاں بھی جمہوریت کا یعنی شخصیت کے احترام کا اصول کارفرما ہوگا، اور ہونا بھی یہی چاہیے اس لئے کہ خوش قسمتی سے جو کچھ احترام شخصیت کا اصول چاہتا ہے وہی صحیح تعلیم کا بھی مطالبہ ہے۔

صحیح تعلیم نہ ملمع ہوتی ہے، نہ ٹھونس ٹھانس۔ یہ نہ اس لئے دی جاسکتی ہے کہ سب ایک سے دکھائی دیں، ایک سا سوچیں، اور اس بات کو کہ کیا سوچیں اور کیسے دکھائی دیں، کوئی دوسرا اپنے مقصدوں کے پیش نظر طے کر دے۔ اس کے کہنے پر جانیں لیں اور جانیں دیں اس کے کہنے پر اچھائیوں کو برائیاں سمجھنے لگیں، دنیا کو دشمن جانیں اور اپنی مرضی کو سب کی زندگی سے زیادہ عزیز گردانیں، کبھی اس کے کہنے پر آدمی کی جگہ درندہ بننا پسند کریں، کبھی آدمی کی جگہ بھیڑ بکری۔ نہیں صحیح تعلیم نہ یہ ہوتی ہے نہ وہ صحیح تعلیم کی بنیاد تو تعلیم پانے والے کی شخصیت کے احترام پر ہوتی ہے اس میں باہر سے کچھ نہیں ہوتا۔ اندر جو ہے اُسے نشوونما دے کر اُبھارنا اور سنوارنا ہوتا ہے

جمہوریت میں تعلیم کا یہی اصول برتا جا سکتا ہے۔ اور یہی صحیح اصول ہے۔ نئی دنیا میں اس اصول پر تعلیم کی تنظیم ہوگی۔

آپ کو شاید خیال پیدا ہو کہ اگر ہر تعلیم پانے والے کی شخصیت کا احترام کرنا پڑا اور تعلیم اس کی مناسبت سے ممکن ہوئی تو پھر تعلیم کا عام کرنا تو کچھ محال سا ہو جائیگا۔ بے شک یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے لیکن اکثر اندیشوں کی طرح ذرا سوچنے سے دور ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جہاں تک بچپن اور لڑکپن کے زمانہ میں تعلیم کا تعلق ہے قدرت نے اس عمر میں بعض صلاحیتیں بہت عام کر دی ہیں۔ ان میں سب سے عام اور سب سے اہم صلاحیت اور فطری خواہش ہاتھ سے کچھ کرنے، کچھ بنانے، کچھ بگاڑنے، کچھ جوڑنے، کچھ توڑنے کی خواہش ہے۔ علمی تحقیق نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے اور عام تجربہ بھی اس کی وافر شہادت دیتا ہے کہ تعلیم کا ہر وہ نظام جو بچپن کی تعلیم ہے ان صلاحیتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو موجود نہیں ہوتیں، اور اس صلاحیت سے کام نہیں لیتا جو قدرت نے یوں عام طور پر ارزانی کی ہے۔ وہ قدرت کے منشاء کو پس پشت ڈالتا ہے۔ ایک غیر فطری طریقہ پر تعلیم دینے کی کوشش کرتا ہے، اس کوشش میں اصرار سے بچوں کی زندگیاں تلخ کرتا اور ان کی شخصیت کی صحیح نشو و نما میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنگ کے بعد کی نئی جمہوری دنیا اس تنگ نظری اور ضد کی اجازت نہ دے گی، اور ہر ملک کو ابتدائی تعلیم کے نظام میں ہاتھ کے کام کو مرکزی جگہ دی جائے گی، اور جو دوسری تمدنی چیزیں نئی نسل تک پہنچانی ہیں وہ اس عمر میں اس ہاتھ کے کام سے متعلق اور مربوط کر کے پہنچائی جائینگی اس لئے کہ بچے کو تعلیم کا مرکز ماننے اور اس کے احترام کا یہ لازمی تقاضہ ہے۔ اس بنیادی وجہ کے علاوہ اس طریقہ میں نئی دنیا کی اسلوب زندگی کے ساتھ بعض اور مناسبتیں بھی ہوں گی مثلاً نئی دنیا میں اگر ایک طبقے پر دوسرے طبقے کا تسلط بے جا نہ ہوگا تو اس میں پھر اس بات کی گنجائش بھی نہ رہے گی کہ کچھ لوگ عمر بھر جسمانی مشقت کریں اور کچھ عمر بھر اس سے بے تعلق رہیں۔ اس میں اس کی گنجائش بھی نہ ہوگی کہ لوگ زندگی سے صرف کتابوں کی معرفت آشنا ہوں اور اسے

کبھی رو در رو نہ برتیں۔ اس نئی دنیا میں شاید نکھٹوؤں کے لئے بھی بہت جگہ نہ ہوگی جو دوسروں کا پیٹ کاٹ کر اپنا پیٹ بھرتے رہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ نئی دنیا میں کوئی ۱۴ برس کی عمر تک کے لڑکے لڑکیوں کے لئے تعلیم میں ہاتھ کے کام کو اب سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگی۔ ہاں اور یہی نہ ہوگا کہ اس عمر کے جو لڑکے اور لڑکیاں اسکول میں آئیں ان کے لئے یہ انتظام ہوگا اور باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔ مثلاً یہ نہ ہوگا کہ ہندوستان کی طرح اس عمر کے لڑکوں میں ایک مدرسہ میں ہے تو دو ڈنڈے بجاتے ہیں۔ یا ایک لڑکی پڑھتی ہے تو چھ مدرسہ کی تربیت سے محروم ہیں۔ نہ یہ ہو سکے گا کہ سو بچے پہلی جماعت میں داخل ہوئے تو کُل چالیس شکل سے چوتھی تک پہنچے اور باقی کہیں راستہ میں اٹک رہے۔ یہ وہیں ہو سکتا ہے جہاں قوم کے بچے اس کا سب سے قیمتی سرمایہ نہ سمجھے جاتے ہوں۔ نئی دنیا میں میں سمجھتا ہوں کہ کم سے کم ۱۴ سال کی عمر تک اس قسم کی تعلیم جیسی میں نے ابھی بیان کی سب لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لازمی ہوگی، اور قوم اس کے تمام مصارف برداشت کرے گی۔

یہ تعلیم تو سب کے لئے ہوگی۔ لیکن اس کے آگے بھی تعلیم کی ضرورت پڑے گی۔ وہ کیسی ہوگی؟ اس میں کیا اصول سامنے رکھا جائے گا؟ سو میرا خیال ہے کہ یہاں بھی وہی شخصیت کے احترام کا اصول کارفرما ہوگا۔ اس عمر تک پہنچنے کے بعد قدرت ذہن میں تفریق پیدا کر دیتی ہے اور طبیعت کے غالب رجحان سامنے آنے لگتے ہیں۔ کوئی فکری جھکاؤ رکھتا ہے، کوئی علمی۔ کوئی مذہبی، کوئی صنعتی۔ کوئی جماعتی میلان رکھتا ہے، کوئی جمالیاتی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا اگر تعلیم شخصیت کے احترام کے اصول کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتی تو اسے مختلف میلانوں والے نوجوانوں کے لئے کئی قسم کے ثانوی مدرسے قایم کرنے ہوں گے۔ تاکہ ہر طالب علم کی ذہنی تربیت میں اس کی مخصوص ضرورتوں کا خیال رہ سکے اور تعلیم بہ جبر کسی ٹھپّہ لگا دینے یا کسی من مانے سانچے میں ڈھال دینے کا نام نہ ہو بلکہ صلاحیتوں کے صحیح اور ہم آہنگ نشو ونما سے عبارت ہو۔

پھر ان کے اوپر اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہوں گے جن میں اور بھی زیادہ تفریق ہوگی۔ یہاں

پہنچ کر چونکہ ذہن کی تنقیدی قوتیں اُبھرنے لگتی ہیں اس لئے دنیا کے دوسرے تمدنوں سے واقفیت کے موقعے اس منزل میں اب سے زیادہ پیدا کئے جائیں گے۔ علم کی حدود کو پھیلانے میں یہ ادارے اس وقت سے زیادہ منظم کام کریں گے اور ان کے کام کرنے والوں میں ملک ملک اب سے بہت زیادہ رابطے قایم کرنے کا انتظام ہوگا۔ طالب علموں اور استادوں کے مختلف ملکوں میں جا کر کام کرنے اور ان کی تہذیب و تمدن سے شخصی واقفیت پیدا کرنے کے موقعے بہت عام ہو جائیں گے اور تعلیم میں بین الاقوامی تعاون اور میل جول آج سے کہیں زیادہ ہو جائے گا اس ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ہر ملک میں اچھی اور ذہنی صلاحیتوں والے نوجوانوں کی تلاش اس طرح کی جایا کرے گی، جیسے کوئی اپنے کھوئے ہوئے مال کو ڈھونڈھتا ہے، اور حکومت اپنے خرچ سے ان کی تربیت کا انتظام کرے گی۔ اس نئی دنیا میں اچھی صلاحیت مالی مشکلوں کی وجہ سے ترقی سے محروم نہ رکھی جائے گی۔

لیکن ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں یہ تبدیلیاں بھی نئی دنیا کی ضرورتوں کو پورا نہ کرسکیں گی اب تک جو تجربے ہوئے ہیں انہوں نے ان تینوں منزلوں کی تعلیم کو ایک واقعی آزاد جمہوری دنیا کے لئے بہت ناکافی ثابت کر دکھایا ہے۔ اور ابتدائی تعلیم کے ہر جگہ مفت اور لازمی ہونے کے بعد بھی یہ توقع صحیح نہ ہوگی کہ سچی جمہوریت کو چلانے اور اسے خود غرضوں کا آلہ کار بننے سے بچانے کے لئے شہریوں کی ذہنی تربیت جیسی ہونی چاہیئے ہو جائے گی۔ اس کے لئے تو قوم کے تمام بالغوں کے لئے تعلیم کا ایک نظام قایم کرنا ہوگا۔ ابتدائی لازمی تعلیم کی مدت کو تو شاید ۱۴، ۱۵ سال کی عمر سے آگے بڑھانا مشکل ہو، لیکن دنیا کے سب ملکوں میں اس بات کا انتظام ضرور کیا جائے گا کہ اس کے بعد لڑکے اور لڑکیاں کم سے کم اٹھارہ سال کی عمر تک کمائی کے کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ وقت خاص مدرسوں میں بھی صرف کریں۔ تاکہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ چند سال اور جاری رہ سکے لیکن یہ کافی نہ ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ عمر والوں کے لئے بھی بڑے پیمانے پر تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ جن ملکوں میں بے پڑھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جیسے یا ڈس بخیر ہمارا اپنا ملک، وہاں تو

جہالت کے خلاف ایک بہت بڑا جہاد کرنا ہی ہوگا۔ تاکہ قومی مسائل سے بے خبر اور قومی مقاصد سے ناآشنا اکثریت جمہوریت کے تجربے کو ابتدا ہی میں ناکام نہ کردے۔ لیکن جن ملکوں میں پہلے سے تعلیم لازمی ہے وہاں بھی بالغوں کی تعلیم کا خاص اہتمام کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ سب مانتے ہیں کہ چودہ پندرہ سال کی عمر تک بہت سے مسائل کا اور خصوصاً ان کا جن پر آگاہی جمہوریت کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے پوری طرح ذہن نشین ہونا اور ان عادتوں کا جو مل جل کر رہنے سہنے اور کام کرنے کے لئے ضروری اور اس لئے جمہوریت کی جان ہیں پیدا ہوکر پختہ ہو جانا ممکن نہیں۔ جب تک آدمی زندگی میں داخل نہ ہو جائے اس کے حقیقی مسائل کو کتابوں سے نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے معاش اور سیاسی مسائل کی تعلیم اور قومی ادب اور عالمی تاریخ سے واقفیت کے وسائل فراہم کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ اس لئے کہ جن ملکوں میں لازمی تعلیم ہے وہاں بھی سو میں سے مشکل سے چالیس لڑکے لڑکیاں ابتدائی منزل سے آگے بڑھتی ہیں۔ اور اکثر تعلیم کا سلسلہ چودہ سال کی عمر میں ختم ہو جاتا ہے ہندوستان میں تو یہ سلسلہ ۵ سے شروع ہو پاتا ہے تو ۱۱ سال کی عمر میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ توقع کرنا کوئی بڑی دانشمندی نہیں کہ اس کچی عمر میں وہ باتیں ذہن نشین، اور وہ عادتیں جزو زندگی بن چکی ہوں گی جن کی موجودگی جمہوریت کے حقیقی آقاؤں میں لازمی ہے۔

ان وسیع انتظامات کے لئے بہت وسائل درکار ہوں گے۔ یہ کہاں سے آئیں گے۔ وہاں سے جہاں سے جنگ کے اخراجات پورے ہو رہے ہیں۔ جو قومیں اس جنگ میں اپنا گھر پھونک رہی ہیں انہیں امن کے اس اہم ترین کام کے لئے کم مائگی کا عذر کرتے شاید اب شرم آئے گی اور ضمیر انسانیت کی آواز اس اصرار سے ان وسائل کی فراہمی کا مطالبہ کرے گی کہ انکار کرتے نہ بن پڑے گا۔ اس میں مالدار قوموں کو بلا شرط اور بغیر تجارتی لین دین اور سیاسی بیوپار کی آلائشوں کے انسانی برادری کے تقاضے سے غریب قوموں کا ہاتھ بٹانا ہوگا اور غالباً یہی بے غرض تعاون حقیقی انسانی اتحاد کا امید افزا آغاز ثابت ہو۔

برطانیہ میں قومی ملکیت قائم کرنے کے منصوبے
اور
ان کی عملی دشواریاں

اپریل ۱۹۴۵ء میں برطانیہ کی لیبر پارٹی نے اپنا انتخابی منشور "مستقبل کی تصویر" (لیٹ اس فیس دی فیوچر) کے نام سے شایع کیا تھا۔ اس میں لیبر پارٹی نے اپنے انتخاب کرنے والوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انھیں منتخب کیا گیا تو وہ بنک آف انگلینڈ کو اور ایندھن، قوت محرکہ، ملکی نقل و حمل اور فولاد کی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے آئیں گے اور اس بات کی پوری نگرانی رکھیں گے کہ لازمی صنعتوں میں سرمایہ ایک پہلے سے سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق لگایا جائے۔ لیبر کو انتخاب میں ۳۹۳ نشستیں ملیں۔ کنزرویٹوز کو ۱۹۸، لبرل نیشنلس کو ۱۳ اور لبرلوں کو ۱۲۔ غرض اس طرح منتخب کرنے والوں نے اپنی مرضی کا اظہار صاف طور پر کر دیا۔ اور پارلیمنٹ میں لیبر کے لئے ایک واضح اکثریت کو یقینی کر دیا۔

بادشاہ نے ۱۵۔ اگست ۱۹۴۵ء کو پارلیمنٹ کا سرکاری طور پر افتتاح کرتے ہوئے اس بات کا دوبارہ اعلان کیا کہ سرکاری نگرانی یا ملکیت کا پروگرام اس لئے جاری کیا جائیگا تاکہ ملک کی صنعتیں اور خدمات قومی بہبودی کے لئے زیادہ سے زیادہ کام انجام دے سکیں۔ انتخابی منشور میں جو وعدے کئے گئے تھے اسی قسم کی تجاویز بادشاہ کی تقریر میں بھی موجود تھیں۔ لیبر حکومت نے اس طویل اور پیچیدہ کام کو فوراً ہی شروع بھی کر دیا۔ اس کا تھوڑا سا

حصہ مکمل بھی کیا جا چکا ہے۔ دوسرا حصہ مسودہ قوانین کی صورت میں پارلیمنٹ کی منظوری کے لئے تیار ہے اور بقیہ کے بیشتر حصہ کے لئے ایسے خاکے تیار کئے جاچکے ہیں جن پر پبلک غور اور بحث کرسکتی ہے

انتخاب کے دنوں میں اور اس کے کچھ مہینے بعد تک پبلک کو صرف دو تجویزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک تو بنک آف انگلینڈ پر سرکاری ملکیت قایم کرنے سے اور دوسرے کوئلہ کی کانوں کو سرکاری ملکیت میں لانے سے۔ بنک آف انگلینڈ کو سرکاری ملکیت میں لانا لیبر پارٹی کا بہت پرانا اور مرغوب عقیدہ تھا۔ دوسری تو بنک کی چاہے کتنی ہی مدح سرائی کیوں نہ کریں، لیکن لیبر پارٹی کے راسخ العقیدہ پیرو اپنے اس عقیدہ سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس کے مقابلہ میں کوئلہ کی صنعت کا تعریف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ ایک بیمار اور ربوڑھی صنعت تھی، اس کی طرف سے بے اطمنانی کا پھوڑا پک چکا تھا اور اس کا علاج چوتھائی صدی سے یہی تجویز کیا جارہا تھا کہ اسے قومی ملکیت میں لے آیا جائے۔

یہ بات لیبر حکومت کی عقلمندی پر دلالت کرتی ہے کہ اس نے ان دونوں آسان کاموں کو پہلے شروع کیا اور انھیں بہت جلد ختم کردیا۔ بنک آف انگلینڈ کو قومی ملکیت بنانے کا مسودہ ۱۰ اکتوبر ۴۵ء کو شایع کیا گیا اور یکم مارچ ۱۹۴۶ء کو بغیر کسی شور و ہنگامہ کے قانون بن گیا اور سرکار بنک کی مالک بن گئی۔

بنک پر قبضہ اس لئے آسان ثابت ہوا کہ اس تبدیلی سے کم سے کم فی الحال اس کے کاروبار پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کے کورٹ (بورڈ آف ڈائرکٹرز) کو ۲۴ سے گھٹا کر ۱۶ کردیا گیا۔ لیکن تین ممبروں کو چھوڑ کر اس کے باقی سب ممبر وہی رکھے گئے جو پہلے تھے۔ گورنر لارڈ کیٹو اپنے عہدہ پر حسب سابق قایم رہے۔ بنک کے حصہ داروں کو ایسے سرکاری تمسکات کی صورت میں معاوضہ ادا کیا گیا جن سے آمدنی اتنی ہی ہے جتنی کہ انھیں حصوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

کوئلہ کی کانیں قومی ملکیت بنانے کے دوسرے کام میں یعنی کوئلہ کی کانوں کو قومی ملکیت قرار دینے میں حکومت کو خاص مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اس مسئلہ کو فولاد کی صنعت کے مسئلہ کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر رکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر برطانیہ کی کانیں پرانی ہیں، گہری ہیں، اور ان میں مشین کا استعمال کافی طور پر نہیں کیا جاتا۔ کان کنوں کو برطانیہ کے دوسرے مزدوروں کے مقابلہ میں کم اجرت ملتی ہے اور ان کے کام کے حالات تقریباً ناقابلِ برداشت ہو گئے ہیں لیکن کوئلہ کے مسئلہ کا حل صرف انسانی ہمدردی کے جذبہ کی بنا پر ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کوئلہ ہی صرف وہ کچا مال ہے جس کو برطانیہ روایتی طور پر برآمد کرتی چلی آرہی ہے۔ اور مصنوعات اور غیر مرئی برآمدوں کے علاوہ یہی ایسی برآمد ہے جو باہر کے ملکوں میں برطانیہ کے لئے قوت خرید مہیا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ پھر جو مصنوعات برآمد کی جاتی ہیں ان کے لئے بھی کوئلہ ہی کو بطور ایندھن کے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کام کو بھی یہ خوبی کے ساتھ انجام نہیں دے رہا ہے۔

تقریباً دس سال سے برطانیہ کی کوئلہ کی پیداوار مسلسل اور تیزی کے ساتھ گر رہی ہے غیر ملکی خریدار پیداوار کے دوسرے ذرائع کی طرف رجوع ہو رہے ہیں اور صنعتی کاموں کے لئے خود برطانیہ کو ایندھن کے تیل کو درآمد کرنا پڑتا ہے۔ کوئلہ اب بھی موجود ہے۔ اور بہت افراط کے ساتھ موجود ہے لیکن بہت سالوں سے خراب انتظام اور غیر مطمئن مزدوروں نے مل کر اس صنعت کو ایک طویل اور تباہ کن زوال میں مبتلا کر دیا ہے۔

۱۹۱۹ء میں لارڈ سانکی کی صدارت میں جو کوئلہ کمیشن مقرر کیا گیا تھا، اس نے سرکاری ملکیت قایم کرنے کی سفارش کی تھی۔ کان کھودنے والے مزدور متواتر قومی ملکیت قایم کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر یہ قدم اٹھایا گیا ہوتا تو پچیس سال سے ان کی زندگی کے معیار میں جو پستی پیدا ہو رہی ہے اور تلخ مصیبتوں کا ان کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان سے انھیں نجات مل جاتی۔ مختلف حکومتوں نے وقتاً فوقتاً اس شگاف کو پیوند لگا کر

درست کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں ۱۹۳۸ء کے کوئلہ کی کانوں کے قانون کی دفعات کے ماتحت کوئلہ کمیشن نے کوئلہ کی رائلٹی پر قبضہ کرلیا اور مالکوں کو معاوضہ ادا کر دیا۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں برطانیہ کی کانوں کے مالکوں نے حکومت کی ایک ایسی تجویز کو قبول کیا جس میں انھیں مجبور کیا گیا تھا کہ وہ اپنی کانوں کو جدید نمونہ کا بنائیں لیکن ان سے اور اسی قسم کے دوسرے اقدامات سے پیداوار میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔

۱۹۴۵ء میں ریڈ کمیٹی نے دوبارہ قومی ملکیت میں لانے کی سفارش کی۔ یہ کمیٹی انجینروں پر مشتمل تھی اور اس کے صدر سر چارلس ریڈ تھے جنھوں نے کوئلہ کی کان کنی کے بارے میں فنی مشاورتی کمیٹی کی رپورٹ" کے نام سے اپنی رپورٹ تیار کی۔ ان انجنیروں نے صنعت کو جدید نمونہ پر چلانے کی لاگت کا تخمینہ ایک ارب ڈالر کیا تھا۔ یہ رقم چونکہ ایسی تھی جس کا انتظام نجی مالکان نہیں کرسکتے تھے اس لئے اس مرتبہ بھی کچھ نہیں کیا جاسکا لیکن انتخاب قریب تھا جس کو ایک حد تک قومی ملکیت میں لانے کے پروگرام پر لڑا گیا۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو لیبر حکومت کی طرف سے کوئلہ کی کانوں کو قومی ملکیت میں لانے کے قانون کا مسودہ شایع کیا گیا۔ اس تاریخ کے بعد سے ملک معظم کی حکومت کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس مسودہ میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ایک قومی کوئلہ بورڈ کو کوئلہ کی صنعت سپرد کردی جائے اور وہ ان پالیسیوں کے ماتحت جن کا تعین ایندھن اور قوت محرکہ کی وزارت کرے۔ کوئلہ کی پیدائش اور تقسیم پر جملہ اختیارات رکھے۔ مالکوں کو معاوضہ سرکاری تمسکات کی صورت میں ادا کیا جائے اور ان کی فروخت پذیری کو محدود کر دیا جائے۔ ایندھن اور قوت محرکہ کی وزارت اس قانون کے منظور ہونے کے پانچ سال کے اندر اندر ساٹھ کروڑ ڈالر تک قرض دے سکتی ہے اور اس کے بعد پارلیمنٹ جن رقموں کا تعین کرے وہ قرض دی جاسکتی ہیں۔

کوئلہ کی ان تجاویز کی مخالفت | بنک آف انگلینڈ کو قومی ملکیت بنانے کے مقابلہ میں

اس مسودہ کی کہیں زیادہ سخت اور موثر مخالفت کی گئی۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۶ء کو جب مسودہ کی خواندگی شروع ہوئی، مخالفت مجتمع ہونا شروع ہوئی۔ اس کا اظہار ایک تو کوئلہ کی کانوں کے مالکوں کی طرف سے مسٹر رابرٹ فٹ برطانیہ عظمیٰ کی کانوں کی انجمن کے صدر نے کیا اور دوسرے کنزرویٹوز کی طرف سے مسٹر اینتھنی ایڈن نے کیا جو مسٹر چرچل کی عدم موجودگی میں مخالف پارٹی کے رہنما تھے۔

صنعت کے مالکوں نے معاوضہ کے ادا کرنے کے طریقہ کی مخالفت کی جس کے بارے میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کئی وجوہ سے انصاف کے خلاف ہے۔ صنعت کے نمائندے اس بات کو تو محسوس کرتے تھے کہ قومی ملکیت کے اصول کی مخالفت کرنے کا زمانہ تو مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے لیکن وہ اس بات کی پوری کوشش کرنا چاہتے تھے کہ انھیں متعین اور منصفانہ معاوضہ ادا کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو یہ معاوضہ نقد کی صورت میں ادا کیا جائے۔ مخالف جماعت نے ایک ترمیم پیش کی جس سے حکومت کی پوری تجویز بیکار ہو جاتی تھی لیکن اسے ۱۸۲ رایوں کے مقابلہ میں ۳۵۹ رایوں سے نامنظور کر دیا گیا لیکن مباحثہ کے دوران میں انہوں نے جو دلیلیں پیش کیں ان کا اچھا اثر ہوا۔ میجر لائیڈ جارج نے جو ملی جلی حکومت میں ایندھن اور قوت محرکہ کے وزیر رہ چکے تھے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ قومی ملکیت بنانے کی تجویز سے کوئلہ کی صنعت پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا ہے۔ کیونکہ پیداوار گر رہی ہے اور بلاارادہ غیر حاضری بڑھ رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس تجویز کی جگہ اگر حکومت ریڈ کمپنی کی سفارش کے بموجب کاروبار کی نئی تنظیم شروع کر دیتی تو اس سے بہتر نتیجہ برآمد ہوتا۔

اس کے بعد سے صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ مزدور پارٹی کے ایندھن اور قوت محرکہ کے وزیر مسٹر ایمانیول شنول نے کان کنوں کی طرف توجہ مبذول کی اور ان سے اپیل کی کہ کوئلہ کی پیداوار میں جو کمی ہو رہی ہے اُسے روکیں، خود کان کنوں کو اس بات میں

شبہ تھا کہ قومی ملکیت قایم ہونے سے ان کو فوری فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ فروری کے آخر میں کان میں کام کرنے والوں کی قومی انجمن کے صدر ول آہنر نے مطالبہ کیا تھا کہ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لانے کا کام باقاعدگی کے ساتھ تدریجی منزلوں میں کیا جائے۔ انہوں نے کہا: "تمام صنعتوں کو ایک ساتھ قومی ملکیت میں لانے کی نہ تو اُمید رکھنی چاہئے نہ اس کی کوشش کرنا چاہئے"۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ جو صنعتیں سرکاری ملکیت میں ہیں انھیں سیاسی نگرانی سے آزاد کر دیا جائے۔ یہ بات صاف اور واضح ہے کہ کان کھودنے والوں کو جس حد تک قومی ملکیت بنانے کے کام میں شریک کیا گیا تھا اس سے وہ مطمئن نہیں تھے اور اس بات پر ان کو غصہ تھا کہ مزدور حکومت قایم ہوئے مہینے گذر چکے تھے لیکن پھر بھی ان کے کام کے حالات میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوئی تھی۔

سرمایہ کاری پر نگرانی

کوئلہ ایسی چیز ہے جس سے برطانیہ کے ہر شخص کو گہرا تعلق ہے اور اس کے مسائل کو ملک کے سب لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن سرمایہ داری پر نگرانی قایم کرنا جس کا مزدور پارٹی نے اپنی انتخابی مہم کے زمانہ میں وعدہ کیا تھا ایک ایسا مسئلہ تھا جس کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ جب ۲۳ رجنوری ۱۹۴۶ء کو سرمایہ کاری (نگرانی اور ضمانت) کے قانون کا مسودہ قرطاس ابیض کی صورت میں شایع کیا گیا تو اس پر تنقید و تبصرہ تقریباً تمام تر مالیاتی حلقہ تک محدود رہا۔ مزدور جماعت کے ان حلقوں کے علاوہ جو مالی مسائل سے واقفیت رکھتے ہیں۔ باقی عام لوگوں کے لئے اس تجویز کی نوعیت اور مقصد کوئی دلچسپی نہ رکھتی تھی۔

اس کے ذریعہ اور اسی قسم کی دوسری تجاویز کے ذریعے حکومت کا منشاء یہ ہے کہ ان منصوبوں کو ترجیح دی جائے جو روزگار کی سطح کو بلند رکھنے اور قومی ترقی کو آگے بڑھانے میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے ذریعہ اجرائے سرمایہ کی کمیٹی کو دو لاکھ ڈالر سے زاید کے اجرائے سرمایہ پر نگرانی قایم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور

خزانہ سرکاری کو مجاز بنایا گیا ہے کہ وہ کسی ایک سال میں بیس کروڑ ڈالر تک صنعتی قرضوں کی ضمانت کرسکتی ہے۔

۵ فروری کو جب اس کی دوسری خواندگی ہورہی تھی تو قدامت پسندوں نے یہ اعتراض کیا کہ اس کی وجہ سے ایسے زمانہ میں آزاد اقدام کی حوصلہ شکنی ہوگی جب کہ ملک کو آزاد تجربوں کی بہت ضرورت ہے لیکن مخالف پارٹی کی ترمیم ۱۴۲ کے مقابلہ میں ۳۴۶ رایوں سے نامنظور کردی گئی۔ لندن کے فنانشل ٹائمز نے اس پر یہ تبصرہ کیا تھا کہ "مالی حلقہ کو اب اس بات کا یقین ہوگیا ہے، جیسا کہ مدت سے بہت سے لوگوں کو جن میں مزدور حکومت کے بہت سے ہمدرد بھی شامل ہیں، توقع تھی کہ مسٹر ڈالٹن اور حکومت بہ صورت مجموعی لندن کی سرمایہ کی منڈی کے طریقۂ کار کو نہیں سمجھتے ہیں اور انھیں اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے کہ یہ پیچیدہ لیکن کارگزار تنظیم صنعت اور تجارت کی بحالی میں کتنی سہولت پیدا کرسکتی ہے"۔

لورپول کی کپاس کی منڈی کی منسوخی

۱۸ مارچ کو برطانوی حکومت نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ لورپول کی کپاس کی منڈی کے دوبارہ کھولے جانے کو ممنوع قرار دے گی اور اس کی جگہ مرکزی خریداری کا ایک مستقل نظام قایم کردے گی۔ اس کے خلاف بڑا شور و غوغا ہوا۔ اور ۴ اپریل کو ایوان عوام میں گھمسان کا معرکہ ہوا لیکن جب اس کی مخالفت پر ایوان عوام میں رائے شماری کی گئی تو ۱۸۶ کے مقابلہ میں ۳۲۷ سے اسے شکست دی گئی۔

فولاد کی پیچیدہ صورتِ حال

فولاد شروع ہی سے پروگرام میں شامل تھا۔ آخر کار ۱۷ اپریل کو سپلائی کے وزیر جان سی۔ ولماٹ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ لوہے اور فولاد کی صنعت میں سرکاری ملکیت کو بڑی حد تک رائج کیا جائیگا لیکن اب قومی ملکیت کی جاذبیت ختم ہوچکی تھی اور لوگوں کا مزاج چڑچڑا ہوگیا تھا

مخالف پارٹی کے رہنما مسٹر چرچل نے کہا کسی کو اس بات کا پتہ نہیں ہے کہ ان تجاویز کا مفہوم کیا ہے۔ امریکہ کے ایک اخباری نمائندے نے بیان دیا کہ مسٹر ولماٹ نے جو دو پریس کانفرنسیں کیں ان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ کس چیز کو قومی ملکیت میں لانا ہے۔ اور کب یہ کام کرنا ہے۔ کون اس صنعت کو چلائے گا، معاوضہ کس طرح ادا کیا جائیگا سرکاری خزانہ پر اس کا کتنا بوجھ پڑے گا، اور صنعت میں جو غیر ملکی سرمایہ لگا ہے اس کا کیا حشر ہوگا۔

حکومت نے مناسب وقت پر اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ فولاد کوئلہ سے بھی زیادہ پیچیدہ صنعت ہے۔ کوئلہ کی طرح قومی ملکیت قایم کرنے کے اصول کو سامنے رکھ کر معاشیات کے ماہروں اور انجنیروں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ قومی ملکیت بنانے کا جو قبل از وقت اور ناعاقبت اندیشانہ اعلان کیا گیا، اس کے فوراً بعد یہ خبر آئی کہ حکومت صنعت کی نئی تنظیم کے بارے میں لو ہے اور فولاد کی فیڈریشن کی رپورٹ کو قرطاس ابیض کی صورت میں شایع کرے گی۔

غالباً اس وجہ سے کہ اس کے اندر غیر یقینی باتیں بہت سی شامل ہوتی ہیں، جب کبھی کسی صنعت کو قومی ملکیت میں لانے کا اعلان کیا جاتا ہے تو محض اس اعلان پر اتنا ہی بحث و مباحثہ شروع ہو جاتا ہے جتنا کہ اصل مسودات قانون پر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ سال یکم نومبر کو جب پارلیمنٹ کو اس بات کی اطلاع دی گئی تھی کہ لاسلکی اور سول ہوائی خدمات کو سرکاری انتظام میں چلایا جائے گا تو اسے لوگوں نے خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا تھا لیکن جب ہربرٹ مارین لارڈ پریسیڈنٹ آف دی کونسل نے ایوان عام سے ۱۹ر نومبر کو یہ کہا کہ حکومت کے پنج سالہ پروگرام میں بجلی اور گیس، مسافروں کی نقل وحمل اور لوہا اور فولاد بھی شامل ہیں تو ایک ایسا طوفان برپا ہوا کہ اسے خود وزیر اعظم اٹیلی کو خاموش کرنا پڑا۔ حالانکہ اس بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ مزدور پارٹی کے انتخابی پروگرام میں یہ سب چیزیں موجود تھیں۔

اس کے بعد سول ہوا بازی اور ہوائی اڈوں کا مسودہ شایع کیا جاچکا ہے، کیبل اور بے تار برقی کا مسودہ تیار ہوگیا ہے اور گیس کی تجاویز کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کردی گئی۔ اس کے علاوہ ۲۲ مارچ کو قومی صحت کی خدمت کا جو مسودہ شایع کیا گیا ہے اس میں نجی ہسپتالوں کو وزارت صحت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

لیکن کوئی مشکل حکومت کو قومی ملکیت بنانے کے اس پروگرام سے جو ۱۹۴۵ء میں پیش کیا گیا تھا، باز نہیں رکھ سکے گی۔ سیاسی صورتِ حال مستحکم ہے جیسا کہ ذیل کی رائے شماری سے جو بنک آف انگلینڈ کوئلہ سرمایہ کاری اور کپاس کی سرکاری خریداری کے مسودوں پر ہوئی، ظاہر ہوتا ہے۔

سرکاری تجویز برائے	موافقت میں	مخالفت میں
بنک آف انگلینڈ	۳۴۸	۱۵۳
کوئلہ	۳۵۹	۱۸۲
سرمایہ کاری	۳۲۶	۱۴۲
کپاس	۳۳۷	۱۸۶

عوام کے منتخب شدہ نمائندے اپنے وعدوں اور اپنے عقیدوں کے مطابق رائے دیتے ہیں لیکن نئی پالیسی کے نتائج کا پتہ جب ہی چل سکے گا جب بہت سے مہینے گذر جائیں گے۔ نجی مالکوں کو ظاہر ہے مزدور حکومت کی قومی ملکیت قایم کرنے کی ہوا نجی ...ش نہیں رکھ سکتی لیکن اس کے بارے میں مجموعی طور پر جو ابہام پایا جاتا ہے وہ وزیر مالیات ڈالٹن کے ۱۹۴۶-۴۷ء کے بجٹ کے کئی نکتوں سے بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

جن صنعتوں پر اس کا اثر پڑا ہے ان کی ابتدائی شہادت سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ ساہوکاروں کا حلقہ اس کی وجہ سے بالکل ہراساں نہیں ہے۔ فولاد اور کپاس البتہ غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ نقل وحمل اور خبر رسانی کی خدمات بڑے پیمانہ کی سرکاری

نگرانی سے مانوس ہو چکے ہیں اور ان کو اس کی وجہ سے نسبتاً کم صدمہ پہنچا ہے۔ کوئلہ کی صنعت میں جو تکلیف دہ زوال پایا جاتا ہے وہ اس کی وجہ سے نہ کچھ کم ہوا ہے نہ بڑھا ہے لیکن صنعتی حلقہ میں جو چیز بالکل صاف ہے وہ یہ ہے کہ ہر نئے قدم پر فنی مشکلات زیادہ شدید ہوتی جارہی ہیں۔

ایک آمرانہ حکومت کے مقابلہ میں برطانیہ کا کام زیادہ مشکل ہے۔ اسے ہر منزل پر مشورہ کرنا اور لوگوں کو رازدار بنانا پڑتا ہے۔ اسے پرانے کاروبار اور طویل مدت سے قایم کارخانوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام وسیع مرغزاروں اور میدانوں میں نئے کارخانے قایم کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ کاروبار میں جو بھی لوگ شریک ہیں ان کی قوتوں کو بھی مضبوط کرنا ضروری ہے۔ یہ سب کام اس وقت کرنا ہے جب کہ خارجی تجارت اور مبادلہ کا رجحان برطانیہ کے ناموافق ہے۔ وزیر اعظم اٹیلی کی وزارت پر آئندہ کا مورخ اور دوسرا جو بھی تبصرہ کرے لیکن یہ تنقید ہرگز نہ کرسکے گا کہ اس میں ہمت اور جرات کی کمی تھی

ایران کا سیاسی پس منظر

تقریباً گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ایران کے ملک کو تاریخ کی کتابوں میں بساطِ سیاست کے ایک ایسے بے جان مہرہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے جو ذاتی قوت اقدام اور قومی مقاصد سے بالکل محروم ہے اور جسے دوسرے طاقتور ملک اپنے شہنشاہی مقاصد کو پورا کرنے اور حریفانہ تگ و دو کو جاری رکھنے کے لئے برابر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اُسے حریف طاقتوں کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ کبھی ان کے لئے اسے ٹکر روک (بفر) کی خدمت انجام دینا پڑتی ہے۔ کبھی ان طاقتوں کے لئے جو عارضی طور پر متحد ہو جاتی ہیں اُسے ایک پُل بننا پڑتا ہے اور کبھی ان حریف سلطنتوں کے لئے جو جنگی مصلحت یا تجارتی سہولت کی خاطر باہم زور آزمائی کرتی رہتی ہیں، اُسے میدان جنگ بننا پڑتا ہے۔ غرض بین الاقوامی سیاست کے ان پیچ در پیچ معاملات میں کہیں بھی اُس کے کسی مستقل ارادہ، داخلی منصوبہ یا آزاد نصب العین کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن کیا ایران کی اس تصویر کو صحیح سمجھا جا سکتا ہے؟ ایران کی بہر حال اپنی ایک زندگی ہے اور اس کا مطالعہ بجائے خود اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بین الاقوامی سیاست میں اس کی تابع اور ماتحت حیثیت کا۔ ذیل کے مضمون میں ایران کی زندگی کے اسی پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایران کا ملک اور اس کی آبادی

ایران کا رقبہ چھ لاکھ ۲۸ ہزار مربع میل ہے۔ اس میں سے صرف دس تا پندرہ فی صدی پر کاشت کی جاتی ہے۔ بیس یا تیس فی صدی ایسا رقبہ ہے جس کی آبپاشی کا اگر کوئی انتظام ہو جائے تو اس پر کاشت کرنا ممکن ہے

اس کے علاوہ باقی سب رقبہ یا تو چراگاہ ہے یا جنگل یا ویران بنجر۔ ایران کی آبادی کے بارے میں صحیح اعداد تو نہیں ملتے لیکن جو اعداد سب سے زیادہ لائق اعتماد ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ آبادی ڈیڑھ کرور کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے تقریباً ایک کرور آدمی زراعت پر گذر کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ پچاس ہزار بڑے اور چھوٹے گاؤں میں بکھرے ہوئے طریقہ پر رہتے ہیں۔

ایران کے حقوق آراضی کا نظام بڑا پیچیدہ ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں عرب فاتحوں نے جو نظام یہاں رائج کیا تھا تقریباً اسی کی بنیاد پر حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ مختلف صوبوں میں مقامی رسم و رواج کی وجہ سے اس میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے ہیں لیکن بصورت مجموعی اس میں اور مغرب کی عرب ریاستوں کے نظام میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ مزروعہ زمین کا تقریباً دس فی صدی حصہ سرکاری ملکیت میں ہے یعنی ان زمینوں کو کسان سرکار سے لگان پر لے کر جوتتے ہیں۔ پیداوار میں سے اپنا حصہ یا تو سرکار براہ راست اپنے کارندوں کی معرفت وصول کرتی ہے یا پھر مستاجروں کی معرفت جنھیں ایک مقررہ رقم کے معاوضہ میں لگان وصول کرنے کا ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔ اس آخری نظام میں جو خرابیاں ہیں انھیں سب جانتے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں سرکاری زمینوں اور ان سے مال گذاری وصول کرنے کے حق کو ایک طرح کی جاگیر کے طور پر عطا یا فروخت کیا جاتا تھا لیکن ۱۹۰۷ء سے یہ چیز خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے اور اب سرکاری مال گذاری کی زمینوں کو صرف پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعہ ہی دوسرے اشخاص کے نام منتقل کیا جا سکتا ہے۔ مزروعہ رقبہ کا تقریباً دس فی صدی مزید حصہ اوقاف پر مشتمل ہے یعنی ایسی زمینوں پر جو مذہبی یا خیراتی کاموں کے لئے وقف ہیں۔ ان زمینوں کا انتظام زیادہ تر ملاؤں کے ہاتھ میں ہے اور ان پر تھوڑی سی نگرانی حکومت کی بھی ہے۔ حال میں کسی زمین کو وقف کرنے سے پہلے حکومت سے اجازت حاصل کرنا ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ باقی سب زمین پر یعنی اسی فی صدی پر نجی ملکیت قایم ہے۔ اس کا بیشتر حصہ نسبتاً ایسے کم تعداد زمینداروں کے قبضہ میں ہے جو اپنی زمین پر نہ خود کام کرتے ہیں نہ رہتے ہیں۔

آزاد چھوٹے زمینداروں کا طبقہ بہت کم ہے اور اس کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ کسانوں کی زیادہ تر تعداد اپنا لگان جنس کی صورت میں ادا کرتی ہے اور اپنے زمینداروں کے بسائے ہوئے گاؤں ہی میں رہتی ہے کہیں کہیں ایک آدھ ایسا بڑا زمیندار بھی ملتا ہے جو اپنے گاؤں میں رہتا ہے اور یا تو خود اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے یا اپنے کام کی نگرانی کرتا ہے لیکن عام طور پر زمیندار پرباسی ہیں اور اپنی زمین پر نہیں رہتے اور کسی نہ کسی قسم کے پٹّے کے ذریعہ اپنی زمینوں سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ پٹّہ کی سب سے عام شکل وہ ہے جسے مضاربت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس میں پیداوار کا بٹوارہ کیا جاتا ہے۔ زمین کا ایک قطعہ کسان کو معینہ مدت کے لئے پٹّہ پر دے دیا جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں پیداوار کا ایک حصّہ وصول کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسان پیداوار کا فی صدی حصّہ ادا کرنے کی جگہ مقررہ مقدار ادا کرنے کا معاہدہ کر لیتا ہے لیکن ہر دو صورت میں زمین اور کسان پر زمیندار کی پوری نگرانی قایم رہتی ہے۔ دوسرا نظام وہ ہے جس میں زمیندار ایک ایسے درمیانی آدمی کو اپنی زمین پٹّہ پر دیتا ہے جو خود کاشتکار نہیں ہوتا۔ یہ درمیانی آدمی کسان سے اس کی پیداوار کا ایک حصّہ وصول کرنے کے حق کے معاوضہ میں زمیندار کو ایک مقررہ رقم ادا کر دیتا ہے۔ یہ طریقہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، سرکاری زمینوں پر اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔

زمین کی پیداوار میں زمیندار اور کاشتکار کے یہ حصّے مقامی حالات اور رسم و رواج کے مطابق مختلف مقامات میں مختلف ہیں۔ زمیندار کا حصّہ کم سے کم بیس فی صدی ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پچھتّر فیصدی۔ لیکن اس کے بعد جو بچتا ہے وہ بھی سارا کا سارا کسان کو نہیں مل جاتا۔ کیونکہ اس میں سے اسے کارندوں، کھیت کے محافظوں، مُلّاؤں اور دوسرے لوگوں کا حق نکالنا ہوتا ہے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اپنی پیداوار کے صرف پانچویں حصّہ کو کسان اپنا کہہ سکتا ہے۔

ایران میں دیہی زندگی کے حالات بہت خراب ہیں۔ آبپاشی اور کاشت کے طریقے اکثر

جگہوں میں ابھی تک بہت ابتدائی حالت میں ہیں اور سماجی اور تمدنی سہولتیں تقریباً بالکل مفقود ہیں حقیت آراضی کے جو نظام رائج ہیں ان کی وجہ سے کسان کے پاس بس اتنا بچ پاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتا ہے لیکن اس میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ حکمران طبقہ کے ایجی مددگاروں کے ظلم و ستم سہنے کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکے۔

اس ایک کروڑ کی زراعت پیشہ آبادی کے بعد دوسرا نمبر تیس لاکھ کی قبائلی آبادی کا ہے جس کا بیشتر حصہ خانہ بدوش ہے۔ یہ لوگ موسمی چراگاہوں میں اپنے گلوں کو جن میں زیادہ تر بھیڑیں ہوتی ہیں چراتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض خانہ بدوش قبیلے آہستہ آہستہ گاؤں میں بس رہے ہیں اور زراعت کے پیشے کو شروع کر رہے ہیں اور سکونت کی مختلف منزلوں میں زندگی گزارتے ہوئے انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔

سب سے آخر میں بیس لاکھ کے قریب شہری آبادی ہے جن میں سے پانچ لاکھ سے زائد دارالسلطنت میں رہتے ہیں اور ڈھائی لاکھ کے قریب تبریز میں جو آذربائیجان کا صوبائی دارالسلطنت ہے اور ایران کے شہروں میں اس کا دوسرا نمبر ہے۔

ابھی تک ایران میں صنعتیں بہت کم ہیں۔ ان میں سب سے اہم قالین اور پارچہ بافی کی صنعتیں ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کے زمانہ میں سرکاری نگرانی میں کئی صنعتوں کو شروع کیا گیا تھا۔ چنانچہ اصفہان کا قدیم شہر ایک چھوٹا سا صنعتی مرکز بن گیا ہے، جہاں مزدوروں کے جھگڑے اور ہڑتالیں شروع ہو گئی ہیں۔

ایران میں صوبہ پرستی کا جذبہ

ایران میں صوبہ پرستی کا شمار بھی اہم ترین مسائل میں کیا جا سکتا ہے۔ ایران کے تقریباً سب بڑے صوبے قدیم زمانہ سے اپنا ایک انفرادی وجود رکھتے چلے آرہے ہیں اور ان کی مخصوص روایات اور ان کے مراسم کی جڑیں نہایت گہری اور پائدار معلوم ہوتی ہیں۔ ایران کی تاریخ میں جب کبھی مرکزی حکومت کمزور ہوئی ہے صوبوں کا رجحان خود مختار بلکہ آزاد مطلق بن جانے کی طرف رہا ہے اور یہ تو

ہمیشہ ہی ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے مقامی حقوق اور رسم و رواج کو مرکزی حکومت کی دست بُرد سے بچانے کے لئے مستقل مزاجی کے ساتھ کوشش جاری رکھی ہے۔ بعض صوبوں میں صوبہ پرستی کے اس جذبہ کو نسلی، مذہبی اور لسانی اختلافات کی وجہ سے اور زیادہ تقویت حاصل ہوگئی ہے۔

رضا شاہ پہلوی کی آمریت کے زمانہ میں، حکمت عملی کا مرکزی مقصد یہ ہوگیا تھا کہ صوبائی اختلافات اور مقامی روایات کو ختم اور مرکزی حکومت کو سارے قومی علاقہ پر مستحکم کیا جائے لیکن رضا شاہ کے بے درد جبر و تشدد کے باوجود، صوبائی تحریکیں سطح کے نیچے دبی ہوئی حالت میں باقی رہیں اور ۱۹۴۱ء میں جب اس کی آمریت کا زوال ہوا تو یہ نئی طاقت کے ساتھ باہر نکل آئیں۔

آذر بائیجان کا مسئلہ ان صوبوں میں جس صوبے کے بارے میں سب سے زیادہ بحث و گفت گو ہوئی ہے اگرچہ وہ شاید سب سے زیادہ اہم نہیں ہے، آذر بائیجان کا صوبہ ہے۔ یہ شمال مغرب میں واقع ہے اور ترکی اور سویٹ روس کی سرحد سے ملحق ہے۔ آذر بائیجان برسہابرس سے ایران کی سلطنت کا ایک حصہ چلا آرہا ہے۔ زردشت جو ایران کے قدیم مذہب کا بانی تھا اور جس کا شمار اس ملک کے عظیم ترین فرزندوں میں کیا جاتا ہے۔ غالباً یہیں پیدا ہوا تھا لیکن آذر بائیجان کی اکثریت فارسی نہیں بولتی۔ ان کی زبان ترکی ہے جس کا رشتہ ناتہ یا تو جمہوریہ ترکی کی زبان سے ملتا ہے یا پھر اس سے زیادہ سویٹ یونین کے ملحقہ صوبوں میں جو ترکی زبان بولی جاتی ہے اس سے ملتا ہے۔ آذربائیجان میں ترکی زبان گیارھویں بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی سے بولی جارہی ہے جبکہ مرکزی ایشیا کے ترکی حملہ آوروں کی پے در پے لہروں نے صوبہ کی نسلی اور لسانی ساخت میں تبدیلی پیدا کردی تھی اور یہاں فارسی کی جگہ ترکی زبان کو رائج کردیا تھا۔

لیکن گذشتہ زمانہ میں زبان کے اس اختلاف کے باوجود آذربائیجان کے لوگوں نے کبھی ایرانی سلطنت سے علیحدہ ہونے اور کسی دوسری مملکت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی لیکن گذشتہ پچیس سال میں جو واقعات رونما ہوئے انھوں نے حالات کو بدل دیا ہے۔

جانب دار لوگوں کی اختلافی دلائل سے صحیح طور پر یہ اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ یہ تبدیلی کسقدر مکمل ہو چکی ہے لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا ذمہ دار زیادہ تر رضا شاہ کی مرکزیت پسند حکمت عملی کو قرار دیا جا سکتا ہے جس نے آذر بائیجان کے لوگوں کو جبر یہ طور پر ایرانی بنانے کی اور ان کی زبان کو ختم کرنے کی کوشش میں ان کے اندر پہلی مرتبہ اپنے جداگانہ وجود کا شعور پیدا کر دیا۔

اس تبدیلی میں دو اور باتوں سے بھی مدد ملی۔ ایک تو سلطنت ترکی سے اتحاد تورانی کے خیالات پھیلائے گئے اور اس میں تمام ترکی بولنے والوں کی باہمی اخوت پر زور دیا گیا جس کی وجہ سے آذر بائیجان کے لوگ اپنے آپ کو ترکی بولنے والے ایرانی کی جگہ واقعی ترک سمجھنے لگے۔ لیکن بصورت مجموعی اتحاد تورانی کا اثر آذر بائیجان میں بہت کم ہوا۔ اگرچہ اس کی وجہ سے مقامی پڑھے لکھے لوگوں میں پہلی مرتبہ ترکی قومیت کا شعور پیدا ہوا۔

سویت آذر بائیجان کی ترغیب و کشش

لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ اس کے بالکل قریب شمال میں آذر بائیجان کی سویت جمہوریت قایم کر دی گئی۔ سویت کا یہ علاقہ اپنی آبادی، نسل اور زبان کے لحاظ سے ایران کے اسی نام کے صوبہ سے تقریباً بالکل مشابہ ہے۔ حقیقتاً یہ اسی کا ایک حصہ تھا لیکن اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں کوہ قاف میں زار کی سلطنت کی توسیع کی وجہ سے یہ علاقہ روس کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ عین اس وقت جبکہ ایرانی آذر بائیجان میں جبری طور پر ایرانی بنانے کی مہم جاری تھی، سویت آذر بائیجان کو بڑی حد تک مقامی خود مختاری اور مکمل لسانی اور تمدنی خود ارادیت کا حق ملا ہوا تھا۔

ان دونوں حکومتوں کی قومی حکمت عملی میں تضاد کے علاوہ ایک اور ایسا تضاد موجود تھا جس کی اہمیت عام آدمیوں کے نزدیک اس سے بہت زیادہ تھی اور وہ تھا زندگی کے معیاروں کا تضاد۔ ایرانی آذر بائیجان میں بدنصیب افلاس زدہ کسان، یہ باسی زمینداروں اور بددیانت اور نااہل حکومت کے اہلکاروں کے جوئے میں بیلوں کی طرح جُتے ہوئے تھے لیکن سویت

آذر بائیجان میں چیزوں کی اگر بہتات نہیں بھی تھی تو بھی ان کی تقسیم زیادہ منصفانہ تھی۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ عام معیار میں تدریجی ترقی برابر جاری تھی۔

جب ۱۹۴۱ء میں سویت روس نے شمالی ایران پر قبضہ کیا تو دونوں آذر بائیجان کے درمیان جو مہر بند سرحدیں تھیں وہ کھل گئیں اور ان کے باہمی تضاد سب لوگوں پر اچھی طرح روشن ہو گئے۔ یہ قیاس کرنا خلاف حقیقت نہ ہو گا کہ سویت حکمرانوں کی طرف سے اس تضاد کو چھپانے یا کم کر کے دکھلانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کا نتیجہ لامحالہ یہ نکلا کہ ایرانی آذر بائیجان میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی جس میں ان مایوسیوں کی وجہ سے اور اضافہ ہوا جو آمریت کے خاتمہ کے بعد ایران میں ناکارہ اور بے بس حکومتوں کے بنائے جانے سے پیدا ہوئیں۔

آذر بائیجان کے لوگ دراصل کیا چاہتے ہیں۔ اس کا موجودہ حالات میں یقین کے ساتھ بتلانا مشکل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے معاشی اور سماجی حالات میں بہتری کے خواہشمند ہیں۔ اور یہ چیز ملک کے طول و عرض میں آبادی کی بڑی اکثریت چاہتی ہے۔ غالباً وہ ایک حد تک انتظام سلطنت میں بھی مقامی خود مختاری کے خواہشمند ہیں لیکن یہ بات کہ وہ ایران سے علیحدگی چاہتے ہیں کچھ مشتبہ سی معلوم ہوتی ہے اور یہ بات تو بہت ہی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسری مملکت میں ضم ہونے کے خواہشمند ہیں۔

بہر حال اسی ضمن میں یہ بیان کر دینا مناسب ہو گا کہ ایران کے ہاتھ سے اگر آذر بائیجان نکل گیا تو اس ملک کو بہت سخت نقصان پہنچے گا۔ کیونکہ آذر بائیجان ایران کا سب سے زیادہ زرخیز اور بار آور صوبہ ہے۔ اس کی فاضل غذائی پیداوار، یعنی غلہ، انڈے مرغی، دودھ مکھن اور پھلوں سے ملک کے دوسرے حصوں کو جس میں دارالسلطنت بھی شامل ہے غذا مہیا کی جاتی ہے بعض مصنفوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایران آذر بائیجان کے بغیر اپنے آزاد وجود کو قایم نہیں رکھ سکتا اور اس کے دوسرے ملک میں ضم ہونے کے کچھ عرصہ بعد سارے ملک کا جذب ہونا لازمی ہو جائے گا۔

کُرد — ایرانی آذربائیجان کے بالکل جنوب مغرب میں ایرانی کُردستان ہے اور اور یہ عراقی سرحد کے برابر اُرمیا سے شروع ہو کر کرمان شاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ کُرد اپنی اصل کے لحاظ سے ہندی یورپی نسل سے ضرور تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ایرانیوں سے ان کی نسل مختلف ہے۔ ان کی تعداد تیس چالیس لاکھ کے قریب ہے۔ اور یہ اس علاقہ میں ملتے ہیں جہاں ترکی، ایران اور عراق کی سرحدیں ملتی ہیں۔ کُردوں کی آدھی سے زیادہ تعداد جمہوریہ ترکی کے علاقہ میں پائی جاتی ہے آٹھ لاکھ عراق میں ہیں۔ ڈھائی لاکھ شام میں۔ پانچ لاکھ ایران میں اور بیس ہزار سوویت یونین میں۔

کُردوں کی قومی تحریک چھوٹے پیمانہ پر انیسویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوئی تھی لیکن جنگ عظیم اوّل کے بعد کے زمانہ تک اس کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اس وقت البتہ جب ترکی کی طرف سے ترکی کُردوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی پیہم کوششیں کی گئیں تو جنوب مشرقی ترکی میں کُردوں کی قومی تحریک نے تیزی سے ترقی کرنا شروع کی اور ملحقہ ملکوں میں بھی یہ تحریک پھیل گئی۔

رضا شاہ پہلوی کی آمریت کا زمانہ کُردوں کے لئے بہت بُرا ثابت ہوا۔ قبائلی سردار جو ہر مقامی تحریک کے قدرتی رہنما ہوتے ہیں یا تو جلا وطن کر دیئے گئے یا قید خانوں میں بند کر دیئے گئے۔ ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ کُردوں کے علاقہ میں ایرانی فوجیں آ گئیں مستحکم چھاونیاں قایم کی گئیں اور جبر و تشدد اور انسداد کی ایک سخت پالیسی کو جاری رکھا گیا۔

یہاں بھی ۱۹۴۱ء میں مرکزی حکومت کے دیوالیہ ہو جانے پر مقامی تحریک کا احیا ہوا اور کُرد سرداروں کو اپنا اقتدار دوبارہ قایم کرنے اور مقامی نگرانی کو سنبھالنے کا موقع مل گیا اسی زمانہ میں خود مختاری کی تحریک کی کمیٹیاں بنائی گئیں اور کُردوں کی زبان میں پمفلٹ اور اخبار چھاپے گئے اور ایران کے کُردوں میں تقسیم کئے گئے اور چوری چھپے ترکی اور عراقی کُردستان میں بھی پہنچائے گئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کُردوں کی تحریک خود مختاری کے چلانے والے بہت ابتداہی سے

روس کی امداد کے طالب بن گئے تھے۔ سویت یونین میں آرمینا کی سویت جمہوریت میں کُردوں کا جو مختصر گروہ آباد ہے ان کی قومی حیثیت تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اسکولوں اور کالجوں میں کُردوں کی زبان استعمال کی جاتی ہے، کُردی کی کتابیں اور اخبار شایع کئے جاتے ہیں اور کُردوں کے لوک گیت اور ادب کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ دراصل کُردوں کا یہی ایک گروہ ایسا ہے جسے مکمل ثقافتی خودمختاری حاصل ہے اور اس کا اثر سویت حدود سے باہر بھی پھیلا ہوا ہے کُرد قوم پرستوں کی نمائندہ کمیٹی (خی بُن) کا مطالبہ یہ ہے کہ ترکی، ایران، عراق اور شام کے کچھ علاقوں کو کاٹ کر ایک آزاد کُردستان بنا دیا جائے۔ لیکن کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر ان مُلکوں میں ان کو تمدنی خودمختاری دے دی گئی تو وہ غالباً مطمئن ہو جائیں گے۔

ایرانی کُردوں کی اکثریت شمالی ایران کے اس حصہ میں ہے جس پر روسی قبضہ تھا اور ان لوگوں پر سویت اثر بہت زیادہ پڑا ہے۔ ایران اور دوسری جگہ کے کُردوں کے حوصلوں کے بارے میں سویت کی سرکاری پالیسی کیا ہے اسے ابھی تک واضح نہیں کیا گیا ہے اور اس کی جو شکل ہو گی اس پر اس تحریک کے مستقبل کا بہت کچھ دار ومدار ہوگا۔

ایران کی دوسری اقلیتوں کا حال اختصار کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ جنوب مغرب میں بحر ایران کے ساحل پر اور عراقی سرحد کے نزدیک عربی بولنے والوں کی ایک مختصر آبادی ہے۔ فارس (قدیم پرسیس) میں کئی قبیلے ہیں جن میں سے اکثر ترکی بولتے ہیں اور ان پر اتحاد تورانی کی تحریک کا کچھ اثر پڑا ہے۔ لیکن اس مسئلہ نے ابھی تک اہمیت اختیار نہیں کی ہے شہروں میں یہودیوں، آرمینیوں اور دوسرے عیسائیوں کی چھوٹی اقلیتیں ہیں۔ ملک کے کچھ حصوں میں زردشت کے پیروؤں کے ایسے باقی ماندہ چھوٹے گروہ بھی پائے جاتے ہیں جو ایران کے قدیم قبل اسلام کے مذہب کو مانتے ہیں۔

ایران کی حال کی تاریخ ایران کی جدید تاریخ سنہ ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتی ہے، جب ایک انقلابی تحریک نے شاہ کو آئین عطا کرنے اور مجلس کے نام سے

قومی اسمبلی قایم کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ یہ آئین تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ اب تک چل رہا ہے اگرچہ اس کے نفاذ کے طریقوں میں بہت اختلافات ہوتے رہے ہیں ۱۹۰۷ء میں برطانیہ اور روس کی حکومتوں نے جو ایران کی آزادی میں مسلسل مداخلت کر رہی تھیں۔ اس سال ایک باہمی معاہدہ کر لیا جس کی رو سے ایران میں دونوں کے حلقہ ہائے اثر کا تعین کر لیا گیا۔ اوران کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے لئے مرکز میں ایک غیر جانبدار علاقہ کا بھی تصفیہ کر لیا گیا۔ ایران کی مرکزی حکومت روز بروز بد دیانتی اور نا اہلیت کے تاریک غار میں گرتی چلی گئی۔ صوبوں میں برطانوی اور روسی مفادوں نے آہستہ آہستہ مضبوطی کے ساتھ اپنی جڑیں گاڑلیں اور بعض اوقات حکومت کے معمولی کاموں کو بھی خود ہی انجام دینا شروع کر دیا۔ ایران کی اس طوائف الملوکی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا کام برطانیہ اور روس تک ہی محدود نہیں رہا جرمنی نے بھی مخبروں اور پروپیگنڈا کے ذریعہ ترکی کے صدر کیمپوں سے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور ۱۹۱۱ء میں ایک امریکی مالیاتی کمیشن نے ایران کے مالیات کی از سر نو تنظیم کرنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگ کے دوران میں جنگ کے دونوں حریفوں نے ایران کی غیر جانبداری کو متفقہ طور پر نظر انداز کر دیا۔ شمال اور جنوب میں روسی اور برطانوی فوجیں اپنا کام کرتی رہیں اور ترکی فوجیں مغرب سے داخل ہوگئیں اور جرمنی کے کارندوں نے مقامی افواج کو بھرتی کر کے سارے ملک میں فتنہ و فساد برپا کر دیا۔ روسی فوجوں کی مکمل شکست کے بعد برطانوی نگرانی شمالی ایران میں بھی پھیلا دی گئی اور ایک چھوٹی سی برطانوی فوج بحر کیسپین اور کوہ قاف میں بھی اس غرض سے گھس گئی تاکہ سویت جمہوریتوں کے خلاف معرکوں میں حصہ لے سکے۔ مرکزی طاقتوں کی شکست کے بعد ایران میں برطانیہ کا کوئی مد مقابل باقی نہیں رہا اور ۱۹۱۹ء میں اس نے ایران کی حکومت سے اینگلو پرشین معاہدہ منوایا جس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ ایران کی حیثیت ایک انتدابی ملک کی سی ہوگئی۔

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں جو بچی کھچی سویت فوجیں تھیں ان کو بھی واپس بلا لیا گیا اور ۲۶ ر جنوری ۱۹۲۱ء کو سویت حکومت نے ایران کی حکومت سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے زاروں کی ایک صدی کے دست بُرد کے ذریعہ ایران سے جتنی مراعات زبردستی حاصل کی گئی تھیں ان سب کو منسوخ کر دیا گیا۔ تمام قرضے ختم کر دئے گئے۔ تمام وہ بینک، ریلیں، سڑکیں اور بندرگاہیں جو روسیوں کی نگرانی میں تھیں وہ ایران کے حوالہ کر دی گئیں اور ایران میں روسیوں کو جو زاید حقوق حاصل تھے وہ سب رضا کارانہ طریقہ پر ختم کر دئے گئے۔

روس کی امداد اور حوصلہ افزائی سے ۲۶ ر فروری کو ایرانی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے اینگلو پرشین معاہدہ کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ اس معاہدہ کی رو سے جن برطانوی افسروں اور مشیروں کا تقرر کیا گیا تھا۔ انھیں برطرف کر دیا گیا اور برطانیہ کی نگرانی میں جو مقامی فوجیں بھرتی کی گئی تھیں، انھیں سُبک دوش کر کے قومی افواج میں شامل کر لیا گیا۔ ایرانی قومی تحریک جو ایک طویل مدت تک دبی رہی تھی پھر اُبھرنا شروع ہو گئی۔

رضا شاہ کی آمریت یہ نازک وقت تھا کہ رضا شاہ برسرِ اقتدار آیا۔ اس نے ایک کم حیثیت سپاہی کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی۔ ۱۹۰۰ء میں وہ ایرانی فوجوں کے کوسک بریگیڈ میں شامل ہوا تھا اور تیزی سے ترقی کر کے اونچے عہدہ پر پہنچ گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں وزیر جنگ نے اور ۱۹۲۳ء میں وزیر اعظم اور ملک کا حقیقی آمر مطلق۔ آخر میں ۲۵ ر اپریل ۱۹۲۶ء کو قاچار نسل کا آخری تاجدار احمد شاہ معزول کیا گیا۔ رضا کو شاہ ایران بنایا گیا۔ اور اس نے نئے پہلوی خاندان کی بنیاد رکھی۔ جس آمریت کو اس نے قایم کیا وہ ستمبر ۱۹۴۱ء تک چلتی رہی۔ اس وقت وہ تخت سے دست بردار ہوا اور برطانیہ اور روس کی فوجوں نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ رضا نے اپنے زمانہ میں بہت سے اچھے کام کئے لیکن بصورت مجموعی اس کے زمانہ حکومت کو جبر و تشدد، ظلم اور رجعت کے زمانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے ملک کو بہت نقصان پہنچایا جس کی تلافی کرنے میں ایران کو ایک مدت لگ جائے گی۔

رضا کا پہلا سیاسی مقصد یہ تھا کہ مرکزی حکومت کے اقتدار کو قایم اور قومی اتحاد کو پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ تمام ان قوتوں کو جو مرکزیت اور یکسانیت کے خلاف تھیں ختم کیا جائے۔ چنانچہ ہر قسم کی صوبہ پرستی کے خلاف قوت کے ساتھ جنگ کی گئی۔ فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں یعنی ترکی اور کُردی زبان کو منسوخ کیا گیا قبائلی سرداروں کی طاقت توڑی گئی اور قبیلوں کو توڑ کر انھیں زراعت کے کام سے لگانے کی کوشش کی گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ارادتاً ایک مجنونانہ غیر ملکی منافرت پر مبنی قومیت کو ترقی دی گئی۔ مرکزیت کی اس تحریک کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں ذرائع رسل و رسائل کو بہتر کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ بہت سی سڑکیں بنائی گئیں اور سب سے اہم یہ کہ ایک بین ایرانی ریل جو ایران کے شمال سے جنوب تک جاتی تھی ۱۹۳۸ء میں مکمل کی گئی۔ بہت سے دوسرے مثبت کام بھی کئے گئے جس میں خاص طور پر لائق ذکر یہ ہیں۔ عورتوں کی نقاب کشائی اور آزادی اور حکومت کی نگرانی میں کئی صنعتوں کا قیام۔

رضا کا دور حکومت ایک بہت ترقی یافتہ آمریت تھی جسے خفیہ پولس اور دہشت انگیزی کے ذریعہ قایم رکھا جاتا تھا جس قوت کی طرف سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ حکومت کے مقابلہ پر آسکتی ہے اس کا یا تو انسداد کر دیا جاتا تھا یا اسے بے بس بنا دیا جاتا تھا۔ دنیا داری کی تحریک نے مجتہدوں کے اس اثر و رسوخ کو ختم کر دیا جو ایک زمانہ میں عوام پر انھیں حاصل تھا اسی طرح دستکاروں کی پنچایتوں کو بھی جو ایک زمانہ میں لوگوں کی روزمرہ کی زندگی پر بہت گہرا اور اہم اثر ڈالتی تھیں بالکل بے اثر کر دیا گیا۔ افراد میں بھی جن کے اندر غیر معمولی قابلیت کے آثار دیکھے جاتے تھے، انھیں قبل اس کے کہ وہ شاہ کے ذاتی اقتدار کے لئے ایک خطرہ بن سکیں سیاسی میدان سے خارج کر دیا جاتا تھا۔

آخری سالوں میں رضا شاہ کی حرص و آز اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی اور وہ اپنی قوت کا بہت بڑا حصہ اپنی نجی دولت کے بڑھانے میں صرف کرنے لگا تھا۔ اس کی مثال کی پیروی اسکے

عہدہ داروں نے بھی شروع کر دی تھی اور سول ملازمین اوپر سے نیچے تک سب بد دیانت بن گئے تھے۔ سرکاری عہدہ داروں کی اس اخلاقی پستی نے آزادی اظہار رائے کے مکمل انسداد کے ساتھ مل کر، ایران کی بددلی اور مایوسی کو جو پہلے ہی ایک صدی تک حریف سلطنتوں کا کھلونا بنے رہنے کی وجہ سے اپنا اعتماد نفس کھو چکا تھا، انتہا کو پہنچا دیا۔

جنگِ عظیم ثانی کے شروع ہونے سے کچھ سال پہلے ایران کی معیشت میں جرمنی کا اثر و نفوذ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ایک آمریت اور دوسری آمریت کے مابین ہم جنسی کا ایک رشتہ موجود تھا۔ دوسرے جرمنوں نے چونکہ گزشتہ زمانہ میں ایران کے ملک میں برطانیہ اور روس کی طرح کوئی دستبرد نہیں کی تھی اس سے ان کے خلاف منافرت کا جذبہ نسبتاً کم تھا اور انھیں زیادہ پسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔

ایران پر جب اتحادیوں نے قبضہ کیا اور رضا شاہ تخت سے دست بردار ہوا تو نگرانی میں کمی واقع ہوئی لیکن اکثر عہدہ داروں کو نہیں بدلا گیا اور جن تبدیلیوں کو کیا گیا ان کی اہمیت زیادہ نہیں تھی۔ حکمران طبقوں کی جڑیں خوب گہری جمی ہوئی تھیں اور کوئی دوسرا شخص ایسا نظر نہ آتا تھا جو ان کی جگہ لے سکے اخباروں اور پارلیمنٹ کی نئی آزادی سے عام آدمیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ رضا شاہ کی طرف سے جو سخت نگرانی پہلے کی جاتی تھی جب وہ کم ہوئی تو بے اطمینانی اور بڑھ گئی۔ مرکزی حکومت عام طور پر کمزور ہو گئی۔ رشوت ستانی کا بازار اور کھل گیا۔

موجودہ دَورِ حکومت کی نوعیت ۱۹۴۱ء سے جو حکومتیں برسرِ اقتدار رہی ہیں وہ پچھلے حکمراں طبقے کی جس سے ان کا تعلق تھا نمائندہ رہی ہیں انھیں مردہ آمریت کا ایک دھندلا سایہ سمجھا جا سکتا ہے انھیں زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے حالات اور بے اطمینانی کی موجودہ فضا میں محصول وصول کرنے کی دشواریوں کی وجہ سے ان کے میزانیہ میں مسلسل خسارہ ہوتا رہا۔ جنگ اور غیر ملکی قبضہ نے تعجب خیز افراطِ زر کو پیدا کر دیا۔ ۱۹۳۶ء کو اگر تسلیم مانا جائے تو ایران کے مصارف زندگی ۱۹۴۲ء میں بڑھ کر

(۵۴۲) ہو گئے تھے اور دسمبر ۱۹۴۳ء میں (۱۰۷۶) اور مئی ۱۹۴۴ء میں (۱۰۲۱۰)

۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر ملسپاغ کی نگرانی میں ایک امریکی مشاورتی کمیشن کو ایران میں بلایا گیا تاکہ وہ ملک کی مالیات کی از سر نو تنظیم کرے۔ ۱۹۴۳ء میں ملسپاغ کو مالیات کا منتظم عام مقرر کر دیا گیا اور معاشی اور مالیاتی معاملات میں بہت وسیع اختیارات دیئے گئے۔ اس کا کام یہ تھا کہ میزانیہ کے عدم توازن کو درست کرے۔ غذا کے سامان کی کمی اور مصارف زندگی کے اضافہ کا علاج کرے لیکن اس کی کوششوں میں مجلس نے ہر قدم پر رکاوٹیں ڈالیں مجلس میں زیادہ تر ان طبقوں کی نمائندگی تھی جنہیں افراط زر اور رشوت ستانی سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ ملسپاغ ان ہی چیزوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی کامیابی سے ان ہی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچتا۔ اس کی ایک اچھی مثال متزائد محاصل آمدنی کی مخالفت ہے جس کا عاید کرنا ایران کی مالیات کی تنظیم نو کے لئے ناگزیر تھا۔ فروری ۱۹۴۵ء میں ایرانی حکام سے آخری جھگڑا کرنے کے بعد ڈاکٹر ملسپاغ مستعفی ہو گیا اور اس کے کمیشن کے دو ممبروں نے اس کے مالی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور معاشی اختیارات ایران کی حکومت کو واپس کر دیئے گئے۔

ایران کی موجودہ سیاسی حالت کی ایک دشواری یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسی عوامی تنظیم نہیں ہے جس کی جڑیں گہری اور مضبوط ہوں اور جس کی بنیاد پر جمہوری زندگی کو شروع کیا جاسکے۔ آج جو سیاسی گروہ بندیاں نظر آتی ہیں وہ زیادہ تر شخصی نوعیت کی ہیں اور کسی نہ کسی ممتاز شخصیت کے وابستگان پر مشتمل ہیں۔ یہ کمزور اور ناپائدار ہوتی ہیں۔ چونکہ خود اپنے ملک میں انھیں وسیع بنیاد پر تائید و حمایت حاصل نہیں ہے اس لئے بہت پہلے سے ان گروہوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ یہ باہر کی تائید و حمایت کی تلاش میں رہتی ہیں۔

آمریت کے خاتمہ کے بعد ایران میں جو بہت سی سیاسی جماعتیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں دو اس لائق ہیں کہ ان کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا جائے۔ ایک ان میں سے تودہ (عوام کی)

جماعت ہے جس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اس کو سویت حکومت نے قایم کیا ہے اور وہ اس کی تائید میں ہے۔ تو وہ جماعت کو جمہوریت کے اس مفہوم کے مطابق جو مشرقی یورپ میں رائج ہے جمہوری کہا جاسکتا ہے، آذربائیجان کے "جمہور" تو وہ کسی مقامی شاخوں سے ترقی پاکر بنے ہیں۔ دوسری جماعت "رضائے قومی جماعت" ہے جس کے رہنما سید ضیاء الدین طباطبائی ہیں یہ جلاوطنی سے واپس آنے پر دائیں بازو کے بہت جلد رہنما بن گئے ہیں۔ ان کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ ایران میں برطانوی نقطۂ خیال کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ایران کی داخلی سیاست میں ایک اور عنصر بھی لایق توجہ ہے یعنی فوج جسے آمریت کے زمانہ میں امتیازی حیثیت دی گئی تھی اور جو اب اپنی حیثیت کو چھوڑنے کے لئے بہت کم تیار ہے فوج ابھی تک مملکت میں ایک خودمختار حیثیت رکھتی ہے اور سول اور فوجی عہدہ داروں میں تفوق اور برتری کی جو کشمکش جاری ہے وہ ابھی تک ختم نہیں ہو پائی ہے۔

معدنی تیل کی اہمیت

سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک انگریز تاجر مسمی ڈارسی نے شاہ ایران سے ساٹھ سال کے لئے کیسپین کے پانچ صوبوں کو چھوڑ کر باقی کل ایران کے لئے معدنی تیل کے حقوق حاصل کر لئے تھے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں مسجد سلیمان میں تیل کا چشمہ برآمد ہوا اور ڈارسی کے حاصل کردہ حقوق سے فائدہ اٹھانے کے لئے اینگلو پرشین آئل کمپنی بنائی گئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں بڑے پیمانہ پر موثر طریقہ پر تیل نکالنا شروع کیا گیا اور دو سال بعد برطانوی حکومت نے اس کمپنی کے اتنے حصے خرید لئے کہ اس کی نگرانی اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک روسی باشندے اکے کھوستاریا نے شمال کے صوبوں کے لئے اسی قسم کی مراعات حاصل کرلیں۔ انقلاب کے بعد اگرچہ کھوستاریا کے مراعات کو منسوخ کردیا گیا تھا لیکن اینگلو پرشین نے سنہ ۱۹۱۸ء میں انھیں خرید لیا اور اس کے حقوق کا مطالبہ کرنا شروع کردیا۔ اسی زمانہ میں امریکہ کے اسٹینڈرڈ آئل نے بھی پچاس سال کے حقوق حاصل کئے لیکن ان سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ بعد میں برطانیہ اور امریکہ کے تیل کے مالکوں میں شمالی صوبوں سے تیل نکالنے کے لئے ایک مشترکہ معاہدہ ہوگیا

لیکن ایران نے روس کی حمایت سے اس کا جواب یہ دیا کہ امریکہ کی ایک چھوٹی اور آزاد کمپنی سنکلیئر کنسالیڈیٹڈ کو حقوق عطا کر دئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سنکلیر کے حقوق کو ایران کی حکومت نے اس لئے منسوخ کردیا کہ سنکلیر واشنگٹن میں ایک معاملہ کی وجہ سے بہت بدنام ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ان شمالی صوبوں سے تیل نکالنے کا معاملہ جو ڈارسی کے ابتدائی حقوق سے خارج تھے تعطل میں پڑا رہا۔

اس اثنا میں ایران کی حکومت اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے درمیان تعلقات کچھ خوشگوار نہیں رہے۔ ڈارسی نے ایسی اچھی شرائط حاصل کرلی تھیں کہ انھیں ایران کے مفاد کے خلاف سمجھا جاتا تھا اور ایران کی حکومت کو اس بات کی وجہ سے اور زیادہ شکایت تھی کہ سنہ ۱۹۰۱ء میں شاہ ایران نے جو اپنی نااہلیت کا ثبوت دیا تھا اُسے اس کا پابند بنایا جارہا ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۲۳ء میں برابر ان حقوق پر نظر ثانی کرنے کے لئے گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا۔ جب سنہ ۱۹۳۱ء میں ایران کی حکومت کو سنہ ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں صرف ایک چوتھائی حقوق مالکانہ ادا کئے گئے تو معاملہ انتہا کو پہنچ گیا اور ایران کی حکومت نے کمپنی کو مطلع کردیا کہ اس کی مراعات ختم کردی گئی ہیں۔ اس کے بعد سارے ایران میں دو دن کی سرکاری تعطیل منائی گئی۔ کمپنی نے برطانوی حکومت سے اپیل کی جس کو جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے کمپنی کے معاملات میں نگرانی کے حقوق ملے ہوئے تھے۔ اس کے بعد چھ مہینے تک سفارتی بحران جاری رہا۔ برطانیہ نے ابتداءً دھمکی کا ایک خط لکھا اور بحر ایران میں اپنے بیڑہ کا مظاہرہ کیا لیکن جب اس سے کام نہ بنا تو معاملہ کو لیگ آف نیشنس کے سامنے رکھا۔ طویل گفت وشنید کے بعد آخرکار ایک نیا معاہدہ ایسی شرائط پر کیا گیا جو ایران کے لئے پہلے سے بہت زیادہ موافق تھیں۔ اول تو وہ رقبہ جس پر اس مراعات کو جائز رکھا گیا تھا گھٹا کر صرف ایک لاکھ مربع میل یعنی پہلے رقبہ کا پانچواں حصہ کردیا گیا۔ پھر مالی اعتبار سے بھی ایران کو فائدہ پہنچا۔ اس بات کی ضمانت کی گئی کہ ایران کو ہر سال دس لاکھ پچاس ہزار پونڈ ادا کئے جائیں گے۔ اس کے بعد سے تیس تا چالیس لاکھ پونڈ سالانہ کی رقم ایران کو ادا کی جارہی ہے۔

۱۹۳۷ء میں امریکہ نے اس میدان میں داخل ہونے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔ امریکہ کی ایک کمپنی امی ایرانین آئل نے شمال کے لئے مراعات حاصل کیں لیکن نقل وحمل کی مشکلات کی وجہ سے انھیں اگلے سال ترک کر دیا۔ اس سوال پر اس کے بعد کوئی مباحثہ پبلک کے سامنے ۱۹۴۴ء تک نہیں ہوا۔ اس سال البتہ اس جانب غیر معمولی توجہ کی گئی طہران میں برطانیہ اور امریکہ اور ہالینڈ کے نمائندے اس بات کا پتہ چلانے کے لئے پہنچے کہ ایرانی حکومت کس قسم کی مراعات دینے کو تیار ہے۔ یہ گفتگو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچی اور آخر کار ایران کی حکومت نے تیل کی کمپنیوں کے نمائندوں کو اطلاع دے دی کہ مراعات کے تمام بحث ومباحثے کو جنگ کے خاتمے تک ملتوی رکھا جائے گا۔ اس کے دو ہفتہ بعد کاوٹمار اڈزے معاملات خارجہ کا نائب وزیر طہران پہنچا اور اس نے کیسپین کے صوبوں میں نیز خراسان اور سمنان کے صوبوں میں مراعات کے سوال کو اٹھایا۔ اس سے بھی ایران کی حکومت نے یہی کہا کہ گفتگو کو جنگ کے خاتمہ تک ملتوی رکھا جائے۔ اس کو روسی حکومت نے اپنی توہین سمجھا۔ اور یہ ایران کی حکومت کے لئے ایک نازک صورت پیدا ہوگئی ہے۔ ۱۹۴۵ء کے موسم خزاں میں روسیوں نے تبریز کے ترہ ویک اور بحر کیسپین کے کنارے مراعات کے عطا کئے جانے کا انتظار کئے بغیر آزمائشی طور پر کنوئیں بنانا شروع کر دئے ہیں۔ اس کے بعد دوسری منزل حال کے نازک موقع کو قرار دیا جاسکتا ہے جس کا انجام روسی ایرانی معاہدہ کی صورت میں ہوا جس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایک سوت ایرانی تیل کمپنی بنائی جاتی ہے۔ اس معاہدہ کے حدود اور اس کے اثرات ابھی تک پوری طرح معلوم نہیں ہوسکے ہیں۔

ایران اور بڑی طاقتیں

یورپ کے ساتھ ایران کے تعلقات پندرھویں اور سولھویں صدی میں اس وقت شروع ہوئے جب پرتگال، ہالینڈ اور انگلستان کے تاجر بحر فارس میں پہنچے۔ کچھ عرصہ تک یورپ کے ساتھ تعلق رکھنے میں ایران کا مفاد صرف یہ تھا کہ ان کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے مقابلہ میں اتحاد قایم کیا جاسکتا تھا اور امید یہ تھی کہ جب

ایران ترکی پر شرق سے حملہ کرے گا تو یہ لوگ اس پر مغرب سے حملہ کریں گے۔

اٹھارویں صدی میں جب برطانیہ کی طاقت ہندوستان میں مستحکم ہو گئی تو برطانیہ کی حیثیت بحر فارس میں حاکم اعلیٰ کی ہو گئی اور یورپ کی مملکتوں میں اسے سب سے زیادہ ایران سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ برطانیہ کے لئے ایران کی حیثیت ہندوستان کی سرحد پر ایک ٹکر روک (بفر) مملکت یا ایک ایسے راستے کی تھی جہاں سے گذر کر یورپ کا ایک حریف ہندوستان کی سلطنت پر حملہ کر سکتا تھا۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے برطانیہ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ ایران میں دوستانہ یا ماتحت حکومت کو قایم کرے یا کم سے کم اس بات کی ضمانت حاصل کرلے کہ اس ملک میں یورپ کی کوئی دوسری طاقت حاکمانہ حیثیت حاصل نہ کر سکے گی۔

نپولین کے زوال کے بعد انیسویں صدی میں خاص خطرہ روس کی طرف سے تھا اور برطانیہ کی پالیسی کا اصل مقصد ایران میں روس کے نفوذ کا سد باب کرنا تھا۔ روس کی حکومت صدیوں سے آہستہ آہستہ اپنی سلطنت کی توسیع جنوب کی جانب کر رہی تھی اور روس کی پہلی سفارت ایران میں ۱۶۶۴ء میں بھیجی گئی تھی لیکن روس اور ایران کی سرحدیں ایک دوسرے سے براہ راست اس وقت تک نہیں مل سکی تھیں جب تک کہ اٹھارویں صدی کے اختتام، اور انیسویں صدی کے آغاز میں روسی کوہ قاف کی طرف نہیں بڑھ آئے تھے۔ انیسویں صدی میں ایران میں باریاب ہونے کے لئے برطانیہ اور روس باہم مقابلہ کرتے رہے اور کئی مرتبہ ایران اور افغانستان کو انگریزوں اور روسیوں کے بدلے میں جنگیں لڑنا پڑیں۔ مشرق قریب کی جانب پیش قدمی میں روس کو جو ہزیمت کریمیا کی جنگ میں اٹھانی پڑی اس نے اس کی توجہ کو اور بھی زیادہ ایران کی طرف منعطف کر دیا اور ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کے کھل جانے سے مشرق قریب کو اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ اگر ایران برطانیہ کے لئے ہندوستان کا ٹکر روک ہے تو روس کے لئے یہ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ اور سب سے اہم یہ کہ کھلے سمندر کا ایک پل ہے۔ اس کے علاوہ یہ وہ راستہ بھی ہے جہاں اس کا دشمن جنوب سے اس پر حملہ کر سکتا ہے بلکہ

خانہ جنگی کے زمانہ میں واقعتاً دشمن نے اس جانب سے روس پر حملہ کیا۔

موجودہ صدی کے آغاز میں ایران میں معدنی تیل کے دریافت ہوجانے کی وجہ سے رقابت کا ایک نیا محرک پیدا ہوگیا ہے۔ ایران کے تیل نے بہت تیزی کے ساتھ ایک لازمی شہنشاہی ضرورت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اور اب صورت یہ ہوگئی ہے کہ اگر ہندوستان برطانیہ کے ہاتھ سے جاتا بھی رہے تو بھی ایران میں برطانیہ کا مفاد محض تیل حاصل کرنے کے لئے باقی رہے گا۔ روس کے لئے شمالی ایران کا تیل جنگ سے قبل کے زمانہ میں اتنی ضروری ضرورت کی چیز نہ تھا۔ اسے صرف اس بات کی فکر تھی کی کہ مغرب کی سرمایہ دار تیل کی کمپنیوں کو ان صوبوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے جو سویت یونین سے بالکل ملحق ہیں۔ لیکن حالیہ جنگ میں سویت کے بہت سے تیل کے اضلاع کی بربادی اور ویرانی کی وجہ سے سویت کے تیل کی پیداوار بہت گھٹ گئی ہے اور شمالی ایران میں تیل کے جو امکانات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا سویت روس کے لئے بہت ضروری ہوگیا ہے۔

سویت انقلاب سے پہلے کے زمانہ میں روس ایران میں رجعت پسند زمیندار عناصر کی حمایت کیا کرتا تھا اور برطانیہ آزادی اور ترقی پسند عناصر کی۔ لیکن سویت انقلاب اور اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں سویت حکومت کی طرف سے رضاکارانہ طریقہ پر ان تمام شہنشاہی مراعات سے جو ایران میں روس کو حاصل تھیں۔ دست کشی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ترقی پسند عناصر روس کی جانب مائل ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے برطانیہ نئے اتحادیوں کو ڈھونڈنے کے لئے مجبور ہوگیا ہے ایران میں یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ رضا شاہ کو برطانیہ کی حمایت اور حوصلہ افزائی سے اقتدار حاصل ہوا۔ کیونکہ انھیں امید تھی کہ ایران میں اگر ایک مضبوط اور مطلق العنان حکومت قایم ہوگئی تو سویت خیالات اور اثرات کو جنوب کی جانب پھیلنے سے کامیابی کے ساتھ روکا جاسکے گا یہ امید بڑی حد تک پوری ہوئی لیکن دوسرے لحاظ سے رضا شاہ احسان مند اور اطاعت پذیر آوردہ ثابت نہ ہوسکا۔ اس کی حکومت کے زمانہ میں برطانوی اور روسی دونوں اثرات

کم سے کم کر دئے گئے اور ایران کے دونوں بڑے پڑوسیوں کی رقابت اس علاقہ میں معطل سی ہو کر رہ گئی۔

لیکن گذشتہ چند سالوں کے واقعات کی وجہ سے دوبارہ مراعات اور اثرات حاصل کرنے کی کشمکش شروع ہو گئی ہے اور برطانیہ اور روس دونوں ایران میں اتحادیوں اور مہروں کو تلاش کر رہے ہیں۔ ایران میں رائے عامہ کی اس وقت جو حالت ہے اس سے انھیں کام میں اور مدد مل رہی ہے۔

ایک لانبی مدت تک ایران کی سرحدیں جس طرح برابر پیچھے ہٹتی چلی گئیں اس کی قدیم تہذیب پر مغرب کی طاقت اور اس کے اثر کا جس انداز سے غلبہ ہوتا رہا اور غیر ملکی حکومتیں ایران کے معاملات پر نگرانی قایم کرنے کے لئے جس طریقہ پر دھینگامشتی سے کام لیتی رہیں۔ ان سب باتوں نے ایران کے سینے کو گہرے زخموں سے داغدار کر رکھا تھا اور اس کے اندر بددلی اور مایوسی کی کیفیت موجود تھی کہ آمریت کا عذاب ایران پر مسلط ہو گیا اور اس نے ایران کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں جتنی اچھائیاں باقی رہ گئیں تھیں ان کو بھی ملیامیٹ کر دیا۔ آمریت کے زمانہ میں پرانے زخموں پر مغربیت اور غلط قومیت کے مرہم کا ایک پھایا ضرور رکھا گیا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۱ء میں یہ چیز راتوں رات غائب ہو گئی اور مایوسی پہلے سے بھی زیادہ شدید صورت میں رونما ہو گئی۔

اس وقت ایران کو ایک ایسی نئی نسل کی ضرورت ہے جس کی فکر تعمیری اور ترقی پسند ہو جو ایران کے عوام کے مفاد کو طبقہ وارانہ مفاد پر مقدم رکھے اور جو ایران کی حکمت عملی کے اس مخصوص رویہ کو ترک کر دے کہ اسے صرف اس بات کی فکر رہتی ہے کہ اس کے وسائل کو حاصل کرنے کے لئے نیلام میں کون سب سے اونچی بولی لگا رہا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے ایران کو اپنے دونوں بڑے پڑوسیوں کی امداد کی ضرورت ہو گی۔ اور انھیں متفقہ طور پر اس امداد کو فراہم کرنا ہو گا۔ کیونکہ ایران کو اگر اکھاڑا بنا کر پرانی رقابت کو

جاری رکھا گیا تو اس ملک میں اور بھی زیادہ بد دلی اور تباہی پھیلے گی۔ کیا یہ امید کرنا فضول ہے کہ دوسرے مقامات کی طرح ایران میں بھی برطانیہ اور روس اپنے اختلافات کو ختم کردیں گے اور اس ملک کو وہ امداد دیں گے جس کی اُسے دونوں ملکوں سے حاصل کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

کتبِ موصولہ پر ایک نظر

(الف)

کتابیں

لاجونتی از ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر۔ متوسط تقطیع، نہایت خوبصورت چمڑے کی جلد، لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ ۱۴۳ صفحات قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ انند سروپ بھٹناگر ۲۵ تغلق روڈ نئی دہلی۔

یہ ڈاکٹر بھٹناگر صاحب شانتی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ بھٹناگر صاحب نے سائنس کے میدان میں جو بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے، وہ ہندوستان کے لئے بجا طور پر قابلِ ناز ہے۔ آپ امپیریل سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ڈائرکٹر ہیں اور ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ لیکن اس بات کا کم لوگوں کو علم ہوگا کہ یہ سائنس داں شعر و شاعری کے میدان میں بھی ایک بڑے اونچے مرتبے کے مالک ہیں۔ اس کتاب کے لئے خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، مولوی عبدالحق صاحب، خواجہ حسن نظامی صاحب، اور سرتیج بہادر نے الگ الگ چار مقدمے لکھے ہیں۔ اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ایک تقریظ لکھی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے "سائنس ہو یا شعر و سخن دونوں میں موضوع کے اعتبار اور موقع و محل کی مناسبت سے اپنے خیال کا اظہار خوبی اور حسن سے کرنے پر قادر ہیں سائنس کے مضامین میں بیان اکثر الفاظ پھیکا اور ثقیل نہیں اور نہ ان کے اشعار میں کسی قسم کی تعقید و پیچیدگی اور ابہام ہے، بلکہ شگفتگی، روانی اور لطف ہے سائنس نے جو صحت پسندی کا نقش ڈاکٹر صاحب کے دل و دماغ پر ثبت کر دیا ہے اس سے وہ خود بخود حقیقت نگاری کی طرف مائل ہو گئے ہیں، ان کی نظمیں زندگی کے واقعات اور حقائق سے وابستہ ہیں کچھ رسمی ہیں، کچھ آپ بیتی ہیں اور کچھ جگ بیتی ان میں سنجیدہ بھی ہیں اور مزاحیہ بھی"۔

یہ تبصرہ بہت جامع ہے، بھٹناگر صاحب کا پورا کلام نظموں پر مشتمل ہے۔ پہلی نظم "خدا" ہے۔ دوسری "کیمیا اور فلسفہ" ان دونوں نظموں میں مذہب سائنس میں مطابقت اور ہم آہنگی دکھلائی گئی ہے۔ ایک شعر ہے:۔

انل کے راز ہیں نہاں، دلِ مرکبات میں
اگر خدا کو ڈھونڈھنا ہے، ڈھونڈھ کیمیات میں

رام موہن رائے بن باس (رامچندر جی کا) وصال (گنگا کا سمندر سے خطاب) خاتون ہند، شکوہ دید وغیرہ بہت سی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں۔

مزاحیہ نظموں میں "رنگ سیاہ" "مریض بردل عزیز" "جشن فتح" اور "ووٹ" کی نظمیں بہت پر لطف ہیں۔ چند ہندی نظمیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جس میں "جیون کہانی" "تو میں ایسا جانتا" اور "دن رات میں تم کو ڈھونڈ تی ہوں" خوب ہیں۔ ان کی ایک ہندی نظم "کل گیت" بنارس یونیورسٹی میں روزانہ صبح کو اور ضروری جلسوں کے موقع پر گائی جاتی ہے۔ غرض اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا یہ مجموعہ کلام لائق مطالعہ ہے۔

امام غزالی کی فکر کے بنیادی پہلو | از جناب عمرالدین صاحب سینیر لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، بزبان انگریزی ۱۹۴ صفحات۔ ناشر ارشاد بک ڈپو علیگڈھ — یہ عمرالدین صاحب کے ان مقالوں کا مجموعہ ہے جو بہت کاوش اور تحقیق کے بعد انہوں نے مختلف اوقات میں تحریر فرمائے ہیں۔ مصنف کا بیان ہے کہ یہ مختلف مقالے ایک منصوبے کے ماتحت لکھے گئے ہیں اس لئے سب ایک واحد رشتے میں منسلک ہیں اور ایک اعلیٰ کل کے مختلف اجزائے ترکیبی ہیں۔ ان مقالوں کے عنوانات یہ ہیں:۔

(۱) الغزالی خصوصیت کے ساتھ ان کا داخلی ارتقا (۲) الغزالی کے مذہبی فلسفہ کی نفسیاتی بنیاد۔ (۳) الغزالی کے اخلاقی نظام میں علم اور اخلاق کا باہمی تعلق (۴) اختیار کے مسئلہ پر الغزالی کے خیالات کی تشریح (۵) حقیقت کبریٰ تک پہنچنے کے لئے الغزالی کا راستہ خصوصیت کے ساتھ ان کے اور اقبال کے نظام میں فکر اور وجدان کا باہمی تعلق۔ (۶) الغزالی کے فلسفہ میں محبت کا تصور (۷) دیدار الہٰی کے بارے میں الغزالی کے خیالات (ضمیمہ۔ الف) بچوں کی تعلیم پر الغزالی کے خیالات (ب) سہروردی مقتول کا فلسفیانہ مقام، ان کی جوانی کی تصانیف کے پیش نظر (ج) "صوفیوں کے عقائد" مصنفہ بکر الکلابدھی مترجمہ اے۔ جے اربری پر تبصرہ (د) مسلم فلسفہ۔ اس کا مفہوم اور اس کے حدود۔

عمرالدین صاحب فلسفہ کے ایک مخلص محقق ہیں۔ ہم ان کے نتائج فکر پر رائے زنی کا اپنے آپ کو اہل نہیں پاتے۔ اس لئے ہم ان کی تصانیف کی جانب ان اصحاب کو جنہیں اس موضوع سے دلچسپی ہے متوجہ کرتے ہیں۔

عربی زبان کے دس سبق ازعبدالسلام صاحب قدوائی ندوی۔ ناشرادارۂ تعلیمات اسلام ۳۸ امین آباد پارک لکھنؤ۔ قیمت ۴ر

جو لوگ عربی کا مکمل درس حاصل کئے بغیر قرآن پاک کا ترجمہ کرنا سیکھنا چاہتے ہیں ان کی آسانی کے لئے عربی زبان کے کچھ اسباق کو ترتیب دیا گیا ہے مصنف کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ان کا تجربہ بہت سے آدمیوں پر کرلیا ہے۔ فی الحال اس سلسلے کے پہلے دس اسباق کو رسالہ کی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ باقی کو بعد میں شایع کرنے کا ارادہ ہے۔ ان اسباق کے مطالعہ اور مشق سے امید ہے کہ ابتدائی پارہ کا طالب علم خود بہت کچھ ترجمہ کرنا سیکھ جائے گا اور استاد کی مدد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہے گا۔

۱۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی
۲۔ غدر پارٹی کے انقلابی
ناشر قومی دارالاشاعت لاہور قیمت فی کتاب ۸ر کتابت اور طباعت خوش نما۔ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے یہ دو کتابیں پرانے انقلابی رہنماؤں کے حالات زندگی کے بارے میں لکھائی گئی ہیں۔ اور ان میں ایسے اندرونی حالات ان لوگوں کی زبانی درج کئے گئے ہیں جو خود ان پارٹیوں میں شریک رہ چکے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور موثر ہے۔

۱۔ ایران کی بیداری
۲۔ انڈونیشیا کی جنگ آزادی
ناشر قومی دارالاشاعت لاہور قیمت علی الترتیب عہ اور ۶ر ان دو کتابوں میں ہمارے دو پڑوسی ملکوں میں شہنشاہی ملکوں کے پنجے سے آزادی کی جو تحریکیں جاری ہیں ان کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ یہ بھی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شایع کی گئی ہیں

۱۔ مارکسزم کیا ہے؟
۲۔ اشتراکی سماج
ناشر قومی دارالاشاعت لاہور قیمت علی الترتیب ۱۲ ر و ۸ ر ان دو کتابوں میں اشتراکیت کے بارے میں نظری بحثیں کی گئی ہیں۔ یہ بھی کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی میں شایع ہوئی ہیں

۱۔ سب کو روزگار ملے
۲۔ لوٹ کے غار
ناشر قومی دارالاشاعت لاہور قیمت علی الترتیب ۵ ر و ۳ ر۔ یہ دو رسالے ہندوستان کے حالات پر لکھے گئے ہیں۔ دوسرے رسالہ میں ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی زبوں حالت دکھلائی گئی ہے۔ پہلے رسالہ میں ما بعد جنگ کے جو مختلف منصوبے پیش کئے جارہے ہیں اسی قسم کا ایک منصوبہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے پارٹی کے مفکر رندیوے نے پیش کیا ہے جس میں سب کو روزگار فراہم کرنے کی تدبیریں بتلائی گئی ہیں۔

(ب)

رسائل

ماہنامہ "نسوانی دنیا"

مدیرہ جناب عائشہ صدیقہ صاحبہ ملنے کا پتہ۔ نسوانی دنیا۔ چابک سواران اسٹریٹ۔ لاہور — یوں تو یہ رسالہ بہت عرصے سے نکل رہا ہے۔ غالباً اٹھارہ سال سے لیکن جولائی ۱۹۴۶ء سے اس کو نئے انداز پر نکالنا شروع کیا گیا ہے۔ یہ اب "عورتوں کا سیاسی ادبی ماہنامہ" بن گیا ہے اور یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے نسوانی ماہ ناموں سے ممتاز کرتی ہے۔

اگست کے مہینہ کا رسالہ ہمارے سامنے ہے اور اس میں خوش سلیقگی کے ساتھ ترقی پسند خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں دوسرے ملکوں کی عورتوں کے حالات پر دو مضمون ہیں جن کے عنوان ہیں "عورتوں کی تحریکیں اسلامی ملکوں میں"۔ اور "اطالوی خواتین میں بیداری"۔ ایک کہانی ہے، ایک تمثیلچہ ہے۔ دو ترقی پسند نظمیں اور دو غزلیں ہیں۔ تربیت اولاد پر ایک مضمون "بچہ اور آپ" کے عنوان سے ہے۔ اور ایک نفسیات پر مضمون "بدحواسیاں" کے عنوان سے ہے۔ یہ سب باہر کے لوگوں کے مضامین ہیں اور ان کے لکھنے والے نئے لیکن ہونہار قابل اور مستند ہیں۔ اس کے بعد مستقل عنوانات ہیں۔ ادارہ کی طرف سے "پڑھنے والوں سے" کے عنوان سے رسالہ کے بارے میں پالیسی اور پروگرام کی وضاحت کی گئی ہے اور رسالہ کے مضامین اور مضمون نگاروں سے تعارف کرایا گیا ہے۔ "باتیں" کے عنوان سے مدیرہ نے ملکی سیاست اور نسوانی دنیا پر تبصرہ کیا ہے۔ "گھریلو باتیں" کے عنوان سے کام کی باتیں بتلائی گئی ہیں۔ مثلاً کپڑوں کی صفائی چاقو یا چھری کا دستہ لگانا۔ رنگ اڑانے کے سلوشن وغیرہ۔ "دستکاری" اور "دنیائے فلم" کے بھی مستقل عنوان رکھے گئے ہیں۔ رسالہ کی زبان نہایت سلیس، سادہ معیاری اور دلنشین ہے۔ انداز میں خلوص اور صداقت ہے۔ رسالہ محض تجارتی اغراض کے لئے نہیں بلکہ واقعی خدمت کرنے کے لئے نکالا جا رہا ہے۔ اور نئے زمانے کی ضرورتوں کو خوبی کے ساتھ پورا کرتا ہے۔ ہر جگہ ترقی پسند رجحانات نمایاں ہیں۔

عائشہ صدیقہ صاحبہ اس کامیاب ادارت پر مبارکباد کی مستحق ہیں۔

ماہنامہ "نئی زندگی" الہ آباد خاص (پاکستان) نمبر، مرتبہ ڈاکٹر سید محمود صاحب۔ ایڈیٹر جناب انیس الرحمٰن صاحب۔ صفحات ۲۴۴ قیمت ۱۲؍ طباعت اور کتابت خوش نما۔

پاکستان کی مخالفت میں یہ رسالہ نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے۔ رسالے کے دو حصے کئے گئے ہیں۔ پہلا حصہ سید انیس الرحمٰن صاحب کی زیر تصنیف کتاب کے تین ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوان ہیں "تقسیم کس طریقہ پر ہو" "پاکستان میں صنعت و حرفت کی ترقی کے امکانات"۔ اور "پاکستان کی مالیات"۔ دوسرے حصے میں ملک کے ممتاز سیاسی رہنماؤں نے پاکستان کی مخالفت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن بزرگوں کے مضامین درج کئے گئے ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی۔ مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری قاضی عبدالغفار صاحب سر آردشیر دلال صاحب پروفیسر عبدالمجید خاں صاحب۔ سید علی ظہیر صاحب۔ مولانا محمد میاں صاحب۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب اور ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب۔

پاکستان کی حمایت میں تو لٹریچر بہت نکل رہا ہے، لیکن اس کی مخالفت میں زیادہ لٹریچر نہیں ہے اس خاص نمبر کو نکال کر نئی زندگی نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ مسئلہ کے دونوں رخ جب تک سامنے نہ ہوں۔ صحیح رائے قایم نہیں کی جاسکتی۔ پاکستان کے حامیوں کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ ضرور اس رسالہ کا مطالعہ کریں۔ کیونکہ ہمیں امید ہے کہ انھیں اس رسالہ میں کام کی باتیں ملیں گی۔

ہفتہ وار "ذوالقرنین" بدایوں ایڈیٹر محمد وحید الدین صاحب نظامی

اس ہفتہ وار اخبار کا طفیل نمبر ہمارے سامنے ہے جو ۲۰، صفحے کے ایک رسالہ کی صورت میں نکالا گیا ہے۔ مولانا طفیل احمد نے اپریل ۱۹۴۶ء میں انتقال فرمایا۔ مولانا کی بے لوث زندگی ملک و قوم کے لئے سرمایۂ ناز اور وجہ افتخار ہے۔ مرحوم نے جس خاموشی اور خلوص کے ساتھ مسلمانان ہند کی تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی خدمات خاص طور پر اور ملک و قوم کی عام طور پر انجام دی ہیں وہ ہماری نئی نسل کے لئے ایک نہایت پاکیزہ نمونہ ہیں۔ ضرورت تھی کہ مولانا سے جو لوگ قریبی تعلق رکھتے تھے اور ان کے حالات سے بخوبی واقف تھے وہ اپنے تاثرات اور اپنی

عقیدت کا یکجائی طور پر اظہار کرتے اور مولانا مرحوم کی سبق آموز اور حوصلہ افزا زندگی کے جس قدر حصہ کا خود انہوں نے مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا اس کا تذکرہ بلا توسط خود اپنے لفظوں میں کرتے ذوالقرنین نے طفیل نمبر نکالنے کا فیصلہ کر کے ایسے سب لوگوں کے لئے ایک مقام اجتماع فراہم کر دیا۔

چنانچہ اس نمبر میں ہمیں مولانا کے حالات زندگی بھی خاصی تفصیل سے ملتے ہیں اور مولانا کے جو ذاتی تعلقات اپنے عزیزوں، دوستوں اور عقیدت مندوں سے تھے ان کے مشاہدہ کا بھی موقع ملتا ہے۔ یہ نمبر مولانا کی گوناگوں زندگی کا ایک اچھا خاصا مرقع ہے اس کی بنیاد پر مولانا کی ایک زیادہ مبسوط سوانح زندگی کو ترتیب دیا جا سکتا ہے اور ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہے کہ نظامی صاحب اس کے مکمل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

اس نمبر میں ملک کے تین پینتیس بزرگوں نے اپنے نثر و نظم کے مضامین کے ساتھ شرکت فرمائی ہے۔ ان میں خواجہ غلام السیدین۔ سید رضا علی، آنریبل بابو سمپورنانند قاضی عبدالغفار صاحبان خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

ہفت روزہ "الحمرا" بھوپال | ایڈیٹر طفیل بدر صاحب بی۔ ٹی۔ ایچ۔

اس نئے مصوّر اخبار کے چار شمارے ہمارے سامنے ہیں۔ اخبار کی ترتیب، مضامین کا انتخاب اور ادارہ کی طرف سے تنقید و تبصرہ سب میں ترقی پسندی کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ ہم اس اخبار کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ اپنے معیار کو اور زیادہ بلند کرنے میں کامیاب ہوگا۔

مکتبہ جامعہ کی چند نئی کتابیں

کھیل کے ذریعہ تعلیم

از عبدالغفار مدھولی۔ عبدالغفار مدھولی کو چھوٹے بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تقریباً ۱۵ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اسی تجربے کی بنیاد پر انھوں نے یہ بتایا ہے کہ پہلی جماعت کے بچوں کو تعلیم دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ ایسا طریقہ جو بچوں کا دل موہ لے بچے استاد کو قصائی اور تعلیم کو گھناؤنی چیز سمجھنے کی بجائے دونوں میں دلچسپی لینے لگے۔ بنیادی تعلیم پر ایک نادر کتاب ہے قیمت [illegible]

ہندوستانی کھیل

الطاف علی صاحب جو مدتوں جامعہ میں بچوں کو ورزش سکھاتے رہے ہیں۔ آپ نے تجربے سے فائدہ اٹھا کر بچوں کے لئے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں بچوں کو ہندوستانی کھیل کھیلنے کی رغبت دلائی ہے۔ جو مفید بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دلچسپ اور سستے بھی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

بچوں کا حساب

از عبدالغفار مدھولی۔ حساب بھی ایسی چیز ہے جس سے بچے عموماً جی چراتے ہیں لیکن اگر انھیں اس کتاب کی مدد سے تعلیم دی جائے تو یقین مانئے وہ سمجھیں گے کہ حساب سے دلچسپ کوئی چیز نہیں۔ حساب کاہے کو ہے بچوں کو مختلف کھیل کھلائے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس طرح کہ ان کو پتہ بھی نہ چلے حساب کی تعلیم بھی دے دی گئی ہے۔ قیمت ۱۲ر

بچوں کا قاعدہ

حساب کی طرح پڑھانا بھی کچھ آسان نہیں وہ بھی نرسری اور خود سر چھوٹے چھوٹے بچوں کو۔ لیکن عبدالغفار مدھولی کا یہ قاعدہ اتنا دلچسپ ہے کہ بچہ اس کو کہانیوں کے شوق کے ساتھ پڑھتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم سائنٹفک بھی ہے بنیادی تعلیم (Basic Education) کے سلسلے میں یہ چیز انتہائی کارآمد ہے۔ قیمت ۱۲ر

مکتبہ جامعہ دہلی

دہلی لکھنؤ بمبئی

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

(ان پڑھ بالغوں کے لئے)

۱۔ قاعدہ ہر (۲) درسی سبق لہر (۳) نکاح ہر

۱۔ نماز ہر
۲۔ حکایتیں اول ہر
۳۔ 〃 دوم ہر
۴۔ حبیب خدا ہر
۵۔ نظمیں ہر
۶۔ میونسپلٹی ہر
۷۔ صدیق اکبر ہر
۸۔ خط کتابت ہر
۹۔ ضلع کا انتظام ہر
۱۰۔ قومی گیت ہر
۱۱۔ غزلیں ہر
۱۲۔ ہمارا ہندوستان ہر
۱۳۔ اماں بھی پڑھنے لگیں ہر
۱۴۔ عمر فاروق ہر
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ہر
۱۶۔ شہید کربلا ہر
۱۷۔ ہماری دنیا ہر
۱۸۔ ایشیا ہر
۱۹۔ یورپ ہر
۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب ہر
۲۱۔ مثنوی میر حسن ہر
۲۲۔ گل بکاؤلی ہر
۲۳۔ چار درویش اول ہر
۲۴۔ 〃 〃 دوم ہر
۲۵۔ 〃 〃 سوم ہر

۲۶۔ چار درویش چہارم ہر
۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ہر
۲۸۔ 〃 〃 دوم ہر
۲۹۔ 〃 〃 سوم ہر
۳۰۔ 〃 منصور موہنا ہر
۳۱۔ 〃 فردوس بریں ہر
۳۲۔ 〃 لیلیٰ مجنوں ہر
۳۳۔ شکنتلا ہر
۳۴۔ تانبے والا ہر
۳۵۔ بجلی ہر
۳۶۔ صوبے کی حکومت ہر
۳۷۔ حکومت ہند ہر
۳۸۔ جمہوریت ہر
۳۹۔ روپے ہر
۴۰۔ دلچسپ شعر ہر
۴۱۔ مرثیے ہر
۴۲۔ مسدس حالی ہر
۴۳۔ حالی کی نظمیں ہر
۴۴۔ گنتی ہر
۴۵۔ بڑی گنتی ہر
۴۶۔ پہاڑے سپانے ہر
۴۷۔ اجرت کا حساب ہر
۴۸۔ تنخواہ کا حساب ہر
۴۹۔ چاند تارے ہر
۵۰۔ نزلہ زکام ہر

۵۱۔ حالات قرآن مجید ہر
۵۲۔ تعلیمات عقائد ہر
۵۳۔ 〃 عبادات ہر
۵۴۔ 〃 اخلاق ہر
۵۵۔ 〃 معاملات ہر
۵۶۔ قصص قرآن مجید حصہ۱ ہر
۵۷۔ 〃 〃 حصہ۲ ہر
۵۸۔ کعبہ شریف ہر
۵۹۔ حدیث شریف ہر
۶۰۔ عثمان غنی ہر
۶۱۔ علی مرتضیٰ ہر
۶۲۔ صحابۂ کرام حصہ۱ ہر
۶۳۔ 〃 〃 حصہ۲ ہر
۶۴۔ 〃 〃 حصہ۳ ہر
۶۵۔ 〃 〃 حصہ۴ ہر
۶۶۔ 〃 〃 حصہ۵ ہر
۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہر
۶۸۔ حضرت غوث پاک ہر
۶۹۔ اجمیری خواجہ ہر
۷۰۔ نظام الدین اولیاء ہر
۷۱۔ گوتم بدھ ہر
۷۲۔ کرشن کنھیا ہر
۷۳۔ رام کہانی حصہ۱ ہر
۷۴۔ 〃 〃 حصہ۲ ہر
۷۵۔ 〃 〃 حصہ۳ ہر

۷۶۔ امریکہ ہر
۷۷۔ جنوبی امریکہ ہر
۷۸۔ سرزمین ہند ہر
۷۹۔ صوبے ہر
۸۰۔ دیسی ریاستیں ہر
۸۱۔ داستان امیر حمزہ حصہ۱ ہر
۸۲۔ 〃 〃 حصہ۲ ہر
۸۳۔ 〃 〃 حصہ۳ ہر
۸۴۔ 〃 〃 حصہ۴ ہر
۸۵۔ 〃 〃 حصہ۵ ہر
۸۶۔ کہاوتیں ہر
۸۷۔ پہیلیاں ہر
۸۸۔ گرو نانک ہر
۸۹۔ مثنوی میر حسن ہر
۹۰۔ گلستاں ہر
۹۱۔ احمد خاں دکاندار ہر
۹۲۔ عبدالرحمٰن حلوائی ہر
۹۳۔ نصیب خاں حجام ہر
۹۴۔ ختا خدمت گار ہر
۹۵۔ پیارے خاں درزی ہر
۹۶۔ حفیظ خانساماں ہر
۹۷۔ بین بڑھئی ہر
۹۸۔ سمدھو حلوائی ہر
۹۹۔ میرا ننھا ہر
۱۰۰۔ ہندوستان ۵ ہزار برس پہلے ہر

مکتبہ جامعہ دہلی

اکتوبر ۷۲ء

مکتبہ جامعہ دہلی

زیر ادارت۔ پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۴ نمبر ۴	بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء	سالانہ چندہ ۵ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

طابع وناشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) دیال پریس دہلی۔

فکری آزادی

(معروف انگریز مورخ ڈاکٹر جے بی بیوری نے ایک کتاب "تاریخ حریت فکر" نامی لکھی ہے جس میں انسانی معاشرے کے وجود میں آنے سے اب تک فکری آزادی نے جو مراحل طے کیے ہیں ان کا مدلل اور جامع تذکرہ ہے۔ مندرجہ ذیل صفحات میں اسی کتاب کے باب دوئم کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ باب اوّل کا ترجمہ اسی مترجم کے قلم سے رسالہ "جامعہ" بابت مارچ ۱۹۴۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ پہلا باب محض تعارف ہے اس میں فکری آزادی کی مفہوم سے بحث کی گئی ہے۔ حقیقتاً کتاب دوسرے باب سے شروع ہوتی ہے۔ اُردو میں یہ موضوع یکسر نیا ہے۔ توقع ہے کہ ہمارے صاحب فکر ادیب ادھر توجہ دیں گے۔)

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ اہلِ یونان کے تہذیب پر کیا احسانات ہیں تو سب سے پہلے ہماری نگاہ ان کی ادبی اور فنی فتوحات پر جائے گی۔ لیکن صحیح تر جواب یہ ہے کہ بحیثیت آزادئ فکر و بحث کے نقیب کے وہ ہمارے شکریے کے سب سے زیادہ مستحق ہیں یہ آزادئ قلب و ذہن نہ صرف ان کی فلسفیانہ موشگافیوں، حکیمانہ ترقیات اور سیاسی تجربات کی شرط اوّل تھی بلکہ ادبی و فنی کارناموں کی جان تھی۔ مثال کے طور پر یونانی ادبیات جیسی ہم آج دیکھتے ہیں ویسی ہرگز نہ ہوتیں اگر ان کو زندگی کی آزادانہ تنقید کا حق حاصل نہ ہوتا۔ اس سے قطع نظر انسانی نمود و بود کے میدان میں ان کے جو کارنامے ہیں اگر وہ انجام نہ بھی پاتے تو اصولِ آزادی کی تکوین ہی ان کو انسان کے اعلیٰ ترین محسنوں میں شمار کرانے کو کافی تھی۔ کیونکہ یہ بجائے خود دنیا کے ارتقا کی راہ میں اہم ترین اقدامات میں سے ہے۔

ہمیں یونانِ قدیم کی تاریخ کے بارے میں بہت کم علم ہے ورنہ یہ معلوم کرنا استفادے سے خالی نہ ہوتا کہ انھوں نے آزادانہ نکتہ نگاہ کیونکر حاصل کیا اور اپنی تنقیدی اور تحقیقی استعداد سے بلا جھجک کام لینے کی ہمت ان کو کیسے ہوئی؟ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یونانی قوم مختلف قبائل اور نسلوں کا معجونِ مرکب تھی جن کے مزاج رسوم اور روایات میں بہت اختلاف تھا۔ اگرچہ اکثر ممتاز خصائص ان میں مشترک تھے۔ بعض طبقے دوسروں کے مقابلے میں قدامت پسند، پس ماندہ اور غیر ذی فہم تھے۔ اِس باب میں لفظ 'یونانی' سارے اہلِ یونان کے لیے نہیں آیا بلکہ مدعا محض ان سے ہے جن کو تاریخ تمدن میں کوئی امتیاز حاصل ہے۔ خصوصاً اہلِ لونیا اور ایتھنز والے۔

ایشیائے کوچک کا شہر لونیا آزادانہ تجسس پسندی کا گہوارہ تھا۔ یوروپی سائنس اور فلسفے کی تاریخ لونیا ہی سے شروع ہوتی ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں۔ یہیں فلاسفہ نے زمین کی پیدائش اور ہیئت کے متعلق تحقیق کا دروازہ کھولا۔ لاریب وہ ماضی سے اپنا دامن بالکل نہ چھڑا سکے لیکن ان کو دقیانوسی نظریات اور دھندلے مذہبی معتقدات کے ڈھانے والوں کا نقیب اور پیشرو ماننا ہی ہوگا۔ ایگزنوفینیز کا نام اِس خصوص میں پیش کیا جا سکتا ہے (اگرچہ وہ اپنے ہموطنوں میں قابل ترین عالم نہیں تھا) کیونکہ اس کی تعلیمات میں رواداری اور ٹھیراؤ کا عنصر اس ماحول کی آئینہ داری کرتا ہے جس میں وہ لوگ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ شہر بہ شہر اخلاقی وجوہ کی بنا پر دیوی دیوتاؤں سے متعلق عوامی عقائد کا تجزیہ کرتا اور یونانیوں کے تشبیہی تصورات کا مذاق اڑاتا پھرتا تھا۔ مثلاً "اگر بیلوں کے انسانوں جیسے ہاتھ ہوتے تو وہ بھی بیلوں کی شکل میں اپنے دیوتاؤں کی مورتیاں بنا ڈالتے۔" یہ طنز دراصل پرانے راست گو شعرا خصوصاً ہومر پر ایک چوٹ تھی جس کی عظمت اساطیر میں مسلم تھی۔ ایگزنوفینیز ہومر کی کڑی تنقید کرتا ہے کہ اس نے ایسے افعال کو دیوتاؤں سے منسوب کیا ہے جو انسانوں کے ہاتھوں بھی پورے ہوتے تو انتہائی ذلت کا باعث ہوتے۔ ایسی کوئی [illegible] سننے میں نہیں آئی کہ ایگزنوفینیز کو روایتی عقیدوں کے پرچے

اڑانے یا ہومر کو نام دھرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہاں یہ امر ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ ہومر کی نظمیں ملفوظاتِ خداوندی کبھی نہیں سمجھی گئیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہومر کا کلام یونان کی بائیل ہے حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ خوش قسمتی سے اہلِ یونان کے ہاں سرے سے کوئی بائبل تھی ہی نہیں۔ ہومر کی نظمیں متشکانہ ہیں نہ کہ مذہبی۔ اور مسیحی کتبِ مقدسہ کی نسبت مغالطوں کے طومار سے بری ہیں۔ ان میں بھی قولِ فیصل کی بو آتی ہے مگر صحائف آسمانی کے برخلاف وہ اپنی رائے کو ناقابلِ حذر قرار نہیں دیتا۔ اسی باعث ہومر کی نکتہ چینی کو بزور نہیں ملیامیٹ کیا گیا۔

اسی سلسلے میں آزادہ روی کے اظہار کے ایک دوسرے طریقے کا ذکر ضروری ہے یعنی شیوخ پرستی کا فقدان۔ یونان میں مندروں کے پجاری ہرگز اس قابل نہ ہو سکے کہ اپنے مفاد کی خاطر عوام کو دہشت زدہ کرتے یا اس صدائے احتجاج کو دبا سکتے جو مذہبی عقائد کے خلاف بلند کی جاتی تھی۔ عبادت گاہوں کی دیکھ بھال براہ راست شہری حکام کے ہاتھوں میں تھی۔ ممکن ہے کسی پجاری گھرانے کو تھوڑا بہت رسوخ حاصل ہو جاتا ہو مگر بالعموم کاہن لوگ ریاست کے ملازم ہوتے تھے اور بجز مذہبی رسوم کی تفصیلات کے اُن باتوں پر کوئی کان نہیں دھرتا تھا۔

ابتدائی فلاسفہ بیشتر مادہ پرست تھے اور ان کے فکری نتائج عقلیت کی تاریخ کا دلکش باب ہیں۔ ان میں سے ہیرا قلیطس اور دموقریطس کو باقی پر اس لحاظ سے فوقیت ہے کہ انھوں نے اشد غور کے بعد گرد و پیش کی اشیا کی جانچ کے جدید استدلالی نظریے وضع کیے اور اس طرح عوام کے خلاف عقلی تصورات کو ڈھایا۔ وہ دموقریطس ہی تھا جس نے سب سے پہلے یہ رائے ظاہر کی کہ ہم کو مادی اشیا میں جو دوامیت دکھائی دیتی ہے وہ فریب نظر سے زیادہ نہیں۔ دنیا اور اس کی ہر چیز ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے۔ اس نے حیرت انگیز دلیری سے کام لیکر کائنات کا نظریہ جو ہری پیش کیا جسکی تجدید سترھویں صدی میں ہوئی اور فی الوقت مادے کے جدید ترین طبیعاتی اور کیمیائی نظریات کا ہم پایہ سمجھا جاتا ہے۔ مقدس قولِ فیصل کی بیان کردہ موجودات کی کوئی

خیالی کہانی اس عظیم الشان اہلِ دماغ کو اپنا کام کرنے سے نہ روک سکی۔

اِس فلسفیانہ نکتہ آفرینی نے سوفسطی معلمین کے لیئے راستہ صاف کر دیا۔ پانچویں صدی کے وسط سے ہم ان کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے یونان کے طول و عرض میں زور و شور سے کوششیں جاری رکھیں۔ دور دراز کے سفر اختیار کیئے۔ نوجوانوں کو زندگی کی کشمکش کے لئے تیار کیا اور ان کو معقول استدلال کو کام میں لانے کی ہدایت کی۔ بہ حیثیت معلمین ان کے پیشِ نظر عملی مقاصد تھے۔ انھوں نے طبیعی کائنات سے ہٹ کر انسانی زندگی —— اخلاقیات و سیاستِ مدن —— کے مسائل پر توجہ مرکوز کی۔ اِس مقام پر ان کو ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا یعنی سچ اور جھوٹ کی پرکھ۔ اور بالآخر ان میں سے قابل ترین معلم نے کسوٹی دریافت کر لی۔ طریقِ استدلال منطق اور وسیلۂ استدلال خطابت و مناظرہ۔ ان کے مخصوص نظریے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان کا مشترکہ عنصر تھا آزادانہ تحقیق اور غیر جانبدارانہ بحث و تمحیص۔ وہ ہر نکتے کو استدلال سے متعین کرنے کے عادی تھے۔ حاصلِ کلام یہ کہ پانچویں صدی کے نصف آخر کو "عہدِ درخشاں" کہہ سکتے ہیں۔

غیر ممالک کی جو خبریں یونانیوں کے پاس بس تک برابر پہنچتی رہتی تھیں، انہوں نے قولِ فیصل کی جانب یونانیوں کے ناقدانہ رویئے کو بہت متاثر کیا۔ جب تک کوئی شخص اپنے دیس سے باہر نہیں قدم رکھتا وہ اہلِ ملک کے عادات و اطوار کو خدا کا حکم سمجھتا رہتا ہے۔ مگر جونہی اسے دیگر ممالک میں جا کر بالکل مختلف اشیا سے واسطہ پڑتا ہے تو پھر اسے رواج کی قوت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اخلاقیات و مذاہب دراصل آب و ہوا اور طبعی ماحول کے تابع ہیں۔ یہ دریافت قولِ فیصل کی جڑوں کو پانی دینا شروع کر دیتی ہے اور افراد کے ذہن پر شک آمیز خیالات کا تسلط ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ایک عیسائی جب اس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ لامحالہ سوچتا ہے کہ اگر میں گنگا یا فرات کے ساحل پر پیدا ہوتا تو میرے عقائد قطعاً متضاد ہوتے۔

بلاشبہ ذہنی آزادی کے یہ محرکات ہر دور میں بہت ہی تھوڑے لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اُس زمانے میں بھی ہر مقام کے عوام توہمات کا شکار تھے۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ ان کے شہروں اور قصبات کی عافیت بلا شرکت غیرے صرف دیوتاؤں کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس واہمہ کو دھچکا لگنے کی صورت میں یہ خدشہ رہتا تھا کہ اب فلاسفہ اور ان کی ذہنی کاوشوں کی خیر نہیں۔ اور ایتھنز میں یہ ہو کر رہا پانچویں صدی کے وسط میں ایتھنز نہ صرف یونان کی طاقتور ترین ریاست تھی بلکہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں بھی اس کی حیثیت صدر محفل کی تھی۔ اس وقت ایتھنز کا سیاسی کرتا دھرتا پیریکلز تھا۔ یہ شخص خود آزاد خیال تھا یا کم از کم آزاد خیال اہلِ فکر سے اس کے تعلقات ضرور تھے۔ حکیم انقساغورث کی، جو لونیا میں پیدا ہوا تھا اور اپنی تعلیمات کے پرچار کی غرض سے ایتھنز میں مقیم تھا، دوستی کا دم بھرتا تھا۔ دیوتاؤں کے باب میں انقساغورث کٹر قسم کا منکر تھا۔ پیریکلز کے سیاسی حریف اُسے زک پہنچانے کے لئے اُس کے دوست کا ناطقہ بند کرنے کی تدبیریں کیا کرتے تھے۔ آخر وہ ایک قانون رائج کرانے میں کامیاب ہو گئے جس کی رو سے منکرین اور وہ لوگ جو سماوی امور میں مذہب سے مختلف تعلیم دیتے تھے قابلِ مواخذہ قرار دیئے گئے۔ اس بات کا ثبوت بہم پہنچانا آسان تھا کہ انقساغورث "کافر" ہے۔ دیوتاؤں کے وجود کا انکار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ جس سورج کی پرستش اہلِ ایتھنز صبح و شام کیا کرتے ہیں وہ محض آتشیں اجزا کا تودہ ہے۔ پیریکلز کے رسوخ کے طفیل وہ سزائے موت سے تو بچ گیا مگر اسے بھاری جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ لمپساکس کی طرف چلے جانا پڑا۔ جہاں اُس کا معززانہ استقبال ہوا۔

ایسے متعدد شواہد موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفین مذہب کو کڑی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ مشہور سوفسطی حکیم پراتوگورس نے ایک کتاب "دیوتاؤں کے بیان میں" شائع کی، اس کا نفسِ مضمون تھا دیوتاؤں کو استدلال سے نہیں جانا جا سکتا۔ اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے "دیوتاؤں کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا وجود ہے نہ ہی یہ کہہ سکتا ہوں

کہ ان کا وجود نہیں ہے : اس پر ملحد ہونے کا الزام عائد کیا گیا - وہ چھپ کر بھاگ نکلا - بایں ہمہ آزاد خیالی کا قلع قمع کرنے کی باقاعدہ حکمت عملی ابھی تک وجود میں نہیں آئی تھی - پرٹاگورس کی کتب جمع کرکے نذر آتش کردی جاتی تھیں - مگر انکسا غورث کی تالیفات کتب فروشوں کی دوکانوں کی زینت بنی ہوئی تھیں - مزید برآں عقلیتی آدرش اسٹیج کے واسطے سے نشر ہونا شروع ہوگئے تھے - دایونی سس دیوتا کے سالانہ جشن کے موقعہ پر جو ناٹک کھیلے جاتے تھے وہ بالکل مذہبی نوعیت کے ہوتے تھے - شاعر یوری پی دس توننئے تنقیدی میلانات سے بیحد متأثر تھا - اس کے المیہ ناٹکوں کے متعلق مختلف لوگوں کی مختلف رائیں ہیں لیکن اس کے کردار اکثر غائت درجہ دقیانوسی خیالات کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں - اس پر ایک ہر دلعزیز سیاس نے بے دینی کا الزام رکھ کر مقدمہ چلایا - یہ اندازہ لگانا سہل ہے کہ پانچویں صدی کے آخری تیس سالوں میں تعلیم یافتہ طبقے میں جدید خیالات کی وافر اشاعت ہوئی - استدلالیوں کی جماعت خاصی بارسوخ تھی یہی وجہ سے ان کے خلاف کوئی منظم تحریک پیدا نہیں ہوسکتی تھی - تاہم قانون تکفیر کا سب سے مکروہ پہلو یہ تھا کہ اسے ذاتی وجوہ کی بنا پر استعمال کیا جاسکتا تھا اور کیا جاتا تھا - ہم کو بعض ایسے مقدمات کا علم ہے جن کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اسی قبیل کے محرکات کا ثمر تھے - یونانیوں اور بعد ازاں رومنوں میں یہ ایک مسلمہ اصول تھا کہ مذہب عوام کے لئے ایک ضروری چیز ہے - جو لوگ اسکی تقدیس کے قائل نہیں تھے وہ بھی بطور ایک سیاسی ادارے کے اس کی افادیت مانتے تھے - اور فلاسفہ عموماً اس سے چھیڑ چھاڑ کرنا خلاف دانش سمجھتے تھے ظاہری رکھ رکھاؤ کا فیشن عصر حاضر سے بھی زیادہ جزو زندگی بن گیا تھا - مجموعی اعلیٰ تعلیم سیاسئین اور مفکروں کے پروگرام میں شامل نہیں تھی - اور غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ اُس زمانے میں یہ ممکن تھی بھی نہیں -

تاہم ایتھنز میں کم سے کم ایک شخص ایسا ضرور تھا جس کے سوچنے اور غور کرنے کا رنگ ڈھنگ اپنے ہم وطنوں سے مختلف تھا - وہ تھا حکیم سقراط - سقراط معلمین میں سب سے زیادہ باعظمت تھا -

غریب ہونے کے باوجود اتنا فیاض واقع ہوا تھا کہ اپنے ہمعصروں کے وطیرے کے برخلاف بغیر کسی معاوضے کے علم کی دولت بکھیرا کرتا تھا۔ اُس کا طریق تعلیم بحث و مباحثہ تھا۔ اور اس مباحثے کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا کہ کوئی مثبت نتیجہ مترتب نہ ہوتا بلکہ کسی قائم شدہ اندازِ نظر کی تردید ہو جاتی یا یہ مقولہ دوہرایا جاتا کہ حق کا تعین بہت مشکل ہے۔ بلاشبہ علم ادونیکی سے متعلق اسکے اپنے نظریات تھے (جن کا فلسفے کی تاریخ میں بہت مقام ہے) لیکن یہاں ہمارا مقصد اس کے بحثی اور تنقیدی خصائص سے ہے وہ ہر اس شخص کو جو اس کی بات سننے پر آمادگی ظاہر کرتا عوامی عقائد کو تنقید کی آگ میں پرکھنے کی ہدایت کرتا اور اس کے سامنے دفتر کے دفتر کھولا کرتا تھا۔ اس کے شاگردوں میں ایسے تمام نوجوان طلبۂ فلسفہ شامل تھے جو آئندہ نسل کے امام ہونے والے تھے۔

اگر ایتھنز میں روزانہ اخبارات کی اشاعت کا دستور ہوتا تو صحافی لوگ سقراط کو "خطرناک انسان" کا پرہیبت لقب عطا کرتے۔ اس زمانے میں ایسے کئی تفریحی ناٹک لکھے گئے جن میں فلسفیوں اور سوفسطیوں اور ان کے لایعنی نظریوں کو مذاق کا مضمون بنایا گیا تھا۔ ایسا ایک ڈرامہ ارسطوفاینس کا "بادل" ہم تک بھی پہنچا ہے۔ اس تمثیل میں سقراط کو سٹری اور بہکی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس استہزا کے باوجود سقراط بڑھاپے تک اپنے ہم جلیسوں کو اپنی تعلیمات سے روشناس کراتا رہا اور اس پر کوئی آنچ نہ آئی۔ ستر برس کی عمر میں اس پر لامذہبیت اور نوجوانوں کے خیالات کو پراگندہ کرنے کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا دی گئی۔ (ق م 399) تعجب ہے کہ اہل ایتھنز مخدوش سمجھ کر بھی اسے اتنے عرصے تک برداشت کرتے رہے میرے نزدیک اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش بہت کم ہے کہ اس کے قتل کے محرکات دراصل سیاسی تھے۔ سقراط غیر محدود جمہوریت کی حمایت ہرگز نہیں کر سکتا تھا نہ ہی اُسے اس کا یقین تھا کہ جاہل اکثریت کی رائے رہنمائی کا حق بخوبی ادا کر سکتی ہے۔ غالباً اُس کی ہمدردی اُن لوگوں کے ساتھ تھی جو رائے دہندگی کو محدود کرنے کے حامی تھے۔ بڑی کھینچ تان کے بعد جس میں ایک سے زائد مرتبہ آئین کو سربازار رسوا کیا گیا جمہوریت ظفرمند ہوئی (ق م ۴۰۳) تو ان

لوگوں کے خلاف اشتعال بھڑک اٹھا جن کا رد یہ جمہوریت گوارا نہ رہا تھا۔ ان میں سے سقراط کو نشانہ بنانے کے لئے منتخب کیا گیا۔ وہ چاہتا تو آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ اگر اپنی تعلیم کا پرچار نہ کرنے کا یقین دلاتا تو بھی اُس کی گلو خلاصی ہو جاتی۔ مزید برآں اگر اس نے ذرا مختلف لب ولہجہ اختیار کیا ہوتا تو اسے سزائے موت کا حکم نہ ہوتا کیونکہ اس کے پانسو ایک[5] ایتھنزی منصفوں میں سے ایک بہت بڑی اقلیت نے اُس کی بریت کا فتویٰ دیا تھا۔

اِس معرکے میں وہ صفائی پیش کرنے اُٹھا اور آزادیٔ تقریر کی حمایت میں ایسی معقول اور لاثانی تقریر کی کہ سب دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے۔ اس کے سر برآوردہ شاگرد افلاطون کی تصنیف "سقراط کی صفائی" سے اس کے طرزِ استدلال پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دیوتاؤں کے وجود سے انکار والے الزام کا خاطر خواہ توڑ پیش نہ کر سکا اور اس کی تقریر کا یہ حصہ بالکل پھسپھسا ہے مگر اس الزام کی صفائی میں کہ اس نے نوجوانوں کے خیالات کو خراب کیا جو الفاظ آزادیٔ تقریر کی حمایت میں اس نے کہے ان کے حرف حرف سے شان اور علمیت ٹپکتی ہے۔ یہ "صفائی" کا سب سے گراں مایہ جزو ہے اور اس میں آج بھی وہی تازگی ہے جو اُس وقت تھی۔ جن دو باتوں پر اس نے خصوصاً زور دیا وہ یہ ہیں:-

(۱) فرد کو قولِ فیصل یا انسانی عدالت کے دباؤ سے ایسے امور کو بہر کیف صحیح تسلیم نہیں کرنا چاہیئے جنھیں اس کا ادراک رد کرتا ہے۔ گویا انسان ساختہ قوانین پر ضمیر کو فوقیت حاصل ہے۔ وہ خود اپنی زندگی کو عبادت سے کم نہیں سمجھتا۔ اُس کا ایمان ہے کہ فلسفیانہ مباحثے سے اشیاء کی حیثیت کا تعین کر کے اس نے انسانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے۔ اپنے ذاتی عقائد کو ترک کرنے کی نسبت اُس نے موت کو ترجیح دی۔ وہ کہتا ہے "اگر تم مشروط طور پر رہا کرنا چاہتے ہو اور چاہتے ہو کہ میں حق کی تلاش چھوڑ دوں تو اس کے جواب میں میں کہوں گا۔ شکریہ لیکن میں خدا کے حکم کی پیروی برابر کئے جاؤں گا جیسا کہ میرا ایمان ہے کہ اسی نے اِسی واسطے مجھے جسدِ خاکی عطا کیا ہے۔ جب تک دم میں دم ہے میں فلسفے کا دامن ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جو کوئی

مجھے ملے گا میں اسے ٹوکنے سے ہرگز باز نہ آؤں گا۔ کیا تم کو شرم محسوس نہیں ہوتی کہ تم دولت اور اعزاز کے پیچھے بھاگتے ہو اور خرد اور روح کی بالیدگی کی جانب سے بڑے لاپروا ہو؟ میں نہیں جانتا کہ موت کیا ہے۔ ممکن ہے یہ اچھی چیز ہو۔ بہرحال میں اس سے ذرہ بھر خائف نہیں ہوں۔ البتہ یہ میں جانتا ہوں کہ اپنے مقصد کو چھوڑنا بُرا ہے، بہت ہی بُرا۔

(۲) وہ آزادانہ تمحیص کی مجموعی حیثیت پر زور دیتا ہے۔ "میری ذات میں تم کو ایک سخت گیر ناقد نظر آتا ہے۔ جو ہر لمحہ تمہیں ردّ و قبول کے بکھیڑوں میں الجھائے رہتا ہے تمہارے نظریات کی پڑتال کرتا اور تم پر یہ واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جن امور کے متعلق تمہارا زعم ہے کہ تم ان کی رگ رگ سے آگاہ ہو در حقیقت تم ان کا کچھ بھی نہیں جانتے۔ جن معاملات پر تم میری زبان سے روزانہ تقریریں سنتے ہو وہ نوع انسانی کا بہترین سرمایہ ہیں۔ جو زندگی استدلالی آزمائشوں کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی، تاریکی ہے زندگی نہیں۔"

پس جس دستاویز کو ہم حریتِ فکر کی اوّلین توجیہ ٹھہراتے ہیں، اس میں دو اہم دعووں کی توثیق موجود ہے۔ آزادیٔ ضمیر جو بعد میں عقلیتی جدوجہد کی بنیاد قرار پائی اور تمحیص و تنقید کی سماجی اہمیت۔ اوّل الذکر دعوے کی اساس استدلال پر نہیں بلکہ مشاہدۂ ذات پر ہے۔ اس کے ماننے سے پہلے کسی نہ کسی مافوق الفطرت اخلاقی نظریہ کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ کسی ایسے نظریہ کے قائل نہیں ان کے لئے سقراط کا استدلال بیکار ہے۔ دوسرا دعویٰ زاید از دو ہزار سال کے تجربات کے بعد آج کہیں زیادہ وسیع اور منضبط ہو گیا ہے۔

سقراط کے مقدمے کے جزئیات کا مطالعہ کرنے سے اہلِ ایتھنز کی رواداری اور عدم رواداری آئینے کی مانند روشن ہو جاتی ہیں۔ اس کا اتنے عرصہ تک محفوظ و مامون رہنا، یہ حقیقت کہ بالآخر اس پر زد آئی بھی تو سیاسی اور ذاتی وجوہ سے۔ نیز منصفین کی ایک بڑی تعداد کا اس کے حق میں ہونا اس بات کا مظہر ہے کہ بالعموم فکری آزادی پر تعزیرات عائد نہیں تھیں۔ یہاں ارسطو کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جس نے ستتر برس بعد ایتھنز کو خیرباد کہا کیونکہ اس پہ کفر کے الزام میں مقدمہ چلایا

جانے والا تھا اگرچہ اصلیت میں یہ ایک گہری سیاسی سازش تھی مختصر یہ کہ آزادیٔ رائے کو منتظم طور پر مٹانے کی کوئی اسکیم برسرِ کار نہیں تھی۔

یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ یونانیوں کے جذبات مقاومت کی چھان بین میں ہم کو فلاسفہ کے جزدان ٹٹولنا پڑتے ہیں۔ سقراط کے ذہین ترین شاگرد افلاطون نے اپنے آخری ایام میں ایک مثالی ریاست کا ڈھانچہ بنایا تھا۔ اس میں اس نے ایسے مذہب کے قیام کی تجویز کی جو رائج الوقت مذہب سے خاصہ مختلف تھا۔ سارے شہریوں کو اس کے دیوتاؤں کے آگے سر جھکانے پر مجبور کرنے کا منصوبہ باندھا گیا تھا۔

لیکن اس کے اس میلان میں جو دلچسپ نکتہ تھا وہ یہ کہ اسے اس امر کی چنداں پروا نہیں کہ کسی مذہب میں حقانیت کا عنصر کتنا ہے۔ بلکہ وہ مذہب کی اخلاقی افادیت سے کام رکھتا ہے۔ اخلاق کے فروغ کی راہ میں قصص و حکایات سے مدد لینے کو بھی تیار تھا۔ اساطیر کی مذمت وہ اس وجہ سے نہیں کرتا کہ وہ بے سود تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مفید مطلب نہیں تھے۔

ایتھنز کی حریت نوازی چند فلسفوں پر منتج ہوئی جن کا خاص تعلق سقراط کے مواعظ سے تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ افلاطون اور ارسطو وغیرہ کی کوششوں کو دیگر ذہنی تحریکوں کی نسبت انسانی ترقی میں بدرجہا زیادہ دخل ہے۔

اپیکورس کے متبعین لاادریوں[۱] اور رواقیوں[۲] کے نظریۂ روحانی سکون کی تلاش میں میں تیسری صدی عیسوی سے ساری یونانی دنیا میں زور و شور سے ان کی تبلیغ کی جاتی تھی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بیشتر تعلیم یافتہ یونانی عقلیت کے دلدادہ تھے۔ اپیکورس کی تعلیم کا نمایاں حصہ مذہب شکن رجحان کا حامل ہے۔ مذہب کی بنیاد وہ خوف کو قرار دیتا ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد اسی خوف کی بیخ کنی ہے۔ وہ مادہ پرست تھا۔ اس نے دیموقریطس کے نظریہ جوہری کی

---

[۱] مذہب کی صداقت میں شک کرنے والے لوگ۔

[۲] اس مذہب فلسفہ کے پیرو نیکی صرف خیر کو مفید حیات قرار دیا۔ اسکا ظہور ۳۰۸ ق۔م میں ایتھنز میں ہوا

تفسیر کی اور کائنات کو کسی سماوی طاقت کا پابند ماننے سے انکار کیا۔ دیوتاؤں کے وجود کو اس نے تسلیم کیا، لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کے دیوتا ہونے نہ ہونے کے برابر تھے، جو کسی کونے کھدرے میں پڑے مقدس سکون کے مزے لوٹتے تھے۔

اس فلسفے میں کوئی تو ایسی بات تھی جس سے ایک قادر الکلام شاعر بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رومی لوقطریطیس (پہلی صدی ق۔م) اپیکورس کو نوع انسانی کا نجات دہندہ خیال کرتا تھا۔ اور اس نے اس کے مرکزی فلسفے کو اپنی ایک نظم "تعمیر عالم" میں سمویا ہے۔ وہ اپنے تئیں حقیقی مذہب کا حامی ظاہر کر کے آتشین الفاظ میں مذہب کی مذمت کرتا ہے۔ اور چن چن کر ان جرایم کو گنتا ہے جن کی مذہبی جذبے نے ترغیب دی۔ وہ لامذہبوں کے طائفے کی رہنمائی کرتا ہوا آسمانوں سے ٹکر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ علمی دلائل کو وہ ایک نئی دنیا کے انکشاف کے طور پر پیش کرتا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اس کا سارا جوش و خروش مکمل سکون کی راہ دکھاتا ہے۔ اگرچہ یونانی حکیموں نے کام کی تکمیل کر دی تھی اور لاطینی نظم کی حیثیت محض ترانہ فتح کی سی ہے تاہم فکری ادب میں اس کے بے پایاں خلوص کے باعث اس کا مقام ہمیشہ بلند رہے گا۔ اگر یہ تودۂ بارود کسی قدامت پرست معاشرے میں پھٹا ہوتا تو اس کے اثرات اور بھی گہرے ہوتے لیکن اس زمانے میں تعلیم یافتہ رومن مذہب کے بارے میں شکی تھے۔ بہت سے اپیکورس کے پیرو تھے۔ لہذا جن کی نظر سے یہ نظم گذری انہوں نے اس میں کوئی خاص جدت نہ پائی۔

ذہنی آزادی کے کاز کو رواقی فلسفے کی دین کچھ کم اہم نہیں اور کسی ایسے ماحول میں اس کا پروان چڑھنا محال تھا جہاں استدلال کی زبان بندی کی گئی ہوتی۔ یہ فلسفہ قول فیصل کے مقابلے میں فرد کے حقوق کی فوقیت پر زور دیتا ہے۔ سقراط نے پہلے ہی رسوم کی خامی اور لوگوں کی غلط کاری کی کھوج لگائی ہو، لیکن معاشرے کی رہبری کا کوئی اصول اس نے وضع نہیں کیا۔ یہ اصول رواقیوں نے آئین فطرت سے اخذ کیا اور اس کے اثرات اتنے دوررس ہوئے کہ ان کے اپنے مخصوص حلقوں سے نکل کر رومن قوانین بھی ان سے دامن نہ بچا سکے۔

ان فلسفوں پر بحث کرتے کرتے ہم یونان سے روم جا پہنچے ہیں۔ سلطنت روما اور پھر بعد میں جمہوریۂ روما میں اظہار رائے پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی، اور ان فلسفوں کی جو فرد کو اولین اہمیت عطا کرتے ہیں خوب اشاعت ہوئی۔ اکثر سرکردہ شخصیتیں ریاستی مذہب کو تسلیم نہیں کرتی تھیں لیکن یہ لوگ بھی اس لحاظ سے اس کو قابل قدر ضرور سمجھتے تھے کہ اس کے وسیلے سے عوام پر قابو رکھنا آسان تھا۔ ایک یونانی مورخ رومنوں کی حکمت عملی —— عوام کے فائدے کے لئے توہمات کی آبیاری کرنے کو —— قابلِ تعریف قرار دیتا ہے۔ یہی سیسرو کا رویہ تھا۔ اور قدیم منکرین عموماً اس امر کے قائل تھے کہ غلط مذہب بھی بطور سماجی مشین کے لازمی اور لابدی شے ہے۔ آج بھی یہ نظریہ عام ہے۔ کم از کم مذہب کی سراہنا صداقت نہیں بلکہ افادیت کی بنا پر کی جاتی ہے۔ یہ وطیرہ میکیاولی کے فلسفہ سیاست کا نچوڑ ہے۔ جس کی رائے تھی کہ حکومت کے لئے مذہب ضروری ہے، حکمران کا فرض ہے کہ اگر وہ مذہب کو باطل سمجھے تو بھی اس کی حمایت کرتا رہے۔

یہاں یونان کے آخری حکیم لوسین (دوسری صدی عیسوی) کا تذکرہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے مذہب کا مذاق اڑا کر بے دریغ حملے کئے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کی تضحیکات نے دماغی تفریح کے ماسوا اس دور کے پڑھے لکھے لوگوں پر کوئی مستقل اثر بھی چھوڑا تو ہماتی عقائد کے بے ڈھنگے پن کو جیسا لوسین نے نشانہ بنایا کوئی دوسرا شاید ہی اس کی گرد کو بھی پہنچا ہو۔

رومنوں کی عام پالیسی یہ تھی کہ سلطنت کے طول و عرض میں سب مذاہب و آراء کو کھلی چھٹی ہونا چاہئے۔ کافر کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں تھی۔ اس کے ثبوت میں ہم شہنشاہ طبریس کے یہ الفاظ پیش کرسکتے ہیں " اگر کوئی شخص دیوتاؤں کی اہانت کرتا ہے تو وہ آپ اس سے نپٹ لیں گے " رواداری کے اصول سے انحراف کیا گیا تو عیسائیت کے معاملے میں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ بدسلوکی یورپ میں مذہبی مناقشات کی ابتدا تھی۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا

موجب ہوگا کہ ان سلاطین نے جو قابل اور انسانیت پرور تھے، استبداد پسند نہیں تھے، یہ رویہ کیوں اختیار کیا؟

مدت تک رومن عیسائیوں کو یہودیوں کا ایک فرقہ خیال کرتے رہے۔ یہودیت واحد مذہب تھا جو اپنی عدم رواداری اور علیحدگی پسندی کی بدولت رواداری غیر اہل کتاب کی نگاہ میں مخدوش تھا۔ اگرچہ بعض اوقات یہودی ارباب سلطنت سے بھی اُلجھ جاتے تھے، مگر شاہی رویہ یہی رہا کہ ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے، اور یہ اپنے خلاف خود پیدا کردہ منافرت سے آپ ہی عہدہ برآ ہولیں۔ لیکن یہودیت کے امور میں دراندازی نہ کرنا اور بات تھی، اور اس کی تبلیغ کو چپ چاپ سہہ لینا، اور ایک ایسے مذہب کو پھلتے پھولتے دیکھ کر جو دیگر مذاہب سے سخت عناد رکھتا ہو بادشاہ کے دل میں غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی تھیں۔ اسی وجہ سے یہ عام خیال تھا کہ صیہونیت کے پیرو نوع انسانی کے دشمن ہیں۔ کیونکہ یہودیت کی اسپرٹ رومن سماج کی روایات سے تال میل نہیں رکھتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے قیصر دومیشین نے سب سے پہلے اس سوال کو اس روشنی میں دیکھا۔ اور رومن شہریوں کے تبدیلی مذہب کے خلاف سخت اقدامات کئے۔ ممکن ہے اس کے احکام کی زد میں بعض عیسائی بھی آگئے ہوں، مگر اس کے نقطۂ نگاہ سے بات ایک ہی تھی۔ مسیحیت، یہودیت سے — جس کے بطن سے اس نے جنم لیا تھا — عدم رواداری اور عناد کے باب میں بہت کچھ ملتی جلتی تھی لیکن ان میں فرق یہ تھا، کہ مسیحیت کے مقابلہ میں صیہونیت کی اشاعت بالکل بے اثر رہی۔

ٹراجن کے عہد میں یہ اصول تھا کہ عیسائی ہونا ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ بعد ازاں مسیحیت غیر قانونی مذہب کی شکل میں زندہ رہی لیکن عملاً اس قانون کا اطلاق جبر و قہر کے ساتھ نہیں کیا جاتا تھا۔ شہنشاہ اس امر کے خواہاں تھے کہ اگر ممکن ہو تو مسیحیت کو بلا خون خرابہ کئے معدوم کر دیا جائے۔ ٹراجن کی ہدایت تھی کہ چن چن کر عیسائیوں کی کھوج نہ لگائی جائے۔ گمنام ذرائع سے حاصل شدہ اتہامات پر دھیان نہ دیا جائے اور جو مخبر اپنی خبر کا ثبوت مہیا کرنے میں ناکام

رہے اُسے دھوکا دہی کا مجرم گردانا جائے۔ خود عیسائیوں کو اعتراف تھا کہ اس فرمان سے وہ مامون اور محفوظ ہو گئے۔ ماسوا ان واقعات کے جن کا علم سب کو تھا، دوسری صدی عیسوی میں بعض بعض مقدموں کے سلسلے میں مسیحیوں نے ڈٹ کر تشدد کا مقابلہ کیا اور شہیدوں کی فہرست میں اپنے نام درج کرائے۔ اس امر کی دو شہادتیں موجود ہیں کہ اگر کوئی محروس عیسائی فرار ہو جاتا تو اس سے چشم پوشی کی جاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ عیسائیوں کی پکڑ دھکڑ اہل اختیار کا مطمح نظر نہیں تھی بلکہ عوام کی خواہش کا نتیجہ ہوتی تھی۔ لوگ اس پُراسرار مشرقی گروہ سے ہراساں تھے جو ان کے دیوتاؤں سے متنفر تھا اور دنیا کی تباہی کی دعائیں مانگتا تھا۔ سیلاب، قحط اور خصوصاً آتش زدگی، یہ واقعات عیسیٰ کے کالے جادو کا پھل سمجھے جاتے تھے۔

جب کسی پر عیسائی ہونے کا الزام لگایا جاتا تو جھوٹ سچ معلوم کرنے کے مقصد سے ملزم کو دیوتاؤں یا معبود بادشاہوں کے بتوں کی پوجا کرنے کو کہا جاتا تھا۔ اس حکم کی بجا آوری ملزم کو فوری رہائی کا مستحق بنا دیتی تھی۔ اس طریق عمل کے خلاف عیسائیوں کے اعتراض کا ـــــ کہ عیسائی اور یہودی ہی واحد معترضین تھے ـــــ یہ مطلب لیا جاتا تھا کہ ان کا مذہب خطرناک تھا۔ بادشاہوں کی پوجا کا مدعا اس عظیم سلطنت کی ایکے اور اتحاد کا مظاہرہ تھا جو اپنے مختلف معتقدات کی حامل اقوام کو شیرازہ بند کئے ہوئے تھی ایسی کا مقصد سیاسی تھا، وفاداری اور اتحاد کا اظہار۔ اور یہ کوئی تحیر خیز چیز نہیں کہ اس کی خدمت کرنے والوں پہ عدم وفاداری کا اشتباہ کیا جاتا۔ لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ شہریوں کے لئے اس پوجا پاٹ میں حصہ لینا لازمی نہیں تھا۔ سلطنت کے عام باشندے جو سول یا فوجی خدمات سرانجام دیتے تھے ان سے کسی نوع کی توثیق طلب کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں پہ فوجی اور سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہو گئے۔

اس زمانے میں عیسائیوں کی جانب سے جو تحریری عذر پیش کئے گئے اگر وہ بادشاہوں

کی تلاش کرتے تو بلا شبہ اس سیاسی خطرے کی بو سونگھ لیتے۔ بین السطور میں یہ پڑھ لینا دشوار نہیں تھا
کہ اگر عیسائیوں کو بالادستی مل جائے تو وہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر دم لیں گے۔ تاتیان
کی ہم عصر تصنیف "یونانیوں سے دو دو باتیں" سے منکشف ہوتا ہے کہ معذورین Apologists
کے طول طویل بیانات کا مقصد کیا تھا؟ اس تہذیب سے بے پناہ نفرت جس کے ماحول میں وہ
سانس لیتے تھے۔ اس عہد کے مسیحی ادب کے طالب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اگر عیسائیوں
کو کسی مملکت میں اقتدار مل جاتا تو وہ دیگر معتقدات و مذاہب کو ہرگز ہرگز برداشت نہ کرتے
شہنشاہوں کا عیسائیوں کے باب میں رواداری کا خیر باد کہہ دینا رواداری کے تحفظ کے خیال
سے تھا۔

تیسری صدی عیسوی میں اگرچہ مذہب پر قیود عائد تھیں تاہم اس کو برداشت کیا جاتا
تھا۔ کلیسہ کھلم کھلا اپنی تنظیم میں مصروف تھا۔ مذہبی اجتماعات میں دراندازی نہیں کی جاتی تھی۔
چند مقامی نوعیت کی چھوٹی موٹی تشددانہ کوششیں ضرور ہوئیں۔ بڑے پیمانہ پر قتل و غارت صرف
ایک مرتبہ ہوا ——— ڈی سی اس (۲۵۰ ق-م) نے شروع کیا اور والرین (Valerian)
نے جاری رکھا۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ اس صدی میں بہت سے واقعات رونما ہوئے، اگرچہ بعد
میں عیسائیوں نے رائی کا پہاڑ بنا لیا اور واقعات شہادت پر دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔

پھر ایک طویل بحرانی دَور شروع ہوا۔ سلطنت کا سنگھاسن ڈولتا دکھائی دینے لگا۔ مگر
شہنشاہ دی اوکلیشین (Dioclation) کے تدبر اور ترقی پسند اصلاحات نے رومن
طاقت کو سو سال کے لئے بکھرنے سے بچا لیا۔ اس نے رومن اسپرٹ کی تجدید سے اپنے
سیاسی مشن کی تکمیل میں مدد لینا چاہی اور ریاستی مذہب کی شریانوں میں نیا خون دوڑانے کی
کوشش کی۔ چنانچہ اس نے عیسائیوں سے جو اقلیت میں ہونے کے باوجود بہ اعتبار تعداد کافی
تھے ——— کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو ملیامیٹ کرنے اور کشت و خون کا ایک نیا باب کھول دیا۔
جلو ویل مستبدانہ، منظم اور عمومی تھا۔

لیکن یہ کوشش یکسر ناکام رہی، عسائیوں کا شمار اتنا بڑھ چکا تھا کہ ان کو ختم کرنا محالات میں سے تھا۔ دی اوکلیشن کی تخت سے دست برداری کے بعد مملکت کے مختلف حصوں میں جو حکمران برسر اقتدار آئے انہوں نے اپنے پیش رو کی حکمت عملی کو نامناسب قرار دیا۔ فرامین رواداری (Edicts of Toleration) (۳۱۱ و ۳۱۳ ق۔م) کے ذریعہ اس خونی ڈرامے کا خاتمہ ہوا۔ یہ دستاویزات مذہبی آزادی کے تاریخ کے طالب کے واسطے خاصی دلچسپی کے حامل ہیں۔

پہلا فرمان جو مشرقی صوبہ جات میں جاری ہوا حسب ذیل ہے۔

"ابدولت عرصہ دراز سے اپنی سلطنت کے گم کردہ راہ عیسائیوں کی اصلاح کے آرزومند ہیں۔ جنہوں نے اپنے اجداد کے قایم کردہ مقدس مذہب اور رسوم سے منہ موڑا اور نہایت بے باکی سے قرون عتیق کے رواجوں کی تحقیر جاری رکھی اور اپنی پریشان خیالی کے مطابق غیر معقول اصول و قواعد گھڑے اور ہماری سلطنت کے مختصر عناصر سے بھان متی کے کنبے کا سا سماج یکجا کر لیا ہے۔ ابدولت کے جاری کردہ دیوتاؤں کی پرستش سے متعلق فرامین کے کارن بہت سے عیسائی اذیت اور صعوبت میں مبتلا ہو گئے، بہت سے موت کے گھاٹ اترے اور مزید برآں سے جو ابھی اپنی ملحدانہ بے راہ روی کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں؛ ہر نوع کی مذہبی رسومات کی ادائے گی سے محروم ہیں، ان بدنصیبوں کی طرف ہم اپنا دست ترحم دراز کرتے ہیں۔ لہذا ان کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ جو شخصی رائے چاہیں رکھیں، رسوم کی ادائیگی کے لئے بے خوف و خطر جمع ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ رائج الوقت قانون کا احترام ملحوظ رکھیں۔"

دوسرا فرمان "فرمان میلان" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی تصنیف کانس ٹن ٹائن (Constantine) سے منسوب کی جاتی ہے۔ مغز وروح کے اعتبار سے اسی کا ہم صنف ہے۔

رومن حکومت اور عیسائیوں کے تنازعے نے تشدد اور آزادی ضمیر کے سوال کو معرض

بحث میں لا کھڑا کیا۔ ایک ریاست جو اپنا جداگانہ سرکاری مذہب رکھتی ہے مگر ساتھ ہی دیگر مذاہب و معتقدات کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مملکت میں ایک نئی جماعت پیدا ہو چکی ہے جو اپنے علاوہ کسی دوسرے مذہب کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور اگر اس کا بس چلے تو سب کا صفایا کر ڈالے۔ حکومت خود اپنے تحفظ کی خاطر ان مخرب خیالات کی روک تھام کرتی ہے اور اس جماعت کے عقائد کو علی الاعلان ممنوع قرار دیتی ہے۔ عقیدوں کی خصوصیت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے معاشری اثرات بد کی بنا پر۔ امکان معاشرہ اپنے ضمیر کا گلا گھونٹے بغیر اپنے مخصوص عقیدوں کو ترک نہیں کریں گے۔ آزادیِ ضمیر کو ریاست کی طرف عائد ہونے والی تمام تر ذمہ داریوں کی نسبت اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو۔ ریاست اس نئے اصول کو تسلیم کرنے سے اپنے تئیں ناقابل پاتی ہے۔ نتیجہ ہوتا ہے قتل و خون۔

وفادار اور غایت درجے راسخ العقیدہ لوگوں کے نقطۂ نظر سے بھی عیسائیوں کے قتل کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایک ایک قطرہ خون محض بیکار بہایا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک بڑی غلطی تھی، کیونکہ یہ ناکام رہی۔ قتل و غارت دو برائیوں میں سے کم معیوب برائی کے انتخاب کے مرادف ہے۔ متبادل صورتیں ہیں (۱) جبر محض (جس کے بجائے خود برائی ہونے سے خونریزی کا معقول وکیل بھی انکار نہ کرے گا) پُر خطر آرا کی تبلیغ۔ اوّل الذکر برائی کو دوسری بُرائی کے مقابلے میں اس بنا پر ترجیح دی جاتی ہے کہ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ دوسری زیادہ کھل ہے لیکن اگر خونریزی حصول مقصد میں کامیاب نہ ہو تو پھر ایک کے بجائے دو بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی جواز ہو ہی نہیں سکتا، جہاں تک ان کے نظرئے کا تعلق ہے شہنشاہ مسیحیت کو خطرناک سمجھتے ہیں اور وہ اس کی سرکوبی کرنے میں حق بجانب تھے لیکن یا تو انھیں اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے تھا یا اس کا خاتمہ کرنے کے لئے جچے تلے طریقے اختیار کرنا چاہئے تھے اگر شروع ہی میں انہوں نے احتساب کا معقول انتظام کیا ہوتا تو ممکن تھا کہ اس سے ان کا پیچھا چھوٹ جاتا۔ یہ طریقہ کم سے کم مدبرانہ تو تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے سامنے ماضی کی

کوئی مثال موجود نہ تھی جو دلیل راہ کا کام دیتی۔ وہ دھمکی اور تخویف سے کام چل جانے کی امید باندھے ہوئے تھے۔ ان کی جدوجہد میں تذبذب کا پہلو نمایاں تھا اور وہ مضحکہ خیزی کی حد تک غیر موثر تھی۔ بعد کی خونریزیاں (۲۵۰ اور ۳۰۳ عیسوی) تو کامیابی سے بالکل تہی داماں تھیں۔ یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسیحی ادب کو غارت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

اہم تر مسئلہ، کہ اگر خونریزی سے خواہ حصول مقصد بھی ہو جائے تو بھی یہ روا ہے یا نہیں۔ اس پر کسی نے غور و خوض کی زحمت گوارا نہ کی۔ ساری کھینچ تان کا سلسلہ دے کر ضمیر انسانی اور حکم (Authority) اور ریاست کے مفروضہ مفادات کی باہمی عدم مطابقت تھی یہ وہی سوالات تھے جو کبھی سقراط نے اٹھائے تھے۔ البتہ اتنی تبدیلی ضرور ہو گئی تھی کہ ان کا میدان وسیع ہو گیا تھا۔ جب قانون اور کسی دوسرے آقا کے احکام میں ٹکر ہونے لگے تو کیا ہوتا ہے؟ کیا ریاست پر لازم ہے کہ ہر قیمت پر فرد کے ضمیر کا احترام کرے یا کسی مخصوص حدود کے اندر رہ کر کرے؟ عیسائیوں نے اس کے حل کی کوئی راہ نہ نکالی۔ اس لئے کہ مجموعی حیثیت سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ غیر مسیحی حکومت سے صرف اپنے لئے حق آزادی کا مطالبہ کرتے تھے اور یہ بڑی خوش فہمی ہوگی اگر سمجھ لیا جائے کہ حکومت نے ان کی معتوب غناسطی (Gnostic) فرقے پر زور آزمائی کی ہوتی تو وہ اس کی خدمت کرتے۔ اگر ریاست کی باگیں عیسائیوں کے ہاتھ آجائیں تو وہ اصول کو طاق نسیاں پر رکھ دیتے ہیں۔ خود اپنے پیدا کردہ ہمارے زمانے میں کلیسا جدید ریاستوں سے آزادی ضمیر کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اپنے بھلے دنوں میں اس نے کبھی اس اصول کو تسلیم نہ کیا۔

کلاسکی عہد سابقہ (Classic antiquity) کی تاریخ کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ حریتِ فکر ہوا اور پانی کی طرح عام تھی۔ اس کی حیثیت مسلمہ سمجھی جاتی تھی اور کوئی اس پر غور و خوض کرنے کی زحمت نہ اٹھاتا تھا۔ ایتھنز کے سات آٹھ فلسفیوں کو عدم تقلید کے جرم میں سزا ضرور دی گئی مگر بیشتر حالتوں میں یہ الزام محض حیلہ تھا۔ اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا گیا کہ علوم

کی راہ میں تعصب کے روڑے نہیں اٹکانا چاہئیں یا حکمت کو بے مغز حکم کا پابند نہیں کر دینا چاہیئے
تعلیم یافتہ یونانیوں میں رواداری کا مادّہ کافی تھا، کیونکہ وہ استدلال کو عزیز رکھتے تھے۔
اور کسی فرد یا جماعت کو عقلی نتائج سے استرداد کا اہل نہیں قرار دیتے تھے۔ ذاتی رائے کی
ٹھونس ٹھانس نہیں کی جاتی تھی۔

لیکن یہ آزادی شعوری حکمت عملی کا نتیجہ نہیں تھی۔ لہذا قیاسی تھی۔ حدیث فکر مذہبی خود
مختاری اور رواداری کے مسائل معاشرے پر ٹھونسے نہیں جاتے تھے اور نہ ہی کبھی ان پر
سنجیدہ غور و فکر کیا جاتا تھا۔ عیسائیوں اور رومن حکومت کی ٹکر کے وقت یہ کوئی نہ دیکھ سکا کہ
ایک چھوٹی اور بے حقیقت جماعت کی وجہ سے عظیم معاشری اہمیت کا سوال زیر بحث آ گیا
فطری اور عملی خونریزی کا طویل تجربہ اصول حریتِ فکر کی بنا ڈالنے کو درکار تھا۔ مسیحی کلیسا کے
خلاف جبر و استبداد اور وحشیانہ زد و کوب اور اس کے نتائج نے بالآخر عقلیت کا لوہا مان لینے اور ذہنی آزادی
کو مستقل طور پر چلانے کے لئے مجبور کیا۔ یونانیوں اور رومنوں کی اسپرٹ نے جو ان کی تصانیف میں زندگی
کے سانس لے رہی تھی ایک زمانے کے بعد دوبارہ کائنات کو منور کیا اور دورِ عقلیت کے
آغاز کا باعث بنیں۔

موت کب آتی ہے

(ذیل کا افسانہ آیات قرآنی کی تفسیر و وضاحت کی ایک نہایت دلچسپ کوشش ہے اور اس لئے خاص طور پر ہمارے قارئین کی توجہ کی مستحق ہے۔ اس مسئلہ پر اپنی کوئی رائے ظاہر کئے بغیر کہ افسانہ کو تفسیر قرآن کا ذریعہ بنانا کہاں تک تفسیر اور افسانہ دونوں کیلئے موزوں ہوسکتا ہے نیز اس کے بارے میں بھی اپنی رائے کو محفوظ رکھتے ہوئے کہ صاحب افسانہ کہاں تک اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں ہم اپنے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے تاثرات و تنقید سے ضرور ہم کو مطلع فرمائیں تاکہ ہم صاحب افسانہ تک ان کو پہنچا سکیں۔ جیلانی صاحب کی اس کوشش کو بالکل نیا تو نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری شاعری اور ادب کو ایک زمانے سے تفسیر کا ذریعہ بنایا جاتا رہا ہے۔ مولانا رومی کی مساعی اس ذیل میں جس قدر کامیاب و مشہور ہوئی ہیں ان سے ہر شخص واقف ہے۔ افسانہ میں بھی اس قسم کی کوشش، توبۃ النصوح کے مصنف، قریبی زمانہ میں کر چکے ہیں لیکن جیلانی صاحب کے افسانہ کے انداز میں بڑی قدرت ہے افسانہ نگاری کی ان میں خداداد صلاحیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ افسانہ کو مقصد کی جگہ ذریعہ بنانے سے کیا ان کے افسانے اپنی خوبی کو قائم رکھ سکیں گے؟ دوسری جانب اس سے زیادہ اہم اور نازک مسئلہ یہ ہے کہ کیا تفسیر جیسا اہم اور ذمہ داری کا کام تشبیہ و استعارہ و افسانہ کی صورت میں جیلانی صاحب صحت و سلامتی کے ساتھ انجام دے سکیں گے؟ جیلانی صاحب کے حلقۂ احباب میں نئی نسل کے جو نہار علما شامل ہیں اور خود بھی انہیں مذہب کیساتھ گہرا تعلق اور شغف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ باتیں کس حد تک انہیں مفسر کے منصب جلیلہ کا مستحق بنانے کے لئے کافی ہیں اس کے بارے میں ہم اپنے آپ کو اظہار رائے کا اہل نہیں پاتے لیکن ہمیں اہل الرائے حضرات کے خیالات معلوم کرنے کی ضرور خواہش ہے۔ امید ہے وہ ہمیں مایوس نہ فرمائیں گے۔ مدیر)

انزل من السماء ماءً فسالت اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبدًا رابیًا و مما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ ۔ کذالک یضرب اللہ الحق والباطل ۔ فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض ۔

(سورہ رعد)

سورج عین نصف النہار پر تھا اور اس کی شعاعیں سیدھے تیر کی طرح ہر شے کے جسم میں چبھ رہی تھیں رحمت علی سر پر چارے کا گٹھا اٹھائے چلا آرہا تھا ۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور اس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی وہ دیوانے کتے کی طرح ہانپ رہا تھا ۔ خشک نالے کے پل کے قریب شیشم کا ایک بڑا درخت زمین پر اپنا ٹھنڈا سایہ ڈال رہا تھا ۔ اس سے آگے گاؤں کی قبریں غیر منظم صورت میں بکھری ہوئی تھیں ۔ رحمت نے درخت کے نیچے اپنا بوجھ پھینک دیا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے جسم میں ایک ٹھنڈی جھرجھری سی پیدا کرتا ہوا گذر گیا رحمت کے منہ سے بے اختیار واہ واہ نکل گیا ۔ پھر اس نے دھوتی کے پلو سے اپنی پیشانی صاف کی اور ایک گہرا سانس لیا ۔ جب اس کا گرم دماغ ٹھنڈا ہوا تو اسے اپنی پوری زندگی دھوپ کی طرح چلچلاتی معلوم ہوئی ۔ ہر روز اس کا یہی کام تھا ۔ کڑکتی دھوپ میں باہر جانا اور چارہ کاٹ کر لانا ۔ آرام اور چین کب آئے گا ؟ وہ سوچ رہا تھا ۔ اس کی طبابت کی چھوٹی سی دکان تھی ۔ لیکن دیہات میں مریض بھی کم تھے بچپن سے لیکر پچاس برس کی عمر تک اس کی مفلس زندگی ایک ہی رفتار پر چل رہی تھی ۔

"اللہ اگر تو نے اس بوڑھی عمر تک مجھے ایک بچہ بھی نہیں دیا تو بہتر ہے تو موت ہی بھیج دے میری موت پر میری بیوی کے سوا اور کون رونے والا ہے ۔ مختصر سی پونجی پر میرا بھائی قبضہ کرے گا اور تمام پونجی شراب کے گلاس اور جوئے کی بساط پر بہ جائے گی"

یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ بکتا تھا ۔

"اے موت ، اے موت ۔ آ اور مجھے عالم آلام سے لے جا"

ایکا ایکی سرسوں کے نزدیکی کھیت میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک شخص اس میں سے نکلا

وہ اسی کی طرف چلا آرہا تھا۔ لیکن اس کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا۔ اس کی داڑھی خشخشی تھی اور بھویں تنی ہوئی۔ اس کی آنکھیں چاند کی طرح گول اور سورج کی طرح تیز تھیں۔ وہ اپنے لباس اور قطع وضع سے کسی نزدیکی علاقہ کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ آیا اور رحمت کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"کہو کیا کہتے ہو"

رحمت نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اس کی نگاہیں اس کی آنکھوں میں تیر کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" رحمت نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" اجنبی نے جواب دیا۔ "تم نے ابھی ابھی مجھے یاد کیا تھا"

رحمت خطرے کا احساس کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تتلاتی ہوئی زبان میں پوچھا "یعنی ت ت تم موت ہو!"

"ہاں! تم نے مجھے بلایا تھا"

اس کی آواز رحمت کے کانوں میں ایک سیخ کی طرح چبھی۔ رحمت نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اسکا سر چکرانے لگا۔ اس نے جلدی سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "مجھے یہ گٹھا اٹھوا دو گے؟"

فرشتہ موت ہنس پڑا۔ اس کی مسکراہٹ پر رحمت کی جان میں جان آئی وہ سمجھ گیا کہ موت اتنی سنگ دل نہیں جتنی کہ سمجھی جاتی ہے۔ رحمت نے پوچھا "تم کدھر آئے تھے؟"

"میں رمضان کسان کی جان لینے آیا تھا" اس نے جواب دیا۔

"رمضان" رحمت بے ساختہ چلا اٹھا۔ "اسے تو میں ابھی ابھی ہل چلاتے چھوڑ آیا ہوں"

"ہاں اسی کے پاس جا رہا ہوں"

رحمت کے دل میں جذبہ شوق اٹھا "کیا تم مجھے دکھاؤ گے موت کیسے واقع ہوتی ہے؟"

"ہاں تم قریبی کھیت میں چھپ کر بیٹھ جانا صرف تم ہی مجھے دیکھ سکو گے"

رحمت اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ رمضان درخت کے نیچے بیٹھا حقہ پی رہا تھا وہ ابھی ابھی

کام سے فارغ ہوا تھا۔ بیل دوسرے درخت کے نیچے بندھے لکڑی کی ناند میں چارہ کھا رہے تھے رحمت گندم کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

رمضان بڑے مزے سے حقے کا کش لگاتا اور اس کا دھواں ہوا میں چھوڑتا۔ وہ مشکل تیس برس کا ہوگا۔ اس کا مضبوط جسم پھٹے ہوئے کرتے میں سے اپنی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ وہ بار بار گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دور گاؤں کی سڑک پر اس کی بیوی سر پر ڈلیا اور لسی کی مٹکی اٹھائے چلی آرہی تھی۔ اس کا دوپٹہ ہوا میں کشتی کے بادباں کی طرح لہرا رہا تھا۔ اس کو دیکھکر رمضان جلدی سے اٹھا اور گھڑے میں سے چلو بھر پانی نکال ہاتھ دھوئے اور کلی کی پھر اس نے اپنی چادر گھاس پر بچھا دی اور اسطرح بیٹھ گیا گویا وہ کسی دعوت میں دسترخوان پر بیٹھا ہو۔

اس کی بیوی ہنستی ہنستی آئی اور اس کے سامنے ڈلیا اور لسی کی مٹکی رکھ دی۔

"آج میں نے آٹھ کنال زمین پر ہل چلا دیا ہے" رمضان نے روٹی کا ایک لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔ ابھی اس نے اپنا ہاتھ منہ کی طرف اٹھایا ہی تھا کہ بیل آپس میں بھڑ گئے۔

"ہٹی ہٹی" رمضان چلایا۔ مگر بیل بدستور ایک دوسرے کو دھکیلتے رہے۔

رمضان نے ہاتھ سے لقمہ رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں رحمت نے دیکھا کہ فرشتۂ موت جو درخت کے عین نیچے کھڑا تھا مکھی بن کر ایک بیل کے سینگ پر جا بیٹھا۔ جونہی رمضان نے ان کو سینگوں سے پکڑ کر جدا کرنا چاہا اس بیل نے جس پر فرشتہ موت بیٹھا ہوا تھا یکبارگی سر ہلایا اور رمضان کو سینگوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کی بیوی واویلا کرتی ہوئی اٹھی۔

رمضان نے ایک بار آنکھ کھول کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا پھر ہمیشہ کیلئے سو گیا۔

رحمت کی آنکھیں تر ہوگئیں اور وہ کھیت سے باہر نکل آیا۔ موت کا فرشتہ باہر کھڑا تھا اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "دیکھ لیا تم نے؟"

"ہاں زندگی کا انجام دیکھ لیا" رحمت نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

فرشتہ موت کھڑا ہوگیا۔ "اچھا میں اب رخصت چاہتا ہوں مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں"

رحمت نے کہا "ذرا ٹھیرو، جانے سے پہلے مجھے بتادو کہ میری موت کیسے واقع ہوگی؟"

فرشتۂ موت مسکرا پڑا۔

"بھولے بھالے انسان تم مجھے زندگی کا مختار سمجھتے ہو۔ درحقیقت میں بھی اسی طرح بے بس ہوں جس طرح تم۔ میں اس خدائے قادر کا ایک عاجز بندہ ہوں۔ وہ مجھے جس طرح اور جس وقت حکم دیتا ہے۔ مجھے فوراً بجالانا ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے بھی علم نہیں کہ کس کی موت کس وقت آئے گی اور کس طرح آئے گی۔ ہاں اتنا میں تمہیں ضرور بتائے دیتا ہوں کہ موت کا آنا بھی ایک قانون کے ماتحت ہے۔"

رحمت پوری جرأت سے اس کی باتیں سن رہا تھا "اچھا تو مجھے وہ قانون ہی بتادو"۔

"تم اس قانون کو ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ جب تمہاری جان لینے آؤں گا اسی وقت تمہیں بتاؤں گا" یہ کہہ کر وہ مڑا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔

(۲)

جب رحمت گھر پہنچا تو اس کی بھاوج اس کی بیوی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی بھاوج کے دونوں بچے کوتلوں سے کھیل رہے تھے۔ رحمت نے گھر میں قدم رکھتے ہی ان کی طرف دیکھا۔ دونوں عورتیں چولھے کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں اور اپنے چہرے اوڑھنیوں کی بکلوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ وہ معاملے کا کچھ حصہ بھانپ گیا۔ لیکن اس نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور اپنا گٹھرا ناند کے قریب پھینک دیا۔ بھینس سبز چارہ دیکھکر زور سے ڈکرائی۔ رحمت نے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرا اور چارہ ناند میں ڈال دیا۔

"کیوں عائشہ کیا بات ہے؟" رحمت نے اپنی بھاوج سے پوچھا۔

عائشہ نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا "بھائی کوئی نئی بات ہو تو کہوں"

رحمت نے مضطرب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اس کے جسم کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ کہیں سرخ رنگ کی دھجی لگی ہوئی تھی تو کہیں کالے رنگ کی، وہ اپنی سسکیوں کو دبانے

کے لئے اپنے دوپٹے کا پلّو چبا رہی تھی۔

"کل سے ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی" عائشہ نے دبی آواز سے کہا "معلوم نہیں میری قسمت میں یہ دھکے کب تک لکھے ہوئے ہیں۔ ابھی تک تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زمین بھی ہمارے پاؤں کا بوجھ محسوس کر رہی ہے"

"نیروز کہاں ہے؟"

"وہ تو کل صبح سے غائب ہے"

رحمت دالان میں چارپائی پر جا بیٹھا۔ تھکن سے اس کے جسم کا ہر رگ و ریشہ چور چور ہو رہا تھا اس پر پسینہ اور مکھیاں مستزاد تھیں اس نے اپنے آپ کو دوبد ذور سے پنکھا کرنا شروع کر دیا جب کچھ افاقہ ہوا تو لیٹ گیا۔ مگر اس کی آنکھیں بدستور چھت کی کڑیوں پر جمی ہوئی تھیں اس کے دماغ میں ہر قسم کے خیالات بجلی کی تیزی سے آتے اور غائب ہو جاتے۔ یکا یک اس نے اپنے ہاتھ کی پشت پر کسی کا ننھا سا نرم ہاتھ محسوس کیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ننھا بچہ اس کی چارپائی سے سہارا لئے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحمت نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ پھر اس کے سر سے خاک جھاڑی

"آہ بدقسمت ننھے" رحمت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں"

× × × × ×

پانچویں دن رحمت سن رہا تھا۔

"نیروز نے کل لال دین کے کھیت سے ایک کنال چارہ کاٹ لیا ہے"

رحمت کی دکان پر بیٹھے ہوئے ایک مریض نے اسے خبر سنائی اور کھانستے کھانستے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رحمت نے اپنی آنکھوں سے گندے شیشوں والی عینک اتار کر رکھ دی اور دیوار سے سر لگاتے ہوئے ایک آہ بھری اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمبے تڑنگے نوجوان کی شکل آن کھڑی ہوئی جو شیشم کے درخت کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ اس کی بھاری مونچھیں بل کھائی ہوئی اس کے رخساروں کی ہڈیوں تک جا پہنچی ہیں۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے اور اس کے

گھونگھر یالے بال ہوا میں لہراتے ہیں۔ اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھیں ہر چیز کی گہرائی میں ڈوب جاتا جاہتی ہیں۔ وہ باغی تیر کی طرح ہر جسم میں اتر جاتی ہیں ان کے لئے شکست نہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بید ہے۔ جس سے وہ اپنے جوتے کی نوک کھٹکھٹا رہا ہے۔

کل رات وہ تاڑی کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور خوب مخمور ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں سرخ ڈورے لال مچھلیوں کی طرح تیر رہے تھے۔ لال سنگھ نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"فیروز گندم کے دو چھکڑے گاؤں سے نکلنے والے ہیں"

فیروز کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

رات کی سیاہی گہری ہو چکی تھی۔ خشک نالے کے پل کے قریب دو چھکڑے گندم سے بھرے جا رہے تھے کہ ایکا ایکی دو آدمیوں نے انہیں روک لیا۔ ان کے ہاتھوں میں برچھیوں کے پھل رات کی سیاہی میں بجلی کی طرح چمک رہے تھے اور ان کی آنکھیں چھکڑے والوں کو گھور رہی تھیں۔ ایک نے آگے بڑھ کر ایک بوری اٹھالی۔ دوسرے نے بھی ایک بوری اپنی پشت پر رکھ لی اور دونوں کھیتوں میں گم ہو گئے۔

دوسرے دن چھکڑے کا مالک فیروز کے پاس آیا۔ وہ اسوقت کوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا

"فیروز مجھے دونوں بوریاں واپس کر دو" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

فیروز نے اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور دور شہتوت کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"فیروز تم مجھے دونوں بوریاں واپس کر دو" اس نے پھر کہا۔

فیروز نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہی اس کا جواب تھا۔

"ایک بوری سہی" اس نے لجاجت سے کہا۔

"تمہاری گفتگو میری سمجھ سے بالاتر ہے" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔

چھکڑے والے کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ "بدمعاش۔ غریبوں کو لوٹنے والے۔ اگر تم بوریاں نہ دیگے

ہاتھوں واپس نہ کرو گے تو اچھا نہیں ہوگا "

" فیروز نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا " تم مجھ سے مخاطب ہو؟ "

" ہاں ہاں تم سے شرابی لٹیرے "

فیروز نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔ جھگڑے والے نے دیکھا اس کی آستین سے ایک چمکدار خنجر جھانک رہا تھا۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے بڑھتا آرہا تھا۔

" تم مجھ سے مخاطب ہو؟ "

جھگڑے والا یکایک چلاتا ہوا بھاگا " وہ مجھے قتل کر دے گا۔ لوگو مجھے بچاؤ "

فیروز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ پھر اپنے راستے پر ہو لیا۔

جب وہ اپنے بھائی کی دکان کے سامنے سے گزرا تو رحمت نے اسے آواز دی۔ لیکن اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ رحمت علی نے بھاگ کر اسے جا لیا " بھائی کی بات سننا بھی تمہیں ناگوار ہے "

فیروز اس وقت بھی مخمور ہو رہا تھا۔ رحمت کو اس کے منہ سے شراب کی گرم گرم بو آرہی تھی اس کے گلے میں موتیا کا ایک کمھلایا ہوا ہار پڑا تھا۔

" میں نے آواز نہیں سنی تھی " فیروز نے اسی لاپروائی سے جواب دیا۔

" فیروز تمہیں شرم آنی چاہیے " تم دو بچوں کے باپ ہو۔ کل تمہاری اولاد بڑی ہوگی تو دنیا کے منہ سے تمہارے متعلق کیا سنے گی؟ "

" یہی کہ وہ بہادر اور نڈر تھا "

رحمت نے اپنے ہونٹ غصہ سے چباتے ہوئے کہا " تم ان کیلئے بری مثال پیدا کر رہے ہو "

فیروز کی آنکھیں بے تابی سے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ وہ اس بلائے ناگہانی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا " یہ پند و نصائح کے دفتر کس لئے؟ میرا کام اس زندگی میں بھی چل رہا ہے جیسے تم بری زندگی سے تشبیہ دے رہے ہو۔ ابھی تک تو مجھے نیکی اور بدی میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوا تم کہتے ہو نیکی سے انسان چین کی زندگی بسر کرتا ہے۔ خدا کی رحمتیں اس پر نازل ہوتی

ہیں۔ میں کہتا ہوں بدی سے بھی انسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ بدی کی کمائی تو سب سے زیادہ حلال کمائی ہے۔ رات کے بارہ بجے اٹھ کر بوریاں پشت پر لاد کر لانا، کسی سے لڑنا جھگڑنا اور مار کھانا۔“

فیروز چپ کھڑا رہا۔

”خدا نے تمہیں ایسی نیک بیوی دی ہے۔ لیکن تم ہو کہ اسے بھی فاقوں تڑپا رہے ہو۔ تم کب اچھی زندگی بسر کرو گے۔ تمہارے ہاتھوں خدا کی مخلوق نالاں ہو رہی ہے اور تو اور تم خود اپنے لئے کس قدر تکلیف بو رہے ہو۔“

”تو عائشہ تمہارے پاس آئی تھی؟“ فیروز نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”تو وہ کس کے پاس جاتی؟ تمہارے پاس؟“

فیروز اپنے دانتوں میں ایک تنکا چباتا رہا

”اگر تم اپنے بچوں سے بھی تنگ ہو تو انہیں میرے حوالے کر دو۔ میں انہیں پال پوسوں گا ان ننھی جانوں کا کیا قصور جو تم انہیں بھی غریب عائشہ کے ساتھ فاقوں مار رہے ہو۔ تم جانتے نہیں وہ تمہارے ہی خون سے بنے ہوئے ہیں۔ اگر اپنے پیٹ کے دوزخ میں کچھ ایندھن ڈال لیتے ہو تو انہیں کیوں بھول جاتے ہو؟“

فیروز نے اپنی بھاری مونچھوں کو بل دیا اور اپنے سر کو بزور نفی میں ہلایا۔

”میں اپنے بچوں کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں عائشہ کو بوری میں بند کر کے دریا میں پھینک آؤں گا......“

رحمت اسوقت ہوش میں آیا جب فیروز جا چکا تھا۔

× × × × ×

چاند اپنے سایوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ فیروز جھونپڑے کے قریب سے ہوتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ اس کی بغل میں ایک بوتل تھی۔ وہ گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چاروں جانب انتہا خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بوتل کو کھولا اور اپنے منہ سے لگا دیا اور غٹاغٹ ایک ہی سانس میں پی گیا

بوتل کو دیوار سے دے مارا۔ پھر دہلیز پر کھڑے ہو کر دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا۔ دروازہ پہلی ہی دستک پر کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا اور کواڑوں کو زنجیر چڑھا دی۔

آنگن میں بیری کے درخت نے چاندنی کو اپنے پتّوں میں چھپا رکھا تھا۔ اندرونی کمرے کا سیاہ دروازہ نیم چاندنی میں منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ فیروز آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا "تم اس کے پاس گئی تھیں! ؟ تم اس کے پاس گئی تھیں!!؟" وہ سایوں کے ساتھ لگا ہوا اندر داخل ہوا۔ عائشہ اپنے مصلے پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے "میرے اللہ! میرے خاوند کو ہدایت دے۔ میرے اللہ میں جانتی ہوں تو مجھے اپنے دامن رحمت میں لینے سے پہلے ٹھونک بجا کر میری اصلیت دیکھنا چاہتا ہے۔ اللہ تو ہی مجھے توفیق دے کہ میں تیرے امتحان میں پوری اتر سکوں۔"

باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ جبلّی طور پر جان گئی کہ وہ کون تھا وہ اپنے مصلے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فیروز دروازے کے پٹ سے لگ کر کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم ـــــ اس کے پاس گئی تھیں ؟"

عائشہ نے لمبے وقفے کے بعد جواب دیا "میں بھوک سے بیتاب ہو گئی تھی۔"

"ٹھیک" اندھیرے میں سے کرخت آواز آئی "تمہارے گھر میں مٹی نہیں رہی تھی؟"

"میں بھی انسان ہوں ـــــ میں تو مٹی کھا لیتی۔ لیکن تمہارے بچے کیا کرتے ؟"

"انہیں اپنا خون پلاتیں !"

یکایک اندھیرے میں سے ایک ہاتھ اٹھا اور دھم سے عائشہ کے سر پر گرا۔

"آہ !" وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر گر پڑی "تم کتنے ظالم ہو۔ تمہیں خدائی قہر کا خوف نہیں ؟"

فیروز نے ایک قہقہہ لگایا "خداوندی قہر تمہارے لئے ہے میرے لئے نہیں۔"

"میری قسمت"

وہ خاک میں لتھڑی پڑی تھی۔

"تم اس کے پاس کیوں گئیں ؟" فیروز نے کڑک کر کہا "شیطان کی بیٹی! کیا وہ تمہارا یار تھا؟"

"نہیں وہ بڑا بھائی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی تم اپنے بھائی کے متعلق منہ سے ایسے الفاظ نکال رہے ہو؟"

اس نے عائشہ کو چوٹی سے پکڑا اور کھڑا کر کے اس کے پیٹ میں ایک ایسی لات ماری کہ وہ پچھنی کھاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔

"ظالم! میں تیری امانت اٹھائے پھر رہی تھی۔ یہ تو نے کیا کیا!"

عائشہ کی کانپتی ہوئی آواز اٹھی اور آہستہ آہستہ تیز اور بلند سانسوں میں گم ہو گئی۔

× × × × ×

رحمت علی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ لیکن وہ خود بھی اسی طرح بے بس تھا جسطرح عائشہ صرف کبھی کبھی فیروز کو روک کر دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ جب وہ فیروز کے نت نئے کرتوت سنتا تو اسے اپنی بے کسی اور بے چارگی اور بھی زیادہ شدت سے یاد آتی۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ خود طبیب تھا لیکن اپنے لئے کوئی ایسی دوا نہ ڈھونڈھ سکا جو اس کے گوہر مقصود کو اس کی جھولی میں لا کر ڈال دیتی۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھی اس کے ہاتھ دعا کیلئے اٹھ جاتے۔ اس کی چارپائی کے قریب ظلمہ سو رہی ہوتی تو گھنٹوں اس کے چہرے کو دیکھتا رہتا۔ پھر معاً اس کے دل میں سوال پیدا ہوتا "میری موت کے بعد اسکا کون وارث ہوگا یہ بیچاری ——" اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنا شروع ہو جاتے۔

اس کے بعد عائشہ کی معیت کا سوال تھا۔ ایک دفعہ وہ عائشہ کو بچوں سمیت اپنے گھر میں لے آیا فیروز نے کوئی بات کہی نہ سنی۔ وہ اس کے گھر کے سامنے سے اس طرح گذر جاتا تو گویا کچھ ہوا ہی نہیں گویا وہ شادی شدہ تھا ہی نہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ آزادی کے ساتھ اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو گیا وہ ان لوگوں کے لئے بہترین آلہ تھا جو کسی سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ کوئی اس کے پاس آتا اور کہتا "فیروز! فلاں شخص گھر سے نکلے تو اسے ذرا ٹھیک ٹھاک کر دینا" فیروز سائل کی طرف اپنی آنکھوں کے

مخصوص گوشوں سے دیکھتا اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا پھر وہ اپنے انگوٹھے کو اپنی انگلی پر اس طرح حرکت دیتا گویا وہ روپے کھنکھنا رہا ہو۔ سائل سمجھ جاتا اور اس کی ہتھیلی پر چاندی کے چند سکے یا بعض اوقات ایک بوتل رکھ دیتا۔

یہی اسکا پیشہ تھا اور یہی کام۔ وہ اپنے گاؤں میں ہوا کی طرح آزاد تھا۔ وہ جس شے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا وہی اس کی تھی۔

جب کوئی اس سے کہتا " فیروز تم کاشت کاری کیوں نہیں کرتے ؟" تو اسکا یہ جواب ہوتا " میں یہ سب کام اس دن کروں گا جب میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے "

ایک دن وہ رحمت کے گھر آیا اور عائشہ کو زور زور سے پکارنے لگا۔

" کیوں چلا رہے ہو ؟" عائشہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

" تم اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمہیں کسی صورت میں بھی یہاں دیکھنا پسند نہیں کرتا "

اس کے الفاظ آخری الفاظ تھے۔ عائشہ نے بچوں کو ساتھ لیا اور اس کے آگے آگے چلی

کچھ دنوں کے بعد رحمت علی کو معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے کان میں بھنک ڈال دی تھی کہ عائشہ اور رحمت کا ناجائز تعلق ہے۔

× × × × × × ×

پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد عائشہ کے بچہ پیدا ہوا۔ بچے نے اس دنیا میں آکر چند سانس لئے اور پھر ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی عائشہ کی حالت بھی متغیر ہو گئی۔

جب دائی بچے کو کپڑے میں لپیٹے ہوئے باہر نکلی تو فیروز آنگن میں بیری سے لگا کھڑا تھا وہ چپ چپ سا تھا۔ اس نے دائی کو باہر نکلتے دیکھا۔ جب وہ اس کے قریب آئی تو وہ آگے بڑھا۔ دائی نے اس کا مطلب سمجھ لیا اور اس نے بچے کے مردہ چہرے سے کپڑا الٹ دیا۔ بچہ ابدی نیند سو رہا تھا اس کے ملائم سیاہ بال ریشم کے باریک لچھوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اسکا حلیہ ہو بہو فیروز سے ملتا تھا۔

"عائشہ کیسی ہے؟"

"وہ تمہیں بلا رہی ہے"

عائشہ اندر چارپائی پر کپڑوں میں لپٹی لیٹی ہوئی تھی۔ روشندان میں سے روشنی چھن چھن کر اس کے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ فیروز اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے اس کی طرف اپنی بھوری آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عائشہ نے کہا: "میں نے اپنے فرض کو حتی المقدور پوری تن دہی سے انجام دینے کی کوشش کی ہے اگر مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہو تو مجھے معاف کرنا۔"

اس نے دیکھا فیروز کی آنکھوں سے ایک آنسو ڈھلکتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ عائشہ نے کہا۔

"خدا ہم سب کو معاف کرے ہم بہت کمزور ہیں۔ ہم پہاڑوں کو گرا سکتے ہیں۔ لیکن نفس کے مقابلہ میں شکست کھا جاتے ہیں۔ ہم عمر بھر کام کرتے رہتے ہیں لیکن اس زندگی سے رخصت ہوتے وقت گناہوں کی ایک گٹھڑی ہی سر پر ہوتی ہے۔ میں اس دن سے ڈرتی ہوں جب ہمارے اعمال نامے، جب ہماری پوری زندگی کی کارگزاری ہمارے سامنے پیش ہوگی۔"

فیروز کا مضبوط سر عائشہ کے سینے پر ڈھلک گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اسی شام عائشہ مر گئی۔

× × × × ×

فیروز اب بہت کم باہر دیکھا جاتا اب وہ غنڈوں کی مجلس میں ہوتا نہ شراب کی دکان کے بنچ پر لیٹا پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی اس سے ملنا چاہتا تو اسے گھر پر ہی پاتا جہاں وہ بیری کے نیچے چارپائی پر بیٹھا اپنے بچوں کو کھلاتا ہوتا۔ اگر کوئی اسے مارپیٹ کے لئے کرائے پر لینا چاہتا تو اول وہ خاموش ہو جاتا اگر زیادہ اصرار کرتا تو صرف اتنا کہہ دیتا۔ "جی نہیں چاہتا۔"

عائشہ دو بچے چھوڑ مری۔ ایک چار سال کا بچہ اور ایک دو سال کا۔ رحمت علی نے عائشہ کی وفات کے بعد چاہا کہ بچوں کے بارے میں فیروز سے گفتگو کرے اور ان کو اپنے ساتھ لے لے لیکن

ہمت نہ پڑی آخر کار وہ خود ہی محسوس کرنے لگا کہ ، فیروز کو آپ ہی اپنے بچوں کی نگہداشت کرنی چاہئے اس کے علاوہ اس نے سوچا شاید بچوں کا بوجھ اس کو راہ راست پر لے آئے۔

(۳)

عائشہ کی موت کے کچھ دن بعد کا واقعہ ہے ایک دن رحمت علی شام کے وقت دکان بڑھا کر گھر آیا تو اپنی بیوی کو دالان میں ٹوٹے ہوئے چھپّر میں سسکیاں بھرتے ہوئے پایا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے یہ منظر دیکھ کر دریافت کیا۔

لیکن وہ چپکے چپکے روتی رہی۔

"کیا وہ راز میرے لئے نہیں؟" رحمت علی نے پھر پوچھا۔

"نہیں"

فاطمہ اٹھی اور اس کے سامنے کھانا چن دیا۔ رحمت نے کھانا شروع کر دیا اور فاطمہ پھر بیٹھ کر سسکیاں لینے لگی۔ رحمت آہستہ آہستہ لقمے چباتا رہا اور سوچتا رہا کہ وجہ کیا ہے۔ لیکن کچھ نہ جان سکا آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ یہ بھی ایک قسم کا دورہ ہے جو عموماً عورتوں پر گذرے ہوؤں کی یاد سے پڑ جاتا ہے۔

رات کو سوتے وقت اس نے اپنی بیوی سے پھر وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ تمہیں بتانے سے کیا فائدہ — ؟"

"فاطمہ تمہیں میری قسم ضرور بتاؤ"

لیکن فاطمہ بدستور چپ رہی۔

"اگر تمہیں کوئی بات بتاؤں تو تم اسے صحیح مانو گے؟"

"ہاں"

"تم اپنے بھائی کی رعایت کرو گے"

رحمت علی کی حیرت قدرے کم ہوئی۔ اس نے سوچا یہ بھی کوئی فیروز کی شکایت ہوگی۔

"نہیں تم کہو تو سہی"

"وہ آج یہاں آیا تھا۔ اپنے بچوں کو ساتھ لایا تھا اور کہتا تھا کہ میں انہیں تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں"

رحمت علی ہنس پڑا "بس اتنی سی بات، یہ بھی کوئی معاملہ تھا جسے تم سوہان روح بنا لیتیں، ہشت"

"نہیں، نہیں" فاطمہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم بات نہیں سمجھے، وہ کہتا تھا۔ میرے گھر مل کر رہو"

"کیا کہا" رحمت نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں ہاں اس نے یہی کہا تھا۔ وہ سخت اصرار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے چیخنا پڑا۔ وہ شراب سے مخمور تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنے بھائی سے بدلہ لینا چاہتا ہوں"

رحمت علی کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیوی کی شکل گھومنے لگی۔ چارپائیاں۔ چھت اور مکان سب الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا گویا کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے اور وہ اس کے ہاتھ اپنے گلے سے اسوقت تک الگ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس ہاتھ کو کلائی ہی سے نہ کاٹ دے بس یہی علاج ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس کے دل پر ہاتھ ڈالے اور وہ بت بنا رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی سر بازار اسکی بے عزتی کرے اور وہ چپ بیٹھا رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

اس کی بیوی سسکیاں بھر رہی تھی اور کہہ رہی تھی "اپنی زندگی بھر میں میں نے کسی سے ایسے الفاظ نہ سنے تھے اگر اس وقت مجھے تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور اپنا گلا کاٹ لیتی اف۔ اف۔ اف!!!"

رحمت علی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی قوت سے چمک رہی تھیں۔

"مجھے خنجر دو میں اس کا قصہ پاک کر دینا چاہتا ہوں۔ میں خلق خدا کے لئے کانٹوں بھرا راستہ صاف کر دوں گا۔"

اسکی بیوی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خون کی ندیاں بہنے لگیں دنیا کا شور، قتل قتل کی آوازیں، پیپل اور شیشم کے ٹنڈ کے نیچے لٹکتی ہوئی اس کے شوہر کی لاش

سبھی کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے چند ہی لمحات میں پھر گیا۔ وہ چیخ مار کر اس کے قدموں میں گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"تم نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی"

لیکن رحمت علی بدستور افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی مٹھی زور سے بھینچ گئی۔ اس کے جسم کی تمام قوت اس کے بازوؤں میں جمع ہو گئی تھی۔

"پیالہ چھلک چکا ہے۔ اب تم مجھے چھوڑ دو"

رحمت علی نے اپنی بیوی کو ایک ٹھوکر لگائی اور لپک کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ فاطمہ بے تحاشا اس کے پیچھے بھاگی۔ لیکن رحمت علی اپنا دامن چھڑا کر پوری تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا یکایک اسکا پاؤں رپٹا اور وہ بیس زینے لڑھکتا ہوا نیچے بے ہوش آن گرا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو دالان میں چارپائی پر پایا۔ صبح کا تازہ سورج چمک رہا تھا۔ اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھی اسے پنکھا کر رہی تھی اور ڈاکٹر اس پر جھکا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے خیرو غمگین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی رحمت غصے سے چیخ اٹھا "نکل جاؤ میرے گھر سے"

اس نے بمشکل فقرہ ادا کیا تھا کہ اس کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے دنیا گھومنے لگی اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

دوپہر کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ اس کی بیوی اسے پنکھا کر رہی تھی۔ اور ڈاکٹر ایک دوائی تیار کر رہا تھا۔ جب ڈاکٹر نے رحمت کو بیدار ہوتے دیکھا تو وہ اس کے قریب آیا۔

"کیا تم اب کچھ افاقہ محسوس کرتے ہو؟"

رحمت علی نے اپنے سر کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ ایک پتھر کی طرح جما ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے سر کو ٹٹولا۔ سر بھاری پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔

"میرا سر مردہ ہو چکا ہے"

اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی ڈاکٹر رحمت کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت جلدی۔"

رحمت علی دل ہی دل میں ڈاکٹروں اور طبیبوں کے اس فریب پر ہنسا۔ وہ کہنا چاہتا تھا" میں بھی طبیب ہوں" لیکن اس کی زبان کو یارائے کلام نہ ہوا۔

ڈاکٹر نے اسے ایک پیلے رنگ کی دوائی پلائی اور قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

رحمت علی کی آنکھوں کے سامنے رات کے واقعات ایک بے ترتیب صورت میں آنا شروع ہو گئے۔ یکایک اس نے محسوس کیا جیسے وہ زندگی کو بالکل چھوڑنا چاہتا تھا۔

شام کے قریب ڈاکٹر نے اسے ایک اور خوراک پلائی۔

"ڈاکٹر صاحب کیا میں بچ جاؤں گا" رحمت نے نحیف آواز میں پوچھا۔

" یقیناً، یقیناً" ڈاکٹر نے فاطمہ سے فیس لیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا چرمی بیگ اٹھایا اور نکل گیا۔ فاطمہ نے چراغ روشن کیا اور اس کی پائینتی بیٹھ گئی۔

"کیا اب کچھ افاقہ ہے؟"

رحمت علی نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی پرنم آنکھوں میں دیئے کی سرخ لو ناچ رہی تھی۔

" فاطمہ اگر میں مر گیا تو تم کیا کرو گی؟"

فاطمہ نے پھر رونا شروع کر دیا۔ " للہ ایسا مت کہو، تم اپنی موت سے پہلے مجھے مار دو گے"

رحمت علی کو اس وقت اپنا بچپن یاد آگیا۔ کس طرح وہ گلیوں کی سنہری دھوپ میں لوہے کا چکر چلاتا دوڑتا پھرتا تھا۔ پھر وہ اپنے باپ کی انگلی پکڑے کھیتوں میں جاتا۔ سبز سہانے کھیت چاروں طرف پھیلے ہوتے۔ اس کا باپ پچھتار ے کے درخت کے نیچے ایڑیاں اٹھا کر اسے ایک سرخ پھول توڑ دیتا۔

"کیوں بے رحمت تو بڑا ہوگا تو کیا بنے گا؟"

"بابو"

اس کا باپ کھل کھلا کر ہنس پڑتا اور اس کا بے دانت کا منہ کھل جاتا۔ پھر اس کی شادی ہوئی۔ اور اس کی چاندسی بیوی آگئی۔

رحمت علی نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "تمہیں شادی کی چاندنی راتیں یاد ہیں"

"ہاں یاد ہیں" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

پھر اس کی شادی کے فوراً بعد ہی ساس بہو کا قدیم رسمی جھگڑا شروع ہوگیا۔ اور جب اس کی بوڑھی ماں نے نوخیز نسل کی جگہ چھیننی چاہی تو وہ مرگئی۔ کچھ مہینوں کے بعد بوڑھا باپ بھی مرگیا اور وہ اپنی طب کی دکان میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ انسانوں کی زندگی کو موت کے کنارے سے واپس لانے کا پیشہ کرتا تھا۔ لوگ خوش ہوتے تھے اور اپنی زندگی کی قیمت صرف چند سکے دیتے تھے۔

"زندگی" رحمت بڑبڑایا۔ اس کے دل میں درد ہونے لگا۔ اسے گذشتہ زندگی مرے ہوئے بچے کی طرح یاد آرہی تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ چاروں جانب گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فاطمہ اونگھتے اونگھتے اس کی چارپائی کی پٹی سے سر لگا کر سوگئی تھی اسے بھی نیند کی جھپکی آئی لیکن پھر یکایک اسکی آنکھ کھل گئی۔ تمام کمرہ کسی آسمانی نور سے روشن ہو رہا تھا اس نے اپنے کانوں میں بھاری پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنی۔ اس کے سامنے فرشتہ موت کھڑا تھا جو اس دن اسے دہقانی لباس میں ملا تھا۔ اب وہ نور میں ملبوس تھا وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"کیا میرا وقت آگیا ہے؟" رحمت نے پوچھا۔

"ہاں دوست، اب تمہاری مہلت ختم ہے۔ تم نے زندگی کا جام خوب پیا۔"

"لیکن جب رحمت نے سوچا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ابھی جام کو منہ لگانے ہی لگا تھا۔

"مجھے تمہارا ایک وعدہ یاد آرہا ہے۔" رحمت نے کہا۔

"ہاں" فرشتے نے جواب دیا "تم یہ راز معلوم کرنا چاہتے تھے کہ موت کب آتی ہے۔ یہ موت کا راز نہیں، زندگی کا راز ہے"۔ رحمت نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور سو رہی تھی۔

"انسان کو زندگی اُسوقت تک عطا ہوتی ہے جب تک کہ وہ اپنے لئے اور نوع انسانی کے لئے مفید ثابت ہو اور جب اسکی افادیت ختم ہو جائے اسی وقت اُس کی موت آجاتی ہے۔ تم نے اپنی زندگی پر غور کیا۔ کل رات جب تم سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے اُس وقت تم انتہائی غصے میں تھے، اگر تم نہ گرتے تو تم فیروز کو ضرور قتل کر دیتے، کیونکہ وہ اس رات شراب سے خوب مخمور ہو کر سو رہا تھا۔ اگر تم اسے قتل کر دیتے تو اس کے بچوں کی پرورش و نشو و نما بہت حد تک رُک جاتی اور قدرت تم سب کو دنیا میں محض اس لئے ڈھیل دے رہی ہے کہ تم ان ننھے شگوفوں کی ترقی کے موجب بنو اور ان کی راہ میں حائل نہ ہو۔ خزاں اسی لئے آتی ہے کہ بوڑھے پتے ننھے شگوفوں کے لئے راستہ چھوڑ دیں، وہ اسی وقت تک شاخ پر لگے رہتے ہیں جب تک وہ اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں اور درخت کو من حیث المجموع فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں، اور جوں ہی وہ کام کے اہل نہیں رہتے ان کے پاؤں خود بخود چھوٹ جاتے ہیں اور وہ لڑھکتے ہوئے زمین پر آگرتے ہیں۔ عائشہ کی زندگی بھی اسی لئے چھین لی گئی کہ اگر وہ زندہ رہتی تو فیروز ہمیشہ لاپڑ رہتا اور بچے پانی کے تنکوں کی طرح زندگی بسر کرتے۔ کیا نیک کیا بد دنیا میں ہر ایک کا یہی حال ہے۔ ان کا زمین پر چلنا پھرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قدرت کے کسی مقصد کے لئے ابھی تک مفید ہیں۔"

رحمت نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میرے بعد فاطمہ کا کیا بنے گا؟"

"تم دیکھ لو گے"۔ یہ کہہ کر فرشتہ آگے بڑھا اور اس کے دل پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ زندگی کی لہر اس کے پاؤں سے چڑھتی ہوئی اوپر چلی آ رہی تھی، جوں جوں زندگی دل کے قریب پہنچتی جا رہی تھی وہ بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ نادیدہ آفاق کی فضاؤں میں پہنچ گیا ہے۔

دور سے مؤذن کی بھرائی ہوئی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر! اللہ اکبر!" اور رحمت کا آخری سانس ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے جسدِ خاکی سے نکل گیا۔ جب اس کی رُوح اپنے نشیمن سے نکل رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ فیروز اپنے دونوں بچوں سمیت اندر داخل ہوا۔ فاطمہ چارپائی کی پائنتی سے سر لگائے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب ہوا۔ وہ پہلے سے بہت اُجلا اور سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"فاطمہ" اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے گناہ معاف کر دو۔ اٹھو ان بچوں کو اپنے دامن میں چھپا لو ـــــ"

سویت کا چوتھا پنج سالہ منصوبہ

جنگ عظیم ثانی نے سویت معیشت کو بڑا زبردست نقصان پہنچایا۔ ہٹلر کی فوجوں نے ایک ہزار سات سو دس سویت شہروں اور ستر ہزار سے زیادہ گاؤں کو یا تو بالکل مسمار کر دیا یا جلا ڈالا یا جزئی طور پر ان کو برباد کر دیا۔ اس کی وجہ سے تقریباً ڈھائی کروڑ آدمی بے گھر ہو گئے۔ روپیہ کی صورت میں نازی حملہ آوروں کے نقصان کا اگر اندازہ کیا جائے تو اس کی رقم ۶ کھرب ۷۹ ارب روبل ہوتی ہے۔ انسانی جانوں کے لحاظ سے اگر نقصان کا اندازہ کیا جائے تو ستر لاکھ آدمی مارے گئے یعنی آسٹریلیا کی جو مجموعی آبادی ہے اس کے برابر۔ جرمنوں کو جب مغربی سویت روس سے نکالا گیا تو ہر جگہ عمارتوں کے ڈھانچے، اینٹ اور پلاسٹر کے ٹوٹے ٹکڑوں کے زبردست انبار، ٹوٹی ہوئی ریلیں، گھاس پات سے لدے ہوئے کھیت اور جھونپڑوں میں رہنے والے بھوکے انسان نظر آتے تھے۔

سویت یونین کو جرمنوں کی جنگی طاقت کو ختم کرنے میں چار سال صرف کرنا پڑے۔ سوال یہ ہے کہ جرمنوں نے جو تباہی پھیلائی ہے اس کے دور کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ سویت کی سرزمین کو ایک ہی نسل کے دوران میں دو دفعہ جنگ کی تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جنگ عظیم کا نقصان دوسری جنگ عظیم کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی تلافی کرنے میں بھی چھ سال لگ گئے تھے۔ لیکن اس مرتبہ سویت یونین یہ چاہتی ہے کہ جنگ سے پہلے کی معیشت پر پہنچنے کے لئے اپنی رفتار کو دگنا کر دے

سویت یونین کے مغربی حصوں کی قومی معیشت کے بحال کرنے کا کام جرمنوں کی پسپائی

کے فوراً بعد جب کہ جنگ ابھی جاری تھی شروع کر دیا گیا تھا۔ جنگ سے پہلے امن کے زمانہ میں صنعتی ترقی کا جو کام جاری تھا اس میں روس کے زیادہ ترقی یافتہ مغربی علاقے، مشرقی علاقوں کی ترقی میں مدد دیا کرتے تھے لیکن جنگ کے سالوں میں مشرقی علاقوں نے زیادہ تیزی سے ترقی کی اور مغربی علاقوں کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دی ....
اور مشرق سے مغرب کی طرف سامان، مشینوں اور آدمیوں کا ایک دریا بہتا رہا۔

مغربی علاقوں کی معیشت کو بحال کرنے کا جو کام شروع کیا گیا تھا، اب اس کے نتائج ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ڈونیاس، سوویت کی کوئلہ کی صنعت کا خاص مرکز تھا اب دوبارہ ملک کے کوئلہ کے علاقوں میں اس کا شمار اوّل نمبر پر کیا جانے لگا ہے۔ موجودہ سال کے شروع ہونے کے وقت اس کی کوئلہ کی پیداوار قبل جنگ کے نصف کی برابر ہو گئی تھی۔ ڈونباس کی پوری بحالی کے لئے کوئلہ کی کانوں میں ڈھائی ہزار کلو میٹر (تقریباً ڈیڑھ ہزار میل) لانبی، یعنی ماسکو سے پیرس تک کا جو فاصلہ ہے اس کے برابر اور دو سو تا سات سو میٹر گہری گیلریاں (زمین دوز راستے) بنانا ہوں گے، جس کے معنی یہ ہیں کہ مزدوروں کو ان کے اندر جانا اور کھمبے لگا کر ان کو تعمیر کرنا پڑے گا۔ ماسکو کے کوئلہ کے علاقہ کو بھی ڈونباس کی طرح جرمن حملہ آوروں نے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ یہاں بھی نہ صرف یہ کہ قبل جنگ کی پیداوار کو دوبارہ حاصل کر لیا گیا، بلکہ ۱۹۴۶ء کے آغاز تک پیداوار کو دوگنا کر لیا گیا تھا۔

اکرائن کی لوہے اور فولاد کی صنعت نے جنگ سے پہلے اشتراکی اتحاد روس کی قومی معیشت کے تعمیر کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ اس کے بحال کرنے کا کام بھی بہت تیز رفتار کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اس سال کے شروع میں اکرائن میں برباد شدہ جگہوں پر بیس لوہا بھٹیاں دوبارہ نصب کر دی گئی ہیں۔ مشین سازی کی صنعت بھی تیزی سے بحال کی جا رہی ہے۔ خارکوف میں جن صنعتی کارخانوں کو نازیوں نے پسپائی کے وقت بالکل مسمار کر دیا تھا اب انھوں نے دوبارہ ٹریکٹر، ٹربائن اور سائیکلیں تیار کرنا شروع کر دی ہیں۔

دشمن نے پاور اسٹیشنوں کو تقریباً بالکل برباد کردیا تھا۔ مثلاً جب جرمنوں کو بیلورشیا سے نکالا گیا تو وہاں صرف پانچ فی صدی پاور اسٹیشن باقی رہ گئے تھے۔ انھیں اب دوبارہ تعمیر کیا جارہا ہے اور ان سے کام لیا جارہا ہے۔ مشہور ڈنیپر کا پن بجلی کا کارخانہ جو یورپ میں سب سے بڑا تھا اس کو تقریباً از سر نو تعمیر کرنا پڑا ہے لیکن کام کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اُمید کی جاتی ہے کہ اس سال کے آخر تک یہ کارخانہ دوبارہ چلنا شروع کر دے گا۔

نقل و حمل کی از سر نو تعمیر کا کام بھی بڑے پیمانہ پر کیا جارہا ہے۔ ریلوں کے راستوں کی مرمت کی جارہی ہے۔ ان مقامات پر جنھیں جرمنوں نے پھونک ڈالا تھا لکڑی کے عارضی پل اور ریلوے اسٹیشن بنائے جارہے ہیں۔ صرف ایک سال کے اندر اندر ریل کے مجموعی فاصلہ میں سے ایک تہائی کو بحال کیا جاچکا ہے۔ اسی طرح ملک کے اندرونی آبی راہوں کو بھی تیزی سے درست کیا جارہا ہے۔ بیلورشیا میں ڈنیپر تا بگ کی نہر کی مرمت کی جاچکی ہے بالٹک تا بحر اسپین کی نہر کو بحال کرنے کا کام جاری ہے اور اُمید ہے کہ اس سال کے اندر ہی یہاں جہاز رانی کو شروع کیا جا سکے گا۔

زراعت میں بھی تعمیر نو کا کام جاری ہے۔ پُرانے مشین اور ٹریکٹر اسٹیشنوں کو دوبارہ قایم کیا جارہا ہے اور اشتراکی اتحاد روس کے مغربی علاقوں میں مزروعہ رقبہ کو وسیع جارہا ہے فصلوں کی پیداوار میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ اکرائن میں اشتمالی کسانوں کا جتنا رقبہ جنگ سے پہلے تھا اب اس کا تین چوتھائی دوبارہ آگیا ہے۔

شہروں میں مکانوں کی تعمیر وسیع پیمانہ پر کی جارہی ہے۔ اسٹالن گراڈ، نووروسسک سمولنسک اور دوسرے ان ہی جیسے شہروں کو نازیوں نے بالکل مسمار کر دیا تھا، ان کو اب از سر نو تعمیر کیا جارہا ہے۔ لینن گراڈ کو جرمنوں کی گولہ باری سے زبردست نقصان پہنچا تھا لیکن صرف سنہ ۱۹۴۴ء میں دس لاکھ مربع میٹر گنجایش کو دوبارہ تعمیر کیا جاچکا تھا۔ دیہی علاقہ میں بھی کسانوں کے خاندان اپنے جھٹوں میں سے نکل رہے ہیں اور ان نئے گھروں میں رہنا شروع کر رہے ہیں

جنھیں نئے معیاری نمونوں کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے۔

روس کے برباد شدہ مغربی علاقوں میں بحالی کا کام جاری ہے لیکن ابھی تک اس کا بہت کم حصہ انجام تک پہنچ سکا ہے۔ ابھی تک بہت سے صنعتی کارخانے مسمار شدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ بہت سے کھیتوں پر بوائی کا کام شروع نہیں کیا جا سکا ہے اور جرمنوں کے قبضہ میں جو رقبے چلے گئے تھے ان سے پیداوار کم حاصل ہو رہی ہے۔ مثلاً بیلو رشیا میں موجودہ سال کے شروع میں صنعتی پیداوار جنگ سے قبل کے مقابلہ میں صرف پانچویں حصہ تک پہنچ سکی تھی۔ آبادی کو گھر کے ساز و سامان کی بہت ضرورت ہے۔ پسپائی کے وقت جرمنوں نے علاقوں کو بالکل ریگستان بنا کر چھوڑا ہے

نئے پنج سالہ منصوبہ میں یہ رکھا گیا ہے کہ اشتراکی اتحاد روس کے تمام مغربی علاقوں کو وسیع پیمانہ پر بحال کیا جائے، تا کہ ۱۹۴۸ء تک صنعت جنگ سے قبل کی سطح پر پہنچ جائے بحالی کے دوران میں پچھلے زمانہ کی بہت سی کمزوریوں کو دور کیا جا رہا ہے۔ ایندھن اور قوت محرکہ کی صنعتوں کو ایسی جگہوں میں قایم کیا جا رہا ہے جہاں وہ پہلے کبھی قایم نہیں کی گئی تھیں۔ مثلاً پہلے ڈونباس تمام اکرائن کو کوئلہ مہیا کیا کرتا تھا۔ اب اکرائن کے مغربی علاقہ کی اپنی جداگانہ کوئلہ کی صنعت ہوگی۔ جہاں ایک طرف پہلے کے موجود کارخانوں کو بحال کیا جا رہا ہے وہاں دوسری طرف بالکل نئے کارخانوں کو بھی شروع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ جرمنوں کو نکالنے کے فوراً بعد ڈینپرو پیٹرسک میں موٹر کاروں کا پہلا کارخانہ تعمیر کرنا شروع کیا گیا۔ اسی طرح بیلو رشیا بھی اپنے ان تمام کارخانوں کو بحال کرنے کے ساتھ ساتھ جو نازی حملہ سے پہلے وہاں موجود تھے ایک نیا موٹر کاروں کا کارخانہ بھی تعمیر کرا رہی ہے۔

نئے پنج سالہ منصوبہ نے اپنے سامنے خاص مقصد یہ رکھا ہے کہ روس کی پیداوار ۱۹۴۰ء کے مقابلہ میں ۱۹۵۰ء میں ۴۸ فی صدی زیادہ ہو۔ پیداوار میں یہ اضافہ صنعت کی ہر شاخ میں کیا جائے گا۔ جب مغربی علاقے جنگ سے تباہ و برباد ہو رہے تھے اس وقت مشرقی علاقے

تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔ زبردست مشکلات کے باوجود ان کی صنعتی پیداوار برابر بڑھ رہی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۵ء کے پہلے چھ مہینوں میں سویت کے مشرقی علاقوں کی پیداوار ۱۹۴۱ء کی اسی مدت کی پیداوار کے مقابلہ میں دوگنی ہوگئی تھی۔ جنگ کے چار سالوں میں یورال کی پیداوار ۳،۶ گنا سائبیریا کی ۲،۸ گنا اور وونگا کی ۳،۴ گنا بڑھ گئی۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جنگ کے بعد کے زمانہ میں روس اپنی قومی معیشت کو بحال کرنے کا کام ہی انجام نہیں دے رہا ہے بلکہ اس کو مزید ترقی بھی دے رہا ہے۔

روس میں ۱۹۴۰ء کے پیداوار کے اعداد و شمار کوئلہ، معدنی تیل اور پگ آئرن کے لئے علی الترتیب ۱۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن، ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن اور ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن ہوتے تھے ان ہی چیزوں کے لئے ۱۹۵۰ء کی سطح علی الترتیب ۲۵ کروڑ، ۳ کروڑ ۴۴ ۵ لاکھ، اور ایک کروڑ ۹۵ لاکھ رکھی گئی ہے۔ مشینوں کی پیداوار کو بھی دوگنا کر دیا جائے گا۔ نئے پنج سالہ منصوبہ میں یہ خواہش کی گئی ہے کہ دھات کی مشینوں کی تعداد ۱۳ لاکھ کر دی جائے۔ ۱۹۴۰ء میں امریکہ میں جو مشینیں زیر استعمال تھیں ان سے یہ تعداد تیس فی صدی زیادہ ہے۔ روس کی قومی معیشت میں مشین سازی کی صنعت کو ابھی تک ایک ممتاز صنعت اور فنی اور معاشی خود مختاری کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

منصوبہ بند معیشت نے سویت روس کی صنعتوں کی تمام شاخوں کی ترقی کو یقینی بنا دیا ہے منصوبہ بند معیشت میں جنگ کے بعد کی بے روزگاری، کساد بازاری یا بحران کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

آئندہ کے پانچ سالوں میں سویت یونین میں بہت سے نئے صنعتی کارخانے قائم ہو جائیں گے۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء کے سالوں میں مجموعی طور پر لوہے اور دیگر دھاتوں کو صاف کرنے، مشینوں کو بنانے، کیمیاوی اور ہلکے سامان تیار کرنے والے پانچ ہزار نو سو بڑے

کارخانے یا تو بحال کئے جائیں گے یا از سرِ نو تعمیر کئے جائیں گے نئی تعمیر کا جو کام شروع کیا جائیگا اس کی مثال کے طور پر پن بجلی کے اسٹیشنوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ سائبیریا میں دریائے ارتش پر، ازبکستان میں سر دریا پر، آذربائیجان میں دریائے کرا پر، آرمینا میں جھیل سیوان پر پن بجلی کے بڑے اسٹیشن بنائے جارہے ہیں۔ آئندہ کے چند سالوں میں شمالی یورال میں دریائے کاما پر گورکی کے قریب دریائے وونگا پر اور کالوگا کے قریب دریائے اوکا پر بڑے پاور اسٹیشن بنائے جائیں گے۔ اشتمالی فارموں اور چھوٹے شہروں میں بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے پن بجلی کے اسٹیشن بنائے جارہے ہیں۔

اکرائن اور بیلو رشیا میں جو موٹر کاروں کے کارخانے بنائے جارہے ہیں ان کے علاوہ نئے کارخانے سائبیریا کے اندر نووسی برسک میں جیورجیا کے اندر کیٹےسی میں اور وسط وونگا کے اندر الیانووسک میں اور ماسکو میں بنائے جارہے ہے۔ موخرالذکر میں ہلکی طاقت کی موٹر کاریں بنائی جائیں گی۔ نئے منصوبہ کی تجویز یہ ہے کہ جنگ سے پہلے کے زمانے میں جتنی کاریں سویت یونین میں تھی اس سے دوگنی اس منصوبہ کے زمانہ میں تیار ہونے لگیں

منصوبہ کے مطابق اشتراکی اتحاد روس کی مجموعی زراعتی پیداوار پانچ سال کی مدت کے ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۰ء کے اعداد کے مقابلہ میں ۲۷ فی صدی زائد ہوجائے گی اس کے معنی یہ ہیں کہ رقبہ بونے، پیداوار کو بڑھانے اور جانوروں کے گلوں کے اضافہ کرنے وغیرہ وغیرہ کے لئے بڑا زبردست کام کیا جائے گا۔

پنج سالہ منصوبہ میں یہ رکھا گیا ہے کہ عام استعمالی اشیاء کو بافراط فراہم کیا جائے اور آبادی کے معیار زندگی کو بلند کیا جائے۔ چنانچہ اجرتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور چیزوں کی قیمتیں برابر گر رہی ہیں۔ اس سال کے موسم خزاں سے روئی اور اناج کے اور ۱۹۴۷ء سے دوسری اور تمام چیزوں کے راشن کارڈ ختم کردئے جائیں گے۔

نئے پنج سالہ منصوبہ کے سامنے جو بڑے کام ہیں انھیں تکنیک اور سائنس کی تیز رفتار

ترقی کے بغیر پورا نہیں کیا جاسکے گا اس لئے روس میں سائنس کو ترقی دینے کی ہر امکانی کوشش کی جارہی ہے۔ اپنی ۹ رفروری کی تقریر میں اسٹالین نے کہا تھا: "مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر ہم اپنے سائنس دانوں کو مناسب امداد دیں گے تو وہ مستقبل قریب میں نہ صرف یہ کہ دوسرے ملکوں کے سائنسدانوں کے برابر ہو جائیں گے بلکہ ان سے بازی بھی لے جائیں گے۔

غرض ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء کے سویت منصوبہ کی یہ عام خصوصیات ہیں۔ اس کے اعداد حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اور ان کے پورا کرنے کے لئے جو میعاد مقرر کی گئی ہے وہ اور بھی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔ ان کے سمجھنے کے لئے ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سویت معیشت میں اس قسم کی منصوبہ بندی بہت عام چیز ہوگئی ہے۔ روس میں حکومت کے منصوبوں کو وہی قوت حاصل ہے جو دوسرے ملکوں میں ترقی کے معاشی قوانین کو حاصل ہے۔ اشتراکی اتحاد روس کی اعلیٰ ترین مجلس نے نئے پنج سالہ منصوبہ کو منظور کرلیا ہے اور اب اس نے ملکی قانون کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

ہندوستان میں قایم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس آغاخان صاحب — عالی جناب ہز ہائنس نواب بھوپال

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپئے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	۲۵ لاکھ ۴۴ ہزار ۶۰	۲۵۴۴۰۶۰
اداشدہ سرمایہ	۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار	۱۲۵۰۰۰۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل آگ، زندگی، رسل و رسائل، موٹر ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے۔

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں!

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن، احمد آباد، کانپور، پشاور، راج کوٹ

کراچی، سیلون اور فلسطین TE TVIV

جوبلی نمبر

مکتبہ جامعہ دہلی

زیرِ ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴۳ نمبر ۵	بابت نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء	سالانہ چندہ صہ قیمت فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

جامعہ والوں سے

جب بھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد
رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھرتھراتا ہے۔ ایسے موقعوں
سے فائدہ اُٹھا کے میں اہلِ جامعہ کو یاد دلاتا ہوں،
کہ عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لئے قابلِ
فخر نہیں ہے۔ اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی
ہیں، یا قیدخانے۔ اگر عمارت میں رہنے والے
اصل مقصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں اُن کے
مقاصد اور ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہیں۔ اگر
عمارتیں ہی مقصود بالذات بن جائیں تو وہ جیل خانہ

ہیں، جن سے حوصلوں، اُمنگوں اور ولولوں کو نکلنے
کی راہ نہیں ملتی۔ جامعہ کی پہلی عمارت کا سنگِ
بنیاد رکھتے وقت میں نے کہا تھا کہ کہیں ہم لوگ
عظیم الشان اور فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اپنے
مقاصد کو نہ بھول جائیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو آئندہ
آنے والی نسلوں کو یہ حق ہوگا کہ ہم کو ان عمارتوں
سے دھکا دے کر نکال دیں اور ہمارے مقاصد
اور ارادوں کے ان مقبروں کو گرا دیں۔ مجھے اُمید
ہے کہ جامعہ والے اس مقصد کو نہیں بھولیں گے۔

ذاکر حسین

پچیس برس گذر گئے

جامعہ کی پچیسویں سال گرہ! کیا کیا خیال، کس کس کی یاد، کیسی کیسی ہمت شکن تنقیدیں، اور کیسی کیسی ہمت افزا حمایتیں، بے وفائیوں اور وفاداریوں، کم ہمتی اور استقامت، خاصی کٹھن راہ پر تھک تھک کر تھم تھم جانے اور پھر ایک دوسرے کو سہارا دے دے کر اس راہ پر قدم بڑھانے کی کتنی تصویریں ذہن کے سامنے گذر جاتی ہیں، جامعہ کی پچیسویں سالگرہ، اس کے ذکر سے آپ سب کے ذہن میں بھی ایسی ہی تصویریں آئیں گی، اگر ہم انھیں خیالات پر معاملے کو ختم کر دیں تو سب کچھ یوں ہی ہوتا رہے گا جیسا ہوتا رہا ہے۔ ہمارے ارادے کا اس میں روز بروز دخل کم ہوتا جائے گا۔ بہت سے دوسرے اداروں کی طرح جامعہ بھی اس لئے چلتی رہے گی بلکہ شاید لوگوں کے خیال میں "ترقی" بھی کرتی رہے گی کہ کسی کو اس کے بند کرنے کا خیال نہ آئیگا، اور چلتی ہوئی چیز کا قاعدہ ہے کہ مانع حالات یا ارادہ راہ میں

نہ آئے تو چلتی ہی رہتی ہے، جامعہ والوں کو جامعہ کے ایسے ہی چلتے رہنے پر راضی نہ ہونا چاہئے، ہمیں چاہئے کہ ہم اس پچیسویں سالگرہ کو تعمیری تنقید اور محکم عزم کا ایک موقع بنائیں۔

پچیس برس۔ لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں پچیس سال کیا ہوتے ہیں۔ ہاں سوتی ہوئی قوموں پہ صدیاں بھی بغیر کسی قابلِ ذکر تغیر کے گذر جاتی ہیں، جن قوموں کو کچھ کرنا ہوتا ہے، ان کے لئے پچیس سال بھی بہت ہوتے ہیں پچیس برس میں قومیں اپنی زندگی کا رخ بدل لیتی ہیں، قومیں اپنی اعتباری حیثیت کو بدل لیتی ہیں، رحمت بن جاتی ہیں، عذاب بن جاتی ہیں۔ ہم نے اپنے کام سے مزاج قومی کو متاثر کیا؟ زندگی کے کسی شعبے میں اس کی فکر یا سعی کو بدلا؟ اپنے وجود ملی کو استحکام بخشا؟ دوسری قوموں میں حیثیت کو بلند کرنے، رحمت بننے، عذاب بننے کا ذکر ہی کیا ہے؟ اسے سوچنا چاہئے مایوس ہونے کے لئے نہیں بلکہ مشکلوں کو اور مجبوریوں کو سمجھنے، اُن پر غالب آنے کے وسائل سوچنے، اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنے اور ہمت سے قدم آگے بڑھانے کے لئے پچیس برس اور اتنا سا کام۔ ہاں بہت کم کام ہے، بہت معمولی کام ہے، بظاہر بہت بے اثر سا کام ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے کاموں کا بیج یہ جماعتی کاموں میں میرا گمان ہے کہ پہلے سے راہ کے جملہ نشیب و فراز سے آگاہ ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ساتھ مل کر چلنے والوں کا یکجا

ہونا، توفیق الٰہی شامل حال ہو تو یہ راہ بھی دریافت کر لیتے ہیں، ایک دوسرے کو سہارا دے کر اسے طے بھی کر لیتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

من از طریق نہ گویم رفیق می جویم　　　　که گفته اند نخستین رفیق و باز طریق

جہاں پچیس مہینے مل کر کام کرنے کی مثالیں کمیاب ہوں وہاں پچیس برس آرام و آسائش میں نہیں تکلیف و بے سروسامانی میں جمے رہنا بالکل بے معنی بات نہیں۔ اس پر بہت فخر کرنے کا موقع بے شک نہیں، اور نہ یہ خیال دل میں لانا چاہئے کہ اوروں سے بھی تو کچھ بن نہیں پڑا دوسرے کی کم معیاری کو اپنے لئے معیار بنانا بڑی ہی کم ہمتی اور پست نظری کی بات ہے، لیکن مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ رفیقان راہ سے اس پچیسویں سال گرہ پر یہ درخواست ہے کہ اب طریق کے تعین میں ایک دوسرے کی مدد کریں، اور اپنی سعی کو زیادہ موثر بنانے میں لگ جائیں، یکسوئی اور دیانت سے کام میں جمے رہئے اور اس کا رنج نہ کیجئے کہ بہت وقت گذر گیا، آدمی اپنا فرض ادا کرتا رہے اور دامن اُمید کو ہاتھ سے نہ جانے دے تو:۔

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

ذاکر حسین

تعلیم اور ایک بہتر معاشرے کی تعمیر

ذیل کا مضمون وہ توسیعی خطبہ ہے جو خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمی حکومت رامپور نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں مارچ ۱۹۴۶ء میں دیا تھا۔ مدیر

میں اراکین جامعہ عثمانیہ کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ان توسیعی خطبات کے لئے مدعو کرکے آپ حضرات سے ملنے اور تعلیم کے موضوع پر اظہار خیال کرنے کا موقع دیا۔ یہ جامعہ آپ کے روشن ضمیر رئیس اور بیدار مغز حکام ریاست کے تخیل اور مصلحت اندیشی کا ایک اعلیٰ ثبوت ہے اس نے علم وادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ میری تعریف کی محتاج نہیں، کیونکہ انہوں نے بہت بہتر مبصرین سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ لیکن میری نظر میں ان تمام علمی خدمات سے بھی زیادہ وقیع اس کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے ملک میں سب سے پہلے اس یتیم تصور کی دستگیری کی کہ قوم کی تعلیم قوم کی اپنی زبان میں ہونی چاہیئے اور انسانی ذہن کے لئے یہ بہت بڑی محرومی ہے کہ وہ کسی غیر زبان کو اندھے کی لاٹھی بنا کر اس کے سہارے آگے بڑھے۔ یہ اصول جو دوسرے ملکوں میں ایک بدیہی حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں برسوں محل بحث ونظر بنا رہا، بلکہ ابھی تک بہت سے لوگ اس کو تسلیم کرنے سے کتراتے ہیں۔ لیکن خدا خدا کرکے اب اسے تعلیمی حلقوں میں قبولیت حاصل ہو چلی ہے۔ اور آپ حضرات خوش نصیب ہیں کہ آپ نے اس ذہنی انقلاب کی علم برداری کی۔

لیکن اجازت دیجئے تو میں یہ عرض کروں کہ ملک معنی کی وسعتیں حدبندی سے آزاد

ہوتی ہیں اور یونیورسٹیاں جن کا مقصد اعلیٰ ملک معنیٰ کی تسخیر ہے کسی ایک مورچے کی فتح پر قناعت نہیں کر سکتیں۔ ان کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذہنی جدوجہد کے ذریعہ انسان کے بنت نئے اور مشکل معاملات اور مسائل کو حل کرتی رہیں اور یہ ایک ایسا کام ہے جو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ آپ کی یونیورسٹی نے تعلیم کی زبان کا مسئلہ تو حل کر لیا یعنی آپ کے پاس وہ موزوں اور خوبصورت جام موجود ہے جس میں شراب ڈالی جائے لیکن باقی ملک کی طرح یہاں بھی نفس تعلیم کا مسئلہ ابھی تک محتاج توجہ ہے یعنی ابھی شراب کشید ہونا باقی ہے۔ زمانہ اس قدر آگے نکل گیا ہے اور قومی ارتقا ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے کہ اگر ہم جلد تعلیم کا صحیح تصور معین نہ کر سکے اور اس کے لئے ایک موزوں نظام کی تشکیل نہ کر سکے تو ہماری تہذیب اور تمدن کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ میری آرزو ہے کہ جس طرح زبان کے معاملے میں آپ نے پہل کی ہے اسی طرح تعلیمی اصلاح کے میدان میں بھی شرف قیادت آپ کو حاصل ہو۔

اس تقریر کے دوران میں میری کوشش یہ ہوگی کہ اصلاح تعلیم کا جو مسئلہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس کے ایک مرکزی اور بنیادی پہلو کی طرف آپ کو توجہ دلاؤں جس کی جانب میں نے کل کی تقریر کے آخر میں اشارہ کیا تھا۔ یعنی یہ کہ تعلیم کے مقصد اور منہاج اور اس کی تنظیم و تنظیم کا تعلق ہمارے موجودہ معاشرتی نظام سے اور اس کے مستقبل کے تصور کے ساتھ کیا ہے۔ میں اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ جب تک ہم اپنے معاشرتی تقاضوں اور تحریکوں کو اچھی طرح نہ سمجھیں اور ان کو پیش نظر رکھ کر اپنا تعلیمی پروگرام مقرر نہ کریں اس وقت تک تعلیم ایک جسد بے روح رہے گی اور قومی زندگی میں کوئی اہم اور بنیادی انقلاب پیدا نہ کر سکے گی۔ ممکن ہے محض نصاب یا طریقہ تعلیم کی اصلاح کی بدولت بچوں کی صحیح ذہنی تربیت ہو جائے یا وہ افراد کامل بن جائیں یا ان میں علمی اور ادبی ذوق پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ تمام چیزیں محض افراد تک محدود ہوں گی۔ ان کی وجہ سے جماعتی زندگی میں کوئی حیات بخش جوش یا حرکت

پیدا نہ ہوگی۔ اس خاص پہلو پر زور دینے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی روایتاً تعلیم اور زندگی کو ایک دوسرے سے جُدا سمجھا گیا ہے اور جدا رکھا گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مدرسوں میں زندگی کا سُراغ نہیں ملتا اور زندگی میں وہ قدریں راہ نہیں پاتیں جن کی اشاعت تعلیم کا مقصد ہے۔ شاید اسی وجہ سے شاعر نے گلہ کیا ہو کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

موجودہ زمانہ میں بھی تعلیمی بحثیں زیادہ تر ایسے مسائل کے متعلق ہوتی رہی ہیں کہ فرد کی شخصیت کو کس طرح تربیت دی جائے، اس کی خوابیدہ قوتوں کو کس طرح بیدار کیا جائے۔ اس کے فطری نقائص کا کس طرح علاج کیا جائے۔ انگلستان کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر نن (Nunn) نے اپنی تصانیف میں بہت عمدگی اور قابلیت کے ساتھ اس نظریئے کی وکالت کی ہے کہ تعلیم کا مقصد اصلی انفرادیت کی تربیت ہے اور اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ افراد کی تخلیقی جدوجہد کے بغیر دنیا میں حُسن، خیر اور صداقت کا کوئی جلوہ داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ دعویٰ صحیح ہے اور اس نازک دَور میں جب بہت سے اجتماعی خطروں اور کلّی تحریکوں نے فرد کو یورش میں لے لیا ہے انفرادیت کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ لیکن باوجود اس اعتراف کے میں یہ خیال پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ بغیر سماج کی زندگی اور اس کے گوناگوں مطالبات اور مسائل پر غور کئے ہم نہ فرد کے متعلق کوئی نیک رائے قایم کر سکتے ہیں نہ اس کی تعلیم و تربیت کے لئے کسی موزوں اور مؤثر ماحول کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ سوسائٹی کی اجتماعی زندگی میں ہر وقت مختلف قوتوں اور اثرات کی رسّہ کشی ہوتی رہتی ہے۔ اس میں بے شمار نقیضیں کارفرما ہیں۔ مثلاً فرد اور جماعت، میراث اور تربیت، ضبط اور آزادی حقوق اور فرائض، مادی مطالبات اور روحانی قدریں، علم اور اخلاق، دولت اور افلاس لہٰذا جب ہم فرد کی تربیت کا انتظام کرتے ہیں تو اس کو کسی سماجی خلا کے لئے تیار نہیں کرتے بلکہ اس سماجی زندگی کے لئے تیار کرتے ہیں جس کا لباس ان تمام اثرات کے تانے بانے سے تیار ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیمی کارکنوں کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے ماحول کا تجزیہ کر کے یا اندازہ

کریں کہ اس میں کون سے عناصر ہیں جو فرد کی آزادانہ اور مکمل نشوونما میں مخل ہوتے ہیں اور کون سے اس کے لئے مفید اور سازگار ہیں لیکن ان کے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ ایک غیر جانب دار سائنس داں کی طرح موجودہ سماج کا تجزیہ کریں۔ انہیں تو ایک بہتر سماج کی تعمیر میں حصہ لینا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسکول کی چار دیواری کے اندر اس خوب تر سماج کا ایک چھوٹا سا مرقع تیار کرنا ہے اس لئے معلم کے ذہن میں یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ مستقبل کے سماج میں کون سی قدریں اور اصول کارفرما ہوں گے اور اخلاقی اور اقتصادی اعتبار سے کارفرما ہونے چاہئیں تاکہ مدرسے کے اثرات ان کی تخلیق میں معین ہوں۔

بعض لوگ جن کا نعرہ یہ ہے کہ تعلیم کو سیاست سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہئے اس خیال سے بھڑکتے ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ ایسا کرنے سے تعلیم اپنے پُرامن گوشۂ عافیت سے نکل کر میدان کارزار اور حلقہ نزاع میں پہنچ جائے گی اور اس طرح کہ اس کے خاموش اور سکون طلب تعمیری کام میں خلل پڑے گا۔ جو لوگ خلوص اور نیک نیتی سے یہ اعتراض کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں ہر وقت مختلف اصول اور قدریں، توہمات اور تعصبات انسانی زندگی پر تسلط حاصل کرنے کے لئے برسرپیکار ہیں اور یہاں قدم قدم پر خوب و ناخوب کی تمیز ضروری ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں تعلیم کا غیر جانب دار رہنا، یعنی اس کشمکش کو نظرانداز کر دینا غیر مفید ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ موجودہ نظام کی ساخت کو قبول کرے یا مسترد کرے یا اس کی ترمیم کرے۔ اور نئی بنیادیں رکھنے کے لئے تو اکثر پرانی بنیادوں کو اکھیڑنا پڑتا ہے! ان میں سے بعض معترضین ایسے بھی ہیں جو قصداً اور مصلحتاً یہ روش اختیار کرتے ہیں، کیونکہ ان کی اغراض مقاصد اور مصلحتیں مروجہ نظام معاشرت اور اس کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس کی بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کی بدولت انہیں اپنی ذات کے لئے جلب منفعت کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا ہے۔ اس لئے وہ اس میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں، اور جب وہ تعلیم کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں تو ان کا دراصل یہ مطلب ہوتا ہے کہ تعلیم کو کسی قسم کی بنیادی تبدیلی یا انقلاب

کا ساتھ نہیں دینا چاہئے۔ ورنہ مروجہ اصولوں اور سماجی اداروں کی حمایت تو نظام تعلیم بلا ارادہ بھی کرتا ہے اور اکثر استادوں اور پبلک کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر کسی سرمایہ داری کے نظام میں تاریخ جغرافیہ، اقتصادیات وغیرہ کی تعلیم میں ان مفروضات کو جگہ دی جائے جو اس نظام میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں، یا سوشلسٹ نظام میں ان طریقوں اور اصولوں کی تائید کی جائے جو اس میں رائج ہیں تو عرف عام میں کیا جاتا ہے کہ تعلیم سیاسی اعتبار سے غیر جانب دار ہے۔ برخلاف اس کے اگر تعلیم کے ذریعے ان اصولوں اور قدروں کی اشاعت کی جائے جن کو عام لوگ یا مفاد مخصوص جن کو قوت و اختیار حاصل ہے اس وقت قبول نہیں کرتے تو فوراً تعلیم پر جنبہ داری اور غیر متعلق امور میں دخل اندازی کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ معلم کو عقل اور اخلاق کی رو سے یہ حق حاصل ہے نہ وہ موجودہ نظام کی تنقید کرے اور آزادی رائے کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کرے کہ خیالات کی جو جنگ اس کے چاروں طرف ہو رہی ہے اس میں وہ کس کا ساتھ دے گا۔ میں نے عمداً "کس فریق کا ساتھ دے گا" نہیں کہا، کیونکہ تعلیم کا کام حق اور شرافت کی طرف داری ہے نہ کہ سیاسی جماعت یا عقیدے کے ساتھ وابستہ ہونا، آج کل کی پیچیدہ زندگی میں حق اور صداقت میں کسی خاص سیاسی جماعت کی مکمل اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض جماعتوں کی پالیسی دوسروں کی نسبت زیادہ ترقی پسند اور بحیثیت مجموعی انسان کے لئے زیادہ مفید ہے لیکن ہر سمجھدار اور انصاف پسند شہری اور ہر معلم کو بالخصوص یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ سیاسی فرقہ بندیوں سے بلند ہو کر حق کا ساتھ دے، خواہ وہ اسے کہیں لے جائے۔ یہ نقطۂ نظر ٹھیک ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اسے عام قبولیت حاصل ہونا مشکل ہے، کیونکہ اس پر وہ لوگ بھی نکتہ چینی کریں گے جو انقلاب اور تبدیلی کے مخالف اور سماجی جمود کے حامی ہیں اور وہ بھی جو تعلیم کو خاص سیاسی اغراض و مقاصد کا مجہول آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں، کیونکہ آزادی رائے میں آزادی تنقید بھی شامل ہے اور یہ لوگ تنقید کے بجائے اندھی تعمیل کے طلبگار ہیں! مگر بہر حال جو لوگ تعلیم کا کٹھن فرض اپنے ذمے لیتے ہیں انہیں جان بوجھ کر یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ لیکن معلم کی دولت ہر کس و ناکس کی رضامندی نہیں، بیچ کا

ساتھ دینا ہے!

اس ضمن میں ایک بات کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ مدرسوں کا کام براہِ راست کسی خاص سیاسی یا سماجی یا اقتصادی عقیدے کی تبلیغ کرنا ہے، ایسا کرنے سے طلبہ کے ذہن پر ابتدا ہی سے بعض خاص قسم کے خیالات کا تسلط قایم ہو جائے گا اور ان کی آزادیٔ فکر کی صلاحیت نشو ونما نہ پا سکے گی جو ذہنی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہے میری رائے میں یہ بات کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی کہ کسی نیت سے بھی تعلیم کے ذریعہ طلبہ کے دماغی دریچوں کو بند کر دیا جائے۔ جب تک ان میں غور و فکر کے بعد زندگی کے اہم انفرادی اور اجتماعی مسائل کے متعلق صحیح اور بے لاگ رائے قایم کرنے کی صلاحیت نہ ہوگی اندیشہ یہ ہے کہ وہ ہر چالاک عقیدہ فروش اور سیاسی بازی گر کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ لہٰذا مدرسہ کا اصل کام یہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر کے لئے طلبہ کو صحیح معلومات اور صحیح قدروں کا سرمایہ اور تلاش حق کا جذبہ عطا کرے، یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ اگر ان میں عقل کی کمی ہوگی یا تلاش حق کا جذبہ نہ ہوگا جس کے ذریعہ صحیح معلومات حاصل کی جاتی ہیں تو وہ اپنے گردوپیش کے حالات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے اور ان کی ذہنی کیفیت اندھیرے میں تیر چلانے کی ہوگی۔ اگر ان کے دل میں صحیح قدروں کا احترام نہ ہوگا تو وہ اپنی دماغی قابلیت کا غلط اور نقصان دہ استعمال کریں گے، اور اخلاقی کجروی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لہٰذا جب میں تعلیم سے معاشرتی رہبری کی توقع کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ نوجوانوں پر کوئی بنا بنایا نظام فکر و عمل زبردستی عائد کر دے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ ان کو ترقی پسند خیالات اور شریفانہ جذبات کی دولت سے مالا مال کرے تاکہ وہ آگے چل کر ایک بہتر سماج کی تعمیر میں شریک ہو سکیں۔

یہ تمہید کسی قدر طولانی ہو گئی، لیکن چاہتا تھا کہ ابتدا ہی میں نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے اب ہمیں مختصر طور پر یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ نظام معاشرت کی امتیازی خصوصیات کیا کیا ہیں اور اس میں کون سے خاص اثرات اور رجحانات کام کر رہے ہیں جو اس کو آئندہ شکل دینے میں کارگر

ہوں گے۔ معلم بھی بڑی حد تک اپنے گرد و پیش کے معاشرتی وسائل او ر ذرائع اور محرکات ہی سے کام لیتا ہے۔ اس کے لئے ان سے قطع نظر کر کے تربیت کرنا ناممکن ہے اور اگر ممکن بھی ہوتا تو یہ تربیت بالکل ناقص یا بے اثر رہتی۔ تعلیم دراصل انھیں تمام اجتماعی اثرات کا ایک جزو ہے اور اس جزو کو کُل کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہماری موجودہ سماج کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کی رفتار بہت بڑھ گئی ہے اور زندگی جو سَو سال پہلے تک بالعموم ساکن یا سُست رفتار تھی انقلاب کے بھنور میں آپھنسی ہے۔ اب صدیوں کی تبدیلیاں چند سال کے اندر اندر ہو جاتی ہیں اور ان کی باگ اتفاق کے بجائے ارادہ نے تھام لی ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے انسان کو فطرت کی غلامی اور بے بسی کی منزل سے نکال کر مختار فطرت بنا دیا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک ایسی بے اندازہ قوت دیدی ہے کہ وہ اس کی خوفناک طاقتوں کو تسخیر کر کے اپنے ماحول اور اپنی زندگی کو بالارادہ ایک نئے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ وہی انسان جو چند صدی پیشتر فطرت کے حضور میں ایک خوف زدہ سائل کی طرح حاضر ہوتا تھا اور اس کے رازوں کی دریافت کے لئے حسنِ اتفاق کا مرہونِ منت تھا۔ اب خود اعتمادی کے ساتھ ان کی تلاش کرتا ہے اور انہیں اپنے مقاصد کی تحصیل کے لئے بے دھڑک استعمال کرتا ہے۔ اس کے جو عجیب و غریب نتائج نکلے ہیں وہ ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لہذا ان کی تفصیل سے کیا حاصل ہے؟ اس کی بدولت انسان نے خشکی، ہوا اور پانی کو تسخیر کر کے دنیا کی طنابیں ملا دی ہیں اور مہینوں کے رستے پلوں میں کٹنے لگے ہیں، زراعت، صنعت و حرفت اور پیداوار کے ہر شعبے میں اس کی قوت سینکڑوں گنا بڑھ گئی ہے۔ نئی ایجادوں اور دریافتوں نے خیال کے پر لگا دئے ہیں اور ہر نئی بات چشم زدن میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ جاتی ہے اور یہ تبدیلیاں محض زندگی کے خارجی اداروں تک محدود نہیں بلکہ انسان کی داخلی زندگی پر بھی ان کا انتہائی گہرا اثر پڑا ہے۔ ان کے ردِ عمل سے پُرانے رسم و رواج اور پُرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں، خاندانی اور جماعتی زندگی کے

دھارے جن سے ماضی میں لوگ ایسے ہی اعتماد کے ساتھ واقف تھے جیسے کسی پہاڑ کے دامن میں رہنے والے اس کے خدوخال سے واقف ہوتے ہیں۔ اس قدر تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ ذہن ان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ زندگی کا دھارا جو صدیوں سے ایک خاص سکون اور وقار کے ساتھ بہتا تھا اب دکن کے دریاؤں کی طرح بہت تیز رفتار ہو گیا ہے اور کٹھن پہاڑی راستوں سے گذرنے لگا ہے۔ آئیے دیکھیں کہ اس انقلاب کا اثر افراد پر کیا ہوا ہے؟

زمانۂ ماضی میں اکثر رسوم و رواج، خیالات و عقائد، اصول اور قدریں کم و بیش غیر محسوس طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتی تھیں ایک ایسے سماج میں جہاں بحیثیت مجموعی سکون ایک عمومی کیفیت ہو اور انقلاب ایک غیر معمولی بات ہو یا اس قدر آہستہ آہستہ ہوتا ہو کہ لوگوں کو اس کا احساس بھی نہ ہو۔ تقلید کی رہبری شاید کام دے سکتی ہے لیکن جب زندگی میں ہر طرف حرکت اور انقلاب کا قانون کارفرما ہو، جہاں سفر حقیقت ہو اور حضر مجاز ہو، جہاں انسان کا ناخن عقدہ کشا اور اس کی عقل رسا آئے دن نت نئے مسائل پیدا کرتی رہے، وہاں ہم تقلید اور عادت کے سہارے نہیں چل سکتے۔ وہاں تقلید کے بجائے اجتہاد اور عقیدے کے بجائے فکر کی روشنی درکار ہے۔ اس جدید سماج میں ہمیں قدم قدم پر ایسے دوراہے ملتے ہیں جن میں سے ایک کو ہمیں اختیار کرنا ہے اور اگر ہم خود غور و فکر کے بعد اسے اختیار کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو کوئی اتفاقی ریلا ہمیں اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ لہٰذا زندگی کی اس یورش کا مقابلہ ہم مروجہ عقائد اور خیالات سے مسلح ہو کر نہیں کر سکتے اور اس بھول بھلیاں میں پرانے زمانے کے بہت سے بنے ہوئے نقشے کام نہیں دیتے۔ اس لئے اس زمانہ میں فرد پر پہلے کی نسبت بہت زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور تعلیم اس جدید تقاضے کی طرف سے روگردانی نہیں کر سکتی۔

اس صورتِ حال کا مطالبہ تعلیم کے لئے کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک انقلاب پذیر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے جو تعلیم دی جائے گی۔ اس میں ہمیں عقل و فکر کی تربیت پر خاص زور دینا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر اس متحرک سماج میں فرد اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ نصاب

اور طریقہ تعلیم کی تدوین میں یہی خیال پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ ان کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں کی فکری قوتوں کی نشوونما ہو۔ ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک اس بات کی کوشش ضروری ہوگی کہ طلبہ کے سامنے علم کو ایک چبائے ہوئے لقمے کے طور پر نہ پیش کیا جائے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لئے انھیں خود ذہنی اور عملی جدوجہد کرنی پڑے، اور ان پر بہت سی معلومات کا بار ڈالنے کے بجائے ان کو علم حاصل کرنے کے طریقے اور اصول اور ضابطے سکھائے جائیں گے، مشاہدے اور تجربے سے کام لینے، اور دوسروں کی رائے کو تولنے کی مشق کرائی جائے گی تاکہ وہ ذہنی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں اور ہمیشہ خارجی امداد اور سہارے کے محتاج نہ رہیں۔ اس امر پر زور دینا اس لئے ضروری ہے کہ باوجود کتابی تعلیم کے طلسم میں اسیر ہونے کے ہمارے کالجوں اور مدرسوں نے عقل کی تربیت پر کافی زور نہیں دیا بلکہ عقل اور اخلاق میں ایک قسم کی غلط تقسیم قایم کر کے ہمیشہ اخلاق کو عقل پر ترجیح دی ہے، گویا اپنی اور دنیا کی نجات کے لئے بے سوچے سمجھے بعض خاص اعمال کا یا اخلاقی فرائض کا بجالانا کافی ہے اور اس میں عقل کو زیادہ دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے اور مشرقی مذاہب اور فلسفے نے بھی کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی۔ بدھ مت نے "حماقت" کو جس کے لئے اس میں "ناواقفیت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے انسانی گناہوں کی فہرست میں بہت اونچا درجہ دیا ہے۔ اور قرآن شریف میں ان لوگوں کی صریح مذمت کی گئی ہے جو خدا کی دی ہوئی ذہنی قوتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ "ان کے دل ہیں، لیکن وہ سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں، کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں۔ وہ حیوانوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ وہ راستے سے بالکل بھٹکے ہوئے ہیں!"

لہٰذا ہماری موجودہ معاشرتی صورتِ حال اور اخلاق و مذہب کا متفقہ مطالبہ یہی ہے کہ ہم اپنی تعلیم میں قوتِ فکر کی تربیت کو خاص اہمیت دیں اور نوجوانوں میں ایسی ذہنی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ عصرِ حاضر کی دشوار زندگی میں اپنا راستہ ڈھونڈھ نکالیں۔ میرے پاس وقت نہیں کہ میں یہ بتاسکوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے سے ہماری تعلیم میں کس قدر زبردست تبدیلیاں [illegible] ہوں گی لیکن

یقین ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سادہ ناکارہ فرسودہ اور بے فیض سامان دریابُرد کرنا ہوگا جس سے ہمارا تعلیمی جہاز اس وقت اٹا ہوا ہے!

سائنس کی ترقی کا ایک اور زبردست اثر ہماری زندگی پر پڑا ہے جس کی طرف سے تعلیم غافل نہیں رہ سکتی بعض نئی ایجادوں کی وجہ سے اس زمانے میں لوگوں کے خیالات اور جذبات کو متاثر کرنے کے ذرائع بہت زیادہ وسیع اور دُور رَس ہو گئے ہیں۔ اس صورتِ حال کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تو جمہوری تحریک کا زور ہے جس کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ سیاسی قوت اور اختیار عوام کے ہاتھ میں آئے تاکہ وہ دنیا کے مادّی اور تمدنی وسائل سے پورا فائدہ اٹھا سکیں، اور دوسری طرف قیادت کے ہاتھ میں ایسے آلات آ گئے ہیں جن کی مدد سے وہ عوام کے ذہن کو ماؤف یا مسحور کر کے انھیں کٹ پُتلیوں کی طرح نچا سکتے ہیں۔ اس طرح گویا جو اختیارات انھیں ایک ہاتھ سے دیئے جاتے ہیں وہ غیر محسوس طور پر دوسرے ہاتھ سے چھین لئے جاتے ہیں! رائے عامہ کو ڈھالنے کے ان طریقوں پر نظر ڈالئے کہ ان کے بے پناہ مجموعی اثر کے سامنے لوگ کس طرح بے بس ہو جاتے ہیں۔ ایک اخبار جو ہمارے ملک میں ہزاروں اور دوسرے ملکوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں چھپتا ہے محض اپنے جلی عنوانات، اپنے اخفائے حق اور اعلان باطل، اپنے جھوٹے سچے اشاروں، اپنی خبروں کی ترتیب اور انتخاب سے اکثر لوگوں کے سیاسی خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر ملکوں میں، جہاں خواندگی عام ہو گئی ہے لوگ سیاسی معاملات میں غور و فکر کرنے کے بجائے اخباروں کے سطحی اور یک طرفہ مضامین سے متاثر ہو کر بنی بنائی رائیں قبول کر لیتے ہیں۔ یہی حال کتابوں کا ہے جن کی اشاعت اس زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے۔ ان کے ذریعے سے بھی مصنفین اور سرمایہ دار جو اشاعت کے وسائل پر قابض ہیں، عوام کے خیالات کو اپنے مفید مطلب سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ یہی حال ریڈیو، سینما اور تھیٹر وغیرہ کا ہے جن کا اثر اس وجہ سے اور زیادہ مفید (یا خطرناک) ثابت ہوتا ہے کہ وہ بظاہر آلاتِ تفریح ہیں، لیکن دراصل غیر محسوس طور پر ہمارے خیالات، جذبات اور مذاقِ

بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اور غور کیجئے کہ ان کی رسائی کس قدر ہے؟ جس شخص یا جماعت کے پاس نشر کرنے کے آلات ہیں اس کی آواز لاسلکی کے پروں پر سوار ہو کر تمام کرۂ زمین کا طواف کر سکتی ہے۔ ایک ڈائرکٹر جو اپنے سٹوڈیو میں کوئی ڈراما یا فلم تیار کرتا ہے، دور دور کے ملکوں میں لاکھوں تماشہ بینوں کو ایک خاص طریقے پر متاثر کر سکتا ہے۔ پراپگنڈا کے ان تمام جدید ذرائع کا مجموعی اثر یہ ہے کہ فکر کی آزادی زائل ہوتی جاتی ہے، اور اس کے بجائے یکسانیت خیال رواج پاتی ہے جو ترقی کے راستے میں حارج ہوتی ہے۔ اس رجحان کا ازالہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ تعلیم کے ذریعہ لیکن عام طور پر تعلیم بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اکثر ملکوں میں عوام کو ایک ہی قسم کی ناقص اور ناکافی تعلیم دی جاتی ہے جس کو امریکہ کے مشہور مصنف اور مبصر اپٹن سنکلر نے (Goose steps) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے یعنی ایسی تعلیم جس کا مقصد ہے کہ بچوں کو فوج کے سپاہیوں کی طرح قدم ملا کر چلنا سکھایا جائے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اخبار اور کتابیں پڑھنا سیکھ لیتے ہیں لیکن خیالات کا تجزیہ اور تنقید نہیں کر سکتے۔ تقریریں سنتے ہیں لیکن دل خوش کن لفاظی اور تلخ حقیقت میں تمیز نہیں کر سکتے اور جذباتی اپیلوں کو عقلی دلائل سمجھنے لگتے ہیں۔ تھیٹر اور سینما میں کھیل دیکھتے ہیں لیکن اچھے اور گھٹیا کھیلوں اور اعلیٰ درجے کے ڈراموں اور بد مذاق گیتوں، اور عمدہ موسیقی میں فرق نہیں کر سکتے۔ یعنی ان کے ذوق و ذہانت کا معیار اس قدر گرا ہوا ہے کہ نہ وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ سائنس کے ان جدید آلات سے جن کا واقعی کام تہذیب کے خزانوں کو عام کرنا ہے لیکن یہ صورتِ حال ایک جمہوری سماج کے لئے سراسر خطرناک ہے کیونکہ اس کی کامیابی کے لئے شرط اوّل یہ ہے کہ رائے عامہ بیدار اور باخبر ہو تاکہ وہ اپنے مفاد کی نگرانی کر سکے اور اجتماعی پالیسی کے تعین میں حصہ لے سکے۔ شاید ایک حکمی (Authoritarian) سوسائٹی میں عوام کی صحیح تعلیم اس قدر ضروری نہیں کیونکہ ان کا کام محض حکم کی پابندی ہے۔ وہاں تو چند بااختیار لوگوں کا قابل، تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہونا کافی ہے۔ لیکن جہاں سماج کی تنظیم جمہوری اصولوں پر کی جائے اور فرد کی شخصیت کا احترام مدنظر ہو وہاں اس طرح تعلیم دینا ضروری ہے۔

کہ وہ ان وسیع تر امکانات سے فائدہ اٹھا سکے جو اس سماج میں موجود ہیں۔ آخر ایک جمہوری سماج کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ یہی کہ وہ تمام افراد اور جماعتوں کی نشوونما کے لئے ایک موزوں ماحول مہیا کرتی ہے، فرد کی تربیت آزادی کے فضا میں کرنا چاہتی ہے ملانسانوں کو ایک سانچے میں ڈھال کر خیالات میں یکسانیت پیدا کرنا نہیں چاہتی بلکہ تنوع کا خیر مقدم کرتی ہے اور افراد کی امتیازی خصوصیات کی نشوونما چاہتی ہے، کیونکہ اسی میں زندگی اور تہذیب کی دولت مندی کا راز پنہاں ہے۔ وہ ہر معاملے میں حکومت کی رائے کو منزل من اللہ بنا کر پیش نہیں کرتی بلکہ بحث و مباحثہ اور نقد و تنقید کی قائل ہے تاکہ تبادلۂ خیالات کے ذریعہ لوگ ظن و تخمین کی منزلوں سے گذر کر حق اور صداقت تک پہنچ سکیں۔ جس حد تک ایک جمہوری سوسائٹی واقعاً ان اصولوں کو پیش نظر رکھے گی تعلیم ان کا خیر مقدم کرے گی۔ کیونکہ یہی چیزیں اس کے مقاصد میں بھی شامل ہیں یعنی شخصیت کا احترام اور اس کے بے اندازہ امکانات کا احساس، تلاشِ حق کا جذبہ اور امتیازی صفات کی نشوونما کے ذریعے تہذیب و تمدن کی رنگا رنگی۔

یہ جمہوریت کی مثالی تصویر ہے جس کو صرف وہی لوگ مسترد کر سکتے ہیں جو سرے سے ان قدروں کے قائل ہی نہیں لیکن اس پر جو تنقید اور اعتراض عام طور پر کئے جاتے ہیں ان میں جمہوریت کی وہ ناقص شکل پیشِ نظر ہوتی ہے جو آج کل دنیا میں پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک بیشتر قومیں صرف سیاسی جمہوریت کی منزل تک پہنچی ہیں جس کی بدولت ہر شخص کو انتخاب میں رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ روکھا پھیکا حق انھیں کہاں تک لے جا سکتا ہے؟ اس کا نتیجہ محض اتنا ہوا ہے کہ انسانوں کے بجائے ان کے ووٹوں کی قدر ہونے لگی ہے جن کو حاصل کرنے کے لئے اہلِ غرض ہر طرح کے جائز اور ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں۔ سیاست کے خود غرض بازی گر، دولت کے بے درد پجاری، قوت و اختیار کے بے اصول طالب اور اخباروں کے ضمیر فروش مالک سب اپنے مطلب کے لئے عوام کو بے وقوف بنا کر انھیں ان کے حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اکثر اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کو

دیکھ کر بعض احساس مند لوگ سرے سے جمہوریت ہی کے مخالف ہو گئے ہیں۔ لیکن دراصل مخالفت اُن اسباب کی کرنی چاہیئے جن کی وجہ سے جمہوریت عوام کے حق میں کام نہیں کر پاتی بلکہ مخصوص مفاد اور اغراض کا آلۂ کار بن کر رہ گئی ہے۔ جب تک یہ صورتِ حال قایم ہے واقعاً "جلال بادشاہی اور جمہوری تماشے" میں کوئی خاص فرق نہیں لیکن یہ تصورِ جمہوریت کے حقیقی تصور کا نہیں، بلکہ اس ناقص اور نامکمل جمہوریت کا ہے جس پر دُنیا قانع ہو گئی ہے۔ جمہوریت کے پورے امکانات اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتے جب تک اس کی بُنیادیں وسیع نہ کی جائیں اور جو اصول سیاست کے میدان میں تسلیم کیا گیا ہے یعنی تمام افراد کو یکساں حقوق ملنے چاہئیں، وہی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں کار فرما ہو۔ جب تک دنیا کے مادّی وسائل اور تہذیب کی دولت کی منصفانہ تقسیم نہ ہوگی، سیاسی حقوق کی نام نہاد برابری بالکل بے معنی ہے۔ عدل و مساوات کا یہ مطالبہ نہ صرف اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو عقل و انصاف کی رو سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ محتاجی اور فاقہ کشی اور دوسری مادّی محرومیوں سے محفوظ رہے بلکہ یہ وجہ بھی ہے کہ انسانی زندگی کی مادّی بنیادوں کو استوار کئے بغیر تہذیبی زندگی کی عمارت بھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔ جب تک اقتصادی کشمکش اس قدر سخت اور شدید ہوگی کہ انسان کا سارا وقت اور توجہ اور اس کی تمام قوتیں اس میں اسیر ہو کر رہجائیں وہ نہ تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے نہ اس کے خزانوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر کی ایک بڑی خوبی اور صداقت یہ ہے کہ اس میں انسانی تہذیب اور معاشرتی اور اقتصادی حالات کے باہمی رشتے کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کی جس نے سرمایہ داری نظام میں جنم لیا ہے، بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے سائنس اور صنعت و حرفت کے وسائل سے کام لے کر اقتصادی، سماجی اور تہذیبی جمہوریت قایم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک جماعتی تصور سے مغلوب ہو کر اس کے مفکروں اور وکیلوں نے اس چیز کو غیر ضروری یا ناممکن قرار دے دیا۔ یہ دونوں الفاظ علیحدہ علیحدہ تشریح طلب ہیں۔ کیونکہ جب تک اس سماج کے تصور میں وضاحت پیدا نہ ہو جس کی تعمیر

میں تعلیم کو حصہ لینا ہے اُس وقت تک مستقبل کی تعلیم کے خدوخال بھی صاف نظر نہیں آئیں گے۔

کیا ایسے سماج کی تشکیل غیر ضروری ہے ؟ یہ بحث دراصل فلسفے، اخلاق اور انسانی اعیان (Values) کی ہے اور منطق کے ذریعہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ دنیا کے مادی وسائل اور علم، آرٹ، اور تہذیب کی دولت کو سب انسانوں کے لئے کھول دینا اس کو کسی خاص طبقے یا بعض افراد تک محدود رکھنے سے بہتر ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب سے انسان نے اخلاقی شعور کی منزل میں قدم رکھا ہے مذہب اور اخلاق کی اور دنیا کے تمام نیک اور شریف انسانوں کی تعلیم یہی رہی ہے کہ "اپنے" اور "غیر" کے فرق سے بلند ہو کر انسانی وحدت کو تسلیم کرنا چاہئے اور جو اچھی چیزیں ہم خود اپنے لئے چاہتے ہیں وہی اپنے ہمسایوں کے لئے طلب کرنی چاہئیں۔ البتہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ "ہمسائے" کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس زمانے میں جب نقل و حرکت کے جدید وسائل اور کاروبار اور صنعت و حرفت کی بین الاقوامی تنظیم نے دنیا کو سمیٹ کر فاصلے کا احساس ختم کر دیا ہے "ہمسائے" کی تعریف میں صرف وہی لوگ شامل نہیں جو ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں اور جن کی شکل و صورت اور روزمرہ کی زندگی سے ہم واقف ہیں بلکہ انسانی کنبے کے تمام افراد خواہ وہ کسی قوم یا مذہب یا ملک کے ہوں، اس میں آجاتے ہیں۔ ایک مشہور سوال جو فکر انسانی کا ایک مستقل جزو بن گیا ہے، یہ ہے: "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" اس کا جواب یقیناً یہ ہے کہ میں ہوں اور دنیا میں جس قدر انسان ہیں وہ سب میرے بھائی بہن ہیں اور جب تک میں ان کے آرام اور آسائش اور ان کی تعلیم و ترقی کے لئے کوشش نہ کروں میرا ذاتی آرام اور آسائش بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی گیا تو بیکار اور بے فیض ہے" اس زمانے میں واقعاً صورت حال کا تقاضہ یہ ہے کہ یا تو مِل جُل کر کام کرو ورنہ فنا ہو جاؤ گے۔ سب کا بھلا چاہو ورنہ تمہارا بھی بھلا نہ ہو سکے گا اجتماعی ذمہ داری کے اس اصول کو قرآن شریف کی ایک آیت میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "اُس آگ سے ڈرو کہ اگر وہ بھڑکی تو تم میں سے صرف اُن لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے خاص کر کے ظلم کیا ہے، بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں

آجائیں گے" یعنی ظلم اور بے انصافی کے ساتھ معاملہ کرلینا یا اس کو چپ چاپ سہ لینا بھی اتنا ہی بڑا اخلاقی اور معاشرتی جرم ہے جس قدر ظلم میں فعالی حیثیت سے شریک ہونا۔ لہٰذا دوسروں کی بہبود کے لئے جدوجہد کرنا اور ان کی محرومیاں دور کرنے کی کوشش کرنا دراصل خود اپنے تحفظ اور ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔

موجودہ تہذیب کے یقیناً بہت بڑے بڑے کارنامے ہیں لیکن اس نے اپنی فراغت اور آسودگی اور تہذیب کی دولت کو بعض خاص طبقوں تک محدود رکھا ہے اور باقی کو کسی بلند سماجی سطح پر لانے کے لئے کوئی منظم جدوجہد نہیں کی۔ اس لئے نگاہِ حقیقت شناس میں ان لوگوں کی دولت چوری کے مال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور ان کی تہذیب سطحی اور کھوکھلی ہے۔ یہ لوگ اپنے ایک مصنوعی گوشۂ عافیت (Ivory Tower) میں محصور ہوکر ان چیزوں سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں لیکن ان کے گردوپیش کی زندگی جو افلاس، جہالت، بیماری اور ذہن و ذوق کی کم مائگی سے عاجز آئی ہوئی ہے، ان کے قلعوں کے چاروں طرف پھیری ہوئی منڈلا رہی ہے۔ کیا اس حالت میں کوئی دردمند دل اس عام بدنصیبی اور محرومی سے اثر لئے بغیر رہ سکتا ہے؟ مجھے اکثر ایک مصنف کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ہم لوگوں (یعنی اونچے طبقے والوں) کی زندگی میں جو کچھ جلوہ تہذیب اور نفاست کا نظر آتا ہے وہ عوام کی تیرۂ و تار زندگی کو نچوڑ کر حاصل کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس تہذیب اور نفاست کی بنیاد دوسروں کی محرومی اور تصرفِ بے جا پر رکھی گئی ہو وہ کبھی دیرپا یا حیات بخش نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا انصاف اور شرافت اور دانش مندانہ خود غرضی سب کا تقاضا یہی ہے، کہ مستقبل کے معاشرتی نظام میں کسی ایک جماعت کے مخصوص مفاد کا اہتمام نہ کیا جائے بلکہ ایک ایسا ماحول تیار کرنا چاہئے جس میں سب لوگوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کی مناسب نشوونما کا انتظام ہو اور اس طرح عام خوش حالی اور تہذیب کا معیار بلند کیا جائے۔

اب رہا دوسرا سوال کہ آیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا اثباتی جواب اخلاق و مذہب کے تقاضوں کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت حال کی بنا پر دیا جاسکتا ہے۔ سائنس اور صنعت و حرفت کی حالیہ

ترقی سے پہلے انسان بڑی حد تک فطرت کی قوتوں کا غلام تھا اور احتیاج کی زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ فطرت کی آغوش ہر قسم کے مادی خزانوں اور قدرتی طاقتوں سے پُر تھی لیکن یا تو اس کی وہاں تک رسائی نہ ہوتی تھی یا وہ انہیں حاصل نہ کرسکتا تھا یا ان سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ اس لئے اس کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ مادی اور تہذیبی زندگی کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایسی فراوانی کے ساتھ اسباب مہیا کرسکے کہ وہ سب انسانوں کے لئے کافی ہوں۔ لہذا تھوڑی سی ضروری اور قابلِ قدر چیزوں کے بہت سے طلبگار تھے اور اس کا نتیجہ چھین جھپٹ، تصرف و تغلب جماعتی کشمکش اور مقابلہ اور رقابت کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ کام کی تہ میں بالعموم یہ جذبہ نہ تھا کہ نوع انسانی کی خدمت کی جائے یا اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار کیا جائے بلکہ جذبہ محرکہ ذاتی کمانا تھا۔ خواہ اس کی وجہ سے دوسروں پر کچھ بھی گذرے۔ یہ خیال اس قدر شدت کے ساتھ لوگوں کے ذہن پر مسلط ہے کہ وہ نفع کمانے کے علاوہ کسی اور بہتر قوت محرکہ کے وجود ہی سے منکر ہیں یا کم سے کم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ عام ہو سکتا ہے۔ بہرحال ماضی میں جو صورت رہی ہو، گذشتہ نصف صدی میں سائنس کی ترقی اور اس کے استعمال نے حالات بالکل بدل دیئے ہیں اور انسان کے ہاتھ میں اس قدر قوت آگئی ہے کہ اگر وہ اسے سمجھداری اور انصاف کے ساتھ استعمال کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانوں کی اکثریت اپنی زندگی کو لھو کے بیل کی طرح محض روٹی کا چکر چلانے میں ضائع کرے اور علم، تہذیب اور آرٹ کے ان تمام بیش بہا خزانوں سے محروم رہے، جو نسلِ انسانی کی جدوجہد کا پھل ہیں۔ بھاپ، بجلی اور پٹرول کی بدولت انسان کی قوتِ پیداوار میں ہزاروں گنا اضافہ ہوگیا اور اگر ایٹم کی قوت بھی اس کے ہاتھ میں آگئی اور اس نے اس کو خودکشی کے لئے استعمال نہ کیا تو یہ طاقت لاکھوں گنا زیادہ ہوجائے گی۔ اس وقت بھی ماہرین فن کا یہ اندازہ ہے کہ سائنس اور دانشمندی کے امتزاج سے (جو بدقسمتی سے اب تک نہیں ہوسکا!) دنیا کا کام اس طرح منظم کیا جاسکتا ہے کہ ہر شخص دن میں صرف چار گھنٹے کام کرے اور انسانوں کی تمام مادی ضروریات پوری ہوجائیں اور اس شان سے پوری ہوں کہ سب لوگ اطمینان، خوش حالی اور

اعصابی آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ جو چیز ہمارے اس منزل تک پہنچنے میں حائل ہے وہ نہ فطرت کی تنگ دستی اور بے مہری ہے، نہ انسانی فطرت کی ناقابل علاج خود غرضی۔ وہ عام انسانوں کی جہالت اور بے بسی ہے جو ان کو حقیقت حال سے بے خبر اور اتحاد عمل سے دور رکھتی ہے اور ارباب اختیار کی خود غرضی، چالاکی اور اخلاقی بے حسی ہے جو اس معاشرتی المیہ سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کو اپنے مصالح کے خلاف سمجھتی ہے۔ یعنی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے سامان سب موجود ہے۔ لیکن دماغ میں روشنی اور دل میں گداز نہیں جو اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس صورتِ حال کا نہایت معنی آفرین نقشہ علامہ اقبال نے اپنی ایک چھوٹی سی نظم میں کھینچا ہے جس کا عنوان ہے "دورِ حاضرہ کا انسان":

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عصر حاضر کے نبرد آزما مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے محض ذہن بیدار کافی نہیں بلکہ (اگر میں ایک مذہبی اصطلاح استعمال کر سکتا ہوں تو) قلبِ مومن کی ضرورت بھی ہے جس میں اس احساس کی شمع روشن ہو کہ "اچھی زندگی" تمام انسانوں کی متاع مشترک ہے جس کو بعض افراد یا خاص طبقوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس احساس کو صوفیائے مشرق کی اصطلاح اور اقبال کی شاعری میں "عشق" کہا گیا ہے جو وجدانی طور پر ان گہری حقیقتوں تک پہنچ جاتا ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہوتی اور انسانی وحدت کا سچا احساس انہیں گہری حقیقتوں میں سے ایک ہے اس میں وہ تمام اخلاقی اور سماجی قدریں پنہاں ہیں جو انسان کی زندگی کو حیوانوں کے معیار سے بلند کر کے انسانیت کے صحیح مقام تک لے جاتی ہیں اور جنگل کے بے امان قانون کے بجائے انصاف کا شریفانہ قانون رائج کرتی ہیں، جب تک انسان اس اخلاقی شعور میں ترقی نہ کرے اس کی

ذہنی ترقیاں نہ صرف بے فیض ہیں بلکہ بہت خطرناک ثابت ہوسکتی ہیں، جیسا گذشتہ سو برس کی تاریخ نے ثابت کر دکھایا ہے۔ ایک فرانسیسی مفکر ڈاکٹر میرٹ کا یہ قول دُہرانے اور غور کرنے کے قابل ہے۔

All true progress is progress in charity, every other progress being secondary to it.

یعنی اصلی ترقی وہ ہے جو انسان "Charity" کی صفت میں کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں باقی تمام ترقیاں ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہاں Charity کا لفظ جس معنی میں استعمال ہوا ہے اس میں رواداری، انسان دوستی وسیع القلبی، دردمندی، محبت، مروت، غرض وہ تمام صفات شامل ہیں جن کی وجہ سے ایک انسان دوسروں کے درد دکھ کو اپنا سمجھ کر اس میں شریک ہو جاتا ہے اور جن کی بدولت وہ رقابت اور نفرت کی خلیج کو رفاقت اور مفاہمت کے پُلوں سے پاٹ دیتا ہے۔ انسان کی تمام ترقیوں کو پرکھنے کے لئے یہی ایک کسوٹی ہے کہ آیا ترقیاں انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لاتی ہیں اور ان کی سوئی ہوئی انسانیت کو جگاتی ہیں۔ یا ان میں زیادہ فصل پیدا کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے بعض علوم و فنون کی ترقی خیر مقدم کے قابل ہے۔ مثلاً طب کی جدید دریافتوں نے انسان کو بہت سی بیماریوں سے نجات دے کر اس کے دکھ میں کمی کی ہے اور اس کی صحت اور عمر میں اضافہ کیا ہے علم نفسیات کے جدید مشاہدوں اور تحقیقات کی بدولت ہمیں مجرموں، پاگلوں اور نارمل سے مختلف بچوں کی دماغی حالت بہتر طریقے پر معلوم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے ہم اس کے ساتھ زیادہ ہمدردی اور سمجھداری کا سلوک کرتے ہیں اور اُن سے زیادہ قابل مواخذہ ان سماجی حالات کو سمجھتے ہیں جو اس بدنصیبی کا باعث ہوئے ہیں۔ اسی طرح مزدوروں کے حقوق اور ان کی صحت وغیرہ کی حفاظت کے لئے قوانین پاس کئے گئے ہیں۔ یہ تمام ترقیاں اس لئے قابلِ قدر ہیں کہ ان کی پشت پر انسانی ہمدردی کا جذبہ ہے اور اس حقیقت کا احترام کہ تمدن کی بنیاد انصاف پر رکھنی چاہئے۔ برخلاف اس کے بعض ٹکنکل ترقیاں ایسی ہیں جن کا فائدہ امکانی ہے یقینی نہیں، مثلاً صنعت و حرفت کا نیا نظام یا وسائل آمد و رفت کی سرعت۔ یہ اسی حد تک خیر و برکت کا باعث ہیں جب تک اس

جذبے کے تابع رہ کر کام کریں۔ بعض ایسی ہیں جو دنیا کے لئے سراسر تباہی اور بربادی کا باعث ہوتی ہیں، مثلاً فنِ جنگ اور آلاتِ جنگ میں ترقی جس کا شاہکار وہ ایٹم بم ہے جس نے صدیوں کے اخلاقی اصولوں اور مروتوں کو چشم زدن میں بھلا دیا یا سرمایہ داری کی وہ تنظیم جس نے سماج میں احتیاج اور فراوانی کو دوش بدوش جمع کر دیا ہے یا نسل اور رنگ اور قوم اور مملکت کے نام پر بتوں کی پرستش جس نے انسانوں سے ان کی ذہنی آزادی اور اخلاقی احساس دونوں کو چھین لیا ہے اور ان کے درمیان ایسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ انسانی وحدت کا تصور لوگوں کو ناقابلِ فہم معلوم ہوتا ہے۔

اس سموم فضا سے متاثر ہو کر تعلیم بھی اکثر اپنے راستے سے بھٹک جاتی ہے، کبھی تو اسقدر [illegible] اور دیدہ دلیری کے ساتھ جیسے جرمنی یا اٹلی میں ہوا اور زیادہ تر ایسے خاموش اور غیر محسوس طریقے پر کہ لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ آج کل بھی باوجود ان بلند آہنگ دعوؤں کے جو کئے جا رہے ہیں اکثر ملکوں میں (جن میں جمہوری اور کلّی ملک سبھی شامل ہیں!) تعلیم ان فاسد خیالات سے متاثر ہو کر بجائے ایک عالمگیر (Charity) کی تلقین کرنے کے محبت، مروّت اور ہمدردی کو جغرافی حدود میں مقید کرنا چاہتی ہے۔ گویا رواداری اصولاً اچھی چیز ہے لیکن اختلاف رائے کرنے والوں کے ساتھ رواداری برتنا شرافت نہیں بلکہ کمزوری ہے! گویا ہمدردی کے استعمال میں اوّل خویش بعدہٗ درویش کا طریقہ بھی غلط ہے اور اس کا آغاز و انجام خویش ہی تک رہنا چاہئے گویا انصاف کو محض ذاتی اور انفرادی معاملات میں برتنا چاہئے، جماعتی تعلقات کا اور کاروبار میں اس پر کاربند ہونا ضروری نہیں اور بین الاقوامی سیاست میں اس سے کام لینا خارج از بحث ہے۔ کیونکہ امن کے زمانے میں ایسا کرنے سے قومی مفاد کے لئے خطرہ ہے اور جنگ کے زمانے میں اس کا نام لینا بھی جرم ہے جس معاشرت کی بنیاد اس قسم کے خیالات اور [illegible] پر رکھی جائے گی اور تعلیم نام نہاد انفرادیت اور حبّ وطن کی خاطر ان قدروں کی اشاعت کرے گی اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ اس دعوے کا ثبوت [illegible] کے لئے کسی دلیل

یا حجت کی ضرورت نہیں۔ گذشتہ تیس سال کی تاریخ میں یہ حقیقت خون کے حرفوں میں لکھی ہوئی موجود ہے! لہٰذا زمانے کی حالت اور ضروریات اس امر کی مقتضی ہیں کہ ہم اپنی تعلیم کے اخلاقی نصب العین میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس انقلاب کی رہنمائی کے لئے ایک مرکزی خیال کی ضرورت ہے جو مختلف اور منتشر رجحانات میں یکسوئی پیدا کرسکے۔ تہذیب کی تاریخ کے مختلف زمانوں میں مختلف مرکزی خیالات کا تسلط رہا ہے اور انہوں نے ہی اپنے زمانے کو ایک مخصوص انفرادیت بخشی ہے مثلاً قدیم یونانی تہذیب اور چینی تہذیب اور مغل تہذیب کے ایک دور میں حسن شناسی اور حسن آفرینی کو، جو یقیناً ایک قدر مطلق ہے، زندگی میں مقام اعزاز حاصل تھا۔ بعض زمانے ایسے گذرے ہیں جس میں سب سے زیادہ زور تلاش حق اور طلب علم پر دیا گیا ہے۔ یورپ کے دور تاریکی کے بعد اسلام کی علمی ترقیاں اور اس زمانے میں مختلف علوم، بالخصوص سائنس کا فروغ اس رجحان طبیعت کے مظاہر ہیں لیکن ہم اس وقت انسانی ارتقاء کے جس نازک دور میں سے گذر رہے ہیں اس میں خیر کی قدر مطلق کو حسن اور حق کی اقدار مطلقہ پر فوقیت حاصل ہونی چاہئے کیونکہ ہمارے اخلاقی اور سماجی مسائل ہمارے علمی اور جمالی مسائل سے بھی زیادہ اہم اور توجہ طلب ہیں اور خیر کے بھی اس وسیع تصور پر زور دینے کی ضرورت ہے جو انفرادی زندگی کے معاملات تک محدود نہ ہو بلکہ جماعتی اور بین الاقوامی تعلقات پر بھی محیط ہو اور جس کا جذبہ محرکہ یہ ہو کہ دنیا میں عدل کی حکمرانی قائم کرنی ہے۔ اس آئیڈیل کے سامنے دوسرے تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی پرکھ بھی اس کسوٹی پر ہوگی کہ وہ کس حد تک اس مرکزی جذبے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یعنی حسن آفرینی ایک اچھی چیز ہے لیکن اگر وہ چند افراد یا کسی خاص طبقے کا سرمایہ تعیش بن کر رہ جائے اور عوام کی زندگی آرٹ کے جلوؤں سے بالکل محروم ہو تو نگاہ نکتہ سنج میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ اسی طرح علم و عقل کی ترقی انسانی ارتقا کا ستون ہے اور اس کے بغیر انسانی زندگی تاریک ہے لیکن اگر علم پوری سماجی زندگی کی آبیاری نہ کرے اور کچھ لوگوں کے ہاتھ میں آکر دوسروں کی حق تلفی اور تصرف کا ذریعہ بن جائے تو وہ محض بیکار ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس علم کی لگام بھی خیر کے ہاتھوں میں ہونا

ضروری ہے۔

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست نگاہ بندۂ مومن قیامت خرد است

اور اس ضمن میں "مومن" کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ عدل کا علم بردار ہے اور ظلم اور ناانصافی کا دشمن خواہ وہ دنیا میں کہیں پائی جائے۔ وہ اس بارے میں نسل یا رنگ یا مذہب یا جغرافیہ کی حد بندی کا قائل نہیں۔ وہ سچ کا ساتھ دیتا ہے خواہ وہ اس کے نفس کے خلاف ہو اور حق کی حمایت کرتا ہے خواہ وہ اس کے جماعتی اور قومی مفاد کے لئے مضر ہو وہ محاسبہ نفس کے ناگوار فرض سے نہیں کتراتا اور اپنی خوبیوں سے زیادہ دوسروں کی خوبیوں اور دوسروں کے عیبوں سے زیادہ اپنے عیبوں پر نظر رکھتا ہے اس میں حبِ وطن کا جذبہ صادق ہوتا ہے، وہ اپنی اخلاقی اقدار اور اپنے علمی کارناموں پر فخر کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں کی اچھی باتوں کا معترف اور اپنی کمزوریوں کا نقاد بھی ہے۔ جب تک تعلیم ایسی متوازن اور انصاف پسند طبیعتیں پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوگی اس وقت تک نہ تعلیم کی گتھی سلجھے گی نہ معاشرت کی۔

ایک صفت اور ہے جس کی طرف اشارہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ آج کل کے انسانوں میں وہ ناپید ہوتی جاتی ہے اور اس کے بغیر کام بالکل نہیں چلتا۔ یہ رواداری کی صفت ہے جس کے بغیر کسی ایسے سماج میں گزارا ناممکن ہے جس میں اختلاف خیال و طبائع کو دبانے کے بجائے ان کو نشوونما کا موقع دیا جائے۔ ایک کُلیت پسند سماج میں انفرادی اختلافات کو دبا کر لوگوں کے خیالات اور جذبات کو ایک مقررہ سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ایک جمہوری سماج میں افراد کو آزادیِ رائے اور اختلافِ خیال کا پورا حق حاصل ہے۔ ایسی صورت میں اگر افراد میں رواداری کا جذبہ نہ ہو تو مخالفت اور کشمکش پیدا ہونا یقینی ہے۔ رواداری کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کو آزادی سے لیکن معقولیت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع حاصل ہو اور لوگ اس کو اطمینان سے سنیں اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور وہ بھی لوگوں کی تنقید اور اعتراض کو اسی طرح ٹھنڈے دل سے سنے اور اس پر غور کرے۔ لیکن آج کل مختلف سیاسی یا مذہبی سماجی عقائد کی

کشمکش اس قدر تلخ ہوگئی ہے کہ لوگ نہ معاملے کی مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کو تیار ہیں، نہ مخالفین کی نیک نیتی تسلیم کرنے کو نہ اختلاف اور اعتراض کی وجہ سوچنے کو۔ ہر فریق خود کو ایک مخصوص الہام کا حامل سمجھتا ہے اور ہر اس شخص اور جماعت کو جو اس الہام کو تسلیم نہ کرے کافر اور مرتد قرار دیتا ہے اور اس معاملے میں اس شدت، تلخی اور تعصب کا اظہار کیا جاتا ہے جو پرانی مذہبی جنگوں میں پایا جاتا تھا، ہمارے اپنے ملک میں ایسی حالت ہوگئی ہے کہ کسی اہم معاملے میں فرد کا جماعت سے اور اقلیت کا اکثریت سے اختلاف کرنا خطرے کا باعث بن گیا ہے اور سیاسی نزاع میں شرافت، حق دوستی اور رواداری کے وہ اخلاقی اصول جو سیاسی اغراض و مقاصد سے کہیں زیادہ اہم ہیں بالکل نظرانداز کر دئیے گئے ہیں بیشتر اخباروں، رسالوں اور تقریروں کا لب ولہجہ اور ارباب سیاست اور طلبہ کی ذہنیت اس افسوسناک صورت حال کی غمازی کرتے ہیں۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ جب مختلف جماعتوں کے سیاسی جھگڑے طے بھی ہو جائیں گے تو موجودہ سیاسی فضا کا مسموم اثر کم از کم ایک نسل تک ہمارے دل و دماغ پر مسلط رہے گا۔ ہماری تعلیم گاہوں، بالخصوص کالجوں اور یونیورسٹیوں کو اس نازک صورت حال کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس بات کا امکان ہے کہ طلبہ میں بے لاگ تنقید اور رواداری کے ساتھ ہر پہلو پر غور کرنے کی عادت ڈالی جا سکے۔ سیاست کے پلیٹ فارم اور کاروبار کی گرم بازاری میں اصابت رائے اور غیر جانب داری کا اظہار قرین قیاس نہیں۔ قوم میں صالح ذہنی زندگی ایسے اداروں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، جہاں فکر پر پابندیاں عائد نہ کی جائیں، جہاں نوجوانوں کو سوچنے اور بحث و مباحثہ کا موقع حاصل ہو جہاں خیال خیال سے ٹکرائے اور اس کے شرارے کی روشنی میں حقیقت کا رخ زیبا دکھائی دے، جہاں تحقیق و تفتیش کی آزادی ہو لیکن اس کا مقصد کسی مفروضہ عقیدہ کی تائید یا کسی سیاسی جماعت کی ناجائز دست گیری یا کسی نسلی اور قومی تعصب کا جواز پیش کرنا نہ ہو جہاں زندگی کی رزم گاہ کے جھلسے ہوئے اور پیچیدہ سیاسی، اقتصادی، سماجی اور اخلاقی مسائل سکون اور اطمینان کے ساتھ ان پر غور کیا جا سکے تاکہ حقیقت اور پراپگنڈا کا فرق واضح ہو جائے ملک میں

دیانت فکر اور ذہنی بے تعصبی کا وجود اس صورت میں باقی رہ سکتا ہے۔ جب اغراض ومقاصد کی مجنونانہ کشمکش میں یونیورسٹیاں ثبات قدم سے کام لیں اور ان کی شان یہ ہو کہ :-

شل خورشید سحر فکر کی تابانی میں شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کی رفیق

یعنی میں ان سے یہ مطالبہ ضرور کرتا ہوں کہ وہ سماجی عدل کے نصب العین کی علم برداری کریں لیکن یہ توقع نہیں رکھتا کہ خود کو کسی سیاسی جماعت کے ساتھ وابستہ کر کے اپنی آزادی فکر کے بیش بہا عطیہ کو کھو بیٹھیں پہلی بات کے لئے طلباء کے دل و دماغ کی تربیت اور ان میں بعض خاص اصولوں اور قدروں کے ساتھ وابستگی پیدا کرنا ضروری ہے، جو یونیورسٹی کا جائز کام ہے۔ دوسری چیز بنے بنائے خیالات اور عقائد کو ان کے نمو پذیر دماغوں پر عائد کرنا چاہتی ہے جو مقصد تعلیم کے منافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس بہتر سماج کی تعمیر اور بہتر انسان کی تشکیل صرف تعلیم کا کام نہیں۔ ہماری دنیا میں جو الجھنیں ہیں ان کا سب سے بڑا سبب وہ معاشی اور معاشرتی بے انصافیاں ہیں جنہوں نے لوگوں میں جماعتی کشمکش اور دنیا میں قومی رقابتوں کی پرورش کی ہے۔ جب تک وہ دور نہ ہوں گی تعلیم بڑی حد تک ریت میں ہل چلاتی رہے گی۔ ان کو دور کرنے کے لئے ایک زبردست سماجی انقلاب کی ضرورت ہے جس کی ذمہ داری استادوں سے زیادہ ارباب سیاست و اختیار کی مصلحت اندیشی اور جمہور کی دانشمندی اور خود شناسی پر ہے لیکن تعلیم یہ ضرور کر سکتی ہے کہ مقابلے، رقابت، خود غرضی اور طبقاتی ذہنیت پر زور دینے کے بجائے انہیں مل جل کر کام کرنا، ضبط و تنظیم کے ساتھ مشترک مقاصد کے لئے جدوجہد کرنا، خدمت کو سعادت سمجھنا اور دوسروں کے حقوق کا احترام کرنا سکھائے، وہ ان کے ذہن کی تلوار کو تیز کر سکتی ہے تاکہ دنیا کی دشوار گذار بھول بھلیاں میں وہ صحیح راستے کو پہچان سکیں۔ وہ ان میں رواداری اور وسعت قلب پیدا کر سکتی ہے تاکہ بڑے ہو کر ان کے دل و دماغ پر قفل نہ لگ جائیں اور باہمی تعلقات میں شرافت کی چاشنی باقی رہے۔ وہ انہیں ذہنی اور اخلاقی جرأت کی قدر کرنا سکھا سکتی ہے تاکہ وہ جس بات کو خلوص کے ساتھ ٹھیک سمجھیں اس پر قائم رہیں، خواہ ایسا کرنے میں انہیں سماج کی ناراضگی اور مخالفت مول لینی پڑے۔

وہ ان میں احساس اور دردمندی کی کسک پیدا کرسکتی ہے تاکہ ان کے دل کے تار محض ذاتی مفاد کی مضراب ہی سے نہ چھیڑیں بلکہ دوسروں کے دُکھ درد اور محرومی سے بھی جاگ اٹھیں۔ وہ ان کی قوتِ عمل کی تربیت کرسکتی ہے تاکہ ہمدردی کا جذبہ محض ایک ذہنی تعیش تک محدود نہ رہے بلکہ عمل میں تبدیل ہوجائے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ ان کے دل میں انصاف کے لئے جہاد کرنے کی تڑپ پیدا کرسکتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ کرسکتی ہے۔ لیکن اس کا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس بہتر انسان کی نظری تصویر بنانا آسان ہے کیونکہ یہ تو محض لفظوں کا کھیل ہے۔ لیکن اس کو اس دنیائے آب و گل میں متشکل کرنا بہت صبر اور محنت اور حقیقت پسندی کا کام ہے۔ کیونکہ صحیح اور اچھی تعلیم لکچر اور تقریر دینا نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی زندگی بسر کرنے اور اس ناقص دنیا میں رہ کر ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لئے جد و جہد کرنے کا نام ہے:-

مردِ حُر سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر　　　خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے　　　کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر

خواجہ غلام السیدین

ہندوستان میں انگریزی تہذیب اور تعلیم

اگرچہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار ہندوستان پر مسلّم ہوچکا تھا لیکن ان کا تہذیبی اقتدار ہنوز قایم نہیں ہوا تھا مغربی تہذیب کے مادی وسائل ریل تار وغیرہ تو ملک کے بڑے حصے میں پھیل گئے تھے اور عموماً ہندوستانیوں کے دل میں حیرت اور تعریف کے جذبات پیدا کر رہے تھے لیکن اس کے ذہنی عناصر کا اثر بہت خفیف تھا۔ اور وہ بھی کلکتہ یا معدودے چند اور مقامات میں ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود تھا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ اوّل یہ کہ ابھی تک ہندوستانی اپنی پرانی تہذیب سے مطمئن تھے اور اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا سیاسی انحطاط دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہے ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں ان کے ادب اور فنون لطیفہ میں حقیقت کی روح کم اور تصنّع کا رنگ زیادہ ہوگیا ہے اور مجموعی طور پر ان کی تہذیب اس قدر جامد ہوگئی ہے کہ اس میں نشوونما پانے کی اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق کرنے کی طاقت نہیں رہی ہے دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کے ساتھ نئے زمانے اور نئی زندگی کے جو فرحت بخش جھونکے آئے تھے ان میں اہلِ ہند کو سیاسی اور معاشی غلامی کی زہریلی گیس کی بو آتی تھی اس لئے وہ اس سے دور بھاگتے تھے۔ مغربی تہذیب کے نمائندے یا تو نفع کمانے والے تاجر تھے جو ان کی آزادی اور دولت چھیننا چاہتے تھے یا عیسائی مبلغ جو ان کی عزیز ترین ملک یعنی مذہب کے درپے تھے اس لئے اس تہذیب کو بے تعصبی کی نظر سے دیکھنا اور اس کی خوبیوں کی قدر کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ تیسرے یہ کہ لارڈ میکالے جیسے افراد کو مجبوراً بحیثیت مجموعی ان انگریزوں پر جو ہندوستان

میں رہتے تھے۔ انیسویں صدی کی نئی انگریزی ذہنیت کا اثر نہیں ہوا تھا وہ دولت اور قوت کا لالچ ضرور رکھتے تھے مگر نسلی اور قومی غرور سے پاک تھے انہیں گوری قوم کے بار امانت کا احساس نہیں تھا۔ اور وہ ایشیائی قوموں کو غیر مہذب یا نیم مہذب اور اپنے آپ کو ان کے مہذب بنانے کا ذمہ دار نہیں سمجھتے تھے مثلاً سلیمن جیسا انگریز جس نے قوت کے نشے میں سرشار ہو کر اودھ کے تاجدار سے انتہائی حقارت اور ذلت کا برتاؤ کیا قدیم طرز کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمان امرا کی تہذیب اور شائستگی کا قائل تھا اور ان کی ذہنی برتری کا اعتراف کرتا تھا غرض حکومت کی تہذیبی پالیسی کچھ بھی ہو مگر عام انگریز اس وقت تک اپنی تہذیب کو ہندوستانیوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ خود ایک حد تک اس سے متاثر تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد دفعتاً نقشہ بدل گیا ہندوستانیوں کو اپنی بے بسی کے احساس سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس نے ان کی راسخ عقیدت کو جو وہ اپنی تہذیب سے رکھتے تھے متزلزل کر دیا ادھر انگریز اپنی قومی سیرت کے مطابق ان لوگوں کو جنہوں نے بہ حیثیت جماعت اس شدید بحران کے زمانے میں اپنے ارادے کو معطل کر دیا۔ اور سیلاب حوادث کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کے ساتھ بہہ گئے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور قدرتی طور پر ہندوستانیوں کے ساتھ ہندوستانی تہذیب بھی ان کی نظروں سے گر گئی۔ خصوصاً جب انگریزوں کی نئی تانسی نسلی اور تہذیبی برتری کے تصور اور سامراجی جشن کے نشے سے سرشار ہندوستان پہنچی اور اس نے سارے ملک کو خوف سے سہا ہوا دیکھا اور عام طور پر لوگوں کو اطاعت کے لئے سر جھکائے ہوئے پایا تو اسے اور زیادہ یقین ہو گیا کہ اس کا سابقہ ایک پست قوم سے ہے جسے مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے ذریعہ سے ابھارنا اس کا مقدس فرض ہے۔ خود ہندوستانیوں میں بھی ان کے کرائے کے ٹٹوؤں کے علاوہ جنہوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا، اور ان کی ہر بات کی تائید کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انگریز حکومت اور انگریزی تہذیب کے مخلص حامیوں کی تعداد بھی اب بہت بڑھ گئی تھی یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حالات کا غور سے مطالعہ کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس قوم

صرف انگریزہی ہندوستان کی سیاسی ابتری کو دور کرسکتے ہیں اور ایک منظم حکومت قایم کرسکتے ہیں
اس کے علاوہ انھیں یقین تھا کہ ان کے عہد وسطیٰ کی تہذیب اب فرسودہ ہو چکی ہے اور نئے زمانے
کے معاشی، سیاسی اور ذہنی تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی اس لئے ان کو انگریزوں کے سامنے
زانوئے شاگردی تہ کرکے ان سے وہ جدید تہذیب سیکھنی چاہئے جس کی بدولت انہوں نے یہ
ترقی اور کامیابی حاصل کی ہے۔ انگریزوں کے ذہنی اور سیاسی اقتدار کے مخالف اب بھی موجود تھے
لیکن وہ اب میدان میں آنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انھیں حکومت کے پنجۂ غضب سے صرف
مذہب کے ظل حمایت ہی میں پناہ مل سکتی تھی اس لئے وہ مذہبی مدرسوں اور خانقاہوں میں کم وبیش
عزلت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر عموماً وہ امراء اور شرفا جو سیاسی طوفان کی دستبرد
سے بچ رہے تھے اور نئے اونچے اور متوسط طبقے جنہیں سیلاب زمانہ نے ابھارا تھا خوشی سے
انگریزی حکومت کے سامنے سر جھکانے کو تیار تھے، ہندوؤں نے جو زمانہ کے ساتھ بدلنے کی
زیادہ صلاحیت رکھتے تھے انگریزی مدارس کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ تاکہ انگریزی تعلیم اور تہذیب
کی برکتوں سے فیضیاب ہوکر ایک طرف اپنی روزی کا ٹھکانا کریں اور دوسری طرف حاکم قوم کی نظر میں
عزت پائیں مسلمان بہ حیثیت جماعت ایک مدت تک الگ رہے لیکن سرسید کی حکمت عملی نے رفتہ
رفتہ انہیں بھی زمانہ کے ساتھ چلنے پر آمادہ کردیا۔ غرض انگریزی حکومت نے اپنی تہذیبی پالیسی کو جو
۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ایک بڑی وجہ تھی اس ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد بدلنے کی کوئی ضرورت
نہیں سمجھی بلکہ اُسے خود ہندوستانیوں کے ایک بڑے طبقہ کی مدد سے مکمل اور منظم طور پر چلانے کی
کوشش کی۔ اور بظاہر اس میں کامیاب ہوئے یعنی انگریزی تہذیب کا ایک دیسی چربا تیار ہو گیا
جس نے رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب کو پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ لینی شروع کردی ذیل کے صفحات
میں پہلے ہم اس تہذیب کی عام صفات پر اور اُس کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالیں گے۔ اور اس
کے بعد ایک مجموعی تبصرہ کریں گے کہ اس نے ہندوستان کی زندگی پر کیا اثر ڈالا اور کن وجوہ سے
اس کے خلاف ایک شدید ردعمل پیدا ہوا۔

نئی تعلیمی اور تہذیبی تحریک ہندوستانی تہذیب کی تحریک سے جسے اکبر نے شروع کیا
تھا اس امر میں مشابہت رکھتی تھی کہ اس کی تہ میں بھی سیاسی مقصد تھا۔ اور اس کا مرکز بھی ہندوستان
کو قرار دیا گیا تھا۔ اکبر کی طرح انگریز بھی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں سیاسی وحدت پیدا
کریں یعنی ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں کو ایک ریاست کی وفادار رعایا بنا کر اتحاد کے رشتہ میں مربوط
کر دیں۔ انہوں نے بھی اس کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مشترک تعلیم کے ذریعہ سارے ملک کے
اونچے اور متوسط طبقوں کو ایک مشترک تہذیب کے رنگ میں رنگ دیں۔

مگر اس سطحی مشابہت کے اندر دونوں کی پالیسی کا بنیادی فرق صاف نظر آتا۔ اکبر کے پیش نظر
ہندوستانی قومی ریاست تھی جس میں بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ملک کی سب جماعتیں بلاتفریق
نسل و مذہب مساوی درجہ اور مساوی حقوق رکھتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاہی خاندان باہر
سے آیا تھا لیکن وہ ہندوستان میں بس گیا تھا۔ اور یہیں کا ہو رہا تھا۔ اکبر اور اُس کے جانشینوں کی انتہائی
کوشش تھی کہ بادشاہ اور اُس کی ادنیٰ ترین رعایا میں بلا واسطہ تعلق قائم ہو اور وہ یہ محسوس کریں
کہ بادشاہ کی ذات ان کی آرزوؤں اور حوصلوں کا مجسمہ ہے۔ برخلاف اس کے انگریز جس ریاست
کے گرد ہندوستانیوں کو جمع کرنا چاہتے تھے وہ حقیقی معنی میں ریاست نہ تھی بلکہ سلطنت برطانیہ کی
ایک کالونی یعنی ایک محکوم ملک جس میں برائے نام فرمانروائے برطانیہ کی، ورنہ حقیقت میں برطانوی
پارلیمنٹ یعنی برطانوی قوم کی حکومت تھی گویا ہندوستانیوں سے ایک فرد واحد کا مطالبہ نہ تھا بلکہ ایک
پوری قوم کی اطاعت کا اور وہ بھی اس قوم کی جو ان کی تاریخ تہذیب اور معاشرت سے ناواقف
اُن کے جذبات و خیالات سے ناآشنا ان کے رنج و راحت سے بے خبر اُن سے ہزار ہا میل کے
فاصلے پر رہتی تھی جس کی مجموعی رائے اور ارادے پر اثر ڈالنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا
اس قوم کے جو افراد ہندوستان میں تھے انہوں نے بھی اپنی نسلی اور قومی برتری کے جذبے
کے ماتحت وہ تھوڑا بہت معاشرتی تعلق جو وہ اب تک ہندوستان سے رکھتے تھے قطع کر لیا۔ اور
رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان اجنبیت بڑھتی چلی گئی۔

اس سیاسی پالیسی کا قدرتی نتیجہ تھا کہ عام تہذیبی زندگی میں بھی انگریزوں نے مصالحت کے بجائے تسلط کے اصول کو مد نظر رکھا انہوں نے اکبر کی طرح اپنی تہذیب کو ہندوستانی تہذیب میں سمونے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس پر زور دیا کہ جہاں تک ہو سکے مغربی تعلیم اور تہذیب بجنسہ ہندوستان میں رواج پائے تاکہ اہل ہند عہد وسطیٰ کے جمود سے نکلیں اور ان کی قیادت اور رہبری میں عہد جدید کی راہ ترقی پر گامزن ہوں۔

مغربی تہذیب میں اُس ظاہری عظمت و وقار کے علاوہ جو حاکم قوم کی ہر چیز میں محکوم کو نظر آتا ہے جو اندرونی قوت تھی وہ یہی تھی کہ وہ عہد جدید کی علمی روح اور عملی جوش سے معمور تھی لیکن افسوس ہے کہ جس ناقص طریقے سے پہلے پہل جدیدیت کے تازہ خون کو ہندوستان کے مریض جسم میں منتقل کیا گیا۔ اس کی وجہ سے اس کی حیات بخش قوتیں بہت کچھ ضایع ہو گئیں اور مجموعی طور پر ہندوستانیوں کو اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوا۔

اول تو خود وہ چیز جو ہندوستان پہنچی اصلی انگریزی تہذیب نہ تھی بلکہ ایک طرح کی دساوری تہذیب جس کے پُرزے انگلستان سے بن کر آئے تھے اور اُن کے جوڑنے کا کام ہندوستان میں کیا جاتا تھا اس کی ساخت زیادہ تر معمولی دل و دماغ کے لوگوں کے ہاتھ سے ہوئی جو تعلیم یافتہ انگریزوں میں سے خود انگلستان کے لئے سیاسی اور ذہنی فائدہ چننے کے بعد بچ رہے تھے یہ وہ لوگ تھے جو نوجوانی کی کچی عمر میں مدرسوں سے نکل کر اپنی تہذیب کے مرکز سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ذہنی اور سیاسی آزادی کی فضا سے بہت دور بھیج دئے گئے تھے کہ لاکھوں کروروں بے زبان بے قدر انسانوں پر ان کی بھلائی کے لئے حکومت کریں ان کو تاج برطانیہ کا وفادار اور برطانی (؟) مال کا خریدار بنائیں اور جو وقت اُس سے بچے اس میں تعلیم کا ایک نیا نظام قایم کریں اور تہذیب و تمدن کی ایک نئی دنیا بسائیں، اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کوئی نصف صدی تک برطانیہ سامراج کے من چلے ہیرو لوں خصوصاً سول اور محکمہ تعلیم کے بہت سے انگریزوں نے ایک قسم کے مذہبی جوش کے ساتھ کام کر کے ہندوستان میں صرف پائدار نظم و نسق ہی قایم نہیں کیا بلکہ جہاں تک ایک عہد وسطیٰ کے زراعتی

نظام کے اندر ممکن تھا ملک کو مغربی تمدن کے مادی فوائد کے ساتھ اس کی تعلیمی اور تہذیبی برکات سے مالامال کرنے کی بھی کوشش کی۔

لیکن ظاہر ہے کہ ایک دور افتادہ کالونی کی ناموافق آب وہوا اور ناآشنا آبادی میں ایسی کون سی کشش تھی کہ انگلستان یا دوسرے مغربی ملکوں کے اہل کمال۔ چوٹی کے علماء فضلا، فلسفی اور فن کار یہاں آکر جمع ہوتے اور مغربی تہذیب کی سچی فضا پیدا کرنے میں مدد دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں انگریزی تہذیب کا جو نمونہ بنایا گیا اس کی تشکیل اہل فن کے ہاتھوں سے نہیں بلکہ ان عطائیوں یعنی سرکاری اور غیر سرکاری انگریزوں کے ہاتھ سے ہوئی جو وضع قطع معاشرت اور خیالات میں انگلستان کے باسی فیشنوں کی بُری بھلی نقل سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے اس طرح جو تہذیب وجود میں آئی اسکو ولایتی تہذیب کے مقابلہ میں دساوری تہذیب کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا۔

پھر یہ کہ انگریزوں کے نسلی غرور اور ان کی بیگانہ وشی کی وجہ سے ہندوستانیوں کو اس تہذیب کو بھی اچھی طرح اپنانے کا موقع نہیں ملا حاکم ومحکوم کے درمیان استادی شاگردی کا رشتہ یوں بھی بڑی مشکل سے نبھتا ہے اور جب حاکم قوم کا احساس برتری اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ وہ محکوم سے معاشرتی تعلقات رکھنا اپنی کسر شان سمجھے تو ظاہر ہے کہ ان میں وہ ذہنی قرب ناممکن ہے جس کے بغیر آج تک کوئی شاگرد استاد کی تعلیم کی حقیقی روح کا محرم نہیں ہو سکا چنانچہ جب ہندوستانیوں نے انگریزوں کی تہذیب کو ان کی زندگی میں مجسم دیکھنے کی کوشش کی تو انہیں دور سے صرف اس کی ظاہری اور سطحی چیزیں ہی نظر آئیں۔ یعنی ان کی وضع اور لباس ان کے رہنے سہنے کا طرز ان کا اکل کھوان ان کی مادیت پرستی ان کی مذہبی تشکیک اور انہیں چیزوں کو حاصل کرنے میں وہ اپنی ساری کوشش صرف کرتے رہے انگریزی سیرت کی بنیادی صفات یعنی سازگاری خودداری ضبط ارادے کی مضبوطی، اخلاقی جرأت کھلاڑی کی آن جنٹلمین کی شان اور ان کے علاوہ عہد جدید کی وہ خصوصیات جو انگریزوں اور یورپ کی دوسری قوموں میں مشترک ہیں یعنی علمی تحقیق کی روح زندگی کی بنیاد عقل اور تجربے پر رکھنا تسخیر فطرت کے ذریعہ زندگی کو خوشگوار بنانا غرض انگریزی قوم کی عظمت کے

حقیقی عناصر ہندوستانیوں کی نظر سے تقریباً پوشیدہ رہے اور وہ ان سے بہت کم متاثر ہوئے لارڈ میکالے کو تو یہ امید تھی کہ انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی تعلیم سے ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو ظاہری وضع کے لحاظ سے انگریز معلوم ہوگا لیکن ہوا یہ کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی وضع قطع اور معاشرت میں تو دساوری انگریز کا بگڑا ہوا چربا بن گیا لیکن ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اس نے یا تو انگریزوں کا اثر قبول ہی نہیں کیا اور اگر کیا تو ان کے عیوب کو بڑھا چڑھا کر اختیار کیا جس کی وجہ سے وہ بے اصول بے توازن قومیت یافتہ انفرادیت پرست ہو کر رہ گیا۔ غرض وہ جدید تہذیب جسے ہندوستان کے اونچے اور متوسط طبقوں نے انگریزی تہذیب سے متاثر ہو کر تعمیر کرنے کی کوشش کی ایک مشترک تہذیب ضرور تھی۔ مگر قومی نہ تھی اس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں ایک حد تک ہم رنگی تو پیدا کر دی مگر ہم آہنگی نہ پیدا کر سکی پھر بھی چونکہ اس نے بلا واسطہ ہندوستانی ذہن کو عہد وسطی کے جمود سے نکال کر عہد جدید کی حرکت اور زندگی سے آشنا کیا اور بالواسطہ ہندوستان کی قومی تحریک کو ابھارنے میں مدد دی اس لئے ہم کو اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

لیکن ہم یہاں دو باتوں کو صاف کر دینا چاہتے ہیں ایک یہ کہ ہمیں یہاں مغربی تہذیب کے اُس روپ کا ذکر نہیں کرنا ہے جو ہندوستان میں انگریز اور اینگلو انڈین سوسائٹی کی زندگی میں ظاہر ہوا۔ بلکہ اس کے اُلٹا چربے کا جو ہندوستانیوں نے اُتارا اس لئے دساوری انگریزی تہذیب کی اصطلاح ہم ہر جگہ ہندوستانیوں کے نئے تعلیم یافتہ طبقے کی تہذیب کے لئے استعمال کریں گے اور انہیں کی زندگی کی تصویر پیش کریں گے۔ دوسرے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اس دَور میں ہندوستان میں صرف یہ ایک ہی تہذیب وجود رکھتی تھی اس کے علاوہ مقامی اور فرقہ وارانہ تہذیبیں بھی تھیں جو نئے اثرات سے متاثر ہو کر اپنے اپنے ضلع میں ترقی کر رہی تھیں لیکن چونکہ مشترک اور ملک گیر تہذیب کی جگہ اس دساوری انگریزی تہذیب نے لے رکھی تھی اس لئے ہم کو اسی سے بحث ہے دوسری تہذیبوں کی طرف ہم آخر میں اشارہ کریں گے۔

جیسا ہم نے اوپر کہا ہندوستان میں دساوری انگریزی تہذیب کا مرکز ریاست تھی لیکن

ایک انوکھی قسم کی ریاست جس سے اس ملک کو اپنی تاریخ میں پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ ہندوستان ہندو عہد میں مذہبی ریاست، بدھ عہد میں اخلاقی ریاست اور مغل عہد میں سیاسی اور تہذیبی ریاست دیکھ چکا تھا۔ لیکن ان سب کی دستوری شکل یکساں تھی یعنی سب میں اقتدارِ اعلیٰ کی حامل بادشاہ کی ذات تھی اور آخری دو ریاستوں کے اندر ہر نسل اور ہر طبقے کو بادشاہ کی رعایا کی حیثیت سے مساوی سیاسی درجہ حاصل تھا۔ اجتماعی اور تہذیبی زندگی کا محور شاہی دربار تھا۔ نظم ونسق عدل وانصاف اور وضع قانون کے علاوہ سماجی اصلاح اور اخلاقی احتساب، خیرات وحسنات، علم وحکمت اور فنون لطیفہ کی سرپرستی صنعت وحرفت کی قدردانی، طرز معاشرت اور وضع لباس کا تعین غرض کل تہذیبی وظائف، بادشاہ کی قیادت میں انجام پاتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ریاست جس کا مظہر بادشاہ تھا۔ صرف سیاسی ادارے کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ایک مکمل تہذیبی ادارے کی اس ریاست کا مرکز ثقل ملک کے اندر تھا۔ اور اس کا مقصد ملک کی فلاح وبہبود، اب جو ریاست انگریزوں نے ہندوستان میں قایم کی وہ ہر اعتبار سے ہندوستان کی روائتی ریاست سے مختلف تھی حقیقت میں وہ ریاست نہیں بلکہ ایک ماتحت حکومت تھی جو اقتدار اعلیٰ سے محروم تھی یہ اقتدار برائے نام شاہ برطانیہ کو مگر دراصل برطانوی قوم کو حاصل تھا اور اس کی نمائندہ جماعت برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ مقننہ، عاملہ اور عدالت کے وظائف پارلیمنٹ کی نگرانی میں وائسرائے اور سول سروس کے ارکان ادا کرتے تھے جو ابتدا میں سب کے سب بدیسی تھے، یہ بدیسی اپنے آپ کو نسلی اور تہذیبی حیثیت سے دیسیوں سے برتر سمجھتے تھے، اور اس برتری کا ہر ممکن طریقہ سے اظہار کرتے تھے یہاں تک کہ دیسی کا لفظ ہی ایک حقارت کا کلمہ بن گیا ظاہر ہے ایسی حالت میں حاکم ومحکوم میں وہ ذہنی اور روحانی قرب نہیں پیدا ہو سکتا تھا جس کے بغیر اچھی ریاست اور اچھی حکومت کا وجود میں آنا محال ہے اس میں شک نہیں کہ جہاں تک حکومت کے سیاسی فرائض کا تعلق ہے ۱۸۵۸ء کے بعد جو انگریز نوجوان ہندوستان کی سول سروس میں آئے انہوں نے عام طور پر ملک میں امن وامان قایم کرنے عدالتی اور انتظامی کارگذاری کو

دیانت داری اور قابلیت سے چلانے میں جان توڑ کر کوشش کی اور گورے آدمی کے بوجھ کو بڑی ہمت اور فرض شناسی کے ساتھ اٹھایا لیکن ان کی کوششوں میں جتنی کامیابی ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہوئی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ناواقفیت، بیگانگی اور بدگمانی کی فضا میں حکومت کو لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں ہوا، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت کی معاشی پالیسی نے جس کا ذکر آگے آئے گا ملک میں وہ مادی حالات نہ پیدا ہونے دئے جو کامیاب نظم ونسق کے لئے ضروری تھے۔

جہاں تک تہذیبی وظیفے کا تعلق ہے نئی ریاست نے بدیسی زبان میں تعلیم کا برا بھلا انتظام کرنے کے سوا براہ راست کسی تہذیبی سرگرمی میں قابل ذکر حصہ نہیں لیا۔ حاکم قوم کی سماجی اور تہذیبی زندگی جیسی کچھ تھی ایک حصار کے اندر بسر ہوتی تھی جس میں ہندوستانیوں کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی ہندوستانیوں کو مغربی تہذیب سے آراستہ کرنے کے فرض کا ان کے انگریز حاکموں کو احساس تو ضرور تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ محض انگریزی ادب مغربی تاریخ جدید فلسفے اور دوسرے نئے علوم کو پڑھنے سے ان کے لئے اس طلسم کا دروازہ کھل جائے گا۔ مغل دربار کا سا تہذیبی عمل جس میں مختلف تہذیبی رنگوں کے امتزاج سے ایک نیا رنگ بنا کر حاکم محکوم سب پر چڑھایا جاتا تھا۔ انگریز کچھ اپنی بیگانہ وشی اور کچھ ذہنی بے حسی کی وجہ سے قایم نہ کر سکے۔

غرض یہ غیر شخصی غیر تہذیبی غیر مقتدر ریاست جو ایک غیر ملکی قوم کے مجموعی ارادے اور اغراض کی تابع تھی ہندوستان کو بظاہر ایک منظم حکومت اور پُرامن زندگی سے زیادہ کچھ نہ دے سکی لیکن سچ پوچھئے تو ان کو ایک حد تک حریت پسند انگریزوں کی تعلیم اور اس سے کہیں زیادہ ان کی مثال سے ایک نہایت اہم چیز ہاتھ آئی۔ یعنی انفرادی اور قومی آزادی کا ایک نیا تصور اور جمہوریت کا ایک نیا طریقہ کار اور ہم اس اصلاح کا ذکر کر چکے ہیں جو لارڈ رپن نے لوکل سیلف گورنمنٹ میں کی تھی۔ یہ اصلاح اس امر پر مشتمل تھی کہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں انتخاب اور نمائندگی کے اصول جاری کئے گئے اور اس طرح ہندوستانیوں کو مغربی جمہوری حکومت کی ابجد سیکھنے کا موقع دیا گیا۔

اسی کے ساتھ البرٹ بل کے ذریعہ ہندوستانیوں کو قانون کی نظر میں انگریزوں کے ہم پلہ قرار دے کر لارڈ رپن نے ان کے دلوں میں سیاسی مساوات کا جذبہ بیدار کر دیا البرٹ بل کے خلاف ہندوستان کے انگریز تاجروں اور دوسرے انگریزوں نے جو ہنگامہ برپا کیا اس کے رد عمل کے طور پر زیادہ تر بنگالیوں نے مگر ایک حد تک اور صوبے کے لوگوں نے بھی سیاسی جلسے منعقد کئے اور تاریخ میں پہلی بار ہندوستانیوں نے رائے عامہ کو جمہوری طریق پر منظم کر کے سیاسی حقوق کا مطالبہ شروع کیا ۱۸۸۳ء میں سریندر ناتھ بنرجی کی کوشش سے کلکتے میں نیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حکومت کی انتظامی پالیسی کا جائزہ لیا گیا اور اس پر نکتہ چینی کی گئی اگلے سال سریندر ناتھ بنرجی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کر کے ملک گیر اجیٹیشن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دوسری نیشنل کانفرنس میں جو ۱۸۸۵ء میں کلکتہ ہی میں منعقد ہوئی، شہر کی تین پبلک انجمنیں برٹش انڈین ایسو-سی-ایشن۔ انڈین ایسو-سی-ایشن اور سنٹرل محمڈن ایسو-سی-ایشن بھی شریک ہوئیں اور اس طرح اس کو بنگال کے کل تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کی تائید حاصل ہو گئی اسی سال یعنی ۱۸۸۵ء میں ہندوستانیوں کی سیاسی بیداری ایک اور سیاسی انجمن انڈین نیشنل کانگریس میں شکل پذیر ہوئی جس کے قیام میں منفرد انگریزوں کی بلاواسطہ اور انگریزی حکومت کی بالواسطہ مدد شامل تھی، چونکہ یہ زیادہ نمائندہ اور با اثر جماعت تھی اس لئے نیشنل کانفرنس اسی میں مدغم ہو گئی کانگریس کی نشو و نما ۱۹۱۹ء تک ہم اوپر دکھا چکے ہیں یہاں صرف اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی بیس سال کی عمر تک کانگریس گویا انگریزوں کے دامن تربیت میں پلی اس کے پہلے جنرل سکریٹری مسٹر ہیوم انگریز تھے اور بیس سال کے عرصہ میں چار انگریزوں نے اس کی صدارت کے فرائض انجام دئے۔

انگریزی حکومت بھی کانگریس کو یہ سمجھ کر قدر کی نظر سے دیکھتی تھی کہ وہ اسے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی رائے سے مطلع کرتی رہے گی اور حاکم و محکوم کے تعلقات خوشگوار بنانے میں مدد دیتی رہیگی لیکن کانگریس کا انگریز اپنے شاگردوں کو جمہوریت اور آزادی کا سبق اسی حد تک پڑھانا چاہتا تھا کہ وہ اس کی ظاہری شکلوں سے واقف ہو جائیں اور انہیں استاد کے سہارے سے ایک محدود

دائرے میں برت سکیں۔ جب شاگردوں نے صورت کے پردے میں معنی کی جھلک دیکھی اور اُسے
اپنی کوشش سے حاصل کرنے کا خواب دیکھنے لگے تو استاد شاگردوں کی گستاخی سے بددل ہوگیا۔
اُسے اپنے کام سے جو شوق اور انہماک تھا وہ جاتا رہا اور اس کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہوگئی
کہ کبھی سختی سے اور کبھی نرمی سے کام لے کر شاگرد کی بڑھتی ہوئی خودسری کو قابو میں رکھے ۱۸۵۷ء
کے بعد سے ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ میں واقعات کا یہ سلسلہ اپنے آپ کو بار بار دوہراتا رہتا
ہے:۔ ہندوستانیوں کی سیاسی شورش حکومت ہند کی تعزیری تدابیر برطانوی رائے عامّہ کی
مداخلت جزوی سیاسی اصلاحات اور ان کی ناکامی مختصر یہ کہ انگریزی حکومت نے سب سے بڑی
نعمت جو وہ ہندوستانیوں کو دے سکتی تھی دینی شروع کی لیکن نسلی غرور اور معاشی خودغرضی نے
اس کا ہاتھ تھام لیا اس لئے اگر کچھ تھوڑا بہت امکان اس امر کا تھا کہ عام ہندوستانی نئی ریاست
کو اپنا سمجھنے لگیں اور مغربی تہذیب کو اپنا کر قومی تہذیب بنالیں تو وہ ختم ہوگیا۔ ہندوستان کے
سیاسی حلقوں اور انگریزی حکومت کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم
کے بعد ان میں کھلم کھلا مخالفت ٹھن گئی۔

انگریزی حکومت کی معاشی پالیسی کو جس سے اس کی سیاسی پالیسی متاثر ہوئی سمجھنے کے لئے
اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی وارث تھی اور اس کا سب سے
بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزی سرمایہ کے لئے ہندوستان میں معاشی استحصال کے مواقع فراہم کرے
اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں انگلستان کی رائے عامّہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شدید مخالفت
زیادہ تر اسی لئے شروع کی تھی کہ معدودے چند اشخاص نے ہندوستان کی نفع بخش تجارت پر بلا شرکت
غیرے قبضہ کر لیا تھا اور دوسروں کو اس فائدے سے محروم رکھتے تھے ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح حکومت
برطانیہ کمپنی کے معاملات میں روز بروز مداخلت کرتی رہی اور اس کے تجارتی ادارے کو روز بروز محدود
کرتی رہی یہاں تک کہ جب صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان کے کارخانے بہت زیادہ مال پیدا کرنے
لگے اور اس کی کھپت کے لئے کھلے بازاروں کی ضرورت ہوئی تو کمپنی کو توڑ دیا گیا تاکہ بلا تفریق

سرمایہ دار اور بالواسطہ ساری برطانوی قوم ہندوستان کا معاشی استحصال کرسکے اس لئے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت جس نے سیاسی حیثیت سے کمپنی کی جگہ لی۔ یہ معاشی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور تھی کہ ہندوستان کو انگلستان کے صنعتی نظام سے اس طرح وابستہ کرے کہ وہ بدستور زراعتی ملک رہے بلکہ اور زیادہ زراعتی ہوجائے یعنی اپنی دستی صنعتوں کو ختم کرکے تمام تر انگریزی کارخانوں کے لئے کچا مال پیدا کرنے والا اور ان کی بنائی ہوئی چیزوں کا صرف کرنے والا بن جائے حکومت کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھدے اور وحشیانہ طریقے استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ آزاد تجارت اور تامین کے ترقی یافتہ طریقوں کو ہوشیاری سے ملا جلا کر استعمال کرنا اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے کافی تھا کہ انگلستان کی مشینی صنعت ہندوستان کے بازاروں میں دوسرے ملکوں کے مقابلے سے محفوظ رہے اور دیسی دستی صنعت کو کھلے مقابلے میں شکست دے کر ختم کردے۔

اس میں شک نہیں کہ خود ہندوستان میں بھی صنعتی کارخانے ختم ہوئے۔ بنک کھولے گئے، ریلیں چلیں، غرض عہد جدید کے وہ سب سامان نظر آنے لگے جو ملکوں کی معاشی ترقی کا باعث ہوتے ہیں لیکن ایک تو یہ چیزیں ملک کے وسیع رقبے اور آبادی کے لحاظ سے بہت محدود پیمانے پر تھیں دوسرے ان میں سرمایہ اور انتظام تقریباً پورا انگریزوں کا تھا ہندوستانی ان سے یا گاہکوں کی حیثیت سے تعلق رکھتے تھے یا مزدوروں اور کلرکوں کی حیثیت سے گاہکوں کی حیثیت سے انہیں اور فائدے تو پہنچے لیکن روپیہ ان کی جیبوں سے کھنچ کر باہر جاتا رہا مزدوروں کی حیثیت سے وہ مدتوں تک بغیر قانون مزدوری کی حفاظت کے بدیسی سرمایہ داروں کے رحم وکرم پر رہے اور یورپ کے مزدوروں کے مقابلہ میں جنہوں نے اپنے آپ کو منظم کرلیا تھا کہیں زیادہ استحصال کا شکار ہوئے غرض کچھ تو حکومت کی بالقصد پالیسی کچھ اس کی بے پروائی اور اس سے بھی زیادہ خود ہندوستانیوں کی جہالت اور بے حسی کی وجہ سے جدید معاشی نظام ملک میں اس طرح آیا کہ اس کی کل بدیسی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھی اور اس کے ساتھ وہ تحفظات نہ تھے جو یورپ میں اس کے مضر اثرات کو ایک حد تک روکنے کے لئے وضع

کئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً اس کا سارا فائدہ انگریزوں کو پہنچا اور ہندوستان کو بجائے فائدے کے نقصان ہوا وہ مجموعی طور پر بدستور عہد وسطیٰ کے زراعتی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتا رہا بلکہ جب دیسی صنعتیں مشینی صنعت کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے مٹنے لگیں تو ان لوگوں کو چھوڑ کر جو معدودے چند بڑے کارخانوں میں مزدوری کرتے تھے دستکار بھی کاشتکاری کی طرف ڈھلنے لگے اور اس ہجوم نے زراعتی زمین پر اتنا بوجھ ڈالا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی لیکن اس سے زیادہ تباہی کاشتکاروں میں اس وجہ سے پھیلی کہ ہندوستان اب تک زراعت میں عہد وسطیٰ کے فرسودہ طریقے استعمال کر رہا تھا۔ حالانکہ اب اس میدان میں بھی اُسے ترقی یافتہ ملکوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ دوسرے ملکوں میں زراعت کی پشت پر امداد باہمی کا سرمایہ تھا، سائنس تھی، تنظیم تھی۔ ہندوستان میں کاشتکار کی گردن پر جہالت سوار تھی اور مہاجن اور ملیریا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے ہر مقابلہ میں شکست ہوئی اس کی روئی اور اس کا گیہوں ادنیٰ درجہ کا سمجھا گیا اور بہت کم داموں پر بکا اس کا نیل کیمیاوی رنگوں کی برابری نہ کر سکا اور ختم ہو گیا حکومت نے اس کی مدد کے لئے بہت سی تدبیریں کیں زراعت کا محکمہ قایم ہوا۔ امداد باہمی کا محکمہ قایم ہوا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کھولا گیا، نمونے کے زراعتی فارم اور مویشیوں کی افزائش نسل کے فارم کھولے گئے زراعتی نمائشیں کی گئیں، مویشیوں کے میلے کئے گئے لیکن سول سروس کی بیدلی اور ادنیٰ ملازموں کی نالائقی اور بددیانتی کی وجہ سے بے حس اور جاہل کاشتکار ان چیزوں سے کوئی قابل ذکر فائدہ نہ اٹھا سکے کاشتکاروں کے افلاس جہالت اور قدامت پرستی کے باوجود زراعت کے نئے طریقوں کو پھیلانے کے لئے جس تبلیغی جوش اور بے غرض خدمت کی ضرورت تھی وہ بیرونی حکومت یا اس کے ہندوستانی ملازموں کے بس کی بات نہ تھی۔ اب رہے زمیندار جو اکثر صوبوں میں حکومت اور کاشتکاروں کے بیچ میں واسطے کا کام دیتے تھے انہوں نے جس طرح اپنے خالق مجازی یعنی انگریزوں کی دوسری توقعات پوری نہیں کیں اسی طرح یہ توقع بھی پوری نہ کر سکے کہ کاشتکاروں کی رہنمائی کر کے انہیں جدید زراعتی طریقوں سے کام لینے پر آمادہ کریں چنانچہ نئے حالات میں پرانے طریقوں کو برتنے اور چکی کے دو پاٹوں یعنی زمیندار اور مہاجن کے بیچ میں پسنے کی وجہ سے ہندوستان کے کاشتکار کی

حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔ اس کے بلاواسطہ اور بالواسطہ اثرات نے ملک کی عام معاشی سطح کو پست کردیا اور لوگوں میں ایک عام بےچینی پیدا کردی جس سے سیاسی شورش کو اور زیادہ تقویت پہنچی

ہم نے دیکھا کہ سیاست اور معیشت کے میدان میں دساوری انگریزی تہذیب نے ہندوستان کو عہد جدید کے رجحانات سے آشنا تو کردیا لیکن ان کی نشوونما کا موقع نہ دے کر ملک میں سخت ہلچل اور ابتری ڈال دی اسی طرح ذہنی زندگی کے میدان میں بھی نئی تہذیب کا حصہ مجموعی طور پر منفی اور تخریبی رہا اس نے ہندوستانیوں کے ایک بڑے طبقے میں خیال اور عمل کے جمود کو توڑکر ایک حرکت تو ضرور پیدا کردی لیکن اس حرکت کو کسی تخلیقی مقصد کی راہ نہ دکھا سکی اس کے اثر سے تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ماضی سے بیزار ہوگئے لیکن اپنے مستقبل کی تشکیل کا کوئی تصور نہ قایم کرسکے، بلکہ ایک بے ربط بے مقصد حال میں گرفتار ہوکر رہ گئے، انہوں نے اپنے آباو اجداد کی تقلید کا جوا گردن سے اتارنے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب ہوئے لیکن تقلید پرستی ذہن میں ایسی رچی ہوئی تھی کہ اس سے بدتر ذہنی غلامی میں گرفتار ہوگئے یعنی کالونی کے انگریزی کی زندگی کو دور سے دیکھ کر اس کی بری بھلی نقل کو انہوں نے اپنا تہذیبی نصب العین بنالیا۔

جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، انگریزی حکومت نے مغربی تہذیب کو ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ اختیار کیا یعنی تعلیم کا ایک نیا نظام قایم کرکے اُسے ہندوستانیوں کے اونچے اور متوسط طبقے میں پھیلانے کی کوشش کی۔ آئیے اب اس تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈال کر دیکھیں کہ اس کی تہذیبی قدر کتنی تھی اور یہ کس حد تک ہندوستان کے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی نشوونما میں مدد دے سکتی تھی۔

جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے حکومت کو اس سے بہت کم دلچسپی تھی اس نے اس کی مالی اور انتظامی ذمہ داری زیادہ تر ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں پر ڈال دی! البتہ نصاب کے بنانے اور مدرسوں کے معائنے کا کام اپنے محکمہ تعلیم کے ہاتھ میں رکھا قدیم نظام میں بنیادی تبدیلی ایک تو یہ ہوئی کہ مذہبی تعلیم مدارس عامہ سے خارج ہوکر صرف پرائیویٹ مکتبوں اور

پاٹ شالاؤں میں رہ گئی اور سرکاری مدد سے محروم ہونے کی وجہ سے روز بروز کم ہونے لگی دوسری یہ کہ نصاب میں جغرافیہ تاریخ وغیرہ کے معید مضامین کا اضافہ اور مدرسوں کے لئے ٹریننگ کا انتظام کیا گیا۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے جو شرائط عائد کی گئیں ان کی وجہ سے ابتدائی تعلیم کا معیار تو مزور را و بچا ہو گیا۔ لیکن چونکہ ان شرائط کو پورا کرنے کے لئے زیادہ روپے کی ضرورت تھی اور وہ مقامی مجالس اور دوسری تعلیمی ایجنسیوں کے پاس نہیں تھا اس لئے مدرسوں کی تعداد بہت محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ مدت تعلیم کی کمی، طریقہ تعلیم کی خامی اور انتظام کی خرابی کی وجہ سے یہ محدود تعلیمی کوشش بھی زیادہ تر ضائع ہی ہوتی رہی۔

ثانوی مدارس میں بھی انیسویں صدی کے مغربی تصورات کے مطابق انفرادی رجحانات کا لحاظ کئے بغیر سب کے لئے یکساں نصاب تعلیم لبرل ٹائپ کا رکھا گیا۔ اس سے زیادہ ستم یہ ہوا کہ ذریعہ تعلیم انگریزی زبان کو بنایا گیا۔ اس بنیادی غلطی نے تعلیم کے سارے نقشے کو بگاڑ دیا۔ کچی عمر کے ہندوستانی بچوں کو اتنی انگریزی سکھانے کے لئے کہ وہ کل مضامین اس کے ذریعہ پڑھ سکیں اور امتحان کے پرچوں کا جواب اس میں دے سکیں انگریزی زبان کو نصاب کا جزو اعظم بنانا پڑا اور دوسرے مضامین ادب و تاریخ وغیرہ کو جو لبرل تعلیم کی جان ہیں ضمنی حیثیت دینی پڑی جس کی وجہ سے نصاب کا ذہنی معیار اور اس کی تہذیبی قدر بہت کم ہو گئی یہی بات یونیورسٹی کی تعلیم پر صادق آتی ہے صرف اتنا فرق تھا کہ یہاں مضامین میں زیادہ تنوع تھا اور انتخاب کا موقع بھی زیادہ تھا۔ سب سے بڑا نقصان غیر زبان میں پڑھنے پڑھانے سے یہ ہوا کہ استادوں اور شاگردوں کے ذہن کو لفظ اور معنی میں مطابقت پیدا کرنے کی عادت نہیں رہی اور وہ وضاحت خیال اور صحت ادا سے محروم ہو گئے۔ بے سمجھے ہوئے رٹنے کی عادت پہلے بھی کم نہ تھی اب بہت عام اور بہت پختہ ہو گئی سائنس کی تعلیم اور فنی تعلیم میں جو لبرل تعلیم کے مقابلہ میں بہت کنجوسی سے دی جاتی تھی۔ یہ بنیادی خرابیاں اور بھی زیادہ محسوس ہوتی تھیں۔ فارمولا رٹنے والے توتوں کی حالت شعر پڑھنے والے توتوں سے بھی زیادہ ابتر تھی۔

اگر اس کے باوجود انگریزی تعلیم نے بہت سے قابل ہندوستانی پیدا کئے تو اس کا سہرا نظام تعلیم کے سر نہیں بلکہ یہ منفرد انگریز اور ہندوستانی استادوں کے حسنِ تعلیم اور شاگردوں کی غیر معمولی ذہانت اور اپج کا کمال ہے ورنہ انگریزی تعلیم پانے والوں کا عام ٹائپ ذہنی حیثیت سے ان لوگوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا جو قدیم مشرقی طرز کی تعلیم پاتے تھے اس میں شک نہیں کہ انگریزی خوان عالم انسانی اور عالم طبعی کے متعلق تازہ تر اور صحیح تر معلومات رکھتے تھے لیکن وہ بھی مشرقی مدارس کے طلبہ کی طرح اس معلومات کو بغیر چبائے نگلتے تھے اس لئے ہضم نہیں کرسکتے تھے ان کے قوائے ذہنی میں بھی صرف حافظے کی قوت کو ابھرنے کا موقع ملتا تھا غور و فکر تنقید و تحقیق کی قوتیں اور علم کے عملی استعمال یعنی اس سے مسائل زندگی کے حل میں کام لینے کا مادہ دب کر رہ جاتا تھا لیکن یہ فرق ضرور تھا کہ تعلیم کا جو مقصد عموماً انگریزی خوانوں کے سامنے تھا کہ کلرکوں اور ماتحت افسروں کی حیثیت سے انگریزوں کے نیچے کام کرسکیں اس میں وہ کامیاب تھے ان کی تعلیم انہیں کاغذات کی نقل واقعات کے اندراج نقشوں کی ترتیب احکام کی تعمیل ہدایات کی پابندی، غرض ان سب مکانی کی اعمال کے لئے بہت اچھی طرح تیار کردیتی تھی جن میں قوتِ حکم اور قوتِ ارادہ کی ضرورت نہیں پڑتی بازار میں ان کی مانگ تھی اور ملک کی معاشی حالت دیکھتے ہوئے اچھی خاصی قیمت پر بک جاتے تھے، جن لوگوں کی سرکاری نوکری میں کھپت نہیں ہوتی تھی وہ زیادہ تر وکالت اور کم تر دوسرے آزاد پیشوں کی طرف رخ کرتے تھے۔ ان میدانوں میں جہاں اعتماد نفس اور اپج کی ضرورت تھی چند انے گنے امرا کو چھوڑ کر باقی سب بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹتے تھے، جیسے جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی ان سب پیشوں خصوصاً وکالت میں مقابلہ سخت ہوتا گیا اور جو اس مقابلہ میں ناکام رہے ان کو بے روزگاری منہ پھیلائے نگلتی چلی گئی۔

یہ لوگ ہندوستان میں عہد جدید کے ہراول اور دساوری انگریزی تہذیب کے علم بردار تھے اور انھیں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ اپنے ذہن کو مغرب کی نئی روشنی سے منور کر کے سارے ملک میں اُجالا پھیلائیں گے۔ اس بات کا اندازہ کرنے سے پہلے کہ تہذیبی زندگی کے مختلف

شعبوں میں ان حضرات نے کیا سیکھا اور کیا سکھایا ہمیں ان دشواریوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جو ان کی راہ میں حائل تھیں، ایک تو یہ کہ جو مقصد ان کے استادوں نے ان کے لئے متعین کیا تھا کہ اپنی قدیم تہذیب سے قطع تعلق کر کے ایک بدیسی تہذیب کے رنگ میں رنگ جائیں وہ قوموں کے طبعی ارتقا کے خلاف ہونے کی وجہ سے نہایت مشکل تھا دوسرے یہ کہ جیسا ہم اوپر کہہ چکے ہیں خود ان کے استادوں اور ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کو مغربی تہذیب کی اعلیٰ اقدار میں بہت کم حصہ ملا تھا اور اُسے شاگردوں تک پہنچانے میں ان کی سماجی علیحدگی حائل تھی۔ تیسرے یہ کہ تعلیم کے ناقص نظام نے شاگردوں میں جدت اور اپج کا تو کیا ذکر ہے تقلید میں بھی تمیز اور سلیقے سے کام لینے کا مادہ پیدا نہیں کیا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود جس حد تک وہ مغربی تہذیب کا چربا اتارنے میں کامیاب ہوئے وہ کم سے کم ان کے جوش تقلید اور محنت کا ثبوت ضرور ہے جہانتک فکر و نظر کا تعلق ہے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے بنیادی افکار کا بالکل غلط تصور قایم کیا اور اسے دلیل راہ بنا کر گمراہی میں پڑ گئے، انگریزوں کو رسمی مذہب سے بدظن اور زندگی کے مادی اقتدار کا قائل دیکھ کر وہ بہ زعم خود ان کی تقلید میں ملحد اور مادہ پرست بن بیٹھے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ انگریزوں کی ظاہری مادیت حقیقت میں پیوریٹنزم کے شدید مذہبی اور اخلاقی ضابطے کی ایک نئی شکل ہے اسی طرح انگریزوں کے فلسفہ انفرادیت کی تعبیر انہوں نے تہذیب نفس کے بجائے انانیت کے اور فلسفہ افادیت کی تعبیر اقتصادی واقعیت پسندی کے بجائے زر پرستی کے رنگ میں کی انگریزوں پر اگر مذہب عیسوی کا روحانی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ تو حُبِ وطن اور حُبِ قوم کے اخلاقی اثرات اور ایک حد تک فنون لطیفہ اور ادب و شعر کے جمالی اثرات ان کے نفس میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتے تھے۔ مگر انگریزوں کے یہ اندھے مقلد صرف اپنے قدیم مذہب و اخلاق ہی سے نہیں بلکہ اپنے آرٹ اور ادب سے بھی بیزار تھے اور قومی اور ملکی احساس سے بیگانہ۔

مغربی فنون لطیفہ سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ تو کیا خود وہ لوگ بھی جو مانوس نہیں

رکھتے تھے جو انگلستان جاکر تعلیم پاتے تھے اس لئے کہ یہ دولت ارباب ذوق کی صحبت سے نصیب ہوتی ہے اور اس سے یہ محروم تھے، ہندوستان میں تو ارباب ذوق کا حلقہ تھا ہی نہیں انگلستان میں تھا۔ مگر ان کی پہنچ سے باہر تھا اب رہا انگریزی ادب اس کی چند انی گنی کتابوں کے مطالعہ میں ان کو اپنی عمر کا ایک اچھا خاصہ حصہ یعنی طالب علمی کا پورا زمانہ صرف کرنا پڑتا تھا، مگر تعلیم کے ختم کرنے کے بعد یہ کسی معقول ادبی کتاب کو اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ عموماً معمولی درجہ کے تفریحی ادب مثلاً رینالڈس رائڈر ہیگرڈ۔ چارلس گاروس۔ میری کوریلو۔ بیرنس۔ آ کنڑلی کی تصانیف اور جاسوسی ناولوں تک محدود رہتا تھا شاذونادر ہی کسی کو انگریزی ادب عالیہ خصوصاً انگریزی شاعری سے اتنا قلبی تعلق پیدا ہوتا تھا کہ اس کے اندر ڈوب کر اپنے انفرادی وجود کو نوع انسانی کے رنج و راحت میں کھو دے غرض عام طور پر تعلیم یافتہ ہندوستانی کا ذہن انگریزی فکر اور تخیل کی سطح پر اُترتا رہا اور اس سے محض خود غرضی بے رنگ بے رس بے کیف خود پرستی کے سوا کچھ نہ حاصل کر سکا۔

ظاہر ہے کہ جب دساوری انگریزی تہذیب کے حامل ہندوستانی انگریزوں کے ذہنی اور جمالی خزانے سے لطف اور فیض ہی نہ اٹھا سکے تو وہ اس میں تخلیقی اضافہ کیا کر سکتے تھے علوم صحیحہ کے میدان میں دیکھئے یا شعر و ادب کے یا فنون لطیفہ کے اگر اس دور میں کچھ کیا ہے تو اُن ہندوستانیوں نے جن کے ذہن کی تربیت دراصل مشرقی تہذیب کے ماحول میں ہوئی تھی انہوں نے اپنے فلسفے اور مذہب اپنے قانون اور رسم و رواج اپنی تاریخ اور آثار قدیمہ پر دیسی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی کتابیں لکھیں اپنی موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ کو نئے حالات سے مطابقت دینے اور نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی صرف انگریزی پڑھے مغرب زدہ حضرات کا جو نئی تہذیب کے اصلی حامی بنے تحقیق حق یا تخلیق حسن میں کوئی حصہ نہ تھا ان کے قلم کی جولانی زیادہ تر اخباروں کے مضامین تک محدود تھی جن کے بہترین نمونے اینگلو انڈین اخباروں میں جگہ پانے کی عزت حاصل کرتے تھے۔ عموماً یہ مضامین ان انگریزی

اخباروں میں چھپتے تھے جو ہندوستانیوں کے زیرِ ادارت تھے، ان کی لفاظی، پریشان خیالی۔ ژولیدہ بیانی، صرف ونحو اور محاورے کی غلطیوں کی وجہ سے انگریز ان کی بابو انگلش کا مذاق اڑاتے تھے۔ بابو جبرجی بی۔ اے۔ اور بابو بیجی لال ایم۔ اے وغیرہ کے فرضی کردار اسی مقصد کے لئے تراشے گئے تھے۔

غرض دساوری انگریزی تہذیب کی ذہنی اور روحانی بنیاد بالکل کھوکھلی اور ناپائدار تھی پھر بھی اس پر تمدن و معاشرت کی جو عمارت بنی تھی وہ دیکھنے میں خاصی شاندار اور انگریزوں کی زندگی کے قصر رفیع سے بہت کچھ مشابہ معلوم ہوتی تھی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی انگریزی وضع کا لباس پہنتے تھے۔ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے تھے نوکروں سے، غیر انگریزی دانوں سے اپنے نزدیک ولایتی لہجہ میں دیسی زبانوں کو توڑ مروڑ کر بیچ بیچ میں انگریزی لفظ اور فقرے ٹھونس کر بولتے تھے جن کو مقدرت تھی وہ بنگلوں میں رہتے تھے اور انہیں انگریزی طور سے سجاتے تھے۔ میز کرسی پر چھری کانٹے سے انگریزی کھانا کھاتے تھے۔ انگریزوں کے کلب کو دور سے باحسرت دیکھتے ہوئے دیسی صاحب لوگ اپنے کلب میں بلیرڈ ٹینس۔ تاش کھیلتے تھے اور جو ان میں زیادہ آزاد تھے وہ یورپی شراب سے اور اگر کوئی آزاد خیال خاتون ساتھ دے تو یورپی رقص سے شغل کرتے تھے۔ ادب آداب نبھاؤ اور برتاؤ میں بھی یہ حضرات حتی المقدور انگلش ایٹی کیٹ کی پیروی کرتے تھے۔

لیکن غور سے دیکھنے سے صاف نظر آتا تھا کہ ہر بات میں ہر چیز میں انگریزی تہذیب کی ہندوستانی نقل اصل سے بہت دور ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تقریر ملی انگریزی بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں ہوتی تھی۔ تحریر میں تو صرف زبان و بیان ہی کی غلطیاں تھیں، بولنے میں تلفظ کی غلطیاں اور ستم ڈھاتی تھیں خصوصاً جب وہ دیسی آلات نطق سے انگریزی لہجہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے تو عجیب وغریب آوازیں سننے میں آتی تھیں ان کا انگریزی لباس اکثر بھڑکدار کپڑے اور بھدی وضع کا ضرورت سے زیادہ ڈھیلا یا چست ہوتا تھا اور اسے انگلستان کی بچاک

سے جس کی خوش نما تراش اور آرام دہ موزونیت دنیا میں مشہور ہیں۔ کوئی نسبت نہ تھی کپڑوں کے میل اور رنگوں کے تناسب انھیں ڈھنگ سے رکھنے اور سلیقے سے پہننے کا دیسی صاحب لوگوں کے ذہن میں کوئی تصور نہ تھا اس معاملہ میں ان کا رہنما اکثر ان کا بیرا ہوتا تھا جیسے انگلستان کے ویلے کا ایک مضحک خاکہ سمجھنا چاہیئے ان کے بنگلے بارکوں کی وضع کے برآمدوں سے گھرے ہوئے تاریک کمرے تھے، یہ طرز جسے ہندوستان کے محکمہ تعمیرات کے معصوم ذہن نے آرٹ کی آلودگی سے پاک رہ کر محض آرام کے خیال سے ایجاد کیا تھا۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی اسٹائل کہلاتا تھا۔ مگر جتنی کامیابی اُسے حسن و تناسب سے بچنے میں ہوئی اتنی راحت و آرام پہنچانے میں نہیں ہو سکی۔ یہی بات کم و بیش ان مکانوں کے فرنیچر پر صادق آتی تھی۔ صرف ان کے کھانے کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں انگریزی مذاق کے ساتھ ہندوستانی مذاق کو سمو کر خاصا خوشگوار مزہ پیدا کیا گیا تھا۔ اگرچہ انگریزوں کے آداب طعام کی تقلید میں جو تکلف کرنا پڑتا تھا اُس سے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا تھا۔

جہانتک آدابِ معاشرت کا تعلق ہے یہ دیسی صاحب لوگ اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے میں بڑے اہتمام سے انگریزوں کی حرکات و سکنات کی ہو بہو نقل آتارنے کی کوشش کرتے تھے لیکن آداب مظہر ہیں انسان کی اندرونی سیرت کے یہ حضرات انگریزوں کی سی طبیعت اور مزاج تو رکھتے نہیں تھے اسلئے ان کی نقالی کی کوششیں اگر کامیاب ہوئیں تو کل کے پتلوں کی بے معنی جنبش اور ناکام رہیں تو بھانڈوں کی بے تکی حرکتیں معلوم ہوتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی آداب کی سطحی تقلید نے بعض صورتوں میں ان کے اخلاق کو بگاڑ دیا۔ انہوں نے انگریزوں کی کم آمیزی اور رکاوٹ سیکھی مگر وہ حجاب اور ضبط نہ سیکھ سکے جو اس کی تہ میں پوشیدہ تھا، اس لئے بڑے کل کھرے اور مغرور ہو کر رہ گئے انہوں نے انگریزوں کی طرح اظہار خودی اور اعتماد نفس سے کام لینا چاہا مگر انگریزوں کا سا احساس تناسب نہ رکھنے کی وجہ سے ان صفات نے تحکم اور خود نمائی کا رنگ اختیار کر لیا۔

یہ نقلی انگریزی تہذیب زیادہ تر مردوں تک محدود رہی، عورتیں اس سے بہت کم متاثر ہوئیں۔ لیکن جو ہوئیں انہیں مردوں سے بھی زیادہ نقصان پہنچا۔ ہندوستانی عورت دَورِ تنزل میں جہالت، بیماری

اور سماج کی بے جا قیود کی وجہ سے ایک اعصابی مزاج کی دبی دبائی مخلوق بن کر رہ گئی تھی انگریزی تہذیب نے اُسے بغیر ان تحفظ کی توتوں کے جو انگریز عورتیں رکھتی ہیں گوشۂ عافیت سے باہر کھینچ کر زندگی کی کشمکشوں اور تحریصوں میں ڈال دیا صرف اسکا پردہ ہی نہیں توڑا بلکہ وہ فصل جو ایشیا میں مردوں اور عورتوں میں ہمیشہ رہا ہے دور کر دیا صرف اسے گھر سے نکالنے پر اکتفا نہیں بلکہ کلب میں لے جا کر ناچنے کے لئے کھڑا کر دیا اس آزادی کے ناگوار نتائج کا ردِ عمل اور زیادہ افسوس ناک تھا۔ مغرب زدہ عورتوں کی مثال نے عام طور پر ہندوستانیوں کو عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی مصلحانہ اور ذمہ دارانہ تحریکوں سے بدظن کر دیا اور ان کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی۔

تعلیم یافتہ جماعت سے انگریزوں کو یہ امید تھی کہ یہ نئی روشنی کے پھیلانے میں مبلغوں کا کام کرے گی عوام کی تعلیم کو نظر انداز کر کے صرف اونچے اور متوسط طبقے کی تعلیم پر زور دینے کے حق میں یہ دلیل پیش کی گئی تھی کہ انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب اوپر سے مقطر ہو کر نیچے ٹپکے گی لیکن اوپر والے نہ اتنا ظرف رکھتے تھے اور نہ انھیں نیچے والوں سے اتنا تعلق خاطر اور ہمدردی تھی کہ ان غریبوں کو اپنے رشحات فیض سے سیراب کرتے۔ نئی روشنی کے مشعل بردار انگریزی تعلیم یافتہ نہ صرف ان پڑھ عوام سے بلکہ ان لوگوں سے بھی بالکل کٹ گئے تھے جنہوں نے پرانی تعلیم پائی تھی اور پرانی ڈگر پر چلتے تھے وہ عزیزوں میں بیگانہ ہو کر رہتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ مشرق و مغرب کے درمیان جو برزخ انہوں نے بنایا تھا اس میں وہ وطنی احساس اور قومی درد کے خرخشوں سے آزاد تھے بس ایک ہی خلش ان کے دل میں تھی اور وہ یہ کہ انگریزی سوسائٹی کی جنت کے دروازے ان پر بند تھے غرض ان حضرات نے انگریزی تعلیم اور تہذیب کو عوام تک پہنچانے کی ذمہ داری پورا کرنا تو ایک طرف اسے محسوس تک نہیں کیا یہ ہمہ تن حاکم قوم کی خوشنودی اور قربت حاصل کرنے میں مصروف رہے اپنی قوم کی خدمت اور اصلاح کا کام انہوں نے اوروں پر چھوڑ دیا جو تہذیب کی دوسری راہوں پر چل رہے تھے۔

تعلیم اور جماعتی کام

انسان کی ہدایت کے جو ذریعے ہیں، وہ اکثر ناکافی معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ کمی اصولوں کے علم میں نہیں ہوتی، اصول تو مذہب، اخلاق، تاریخ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوجاتے ہیں، جو بات سمجھ میں نہیں آتی، وہ یہ ہے کہ اصول کو روزمرہ زندگی میں کس طرح سمویا جائے اور اس کی کیا تدبیر کی جائے کہ انسانی طبیعت کی نشو ونما کے پورے امکانات موجود ہیں، مگر نمو کی قدرتی خواہش چھوٹی بڑی جماعتوں اور ساری انسانی برادری کے لئے خطرے پیدا نہ کرسکے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں معلوم اصولوں کے مطابق زندگی کا کوئی ایسا نظام مرتب کرنا ہے، جس میں افراد سب مصروف اور مطمئن رہیں، جماعتیں خوش حال ہوں اور انھیں ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کوئی بڑی خارجی رکاوٹیں محسوس نہ ہوں، جنھیں وہ اپنی ترقی کے لئے ضروری جانتی ہیں، نفسیات کے ماہر مختلف علامتوں اور مظہروں پر غور کرکے اس کا یقین دلا چکے ہیں، کہ بیشتر انسان مرکز پسند ہوتے ہیں، جماعتی زندگی اسی مرکز پسندی کے قدرتی میلان کا نتیجہ ہے، اور اس مرکز پسندی میں فائدے کے بھی بڑے امکان ہیں اور نقصان کے بھی۔ اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تخلیقی قوت کے حامل افراد ہوتے ہیں، افراد ہی اپنے وجدان کے ذریعہ حالات کا صحیح اندازہ کرکے اور اپنی شخصیت کی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لاکر ایسی تہذیبی اور سیاسی تحریکیں شروع کرتے ہیں۔ جو جماعت میں بے چینی اور حرکت یا اطمنان اور استقلال پیدا کرتی ہیں۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اگر انسانی طبیعت میں کوئی بہت بنیادی انقلاب نہ ہوگیا تو موجودہ جماعتی زندگی قایم رہے گی، مگر جماعتیں اقتدار اور رہنمائی کی محتاج رہیں گی۔ یہ اقتدار اور رہنمائی جمہوری

طرز کی ہوسکتی ہے یا فاشسٹ اور کمیونسٹ طرز کی۔ رہنمائی کے فرائض بے شمار حصوں میں تقسیم ہوسکتے ہیں، اقتدار محدود اور مشروط ہوسکتا ہے اور اس کے حامل بدلتے رہ سکتے ہیں یا کمیونسٹ اور فاشسٹ اصول پر سارا اختیار ایک پارٹی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں جماعت کی بہبودی اور ترقی کے لئے لازمی ہے کہ صرف مفید اور مضر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ و ادنیٰ میں تمیز کی جائے اور جماعت کو مفید اور اعلیٰ مقاصد کی طرف مائل کرنے کے لئے وہ تمام مستقل تدبیریں کی جائیں جو جماعت کے رہنما اختیار کرسکتے ہیں۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ ایسا کوئی معیار نہیں جس پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کیا جاسکے، عام طور پر لوگوں کا عمل ان کی خواہش یا پسند کے مطابق ہوتا ہے یعنی وہ اسی چیز کو اعلیٰ سمجھتے ہیں، جس کی انھیں خواہش ہے اور وہ کسی بہتر اصول سے متاثر ہوں، تب بھی زندگی کی تفصیلات میں خواہشوں کی عملداری رہتی ہے۔ بعض لوگ جن کی طبیعت زندگی کی راہوں پر بے سوچے سمجھے چلنا گوارا نہیں کرتی عمل کے نتیجوں کو دیکھتے رہتے ہیں، لیکن اسباب کا سراغ لگانا اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ لوگ نتائج کی بنا پر جو رائے قایم کرتے ہیں، وہ بہت کم ان کی اپنی رائے ہوتی ہے۔ دراصل وہ صرف اپنے غور و فکر یا تجربے سے ان دینی اور روائتی تعلیمات کی تصدیق کرتے ہیں، جنھیں صحیح تسلیم کرنا انہیں سکھایا گیا ہے۔ اس طرح دینی یا روائتی اصول غلط اور صحیح، ادنیٰ اور اعلیٰ میں تمیز کرنے کا تیسرا معیار ہیں۔ چوتھا معیار ان لوگوں کے خیالات اور اعمال ہیں، جن کی شخصیت یا تعلیم میں دوسروں پر اثر ڈالنے کی خاص صلاحیت ہوتی ہے، ایسے لوگ اچھے برے ہر طرح کے ہوسکتے ہیں اور ان کو جانچنے کی بڑی ضرورت ہے۔

خواہش، اصول اور مثال کے علاوہ انسان کے دو رہنما اور ہوتے ہیں۔ استعداد اور توفیق استعداد طبیعت کی ایک اہلیت ہوتی ہے جو انسان کو کسی خاص کام کے لئے موزوں بنا دیتی ہے اور اگر اس استعداد کی صحیح تربیت کی جائے تو انسان اپنی طبیعت اور اپنی زندگی میں مناسبت اور ہم آہنگی محسوس کرتا ہے اور اس سے طبیعت اور زندگی دونوں کو فروغ ہوتا ہے، لیکن استعداد کا اخلاق سے براہِ راست کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہوتا۔ استعداد کو بھی رہنما درکار ہوتا ہے۔ اور

یہ رہنما توفیق ہے۔ یہ ایک جبلی میلان ہے، مفید اور اعلیٰ چیزوں کی طرف، مگر استعداد کی طرح یہ بھی تربیت اور پرورش کا محتاج ہوتا ہے۔ توفیق ان قوتوں میں سے جو زندگی کا نقشہ بناتی اور بدلتی ہیں، سب سے زیادہ اہم اور موثر ہے اور دنیا میں جماعتوں کی حیثیت ان کے افراد کی توفیق ہی کا آئینہ ہوتی ہے۔ نفسیات کے ماہر اس تقسیم کو صحیح نہ مانیں گے مگر یہ زندگی کے مسائل کو سمجھنے کے لئے بہت کارآمد ہوسکتی ہے کہ ہم کہیں کہ انسانوں کی چار بڑی قسمیں ہیں، ایک وہ جو استعداد اور توفیق دونوں سے محروم ہوں، دوسری وہ جن میں استعداد ہو، توفیق نہ ہو، تیسری وہ جن میں توفیق ہو، استعداد نہ ہو اور چوتھی وہ جن میں دونوں صفتیں موجود ہوں۔ پہلی دو قسموں کے آدمی اعلیٰ اور ادنیٰ، مفید اور مضر میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ باقی دونوں قسم کے لوگ رہنما بن سکتے ہیں اور مقاصد کا صحیح انتخاب بھی کرسکتے ہیں لیکن ان سے بڑی غلطیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ اگر تعلیم کا مقصد اصلاح و ترقی اور اطمنان کی زندگی ہے تو اس کا خاص منصوبہ توفیق اور استعداد کی تربیت ہونا چاہئے۔ تاکہ افراد اور جماعت میں مفید اور اعلیٰ چیزوں کو حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہو اور استعداد اس حوصلے کو پورا کرتی رہے۔

معلّم کا یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ وہ ایسے نوجوانوں میں توفیق یا استعداد پیدا کرسکتا ہے، جنھیں قدرت نے ان صفتوں سے محروم کیا ہے لیکن دوسری طرف نفسیات کے وہ تمام دعوے بھی اسی قدر غلط ہیں جو مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں اور جن میں تعلیم اور تربیت کے امکانات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ تعلیم جو کچھ پیدا یا اُجاگر کرتی ہے وہ قدرت کی دین سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن یہ معلوم کرنا کہ قدرت نے کس کو کیا اور کتنا دیا ہے، تعلیم کا منصب ہے، اور انسانی طبیعت کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا اصل سبب یہ ہے کہ معلّموں اور درس گاہوں کی معذوری یا مجبوری نے انھیں اپنا فرض ادا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ معلّم نوجوانوں کی طبیعت کو سمجھ کر انھیں مناسب کاموں میں مصروف رکھ کر اور مثال اور ماحول کا پورا اثر ڈال کر افراد اور جماعت میں کتنی خود اعتمادی اور اہل توفیق میں کتنا ذوق عمل پیدا کرسکتا ہے، اس کا ابھی تک کوئی صحیح

اندازہ نہیں کیا گیا ہے اور جب تک تعلیم کو اپنا منصب پورا کرنے کا حق نہ دیا جائے، انسان کی طبیعت ایک معمہ اور انسانیت کا مستقبل ایک مبہم تصور رہے گا۔

تعلیم کا حق یہ ہے کہ معلم اور درس کو ان قدروں کے برتنے کا موقع دیا جائے، جو جماعت کی مخصوص دینی اور تہذیبی دولت ہیں اور اسی کے ساتھ اقدار اور زمانہ اور اقدار اور انسانی طبیعت میں مناسبت اور ہم آہنگی قایم رکھنے کی ضروری تدبیریں کرنے کا اختیار دیا جائے۔ تعلیم کو جماعت کے مذہب، تہذیب، تاریخ اور موجودہ حالات سے جدا کرنا، اس کی گردن مروڑ دینا ہے۔ مگر اسے رائج اصول اور انھیں برتنے کے طریقوں کا بالکل پابند کر دیا جائے تو درسگاہیں ذہن کے قید خانے اور امنگوں کے مقتل بن جاتی ہیں، معیاری انسان، معیاری جماعت اور معیاری زندگی محض تصورات نہیں ہیں بلکہ ایک روشنی ہے جس کی طرف طبیعت حسب توفیق لپکتی ہے، اور یہ روشنی نہ رہے تو نمو کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ تعلیم کا اگر عام منصب یہ ہے کہ وہ جماعت کی اعلیٰ قدروں کو قایم رکھے تو اس کا خاص منصب یہ ہے کہ وہ موجودہ قدروں کا معیاری قدروں سے مقابلہ کرتی اور معیار کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرتی اور کراتی رہے۔

جماعت کی قدریں اتنی ہی مختلف قسموں کی ہوتی ہیں، جتنی کہ جماعت نے ترقی کی ہو اور جتنا تنوع اس کی زندگی میں ہو۔ لیکن جو بنیادی بات نظر میں رکھنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ جماعت قایم ہوتی ہے ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اور قایم رہتی ہے، اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کرنے کی خاطر۔ جب تک ضروریات کو پورا کرنے کا کوئی سلسلہ قایم نہ ہو، جماعت بن نہیں سکتی، اور اس کے بننے کے بعد بھی اس سلسلے کا جاری رہنا لازمی ہے۔ جماعت کے مخصوص عقائد اور اصول، اس کی ذہنی اور تہذیبی خصوصیات ان تدبیروں اور طریقوں میں ظاہر ہوتی ہیں، جو ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں اور اس معیار میں جس کے مطابق اعلیٰ اور ادنیٰ اہم اور غیر اہم میں فرق کیا جاتا ہے اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اخلاقی اور سیاسی شعور کی نشو و نما کے ساتھ ان عقائد اور اصولوں کی اہمیت بڑھتی گئی ہے، جو جماعتی زندگی کی بنیاد مانے جاتے ہیں اور جن کے مطابق

افراد کے حقوق اور فرائض کا تعین کیا جاتا ہے، کام اس طرح سے تقسیم کئے جاتے ہیں اور پیشوں کی ایسی تنظیم کی جاتی ہے کہ جماعت کی ضرورتیں کسی نئی اور عدل سے قریب تر صورت سے پوری ہوں گویا جماعت کے کام اس کی مخصوص قدروں کی ترجمانی کرتے ہیں اور انھیں کی بدولت یہ قدریں رائج ہوتی ہیں۔ ان کاموں کے لئے اصطلاحی لفظ "عمل" ہے۔ عمل کا میدان اتنا ہی وسیع ہونا چاہئے جتنا کہ اصول کا اور یہ سمجھا جانا چاہیئے کہ جماعت اپنے اصول پر اسی وقت تک کار بند رہتی ہے، جب تک کہ زندگی کے ہر شعبے میں اصول اور عمل جسم اور جان کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ رہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک طرف وہ لوگ جنھیں سیاسی اقتدار حاصل ہوتا ہے، حقوق اور فرائض کی تقسیم کو اپنے مفاد کا ایک ذریعہ اور اپنی حکومت کا آلہ بنا لیتے ہیں اور دوسری طرف دینی رہنما یکسوئی کی خاطر "عمل" کے مفہوم کو اس طرح محدود کر دیتے ہیں کہ وہ ایک دینی اصطلاح بن جاتا ہے اور اس کا ان دماغی اور جسمانی کاموں سے کوئی تعلق نہیں رہتا، جو دراصل جماعت کی مخصوص تنظیم کی اساس اور اس کی تہذیب کی جان ہوتے ہیں، سیاسی حاکم اپنے حق سے زیادہ اختیار اور دولت اس وجہ سے حاصل کر لیتے ہیں کہ لوگوں کو جان اور مال کی محبت ہوتی ہے اور ان دونوں کی حفاظت سیاسی اقتدار کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ دینی رہنما سیاست اور معیشت سے اس بنا پر کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ ان کی طبیعت اس جبر کو گوارا نہیں کرتی، جو حاکم اپنی مصلحت کی خاطر کرتے ہیں اور خود حکومت کرنے کی صلاحیت دینی رہنماؤں میں ہوتی نہیں ہے۔ سیاسی اور معاشی نظام میں خرابیاں پیدا ہونے کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ زندگی میں کام کی مرکزیت محسوس اور نمایاں نہیں ہوتی۔ کسان، زمیندار اور حاکم لگان وصول کرتے ہیں تو وہ یہ نہیں سوچتے کہ جماعت کے نظام میں کسان کا کیا مقام اور مرتبہ ہے، اور کسان لگان ادا کرتا ہے تو اسے اپنی مصیبت کا احساس ہوتا ہے، اپنی منصب کا نہیں ہوتا، اسی طرح صنعتی اور تجارتی پیشوں کو برتنے والے اپنے فائدے کو سمجھتے ہیں، اپنے اصل منصب پر غور نہیں کرتے۔ جماعتی نظام کے مسائل پر جو بحث کی جاتی ہے، وہ بھی تصورات اور اصطلاحوں میں نظر بند رہتی ہے۔ اس لئے کہ تصورات کے

دائرے سے باہر نکلنا مفکروں اور عالموں کی شان کے خلاف ہوتا ہے، اصل حقیقت جو اس قدر ادنیٰ سمجھی جاتی ہے کہ کوئی اسے بیان نہیں کرتا، یہ ہے کہ زندگی کا باغ محنت کے پسینے سے سینچا ہے اور دل اور دماغ کو تازگی صرف اس نیند سے نصیب ہوتی ہے جو محنت کرنے والوں کا حصہ ہے۔

آج کل جماعتوں میں کام کی مرکزیت اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب کوئی بڑا خطرہ پیدا ہوتا ہے، یعنی جنگ کی حالت میں۔ جنگ ہوتی ہے تو افراد کی بہت بڑی اکثریت ضروری کاموں کو خوبی کے ساتھ انجام دینے میں مصروف ہو جاتی ہے اور وہ سب دیکھتے ہیں کہ کام میں محو ہو جانے سے ان کی جمعیت کو جو فروغ ہوتا ہے اور خود انھیں جو تسلی حاصل ہوتی ہے، وہ اور کسی طرح میسر نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے ہیگل نے اپنے سیاسی مذہب میں جنگ کی کیفیت کو افراد اور جماعت کی معراج کا مرتبہ دیا ہے لیکن جمعیت کے احساس کی قیمت جنگ ہو تو یہ سودا اچھا نہیں ہے، اور سوا اس کے کہ قوموں کی طبیعت یا ان کی سیاست کو کوئی روگ لگ جائے، وہ حتی الامکان جنگ سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چاہے اس سے جمعیت کا احساس کچھ کمزور ہی کیوں نہ رہے۔

کام پر مبنی جماعت بندی کا ایک اور نمونہ سرمایہ داری نظام کا دفتر اور کارخانہ ہے۔ دفتر سے یہاں مراد کاروبار کی وہ قسمیں ہیں جن کا کام زیادہ تر دفتری ہوتا ہے اور کارخانے میں وہ تمام صنعتی ادارے شامل سمجھنا چاہئے جن کا مقصد مال تیار کرنا ہوتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے ادارے مخصوص کاموں کے انجام دینے کے لئے قایم ہوتے ہیں، ان کا معیار کارپردازی ہوتی ہے اور یہ اشتراک عمل کی خوبی کے لحاظ سے کامیاب ہوتے ہیں، ان اداروں میں کام کرنے والوں کے ذہن پر ادارے کا مفاد حاوی ہوتا ہے، وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑی کل کے پرزے ہیں اور انھیں اس خیال سے اتنی تسکین ہوتی ہے کہ وہ کل کو چلاتے رہنے کی خاطر کام کو عبادت اور عبادت سمجھ کر کرنے لگتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو اس پر قربان کرتے رہتے ہیں، مگر اشتراک عمل کے ان نمونوں میں بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف منافع حاصل کرنے کی غرض سے

قایم ہوتے ہیں، جماعت کا مفاد ان کے لئے محض ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے یا کوئی حیثیت رکھتا ہی نہیں۔ ان میں صرف وہ چند اخلاقی قدریں برتی جاتی ہیں جن کی بدولت کام میں سہولت پیدا ہوتی ہے اور منافع میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی منافع پر ضرورت کے وقت جماعت کی اعلیٰ قدروں اور افراد کی استعداد اور توفیق کو بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ داروں کے حوصلے اور سرمایہ داری نظام کی چند خوبیوں کی بدولت دنیا کے بعض ملکوں نے بہت ترقی کی ہے لیکن سرمایہ داری کی وجہ سے سیکڑوں نئے فتنے بھی پیدا ہوئے ہیں، قدروں کا توازن بالکل بگڑ گیا ہے۔ انصاف اور مساوات کے تصور بے معنی سے ہو گئے ہیں اور دنیا کی کمزور قوموں کو بڑے سخت صدمے پہنچے ہیں اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک سرمایہ داری کو اعلیٰ قدروں کا خادم نہ بنایا جائے یا اسے مٹا نہ دیا جائے اس وقت تک ترقی کی بہت سی راہیں بند رہیں گی۔

کام کی مرکزیت کو نمایاں کرنے اور اعلیٰ اجتماعی قدروں کی خدمت کرنے کے لئے تعلیم گاہ سے زیادہ موزوں کوئی ادارہ نہیں ہو سکتا، لیکن ابھی تک تعلیم گاہوں نے اپنے منصب کو قبول نہیں کیا ہے اور ساری دنیا میں گنتی کے چند ادارے ایسے ہوں گے، جنہوں نے اشتراک عمل اور کارپردازی کا نمونہ بننے اور اعلیٰ جماعتی قدروں کی خدمت کرنے کا حوصلہ کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تعلیم حکومت کے محکموں میں سے ایک محکمہ ہے، تعلیم کا تصور محدود اور اس کے مقاصد مبہم ہیں اور جماعت، مدرسہ، معلم اور طالب علم کا جو صحیح رشتہ ہے، وہ اگرچہ معلوم کر لیا گیا ہے مگر قایم نہیں کیا جا سکا ہے۔ اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جماعت مخصوص عقائد اصول روایات، تہذیب کا مجسمہ ہوتی ہے اور تعلیم صحیح اسی وقت ہوتی ہے، جب متعلم اپنی طبیعت اور شخصیت سے مناسبت رکھنے والی [illegible] کو اپنا سکے، ان کا عامل بن جائے اور انھیں برت سکے۔ متعلم کی استعداد یہ دیکھ کر پہچانی جاتی ہے کہ اس میں کن خاص قدروں کو قبول کرنے اور برتنے کی صلاحیت ہے اور اس کی توفیق کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنی انفرادیت اور اپنی استعداد کو جماعتی اور انسانی قدروں کا خادم بنانے پر آمادہ ہے۔ معلم کا منصب یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ تعلیم کے صحیح اصول اور

طریقے پر عمل کرے اور متعلم کو وہ نسخہ پہنچائے، جو اس کا حق ہے، مگر معلم ابھی تک محکمۂ تعلیم کے قاعدے قانون کا پابند ہے اور اپنے کاموں پر اتنا ہی خرچ کرسکتا ہے، جتنا کہ اور محکموں کی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد اس کے لئے بچایا جاسکے، کوئی تعجب نہیں کہ اچھے معلم بھی اپنے کام کو نصاب تک محدود رکھتے ہیں چمن کی وسعت کو دیکھتے ہیں مگر اپنے پنجرے سے نہیں نکلتے۔

لیکن ترقی پسند ملکوں میں تعلیم کا جو تصور رائج ہو رہا ہے، اس نے ایسے تعلیمی اداروں کے لئے زمین تیار کر دی ہے جن کا نصاب یہ حوصلہ ہو کہ صحیح اجتماعی زندگی کا نمونہ بنیں۔ ایسے ادارے صرف وہ استاد قائم کرسکتے ہیں جنھیں کام کی لگن متحد اور متفق کرے، جو آزاد رہنا چاہیں اور اپنے اس کام کو جو آزادی سے منتخب کیا جائے اور ایک خاص مقصد کے ماتحت کیا جائے اور تمام مشغلوں پر ترجیح دیتے ہوں، جنھیں اپنی بنائی ہوئی زندگی کا دھندلا اور نامکمل خاکہ بھی ان بنے بنائے نقشوں سے زیادہ عزیز ہو جن کی ہر لکیر کو وقت اور عادت نے پختہ کر دیا ہو۔ اصل میں یہ استاد ان داخلی اور خارجی قدروں کے حامل ہوں گے، جو ان کی جماعتی زندگی میں مضمر ہوں گی اور وہ کوشش کریں گے کہ دنیا کی ہر ترقی پسند جماعت کے علم اور تجربے سے فائدہ اٹھائیں، ان کا فکر ان کے عمل کا پابند ہوگا اور ان کا عمل ان کے وسائل کا، لیکن ان کے دل بالکل آزاد ہوں گے اور وہ کسی کا دامن پکڑ کر نہیں بلکہ اپنے شوق سے توفیق کے ان سرچشموں تک پہنچیں گے جنھوں نے ان کی جماعت کی زندگی کو سیراب کیا ہے۔ یہ استاد کام کی دشواریوں اور وسائل کی کمی سے مایوس نہ ہوں گے۔ ان کی حالت اس ذہین بچے کی سی ہوگی جو طاقت ور بننا چاہتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ جتنی طاقت وہ چاہتا ہے، اس کے جسم میں پیدا ہو جائے گی، مگر یہ بھی جانتا ہے کہ ابھی اس میں یہ طاقت موجود نہیں ہے، اس طرح وسائل کی کمی ان استادوں میں کمزوری یا محرومی کا احساس پیدا نہ کرے گی اور انھیں اس کی بھی کوئی شعوری یا غیر شعوری خواہش نہ ہوگی کہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو مغالطے میں رکھیں۔

یہ استاد، جنھیں کام کا شوق یکجا کرے گا، آزادی کے بغیر اپنی جمعیت کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ شریف خارجی پابندیوں کو ہر حالت میں بڑی بددلی سے گوارا کرتا ہے، اور جو لوگ اپنے دل و جان کو کسی

شوق کے حوالے کردیں، انھیں اس کا یقین ہونا چاہیئے کہ یہ قربانی انہوں نے جان بوجھ کر اور اپنے ارادے سے کی ہے۔ جو استاد تعلیم اور جماعتی کاموں کے درمیان ایک نیا رشتہ قایم کریں، ان کا حق ہے کہ اپنی انجمن کو حکومت کے تعلیمی نظام سے الگ رکھیں، اپنی ضرورت اور مصلحت کو دیکھ کر قاعدے قانون بنائیں، اور ان کی اس آزادی کو محدود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ استادوں کی اس انجمن کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ خود مختار رہو، اپنے کام کو اپنے طریقے پر اور اپنے اراکین کے ذریعے انجام دے اور جو لوگ انجمن کے رکن نہ ہوں اور کسی کام کے ذمہ دار نہ ہوں، انھیں کسی قسم کی مداخلت کا اختیار نہ ہو۔ اس میں جماعت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے، استادوں کی انجمن اپنے شوق اور اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے جماعت کو خود ہی دعوت دے گی اور اس کے کاموں کو سمجھے اور جانچے اور انھیں ترقی دینے میں مدد کرے گی استاد اگر سچا شوق رکھتے ہوں گے تو وہ مدد کے ساتھ آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ بغیر کسی تامل کے کریں گے اور جماعت قدر شناس ہوئی تو اس مطالبہ کو خوشی سے منظور کرے گی۔ اس طرح اس کی امداد مشروط نہ ہوگی، وہ کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھائے گی اور انھیں پابند نہ کرے گی۔

تعلیم کے ذریعوں میں شاید سب سے زیادہ موثر استاد کی شخصیت ہوتی ہے، اور جو استاد تعلیم کو جماعتی کاموں سے مربوط کرنا چاہیں گے وہ اس پر ضرور اصرار کریں گے کہ طالب علم ان کے ساتھ رہ کر ان کی زندگی اور ان کی شخصیت سے اثر لیں۔ تعلیم میں کام سے کام اسی طرح نکلتے ہیں جیسے بڑھتے ہوئے پودے میں سے کلّے پھوٹتے ہیں اور جو استاد چاہتے ہوں کہ ان کے کام حسب ضرورت بڑھائے جائیں۔ وہ اپنی تعلیمی بستی الگ بسانا پسند کریں گے۔ اس میں ان کا منشا یہ نہ ہوگا کہ جماعت سے حتی الامکان کم تعلق ہو تعلق کا ہونا نہ ہونا بہرحال دل اور نیت پر منحصر ہے، اور ہندوستان میں بے شمار ایسے تعلیمی ادارے ہیں جن کا مقام شہروں کے اندر ہے، مگر جماعتی زندگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں تعلیمی بستی الگ بسانے میں بہت سے جماعتی کام جو شہروں میں میونسپل اور سرکاری محکموں کے ذریعے انجام پاتے ہیں بستی والوں کو خود کرنے ہوں گے اور وہ اپنے انتظام کی خوبی سے آرام حاصل کرکے اس کی خرابیوں سے تکلیف اٹھا کر کام کی مرکزیت کو محسوس کرتے رہیں گے۔ نوجوانوں کے لئے یہ بہت مفید تجربہ ہوگا، وہ اپنے ملک اور

اپنے شہر کے انتظامات کو اس نظر سے نہ دیکھیں گے کہ جو کچھ ہوا اسے غنیمت سمجھیں، بلکہ ہر کام کو جانچیں گے اور اس کا مطالبہ کرتے رہیں گے کہ ہر کام سلیقے سے اور وقت پر کیا جائے۔ تعلیمی بستی کے بہت سے جماعتی کام وسائل کی کمی کی وجہ سے سہولت کے ساتھ اور اس خوبی سے انجام نہ پاسکیں گے، جو صرف بڑے شہروں میں ممکن ہے، لیکن خود استاد ہمت نہ ہارے تو تعلیمی بستی کی خامیاں بے حسی کا وہ اطمینان نہ پیدا کریں گی جو ہندوستان اور دنیا کے اور بہت سے ملکوں میں ایک رکاوٹ بن گیا ہے، بلکہ ان کی وجہ سے نظر بلند اور حوصلہ چُست ہو جائے گا۔

یہاں تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کا موقع نہیں کہ تعلیمی بستی کو کیا کرنا چاہئے کہ اس کی زندگی میں کام کو مرکزی حیثیت حاصل ہو، اور یہ کام آمدنی اور ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ تعلیمی بستی کا مرکزی منصوبہ تو یہی ہوگا کہ بہتر سے بہتر تعلیم دی جائے اور اس تعلیم میں اتنا تنوع ہو کہ ہر قسم کی استعداد رکھنے والے نوجوانوں کو تربیت دی جاسکے۔ باقی کام اس پر منحصر ہوں گے کہ بستی کے استاد کتنے مختلف فنون سے واقف ہیں۔ سب بستیاں ایک نمونے کی نہ ہوں۔ کسی کے بانی زراعتی یا صنعتی کاموں میں زیادہ ملکہ رکھتے ہوں گے اور اس سے جو آمدنی ہوگی اُسے تعلیمی منصوبوں کے لئے وقف کریں گے، کسی کے بانی علوم سے زیادہ شوق رکھتے ہوں گے اور وہ اپنا خرچ پورا کرنے کے لئے آمدنی کے ذریعے پیدا کریں گے، کہیں کوئی کیمیا کا ماہر اپنے معمل کو مرکز بنادے گا، کہیں کوئی تعلیم کا ماہر بستی کو تجربہ کا میدان بنائے گا، لیکن تکمیل کی آرزو ہر بستی میں ہوگی، اور یہ آرزو اس کے کاموں کو محدود نہ رہنے دے گی۔ نئے کام شروع کئے جاتے رہیں گے اور ایک کام چل جائے گا تو دوسرے کی خواہش خود بخود پیدا ہوگی، جس قدر کام بڑھتے جائیں گے، اتنی ہی زیادہ ضرورت اس کی ہوگی کہ ان کے درمیان تناسب اور ہم آہنگی ہو، اور وہ سب ایک دوسرے کی ترقی اور بستی کی کامیابی کا ذریعہ بنیں۔

کام کی نوعیت کا اس اصول پر کوئی اثر نہ پڑے گا کہ زندگی میں مرکزیت کام کو حاصل ہونا چاہئے اسے تعلیم میں اسی طرح برتا جاسکتا ہے، جیسے کہ زراعت یا صنعت کے کسی شعبے میں۔ اصل مقصد ایسی ذہنیت پیدا کرنا ہے کہ جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو نہ دیکھے، اپنے کام کو دیکھے اپنے فرائض کی

انجام دہی کو اپنی زندگی کی تکمیل سمجھے، اور اپنی ان تمام خواہشوں اور جذبات کو قابو میں کرے جو کام کو توجہ سے ہٹاتے ہیں۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں عام ذہنیت یہی ہے۔ اس کے بغیر کوئی کاروباری دفتر، کوئی کارخانہ چل نہیں سکتا، ریل، جہاز رانی، ڈاک کی قسم کا کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کام کی لگن ہندوستان میں بھی ہے۔ مگر کاروباری حلقوں کے علاوہ اس کا ہر جگہ ایسے میلانات اور ایسی عادتوں سے تصادم ہوتا رہتا ہے جو غلامی کے اطمینان نے پیدا کی ہیں اور انھیں یا تو آزاد مقابلے کو زندگی کا صحیح اصول مان کر اور سرمایہ داری کو فروغ دے کو دور کیا جا سکتا ہے یا ایسی تعلیم کے ذریعہ جو ہر شخص کو کارپرداز بنا دے۔ آزاد مقابلے میں صرف وہی کامیاب ہو سکتے ہیں، جو دوسروں کی بہ نسبت مقابلے کے لئے زیادہ تیار ہوں اور کاروباری قدروں پر اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو قربان کر سکتے ہوں۔ اس میں وہ لوگ جو کسی وجہ سے معذور اور مجبور رہوں، بالکل ہٹ جاتے ہیں، اور پھر قدروں کا صحیح توازن اسی وقت قایم کیا جا سکتا ہے۔ جب سرمایہ داری نظام پورا امکانی فروغ حاصل کر لے اور یہ ثابت ہو جائے کہ آزاد مقابلے کے طریقے میں خود اس نظام کے لئے بڑے خطرے ہیں۔ اس کے برخلاف کارپردازی کی وہ ذہنیت جو تعلیم پیدا کرے اُسے اتحادِ عمل کی طرف مائل کرتی ہے اور وہ اخلاقی و تہذیبی قدروں کے رنگ میں اس طرح رنگی ہوتی ہے کہ ذاتی منافع کا خیال طبیعت پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں سرمایہ داری نے نمایاں حیثیت اور اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اتحادِ عمل اور اشتراکیت کے فائدے بھی محسوس کئے جا رہے ہیں اور اس تعلیم کی بنیاد بھی رکھی جا چکی ہے، جو کام کو زندگی کا مرکز بنا دے گی اور یہ کام جماعتی ہوگا، جماعت کا حق سمجھ کر کیا جائے گا۔

جامعہ ملیہ میں چند صفتیں موجود ہیں، جن کے بغیر کوئی تعلیمی بستی اپنا منصب پورا نہیں کر سکتی۔ اسے ایسے لوگوں نے قایم کیا جو نئے کام کے شوق میں ایک دوسرے کے رفیق بنے، جنھوں نے جماعت سے اپنا تعلق قایم رکھا اور آزاد بھی رہے، اور جنھیں اس کا یقین تھا کہ وہ اپنی کارپردازی کی بدولت ترقی کریں گے۔ لیکن جامعہ کی بستی ابھی بہت چھوٹی ہے، اور اس کے افراد ابھی آزمائش کی اس منزل سے نہیں گذرے ہیں، جب زندگی کا نظام رفاقت اور شخصی تعلقات سے برتر ہو جاتا ہے اور سوا

اس کے کہ ہر شخص اپنے کام کو انتہائی پابندی، محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دے، تسکین کا اور کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ جامعہ والے اپنی بستی کے خادم ہیں تو مخدوم بھی ہیں اور یہ خدمت کا پہلا اور نسبتہً آسان مقام ہے، وہ منزل اس کے بہت آگے ہے، یہاں انسان خادم ہی ہوتا ہے، اسی سے مطمئن ہوتا ہے اور اسی پر فخر کرتا ہے، اگر کوئی نئی زندگی کے خاکے بنانا چاہے تو جامعہ کی فضا اسے بہت موزوں معلوم ہوگی۔ یہاں کارپردازی کا معیار بہت بلند نہ سہی مگر کام میں وہ انہماک ہے جس کے بغیر کارپردازی ممکن نہیں ہوتی۔ یہاں وہ ساری پابندیاں ہیں جو ذاتی اغراض کو ظاہر ہونے سے روکتی ہیں یعنی دولت پیدا کرنے کا امکان نہیں، اثر بڑھانے سے فائدہ نہیں، آرام کے لئے کوئی سامان نہیں۔ یہاں امتیاز صرف کام کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ اختیار صرف نئی ذمہ داریاں قبول کر کے بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ صرف ایک بنیاد ہے اور اسی کو قائم کرنے میں بہت سی عمریں صرف ہو گئی ہیں۔ دنیا میں بہت سی بنیادیں پڑی ہیں جس پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی، اور یہ ممکن ہے کہ جامعہ کی بستی اپنی خامیوں یا خارجی رکاوٹوں کی وجہ سے ترقی نہ کر سکے لیکن کبھی کوئی تعلیمی بستی بسائی جائے گی تو اسی طرح اور ہندوستانی زندگی کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ ہر چھوٹے بڑے شہر کے گرد ایسی بستیاں ہوں اور نوجوان شہری انھیں میں پرورش پائیں۔

تعلیم و تربیت کا مقصد اور نصب العین

ہر فرد کی زندگی کے دو بڑے پہلو ہوتے ہیں۔ انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی۔ پھر انفرادی زندگی بھی تین ذیلی شعبوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے یعنی جسمانی، ذہنی اور روحانی زندگی۔ تعلیم و تربیت کا منشاء اور مقصود یہ ہونا چاہئے کہ وہ فرد کی زندگی کے ان مختلف پہلوؤں کی نشوونما اور ترقی میں مدد دے۔ اور کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرے، اس لئے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں ورزش اور کھیل کود کے ساتھ عقلی اور ذہنی علوم اور مذہب و دینیات کی تعلیم صحیح تناسب میں ہونی چاہئے تاکہ انفرادی زندگی کے تینوں پہلو ایک ساتھ نشوونما پائیں۔ اگر کسی فرد کی زندگی میں ایک پہلو بھی حد سے زیادہ کمزور رہ جائے تو اس کی زندگی مکمل نہیں کہلائی جاسکتی۔ اس لئے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے ان مختلف شعبوں میں سے ہر شعبہ کی اس حد تک تربیت حاصل کرے کہ وہ شعبہ نشوونما کے ایک قلیل ترین معیاری درجہ تک پہنچ جائے اور آئندہ زندگی میں مفید ہوسکے جسم کو اس حد تک مضبوط بنانا چاہئے کہ عمر صحت و تندرستی کے ساتھ گذر سکے۔ اعضاء زندگی کی کشمکش میں ساتھ دیں اور معمولی امراض سے بخوبی مقابلہ کرسکیں۔ ذہن کی تربیت اس قدر ہونی چاہئے کہ تہذیب اور تمدن کے بنیادی اصول اور اساسی مسائل سے واقفیت کے علاوہ ایک خاص علم یا فن یا پیشہ میں کافی مہارت اور کمال حاصل ہوجائے تاکہ فرد اپنی جماعت اور نوع انسانی کی کچھ خدمت کرسکے اور اس کا وجود اجتماعی حیثیت سے محض بیکار نہ ہو۔ روح کی تربیت اس حد تک ہونی چاہئے کہ انسان کو دلی اطمنان اور مسرت حاصل ہو اور زندگی بے کیف اور بے مقصد نہ محسوس ہونے لگے۔ ان تینوں قسموں کی تربیت کے بعد فرد کی زندگی ایک حد تک تکمیل کی طرف آگے بڑھتی ہے، کیونکہ اسی وقت

وہ زندگی کے تمام لوازمات سے مناسب ترین فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اس انفرادی زندگی سے آگے زندگی کی ایک اور منزل ہوتی ہے، جو فرد سے انتہائی توجہ اور محنت و مشقت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس منزل پر فرد کا وجود صرف اس کی اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ جماعت کا بھی رکن ہوتا ہے اور اس پر اجتماعی ربط اور تعلق کی وجہ سے نئے اور اہم تر فرائض عاید ہوتے ہیں، اب اس کو بتدریج عزیز و اقارب، دوست احباب، ملک و قوم اور افراد دنیا اور نوع انسان سے سابقہ پڑتا ہے اور ان سب کے حقوق ادا کرنے پڑتے ہیں اس لئے تعلیم و تربیت کا مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ فرد کو ان تمام فرائض کے بطریق احسن انجام دینے کے قابل بنایا جائے۔

اس زمانہ میں انسانی عمر کا اوسط عام طور پر پچاس ساٹھ برس فرض کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے ان مختلف پہلوؤں کی نشو و نما کے لئے اعلیٰ تعلیم و تربیت کی خاطر ابتدائی عمر کے بیس پچیس برس صرف کرنا کچھ نامناسب نہیں۔ ہر علم و فن گذشتہ پچاس سال میں اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ اس کے مبادیات پر حاوی ہونے کی خاطر بھی اب پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ وقت درکار ہے۔ اس کے علاوہ متمدن زندگی اب پہلے کی طرح سادہ نہیں رہی بلکہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے، اور زندگی کے ہر معمولی شعبہ اور کاروبار میں ناتربیت یافتہ یا نیم تربیت یافتہ لوگوں سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لئے اچھے ماہرین کی ضرورت ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے اگر علم و فن کی موجودہ وسعت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم یہ سفارش کریں کہ ہر فرد کو اپنے منتخبہ شعبہ میں مہارت حاصل کرنے کی خاطر کم و بیش بیس پچیس سال کی عمر تک تعلیم اور تربیت پانی چاہئے۔ اس کے علاوہ سب کو معلوم ہے کہ انسانوں کی آبادی میں تو اضافہ ہو رہا ہے لیکن ہمارے معاشرے کی موجودہ تنظیم کی وجہ سے ذرائع معاش اور وسائل روزگار میں تناسب اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے ہر تقرر طلب جا' عداد اور ملازمت پر امیدواروں کا ہجوم رہتا ہے بیکاروں اور بے روزگاروں کی تعداد دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اگر ان نوجوانوں کو تعلیم گاہوں اور تربیت گاہوں میں چند سال اور زیادہ رکھا جائے تو اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اپنے خاص علم و فن کے متعلق بہتر معلومات حاصل کریں گے اور زیادہ مہارت پیدا کریں گے، بلکہ ملازمتوں پر ہجوم بھی کم

ہو جائے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح تعلیم کو عام کرنے سے تعلیم یافتوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ بے روزگاری میں اضافہ ہوگا۔ جو لوگ اس طرح تعلیم کو بے روزگاری کا باعث بتاتے ہیں وہ اس کا خیال نہیں رکھتے کہ بے روزگاری کا اصلی سبب آبادی کی زیادتی اور معاشرہ کی ناقص تنظیم ہے نہ کہ تعلیم کی زیادتی۔ تعلیم کی کمی بیشی سے بے روزگاری پر صرف اسی قدر اثر پڑ سکتا ہے کہ اس کا مرکز ثقل ایک مقام سے ہٹ کر دوسرے مقام پر آجائے انسان اگر پیدا ہوا ہے تو اُسے بہرحال اپنی زندگی کے دن پورے ہونے تک کھانے کپڑے کی تلاش کرنی ہے۔ تعلیم سے اس جستجو میں مدد ہی مل سکتی ہے۔ نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا

چند لوگوں کو ڈر ہے کہ اگر جامعات اس رفتار سے گرایجویٹ نکالنے لگیں تو غریب اور مزدور پیشہ کی اولاد بھی گرایجویٹ ہو جائے گی اور پھر ادنیٰ درجہ کے کام کرنے کے لئے کوئی آمادہ نہیں ہوگا۔ اس کا ایک سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ گرایجویٹ ہونے کا ٹھیکہ کچھ امیروں، یا عہدہ داروں کی اولاد نے تو نہیں لے رکھا ہے کہ غریب مزدوروں کی اولاد گرایجویٹ ہونے نہ پائے یوں بھی اگر ایک غریب مزدور تعلیم یافتہ ہوگا تو بے کاری اور فرصت کے وقت لہو و لعب میں مشغول ہونے کی بجائے کوئی اخبار یا کتاب ہی پڑھتا رہے گا۔ اب رہا ان کاموں کو انجام دینے کا سوال جن کو عام طور پر "حقیر" پیشوں سے متعلق سمجھا جاتا ہے تو معاشرہ میں ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ لوگ ان کاموں کو انجام دینے کے لئے خود بخود اپنی رضامندی سے آمادہ ہوں۔ کسی فرد بشر کو محض اس بنا پر حقیر پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا کہ اس کے آباؤ اجداد اس پیشے سے تعلق رکھتے تھے اس بیسویں صدی میں متمدن زندگی کا کوئی صحیح اصول نہیں ہو سکتا۔ تمام انسانوں کو مساوی موقع اور مساوی آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں اور اپنی خواہش اور دلچسپی کا پیشہ اختیار کریں۔

موجودہ نظام تعلیم کا ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں افادیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے یعنی ساری کوشش اسی نقطہ پر مرکوز رہتی ہے کہ

جس قدر جلد ہو سکے ہر نوجوان کو کسی پیشہ یا ملازمت کے لئے تیار کر دیا جائے چاہے اس نام نہاد تعلیم و تربیت سے اس کی "انسانیت" کی تکمیل ہو یا نہ ہو، اعلیٰ جماعتوں اور کالجوں میں تو کجا، بالکل ابتدائی اور تحتانی جماعتوں ہی سے کوشش کی جاتی ہے کہ لڑکے کے سامنے ایک خاص پیشے کا خیال رہے، اور سارا تعلیمی نصاب اسی پیشے کے گرد گھومتا رہے۔ بعض جدید اسکیموں میں تو یہ انتہا کر دی ہے کہ تعلیم کی ساری بنیاد ہی کسی پیشہ پر رکھی گئی ہے جس سے بچوں کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے کہ انسان کی زندگی میں سب سے اہم پہلو پیٹ کی فکر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا ملک ایک بہت غریب ملک ہے۔ لیکن اقتصادی مشکلات کا یہ حل تو صحیح نہیں ہو سکتا کہ انسانوں کو روزی کمانے والی مشین اور پیٹ کا بندہ بنا دیا جائے۔ ہر کسان کے بچے کو محض کسان اور ہر مزدور کے بچے کو محض مزدور بنا کر ہی کیا ہم توقع رکھ سکتے ہیں کہ اس سائنس اور صنعتی انقلاب کے زمانے میں دوسری ترقی یافتہ اور ترقی پذیر قوموں کا مقابلہ کر سکیں۔ ایک محدود پیشہ کی ادھوری تعلیم پائے ہوئے نوجوانوں کے لئے کونسا موقع ہے کہ وہ اپنے ذہنی اور جسمانی قویٰ کو نشو و نما دے سکیں اور زندگی کی اعلیٰ اقدار سے واقف ہوں۔ کیا ان کی میکانی زندگی میں روٹی کی فکر سے نجات پانے کے باوجود شدید بے اطمینانی اور بیزاری نظر نہیں آتی۔ ان کم و بیش کی فکر میں لگے ہوئے پیشہ وروں اور ملازموں سے جنھیں اعلیٰ انسانی مسائل کے متعلق سوچنے کی نہ فرصت ہے اور نہ صلاحیت۔ کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ قوم اور بنی نوع کی ترقی میں ممد و معاون ہوں گے۔

ایک اور غلطی مدرسہ اور کالج کے تعلیم کے مقصد کو سمجھنے میں ہوئی ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ مدرسہ یا کالج کے اوقات درس ہی میں متعلم کے ذہن میں کسی خاص موضوع کے متعلق معلومات کی ایک معینہ مقدار ٹھونس دی جائے اور پھر امتحان گاہ میں اس کی قوتِ حافظہ کی آزمائش کی جائے طالب علموں کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ جو کچھ معلومات حاصل کرنی ہوں وہ اساتذہ کے درسوں ہی میں حاصل کی جائیں۔ اس کے علاوہ اگر کچھ مطالعہ کبھی کبھی گھر پر کیا جاتا ہے تو وہ اسی طرح

ہوتا ہے کہ درسوں میں بتائی ہوئی معلومات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ اس طرح متعلمین میں یہ صلاحیت اور قابلیت ہی نہیں پیدا ہونے پاتی کہ وہ اپنے طور پر نئی معلومات حاصل کر سکیں۔ اس نظام تعلیم کی غلطی اسی قسم کی ہے جیسے کوئی شخص ایک شیشہ گر کی دوکان میں شراب لینے کے لئے جائے، حالانکہ شیشہ گر تو محض جام و مینا بناتا ہے جن میں شراب ڈالی جا سکتی ہے۔ مدرسہ اور کالج کی تعلیم کا اصل مقصد ذہن اور صلاحیتوں کی تربیت ہے۔ اگر ان تعلیم گاہوں میں یہ حقیقی مقصد ایک حد تک پورا کر دیا جائے کہ متعلمین میں خود غور و فکر کی قوت نشو و نما پائے تو پھر ان کا فطری ذوق خود علم کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ اپنے طور پر تحصیل علم کر سکتے ہیں۔ اس لئے مدرسوں اور کالجوں کو صرف شیشہ گری ہی کرنی چاہئے۔ شرابِ علم کی کشید کو ختم تعلیم کے بعد ذاتی مطالعہ پر چھوڑ دینا چاہئے۔

ایک بڑا نقص موجودہ نظام تعلیم میں یہ ہے کہ بہت قبل از وقت مضامین کی تخصیص شروع کر دی جاتی ہے، اور یہ تخصیص بھی اس قدر تنگ اور محدود ہوتی ہے کہ نوجوانوں کو اپنے خاص مضمون کے علاوہ دوسرے علوم سے مطلق واقفیت نہیں ہونے پاتی۔ یہ چونکہ ایک اہم نکتہ ہے اس لئے مجھے اس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے بحث کرنی پڑے گی۔

انسان کے ذہنی ارتقا میں ایک منزل وہ تھی کہ ایک ہی شخص مختلف علوم و فنون کا ماہر ہوتا تھا اور ہر علم و فن میں اصولی تحقیقات کر کے اہم اضافہ کر سکتا تھا۔ ایسی جامع کمالات ہستیاں مشرق اور مغرب کی تاریخ میں بہت سی گذری ہیں، اس زمانہ میں علم صرف ان چند افراد کا ورثہ تھا جو اپنی فطری قابلیتوں کے باعث ہر قسم کے حقائق کی کھوج میں لگے رہتے تھے۔ یہ علوم اکثر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے تھے اور چونکہ ہر علم کا ابھی آغاز تھا اس لئے اس کے متعلق محض ایک ابتدائی بات بھی اچھی خاصی تحقیق تھی۔ حمل و نقل کے ذریعے ایسے ترقی یافتہ نہیں تھے اور طباعت و اشاعت کے سامان کی اس قدر فراوانی نہیں تھی کہ مختلف لوگ ایک دوسرے کی معلومات اور تحقیقات سے استفادہ کر سکیں۔ مشرق میں چند مکتب اور مغرب میں چند اکادمیاں مفکرین کی ایک محدود جماعت کے لئے علم کی تحصیل اور تحقیق کا

سامان فراہم کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے ختم تک بھی ایک فرد کو جامع العلوم ہونے کا موقع باقی تھا۔ اس زمانہ کے علماء اور مفکرین کی سوانح عمری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحقیقات اور علمی کارنامے کس قدر وسیع اور مختلف النوع ہوتے تھے لیکن گذشتہ سو ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ سائنس نے ذرائع حمل ونقل میں انقلاب پیدا کر دیا اور زمین کی طنابیں کھنچ گئیں۔ اشاعت وطباعت کے طریقوں میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ تشنگان علم کے لئے مختلف مقاموں کو جاکر اور مختلف کتابوں اور تحریروں کو پڑھ کر جدید ترین معلومات حاصل کرنا ممکن ہو گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سماجی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب ہو گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ علم ایک محدود طبقہ کی میراث نہیں رہا بلکہ سہل الحصول ہو کر عوام میں پھیل گیا۔ آئے دن نئے مدرسوں، کالجوں اور جامعات کی مانگ بڑھنے لگی۔ تحقیقاتی اداروں اور اشاعتوں کی تعداد دن بدن زیادہ ہوتی گئی۔ طبیعی، حیاتی اور عمرانی علوم میں اہم اور گراں قدر اضافے اور انکشافات ہونے لگے۔ اس بیسویں صدی میں تو تحصیل علم اور تحقیق علم کے ذرائع میں ایسی حیرت انگیز ترقی ہوئی جو پچاس برس قبل کے انسانوں کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ ان تمام ترقیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر علم وفن اپنی ابتدائی حالت سے نکل کر بالکل نئی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اور نہ صرف کئی نئے علوم پیدا ہوئے بلکہ ایک ہی علم کی بہت سی نئی شاخیں بن گئیں جو بذات خود ایک مستقل علم کا درجہ رکھتی ہیں۔

اب ایک فرد بشر کے لئے یہ قطعی ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اسی طرح جامع العلوم اور جامع الکمالات بنے جیسے قرون وسطیٰ کے علما ہوا کرتے تھے۔ اب ہر طرف تخصیص کا دور دورہ ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اس قسم کی تخصیص ایک حد تک ناگزیر ہے اور کسی کو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں لیکن افسوس ہے کہ اور دوسری اچھی باتوں کی طرح اس امر میں بھی ہم حدود اعتدال سے تجاوز کر گئے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ علوم وفنون کی اس کثرت میں ہم خود علم وصداقت کی وحدت کو بھی بھولتے جارہے ہیں اور سوائے اپنے خاص مضمون کے دوسرے مضامین کو سمجھنے اور ان کے اساسی مفہوموں سے واقف ہونے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

یہ صحیح ہے کہ کسی خاص علم کے متعلق ایک عامی باستدلال کی تفصیلوں وغیرہ سے واقفیت نہیں رکھ سکتا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ ہم محض ایک مورخ، ادیب یا ریاضی داں نہیں ہیں، بلکہ ایک انسان اور ایک متمدن انسان ہیں اور تعلیم یافتہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو جو باتیں انسانوں کے لئے بحیثیت مجموعی دلچسپی رکھتی ہیں ان سے ہر فرد کو دلچسپی پیدا کرنی چاہئے۔ کوئی علم جس کو بعض انسانوں نے تشکیل دیا ہے بقیہ انسانوں کے لئے بالکل مہمل یا ناقابل اعتنا نہیں ہو سکتا ہم اپنے حلقۂ افکار کو اس قدر تنگ نہیں کر سکتے کہ ہم اپنے پڑوسی کی بات ہی سمجھ میں نہ آسکے اس امر کے اظہار کو میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری علمی اور سائنسی کانفرنسوں میں اس محدود تخصیص کا مظاہرہ زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ اور اگر بروقت اس کے خطرہ سے متنبہ نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ ہمارے علمی اداروں میں کوئی شخص کسی دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکے گا۔ ایک مصنف نے اس زمانے کی محدود تخصیص کی تعریف اس طرح کی ہے کہ:۔

"To know more and more about less and less"

میں سمجھتا ہوں کہ اس تعریف میں اگر یہ فقرہ بڑھا دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ:۔

"Until everything is known about nothing."

اس میں شک نہیں کہ کسی ایک مضمون کو لے کر اس میں مہارت اور کمال حاصل کرنا ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم انسانی افکار کے دوسرے شعبوں سے بالکل آنکھیں بند کر لیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو اکثر لوگ جو صرف ایک خاص موضوع کے سوا کچھ نہیں جانتے اس ایک موضوع میں بھی کوئی غیر معمولی کمال حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اس مثل کے مصداق ہوتے ہیں کہ "ہنر ندار کمالے بایں یک فنی"۔ میری رائے میں ایسے شخص سے جو کسی ایک موضوع میں بھی کامل نہیں ہے یعنی "Master of none" ہے۔ وہ شخص بدرجہا بہتر ہے جو مختلف موضوعوں سے کسی قدر واقفیت رکھتا ہے یعنی "[illegible] all [illegible]" ہے۔ اور ایک متمدن انسان کی طرح انسانوں کے مختلف افکار اور خیالات سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے

مہمہ دانی" کی تضحیک تو بہت کی لیکن یہ خیال نہیں کیا کہ اگر ہر شخص واقعی صرف ایک ہی مضمون کے متعلق معلومات
حاصل کرے اور باقی تمام دوسری معلومات سے کورا ہو تو انسانوں کی سماجی اور شہری زندگی ناقابل
زیست ہو جائے ریاضی دان محض ریاضی دانوں سے گفتگو کریں اور انجنیر محض انجنیروں سے ظاہر
ہے کہ انسانی سوسائٹی کے ارتقا کا یہ کوئی خوش آئند تصور نہیں ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ
اس قدیم انگریزی مقولہ کو کسی قدر بدل کر اب یہ اصول مقرر کرنا چاہئے کہ ہر متنفس یا ہر فرد
jack of alt and master of one ہو۔ یعنی ہر شخص ایک علم میں مہارت حاصل کرے اور
باقی علوم سے دلچسپی لے اور ان سے کافی واقفیت رکھے معاشرے کی تنظیم اسی اصول کے لحاظ سے
ہونی چاہئے۔ اور میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں بھی یہ بات کم و بیش پیدا کی جا سکتی ہے بشرطیکہ
ہم کسی قدر وسیع نظر سے کام لینے کی کوشش کریں اور ایک تنگ دائرہ میں اپنے کو محدود نہ کر دیں۔

یہ عذر قابلِ قبول نہیں کہ ماہرین اور متعلمین کو اپنے مضامین کے متعلق لکھنے پڑھنے سے
اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ وہ کسی دوسرے مضمون کے متعلق کچھ لکھ پڑھ سکیں۔ اوّل تو ہم اپنی فرصت
کے اوقات کو بہت ضایع کرتے ہیں، اور پھر کون ایسا فردِ بشر ہے جو دن کے ۲۴ گھنٹے اور سال
کے ۳۶۵ دن ایک اور صرف ایک ہی مضمون کے متعلق لکھتا پڑھتا رہتا ہے۔ کسی خاص مضمون
کا بڑا ماہر بھی یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ ہر لمحہ اور ہر گھنٹہ اس موضوع کے متعلق اہم یا قابلِ لحاظ
انکشافات کرتا رہے۔ خود انسان کا نفس بھی اس قسم کے محدود تصور سے بغاوت کرنے لگتا ہے
اور ایک ہی مضمون کے مسلسل مطالعہ سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ ایسے اوقات میں جبکہ اپنے
پیشہ کی مصروفیتوں سے فرصت ملے یا دل برداشتہ ہو جائے ہم ایک خاص پروگرام کے تحت
دوسرے مضامین کے بنیادی اصولوں اور نتیجوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور ان کے متعلق عام دلچسپی
کے ساتھ گفتگو اور بحث کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک معیّن مدت میں علم کے ہر اہم
شعبے کے متعلق ہماری معلومات اس پایہ کی ہو سکتی ہیں جو اس مضمون کے ایک اوسط طیلسانی
کو حاصل ہوتی ہیں۔ خصوصاً ایک جامعہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا یہ مابہ الامتیاز ہونا چاہئے

کہ ایک حد تک ان کی ذات مختلف حیثیتوں سے جامع ہو۔ یہ تو نہ ہو کہ اگر تاریخ یا فلسفہ کی کوئی ابتدائی اور موٹی بات بھی کہی جائے تو سائنس داں اس طرح سر ہلائیں گویا کہنے والا کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ہمارے موجودہ نظام تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ متعلمین میں بالکل "یک فنی" ہو کر رہ جانے کا رجحان پیدا کرتا ہے اور لبرل ایجوکیشن کے قدیم اور آزمودہ اصول کو پس پشت ڈالتا جا رہا ہے۔

ہر تعلیم یافتہ شخص اور خصوصاً ایک جامعہ کے متعلم کے لئے وسعت نظر لازمی ہے اور کسی خاص مضمون میں بہت محدود تخصیص ایم۔ اے یا زیادہ سے زیادہ بی۔ اے، اور اس کے بعد کی جانی چاہئے۔ انٹرمیڈیٹ یا بی۔ اے تک ذہنی قویٰ کی عام تربیت ہونی چاہئے اور اس تربیت میں منطق، علمیات اور سائنس تجربہ اور مشاہدہ کے بنیادی اصول کو جامعہ کے تمام متعلمین کے لئے لازم قرار دینا چاہئے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ کسی مسئلہ کے متعلق مناسب مواد کیسے فراہم کیا جا سکتا ہے۔ ان معطیات کی بابت صحیح استدلال کرکے ان سے صحیح نتیجے کیسے اخذ کئے جاتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علم کی ماہیت کیا ہے۔ علم حاصل ہونے کے کیا کیا ذریعے اور طریقے ہیں، اور مختلف علوم کا باہمی تعلق کیا ہے۔

اس قسم کی عام ذہنی تربیت حاصل کرنے اور صلاحیتوں کو روشن کرنے کے بعد متعلم ایم۔ اے میں، اور اس کے بعد اساتذہ کی ذرا سی رہبری کی بنا پر خود بخود اپنی دلچسپی کے مضامین میں اعلیٰ معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور در اصل یہیں سے ان کی حقیقی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ ورنہ موجودہ نظام تعلیم سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والوں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر صحیح منطقی طور پر بحث بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی عام تقریر۔ دل اور تحریر دل میں سیوں ظاہر اور پوشیدہ مغالطے پائے جاتے ہیں! ابھی ایک جملہ میں جس اصول کو مان لیا تھا، دوسرے ہی جملے میں اس کے بالکل متضاد اصول کو فرض کر لیتے ہیں اور انہیں یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ان سے کہاں غلطی ہوئی ہے کسی بحث کو اس کے منطقی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ وہ ایک دائرہ میں

چکر کاٹتے رہتے ہیں اور جہاں سے شروع کیا تھا پھر اسی نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح بحث کا وہی دائرہ کا سلسلہ بار بار دہرایا جاتا ہے اور کوئی بات تصفیہ ہونے نہیں پاتی۔ خانگی گفتگو اور کمیٹیوں میں اس چکردار (Circular) بحث کا مظاہرہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

تعلیم یافتہ اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ انھیں صحیح طریقہ پر بحث کرنا بھی نہ آئے۔ صحیح استدلال کے اصول ہمیں نہ تو مدرسہ اور کالج میں سکھائے جاتے ہیں اور نہ خود ہم اپنے طور پر کبھی ان سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ کی ابتدائی منزل میں منطق اور اصول علم ہر متعلم کے لئے لازم قرار دئے جانے چاہئیں۔ اس منزل کو اعلیٰ تعلیم کی تیاری کی منزل سمجھنا چاہئے جس میں طالب علم کسی خاص مضمون کے متعلق چند بنی بنائی معلومات فراہم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی ذہنی اور دماغی تربیت ہو اور وہ صحیح تقریر اور تحریر کے قابل ہو۔ اس تربیت کی بنا پر بعد میں وہ گوناگوں موضوعوں کے متعلق بحث مباحثہ میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لے سکے اور حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ (Cultured) کہلا سکے۔

ہمارے اکثر تعلیم یافتہ افراد بلکہ علما، اور ماہرین کو اپنے خاص مضمون کے علاوہ کسی دوسرے مضمون کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی اور بسا اوقات یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے خاص مضمون کے لئے ان دوسری معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ انجنیر اور ڈاکٹر ہیں تو وہ تاریخ اور ادب سے بالکل بے بہرہ ہیں، اور مورخ و ادیب ہیں تو وہ مبادیات سائنس سے قطعی ناواقف۔ تاریخ اور ادب پھر بھی چونکہ عالمگیر اپیل رکھتے ہیں اور ہر انسان کو ان سے کچھ نہ کچھ سابقہ پڑتا ہے اس لئے سائنس والے ان مضامین کی ابتدائی باتوں سے کم وبیش واقف ہوتے رہتے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عوام اور آرٹس (Arts) کے مضامین کے متعلم اور ماہرین سائنس کی بالکل ابتدائی اور موٹی موٹی باتوں سے بھی بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کی فضا حد درجہ غیر سائنسی ہے، اور سائنس کے جدید انکشافات کے

متعلق تو کجا صدہا سال پہلے حاصل کی ہوئی معلومات کے متعلق بھی کوئی بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ سائنس صرف چند ماہرین کا مشغلہ ہے جس کے لئے کسی سمجھدار شخص کو سر کھپانے کی ضرورت نہیں کیونکہ دوسروں کو ان معلومات سے ذرہ برابر فائدہ کی توقع نہیں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ افادیت ہی کسی مضمون سے واقفیت یا ناواقفیت کا معیار نہیں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو ہماری تہذیب و کلچر کا جزو بن گئی ہیں اور جن سے واقف ہونا ہر تعلیم یافتہ شخص کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اس علم سے کہ زمین گول ہے، ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کیا فائدہ اٹھاتے ہیں، بلکہ اکثر کاروبار میں جیسے مکان کی دیواریں اٹھاتے وقت ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ زمین چپٹی ہے۔ اسی طرح عملی دنیا میں اس علم کی کب ضرورت پڑتی ہے کہ سورج زمین کے گرد نہیں بلکہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ بات چیت میں تو ہم یہی کہتے ہیں کہ سورج غروب ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ زمین گول ہے یا چپٹی، یا یہ کہ سورج گھوم رہا ہے یا زمین گھوم رہی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو مہذب (Cultured) نہیں سمجھا جائے گا۔

اس لئے ہر تعلیم یافتہ شخص کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے اہم علوم کے عام اصولوں اور اساسی نتیجوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر لے۔ میں بتلا چکا ہوں کہ قدیم زمانہ کے اکثر بڑے علماء جامع العلوم ہوتے تھے اور مختلف مضمونوں میں اہم تحقیقات کرتے تھے۔ اب اگرچہ علوم کی ترقی اور وسعت کی وجہ سے اس کا موقع نہیں رہا لیکن پھر بھی اگر موجودہ زمانہ کے کسی بڑے عالم یا سائنس داں کے کارناموں پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی تحقیق ایک چھوٹے موضوع کے تنگ دائرہ تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ متعدد وسیع موضوعوں کے متعلق اصولی انکشافات کرتے ہیں۔ ان کی فنی اور غیر فنی تقریروں اور تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف اپنے خاص مضمون میں بلکہ دوسرے علوم کے متعلق بھی ان کی معلومات کس قدر وسیع ہوتی ہیں۔ انگلستان، جرمنی، فرانس اور خود ہندوستان میں مجھے ایسے علماء سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے جو مختلف

وسیع موضوعوں پر تحقیق کا کام کر رہے ہیں، اور جو صرف ایک تنگ دائرہ میں نہیں گردش کرتے یہ ایک معلومہ حقیقت ہے کہ جو لوگ صرف ایک ہی محدود مضمون کے متعلق ہمیشہ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں ان کے قلم سے شاذونادر ہی کوئی بلند پایہ تحقیق نکلتی ہے۔ کسی موضوع پر اعلیٰ درجہ کی تحقیق کرنے کے لئے ضروری ہے کہ محقق کی نظر وسیع ہو اور وہ دوسرے مشابہ موضوعوں سے اس کا تعلق معلوم کر سکے۔

بہرحال تعلیم کے مقصد اور نصب العین کے متعلق ابھی تک بہت کچھ اختلاف رائے کا اظہار ہوتا رہتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس اہم ترین مسئلہ پر اچھی طرح غور و خوض کیا جائے اور اور اس کا صحیح تعین کر لیا جائے تاکہ اس کی بنا پر نظام تعلیم ڈھالا جا سکے۔

بُنیادی تعلیم

اگر آپ بچّہ کی زندگی کا بالکل ابتدا سے مطالعہ کریں، تو آپ پائیں گے کہ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لینا سب سے پہلے شروع کیا ہے۔ اس کے حواس خمسہ میں کوئی قوت بھی اس قدر جلد بیدار نہیں ہوتی ہے جتنی کہ ہاتھ سے کام لینے کی۔ اس کے دوسرے قویٰ مثلاً دیکھنے، سننے، سونگھنے اور چکھنے کے اس قدر کارفرما نہیں ہوتے، جتنا چھونے اور ٹٹولنے کے اس کی آنکھوں کے سامنے سے کوئی روشن چیز بھی لے جائیے، وہ ان کا ساتھ نہیں دیں گی۔ اس کی نگاہیں ایک جگہ گڑی کی گڑی رہ جائیں گی۔

بعینہ یہی حال اس کے سُننے، سونگھنے اور چکھنے کی قوتوں کا ہے۔ اسے اچھی اور بُری آواز کا فرق تو درکنار، مہین اور موٹی آوازوں کا بھی بہ مشکل امتیاز ہو سکتا ہے۔ اسے اکثر بڑے دھماکے کی آوازیں صرف چونکنا کر سکتی ہیں۔ سونگھنے میں بھی خوشبودار اور بدبودار چیزوں کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے گلاب اور ہینگ کی ڈلی دونوں برابر ہیں۔ چکھنے میں بھی اس کی زبان پر مصری کی ڈلی اور لال مرچیں دونوں یکساں اثر رکھتی ہیں۔

لیکن ہاتھ سے کام بچّہ ابتدا ہی سے لینا شروع کر دیتا ہے۔ اور نہیں تو وہ لیٹے لیٹے اپنے ہاتھ پاؤں کو پھینکتا ہی رہتا ہے۔ یوں بے معنی پھینکنے کے علاوہ وہ چیزوں کو چھونے، ٹٹولنے، ہٹانے اور کھسکانے کی بھی کوشش کرتا رہتا ہے۔ غرض ہاتھ سے کام کی جتنی بھی بنیادی شکلیں ہیں وہ سب برتنے لگتا ہے۔ اور اوائل عمر کی تعلیم کی کوئی شکل بھی ایسی نہیں ہو سکتی جو اس حقیقت کو نظر انداز کر کے صحیح تعلیم کہی جا سکے۔

بچّہ کی بالکل ابتدائی تعلیم کو لیجئے، اُسے خواہ Infant Education کہئے، یا Nursery Education، اس مدت میں جبکہ وہ ماں کی گود سے نکل کر اُستانی یا معلّم کے ہاتھ میں آتا ہے، اس مدت کی تعلیم کی تمام تر بنیاد اس پر ہونی چاہئے جس میں وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور دوسرے عضلات سے زیادہ سے زیادہ کام لے کے اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ وہ چلے پھرے، کودے پھاندے، ہاتھ سے کوئی چیز جی چاہے تو بنائے بگاڑے۔ غرض اپنی اس اندرونی خواہش کو جو فطرت نے اس کی طبیعت کے اندر رکھ چھوڑی ہے پورا کرے۔

بچّہ کی اس ابتدائی زندگی میں اظہار ذات کے دو بڑے ذریعے ہیں۔ ایک زبان اور دوسرا ہاتھ۔ زبان کے ذریعہ اپنی اندرونی کیفیات اور جذبات کے اظہار کا موقع تو ذرا دیر سے آتا ہے لیکن ہاتھ کے ذریعہ وہ اظہار ذات کا کام بالکل ابتدا ہی سے شروع کر دیتا ہے۔ لطیف خواہشات کو جانے دیجئے۔ صرف موٹی موٹی باتوں کو لیجئے۔ ہاتھ پھیلا کر لپکنا، کسی چیز کے لینے کے لئے ہاتھ بڑھانا، ہاتھ سے اشارہ کرنا یا بلانا۔ یہ سب ہاتھ کے ذریعے اظہار ذات کی مختلف شکلیں نہیں تو کیا ہیں؟

کہتے ہیں اگر زبان کا ذریعہ اظہار خیال کے لئے نہ ہوتا تو یہ کہنا مشکل ہے کہ انسان کے خیالات اور افکار کی کوئی نشو و نما بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات اگر زبان کے حق میں درست ہے تو ہاتھ کے معاملہ میں بھی کچھ کم صحیح نہیں ہو سکتی ہے جو اظہار ذات کا اوّلین اور سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ زبان سے اظہار خیال کے لئے تو بچّہ کم سے کم اپنے ایک ہم جنس کا محتاج ہوتا ہے لیکن ہاتھ کے کام کے لئے بچّہ کسی شخص کا محتاج نہیں۔ یہ اس کا ایک فطری تقاضا ہے اس کو پورا کرنے کے لئے فطرت کوئی نہ کوئی مواد اور مسالہ تلاش کر لیتی ہے اس کے لئے کسی خاص صلاحیت اور تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ایک معمولی سے معمولی اور بے پڑھا لکھا بچّہ بھی ہاتھ کے ذریعہ اظہار ذات کا کوئی موقع نکال لیتا ہے۔

نیاز آن سات سال کی ایک چھوٹی بچی ہے، جو دن بھر جنگل میں اپنی بکریاں چرایا کرتی ہے۔ بکریاں چراتے چراتے جب وہ تھک جاتی ہے تو ایک جگہ وہ راستے میں کہیں بیٹھ جاتی ہے اور دھول دیتے اور اِدھر اُدھر کے اینٹ پتھروں سے کچھ بنانا شروع کردیتی ہے۔ بناتے بناتے جب تھک جاتی ہے تو پھر ایک بار اپنے گلّے کا چکر لگا لیتی ہے کہ کہیں کوئی بکری اِدھر اُدھر تو نہیں ہو گئی اس طرح شام کو جب وہ اپنا ریوڑ لے کر گھر لوٹتی ہے تو اس جگہ پر جہاں وہ بیٹھی تھی، ایک خیالی مکان کا پورا نقشہ چھوڑ جاتی ہے۔ کنکر پتھر کے ٹکڑوں سے گھری ہوئی ایک چہار دیواری ہے۔ اس کے اندر دیا سلائی کی چھتیوں سے بنے ہوئے ایک طرف رہنے سہنے کے کچھ کمرے ہیں، دوسری طرف دور ہٹ کر گائے بیلوں کے لئے چھپر ہیں۔ تیلیوں سے قرینے کے ساتھ نالیاں بہتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔

ایک دن نیاز آن جو راہ میں ملی تو اس سے میں نے دریافت کیا۔ نیاز آن، یہ کیا تم دن بھر راستہ میں بیٹھی بنایا کرتی ہو؟ پہلے تو وہ کچھ شرمائی، پھر دوبارہ اصرار پر بولی، کیا کروں، بکریاں چراتے چراتے تھک جاتی ہوں تو اِدھر اُدھر کے کنکر پتھر چُن کر کچھ بنانے بگاڑنے لگتی ہوں، اور ایک درخت کے نیچے لے جا کر اس نے اپنے ایک دن کے کام کی تشریح کرنی شروع کی میرے سوالوں کے جواب میں وہ ہر ایک چیز کی اس طرح تشریح کرتی تھی کہ کیا کوئی بڑے سے بڑا آرکی ٹکٹ بھی اپنے نقشے کو سمجھائے گا۔

بچے کے اظہار ذات کے ان کاموں میں ضروری نہیں کہ کسی بڑی ہنرمندی اور اعلیٰ درجہ کے سلیقے کو دخل ہو۔ وہ تو صرف اس کی فطری ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اور بس۔ اور پھر اس میں معنی و مطلب بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ بچہ ہی سمجھتا ہے اور سمجھا سکتا ہے۔ میرا ساڑھے تین سال کا ایک بچہ ہے جو اپنی بڑی بہن کی دیکھا دیکھی پنسل سے کچھ الٹی سیدھی لکیریں بنایا کرتا ہے۔ ایک دن وہ دوڑا دوڑا آیا، اور کہنے لگا، ابا جان، ابا جان، دیکھئے میں نے موٹر بنائی ہے۔ اور یہ دیکھئے گائے ہے۔ حالانکہ ان الٹی سیدھی لکیروں کو موٹر سے کوئی تعلق تھا،

نہ کرنے سے۔

بچوں کے ہاتھ کا بنایا ہوا مٹی اور گارے سے اپنے قصبہ کا ایک خاکہ، پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے نقشے سے جو اسکیل کے مطابق کسی بڑے کاریگر کا بنایا ہو، تعلیمی اعتبار سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یہ حقیقت میں موٹر، گائے اور بستی کا نقشہ نہیں ہے جو تعلیمی قدر و قیمت رکھتا ہے، بلکہ وہ عمل ہے جس میں بچہ اس کے بنانے اور تیار کرنے کے سلسلے میں مصروف کار رہا ہے۔ اس کی پیمائش اس پیمانہ سے کرنی چاہیئے جو یہ بتائے کہ اس کام نے کہاں تک اس کی فطری ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ اور بچہ نے اس عمل کے دوران میں کہاں تک اپنے خیالات اور جذبات کی نشو و نما میں مدد لی ہے۔ تعلیم میں ہاتھ کے کام کو اور بالخصوص اوائل عمر کی تعلیم میں اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے نہ کہ کسی اور حیثیت سے۔

تعلیم میں ہاتھ کے کام کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ چیزوں کے برتنے اور ان کے استعمال سے بچہ میں تصورات کا نشو و نما ہوتا ہے۔ وہ ان اشیاء کی مدد سے اپنے اور اپنے سے خارج کے درمیان امتیاز کرنا سیکھتا ہے، من و تو کا فرق بچہ سب سے پہلی بار اپنی پیالی اور اپنے بھائی بہن کی پیالیوں کے درمیان فرق سے سیکھتا ہے۔ وہ دودھ پینے کے سلسلے میں سب سے پہلی بار اس فرق کو محسوس کرتا ہے کہ یہ میری پیالی ہے اور یہ ننھے یا منّی کی ہے۔

بچہ کے ذہن میں یہ تصورات غالباً اشیاء سے سب سے پہلے نہیں آتے، جتنے ان اشیاء کی غرض و غایت سے آتے ہیں۔ وہ ان اشیاء کو ان کی غرض و غایت سے پہچانتا ہے۔ ان کے عمل و فعل سے جانتا ہے۔ وہ گیند کو گیند اس لئے جانتا ہے کہ وہ اس کے کھیلنے کی ایک چیز ہے، ورنہ فی الحقیقت اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کرسی اس کے نزدیک بیٹھنے کی ایک چیز ہے، ورنہ چار پایوں کا ایک ڈھانچہ بھر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی طرح کام اور عمل کے لحاظ سے اس کے خیالات اور تصورات کا دائرہ بنتا ہے، نہ کہ وہ مجرد طور پر اس کے اندر پیدا ہوتے ہوں۔ ہماری تمام زندگی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ زندگی سے خارج کر دیئے جائیں

تو یہ دنیا سونی ہو جائے اور انسانی تہذیب پھر اپنے ابتدائی دَور میں پہنچ جائے۔

ہاتھ کے کام کے اوائل عمر کی تعلیم میں شامل کئے جانے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اس سے بچہ کی اکثر جبلتوں کے نشو ونما اور تربیت میں مدد ملتی ہے، بچہ ابتداء سے چیزوں کے بنانے بگاڑنے، لا لاکر اکٹھا کرنے اور اِدھر اُدھر تلاش و جستجو کا عادی ہوتا ہے۔ مدرسہ میں ہاتھ کے کام سے اس کی ان جبلتوں کی تشفی ہوتی ہے، اور یہی جبلتیں ان کاموں سے ترقی پاکر اس کی شخصیت اور سیرت کا مستقل جزو بنتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا اکثر حصہ بچوں کے ایسے مشاغل پر منحصر ہونا چاہیے جس سے ان کے ان جذبات اور میلانات کی تربیت اور نشو ونما میں مدد ملے، ان کے لئے کوئی کام اس سے زیادہ شوق اور انہماک کا نہیں جو ان کی ان جبلتوں کو اپیل کرتے ہوں وہ کبھی ان کاموں اور شغلوں سے اکتاتے نہیں ہیں، بلکہ وہ ان کے سند شوق کے لئے ایک اور تازیانے کا کام دیتے ہیں۔ وہ چیزوں کو نہایت انہماک اور دل بستگی کے ساتھ بناتے ہیں اور پھر چونکہ وہ ان کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں، اس لئے وہ انھیں بڑی حفاظت اور احتیاط کے ساتھ رکھتے بھی ہیں۔ وہ چیزوں کو جمع بھی کرتے ہیں اور اپنی بنائی ہوئی چیزیں ہوں یا اِدھر اُدھر سے اکٹھا کی ہوئی، وہ ان کا اس طرح ذخیرہ کرتے ہیں جیسے چیونٹی اناج کا یا بخیل اپنے مال کا۔

تعلیم میں ہاتھ کے کام کا صرف یہی ایک پہلو نہیں، بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ بچہ اس کے ذریعہ اپنی قوتِ تخلیق کی نشو ونما کرسکے۔ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور شانِ خداوندی کی ایک بڑی صفت خلاقی ہے۔ وہ چیزوں کو نیست سے ہست میں لاتا ہے۔ بچہ بھی اپنی اس شانِ الوہیت کے اظہار کے لئے بے چین اور مضطرب رہتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک تودہ دے دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اس سے کیا کیا شکلیں بناتا ہے۔ یا اس کے ہاتھ میں ایک ماڈل؟ اور گھلنے ہوئے رنگ کے ڈبے دے کر پھر اس کے شاہکاروں کا تماشہ دیکھئے۔

اس کی قوتِ تخلیق کے لئے کھریا مٹی کا ایک ٹکڑا یا کوئلے کی ایک ڈلی کافی ہے۔ وہ اپنی اس قوت سے کام لے کر کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی مخلوق اور صنعت گری کے نمونوں

میں آپ کو معنی و مطلب پہنانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ آپ اُن کے نکات اور باریکیوں کو سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک مروجہ شکل اور معروف صورت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں خلاق اور صورت گر ہے۔ وہ ایسی شکلیں اور صورتیں بناتا ہے جس کو صرف اُسی کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ بعد میں وہ آپ مروجہ شکلوں اور معروف طریقوں سے تطابق پیدا کر لیتا ہے۔

تعلیم میں ہاتھ کے کام کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ پروفیسر ڈِوئی اور ان کے پیرووں کا یہ خیال ہے کہ بچہ کی بہترین تعلیم ان انسانی مشاغل کے ذریعہ ہو سکتی ہے جو نسلاً بعد نسلاً آج تک چلے آتے ہیں۔ مثلاً کپڑے بُنتا۔ کھانا پکانا، باغبانی یا زراعت کا کام، شکار کرنا وغیرہ۔ بچہ کو ان مشاغل زندگی میں عملی شرکت سے ان تمام حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جو کبھی اس کے آباؤ اجداد کو پیش آئے تھے۔ اور جس طرح انہوں نے اپنے تجربہ اور کوشش سے ان حالات پر قابو پایا اور تہذیب کے مدارج تک پہنچے، اسی طرح بچے بھی ان مشاغل کے ذریعہ یہ سیکھیں گے کہ ہماری سماج نے کس طرح درجہ بدرجہ ترقی کی ہے، اور ہماری سماج کے اندر کیا کیا مسائل ہیں جن کا حل ہمیں تلاش کرنا ہے۔ مدرسہ کے یہ مشاغل جتنا ہی اس کے گھر اور اس کی سماجی زندگی سے قریب ہوں گے، اسی قدر وہ ان مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور ان کے حل کرنے کی تدبیریں سوچ سکیں گے۔ جب تک بچے خود ہاتھ کے کام سے واقف اور اس کے کرنے کے عادی نہ ہوں گے، اس وقت تک وہ ان کاموں کے سماجی پہلوؤں سے بھی آشنا نہ ہوں گے اور ان میں ان کام کے کرنے والوں سے کوئی ہمدردی اور تعلق پیدا نہ ہوگا۔

ان مشاغل سے انھیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کا موقع ملے گا جس سے انھیں اشتراکِ عمل اور تعاونِ باہمی کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ ہوگی وہ کسی کام کو ہاتھ میں لیں گے تو اسے وقت مقررہ کے اندر پورا کرنے کا خیال بھی رہے گا جس سے ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا۔ کام پورا کرنے کے بعد وہ اس کی بھلائی بُرائی کو بھی جانچیں گے

اسی طرح ان میں صحیح نقد اور اچھی پرکھ پیدا ہوگی یہ سب اخلاقی خوبیاں ایک اچھی سماجی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ پروفیسر ڈیوی نے اپنے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شکاگو یونیورسٹی کے ما تحت ایک مدرسہ کھولا تھا جس میں انہوں نے خاص طور پر تین ہاتھ کے کام انتخاب کئے تھے:۔

۱۔ کھانا پکانا۔ (۲) کپڑا بننا، اور (۳) باغبانی کا کام، کہتے ہیں وہ اسکول تو کچھ بہت دنوں چلا نہیں لیکن اس کی خاک سے سیکڑوں مدرسے پیدا ہوئے جنہوں نے انہی اصولوں کی بنیاد پر کام کر کے دکھا دیا، اور آج امریکہ میں ابتدائی تعلیم کا کوئی مدرسہ ایسا نہیں جس میں ہاتھ کے کام کا تصور بطور بنیاد تعلیم کے نہ ہو۔

ہاتھ کا کام ابتدائی تعلیم میں تو محض کچھ محاسن کے پیدا کرنے، بعض اصولوں کے سکھانے اور معلومات اور واقفیتیں حاصل کرنے کے ذریعہ کے طور پر ہے، لیکن ثانوی کی منزل میں تو یہ کام بہ حیثیت فن اور پیشہ کے رکھا گیا ہے اور ہاتھ کے کام کے اکثر مدرسے کسی نہ کسی بڑی صنعت یا کارخانے سے وابستہ ہیں تاکہ انھیں اس کام کی نت نئی تبدیلیوں اور اہم ضرورتوں کا علم ہوتا رہے اعلیٰ منزل میں جہاں علوم وفنون کی بیشتر نظری اور معیاری تعلیم ہوتی ہے، ان حرفوں اور پیشوں کی تعلیم بھی اسی معیار پر دی جاتی ہے، اور ان کے لئے وہی ڈگریاں اور اسناد عطا کی جاتی ہیں جو اب تک کسی ذہنی اور فکری علوم کے لئے مخصوص رہی ہیں۔

لیکن یہ سب اور اس سے کچھ زیادہ ہی ہاتھ کے کام کا مفہوم ایک اور ہے جو بنیادی تعلیم کی اسکیم میں ہے۔ اس میں حرفہ بطور ایک مضمون کے نہیں بلکہ ساری تعلیم کی بنیاد اور تمام مضامین کے مرکز کے طور پر ہے۔ اور اس میں نہ صرف اس پر زور دیا گیا ہے کہ تمام مضامین کا اس کے ساتھ ربط ہو بلکہ تمام زندگی اس سے مربوط اور منسلک ہو۔ تعلیم میں ہاتھ کے کام کا یہی ایک منشا نہیں کہ اس سے بچہ کی کلی نشوونما، اور اس کی ذہنی وجسمانی قوا کے یکساں کام میں لانے کا موقع ملے، اس سے بچہ کی قوت تخلیق کو بروئے کار لانے کا سامان میسر آئے۔ بچہ جب کچھ بنا لیتا ہے تو اپنی اس مادی مخلوق کو دیکھ کر اس سے مسرت وخوشی کا حصول بھی کرتا ہے

جو اس کے جذبات کی تربیت واصلاح کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی ذہنی اور جذباتی زندگی کی نشو ونما کا جہاں ایک بڑا وسیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ محسوس اور مادّی طور پر اپنے قوار سے کام لے اور کوئی نہ کوئی شے نیست سے ہست میں لائے، وہاں اس کی بھی بڑی ضرورت ہے کہ اس کی اس زندگی میں کوئی وحدت اور یگانگت پیدا ہو۔ موجودہ نصاب میں مضامین کا متفرق اور منتشر طور پر پڑھایا جانا اس کی سیرت کی اس یکانگت کو توڑتا اور صدمہ پہنچاتا ہے۔ بعض بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم عرصہ سے اس کوشش میں تھے کہ نصاب کے اس انتشار اور طریقہ تعلیم کے اس نقص کو کسی نہ کسی طرح دور کیا جائے اور کوئی ایسا مرکز تلاش کیا جائے جس سے مدرسہ کے سب مضامین یا ان میں سے اکثر باہم مربوط اور مرکوز کئے جاسکیں۔ کسی نے یہ رشتہ ادب سے جوڑا، اور تاریخ، جغرافیہ اور دوسرے مضامین کو اس سے مربوط کیا۔ کسی نے یہ تعلق سائنس سے قایم کیا اور ریاضی، معلومات اور دوسرے مضامین کو اس سے منسلک کیا۔ لیکن حرفہ یا کسی ہاتھ کے کام سے تمام مضامین کو ربط دے کر پڑھانے کی سب سے پہلی کوشش بنیادی تعلیم کی اسکیم میں کی گئی ہے اور ہاتھ کا کام بھی ایسا کام جو کسی بستی یا آبادی کی زندگی کا تمام تر مرکز ہو۔ اس طرح بچہ کے تمام ضروری معلومات اور واقفیتیں اور اس کی ہر قسم کی مہارتیں جو ایک عام زندگی کے لئے ضروری ہیں وہ سب اس بنیادی ہاتھ کے کام سے مربوط اور منسلک کی جاسکتی ہیں۔ تعلیم میں ہاتھ کے کام کی یہ ایک بالکل انوکھی شکل ہوگی۔ اس سے نہ صرف تمام تعلیم میں ایک نئی روح بلکہ ساری زندگی میں ایک جان پڑ جائے گی۔ اس شکل میں حرفہ نہ صرف بچہ کی شخصی زندگی اور اس کی انفرادی صلاحیتوں کی تربیت کا ایک ذریعہ ہوگا بلکہ وہ بچہ کی تمام سماجی، معاشی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہوگا۔ بچہ میں اخلاقی احساس پیدا کرنے اور اس کو ایک سماجی انسان بنانے کا اس سے بہتر بھی اور کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے کہ اسے بستی یا آبادی کے اس بنیادی شغل کے ذریعہ تعلیم دی جائے جس پر ساری آبادی کی اخلاقی اور مادّی زندگی کا دار و مدار ہے؟

سویت یونین کی تعلیم

حکیم ارسطو کا قول ہے: "کسی ریاست کا انحصار اس کے نظام تعلیم پر ہے، اگر کوئی ریاست قایم رہنا چاہتی ہے تو اسے اپنے افراد کی اس طرح تعلیم وتربیت کرنا چاہیے کہ وہ اس کے دستور اساسی کی روح کو اپنی ذات میں جذب کرلیں۔" یہ قول سویت یونین کی ریاست پر حرف بحرف صادق آتا ہے، لہذا سویت کے تعلیمی نظام کو بخوبی سمجھ لینے سے ہمیں مندرجہ بالا سوال کا جواب بڑی حد تک مل جائے گا اور اس سلسلے میں بعض عام غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوجائے گا۔

ریاست اور تعلیم

اس وقت سویت یونین اپنے عبوری دور میں ہے۔ یہ سوشلزم کی منزل ہے جسے سرمایہ داری اور کمیونزم کے بیچ کا مرحلہ سمجھنا چاہیے۔ سوشلزم اور کمیونزم میں خاص فرق یہ ہے کہ سوشلزم تجویز کرتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق اُجرت ملنی چاہیے لیکن کمیونزم میں فرد کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کے کام کے بدلے میں اس کی ساری ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ ذرائع پیداوار پر دونوں صورتوں میں ریاست ہی قابض رہتی ہے اور کوئی شخص کسی دوسرے کی محنت سے اپنی ذاتی دولت میں اضافہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس طرح سویت یونین نے بہت سی ان خرابیوں کی جڑ کاٹ دی ہے جو ہر سرمایہ دارانہ ملک میں ذاتی ملکیت کی وجہ سے پائی جاتی ہیں۔ موجودہ سویت حکومت کا طبقاتی رنگ بہت نمایاں ہے۔ واقعی یہ حکومت مزدوروں اور کسانوں کی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ کا حکومت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ سویت یونین کی سوشلسٹ حکومت کو رفتہ رفتہ ایک کمیونسٹ سوسائٹی میں تبدیل کرنا مقصود ہے، اس لئے سردست اس کی بنیاد پرولیتاری آمریت پر قایم ہے۔ سویت یونین کی روح رواں مزدور اور

کسان ہیں۔ یہ ریاست غیر جانب دار رہ کر اپنے بنیادی اصولوں میں ترمیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، سرمایہ دار طبقہ کو ختم کرنا اس کی حیات کے لئے ناگزیر ہے جس کے بغیر صحیح معنوں میں یہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت نہیں بن سکتی۔ اس لئے وہ شروع ہی سے اسی جد و جہد میں مصروف ہے۔ اس کا ثبوت ہر قدم پر ملتا ہے، سرکاری مدارس میں پرولیتاری (محروم الملک) لوگوں کے بچوں کو سب سے پہلی جگہ ملتی ہے۔ اگر کسی مدرسہ میں کم گنجائش ہے تو بورژوا (سرمایہ دار) کے بچے داخل نہیں کئے جاتے، عام مدرسوں میں جہاں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے ان اقوام کے بچوں کو خاص طور پر مراعات حاصل ہیں جو کہ تمدنی اعتبار سے صدیوں سے گھٹیا قسم کی زندگی گزارنے پر مجبور رہی ہیں۔ سویت نظام تعلیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عوام کی تعلیم و تربیت میں سنجیدگی اور خلوص سے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ لینن کی بیوی کرپ سکایا کے حسب ذیل الفاظ اس حقیقت کو بہت صفائی سے ظاہر کرتے ہیں:۔

"مرد اور عورت، مزدور اور کسان ساتھیو! میں تم سے ایک بڑی مدد مانگتی ہوں اگر تم یہ کر سکو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ لینن کی شخصیت کا احترام محض دکھاوے کے لئے نہ کرو، اس کی یادگار قایم کرنے کے لئے اس کا بت نصب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنی زندگی میں اس قسم کی کسی چیز کا متمنی نہیں تھا، یاد رکھو کہ ہمارے ملک میں افلاس اور بربادی کی انتہا ہے، اگر تم لینن کے نام کی عزت کرنا چاہتے ہو تو بچوں کی تعلیم و تربیت کے ادارے قایم کرو۔ کنڈر گارٹن اور اسکول کھولو، کتب خانے اور ہسپتال بناؤ"

تعلیم کا مقصد

سویت تعلیم کا مقصد کمیونسٹ شہری تیار کرنا ہے۔ جو کہ کمیونسٹ سوسائٹی کی تخلیق و تعمیر میں معاونت کر سکے۔ برخلاف سرمایہ دار ملکوں کے کہ جہاں تعلیم کے مقاصد بہت مبہم ہیں، کمیونسٹ معلمین اور رہنماؤں کے [illegible] کا مقصد بہت واضح اور صاف ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ شہری میں کون کون سی باتیں ہونا چاہئیں اور وہ کیونکر پیدا کی جاسکتی ہیں، کمیونسٹ شہری کو کمیونزم کے بنیادی اصولوں سے متفق ہونا

ازبس ضروری ہے۔ اجتماعیت، ذاتی جائداد کا خاتمہ، پرولیتاریہ امارت اور طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ طبقات کی بیخ کنی۔ وغیرہ، وہ چیزیں ہیں جن کے حصول کے لئے علمی جدوجہد درکار ہے۔ کمیونسٹ شہری کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اس نئے سماجی نظام کے قیام میں مقامی حیثیت سے سرگرم پیکار رہے، لہٰذا اُسے جارحانہ قسم کا انقلابی بنتا پڑیگا۔ اُسے بچپن سے سماج کی فلاح وبہبود میں کا آمد اور مفید محنت ومشقت کے ذریعہ حصّہ لینا ہوگا۔ کیونکہ آمریت پرولیتاریہ کی یہی نیو ہے لہٰذا ضروری ہے کہ وہ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے صحت مند اور طاقتور رہے۔ اُسے ان توہمات اور مذہبی گورکھ دھندوں سے نجات حاصل کرنی چاہئے جو افراد کو بے معنی رسوم وروایات کے بے بس غلام بنائے رکھتے ہیں، اس لئے اس میں سائنٹفک نظر پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ اُسے اس دن کو قریب تر لانے کی انتھک کوشش کرنی چاہئے جب کہ ساری دنیا میں پرولیتاریہ آمریت قایم ہو جائے گی۔ کمیونسٹ سوسائٹی میں لڑکے اور مرد سے جو توقعات وابستہ ہیں وہی لڑکی اور عورت سے بھی ہیں جنہیں بورژوا سوسائٹی نے بظاہر اچھے اور معقول حیلوں سے محکوم اور مجبور رکھا ہے۔ لہٰذا سویت یونین میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے مقاصد اور طریقوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

تعلیم وتربیت کے مفصلہ بالا مقاصد نہ صرف مدرسے کی چار دیواری تک محدود ہیں، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ان کی کارفرائی نظر آتی ہے" زندگی تعلیم ہے اور تعلیم زندگی" کا زریں اصول دنیا کے اور کسی دوسرے ملک میں اتنی سچائی اور شدت کے ساتھ عمل میں نہیں لایا گیا ہے جتنا کہ سویت یونین میں۔ یہاں تعلیمی لحاظ سے مدرسے اور سماج کے درمیان کوئی خلا نہیں ہے، یہاں ان میں باہمی رابطہ وضبط پیدا کرنے کے لئے دوسرے ممالک کی طرح مصنوعی کوشش نہیں کرنی پڑتی کیونکہ اس کے نتائج اکثر مبہم اور بے اثر ہوتے ہیں۔ پرولیتاری ریاست کے سارے وسائل تعلیمی پروگرام کی معاونت کرتے ہیں۔" وہ ایک نئی نسل اور نئے نصب العین کے پیدا کرنے میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔"

نظامِ تعلیم

سویت نظام میں ضابطہ کی تعلیم اور بے ضابطہ تعلیم کے درمیان حدِ فاصل قایم کرنا بہت دشوار امر ہے، کیونکہ تمام وسائل اور مشاغل جن کا تعلیم سے تعلق ہے ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں اور سب کا مقصد ایک ہی ہے یعنی انقلاب کے بنیادی اصولوں کو تقویت پہنچانا۔ زار کی حکومت کا انحصار قدامت پسندی اور قومیت پر تھا، اس لئے اس زمانہ میں تعلیم محض چند مخصوص لوگوں کے اجارے میں تھی جو امراء اور سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور مدرسہ باضابطہ قسم کی کتابی تعلیم کا مرکز تھا جس میں عملی کام کو کوئی دخل نہیں تھا۔ برخلاف اس کے اب مدرسہ عوام کے لئے ہے جس کا تعلق براہِ راست تمام سماجی اداروں سے ہے اور اس میں ہاتھ کا کام مرکزی حیثیت رکھتا ہے، جہاں دورِ قدیم میں طلبہ کی انجمنیں ممنوع قرار دی گئی تھیں، اب وہاں انہیں طالب علمانہ زندگی کا ضروری اور لازمی عنصر سمجھا جاتا ہے۔

مدرسہ کی سیاسی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لینن نے کہا ہے "یہ شرارت آمیز جھوٹ ہے اور بدترین منافقت ہے کہ مدرسہ زندگی یا سیاست سے الگ اپنا کوئی وجود رکھ سکتا ہے۔ بورژوا سوسائٹی ہمیشہ اپنے تسلط اور اقتدار کو قایم رکھنے کے لئے اس مکر و فریب سے فائدہ اٹھاتی رہی ہے کہ مدرسہ سیاسی اعتبار سے غیر جانب دار ہے اور سب کی خدمت کے لئے ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس فریب کا پردہ چاک کرکے اس حقیقت کو سب پر روشن کردیں جسے سرمایہ دار طبقہ نے اپنے وجود کو قایم رکھنے لئے بہت چالاکی اور کامیابی سے اب تک چھپائے رکھا ہے یعنی "مدرسہ کا سیاسی کام"۔ لینن کا یہ قول سویت کے تعلیمی نظام پر لفظاً صادق آتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ارکین کی ٹریننگ بچپن ہی سے شروع ہوتی ہے۔ تعلیم کی ہر منزل پر محنت و مشقت کا کام اور سیاسی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ ہر بچے کو زندگی کے مقصد اور پرولیتاری تحریک اور جدوجہد سے روشناس کیا جاتا ہے اور اسے اپنی صلاحیت کے مطابق کسانوں اور مزدوروں کی عملی مدد کرنے کے ڈھب سکھائے جاتے ہیں۔

تعلیمی انتظامات کے لیے سویت یونین کا ہر ریپبلک آزاد ہے۔ یونین میں ایسا کوئی مرکزی شعبہ نہیں ہے جو تمام ملک کے تعلیمی امور کی نگرانی کرے لیکن ان تمام آزاد ریاستوں کے وزیر تعلیمات مشترکہ کانفرنسوں کے ذریعہ کسی حد تک تعلیمی معاملات میں یک جہتی اور یکسانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہر ریاست کی تعلیمی نگرانی اور رہنمائی نہ صرف اس کے شعبہ تعلیمات سے متعلق ہے بلکہ اس میں ریاست کے دوسرے شعبہ جات بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ مزدوروں کے یونین کی مرکزی کونسل کی تمدنی اور تعلیمی شعبہ مزدوروں کی سیاسی تعلیم، کلب اور کتب خانوں کا اہتمام کرتا ہے سرخ فوج کی سیاسی تعلیم فوجی شعبہ سے متعلق ہے۔ اور اسی طرح ریلوے اور دوسرے ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کے کارکنان کے تعلیمی مشاغل کی تنظیم متعلقہ شعبے کرتے ہیں۔ صنعت و حرفت اور عام تعلیم کے باہمی ارتباط کی دیکھ بھال قومی تعلیم کی مجلس اعلیٰ کے ذمہ ہے اس کے علاوہ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا ایک وسیع پروگرام کمیونسٹ پارٹی کے زیر اہتمام عمل میں آتا ہے جس میں ناخواندوں کی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی تعلیم تک شامل ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ کمیونسٹ انقلاب کی سب سے بڑی انقلابی چیز تعلیم کی تنظیم ہے۔ سویت یونین میں تعلیم کے مقاصد کا تعین اور تعلیمی اور انتظامی کارکنان کا تقرر کر دینے کے بعد معلمین کو تعلیم و تربیت کے میدان میں کافی آزادی دی جاتی ہے، وہ اپنے کام میں ذاتی اپج اور سوجھ بوجھ سے کام لے سکتے ہیں۔ انھیں حق حاصل ہے کہ مجوزہ نصاب کی جزئیات مقامی احوال کے مطابق متعین کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مقامی نظام تعلیم کے مقابلہ میں مرکزی نظام تعلیم کا معیار کارکردگی زیادہ اونچا ہو سکتا ہے لیکن مرکزی نظام تعلیم میں یہ نقص ہوتا ہے کہ نہ تو وہ افراد کی تخلیقی قوتوں کی نشو و نما کے لئے کافی مذاق مہیا کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ سماج کی بدلتی ہوئی ضروریات سے مطابقت کر سکتا ہے۔ تعلیم ایک جیتی جاگتی چیز ہے۔ یہ ایک وسیع خطہ میں ایک ہی

قسم کی نہیں ہوسکتی اگر مقامی حالات کو نظر انداز کرکے تعلیم میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو ڈر ہے کہ اس کی روح فنا ہوجائے گی اور یہ ایک متحرک قوت ہونے کے بجائے ایک جامد شے بن کر رہ جائے گی۔ اس لحاظ سے سویت یونین کا نظام تعلیم ایک زندہ اور آگے لے جانے والی طاقت ہے۔ آج سویت کے گاؤں اور شہر کے مدرسوں میں تنوع کے اس اصول کی کارفرمائی صاف صاف نظر آرہی ہے۔ تعلیمی کارکنان کو بہت واضح ہدایات دی جا رہی ہیں کہ وہ دیہی تعلیم اور دیہی زندگی میں ترقی پیدا کریں۔ نصاب تعلیم میں نہ صرف سائنس کے چند ایک تجربے رکھے گئے ہیں بلکہ زراعتی فارم میں عملی کام کرنا بھی تجویز کیا گیا ہے۔ ہر دیہی مدرسہ سے ملحق کھیتی باڑی کے لئے کافی زمین ہوتی ہے۔ جس میں طلبہ خاص طور پر پھلوں اور سبزی کی کاشت کرتے ہیں۔ نیز اس کے ساتھ ایک ورکشاپ ہوتی ہے جس میں ٹریکٹر اور بجلی کا استعمال، اور مشین کی مرمت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ مدرسہ کے زراعتی فارم کے ایک حصہ میں نئے نئے اناج بونے اور پیدا کرنے کے تجربے کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایسے مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ عجیب عجیب دریافتیں اور انکشافات کر رہے ہیں چنانچہ ۴۲ء میں نکولائی استین نامی روسی نوجوان نے اپنے تجربوں کی مدد سے سدا بہار گیہوں کا پودا تیار کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب کسانوں کو بار بار ہر برس بیج بونے کی ضرورت نہیں رہیگی اسی طرح سویت ایشیا میں کوک سگز نام کا ایک پودا کھوج نکالا گیا ہے جس سے ربر تیار کی جاسکتی ہے۔ اب اس پودے کی کاشت کر کے اس سے ربر پیدا کرنے کا تجربہ امریکہ اور انگلستان میں بھی کیا جا رہا ہے جس کے نتائج بہت امید افزا معلوم ہوتے ہیں۔

تعلیمی منازل سویت یونین میں تعلیم و تربیت پر بچے کی پیدائش کے دن ہی سے توجہ دی جاتی ہے۔ تین سال کی عمر تک اس کی دیکھ بھال شعبہ صحت و تندرستی کے ذمہ ہوتی ہے بسلسلہ ۱۹۳۶ء میں ہر کارخانہ اور اجتماعی فارم کے لئے احکامات نافذ کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے اراکین کے بچوں کی تربیت کے لئے تربیت گاہیں مہیا کرے۔ اس قسم کی تربیت گاہ

کریشے (Creches) کہتے ہیں۔ یہاں مائیں کام کے اوقات میں اپنے گود کے بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں جن کی دیکھ بھال تربیت یافتہ نرسوں کے ذمہ ہوتی ہے۔ یہاں بچوں کی خاطر مختلف قسم کے کھلونے اور مشغلے مہیا کئے جاتے ہیں اور صحت و تندرستی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب اور موزوں قسم کی غذا فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر محلے میں بچوں کے لئے جداگانہ کریشے ہوتے ہیں جن میں اس محلہ کی کلچر کمیٹی کے زیر اہتمام بچوں کے تفریحی مشاغل کا انتظام ہوتا ہے یہاں بچوں کو کھیل کود، موسیقی، رقاصی، ڈراما، دستکاری وغیرہ کے مواقع مہیا کئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد نرسری انفنٹ اسکول کی منزل شروع ہوتی ہے جن میں تین سال سے آٹھ سال کی عمر تک بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ اسکول بھی کریشے کی طرح متعلقہ کارخانے یا اجتماعی فارم کو چلانا پڑتا ہے لیکن جہاں یہ ممکن نہیں ہے وہاں شعبہ تعلیمات کی طرف سے مدرسہ قایم کیا جاتا ہے۔

آٹھ سال کے بعد لازمی یا جبریہ تعلیم شروع ہوتی ہے، اسے ابتدائی یا پرائمری تعلیم کی منزل سمجھنا چاہئے۔ اس اسکول میں ایک جماعت کا صرف ایک ہی استاد ہوتا ہے اور وہ سارے مضامین مربوط طور پر پڑھاتا ہے۔ تعلیم کی یہ منزل ۱۲ سال کی عمر پر ختم ہوتی ہے۔

اس کے بعد ثانوی تعلیم کی منزل آتی ہے۔ سب بچے لازمی طور پر مڈل اسکول میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں ۱۵ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم کی یہ دونوں منزلیں ایک ہی نگرانِ مدرسہ کے ماتحت ختم ہوتی ہیں۔ ان مدرسوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور بغیر کسی امتیاز کے مرد اور عورت دونوں استاد کی حیثیت سے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ ان مدرسوں کی افسر اعلیٰ اکثر عورتیں ہوتی ہیں۔ ۱۵ سال کی عمر تک کی یہ عام تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ اس کے بعد ثانوی مدرسہ کی تین اعلیٰ جماعتوں میں فیس لی جاتی ہے۔ مڈل اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہر لڑکے اور لڑکی کو اپنے لئے طے کرنا ہوتا ہے، اب اُسے کیا کرنا چاہئے جن لوگوں کا میلان طبع صنعت کی طرف ہوتا ہے وہ صنعتی مدرسوں میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ

ریاست کی طرف سے دو سال تک مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس دوران میں ان کے سارے اخراجات منجملہ لباس خوراک وغیرہ ریاست برداشت کرتی ہے۔ یہ ٹریننگ، عام تعلیم صنعت کے متعلق تجربی سائنس اور ورک شاپ کے عملی کام پر مشتمل ہوتی ہے، جو نوجوان درمیانی درجے کے اسپشلسٹ (Specialist) بننا چاہتے ہیں، وہ پیشہ ورانہ ٹریننگ اسکول میں داخل ہوتے ہیں جنہیں ٹیکنی کم (Technicum) کہتے ہیں۔ یہ اسکول صنعتی، اقتصادی یا زراعتی ادارے اپنے طور پر چلاتے ہیں۔ البتہ معلمی کے ٹریننگ اسکول شعبہ تعلیمات کی طرف سے قایم ہیں لیکن ان تمام پیشہ ورانہ اسکولوں کے تعلیمی امور شعبۂ تعلیمات سے متعلق ہیں۔ موسیقی، آرٹ، قانون، ڈراما، تجارت وغیرہ کے لئے مختلف ٹریننگ اسکول قایم ہیں جن میں تقریباً ۷۰ روپے سالانہ فیس لگتی ہے لیکن جو طالب علم اپنے کام میں ہوشیار ہوتے ہیں ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

کچھ نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا رجحان خاص طور پر علمی ہوتا ہے۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر تک ثانوی مدرسہ میں اپنی تعلیم جاری رکھتے ہیں اُنھیں آخری تین سال میں ٹیکنی کم کی طرح فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد انھیں طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ کونسا پیشہ اختیار کریں گے وہ اپنی خواہش کے بموجب متعلقہ یونیورسٹی یا انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ کی درخواست کرتے ہیں یہاں داخلہ کا ایک امتحان ہوتا ہے اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کی صورت میں وہ داخل کرلئے جاتے ہیں۔ اس تعلیم کے لئے انھیں فیس ادا کرنی پڑتی ہے لیکن جو طلبہ داخلہ کے امتحان یا سالانہ امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرتے ہیں ان کی فیس معاف ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہوشیار طلبہ کو اور بھی سہولتیں از قسم وظائف وغیرہ فراہم کی جاتی ہیں۔ یتیم یا ایسے بچوں کو جن کے والدین کسی وجہ سے بے دست و پا ہوگئے ہیں، اسی قسم کی رعایتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم چار پانچ سال تک جاری رہتی ہے اور آخری دو سال میں ہر طالب علم کو ۴۰ ہفتے وقت عملی کام پر صرف کرنا پڑتا ہے۔

ہر پیشے کے اعلیٰ صیغوں کے لئے یونیورسٹی کی ٹریننگ ناگزیر سمجھی جاتی ہے۔ چاہے وہ انجنیرنگ ہو یا زراعتی ریسرچ، معلمی ہو یا وکالت، موسیقی ہو یا ڈراما اور فلم آرٹ ہو یا صحافت۔

مفصلہ بالا تعلیمی مواقع کے علاوہ اور بھی بہت سے تعلیمی وسائل ہیں جن سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مزدوروں کی علمی مجلس (Workers Faculties) کی طرف سے کارخانے کا ہر مزدور تین سال تک مفت تعلیم حاصل کر کے یونیورسٹی میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے کورس زراعتی فارم بھی منظم کرتے ہیں۔ جو مزدور اپنے کام میں زیادہ ہنر مندی کا اظہار کرتے ہیں وہ متعلقہ صنعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے صنعتی اکادمی میں پانچ سال کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں اور اس تعلیم کا سارا خرچہ کارخانہ برداشت کرتا ہے۔ اس کورس کو ختم کرنے کے بعد وہ صنعتی کارخانوں میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات کئے جاتے ہیں۔

جسمانی یا ذہنی اعتبار سے کمزور بچوں کی تعلیم کے لئے خاص قسم کے مدرسے کھولے گئے ہیں، ماسکو اور لینن گراڈ میں اس شعبہ میں تحقیق و تفتیش کی خاطر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قایم کی گئی ہیں۔ اس طرح غیر معمولی مخصوص صلاحیتوں کے بچوں کے لئے خاص ادارے قایم کئے گئے ہیں۔ سات، آٹھ سال کے بعض بچوں میں موسیقی، آرٹ، رقاصی وغیرہ کی صلاحیتیں نمایاں نظر آتی ہیں، ایسے بچے موزوں مدرسوں میں بھیجدئے جاتے ہیں جہاں وہ عام تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کی چیزیں خاص طور سے سیکھتے ہیں ایسے مدرسے عام طور پر اقامتی ہوتے ہیں تاکہ ان میں دور دراز دیہی علاقوں کے بچے بھی داخل ہو سکیں، ان مدرسوں میں بھی ۱۵ سال کی عمر تک مفت تعلیم دی جاتی ہے۔

جہاں تک تعلیمی منازل کا تعلق ہے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی کم وبیش تعلیم کی یہی تین منزلیں، ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ہوتی ہیں۔ لیکن تعلیمی نصب العین اور نصاب میں بڑا اختلاف ہے، تقریباً سب ہی سرمایہ دار ملکوں میں لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے اور اس منزل میں کم وبیش ہر جگہ ہاتھ کے کام پر زور دیا جاتا ہے لیکن سویت یونین کے سوا کہیں بھی صحیح معنوں میں ہاتھ کے کام کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، اس لئے اس کی سماجی

اور اقتصادی اہمیت اور وقعت کا احساس سرمایہ دار ملکوں کے بچوں میں پیدا نہیں ہو سکتا ان ملکوں میں ثانوی تعلیم کو اب تک "لبرل ایجوکیشن" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں خالص کتابی تعلیم جس میں ہاتھ "میلے" ہونے کا اندیشہ نہیں۔ اس کے برعکس سویت یونین میں ثانوی تعلیم بھی اور دوسری منزلوں کی طرح نئے نظام کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نصب العین کے ماتحت دی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں ہاتھ کے کام اور ذہنی کام کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ کمیونسٹ نظریات کی رو سے تعلیم کو محنت و مشقت کے کام سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی تعلیم سماج کی دیگر ضروریات کو نظرانداز کر سکتی ہے۔

نصاب تعلیم مدرسوں کے نصاب تعلیم کے ترتیب دینے میں سوشلسٹ سماج کی ضرورتیات کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، مادری زبان کو دیگر مضامین سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ سویت شہری کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو سلیقہ اور صفائی کے ساتھ ظاہر کر سکے۔

ہر منزل کا نصاب متعلقہ شعبہ ترتیب دیتا ہے قبل اس کے کہ یہ مجوزہ نصاب رائج کیا جائے متعلقہ اساتذہ کے پاس بھیج دیا جاتا ہے کہ وہ اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر سکیں اور ضروری ترمیمات پیش کریں۔ ان آرا اور سفارشات کی روشنی میں نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی اس پر از سر نو غور کرتی ہے اور ضروری تبدیلیاں کر کے اسے رائج کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح نصاب میں اساتذہ کے خیالات کا پرتو لازمی طور پر نظر آتا ہے، اس کے علاوہ مقامی حالات کے مطابق اساتذہ کو مقررہ نصاب میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ابھی سویت کے نصاب تعلیم میں بھی جمہوری اصول کارفرما ہیں۔

سویت میں عام رواج ہے کہ شروع میں ہر مضمون کا نیا نصاب دو ایک سال تک ہر اچھے مدرسے میں تجربی طور پر جانچا جاتا ہے اور اگر اس میں کوئی خامی معلوم ہوتی ہے تو اسے دور کر دیا جاتا ہے۔

طریقہ تعلیم

انقلاب کے بعد شروع میں پروجیکٹ میتھڈ (منصوبی طریقہ) اور ڈالٹن پلان (انفرادی طریقہ) ابتدائی اور ثانوی مدارس میں رائج کئے گئے اور یونیورسٹی میں بریگیڈ لیبوری ٹری میتھڈ (Brigade Laboratory Method) عمل میں لایا گیا اس طریقے کے مطابق چار چار پانچ پانچ طلبہ ایک ساتھ مل کر مطالعہ کرتے تھے اور اپنے معلمین سے وقتاً فوقتاً مشورہ لیتے رہتے تھے۔ کچھ دنوں تک تجربہ کرنے کے بعد استاد محسوس کرنے لگے کہ پروجیکٹ میتھڈ سے مختلف مضمونوں کا محض سطحی علم حاصل ہوتا ہے۔ طلبہ تقریباً ہر موضوع پر گفتگو تو کر سکتے ہیں لیکن ان کے علم میں گہرائی اور پختگی نہیں پیدا ہوتی، اور جب وہ ٹکنی کم یا یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تو بعض مضامین مثلاً ریاضی اور سائنس میں ان کی استعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈالٹن پلان میں معلمین کو یہ خرابی نظر آ رہی تھی کہ یہ طریقہ انفرادیت پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اسے سوشلسٹ کام کے لئے موزوں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی طرح گریڈ لے بوری ٹری میتھڈ کے نتائج بھی اطمینان بخش اور ہمت افزا نہیں تھے، طلبہ میں اس کے ذریعہ اتنی استعداد پیدا نہیں ہوتی تھی کہ پیشہ ورانہ ٹریننگ کے لئے ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اساتذہ نے خود بخود اپنے طریقہ تعلیم میں تبدیلی کر لی۔ اسکے لئے اوپر سے کوئی حکم نافذ نہیں کیا گیا، اب عام طور سے وہی طریقہ رائج ہے جو آپ کے انگریزی مدرسہ میں برتا جاتا ہے۔ استاد ہر موضوع کی تمہید گفتگو کے ذریعہ کرتا ہے، پھر اس پر طلبہ بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اس میں انھیں پوری آزادی ہوتی ہے، وہ صرف وقتِ ضرورت استاد سے مدد لیتے ہیں اس کے بعد انفرادی کام شروع ہوتا ہے۔ جسے زیادہ تر گھر پر کرنا پڑتا ہے طلبہ کتابوں کا مطالعہ کر کے ضروری مواد اخذ کرتے ہیں سبق کے آخر میں استاد چند سوالات کے ذریعہ معلوم کر لیتا ہے کہ طلبہ نے کس حد تک موضوع پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اس دوران میں ضروری نکات بحث و مباحثہ کے ذریعہ واضح کر دئے جاتے ہیں، اسباق میں توضیحی سامان بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جسے یا تو استاد اور طلبہ مل کر تیار کرتے ہیں یا تعلیمی سامان بنانے والے کارخانوں سے حاصل کیا جاتا ہے

بعض چیزوں کی وضاحت کی خاطر سینما اور سیر وسیاحت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے مطالعہ قدرت کے لئے شہری مدرسوں میں بھی ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک چڑیا گھر ہوتا ہے، پرائمری اسکول کی اوّل جماعت میں دوران سال میں کم از کم چار یا پانچ بار تعلیمی سیر وسیاحت کے لئے باہر جانا ضروری ہے، ان مواقع پر عام درخت اور پودے، جانور، موسمی تبدیلیاں بچوں کے مشاہدے میں آتی ہیں۔

ان تعلیمی سیروں سے پورا پورا تعلیمی فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ان میں زبان، ڈرائنگ اور حساب کے کام کے لئے بہت سے فطری مواقع پیدا ہوتے ہیں اور ان کا استعمال ان مضامین میں جان ڈال دیتا ہے ان سیروں کے سارے اخراجات مدرسہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

انقلاب کے بعد شروع میں تعلیم کے میدان میں پروپیگنڈے سے بہت کام لیا جاتا تھا۔ کیونکہ نئے نظام کو قایم کرنے کے لئے یہ بہت ضروری چیز تھی، لیکن اب اس کی چنداں ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس بات کا ثبوت نرسری اسکول اور دوسرے تعلیمی اداروں کے طریقۂ تعلیم میں ملتا ہے پہلے نرسری اسکول میں سیاسی پوسٹروں اور گیتوں کے ذریعے نئے نظام کا پروپیگنڈہ ہوا کرتا تھا، لیکن اب اس چیز کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح سماجی مطالعہ کمیونزم؟ .... کے سیاسی اور اقتصادی اصولوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اب یہ مطالعہ تاریخی اور جغرافی واقعات کی روشنی میں کرایا جاتا ہے۔ حقیقی سیاسی تعلیم کے لئے طلبہ کی بہت سی انجمنیں اور دوسرے ادارے موجود ہیں جو کام کو بہت معقولیت اور کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں، چنانچہ سنہ ۱۹۳۶ء میں درسی کتاب کی تیاری میں بڑا مقابلہ ہوا، یہ طے کیا گیا کہ تاریخ محض انقلاب روس کے دور کی نہیں بلکہ نوع انسانی کے تمام کارناموں کی ہونی چاہئے۔ اس وقت سوویت یونین میں اس قسم کی کوئی درسی کتاب دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ چالیس مشہور مورخوں اور تعلیم کے ماہروں نے مجوزہ کتاب کے مسودے بھیجے۔ اس کتاب کی منظوری کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو نامی گرامی علما اور کمیونسٹ

پارٹی کے اراکین پر مشتمل تھی، انہوں نے ان تمام کتابوں کو مسترد کر دیا، کیونکہ ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں تھی جس میں واقعات کو صحت کے ساتھ سائنٹفک انداز میں پیش کیا گیا ہو، اس کمیٹی نے ان کتابوں پر شدید نکتہ چینی کی جن میں سیاسی تعصبات کی بنا پر واقعات کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا گیا تھا، مثال کے طور پر ان کتابوں میں عیسائیت کو اس کے ظہور کے وقت ایک ترقی پسند تحریک سے تعبیر نہیں کیا گیا تھا یا شروع میں جو مذہبی خانقاہیں قایم ہوئیں ان کے تعلیمی اور تمدنی کارناموں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ اب سویت میں تعلیم کو پروپیگنڈہ کے خاطر قربان نہیں کیا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیم کمیونزم کے مقاصد کو سامنے رکھتی ہے لیکن اس کا انحصار تاریخی واقعات اور حقایق پر ہے نہ کہ پروپیگنڈے پر۔

ضبط مدرسہ سویت کارکنان کا خیال ہے کہ ضبط اور آزادی دو متضاد چیزیں نہیں ہیں ضبط کے بغیر بھی آزادی ناممکن ہے، لہذا مدارس میں صحیح ضبط پیدا کرنا از بس ضروری ہے اس کی ذمہ داری طلبہ اور استاد دونوں پر عائد ہوتی ہے، اگر استاد اپنے اسباق کو ہوشیاری اور محنت سے تیار کریں اور اس طرح پڑھائیں کہ ان میں بچوں کی دلچسپی ہو جائے تو امید ہے کہ ضبط کے بہت کم مسائل پیدا ہوں گے۔ ضبط کے معاملہ میں استاد کے بعد والدین کا درجہ ہے۔ اب مدرسہ کے کام میں والدین کی دلچسپی اکسانے اور مدد حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی جا رہی ہے اس کام کے لئے والدین کی انجمنیں بنائی گئی ہیں، اور ان کو مدرسہ کے کام سے باقاعدہ واقف رکھا جاتا ہے، والدین کی تعلیم کے لئے بے شمار ادارے موجود ہیں جن کا تعلق دوسرے تعلیمی اداروں سے ہوتا ہے کسی یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ یا شعبہ تعلیمات سے ان کا الحاق ہوتا ہے، ان میں والدین کو بچوں کو جسمانی اور نفسیاتی تربیت کے متعلق ٹریننگ دی جاتی ہے اس کے علاوہ استاذ خود والدین سے کبھی کبھی گھروں پر جا کر ملتا ہے اور ان کے بچوں کے مسائل پر گفتگو کرتا ہے۔ نیز مدرسہ میں والدین کے ذریعہ

تجویز کئے ہوئے موضوعات پر تقریریں اور مباحثے ہوتے رہتے ہیں اس طرح تربیت یافتہ والدین سے مدرسہ کا ضبط قایم رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

استادوں اور والدین کے اشتراک عمل سے اس وقت تک مفید نتائج برآمد نہیں ہو سکتے جب تک کہ بچوں کو مدرسہ کے انتظامات میں شامل نہ کیا جائے۔ لہٰذا سویت مدرسوں میں بچوں کی حکومت خود اختیاری قایم کر کے ضبط کی بنیاد کو مضبوط کیا گیا ہے۔ پرائمری اسکول کی پہلی تین جماعتوں میں بچے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انھیں بڑی بڑی ذمہ داریاں نہیں دی جا سکتی ہیں۔ ان کے تجربے اور نفسیاتی نشوونما کو مدنظر رکھتے ہوئے چھوٹے موٹے انتظامی کام ان کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ آگے چل کر یہ ذمہ داریاں وسیع تر ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ثانوی مدرسہ کی آخری دو تین جماعتوں میں طلبہ کو نہ صرف ان کی جماعت سے متعلق انتظامی امور سپرد کئے جاتے ہیں بلکہ انھیں مدرسہ کے تمام انتظامات میں شریک کیا جاتا ہے۔ جماعتی انجمنوں کے ذمہ بعض سنجیدہ قسم کے کام ہوتے ہیں، مثلاً مدرسہ کے ساز و سامان کی حفاظت، پڑھائی میں کمزور طلبہ کی امداد، جماعت کا ضبط، مدرسہ میں تفریحی وقت کے لئے مشاغل کی تنظیم وغیرہ۔

ان دنوں بیشتر مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں ضبط قایم رکھنے کے لئے انعام اور سزا کا استعمال پسندیدہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اس بارے میں سویت یونین میں عام رائے یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو بطور ذریعہ کے کسی حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن محض ایک ذریعہ کی حیثیت سے اور وہ بھی بہت ہوشیاری اور سمجھ بوجھ کے ساتھ۔ انعام کی مختلف شکلیں ہیں۔ تعریف سند، اظہار خوشنودی، دور دراز مقامات کی سیر و تفریح وغیرہ۔ یہاں سزا کا طریقہ اس طریقہ سے بہت مختلف ہے جس پر ہمارے ملک میں عموماً عمل ہوتا ہے۔ سویت یونین میں جسمانی سزا کو قانونی لحاظ سے ایک ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی استاد یا مدرسہ کا افسر اعلیٰ بچوں کے ساتھ بدزبانی سے پیش آئے یا کینہ پروری سے کام لے تو اسے فوراً تنبیہ کی جاتی ہے اور اگر اس سے یہ غلطی اکثر سرزد ہو تو اسے برخاست کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی

بچہ بدتمیزی سے پیش آئے یا دوسرے بچوں کے ساتھ بُرا سلوک کرے تو اسے علیحدہ یا جماعت کے سامنے سمجھایا بجھایا جا سکتا ہے یا اسے کسی دلچسپ یا تفریحی شغلے سے محروم کیا جا سکتا ہے اگر کسی بچے کے چال چلن کی عام شکایت ہو تو اس کا طبی اور نفسیاتی معائنہ باضابطہ طور پر کرایا جاتا ہے کہ کہیں جسمانی خامی یا ذہنی کمزوری تو اس کے چال چلن کی خرابی کا سبب نہیں ہے۔ اس تفتیش کے بعد اس کا مناسب علاج کیا جاتا ہے۔ کسی بچہ کو صرف اس صورت میں مدرسے سے نکالا جاتا ہے جبکہ واقعی اس کی حالت ناقابلِ اصلاح ہو۔

ایسے مواقع شاذ ہی پیش آتے ہیں۔ ۹۵ طلبہ ضبط کے لحاظ سے اچھے ہوتے ہیں، اور ان کی طرف سے استادوں یا ان کے ساتھیوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا۔

غیر نصابی مشاغل

سویت یونین میں تعلیم مدرسہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں ہے بلکہ مدرسہ سے باہر کی زندگی کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ بچوں کی زندگی کو بالا کرنے کے لئے بے شمار غیر نصابی مشاغل ہیں جن میں وہ مدرسے کے باہر معروف رہتے ہیں۔ بچوں اور نوجوانوں کے کلب اور انجمنیں، ان کے لئے مختلف قسم کی دلچسپیاں مہیا کرتی ہیں۔ انھیں ڈراما، سینما، آرٹ اور کتب خانہ وغیرہ سے لطف اندوز ہونے اور مستفید ہونے کی بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ تعلیمی سیر و سیاحت کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ طلبا، کارخانہ، عجائب گھر، اور دیگر سرکاری اداروں کا بنظر غائر مطالعہ کریں، مدرسہ میں بچوں کی ایک ایسی مجلس بھی ہوتی ہے جس کا تعلق براہِ راست کمیونسٹ پارٹی سے ہے۔ اسے پائنیر لیگ (Pioneer League) کہتے ہیں۔ اس کی رکنیت حاصل کرنے سے پہلے بچے کو ایک آزمائشی دور سے گذرنا پڑتا ہے اور اس بات کا عملی ثبوت دینا ہوتا ہے کہ وہ پائنیر لیگ کے نصب العین اور مقاصد کو خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ قبول کر چکا ہے۔ اس جماعت میں بچے دس سال کی عمر میں داخل ہوتے ہیں، اور ۱۶ سال کی عمر تک اس کے رکن رہتے ہیں۔ مدرسہ میں پائنیر اپنی جماعت کا مسلّم قائد سمجھا جاتا ہے، وہ اپنے ساتھیوں میں ایک نمونے کے

طالب علم کی حیثیت رکھتا ہے، وہ ان لوگوں سے نفرت نہیں کرتا جو اس سے دور بھاگتے ہیں بلکہ وہ انھیں اپنے کام میں شریک کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ مدرسہ کی زندگی کے ہر شعبے اور مشغلہ میں پیش پیش رہتا ہے، ضبط قایم رکھنے میں مدد دیتا ہے اور دوسروں کو اپنے کھیل کود اور دیگر سرگرمیوں میں کھینچ لاتا ہے، وہ جلسوں کا اہتمام کرکے اپنے ساتھیوں کو پائینر کے اغراض و مقاصد اور طور و طریقہ سے روشناس کرتا ہے اور انھیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے نزدیک کامریڈ لینن کے نقش قدم پر چلنا عین سعادت مندی اور کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت اور تبلیغ کرنا سب سے بڑی انسانی خدمت ہے۔

سویت یونین میں مدرسہ کا سماجی درجہ بہت اونچا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو تعلیم کو زندگی بخشتی ہے اور اس میں معنی پیدا کرتی ہے۔ یہاں اس اصول پر عمل کرنے کی حقیقی جد و جہد کی جارہی ہے "تعلیم زندگی ہے نہ کہ آئندہ زندگی کے لئے تیاری"۔ یہاں بچہ کی زندگی کے ہر گوشہ کو اس کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے سنوارا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اسے مستقبل کی جد و جہد کے لئے بھی تیار کیا جاتا ہے۔

اُستادوں کی تیاری

لینن کا قول ہے کہ ہمیں اپنے اُستاد کا درجہ اسقدر اونچا کردینا چاہئے جتنا کہ اس نے کبھی نہیں حاصل کیا ہے اور نہ وہ کسی..... ......سوسائٹی میں آئندہ حاصل کرسکتا ہے کیونکہ اس کے بغیر انقلابی بنیاد پر سماج کی تعمیر ناممکن ہے، اس خیال سے سویت یونین میں استادوں اور ان کی ٹریننگ پر کافی توجہ دی جاتی ہے۔

ٹریننگ ختم کرنا دراصل علمی کی ٹریننگ کی ابتدا ہے۔ پانچ سالہ کورس میں بھی ممکن نہیں ہے کہ استاد تعلیم و تدریس کے علم وفن پر پورے طور سے حاوی ہو جائے اسکے علاوہ انسانی علم کے ذخیرہ میں روز بروز بیش بہا اضافے ہوتے رہتے ہیں، اور روس جیسے ملک میں جو تعلیم و ترقی کے معیار پر بہت جلد پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ ناگزیر امر ہے کہ اُستاد

طلبہ کو زیادہ سے زیادہ صحیح و تازہ ترین اور جامع معلومات بہم پہنچائے۔ نیز استاد کا علم اس معلومات سے کہیں زیادہ عمیق اور وسیع ہونا چاہئے جو کہ جماعت کے اسباق کے لئے درکار ہے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُستادوں کے لئے مختلف قسم کے..... کورس ترتیب دئے جاتے ہیں، جن سے مستفید ہونے کا انھیں کوئی نہ کوئی موقع ضرور ملتا ہے۔

اساتذہ کی صلاحیتوں کو ترقی دینے کے لئے جو ادارے قایم ہیں ان میں سب سے مشہور اور اہم ادارہ تعلیمی کارکنان کی انجمن کے زیر اہتمام چلتا ہے، شام کے وقت روزانہ ہر بڑے شہر میں کورس منظم کئے جاتے ہیں جن میں شریک ہونے کے لئے فیس ادا نہیں کرنی پڑتی۔ جو لوگ بُعدِ مکانی یا مصروفیت کی وجہ سے خود وہاں حاضر ہوکر فائدہ نہیں اٹھا سکتے ان کے لئے رسل و رسائل کے ذریعہ ایسے کورس کا اہتمام کیا جاتا ہے، یہ کورس دو تین سال تک جاری رہتا ہے اور اس میں طلبہ کے نصابی نیز غیر نصابی مشاغل کی تنظیم، رہنمائی اور نگرانی سے متعلق مسائل پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

اسی طرح اساتذہ کی یونین کی طرف سے بعض مخصوص کورس تعطیلات میں ہوتے ہیں ان میں خاص طور پر وہ استاد حصہ لیتے ہیں جن کا دیہی مدرسوں سے تعلق ہے اور جو شہر کی تعلیمی سہولتوں سے براہِ راست فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے طعام و قیام اور سفر کا سارا خرچ تعلیمی کارکنان کی انجمن ادا کرتی ہے، اساتذہ کی یونین اپنے اراکین کے لئے جو کلب قایم کرتی ہے ان میں بھی خاص طور پر پیشہ ورانہ مسائل پر توجہ دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر لینن گراد میں اس قسم کا ایک کلب اس محل میں قایم ہے جس میں کسی زمانے میں زار روس رہا کرتا تھا، اس میں ان نتائج کو اساتذہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو کہ تعلیمی میدان میں تجربہ، تحقیق اور تفتیش کی بنا پر برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں مختلف قسم کے موضوعوں پر اکثر گفتگو اور بحث مباحثہ ہوا کرتا ہے۔

تمام اساتذہ لازمی طور پر تعلیمی کارکنان کی یونین کے رکن (انجمن) ہوتے ہیں، تعلیم کے

تمام معاملات، درسی کتب نصاب وغیرہ جو شعبۂ تعلیمات کی طرف سے ترتیب دئے جاتے ہیں۔ آخری منظوری کے لئے اس یونین کے سامنے پیش ہوتے ہیں، اور تعلیمی ادارے کے افسر اعلیٰ مقرر کرتے وقت اس کا مشورہ لیا جاتا ہے، اس کے علاوہ وزیر تعلیمات کو یونین کی کانفرنس میں اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح کہ سویت یونین کے مدرس کو اپنے دائرہ عمل میں سویت سے وہ حقوق اور اختیارات حاصل ہیں جو کہ دنیا کے کسی ملک میں انہیں نصیب نہیں۔

تعلیم بالغان ابھی انقلاب کو ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ لینن کی بیوی نے ۱۹۱۸ء میں کہا کہ "سابقہ مطلق العنان حکومت سے ہمیں ورثہ میں افلاس اور جہالت ملی ہے، عوام اپنی قوت سے خود آشنا نہیں ہیں گویا کہ وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتے، انھیں منظم طور پر کام کرنے کا سلیقہ نہیں ہے اس لئے ان کی بہت سی قوت ضائع ہوتی ہے" یہ الفاظ انقلاب سے پہلے کے روس کی حالت کا صحیح خاکہ پیش کرتے ہیں اس وقت تک وہاں تعلیم محض برائے نام تھی اور جو کچھ تھی بھی وہ اونچے طبقے تک محدود تھی کہ جس کا زار کی حکومت پر اثر تھا۔ عوام کی حیثیت بھیڑ بکریوں کے گلے سے کچھ مختلف نہ تھی۔

سویٹ ریاست کے سامنے ناخواندگی اور جہالت کو جلد از جلد فنا کرنے کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لینن نے کہا ہے کہ "ناخواندگی کا خاتمہ کئے بغیر ہم سیاست کا نام بھی نہیں لے سکتے۔ ایک ناخواندہ شخص میدان سیاست کے حدود کے اندر داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس بے بسی کے عالم میں وہ افواہ تعصبات اور توہمات کے شکار ہونے پر مجبور ہے۔ سیاست کے لئے مطالعہ اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے جو تعلیم کے بغیر بے حد دشوار ہے۔

لیکن ناخواندگی اور جہالت کی بیخ کنی کرنا کوئی کھیل نہیں تھا۔ شروع میں نہ تو اس میدان میں کام کرنے والے کارکنان کافی مقدار میں دستیاب ہو سکتے تھے اور نہ دوسرے ذرائع و وسائل ہی موجود تھے، لیکن اس کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سویت ریاست اس کام کو جلد از جلد شروع کرنا چاہتی تھی۔ لہذا "تمدنی مہم" کے نام سے ایک تحریک شروع کی گئی جس میں ضلع کی تمام

تعلیمی تو توں کو ناخواندگی کی ملیا دمدکرنے کے کام میں لایا گیا اور ہر پڑھا لکھا شخص خواہ اس کا تعلق شعبہ تعلیمات سے ہو یا نہ ہو اس مہم میں شریک تھا اس طرح ایک بہت بڑی تمدنی فوج "عالم وجو میں آئی جو دس لاکھ افراد پر مشتمل تھی اس فوج کو خاص طور پر ٹریڈ یونین، پائینر لیگ، نوجوان کمیونسٹ لیگ کمیونسٹ پارٹی اور بہت سے اجتماعی اداروں سے بہت تقویت حاصل ہوئی۔ حکومت نے بھی اپنی پوری مشین کو اس کام کے لئے استعمال کیا۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۴ء تک ان خطوں میں بھی جہاں انقلاب سے پہلے پڑھا لکھا آدمی ڈھونڈھنے پر بھی نہ ملتا تھا ۹۰ فی صد خواندگی ہوگئی ہے۔ اس وقت حکومت کی طرف سے احکامات نافذ کئے گئے کہ ۱۹۴۲ء تک جہالت کی لعنت کو مٹا دینا چاہئے اس کے علاوہ پریس میں بھی اس سے متعلق بہت زوردار پروپیگنڈہ کیا گیا اب تعلیم بالغان کے کام میں بہت سے ادارے جٹے ہوئے ہیں، والدین کی تعلیم کے لئے یوں تو پہلے ہی سے بہت سے چھوٹے بڑے ادارے قایم تھے لیکن اب اس غرض سے خاص طور پر بعض ادارے قایم کئے گئے ہیں جن میں چھٹی کے دن تعلیم ہوتی ہے یہاں تقریباً ہر مضمون کے مطالعہ کا انتظام ہوتا ہے بالخصوص صنعتی اکادمی قایم کی گئی ہیں جن میں کارخانوں کی طرف سے درجہ اوّل کے مزدور اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل کئے جاتے ہیں۔ یہاں وہ تین سے پانچ سال تک نظری اور عملی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد صنعت و حرفت ۔

اقلیتوں کی تعلیم سویت یونین بہت سی قوموں پر مشتمل ہے لینن کا یہ جملہ کہ "زار کے عہد حکومت میں روس اقوام کا قید خانہ تھا" حقیقت کا صحیح اظہار کرتا ہے۔ روسی قوم کے سوا کاکیشیا اور وسط ایشیا کی سارجی قومیں نہایت ذلت اور افلاس کی زندگی گزارتی تھیں، وہ یا تو خانہ بدوش لوگ تھے جو اپنے مویشیوں کے گلے لئے گھاس کی تلاش میں ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے یا ابتدائی انسان کی طرح فرسودہ اور غیر نفع بخش طریقوں سے کھیتی باڑی کرتے تھے ان کو زار کی نوکر شاہی اور مقامی جاگیر دار اور مذہبی اجارہ دار طرح طرح سے لوٹتے کھسوٹتے اور ایذا پہنچاتے تھے اور اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے انھیں آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ ان کی

تہذیب وتمدن ادنیٰ درجہ کا تھا۔ ان کے ہاں بہت کم مدرسے تھے اور جو تھے بھی ان کی حالت بہت بری تھی۔ ان مدرسوں میں لازمی طور پر روسی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ کوئی قوم اپنی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم نہیں بنا سکتی تھی، حکومت کی تعلیمی پالیسی یہ تھی کہ "بدیسی قوموں کو (اقلیتوں کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا) روسی زبان کے ذریعہ تعلیم دینی چاہیئے تاکہ رفتہ رفتہ روسی زبان اُن کی زبان اور روسی تمدن ان کا تمدن ہوجائے۔ زار کی یہ پالیسی ہندوستان میں برطانوی حکومت کی حکمت عملی سے کس قدر ملتی جلتی ہے۔ دراصل کسی قوم کو مٹانے اور محکوم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے تمدنی سرمایہ کو نیست ونابود کر دیا جائے اور بہ نتیجہ قومی زبان کو ختم کر دینے سے بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے جہاں یہ کیفیت ہو وہاں اقلیتوں کی تعلیم کی حالت کیسی ہوگی بیشتر لوگ ناخواندہ تھے وہاں بعض قومیں ایسی بھی تھیں جن کے پاس کوئی باقاعدہ زبان تک بھی نہیں تھی۔ حکومت کو اس کا کوئی خیال نہیں تھا۔ کیونکہ زار شاہی کے وجود کو قایم رکھنے کے لئے جہالت ضروری چیز تھی۔

لیکن انقلاب روس نے ان جاہل اور مفلوک الحال اقوام کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ آپ لوٹ کھسوٹ کرنے والا طبقہ جو کہ اقوام کے درمیان لڑائی جھگڑا اور فساد پیدا کرتا ہے، ختم ہوگیا ہے۔ اس طرح قومی حسد اور بیر کی جڑ کٹ گئی ہے۔ سویت یونین کی دستور اساسی کی رو سے کوئی قوم کسی دوسری قوم پر فوقیت نہیں رکھتی۔ قومی مساوات اور حق خود اختیاری کو دستور میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی قوم چاہے تو یونین سے الگ ہو سکتی ہے یہ چیز وہ ہے جس کی اجازت آج تک دنیا کی کسی حکومت نے نہیں دی ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ آج سویت یونین میں بہت سی آزاد ریاستیں پھل پھول رہی ہیں۔ ان کے قومی تمدن ہر لحاظ سے ترقی کر رہے ہیں اور ان میں نئی نئی ایجادیں چار چاند لگا رہی ہیں، پچھلے دنوں سویت یونین کی ہر ریاست میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے، ہر خطے میں وہاں کی مادری زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ جن خطوں میں اس سے پہلے کوئی باضابطہ تحریری زبان نہیں تھی، وہاں روسی زبان رائج کرنے کے بجائے

ماہرینِ فن کی مدد سے ایسی زبان وضع کی گئی ہے جو وہاں کی تمدنی حالت سے مطابقت کرتی ہے اور اس وجہ سے وہ خوب پنپ رہی ہے۔ علم وادب میں ان پس ماندہ قوموں نے اتنی قلیل مدت میں جو کچھ کر دکھایا ہے، دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آج ازبک اور کرگیز بچے جن کے باپ دادا نے جدید سائنس کے کرشمے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے، اپنے مدرسوں میں سائنس کی ہر شاخ سے متعلق تجربے اور عمل کرتے ہیں جن علاقوں کی عورتیں گھر کی چہار دیواری سے کبھی باہر نہیں نکلی تھیں آج ان کی لڑکیاں ہوابازی کے میدان میں ریکارڈ قایم کر رہی ہیں۔ آخری زار کے زمانے میں قزاکستان میں مشکل سے کوئی پڑھا لکھا آدمی ملتا تھا، مدرسوں میں زیر تعلیم بچے قابل تعلیم بچوں کی تعداد کے دو فیصدی سے زیادہ نہیں تھے آج وہاں ہر بچہ تعلیم کی دولت سے نہال ہے۔ سلیمان جوکہ داغستان کا ایک مشہور شاعر ہے، کہتا ہے کہ "بالشویک انقلاب نے جہاں ساری دنیا کو ایک زلزلے کی طرح ہلا دیا ہے، وہاں ہمارے طرزِ معاشرت میں بھی ایک بڑی ہل چل پیدا کر دی ہے، ہمارے وسیع میدان اکتوبر کے غیر فانی نور سے معمور ہو گئے ہیں اقلیتیں جو "زمانہ جاہلیت" میں غیر ملکی اقوام کہلاتی تھیں آزاد اور ترقی یافتہ اور متمدن زندگی بسر کر رہی ہیں اور سوویت یونین کی دوسری ترقی یافتہ ریاستوں کے دوش بدوش چل رہی ہیں"

موجودہ جنگ اور تعلیم موجودہ جنگ میں سوویت یونین کا بچہ بچہ جانتا اور محسوس کرتا ہے کہ اس جنگ پر اس کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ ہٹلر اور اس کے خود بین ناعاقبت اندیش ساتھی انقلاب عظیم کے پھل کو کترنے پر تلے ہوئے ہیں، ہر بچہ جو جنگ سے پہلے سکھ چین سے رہتا تھا اور پڑھتا لکھتا تھا اپنے مستقبل کے لئے ایک بڑا خطرہ محسوس کر رہا ہے اور اس لئے دشمن کو اپنے ملک سے نکالنے کے لئے عملی جد وجہد میں مصروف ہے۔ روسی جنگ کے بارے میں جو خبریں موصول ہوئی ہیں ان سے روسی بچوں کی ہمت اور جذبہ ایثار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعض مقامات پر دس دس بارہ بارہ سال کے لڑکے لڑکیوں نے ہٹلر کی خونخوار فوجوں کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ اس وقت سوویت یونین کے پورے تعلیمی نظام

میں جنگی ضروریات کی کارفرمائی نظر آرہی ہے، مدرسوں میں آرٹ، ادب، موسیقی، سائنس وغیرہ کی تعلیم واقعات جنگ سے مربوط کی جارہی ہے، کیونکہ زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس پر جنگ اثر انداز نہ ہو رہی ہو۔

نومبر ۱۹۴۲ء میں ماسکو میں سویت یونین کے طلبہ کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کی کارروائی سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے طالب علم موجودہ جنگ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اس موقع پر انہوں نے استالن کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم کو عوام سے الگ تھلگ رہ کر زندگی نہیں گزارنی چاہئے، بلکہ ہر وقت ان کے ساتھ قریبی رشتہ قایم رکھنا چاہئے، اپنے آپ کو ان سے بالاتر نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ "برابروں میں اگوا" کی حیثیت سے ان کی مدد اور رہنمائی کرنی چاہئے اور اس طرح ان کی جماعت میں رہتے ہوئے ان کا اعتماد اور اشتراک عمل حاصل کرنا چاہئے" ہم آپ کی اس نصیحت پر عمل کر رہے ہیں۔

دنیا کے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "ہٹلر نے یورپ کو عوام کے لئے ایک مستقل قید خانہ بنا دیا ہے، ہزاروں پُرامن شہری موت کے گھاٹ اُتار دئے ہیں، اور لاکھوں کو زرخرید غلاموں کی طرح لے جاکر جرمنی میں بُرے سے بُرا اور سخت سے سخت کام کرنے پر مجبور کیا ہے، ہم کبھی نہیں بھول سکتے کہ جرمن فوجوں نے کتنے بے دردانہ اور وحشیانہ انداز میں علم وفضل کے مرکز اڈیسا اور خارکوف۔ برگن اور بروسلز اور ہلسنکی۔ لے ڈن اور پیرس وغیرہ یونیورسٹیاں مسمار کردی ہیں۔

فتح اور کامیابی بغیر ہاتھ پیر ہلائے حاصل نہیں ہوتی اس کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، ہم میں سے ہر ایک کا یہ فرض اولین ہے کہ اس بڑی اور تاریخی جنگ میں تمام آزادی پسند اقوام کے دوش بدوش لڑیں جو کہ ہٹلر اور اس کے مجرم ساتھیوں کے خلاف مختلف مورچوں پر ہو رہی ہے۔

وہ زمانہ دور نہیں ہے جبکہ ہم اپنے خون آلودہ جنگی لباس کو اُتار کر پھر اپنے کالجوں اور

تعلیمی مرکزوں میں واپس جائیں گے اور پُرامن طور پر تخلیقی اور تعمیری مشاغل میں مصروف ہوں گے لیکن اس وقت تک ہماری زندگی مستقل جدوجہد میں صرف ہونی چاہیئے۔

تعلیمی ترقیاں

زار کے عہد حکومت میں روس کا شمار تعلیمی اعتبار سے بہت پس ماندہ ممالک میں کیا جاتا تھا۔ یورپی روس میں ناخواندگی ۷۰ سے ۸۰ فیصدی تک اور ایشیائی روس میں ۹۹ فیصدی تک تھی۔ بیسوی صدی میں بھی روسی حکومت کا خیال تھا کہ تعلیم غریب کسانوں کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوگی کیونکہ اس کی وجہ سے وہ اپنے کام اور زندگی سے غیر مطمئن ہوجائیں گے۔ عوام کی اس بے اطمینانی سے حکومت کا وجود خطرے میں پڑجانے کا اندیشہ تھا اس لئے زار نے قصداً نہ صرف عوام کی تعلیم سے بے نیازی برتی بلکہ ان نجی اداروں کے کام میں بھی رکاوٹ ڈالی جو اپنے طور پر تعلیم کی اشاعت کرنا چاہتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء میں استاد کنو فونامی گاؤں کے کاشتکاروں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاں ایک مدرسہ کھولنے کی اجازت حاصل کی انہوں نے اسکول کا فرنیچر خود تیار کیا اور بچوں کو پڑھانے کے لئے ایک اُستاد رکھا لیکن گاؤں کے پادری کو یہ بات کھٹکی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ پادری کے کہنے سننے پر پولیس نے یہ مدرسہ چند ہفتے بعد بند کروادیا۔

سوویت یونین نے انقلاب کے بعد تعلیمی میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اب وہاں شاذ ہی ایسا شخص ملے جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو۔ اس ترقی کا اندازہ اخبارات اور مختلف قسم کے لٹریچر کی اشاعت سے لگایا جاسکتا ہے۔ پروَدا روزانہ کی اشاعت بیس لاکھ پرچوں سے زاید ہے۔ ازولستیا روزانہ تقریباً ۷ لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے۔ بڑے بڑے صنعتی ادارے اور زراعتی فارم خود اپنے اپنے اخبار نکالتے ہیں۔ یہ یا تو ہر دوسرے دن شایع ہوتے ہیں یا ہفتہ وار ہیں اور ان کی اشاعت ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں اس قسم کے اخبارات کی تعداد ۴۰۶۰ تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے "چلتے پھرتے"

اخبارات ہیں جو فصل کٹتے وقت فارم ہی میں شایع ہوتے ہیں، ادبی شاہکاروں کی اشاعت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ سویت عہد حکومت میں مشہور روسی ادیب اور ڈراما نگار پشکن کی تصنیفات کی تین کروڑ جلدیں شایع ہوئی ہیں، اس کے برعکس ۱۸۹۷ء سے ۱۹۱۶ء تک ان کی مجموعی اشاعت صرف ۹۰ لاکھ تھی اسی طرح گورکی اور بعض دوسری زبانوں کے مصنفین شلاً شیکسپیر ملٹن وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے کروڑوں کی تعداد میں شایع ہو چکے ہیں۔

بچوں کے لٹریچر کی اشاعت میں جو ترقی ہوئی ہے وہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۱۳ء میں بچوں کی کل ۶۵ لاکھ کتابیں چھپی تھیں، اس کے بالمقابل ۱۹۳۷ء کی مطبوعات کی تعداد ساڑھے چھ کروڑ ہے یعنی اس وقت تک بچوں کی لٹریچر کی اشاعت میں دس گنی ترقی ہو چکی تھی۔ مقامی زبانوں میں بچوں کے بے شمار اخبارات اور رسائل شایع ہوتے ہیں، بچوں کا مقبول ترین اخبار پانیر سکایا پروداً نو لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے۔

تعلیم بالغان کے میدان میں بھی گزشتہ ۲۰ سال میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے ۱۹۴۰ء میں ۵ کروڑ لوگ کتب خانے سے تعلیمی نصاب کی تکمیل میں مصروف تھے۔ سویت شہری اس کی بدولت نہ صرف لکھنا پڑھنا سیکھتے اور معمولی معلومات حاصل کرتے ہیں بلکہ وہ خود اپنے ادبی اور علمی کاوشوں کی بناء پر ایک نئے تمدن کی تخلیق کر رہے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں روس کی کل ۸۰ لاکھ بچے ابتدائی مدرسوں میں اور ایک لاکھ لڑکے اور نوجوان ثانوی مدارس اور کالجوں میں زیر تعلیم تھے، اس کے مقابلہ میں ۱۹۴۰ء میں ابتدائی تعلیم پانے والوں کی تعداد ۳½ کروڑ اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ۶ لاکھ تھی، اس پر بھی سویت یونین اپنی تعلیمی حالت کو قابلِ اطمینان نہیں سمجھتی اور وہ اس کی توسیع اور اصلاح کے کام میں کوشاں ہے جنگ کے زمانے میں بھی ریاست کے میزانیہ کا تقریباً ۱۲ و ۳ فیصدی حصّہ تعلیم پر خرچ ہو رہا ہے اور اس سے کہیں زیادہ روپیہ مقامی صنعتی اور زراعتی ادارے اپنے اراکین کی تعلیم پر صرف کر رہے ہیں۔

آخر میں ہم اس سوال پر غور کریں گے کہ سویت تعلیم کس حد تک موزوں اور کافی ہے۔ واقعی یہ سوال

بہت اہم اور باموقع ہے، بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سویت تعلیم قومی نیز انفرادی ضروریات کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے، نہ صرف موجودہ ضروریات بلکہ روزافزوں ضروریات جو نئی سماجی زندگی کا تقاضا ہیں موجودہ جنگ میں سویت یونین نے جو کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں وہ سویت نظام کی تعلیم کی خوبی اور معقولیت پر دلالت کرتے ہیں، سویت فوجیں جنہوں نے ہٹلر کی فوجوں کے نشے ڈھیلے کر دئیے ہیں، سویت تعلیم ہی کی پیداوار ہیں۔ ہوائی جہاز اور ٹینک اور دیگر سامان جنگ جو اس کی سرخ فوج استعمال کر رہی ہے سویت سائنس دانوں، انجنیروں اور مزدوروں کی علمی اور عملی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آرٹ کے میدان میں دیکھئے تو آج سویت مرد اور عورتیں کسی دوسرے مہذب ملک سے پیچھے نہیں ہیں، ڈراما اور موسیقی میں تو وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن ان سب چیزوں سے کہیں زیادہ اہم سویت تعلیم کا روحانی اثر ہے جو کہ اس کے شہریوں کے دل و دماغ پر طاری اور ساری ہے، اور جس کی بدولت انہوں نے موجودہ جنگ میں بہادری، شجاعت اور قربانی کے ناقابل یقین کارنامے کر دکھائے ہیں، سویت تعلیم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تمام شہریوں کے دل میں علم و تمدن کا شوق پیدا کر دیا ہے اور اس کی برکت سے وہ جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی اعتبار سے بہت بلندی پر پہنچ گیا ہے۔

یہ سویت حکومت کا پروپیگنڈہ نہیں اور نہ ہی کمیونسٹ پارٹی کا اشتہار ہے بلکہ یہ رائے یورپ و امریکہ کے ان ماہرین تعلیم کی ہے جو کہ سیاسی اعتبار سے سویت یونین کے طرز حکومت کے قائل نہیں ہیں۔ ڈیوی، لوسی ولکسن، سمتھ، واشبرن وغیرہ مقتدر ہستیاں جنہوں نے سویت مدرسوں کا بغور معائنہ کیا ہے، وہاں کی تعلیم سے بہت متاثر ہیں اور اس کے شاندار مستقبل میں پورا یقین رکھتے ہیں۔

سویت کی تعلیم نے اپنے نونہالوں اور نوجوانوں کو نہ صرف زندہ رہنا سکھایا ہے بلکہ اس کا بھی درس دیا ہے کہ موت کا مقابلہ کیسے کرنا چاہئے کیونکہ اس کے بغیر آج کی دنیا میں زندگی ناممکن ہے" سچ ہے" تعلیم ہی زندگی کی حقیقی ضامن ہے۔"

ہندوستان کی عام زبان کیا ہو؟

ہندوستان کو لسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے چار سو ملین باشندے آٹھ سو انچاس بولیاں اور زبانیں بولتے ہیں۔ اور بولیوں میں (۳۷) بولیاں ایسی ہیں جو ضبطِ تحریر میں نہیں آئی ہیں۔ ان اعداد کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ تمام عالم کے ایک ہزار آٹھ سو گیارہ ملین باشندے تین ہزار چار سو چوبیس زبانیں بولتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار بھی بے موقع نہ ہوگا کہ مملکت سویٹ روس کے ایک سو اسی ملین باشندے ایک سو سینتالیس زبانیں بولتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں مختلف بولیوں اور زبانوں کی تعداد حیرت انگیز اور اور پریشان کن ہے

ہندوستان کی اہم زبانیں

لیکن چند ہی ایسی زبانیں ہیں جو بکثرت استعمال ہوتی ہیں۔ رپورٹ اعداد شمار سنہ ۱۹۲۱ء مظہر ہے کہ:۔

(۱) ۴۹ ر ۳ ملین لوگ بنگالی بولتے ہیں۔

(۲) ۲۳ ، ۶ " " تلنگی "

(۳) ۱۸ ، ۷ " " تامل "

(۴) ۱۸ ، ۸ " " مرہٹی "

(۵) ۱۰ ، ۳ " " کنٹری "

(۶) ۱۰ ، ۱ " " اوریا "

(۷) ۱ء۹ ملین لوگ گجراتی بولتے ہیں۔
(۸) ۱ء۹ " " ملایالم " "
(۹) ۱ء۱۳۹ " " ہندوستانی "
(ایک ملین دس لاکھ کے برابر ہے)

اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہندوستان کے چارسو ملین باشندوں میں سے ایک سو اکیاون ملین باشندے آٹھ مختلف زبانیں اور تقریباً ایک سو چالیس ملین باشندے ایک زبان ہندوستانی بولتے ہیں۔ نیز جنوب ہند میں ہندوستانی سے نابلد اور زیادہ مختلف زبان بولنے والے آباد ہیں، لیکن بلحاظ مجموعی تعداد ہندوستانی زبان کو دوسری سب زبانوں پر فوقیت حاصل ہے اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ بلحاظ مذہب مختلف زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد کیا ہے؟

بلحاظ مذہب زبانوں کی تقسیم

افسوس کہ سرکاری رپورٹوں میں مطلوبہ مواد موجود نہیں ہے کسی غیر سرکاری ذریعہ سے بھی اس قسم کا مواد فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کا عام خیال یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی مادری زبان ہے، اور اگر مادری نہیں تو ان کی ذیلی زبان ضرور ہے، یعنی وہ اردو سمجھتے اور بول سکتے ہیں تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ خیال خام ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں غیر اردو داں مسلمانوں کی تعداد تخمیناً یہ ہے:

غیر اردو دانوں کی تعداد

(۱) بنگال۔ غیر اردو داں مسلمان ۲،۴۳،۹۵۰
(۲) بمبئی۔ " " ۳۰،۱۵،۷۷۱
(۳) مدراس ۱۰،۲۸،۴۵۱
(۴) سرحد ۲۲،۰۸،۰۸۴
(۵) پنجاب ۹۹،۰۱،۰۶۷
(۶) بہار اوڑیسہ ۶،۸۲،۸۵۴

(۷) آسام - غیر اُردو داں مسلمان ۳۴۱۵ ، ۸۰ ، ۲۷

(۸) بلوچستان " " ۲۷۰ ، ۸۸ ، ۳

(۹) کورگ " " ۳۹۵ ، ۹

(۱۰) " " ۴۱۸ ، ۹۸ ، ۲۷ ، ۴

گو دیسی ریاستوں سے مطلوبہ مواد نہ مل سکا، لیکن یہ ایک حیرت انگیز انکشاف ہے کہ تقریباً سو ملین (دس کروڑ) مسلمانوں میں سے تقریباً پچاس ملین (پانچ کروڑ) مسلمان ایسے ہیں جو اُردو زبان سے نابلد ہیں اور یہ ان کی مادری زبان نہیں ہے۔

عام زبان کا مسئلہ

اختلاف زبان کے ساتھ ہی خصوصاً کسی ایک ملک میں عام او مشترک زبان کا مسئلہ درپیش ہونا لازمی ہے۔ براعظموں میں جب ایک عام زبان کے لئے کوشش ناگزیر خیال کی جائے اور وہ بھی ایسے زمانے میں جب کہ "ایک دنیا" اور ہوائی ذرائع حمل و نقل کا شان گمان بھی نہ ہو۔ کسی ایسے ملک میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہوں ایک عام زبان کی جیسی بھی ضرورت ہوگی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ چنانچہ اس وقت تک ہندوستان میں عام زبان کے لئے یہ دلائل پیش کئے جاتے رہے ہیں:- "انسانوں کی کوئی جماعت ایک قوم نہیں کہی جا سکتی، جب تک کہ سہ گانہ اتحاد عمل نہ ہو۔ یعنی "مذہبی اتحاد، سیاسی اتحاد۔ لسانی اتحاد" ایک ملک کے لئے ایک زبان ضروری ہے" "قوم کی بنیاد ایک زبان پر ہوتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہ ہندوستان کے ایک وحدت اور ایک ملک ہونے کے متعلق اختلاف رائے ہو اور ایک سے زیادہ نظریے ہوں۔ ممکن ہے کہ موجودہ حالات اور سیاسی تحریکات ہندوستان کے تقسیم کرنے اور اس کے باشندوں کو ایک سے زیادہ قوموں میں تقسیم کرنے کے درپے ہوں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان ایک ملک کہلانے کے باوجود ایک براعظم کی خصوصیات کا حامل ہو اور براعظم یورپ کے مماثل حیثیت اختیار کر لے، لیکن اس کے باوجود اس کے لئے ایک عام اور مشترک زبان کا مسئلہ کمزور ہونے کے بجائے اور زیادہ اہمیت اور قوت

اختیار کرلے گا خصوصاً بیسویں صدی میں جب کہ فاصلے مفقود ہو رہے ہیں اور دنیا سکڑتی چلی جاتی ہے۔ اور ایک ہو رہی ہے۔

عام زبان کے لئے تجاویز

جب کبھی عام زبان کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو تین مختلف تجاویز پر جو کم و بیش مسلّمہ قرار دی جا چکی ہیں، غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے:

(۱) السنۂ قدیم (۲) مروجہ زبانوں میں سے کوئی ایک (۳) مصنوعی زبان۔

برّاعظم یورپ کے لئے ایک عام زبان کے سلسلے میں جب ماہرین نے متذکرہ بالا تجاویز پر غور کیا تو انہوں نے پہلی تجویز یعنی السنۂ قدیم کو ناقابلِ عمل قرار دیا۔ واضح رہے کہ یورپ کی السنہ قدیم یونانی اور لاطینی زبانیں ہیں جو سنسکرت کی طرح مُردہ ہو چکی ہیں یعنی یہ بول چال کے لئے کہیں بھی استعمال نہیں ہوتیں۔ دوسری اور تیسری تجاویز کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ اور موافقت اور مخالفت دونوں کے بارے میں قوی وجوہ موجود ہیں۔ مروجہ زبانوں میں سے کوئی ایک زبان کس بنا پر اختیار کی جائے، اس کا فیصلہ واقعی بہت مشکل ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سیاسی اقتدار سے زبان اتنی وابستہ ہوتی ہے کہ ایک قوم کی زبان دوسری آزاد قوم اختیار کرنے میں اپنی سُبکی خیال کرتی ہے۔ فرانس کا جب تک عروج رہا فرانسیسی زبان چلتی رہی۔ جرمنی کا عروج ہوا تو جرمن زبان فرانسیسی کی جگہ لینے لگی۔ اینگلو سیکسن (انگریز و امریکن) کے عروج کے ساتھ انگریزی زبان مسلط ہونے لگی بین الاقوامی تعلقات میں غیر معمولی ملنساری کے باوجود تاریخ شاہد ہے کہ خود دار اور آزاد قومیں سب سے زیادہ زبان کے بارے میں حساس ہوتی ہیں چنانچہ ماہرین یورپ نے کسی ایک مروجہ زبان کو عام زبان قرار دینے کے بجائے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ انفرادی، نفسیاتی کیفیت اور قومی احساسات اور جذبات کے پیشِ نظر کوئی مصنوعی زبان ایجاد کی جائے چنانچہ ۔

یورپ کی مصنوعی زبانیں

اس وقت تک تقریباً ساٹھ مصنوعی زبانیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول اور کامیاب مصنوعی زبان اسپرانتو ہے۔

جو مختلف یورپی زبانوں کو منبع قرار دے کر وضع کی گئی ہے۔ اس کے موجد ڈاکٹر زامن ہوف ہیں، جنہوں نے اسپرانٹو کو مکمل شکل میں ۱۸۸۷ء میں پیش کیا۔ ایک رپورٹ کے بموجب اسپرانٹو کے سات ہزار مرکز دنیا کے مختلف ممالک میں قایم ہیں اور اس کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ اسپرانٹو کے بعد جو زبانیں ایجاد ہوئیں ان میں قابلِ ذکر شلیے ایر کی "وولاپک" اور جسپرسن کی "نوویال" زبانیں ہیں جو بعض ماہرین کے بموجب اسپرانٹو سے مختلف، مگر بہتر اصولوں کے باوجود اسپرانٹو سے بازی نہ لے جاسکیں۔ ایک نقطۂ نظر سے مصنوعی زبان کو غیر جانب دار زبان کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

ہندوستان کے لئے جہاں کے باشندے نہایت درجہ حساس اور جذباتی واقع ہوئے ہیں اور جن میں خودداری کا مادہ روبہ ترقی ہے ان کے لئے مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے کونسی صورت موزوں۔ قابلِ عمل اور مقبول ہوگی؟ اگر یہ سوال عام مجمع میں کیا جائے تو تعجب نہ ہوگا اگر اس کے جواب میں ہندو سنسکرت اور مسلمان عربی کے لئے یک زبان ہو کر شور و غوغا نہ مچائیں!!!

سنسکرت یا عربی

عوام تو رہے ایک طرف قومی لیڈروں کا رجحان بھی السنہ قدیم کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ بحالت موجودہ عام مروجہ زبان کو سنسکرت یا عربی سے قریب تر کرنے کی کوشش مظہرہ خیال کی تائید کرتی ہے۔ غالباً مولانا محمد علی صاحب مرحوم نے یہ آرزو ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مادری زبان عربی ہو جائے! سنسکرت تو ایک مُردہ زبان ہے لیکن عربی جیسی طاقتور اور زندہ زبان نے عربستان کے باہر ایسی اشکال اختیار کرلیں کہ مولانا صاحب مرحوم کی آرزو پوری بھی ہو جائے تو ہندوستانی مسلمانوں کی عربی عربستان کی مروجہ عربی سے اتنی ہی مختلف ہوگی جیسی کہ ہندوستان کی فارسی جدید فارسی سے مختلف ہے۔ ماسوا اس کے السنہ قدیم کے اختیار کرنے سے ہندوستان کی عام زبان کا مسئلہ طے نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ پیچیدہ اور ناقابلِ تصفیہ ہو جاتا ہے۔ جہاں تک مصنوعی زبانوں کا تعلق ہے

ہندوستان کے لئے یورپ کی طرح کوئی مصنوعی زبان ایجاد نہیں ہوئی ہے اور یورپ کا تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان میں اس کی کامیابی کے لئے بالکل مواقع نہیں ہیں۔ لہذا مجبوراً ہندوستان کی مروجہ زبانوں ہی میں سے کسی ایک زبان کو عام زبان قرار دینا پڑے گا۔

عام زبان کے شرائط

اس کا انتخاب کرنے کے لئے چند شرائط کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً (۱) ہندوستان میں عام زبان دیسی زبان ہو سکتی ہے جو مختلف زبانوں سے مِل جُل کر بنی ہو (۲) اس زبان کا کسی مذہب سے گہرا تعلق نہ ہو (۳) اس زبان میں ہر قسم کے ادبی، سائنسی اور کاروباری خیالات ادا کرنے کی صلاحیت ہو (۴) اس کا سیکھنا معمولی استعداد کے شخص کے لئے بھی آسان ہو (۵) اس کا رسم خط جدید ترین میکانی طباعت کے لئے موزوں اور باکفایت ہو۔

اوپر جن بڑی زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کو مجوزہ شرائط کی کسوٹی پر چڑھا کر دیکھا جائے تو ایک زبان بھی جملہ شرائط کی بحالت موجودہ تکمیل نہ کرسکے گی تاہم ان زبانوں میں تین ایسی زبانیں نظر آتی ہیں جو بڑی حد تک مجوزہ شرائط کو پوری کرسکتی ہیں، اور ان میں حالات حاضرہ کے لحاظ سے تھوڑی بہت ترمیم کی جائے تو ہندوستان کی عام زبان بن سکتی ہیں۔

ہندستانی۔ بنگالی یا ملایالم؟

وہ زبانیں یہ ہیں (۱) ہندستانی (۲) بنگالی (۳) ملایالم۔ ہندستانی کا وطن دوآبہ اور شمالی مغربی ہند ہے۔ بنگالی کا مشرقی ہند اور ملایالم کا جنوبی ہند۔ ہندوستانی اور بنگالی آریائی زبانیں ہیں اور ملایالم دڑاوڑی۔ ہندستانی اور بنگالی سنسکرت سے تعلق رکھتی ہیں اور بولی کی منزل سے نکل کر ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ ملایالم ایک اور ڈراوڑی زبان تامل سے گہرا تعلق رکھتی ہے، مگر کوشش کے باوجود وہ اب تک ادبی زبان کے درجہ پر نہ پہنچ سکی۔ ہندوستانی حدود ہند کے باہر دھاوے بول چکی [illegible] کئی حصوں میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ یہی حال ملایالم کا ہے۔ البتہ بنگالی ہندوستان کے باہر پنپ نہ سکی۔ بدیسی زبانوں میں سے صرف انگریزی ایسی

زبان ہے جس نے ہندوستانی اور بنگالی دونوں پر بڑے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اس کے برخلاف ملایالم ہی ہندوستان کی مروجہ زبانوں میں ایسی زبان ہے جو انگریزی سے بہت زیادہ عربی، چینی، ڈچ اور پرتگالی زبانوں کی رہینِ منت ہے۔ ان تینوں زبانوں کی ایک اور مخصوص اور مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے بولنے والے کسی ایک مذہب کے پیرو نہیں ہیں۔ ہر قسم کے عقائد کے ہندو، مسلم، عیسائی وغیرہ کی یہ مادری زبانیں ہیں۔ اب ان تینوں زبانوں کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوب ہند میں ملایالم کو عام زبان بننے کے ایسے ہی مواقع حاصل ہیں جتنے کہ ہندوستانی کو شمال مغربی ہندوستان میں اور بنگالی کو بنگال میں میسّر آسکتے ہیں لیکن کُل ہند کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ملایالم ہندوستانی اور بنگالی کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتی۔ اب رہی بنگالی زبان تو اس نے حال ہی میں غیر معمولی ترقی کی ہے اور ٹیگور جیسی زبردست ہستی نے اسے چار چاند لگا کر اس کا درجہ بہت ملبند کر دیا ہے میکانی طباعت کے لحاظ سے ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بنگالی پہلی دیسی زبان ہے جو ۱۸۱۶ء سے طباعت کے لئے مسلسل ٹائپ استعمال کر رہی ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی عام زبان کے لئے جو شرائط اوپر تجویز کئے گئے ہیں ان کی یہ بدرجہ اتم تکمیل کرتی ہے۔ بعض ایسے بنگالی مسلمان جو اُردو (ہندوستانی) سے محبت رکھتے ہیں ان کی سنجیدہ رائے یہ ہے کہ بنگالی ہندوستان کی عام زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی حقدار ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا یہ خیال درست ہو لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد نہ صرف بہت زیادہ ہے بلکہ وہ پورے ملک کے طول و عرض میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ گویا ہندوستانی سکھانے کے مرکز کسی نے کلیدی مقامات پر قائم کردئے ہیں۔ یہ بات کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہے۔ صرف یہی ایک وجہ اس کو ہندوستان کی عام زبان قرار دینے کے لئے کافی تصور کی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان کی عام زبان کا مسئلہ کیوں زیر بحث اور تصفیہ طلب ہے؟

عام و مشترک زبان کا نام

ہمارے وطن کی متضاد باتوں میں ایک نرالی اور متضاد بات یہ بھی ہے کہ اس کا اور اس کی عام اور مشترک زبان کا نام بھی غیروں نے تجویز کیا ہے۔ غالباً ایرانیوں نے ہمارے وطن کا نام ہندوستان رکھا اور یہ ایسا چپکا کہ لفظ اکھنڈ کے ساتھ بھی سوائے ہندوستان کے کوئی دوسرا لفظ اب تک نہ سمجھایا جا سکا۔ اب رہی عام بول چال تو اس کا نام بھی ہندوستانیوں نے نہیں بلکہ اہل یورپ نے ہندوستانی رکھا۔ ٹیری نامی ایک پادری نے سنہ ۱۶۱۶ء میں ایک عامیانہ اور بازاری زبان "ہندوستان" کا ذکر کیا ہے۔ سنہ ۱۶۷۳ء میں فری ایر نے لکھا کہ "درباری زبان فارسی ہے، لیکن عام طور پر "ہندوستان" بولی جاتی ہے جس کا کوئی باقاعدہ رسم خط بھی نہیں ہے"۔ غالباً گلکرسٹ نے سب سے پہلے اس عامیانہ بولی کے لئے سنہ ۱۷۸۷ء میں ہندوستانی کی اصطلاح استعمال کی اور گارساں دتاسی نے اس کا تتبع کیا۔ انگریز ماہر لسانیات گیرسن نے ہندوستانی کی یہ تعریف کی ہے :-

"ہندوستانی دوآبہ کی زبان ہے اور یہ ہندوستان کی مشترک زبان ہے جو فارسی اور ناگری رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے"۔ اس مشترک زبان کا یہ بدیسی نام چل نکلا، اور انگریزوں نے اسے اتنا رائج کیا کہ ہندی اردو کی جنگ کے دوران میں اسی نام سے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مدت مدید کے بعد بابائے اردو یعنی مولانا عبدالحق صاحب نے ہندوستانی کی اصطلاح کو اس رپورٹ میں استعمال کیا جو بابو راجندر پرشاد صاحب کی شرکت سے اردو ہندی کے قضیہ کو پاک کرنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوؤں کی کوئی عام اور مشترک زبان نہیں تھی۔ کہیں برج بھاشا بولی جاتی تھی کہیں اودھی اور کہیں بندھیلی۔ مسلمانوں کے میل جول سے جب ایک عام بولی پیدا ہوئی تو ہندو مسلمان دونوں نے اسے بڑی محنت اور چاہت سے پروان چڑھایا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب انگریزوں نے

پادریوں کی کارستانی ہندوستان میں قدم جمانے شروع کئے اور عیسائی پادریوں نے اپنے دام پھیلائے تو مغلیہ تہذیب اور کلچر جو درحقیقت قومی تھا یعنی ہندو مسلمانوں نے مل کر اسکا ارتقاء کیا تھا کو اکھاڑنے۔ ہندو مسلم ملاپ کو مٹانے اور دونوں فرقوں میں تفرقے ڈالنے کے لئے ہندوستان کی مشترکہ زبان میں اختلاف پیدا کیا جانے لگا۔ ایک پادری کا بیان ہے کہ جب انجیل کا مروجہ زبان ہندوستانی میں ترجمہ آگرہ روانہ کیا گیا تو وہاں سے یہ مشورہ دیا گیا کہ ہندوؤں میں اسے مقبول کرنے کے لئے فارسی عربی کے الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے جائیں تو مفید مطلب ہوگا۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل شروع کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج نے بھی اس پر توجہ کی اور گلکرسٹ کی رائے کے بموجب للولال نے پریم ساگر لکھ کر ہندوؤں کے لئے مروجہ اور مقبولہ زبان سے مختلف ایک زبان کی داغ بیل ڈالی۔ اس نئی تحریک کے لئے وقت موزوں تھا۔

ہندوؤں کی ایک علیحدہ زبان حالات موافق تھے۔ مغلیہ سلطنت کی تباہی اور قومی تمدن کی بربادی نے ہندوستان کے تمام باشندوں کی زندگی میں سخت انتشار پیدا کر دیا تھا۔ ہر جگہ افراتفری پھیل گئی تھی۔ افراد اور جماعتیں سب کی سب نفسی نفسی میں گرفتار تھے۔ مسلمان انگریزی حکومت کے معتوب تھے۔ ان تمام امور نے ہندوؤں کے لئے جو اپنے مذہبی اور معاشرتی زندگی کے نظام کے باعث علیحدگی پسند ہونے پر مجبور ہیں اپنی انفرادیت کو مسلمانوں سے بالکل الگ تھلگ کرنے کے مواقع وہ بھی زرین مواقع فراہم کر دئیے تھے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوؤں میں عموماً قومیت اور وطنیت کا جذبہ بڑھنے لگا اور شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ملاپ کا جو دور شروع ہوا تھا اور قومی تہذیب کی تعمیر ہو چلی تھی اس کے خلاف ردعمل شروع ہوا۔ یورپ کے عیسائی مستشرقین، مثلاً میکس مولر، کرنل اسکاٹ میڈم بلوٹسکی وغیرہ نے جو اسلام اور مسلم تہذیب کے مخالف تھے، انہوں نے اپنی تحریرات سے ہندوؤں کے شاندار ماضی کی یاد تازہ کر کے ان کو خوب ابھارا۔ دیانند سرسوتی نے ہندوؤں کو مقدس

قدامت کا واسطہ دے کر ہان کے جذبات کو اور زیادہ بھڑکایا اور مستحکم کیا۔ انگریزی حکومت نے جو مسلمانوں کو اپنا مخالف اور باغی تصور کرتی تھی اس نے مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی تحریکات کی تائید کرتے ہوئے ہندوؤں کے لئے جدید زبان کی تحریک کی سرپرستی کی چنانچہ سرانٹونی میکڈانلڈ گورنر صوبہ نے یو۔ پی میں ہندی کو جو مروجہ زبان ہندوستانی یا اُردو کی نئی شکل تھی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اب کیا تھا، علیحدگی پسند ہندو ادیب عربی فارسی الفاظ کو مروجہ زبان سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خارج کرنے لگے اور ان کی جگہ ایک قسم کے انتقامی جذبہ کے ساتھ سنسکرت کے نت سم یعنی اصلی الفاظ جن کا صحیح تلفظ مشکل سے ادا ہو سکتا ہے ٹھونسنے لگے۔

کانگریس اور گاندھی جی کی تحریکات

اس دور کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے بھی زبان کے معاملہ میں دلچسپی لینی شروع کی اور گاندھی جی نے اپنی عادت کے بموجب اس زبان کا نیا نام "ہندی ہندوستانی" رکھا۔ اور اس کے لئے پروپاگنڈہ شروع کر دیا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ ہندو مسلم اتحاد کے شایق اور مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے لئے "بلانک چک" کے مجوز اس نئی زبان کا نام "ہندو پانی" اور "ہندو چائے" کے وزن پر "ہندو ہندی" یا "ہندو ہندستانی" رکھتے!! گاندھی جی کے پیرو اور رفقائے کار کاکا کالیل کر وغیرہ کی کوشش سے غیر مانوس اور مشکل سنسکرت کے الفاظ کی ایسی بھر مار ہوئی کہ اس نئی زبان نے بالکل نیا چولا پہن لیا۔

گذشتہ چند سال میں گاندھی جی کے پیروؤں نے اس نئی زبان کی بڑی سیوا کی ہے وافر مقدار میں ہر قسم کے مضامین پر کتابیں تیار کر دی ہیں جو نہایت واجبی داموں پر فروخت کی جارہی ہیں۔ ہندی پر چارکی سبھائیں بڑے ایثار اور استقلال سے کام کر رہی ہیں اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ "ہندی ہندوستانی" ہندوستانی کی شکل میں ایک مختلف زبان بن گئی ہے لیکن ہندوستان کی خوش قسمتی سے یہ بول چال کی نہیں بلکہ اخباری، کتابی، یا مصنوعی زبان ہے اور اگر تاریخ کا سبق صحیح ہے تو اس کا وہی حشر ہوگا جو سنسکرت۔ پراکرت

اور اہم کشش زبانوں کا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے جو بڑے زمانہ شناس ہیں اس کا احساس کرلیا ہے اور ہتر بجن کا ہندوستانی زبان کا ایڈیشن سنسکرت سے غلو۔ کے بجائے ایک ایسا راستہ اختیار کرنے کا اظہار کر رہا ہے جو مروجہ زبان سے قریب تر ہے لیکن درپردہ یہ کوشش معلوم ہوتی ہے کہ مروجہ زبان پر عربی فارسی نے جو برترا ثرات حاصل کرلئے ہیں ان کو کم کر کے سنسکرت کو ان کی جگہ دی جائے اور عربی فارسی کی ویسی ہی کم تر حیثیت قرار دی جائے جو یورپی جمہوریت کی آڑ میں بلحاظ تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں کانگرس مسلمانوں کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں دینے کے لئے کوشاں ہے۔

رسم خط کا مسئلہ اُردو جہاں تک رسم خط کا تعلق ہے چاہے اردو (نستعلیق) ہو یا ناگری، دونوں میکانی فن طباعت کے لحاظ سے ناقص ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اصحاب متقدر ضروریات کے مدنظر اصلاح کے مخالف ہیں یا اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ سید علی بلگرامی مرحوم نے اردو رسم خط کے متعلق سالہا سال قبل جو کچھ لکھا تھا وہ اس بیسویں صدی میں بھی حرف بحرف صحیح ہے۔ تمدنِ عرب کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ "مثل پہلوی اور فارسی کے اُردو بھی منجملہ ان بدنصیب زبانوں کے ہے جس کا خط ایک غیر قوم کا قرار دیا ہوا ہے اور جس خط کو کوئی طبعی مناسبت زبان کے ساتھ نہیں ہے۔ یعنی زبان میں جبلتاً جو اصوات ہیں ان کو یہ خط بخوبی ادا نہیں کرتا۔ مثلاً عربی ث، ص اور س تینوں سے اردو میں ایک ہی آواز نکلتی ہے، اگر کوئی شخص اردو عبارت پڑھتا جائے اور دوسرا اس کو لکھتا جائے تو جب تک اس کو ذاتی علم عربی کا نہ ہو وہ حرف سن کر ان حروف کو صحیح نہیں لکھ سکتا۔۔۔۔۔۔ سیا طیقی لفظ کو تین چار بلکہ اس سے زیادہ طریقوں سے پڑھ سکتے ہیں، مثلاً عربی میں کتب پر اعراب نہ دیں تو اس کو کَتَبَ۔ کُتِبَ۔ کُتُبٌ (اردو میں لفظ ملک اسی قسم کا ہے۔ راقم) اور ان تینوں صورتوں میں سے کسی خاص صورت کا قرار دینا سیاق عبارت پر موقوف ہوگا (یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ کوئی زبان پر حاوی ہو۔ راقم)۔۔۔۔۔۔ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس ناقص

خط نے اردو پڑھائی کو کس درجہ مشکل کر دیا ہے اور کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے مکتبوں کے بچوں کو محض درست عبارت خوانی کے لئے دو سال درکار ہوتے ہیں۔ ان اشکال کا بہت برا اثر ہم مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر پڑا ہے اور پڑ رہا ہے۔ میکانی طباعت کے نقطۂ نظر سے اُردو ہندوستان کی سب زبانوں سے پیچھے ہے۔ اردو کا رسم خط نستعلیق اس کے موجد ایرانیوں نے طباعت کے لئے بالکل ترک کر دیا ہے۔ کئی سال کی کوشش اور لاکھوں روپئے کے خرچ کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ نستعلیق کا ٹائپ نہیں بن سکتا چنانچہ حکومت سرکار نظام نے سرکاری طور پر اس ناکامی کو تسلیم کر لیا ہے اردو کے لئے نستعلیق کے دلدادہ اس راز سے ناواقف ہیں کہ ماہرین خطاطی کے بموجب نستعلیق کے مسلّمہ اصول کے مطابق نہ فارسی نہ اُردو صحیح طور پر لکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ صحیح طباعت کے لئے ٹائپ ضروری ہے مگر اردو لیتھو ہی کے دقیانوسی طریقہ پر غلط سلط چھپتی ہے اور ہندوستان کی زبانوں میں بلکہ دنیا کی زبانوں میں صرف اردو ہی اب ایسی زبان رہ گئی ہے جس کی طباعت بالعموم لیتھو کے ذریعہ ہوتی ہے۔

ناگری رسم خط ناگری رسم خط اصولی نقطۂ نظر سے ٹھیک ہے مگر گاندھی جی کا یہ دعویٰ کہ "یہ مکمل" ہے، درست نہیں۔ میکانی طباعت کے لحاظ سے یہ اردو سے بدتر ہے۔ اور ہندوؤں کی قدامت پسندی اس میں ترمیم بھی نہیں ہونے دیتی۔ ۱۹۳۵ء میں گاندھی جی کی صدارت میں ایک کمیٹی ناگری رسم خط کی اصلاح کے لئے بٹھائی گئی۔ اس نے کئی سفارشات کیں لیکن آج تک ان کو روبہ عمل لانے کے لئے کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

ہندوستانی کے لئے ایک تیسرا رسم خط یعنی رومن بھی استعمال ہوتا ہے اور انگریزی حکومت ہند نے اپنی فوج میں اسے رائج کیا ہے۔ اس رسمِ خط میں لغات اور دیگر لٹریچر موجود ہے۔ "فوجی اخبار" بھی اسی خط میں ہفتہ وار شایع ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میکانی طباعت کے لحاظ سے بہترین ہونے کے باوجود املا کے لحاظ سے اس میں کئی خامیاں ہیں جو بآسانی دور کی جا سکتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس مسئلہ پر کافی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اگر ہندوستان کے مختلف زبانیں بولنے والے اپنے رسم خط کے

ذیلی رسم خط۔ رومن

علاوہ ایک ذیلی رسم خط جس کی بنیاد لاطینی حروف پر ہو اختیار کرلیں تو بیشتر ان کی زبان کے سیکھنے میں سہولت ہوگی اور اس کے پھیلنے کے امکانات وسیع تر ہوں گے بلکہ ایک عام اور مشترک زبان کے سیکھنے سکھانے اور پھیلانے کے لئے زریں مواقع پیدا ہوجائیں گے۔ ان کی زبان میکانی طباعت کی تازہ ترین ایجادوں سے فوری استفادہ کرسکیگی اور ہندوستان کی عام زبان جو مشکلات کے باوجود حدود ملک کے باہر پہنچ چکی ہے۔ وہ عالمگیر ہوجائیگی۔ ایک غیر جانبدار رسم خط مروجہ زبان کو مذہبی تعصبات سے دور رکھ کر اس کے غیر جانبدارانہ ارتقا میں ممد و معاون ہوگا اور آگے چل کر یہ زبان حقیقی معنوں میں مشترک زبان کا مرتبہ حاصل کرسکیگی۔

اُردو ہندی کا اتحاد

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ عوام نے آپس کی ضروریات کی بنا پر جس مشترک زبان "ہندوستانی" کی بنا ڈالی تھی، اور اس کو پالا پوسا تھا۔ وہ پادریوں۔ مولویوں۔ پنڈتوں اور ہندو مسلم ادیبوں کی بدولت اب اردو اور ہندی میں تقسیم ہوکر انفرادی صورت اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور گو پنڈت دتاتریہ صاحب کیفی فرماتے ہیں کہ "اردو ہندی میں کل تک اتحاد تھا اور اب بھی ہوسکتا ہے" لیکن ڈاکٹر جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کی اس رائے کو نظر انداز کرنا مشکل ہے کہ "میرے دل میں یہ اصول جاگزیں ہوگیا کہ معمولی بول چال میں۔ میں کھاتا ہوں۔ میں جاتا ہوں وغیرہ کے استعمال تو ایک قسم کے ہیں اور ایک قسم کے ہوتے رہیں گے لیکن مضمون نگاری اور تصنیف کے عمل میں یکسانیت قطعاً ناممکن ہے۔ غیر ممکن ہی نہیں بلکہ بربادکن ہے۔ ان (اردو ہندی) زبانوں کا اتحاد اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ کل دھارے وجود مطلق کے بحر بے پایاں میں ضم ہوجائیں گے........ ہندی اور اردو کے دونوں دھاروں کا پریاگ پر سنگم نہیں ہورہا ہے اور دونوں دھارے ساتھوں ساتھ اور الگ الگ چل رہے ہیں اور چلائے جارہے ہیں"۔

اُردو اور ہندی کے خلیج کو پاٹنے کے لئے مولانا عبدالحق صاحب اور بابو راجندر پرشاد صاحب نے مشترک الفاظ کو ایک لغت میں مقید کرنے کی تجویز کی ہے، لیکن اس تجویز کے

وقت انہوں نے غالباً زبانوں کی تاریخ سے عمداً منہ پھیر لیا یا اسکے نتائج کو قبول کرنے سے جان بوجھ کر پہلوتہی کی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زبان کو کوزہ میں بند نہیں کیا جاسکتا جس طرح کسی دریا کو بند باندھ کر بہنے سے نہیں روکا جاسکتا بالکل اسی طرح زبان کو منتخبہ الفاظ کے حدود میں ہمیشہ کے لئے مقید نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ عام طور پر اردو ہندی کے جھگڑے میں عربی، فارسی اور سنسکرت الفاظ سے بحث کی جاتی ہے اور ہندوستانی کے دیگر ماخذوں کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔

ہندوستانی کی خصوصیت

حالانکہ مدتوں پہلے مؤلف فرہنگ آصفیہ نے ایک بڑے پتہ کی بات یہ لکھی تھی کہ "اردو۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی اور ہندی سے مرکب تھی لیکن اب پانچ زبانوں پر مشتمل ہے، یعنی انگریزی الفاظ بھی اس میں شامل ہوگئے ہیں" واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی کی بمقابلہ دیگر السنہ بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑی فراخدلی سے اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے کسی بھی غیر زبان کے الفاظ قبول کرلیتی ہے۔ ہندوستانی کی شاخ اردو میں یہ خصوصیت باقی ہے لیکن ہندی میں بخل اور تنگ دلی سے کام لیا جاتا ہے اور قوی تر رجحان غیر زبانوں کے الفاظ کے استعمال کے خلاف ہے۔ بہ الفاظ دیگر اردو ترقی پسند یا جدت پسند ہے اور ہندی قدامت پسند یا رجعت پسند ہے۔

امریکن فلسفی اور ادیب ایمرسن نے کیا خوب کہا ہے کہ تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ برائی کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے۔ انگریزی حکومت کا ہندوستان کی عام اور مشترکہ زبان پر یہ احسان ہے کہ:-

عام بول چال کی قوت

اس نے کروڑوں ہندو مسلمانوں کو ناخواندہ رکھ کر اردو ہندی کے قضیہ اور شدید جنگ کے زمانہ میں بھی اس عام اور مشترک زبان کو مٹنے نہ دیا۔ میرے تجربہ میں ایک ایسا واقعہ ہے جو بڑا سبق آموز ہے۔ اردو ہندی کے سخت جھگڑے کے زمانے میں میں یو۔ پی میں سفر کر رہا تھا اس مسئلہ کے متعلق ایک ہندی کے پریمی سے بات چیت ہوئی۔ ان کو شبہ بھی نہ ہوا کہ میں کون ہوں! وہ مجھے

جوش میں آکر اُردو کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور ہندی کی تعریف ایسے عربی اور فارسی الفاظ میں کر رہے تھے کہ مجھ جیسا اردو داں حیرت میں مبتلا ہوگیا۔ جب میں نے معصومانہ انداز میں ان سے پوچھا کہ وہ کس زبان میں بات چیت کر رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ "ہندی میں" اس واقعہ سے دلچسپ اور دوررس نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ اردو ہندی کے جھگڑے۔ رسم خط کے اختلاف اور کتابی۔ لغوی یا تحریری تفرقات کے باوجود ہندوستان کی عام اور مشترک بول چال کی زبان مری نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اگر انھیں صاحب کی کوئی تحریر ہوتی تو میں اس کو نہ پڑھ سکتا اور نہ سمجھ سکتا۔ لہٰذا بول چال کی زبان کو برقرار رکھنے، اس کو عام اور مستحکم کرنے کے لئے چند تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ شمالی ہند میں یہ زبان جیسی بولی جاتی ہے ویسی ہی لکھی جائے۔ لکھے پڑھوں کی یہ عادت ہے کہ بول چال اور تحریر میں جان بوجھ کر فرق کرتے ہیں، جب اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا تحریر میں اور زیادہ فرق ہونے لگا۔

اس کے استحکام ورواج کی ضرورت ہندی کے پریمی نامانوس سنسکرت اور اردو کے حامی غیر مانوس عربی فارسی کے زیادہ الفاظ استعمال کرنے لگے۔ حالات زمانہ کے لحاظ سے جدید الفاظ کی جیسے جیسے ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ مروجہ الفاظ سے نئی اصطلاحات بنانے کے بجائے السنہ قدیم یعنی سنسکرت اور عربی کے ماخذ سے بے دریغ مدد لی جاتی ہے اور یہ طریقۂ عمل مشترک زبان کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہا ہے اس معاملہ میں امریکن اصول پر ثابت قدمی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ انگریزوں کی طرح لاطینی یا یونانی کے بجائے مروّجہ الفاظ ہی سے نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات بناتے ہیں۔ مولانا سلیم مرحوم نے اپنی نادر اور راہ نما کتاب "وضع اصطلاحات" میں بڑی قابلیت کے ساتھ اس کے اصول مثالوں کے ساتھ وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں۔ ہندوستان میں کروڑوں ایسے باشندے ہیں جن کو ہندوستانی زبان سکھانے کی ضرورت ہے۔

ہندوستانی کیسے رائج کی جائے ان کے لئے جدید ترین طریقۂ تعلیم کے بموجب درسی

کتابیں تیار کی جائیں اور ان میں ایسے کلیدی الفاظ کا انتخاب کر کے تدریجی اسباق تیار کئے جائیں کہ وہ ان کی مدد سے بہ آسانی اپنا اظہار مطلب کر سکیں، حیدر آباد میں بیسک انگلش کے پیش نظر ہندوستانی کے لئے اسی قسم کا بیش قدر کام ہوا ہے جو افسوس کہ اب تک مطبوعہ صورت میں منظر عام پر نہ آسکا۔ ماہرین حیدر آباد نے ایک ہزار ایسے الفاظ چن لئے ہیں جو جدید ہندی اور اردو دونوں کا جزو لاینفک ہیں۔ ان الفاظ کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی مدد سے ہر قسم کے سیاسی۔ معاشرتی اور کاروباری خیالات کو بخوبی ادا کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک رسم خط کا تعلق ہے ہندوستان کی اس تمام و مشترک زبان کے لئے کسی رسم خط کی قید نہ ہونی چاہئے۔ یہ اُردو۔ ہندی۔ رومن کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے رسم خط میں بھی لکھی جائے۔ البتہ رومن خط (مرمہ) کو رواج دینے کے لئے توجہ کرنے کی ضرورت ہے یہ ایک غیر جانب دار رسم خط ہے۔ اس میں طباعت کی سہولت ہے اور انگریزی زبان کی ہندوستان کو ضرورت اور اس کی عالمگیر حیثیت کے لحاظ سے ہندوستان کی عام و مشترک زبان کو انگریزی داں ملکی اور غیر ملکی رسم خط کی واقفیت کے باعث کفایتِ وقت کے ساتھ جلد سیکھ سکیں گے اور جو ملکی غیر انگریزی داں رومن رسم خط کے ذریعہ ہماری مشترک زبان کو سیکھیں گے ان کو اس زبان کی تحصیل کے ساتھ انگریزی حروف سے واقفیت موجودہ ضروریات کی تکمیل میں مدد دے گی اور انگریزی سیکھنے کے لئے راستہ تیار کرے گی۔ ہندوستان کے انگریزی اُردو اور ہندی اخبار اور رسالے اگر ایک آدھ کالم اس مشترک زبان کے لئے وقف کر کے اس عام و مشترک زبان کو رومن خط میں طبع کر دیں تو اس تشہیر کے ساتھ تو ملک کے مختلف زبانیں بولنے والے حصوں میں ایک قسم کی یگانگت کی فضا پیدا ہو گی اور ہندوستان کے آٹھ سو انچاس بولیاں بولنے والے ایک مرکز پر نظریں جمانے پر مجبور ہوں گے۔ رومن رسم خط میں با تصویر اخبار جاری کیا جائے تو وہ کُل ہند حیثیت اختیار کر لے گا اور اس طرح اَن پڑھ بھی ایک زنجیر کی کڑی میں جکڑ جائیں گے۔

ہندوستانی عام اور مشترک زبان ہے ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہندوستانی ہی ہوسکتی ہے، اور ہونی چاہیئے۔ یہ ہماری میراث ہے اس میں ہندو مسلمان۔ عیسائی، یورپین، اینگلو یورپین۔ اور ہر طبقہ کے لکھے پڑھوں سے زیادہ اَن پڑھ لوگوں کا حصّہ رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ درحقیقت عوام یا جمہور کی میراث ہے۔ اس کے عام اور مشترک ہونے میں جو بھی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہی ہیں۔ اس کے ذمہ دار خواص ہیں۔ بیسویں صدی میں عوام کا دَور دَورہ ہے۔ اس عام اور مشترک زبان کو اردو ہندی کے ادیبوں۔ پروفیسروں سیاسی لیڈروں۔ اخبار اور رسالہ نویسوں، سبھاؤں اور انجمنوں کے چُنگل سے چھڑا کر اُسے اَن پڑھ جاہل عوام کے قبضہ میں واپس دینے کی ضرورت ہے جو اس کے موجد۔ وارث اور حقدار ہیں اور اردو ہندی کے جھگڑوں اور پراپاگنڈے کے باوجود ایک زبان بولتے رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ بولتے رہیں گے۔

ہندوستانی کی خصوصیت ہر ایک کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ "یہ ہماری زبان کوئی اکل کھُری زبان نہیں ہے۔ اس میں سب زبانوں کی کھپت اور سمائی ہے۔ ایسی زبان نے صلاحیت اور ملنساری پائی ہے کہ ہر زبان کے الفاظ خواہ کسی لہجہ اور کیسے ہی مشکل مخرج سے کیوں نہ تعلق رکھیں اس میں بآسانی جزو بدن ہو جاتے ہیں .... جس زبان کا سخت سے سخت اور نرم سے نرم لفظ چاہو اس میں کھپا لو ...."

سجاد مرزا

ہندوستان کی تعلیمی تحریکیں

پروفیسر عبدالغفور صاحب نے ہندوستان کی تعلیمی تحریکوں پر یہ مسلسل مضامین خاص طور پر رسالہ جامعہ (جوبلی نمبر) کے لئے تحریر فرمائے ہیں۔ غفور صاحب کے طرزِ تحریر میں ایک خاص دل کشی ہے۔ آپ غیر ضروری تفصیلات میں قارئین کو اُلجھانا پسند نہیں کرتے بلکہ ہلکے ہلکے اشاروں کے ذریعہ ایسی گہری اور پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کے لئے طویل مقالے بھی ناکافی ثابت ہوں گے۔ جامعہ سے غفور صاحب کو غیر معمولی محبت اور قریبی تعلق ہے۔ اس سلسلے کے مضامین میں دو اور مضمون بھی ہیں۔ "مشنری عیسائیوں کی تعلیمی تحریک"۔ اور "سر سید کی تعلیمی تحریک"۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ اس رسالہ میں چھپنے سے رہ گئے ہیں۔ (مدیر)

(۱) محکمۂ تعلیم

اگر پتھر میں سے جوئے شیر نہ پھوٹے، نہ سہی کم از کم کوہکن کو تو سر پھوڑنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ دودھ کے دھارے نہ بہیں لیکن فرہاد کے خونِ آرزو سے تو وادی ایک بار رنگین ہوجاتی ہے۔ ہمارے محکمۂ تعلیم کی خشک اور بنجر چٹان سے نئی تحریکوں کے سرچشمے نہ اُبل سکے، ہاں اس سنگ خارا کے خلاف تصادم، اس کے مقابلہ میں ردِ عمل سے تعلیم میں نئی آرزوؤں کی بجلی چمک گئی اور اس میں نئی تعلیم کے ایوان اس کے اوپر کونکلتے ہوئے گنبد اور کلس جھلکتے ہوئے نظر آنے لگے۔

محکمۂ تعلیم اور تخلیقی عمل | لیکن آخر ہمارا محکمۂ تعلیم اس بانجھ عورت کی طرح کیوں ہوگیا جس کے

دل کو تخلیق کے جذبے نے کبھی کسمسایا نہ ہو۔ کبھی خوب سے خوب تر کی آرزو نے تڑپایا نہ ہو۔ لیکن ایک نارمل کے سینے میں تو ہزاروں تمنائیں، زندگی کے آدرش، اس کے خواب مچلتے ہیں۔ یہ سب ایک تخلیقی منی سوہنی سی صورت میں دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ اپنے تخلیقی کارنامے میں وہ اپنے زندگی کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو دوبارہ سونے کے تاروں سے جوڑتی ہوئی نظر آتی ہے اس کی خلاء کو دوبارہ رنگ و رامش سے بھرپور دیکھتی ہے۔ اپنے بھولے بسرے خوابوں کی تعبیر دیکھتی ہے لیکن جس کے سینے میں کبھی آرزو اور پیہم جستجو نے آگ نہ لگائی ہو، خواہ کوئی عورت ہو یا محکمہ تعلیم، اسے تخلیقی عمل سے کیا واسطہ۔ وہ تو ایک ققنس کی طرح پر پھیلائے اپنے گرد ہی چک پھیریاں لیتا ہے۔ اپنے آپ میں مگن ہے۔

محکمے کا تاریخی پس منظر

یہ ہمارے محکمہ تعلیم کا قصور نہیں۔ اس عہد کا قصور تھا جس کی وہ پیداوار تھا۔ وکٹوریہ کے زمانے کا انگلستان عجیب بے کیف، بے روح طمانیت کی تصویر تھا۔ اس بڑے قطر والے بنئے کی طرح جس کا کام دنیا میں اپنی توند بڑھانا ہے، اسی میں وہ خدا اور اس کے بندوں۔ کائنات اور اس کی جزئیات سب کا بھلا دیکھتا ہے وہ زندگی میں کامیاب ہے۔ اس کی دنیوی کامیابی اللہ میاں کی طرف سے نہیں کُل کائنات کی جانب سے ایک کھلا ہوا ثبوت ہے، کہ اس کا مذہب، اس کی تعلیم۔ اس کا سماجی اور اقتصادی نظام سب کامیاب ہیں۔ ان کا استحکام، ان کا تحفظ، سیاسی دانشمندی نہیں، مذہبی فریضہ ہے، وہ تعلیم جس نے انگلستان پر یہ سب برکات نچھاور کیں، ہندوستان کے لئے کیسے مفید نہ ہوگی۔

اس طرح یہ بے روح نظام سات سمندر پار سے ہمارے ہاں لایا گیا۔ یہ غیر ملکی پودا ہندوستان کی سرزمین میں پیوند کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں زندگی کی امنگ۔ اس کی ابھرنے تڑپنے والی آرزوئیں کہاں سے آپاتی۔

ریمزے میکڈانلڈ اپنی کتاب گورنمنٹ آف انڈیا میں لکھتے ہیں:-

لارڈ میکالے کو اس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ ہندوستانی ذہن آخرکار مکمل تاریکی میں نہ تھا

کی پیداوار ہے، محض کاغذ کا وہ سفید پرزہ نہیں جسے کوئی جیسا چاہے الٹا سیدھا لکھ کر بھر دے
ہم نے اپنے ہاں ولایت کے مدرسوں میں بھی غلطیاں کیں۔ ہمیں اپنے ہاں بھی تعلیم کے پورے
تخیل، اس کے ڈھانچے کو بدلنا تھا، اس کے ذرائع اور اوپر کے رنگ و روغن کو بدلنے سے کام
کہاں چلتا تھا۔ یہی تعلیم جب ہندوستان میں رائج کی گئی تو ہم نے بہت بڑا دھوکہ کھایا۔ ہندوستانی
ذہن آگے ہی ہندی روایات سے اٹا پڑا تھا۔ اس گودام میں ہم نے مغربی جنس کو اور بھی ٹھونس
ٹھانس کر بھرنا شروع کر دیا۔ ہم نے ان کے کچے اور ملّایانہ نظام پر ایسی نفسیات اور اسکولی نظام کو
مسلط کر دیا جو خالص انگریزی ماحول کی پیداوار تھا۔ اور اب جو اس عمل میں ناکامی اور مایوسی کا
سامنا ہوا تو حیران اور پشیمان ہو رہے ہیں۔"

ہمارے پس ماندہ آقا

پھر اس میں حکمہ کا بھی کیا قصور تھا اس زمانے کا انگلستان تعلیم عوام کے لحاظ
سے دوسرے یورپی ملکوں سے ایک حد تک پچھڑا ہوا تھا۔ اس کی نس
نس میں عہد وکٹوریا کی وہ ذہنیت جاری و ساری تھی جو قوم کے تخیل کو محض اوپر کے طبقے تک
محدود کر دیتی ہے۔ جو ایک نمائشی تہذیب و تمدن، ظاہری اطوار کی ہی نہیں، ظاہری اخلاقیات
اور مذہب کی پرستار تھی، ہماری تعلیم اور اس کی تنظیم پر اس کا جو اثر ہوا وہ ہم دیکھتے ہی نہیں
اپنے رگ و ریشے میں محسوس کرتے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم بھی انہیں میکانکی سانچوں میں ڈھل گیا
افسر اور ماتحت، طلاب اور نصاب سب اس ظاہریت سے مسحور ہو گئے۔ اور وہ نظام تعلیم جس میں
استاد اور شاگرد گہرے رشتوں سے وابستہ تھے، جہاں نصاب سماجی ماحول کے لئے آئینہ
نہیں مشاطہ کا کام دے رہا تھا اب اس سونے گھر کی طرح اجاڑ ہو گیا جس کے رہنے والے
تو چل بسے ہوں لیکن ان کی پرچھائیاں ابھی تک اس کے خالی کمروں کو آباد کئے ہوں۔

ویسے انگلستان میں اونچے طبقے کے لئے بعض ایسے مدرسے موجود تھے جن کی روایات
جن کا ضبط کردار کی تعمیر میں اکسیر کا کام دے رہا تھا۔ ان پبلک اسکولوں میں آرنلڈ اور
تھرنگ جیسی زندہ جاوید ہستیوں نے اچھی تعلیم کے زندہ نمونے قائم کر دئے تھے لیکن وہاں کی

اچھی تعلیم کی جھلک بھی ہمیں اسی دفتری منشوریں سے نظر آتی تھی جو کبھی بورڈ آف ڈائرکٹرز سے جاری ہوتا تھا! اور کبھی انڈیا آفس سے۔ اور کلیوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی نسیم بہار بھی کسی گھورے پر سے گذر جائے تو ساری نہیں، آدھی لطافت تو ضرور پیچھے چھوڑ جائے گی۔

ایک مزاح نویس کے کہنے کے مطابق وہ تعلیمی اصول او رنظریے جو انگلستان میں پچھلے سال ردی کی ٹوکری کے اندر کئے جاچکے تھے آئندہ سال ڈھونڈھ کر بحفاظت تمام نکال لئے جاتے تھے اور منڈ تب اور مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے نئے سال کے تعلیمی آئین میں الہامات کی حیثیت سے داخل کرائے جاتے تھے، پھر اس کے ساتھ ساتھ ایک اور مصیبت تھی پیام اور الہام تو باہر سے آتے ہی تھے، ان کے ساتھ ساتھ تعلیمی پیامبروں کا سلسلہ بھی باہر سے برابر لگا چلا آرہا تھا۔ انگلستان ایک صنعتی ملک ہے اور صنعتی ذہنیت کی سب سے بڑی فتح یہی ہے کہ پیداوار عمل میں کوئی جزوی شے بھی بیکار نہ جائے، گیہوں تو کسی ٹھکانے لگے گا ہی لیکن بھوکٹ بھی کیوں پھینکنا پڑے۔ نوجوان نسل کے اچھے لوگ تو سول سروس میں چلے جاتے تھے اور باقی کے محکمۂ تعلیم کے حصے میں آتے تھے۔ ہندوستان میں ان انگریز تعلیمی افسروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنہیں اس وقت کا کیا ذکر بعد میں بھی کسی قسم کی علمی حیثیت حاصل ہوئی ہو۔ آرنلڈ یا پروفیسر رالی تو ان سیاروں میں سے ہیں جو بھولے بھٹکے ادھر آنکلے، اور پھر ڈوبے تو سچے معنوں میں ستارے بن کر انگلستان کے آسمان پر ہی چمکے۔

آپ کہیں گے کہ سول سروس کے لوگ لاکھ قابل ہوں لیکن انہوں نے ہندوستان کو ایک فولادی شکنجے میں تو کس کے رکھ دیا۔ یہ ضرور ایک تلخ حقیقت ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس شکنجے کے کسنے والے کل پرزوں سے اتنے واقف تھے کہ اب تک یہ شکنجہ ڈھیلا نہیں ہو پایا حالانکہ ہماری تعلیمی مشین کے انجر پنجر ایک عرصے سے ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ محکمۂ تعلیم کے لوگوں نے اس کے ارباب اختیار نے تعلیمی عمل کا غلط مقصد کیوں سامنے رکھا۔ یہ بات خارج از بحث ہے۔ اس میں تو سبھی محکمے برابر کے ساتھی تھے لیکن تعلیم والوں نے تو خالص تعلیمی ٹیکنیک

اس کی جزئیات میں بڑے بڑے دھوکے کھائے ہیں۔ ہماری تعلیمی تنظیم ونسق کی پوری داستان۔ تعلیمی طریق اور ذرائع کے خون سے رنگین ہے۔ اور پھر گشت وخون میں بھی کوئی اصول کارفرما نہیں۔ اسکا ایک بڑا سبب ارباب اختیار کی کم نگہی نہیں، ان کی بے علمی اور کم سوادی تھا، وہ تعلیمی عمل کے مطالبات کو نہیں سمجھ پاتے تھے اور اس بے سمجھی کا اعتراف دوسروں کے سامنے کیا اپنے ضمیر کے سامنے کرنے سے گھبراتے تھے۔

محکمۂ تعلیم یا ایوان سبکدوشی اگر ہم تعلیمی افسروں کی پچھلی فہرست اٹھا کر دیکھیں تو ہمیں ماہرین تعلیم کی جگہ کارواں در کارواں میجر۔ لفٹنٹ اور کرنل قسم کے اصحاب ملیں گے۔ معلوم ہوتا ہے محکمۂ تعلیم نہ تھا فوج کے محکمہ کا Retiring Room ایوان سبکدوشی تھا، کامیاب رہے تو فوج میں کرنیل بنے۔ ناکام ہوئے تو تعلیمات کے ڈائرکٹر ہوئے اور سچ تو یہ ہے کہ ایک جکڑبند، میکانکی نظام کے لئے ماہر تعلیم کی کیا حاجت تھی اس کے چلانے کو فراعنۂ مصر کے زمانے کا غلاموں کا ایسا نگراں ہونا چاہئے تھا جو ایک ہاتھ سے سو سو پر کوڑا پھٹکار سکتا تھا۔

نظام اور تسلسل کی کمی اس کے ساتھ ساتھ اور غضب یہ ہوا کہ تعلیمی عمل اور بالخصوص تعلیمی تنظیم ونسق میں کسی قسم کا منظم سلسلہ نہ رہا۔ اور آخر اس کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی افسروں کا یہ کارواں کوئی پرانے عہدنامے کے پیغمبروں کا سلسلہ تو تھا نہیں جن میں ایک دوسرے کے بعد انسانیت کی تکمیل کا کام انجام دیتا تھا۔ یہاں تو جو نیا ڈائرکٹر آیا اپنا الہام دل ودماغ میں محفوظ ساتھ لایا۔ اگر الہام نہ تھا تو ذہن کی خلا، سر بسر تھی۔ اب اس کے بعد جو الٹی سیدھی میں آیا کردیا یا جو کچھ ان کے کسی بڑے کے دل میں آیا کروا ڈالا تعلیم کا محکمہ پرانا نہیں تھا اس کی روایات بھی سول سروس کی طرح پرانی نہیں تھیں۔ یہ محکمہ اہم نہیں تھا اس لئے کچھ زیادہ سر چڑھے حکام کی نگاہیں پھسلتی ہوئی گذر جاتی تھیں۔ یہ ناگزیر نہ تھا اس لئے اس کے بغیر بھی گذارا ہو سکتا تھا۔ روپے کی کمی ہوئی تو اس کی کٹوتی سب سے پہلے ہوتی تھی۔ بجٹ کو متوازن کرتا ہوا تو

اس پر تصنیف کا گلہاڑا سب سے پہلے چلتا تھا۔

بقول ایک امریکی مصنف کے "انگریزوں پر یہ الزام رکھنا کہ کوئی تعلیمی پالیسی نہیں تھی۔ یا ان کا کوئی مخصوص زاویہ نگاہ نہیں، ایک حد تک زیادتی ہے وہ تو اس کے اہل ہی نہیں محکمہ تعلیم اکثر سیاسی طوفان کے رحم پر رہا۔ یا کسی محاسب کی نظر کرم کو تکتا رہا۔ یا پھر افسروں کے ذاتی خبط اور ان کے توہمات کا شکار بنا رہا۔"

تعلیمی لائحہ عمل یا ذاتی خبط

اگر کسی افسر کو ہاتھ کے کام کا شوق ہوا تو ہر جگہ مدرسوں میں رندہ اور آری چلنے لگی۔ اس کی تبدیلی ہوئی تو یہ اوزار کباڑ خانے میں ایسے بھیجے کہ پڑے پڑے زنگ خوردہ ہو گئے۔ پنجاب میں اینڈرسن ڈائرکٹر ہو کر آئے تو وزارت کی سیاسی مصلحتوں سے ہر طرف لازمی تعلیم کا ڈھول پیٹا گیا وہ رخصت ہونے لگے تو یہ ڈھول تاشے ان کے اعزاز میں اس جوش سے بجائے گئے کہ ہمیشہ کے لئے پھٹ پھٹا کر رہ گئے۔ لارڈ رپن گورنر جنرل ہوئے تو ان کے بعد ۱۸۸۲ء کا تعلیمی کمیشن آیا۔ نجی اداروں کے لئے امداد کے اصول بنے۔ کرزن وارد ہوئے تو یونیورسٹیوں پر ۱۹۰۲ء کے کمیشن کا شکنجہ کس دیا گیا۔

ہم سیاسی طوفانوں کی روک تھام کر سکتے ہیں۔ ہم تعلیم کے لئے خزانے کی تھیلیاں کھول سکتے ہیں لیکن ہم محکمہ تعلیم کے افسروں کے ذاتی خبط اور ان کی حد بندیوں کا کوئی علاج نہیں کر سکتے ہماری تعلیمی اسکیموں کی ناؤ اکثر اسی پوشیدہ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں تو زخم خوردہ ضرور ہو گئی ہے۔ یہ حشر کئی ایک اسکیموں کا ہوا اور برابر ہوتا چلا جا رہا ہے خدا معلوم یہ سلسلہ کہاں جا کر رکیگا۔

---

(۲) ہندوؤں کی تعلیمی تحریکیں

ہندوستان میں تعلیم اور مذہب کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ انگریزی عہد میں

کچھ عرصہ تک تو یہ ساتھ چھوٹا رہا لیکن آخر کار مذہب نے تعلیم کو آلیا۔ ہندو مذہب میں ہمیں احیاء کے دو دھارے ملتے ہیں، ایک کا سرچشمہ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج کی تحریک تھی۔ یہ تحریک ایک سماجی ردعمل تھی ان بھیانک رسوم و عقائد کے خلاف جو کہیں بیواؤں کو لپکتے ہوئے شعلوں کی نذر کر دیتے تھے اور کہیں جگن ناتھ جی کے رتھ جاترا میں انسانوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔ انیسویں صدی کا شروع شروع ہندو مذہب کے لئے عجیب اندھیارے کا دور تھا۔ ویدانت اور فلسفہ، علم اور اخلاقیات اس ماحول میں افسردہ ہو کے رہ گئے تھے لیکن آہستہ آہستہ زندگی کی رَو دوبارہ بیدار ہونے لگی۔ رام موہن رائے کی تحریک نے نئے سرے سے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اس بڑے دھارے سے کئی ایک شاخیں نکلیں۔ ان میں سے ایک سوامی وویکانند کی راما کرشنا مشن کی تحریک تھی۔ یہ ایک فلسفیانہ ردعمل تھا، اس مادی ماحول اور مادی نظریات کے خلاف جنہوں نے سماج کو چار طرف سے آلیا تھا۔ یہ ایک احتجاج تھا، عیسائی پادریوں کے خلاف جو ہندو سماج کو پرانے عقائد کی زنجیروں سے آزاد کر کے نئے عقائد کے بندھنوں میں پھنسا دینا چاہتے تھے۔ یہ تحریک آواز تھی ویدانت کے اس تخیل کے خلاف جو اپنی نگاہ اپنی ناف ہی پر جمائے سمادھی لگائے تھا۔ اس کا مقصد بقول ایک مصنف کے ویدانت کو ایک مرتبہ مرکب عمل بر جگہ دینا تھا، اسے کارزار حیات میں تگ و تاز کے لئے تیار کرنا تھا اور سماجی خدمت اور قوت عمل کے ذریعہ ہندو سماج کے ضمیر اعلیٰ کو بیدار کرنا تھا۔ اس آہنگ عمل میں یقیناً تعلیم اور سماجی خدمت کے لئے ایک نیا پیام زندگی پوشیدہ تھا۔ اس مشن نے اپنے خدمتی اداروں اور رفاہ عام کے کاموں سے تعلیم کو ایک وسیع اور گہرے معنوں میں روشناس کرایا۔ رادھا سوامی سنگھ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انہوں نے بھی ہندو سماج کے کثرت الاصنام کی جگہ وحدت الوجود کا عقیدہ پیش کیا اور عملی زندگی میں دیال باغ آگرہ کے صنعتی اور تعلیمی ادارے میں ان اصولوں پر زندگی کی نئی تنظیم کا کام شروع کیا۔

یہ سب ہندو سماج کی نئی زندگی کے خاموش دھارے تھے جو بے آواز ذرا، ہنگامہ اور شور کے بغیر فطرت کی ان دیکھی قوتوں کی طرح اپنے کام میں مشغول تھے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک

اور دھارا بھی تھا جو پہاڑی ندی کی طرح اس صدی کے شروع میں طوفان مچاتا ہوا اٹھا اور جس کی گرجتی برستی صدائوں میں مدھم لیکن پیہم اور مسلسل جاری رہنے والی دوسری تحریکیں گم سی ہو کے رہ گئیں۔ ہندو دھرم کی احیاء، اس کی تجدید کی، اس نئی للکار نے پورے ہندوستان کو آلیا اور چاروں طرف سے آلیا۔

یہ تحریک خالص مذہبی احیاء کی تحریک نہ تھی۔ اس میں اگر ایک طرف نئے سیاسی شعور کا رنگ جھلک رہا تھا اس کے ساتھ خود اقتصادی کا تازہ احساس بھی موجود تھا، غیر ملکی حکومت کے متعلق ایک نیا عزم۔ نیا رجحان۔ اس کے ساتھ غیر مذہب ہم وطنوں کے خلاف خود حفاظتی تدابیر کا پروگرام۔ یہ نئی تحریک کہیں تو گنپتی کے جلوس کے ساتھ آئی اور کہیں سرسوتی کی پوجا سے شروع ہوئی۔ جب حکومت نے پلیگ کی عالمگیر وبا میں حفاظتی تدابیر کرنا چاہیں اور بعض ناسمجھ افسروں نے اس میں جلدی مچائی تو اس تحریک نے مجسم سماجی غیض وغضب کا روپ لے لیا۔ عیسائی پادریوں نے سماج کے نچلے طبقوں میں گھر کرنا شروع کیا تو اس نے آریہ سماج اور ویدک دھرم کا پھریرا ضیم کے مقابلے میں لہرا دیا۔ جب حکومت نے تقسیم بنگال کا فیصلہ کر دیا تو اس نے ایک سیاسی طوفان کا رنگ لے لیا ہندی اور اردو کے مسئلہ پر ہندی پرچارنی سبھا کے بھیس میں نمودار ہوئی۔ اس تحریک نے ہندو سماج میں نئی قوت عمل کی روح پھونک دی۔ اس روح کے بیدار کرنے والی تم لک کے وہ ارشادات تھے جو گیتا کے جدید مطالعہ پر مبنی تھے یا پھر سوامی دیانند کی صدا جو گجرات سے اٹھی اور سارے ہندو پنجاب پر چھا گئی۔ روس کے خلاف جاپان کی فتح نے اس نئے جذبے کو اور بھی بھڑکا دیا۔ بقول لارڈ کرزن اس فتح کی صدائیں سارے مشرق کے ایوانوں میں گونج اٹھیں اور انہوں نے دلوں کے خوابیدہ تاروں کو نئے سرے سے چھیڑ دیا۔

اس نئی تحریک کی بنیاد اپنشد کا فلسفہ نہیں تھا، بلکہ گیتا کا آہنگ عمل تھا اس کا میدان گیان دھیان کا گوشہ نہیں بلکہ کارزار حیات تھا۔ اور اس کے مدمقابل بدقسمتی سے جو کوئی بھی سامنے آجائے جبکہ پہلی تحریکیں ایک نئی وسعت اور گہرائی، اثبات اور عالمگیر ہمدردی کا پہلو لئے ہوئے تھیں۔

یہ تحریک ایک حد تک منفی اور مذہبی حد بندیوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ ایک اعلان جنگ تھا اور جنگ میں بھلا دوست دشمن کی تمیز کہاں رہتی ہے۔ اس تحریک نے بعض پہلو سے ہندو سماج کو قوت بخشی لیکن اس کے ساتھ ساتھ عام ہندوستانی سماج کے رشتوں کو اگر بالکل توڑا نہیں تو ڈھیلا ضرور کر دیا

سیاسی اور مذہبی تحریک کی طرح اس کے تعلیمی نتائج بھی بالآخر ظاہر ہوئے۔ اس تحریک نے ہماری تعلیمی زندگی میں کسی تخلیقی کارنامے کا ثبوت نہیں دیا بلکہ Recapitulation کے اصول کے مطابق ہمارے ارتقائی سلسلے کی پہلی کڑی یعنی ویدک زمانے کے آشرم کو نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کی۔

شمالی ہندوستان میں گوروکل کے قسم کے اداروں کا جال پھیل گیا۔ گنگا کے پوتر کناروں پر نوجوان ودھیارتھیوں کے لئے پرانے علوم و فنون۔ سنسکرت ادب اور برہم چاریہ کے خزانے کھل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کے بھارت ورش نے نیا روپ دھارن کر لیا ہے۔ آریہ سماج نے ان اداروں کو بڑے جوش اور ولولہ، شوق اور قربانی سے چلایا۔ ان اداروں کی ادبی اور انجمن مباحثہ کی زبان سنسکرت ہے اور ۱۲ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کے طلباء یہ زبان روانی سے لکھ پڑھ اور بول سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آریہ سماج نے ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کی بنیاد ڈال دی۔ اس کے استاد لائف ممبری کے اصول پر کاربند ہیں، ان لوگوں نے جاتی اور ویدک دھرم کے احیاء کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ طلبہ نے اس جذبے کی لگن استادوں کے دل میں دیکھی تو اس کی گرمی حیات ان کے سینوں میں بھی پہنچی، لیکن ان بے عدیل قربانیوں، ان ان گنت زندگیوں کا جنہوں نے خون جگر سے اس پودے کو سینچ کر پروان چڑھایا کیا نتیجہ نکلا؟

اس سوال کا جواب لالہ لاجپت رائے اپنی کتاب قومی تعلیم میں دیتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر آریہ سماج کے کام کی داد کون دے سکتا ہے، لاجپت رائے آریہ سماج کے وہ ستون ہیں جنہوں نے آخری عمر تک اسے سہارا دیا اور جب یہ سہارا ٹوٹا تو

اس کی عمارت ایک دفعہ ڈگمگا گئی۔

لاجپت رائے کہتے ہیں کہ آریہ سماج کے تعلیمی کام پر ان کے اصول ومقاصد پر ایک ہی حرف نقش ہے، وہ ہے ناکامی! ان کے اپنے الفاظ ہیں۔

"میں ذاتی طور پر سنسکرت زبان اور ادب سے بے حد لگاؤ رکھتا ہوں لیکن میری رائے میں اگر ہم نے اسے ذریعہ تعلیم یا نجات بنالیا تو ہم یقیناً بری طرح ناکام ثابت ہونگے اس سے تو عربی اور فارسی ہی بہتر ہیں، وہ کم از کم زندہ زبانیں تو ہیں۔ انھیں لکھو کھا لوگ بولتے ہیں سنسکرت کی ہمارے ہاں وہی حیثیت ہے جو یورپ میں لاطینی اور یونانی کی۔ وہاں بھی سمجھدار لوگ ان زبانوں کے مطالعہ کو آہستہ آہستہ چھوڑ رہے ہیں، اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اپنا وقت اور توجہ زندگی کے عملی مسائل پر لگائیں تو ہمیں یقیناً سنسکرت کو چھوڑنا پڑے گا۔ ماضی میں رہنے کی کوشش بیکار محض نہیں بیہودگی اور کم عقلی کی دلیل ہے۔ ہمیں تو اگر کسی چیز کی فکر کرنا ہے تو وہ مستقبل ہے۔"

لالہ لاجپت رائے کی یہ متوازن اور بالیدہ رائے ۱۹۱۹ء کی پیداوار ہے، لیکن جب اس صدی کے پہلے دسویں میں اس تحریک کا زور ہوا تو اس میں سبھی بہ نکلے۔ مسز اینی بسنٹ جن کی آغوش عاطفت میں تھیوسافیکل تحریک نے پرورش پائی، جنہوں نے اس زمانے میں ہوم رول کی صدا بلند کی جب کسی کو ایسی صدا بلند کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ انہوں نے بھی اس جوش میں آکر تعلیمی مسائل پر کچھ ایسی رائیں ظاہر کیں جنہیں پڑھ کر آج یقین نہیں آتا۔ گورکل ۱۹۰۲ء میں جاری ہوئے۔ اپنی ایک ۱۹۰۳ء کی تقریر میں انہوں نے کہا کہ سنسکرت زبان ہر مدرسے میں ایسے ہی لازمی قرار دے دینا چاہئے۔ جیسے یورپی مدارس میں لاطینی۔ یہ زبان ہماری ہندوستانی بولیوں کے ادب کا سرچشمہ ہے۔ اس کا علم ہر ہندو نوجوان کے ادبی سرمایہ کا ضروری عنصر ہونا چاہئے۔ یہ زبان ہماری قومیت کے رشتہ کو استوار بنا سکتی ہے کیونکہ ایک مشترکہ زبان ہی قومیت کا سب سے اہم عنصر ہوتی ہے۔

مسز اینی بسنٹ نے نیا مذہب اختیار کیا تھا ان میں نئے عقیدت مند کی سبھی خوبیاں موجود تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ جس طرح ہندو احیاء کے موئید پرانے عقائد کے ہر پہلو کو اخلاقی یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نہیں خالص سائنس کے نظریوں سے سمجھانے اور ذہن نشین کرانے پر تلے ہوئے تھے، کالی داس کو اقلیدس سے اور Ramesco کو رام چندر جی سے ملانے کی رائیگاں کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ رائیگاں اس لئے کہ کالیداس کی عظمت کو کسی اقلیدس کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی رامچندر جی کی بلند شخصیت کو رامیس سے رشتہ جوڑنے کی۔ اسی طرح وہ پرانے ویدک آشرم کے سب طریقوں کی اپنے خون کے آخری قطرے سے حمایت کرنے کو تیار تھے۔ ان کی زبان مشرقی لیکن استدلال اور نظریں مغربی ہوتی تھیں۔ مسز اینی بسنٹ کی رائے میں سنسکرت ہمارے ہر بچے کے لئے لازمی ہونا چاہیئے، کیونکہ یورپ میں لاطینی لازمی ہے۔ ہمارے اداروں میں اچھوتوں کو جگہ نہیں ملنی چاہئے کیونکہ ایٹن کے مدرسے میں اگر غریب کے بچے جانے لگیں تو لوگ اس پر ہنس دیں گے۔ یہ استدلال کچھ ایسا اٹل نہیں۔ آج یورپ کے مدرسوں میں لاطینی زبان کو اس کے شہ نشین سے اتارا جا رہا ہے اب یہ مضمون بھی دوسرے مضامین کی صف میں کھڑا ہے۔ بلکہ اس کے سوا چند اور زیادہ اہم مضامین دو چار قدم شہ نشین کی طرف بڑھ آئے ہیں۔

ایٹن اور رگبی کے مدرسوں میں جو اونچے طبقے کے تعلیمی گڑھ تھے اب رخنے پڑنا شروع ہو گئے ہیں ان میں۔ عوام کے بچے چوری چھپے نہیں پکارتے للکارتے داخل ہو رہے ہیں۔

آج ہم ان تصورات اور نظریات پر حیران ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کل آنے والی نسلیں ہمارے تعلیمی خیالات سے اتفاق نہ کریں۔ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے جس میں ہمت تھی اس نے ساتھ دیا جو پیچھے رہ گیا اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ مسز اینی بسنٹ ایک زمانے میں ہوم رول کی دیوی تھیں، لیکن جب لوگوں نے آزادی کی قربانگاہ پر بے باکانہ بھینٹ چڑھانا شروع کی تو ان کی پرستش کم ہو کے رہ گئی۔ ایک زمانے میں تلک

تعلیمی آورش میں عجیب وغریب ندرت وتازگی، جراءت اور بالیدگی جھلکتی تھی آج وہ پھیکے سیٹھے۔
بے آب ورنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے رنگ بڑے پختہ تھے، جس کپڑے پر اس دور میں
چڑھے بہار کی طرح نکھر گیا۔ لیکن یہ دامن بہار ہمارے درمیانی اور اونچے طبقے کا تھا، کیا ہندو،
اور کیا مسلمان، اس زمانے کی نئی تحریکیں خواہ مذہبی ہوں یا سماجی سبھی اس طبقے کے دامن سے
لگی تھیں۔ اُن کے روائتی کلچر، ان کی اقتصادی اور روحانی ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔ لیکن یہ
سب سطح آب کی شکنیں تھیں جو ایک کنکری مارنے سے بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ابھی سماج کے
گہرے پانیوں میں اس کے عوام میں ابھی نئی زندگی کی لہر نہیں آئی تھی، انھیں ان کی مذہبی تُنگ نظریوں
اور مناظروں، گئے گزرے زمانوں کی تجدید یا سنسکرت کے احیاء سے کیا واسطہ۔ ان کے دل
میں نہ گوروکل کی جگہ تھی نہ اڈیار (Adyar) کی۔ اس عہد میں انگلستان کی طرح یہاں بھی مذہب
اور اخلاقیات۔ تعلیم وتمدّن سب پر درمیانی طبقے کی حکمرانی تھی، اب وہاں اس کا طلسم ٹوٹ
چکا، اس کی سحرکاریاں ختم ہوئیں۔ ہمارے ہاں بھی اس کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ زندگی کے تقاضوں
نے اب زیادہ وسعت اختیار کر لی ہے اب اوپری سطح ہی نہیں پانی کا پورا طوفان گہرائیوں تک
اُبلنے لگا ہے۔ اس طوفان کے سامنے ہمارے کلچر اور مذہب کے محدود اور تنگ دائرے ٹوٹ
ٹوٹ کر بہ نکلیں گے اور ان کی اقدار ایک آفاقی حیثیت اختیار کرلے گی۔

تحریکیں ختم ہو جاتی ہیں لیکن ان کی پیدا کی ہوئی ذہنیت نہیں جاتی۔ مادّی جسم آگے بڑھتا
ہے۔ ذہن اکثر ہانپتا کانپتا رہ رہ جاتا ہے۔ پُرانی دلدل میں پھنسا ہوا نکلنے کو ہاتھ پاؤں مارتا ہے
مگر نکل نہیں پاتا۔ گوروکل کم ہو رہے ہیں لیکن ممکن ہے ان کی جگہ کوئی نیا آشرم لے لے سنسکرت
زبان کے سیکھنے کا وہ زور شور نہیں لیکن کیا معلوم ایک دن ہندی زبان ہی اس روپ میں ظاہر ہو
آج دنیا میں Planned اور مرکزی تنظیم والی سماج کا دَور دَورہ ہے لیکن ہمارے
ہاں لوگوں کی نظریں رہ رہ کر غیر مرکزی تنظیم کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ ہمارا ماضی زندگی کی بے پناہ
قوتوں کو نئے دھاروں میں نہیں ڈھالتا بلکہ ان کی روانی میں ایک بند کا کام دے رہا ہے۔

یہ ہمارے راستے میں پھن اٹھائے بیٹھا ہے۔ اس کا توڑ اگر ہے تو اچھی تعلیم میں ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو ماضی کے پرستار اس اکسیر کو بھی اپنے ہاتھ میں لےکر زہر آمیز کر دیں زندگی کے اوراق اُلٹ کر ہمیں پھر اس سادہ صفحے پر پہنچا دیں جہاں سے انسانیت نے نقشِ اوّل شروع کیا تھا۔ یہ نقش ازل کی تکریم نہیں انسانیت کی تذلیل ہے۔

تعلیمی لحاظ سے یہ تحریک ایک ترشول ہے جس کا ایک پھل خالص مذہبی رنگ رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ آریہ سماج کے مغربی علوم کے ادارے اور گورو کل ہیں۔ اس کی دوسری شاخ تھیوسافیکل سوسائٹی کا کام ہے جو اپنے اصول اور روح کار کے لحاظ سے برہمو سماج، اور راماکرشنا تحریک سے ملتا جلتا اس کے پیام میں صوفیوں کی سی گیرائی اور گہرائی ہے اور تھیوسافیکل تحریک کا دھارا تعلیمی لحاظ سے ایک مقطر اور شفاف ندی کی طرح علیحدہ بہتا رہا ہے تنگ نظر مذہبیت یا سیاست اسے مکدر نہ کر سکی اس کی تہ آب میں اب تک خالص تعلیمی جواہر ریزے چمکتے دمکتے آتے ہیں اس کے موتی کی آب اب تک قایم ہے۔ اس تحریک کا ایک بڑا احسان ہمارے دیس میں منٹو سوری طریق تعلیم کی ترویج اور اسے عام کرنا ہے۔ تھیوسافیکل سوسائٹی نے اس کے اچھے مثالی ادارے قایم کر دئیے اس سے دوسروں کو بھی شوق پیدا ہوا اور اس جنگ کے دوران میں جب مادام منٹوسوری جنہیں تعلیم کی مادر عظمیٰ کہنا مناسب ہو گا۔ ہندوستان میں رُک گئیں تو انہوں نے Adyar کو اپنے کام کا مرکز بنایا۔ اس جنگ کے دوران میں منٹوسوری تخیل ہمارے ملک میں چل نکلا ہے۔ مادام نے اس طریق تعلیم کے استادوں کا اچھا خاصا گروہ تیار کر دیا ہے۔ پیشہ سے باہر کے بیدار دل لوگوں میں بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے۔ اور اب جبکہ سارجنٹ اسکیم نے تین سے پانچ سال کے بچوں کی تعلیم کی بھی ضرورت کو مان لیا ہے۔ مادام منٹوسوری کی بالیدہ نگاہ کے نیچے پروان چڑھے استاد ہمارے تعلیمی ایوان کی پہلی منزل کی تعمیر میں بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

مسز اینی بسنٹ پر احیاء مذہب کا بڑا گہرا سایہ پڑا تھا اور اس کے دھندلکے میں ان کے

پرانے نقوش ان کی آفاقی حدود مدھم ہو کے رہ گئی تھیں۔ انہوں نے اس صدی کے آغاز میں فرقہ وارانہ یونیورسٹی کے خلاف علم بلند کیا تھا ایک جراءت انگیز للکار میں انہوں نے ہندوستان کی ساری قوموں کو پکار کر کہا: "کیا تم چاہتے ہو کہ ہندو اپنی یونیورسٹی بنائیں، مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ تعمیر کریں اور پارسی لوگ اپنا انتظام علیحدہ کریں۔ میں ایک قومی یونیورسٹی کی تائید کرتی ہوں، فرقہ وارانہ ادارے کی نہیں۔"

لیکن کچھ سال بعد یہ پھریرہ جو قومی یونیورسٹی کے لئے لہرایا گیا تھا، سنٹرل ہندو کالج پر نصب کر دیا گیا، یہی ادارہ بعد میں بنارس ہندو یونیورسٹی بنا!

"بنارس ہندو یونیورسٹی کا مقصد" بقول عیسائیوں کی اعلیٰ تعلیم کے کمیشن کے "ہندو ادب اور تہذیب۔ مذہب اور فلسفہ کا احیاء تھا۔ لیکن ہوا کیا۔ ہندو یونیورسٹی کا سب سے زیادہ روشن کارنامہ انجینئرنگ کا شعبہ ہے۔" اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم لاکھ شتر مرغ کی طرح ماضی کی ریت میں سر چھپانے کی کوشش کریں۔ زمانہ حال کی فلک شگاف کرنیں ہمیں اپنا سر نکالنے پر مجبور کریں گی۔ ہندو یونیورسٹی کا انجینئرنگ، زراعت اور چینی کے کام کے شعبے ہندو مذہب اور تہذیب کی شکست نہیں۔ یہ اس کی فتح کی علامت ہیں۔ سچا ہندو مذہب کبھی مادی ماحول کے بدلنے میں حائل نہیں ہوگا، ممکن ہے آئندہ چل کر ذہنی ماحول کے بدلنے میں بھی حائل نہ ہوا

احیاء کی تیسری شاخ سودیشی اور بائیکاٹ کی وہ تیغ بے درماں تھی جسے تقسیم بنگال کے مسلمنے سان پر چڑھایا۔ اس تحریک نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشن کو جنم دیا جو لاجپت رائے کے خیال میں سچے معنوں میں قومی تعلیم کی تحریک تھی۔ یہ تحریک فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالاتر تھی اور بنگال میں کسی ہندو تعلیمی تحریک کا قومی حیثیت اختیار کر لینا آسان تھا۔ بنگال میں تعلیمی لحاظ سے ایک ہی قوم تھی وہ ہندو تھی ۔ لکھے پڑھے مسلمان کا تو کمپنی بہادر اور بعد کی حکومت کی مہربانیوں سے نام نشان نہ رہا تھا۔ ان کی تباہی کی داستان نے ہی تو ہنٹر کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" کے صفحات پر خون کی گل ریزیاں دکھائی ہیں۔ اس تحریک کے لوگوں نے فرقہ وارانہ قومیت کو

چھوڑا۔ یونیورسٹی کے نصاب کو بالائے طاق رکھا۔ حکومت کی امداد کو ٹھکرا دیا، چند مخلص اور پرجوش نوجوانوں کو لیا۔ قربانی اور بے نفسی کے اصولوں کو لیا۔ ملک کی قومی اور اقتصادی ضروریات کو سامنے رکھا اور نیا نصاب مرتب کیا۔ تھوڑے عرصے میں ایک نیشنل کالج قایم ہوگیا اس کے ساتھ ساتھ کئی ایک نیشنلسٹ اسکول کھلے لیکن جس تیزی سے لو بھڑکی اسی سرعت سے مدہم بھی پڑ گئی۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد یہ تحریک ہماری تعلیم کی تاریخ میں ایک ٹوٹے پھوٹے کھنڈر ایک افسردہ یادگی حیثیت اختیار کرگئی۔ اس کے مربیوں نے اپنی توجہ ہٹالی اور اس کے سرمایہ کو کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس کالج کی تکمیل میں لگا دیا۔

---

(۳) عربی مدرسوں کی تحریک

یہ نئی تحریکیں تو وہ ادارے تھے جو مغربی تہذیب، اس کے سیلابی حملے کے خلاف ردعمل کے طور پر ظہور میں آئے۔ لیکن پرانی تعلیم کے اداروں کا کیا ہوا جنہوں نے اس ملک کو ایک زمانے سے سرچشمۂ علم و ہنر بنا رکھا تھا۔ ان کے خاتمے کی دردناک داستان تو کسی دوسرے وقت پر اٹھار کھیئے اس وقت تو ہمیں دیکھنا ہے کہ آیا ہندو اور مسلمانوں میں زندگی کی کوئی پیہم اور مسلسل ایسی اُمنگ باقی تھی جو ان کی پرانی تعلیم کو حیاتِ نو بخش سکتی۔ ہندوؤں میں ہم مذہبی احیار کی داستان تو سن چکے تجدید مذہب کے یہ علم بردار بنارس کے وہ برہمن نہیں تھے جن کی دلداری کا فریضہ ادا کرنے کی جانب ۱۸۱۳ء کے تعلیمی ڈسپیچ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ حکومت مرہٹہ حکمرانوں کے نقشِ قدم پر ان مذہبی علمار کی قدر کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ان کے علم کی ضرورت نہ تھی، برہمن ان کی بساطِ سیاست کا ایک مہرہ بن سکتے تھے، لیکن مذہبی علم تو ایک پٹے ہوئے مُہرے کی بھی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ راما کرشنا مشن کے سوامی یا گوروکل کے بانی پرانی طرز کے برہمن نہ تھے وہ تو پرانے طرز خیال کے خلاف ایک احتجاج تھے، ایک گرجتی برستی للکار تھے، معلوم ہوتا تھا کہ پرانے ادارے

مغربی سیلاب کی تاب نہ لا سکے۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ ہندوؤں کے تعلیمی ادارے قوم کا سرمایہ نہیں تھے، برہمن طبقے کی جاگیر تھے، ان کی جڑیں۔ اس کی سوتیں حیات ملی میں بہت گہرائی تک پہنچ نہ پائیں تھیں، ان کی حیثیت ہمیشہ علمی اور انفرادی لحاظ سے علمی رہی۔ اجتماعیت کی کمزوری اور روحانی خودمرکزیت کے احساس نے ان اداروں کو ایسی قندیلیں بنا دیا تھا جو اپنے ہی فانوس میں جگمگاتی ہوں اور جن کی روشنی اس کے اندر سے چھن چھن کر بھی مشکل سے گذر سکتی ہو۔ ان اداروں کا ہندوستانی عوام پر کبھی ہمہ گیر اثر نہیں رہا۔ بدھ مت کے بھکشو اور ان کی خانقاہیں عوام کی زندگی میں ایک نئی قوت بن کے آئیں۔ بھگتی تحریک کے عقیدت میں سرشار شاعروں اور صوفیوں نے عوام کی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کے سازِ حیات کے تار اپنے پر خلوص پُر اثر سیدھے سادے دیسی بولیوں کے گیتوں سے چھیڑ دئیے لیکن سنسکرت کے مدرسے عوام کی زندگی میں نہ آگ بن کے آسکے نہ راگ۔ اور جب ایک اجنبی حکومت نے مغل بادشاہوں کی جگہ لے لی تو وہ سرپرستی بھی جاتی رہی جو مسلمان فرمانروا ان اداروں کی کرتے رہے تھے۔ اور یہ ادارے ایک ذہنی اور مذہبی قوت کی حیثیت سے ختم سے ہو گئے۔

لیکن مسلمانوں کے مذہبی اداروں کی حیثیت ان سے کچھ جداگانہ تھی۔ اکبر، بلکہ اس سے پہلے سے علماء نے اس ملک میں اپنی ایک مخصوص حیثیت قایم کر لی تھی۔ صدرالصدور یا صدر اعظم کی حیثیت نہیں مذہب کے نام سے سونے کی اینٹیں بنا بنا کر گھر بھرنے کی حیثیت نہیں بلکہ عام سماجی خادم کی حیثیت کی بیواؤں کے گھروں میں پانی بھرتے والے، ٹوٹے ہارے مسافروں کے باربردار کی حیثیت۔ اور کبھی سر دربار سر پر کفن باندھ کر کلمۂ حق کہنے کی حیثیت۔ حضرت مجدد الف ثانی سے لے کر حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید تک، زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی آرزو ایک بجلی کی لپکتی ہوئی لکیر کی طرح صفحۂ تاریخ پر چلی جا رہی ہے۔ سید محمد جونپوری سے لے کر مولانا ولایت علی تک علم و عمل، گفتار اور کردار ایسے ہم آہنگ نظر آتے ہیں کہ فقیہ مدرسہ میں پیر میکدہ رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

علم الحیات میں کسی جسم کے ساز زندگی کا ثبوت اس سے بہم نہیں پہنچتا کہ یہ خوشگوار ماحول کہاں تک جوش کی نمائش کرتا ہے بلکہ اس کی آزمائش تو اس وقت ہوتی ہے جب یہ ناسا عد حالات میں زندگی کا ثبوت دے اور حیاتی سرمایہ کے پوشیدہ خزانوں سے ایسی نئی قوت، ایسا نیا سامان مدافعت پیدا کردے جس کا سان گمان بھی نہ ہو۔ سلطنت مغلیہ کے آخری زمانے میں طبقۂ علما بڑے آزمائش کے دور میں سے گزر رہا تھا۔ خود شاہ عالم کا حکم ہی پالم تک چلتا تھا تو خیال ہوتا ہے کہ علما کی آواز تو مسجد کی چار دیواری سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہوگی۔

لیکن عین اسی زمانے میں ہمارے علما علم کوشی اور سرفروشی کے عجیب روح افزا مظاہرے پیش کرتے تھے۔ ہمارا درس نظامیہ اسی زمانے میں مرتب کیا گیا۔ اس ملک میں علما کی سرکردگی میں جہاد پہلی بار منظم کیا گیا۔ تیمور کے زمانے میں علما کو میدان جنگ میں بیگمات کے خیموں کے پیچھے جگہ دی جاتی تھی، اب انہوں نے اپنی جگہ آگے کی صف میں بنا لی۔ ہماری سیاسی زندگی کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ علما تعلیم اور تعلم کی دولت کو سمیٹنے اور سے سلیقے سے ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھے ادھر دہلی میں شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں تدریس کی دیواریں نئی بنیادوں پر اٹھائی جارہی تھیں اور قرآن وحدیث کے سرچشمے سے فلسفہ اور علم الکلام کے پیدا کئے ہوئے ویرانوں کو دوبارہ آباد کیا جارہا تھا۔

مسلمانوں میں مذہبی پیشوائی کسی مخصوص طبقے کا اجارہ نہ تھی۔ یہ پوری قوم کا سرمایہ تھی۔ اس لئے اس گروہ میں پوری قوم کی نمائندگی رہی اور علم اور اس کے ادارے اپنے اردگرد ایسی فولادی دیواریں کھڑی نہ کرسکے جو انھیں زندگی کی رَوؤں سے علیحدہ کر دیتیں۔ اسی لئے ان اداروں کو مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی زندگی سے گہری وابستگی رہی۔ شاہ عبدالعزیز کے مدرسے کی اٹھتی ہوئی لہر نے اگر ایک جانب سرحد کی پہاڑیوں کو جا لیا تو دوسری جانب دہلی کی ارباب نشاط میں بھی اپنی اخلاقی زندگی کے متعلق ایک نیا تجسس، ایک شدید بےچینی پیدا کردی

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے غدر کے قیامت خیز ہنگامے تک وہابی تحریک سے عدم تعاون کے زمانے تک اس جماعت کی قربانیاں ایک ہی آہنی عزم کی کڑیاں، ایک ہی سرفروشانہ جذبے کے مختلف پہلو ہیں۔ نگاہوں کے سامنے اس پرعظمت فلم میں کہیں ہم شاہ اسمٰعیل شہید کو فتحپوری کے تپتے ہوئے فرش پر گھٹنوں چہل قدمی کرتے دیکھتے ہیں کہیں مولوی فضل حق خیرآبادی کو معقولات کا درس دیتے، کہیں سزائے عشق میں پابجولاں کالے پانی کو جاتے ہوئے کسی کے زورِ جنون کے لئے دشتِ نجد بھی تنگ ثابت ہوا تو مالٹا میں جا اسیر ہوا۔ کوئی جلاوطن ہوکر عمر بھر دنیا کی خاک چھانتا رہا۔ جبکہ دوسروں نے زندگی کے لالہ زاروں کو بسایا۔ ان لوگوں نے اپنے خون سے اس وادی کے خارزاروں کو لالہ زار بنایا۔

یہ جہاں کہیں بھی رہے اپنی ذات میں خود ایک مدرسہ تھے۔ ایک اخلاقی قوت تھے۔ تعلیم و تربیت کی ایک زندہ رَو تھے۔ اور یہ رَو پورے ملک میں جاری و ساری تھی، غدر کے طوفان نے مسلمانوں کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا اس کے سمیٹنے کی کوشش ایک جانب تو سرسید نے کی۔ ان کا مسلک حکومت سے تعاون تھا اس کے ساتھ ساتھ مغربی تمدن اور تہذیب سے نیا رشتہ پیدا کرنا تھا۔ سرسید ایک بڑے نازک وقت میں درمیانے اور اونچے درجے کا سہارا بن گئے ایک سمجھدار اور رجز درس کسان کی طرح وہ اپنا قلیل سرمایہ زمین کے اسی حصہ پر صرف کرنا چاہتے تھے جس سے کہ انہیں تھوڑے دنوں میں ہی نئی فصل کی امید تھی، لیکن اس کی وسیع ویرانیوں، اس کے عوام کا کیا ہوگا؟ سرسید کے خیال میں انہیں ابھی انتظار کرنا تھا۔ جب اوپر کے طبقے سیراب ہوجائیں گے تو ان سے پانی رس رس کر عوام کے لئے بھی آبِ حیات کا کام دیگا۔

لیکن ابھی تک مسلمانوں میں عوام کی پرانی تعلیم کے دھارے بالکل خشک نہ ہوئے تھے انھیں حکومت کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اس سرپرستی کی یادگار، اس کا مٹتا ہوا سا نشان یعنی دہلی کا تخت و تاج اب تاراج ہوچکا تھا۔ غدر کی بادِ صرصر ان اداروں کی مرکزیت کو ان کے اساتذہ اور تلامذہ کو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح منتشر کرچکی تھی تاہم اس کی روایات کا تسلسل ایک نئے پیرایہ

بہنے والے چشمے کی طرح جاری وساری تھا۔ اس مرتبہ اسے ہندوستان میں سر نکالنے کی جگہ نہ ملی تو عرب کی سرزمین سے اُبھر کر پھوٹ پڑا۔ غدر کے ابتلار سے نکلے ہوئے چند علمار نے حجاز میں پہنچ کر آرام کا سانس لیا اور یہاں بیٹھ کر نئے سرے سے مسلمان عوام کی تعلیم کے مسئلہ کو اس کے بکھرتے ہوئے رشتوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ غدر میں مسلمانوں کی تباہی کو دیکھ کر ایک مرتبہ سرسید نے بھی ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ کر لیا تھا ہمارے علمار نے اس ارادے کو پورا کیا اور پردیس میں اپنے دیس کو علمی اور روحانی طور پر دوبارہ بسانے کی تجویز پر سوچ بچار کیا۔

غدر کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسلمانوں کے لئے اب اس ملک میں کوئی جگہ نہیں دہلی لٹ چکی۔ دہلی کا نام نہاد بادشاہ رنگون میں تھا۔ علما اس سے بھی دور کالے کوسوں نہیں کالے پانی۔ کچھ لوگ حسن اتفاق سے عرب پہنچ گئے تھے اس سرزمین میں ان علمار نے اس نظام تعلیم کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا جو ان کے خیال میں قوم کے لئے سرمایۂ حیات تھا۔

اس نئی تعلیمی تحریک کا فکری اساس مکہ معظمہ میں تعمیر ہوا اور اس کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے مخلصین کے ایک گروہ نے ہندوستان میں کام کرنا شروع کر دیا۔ دیوبندی نظام اور دیوبند کا مدرسہ اس تحریک کے برگ و بار ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ اسے تعلیم کی ایک نئی تحریک کا درجہ دینے سے انکار کر دیں۔ یہ انکار اس تحریک کا انکار نہیں، تعلیم اور زندگی کے مضبوط رشتے کا انکار ہوگا۔ کردار اور گفتار کی ہم آہنگی اس کی اہمیت کا انکار ہوگا، تعلیم کی عمومیت اور جامعیت کا انکار ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ اس تحریک میں نہ تو نصاب کی تجدید کا کوئی مغربی طریق اختیار کیا گیا، نہ ہی مغربی طریق تعلیم کو فریضہ کا منصب عطا کیا گیا۔ لیکن اگر مادیت کی تجدید اہم تھی تو اتنے سال کی انگریزی تعلیم کے بعد ہم نے محسوس کر لیا کہ روحانیت اور تصوف کی روحانیت کی تجدید اس سے زیادہ اہم تھی۔ ہماری پرانی روحانی روایات، اس کی ہمہ گیریت، اس کی رواداری اور خلوص بھی کچھ اہم تھا۔

ہندو دھرم میں احیار مذہب کی کئی ایک تحریکیں چلیں۔ انھیں بڑھانے پھیلانے کے لئے

نئے ادارے نئے نظام تعلیم وجود میں آئے۔ لیکن ان میں اکثر تحریکیں پرانی روحانیت، اس کی وسعت نظر کا سلسلہ قایم نہ رکھ سکیں۔ عربی مدرسوں کی تحریک نے اس پرانی روح کو قایم رکھا۔ قایم ہی نہیں اسے بالیدہ تر کرنے کی کوشش کی۔ شرکت عمل کی جو کمی مدرسے کے دائرے میں پوری نہ ہو سکتی تھی، اسے سیاست کے میدان میں مکمل کیا۔ عدم تعاون کی تحریک اس کی پھیلنا فتحیابی اسی تسلسل کی بنا پر تھی۔ شرکت کے پلیٹ فارم کو سب سے پہلے ان علما نے نہیں چھوڑا جو عربی مدرسوں سے وابستہ تھے بلکہ ہندو احیاء کے اس علم بردار نے جسے مسلم رواداری نے جامع مسجد دہلی کے منبر پر جگہ دی تھی۔ ہمارے دیس کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی تھی کہ ہندو اور مسلم تعلیمی تحریکوں میں ہم آہنگی نہ ہو سکی۔ جبکہ عربی مدرسوں کی تحریک پرانی مذہبی روح کی آئینہ دار بن گئی۔ ہندو دھرم کے احیار کی تحریکیں۔ محدود قومیت کے شعور کا عکس تھیں۔ ان میں روحانیت کی کمی کو سماجی اور سیاسی احساس سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کوشش نے ہماری راہ میں ہندو مسلم مناقشات کی وہ چٹان کھڑی کر دی ہے جس سے ہماری زندگی کا ہر مسئلہ آکر ٹکراتا ہے اور ایک بھنور میں گم ہو کے رہ جاتا ہے۔

دیوبند کی تحریک نے تعلیم کو عوام کی امانت سمجھا۔ اوپر کے طبقہ کی اجارہ داری تصور نہیں کیا۔ اوپر کا طبقہ صاحب مقدور رہو تو ہو یہ تعلیم بغیر مقدرت کے لوگوں کے لئے دی جائیگی۔ غریبوں کو دی جائے گی۔ امیروں سے زکوٰۃ خیرات لے کر نہیں، غریبوں کی دولت کے بل بوتے پر دی جائے گی۔ ان کے پاس سونے اور چاندی کے ڈھیر نہ ہوں۔ محبت اور خلوص کا سرمایہ تو ہے۔ ہماری نئی تحریکوں میں یہ ایک نیا عزم تھا، ایک نیا ارادہ تھا۔ تعلیمی خودداری کا، مالی خودداری کا۔ حکومت گئی، حکومت کے ساتھ ساتھ دولت بھی گئی، لیکن دست غیب نے ہم پر اخلاقی جرأت اور ہمت کی نئی دولت نثار کی۔

چند بلند ارادہ اُستادوں نے ایک تعلیمی تخیل اپنے پیش نظر رکھا، وہ اسے ایک آزاد ماحول میں آزادی مائے سے محض ان اصولوں کے ماتحت جو وہ خود اپنے اوپر عائد کرنا چاہتے تھے

تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ صاحب ثروت اور صاحب اختیار طبقے کی امداد سے نہیں۔ عوام کی امداد سے اس نصب العین کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس کی بنیادیں روحانیت کے سنگ بنیاد پر کھڑی کرنا چاہتے تھے۔ مالیات کی بھس بھسی اور کمزور بنیاد پر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ یہی نہیں وہ کسی ایک مستقل اور محفوظ ذریعہ آمدنی کے مخالف تھے۔ وہ ادارے جنہیں حکومت کی امداد حاصل ہے جنہیں روساء ملک سے بیش قرار سالانہ گرانٹ ملتی ہے۔ یقیناً ایک حد تک قوم کے مطالبات بالخصوص غربا کی ضروریات سے بے نیاز ہو سکتے ہیں لیکن جس ادارے کو مالیات کا یہ حریر و دیبا سے منڈھا ہوا گہوارہ نہ ملے گا وہ رہ رہ کر مادر مہربان اپنی قوم کے آغوش محبت کی طرف تکے گا مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے وصیت نامہ میں دیوبند کے انہی بنیادی اصولوں کی تفسیر کی ہے اس وصیت نامہ کی رو سے نئی تحریکوں کے اس عہد میں تعلیم کے مالی اساس کو پہلی مرتبہ ایک جراءت آفرین بلند اور تخلیقی پہلو سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں " مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں ہے جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ تعالیٰ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر آمدنی یقینی ایسی حاصل ہو گئی جیسی جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی...... آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔"

دیوبند کی بنیاد غدر کے چند سال بعد رکھی گئی۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے اس گھائل کا سا تھا جسے غدر کے بعد تاب تک اپنے زخموں کا بھی ہوش نہ رہا ہو۔ اس دور میں انہیں متاع کاروان کے لٹنے کا پہلی مرتبہ احساس ہوا۔ دیوبند کے ساتھ ساتھ سہارنپور۔ کانپور اور دوسری جگہوں پر نئے مدرسے قایم کئے گئے۔ یہ تحریک برابر بڑھتی پھیلتی گئی۔ اس میں ایک نئی زندگی، ایک نئی قوت نمو تھی جس کا سرچشمہ عوام اور ان کی روحانی تقاضے تھے

دنوں میں ہی اس کی سوتیں ملک کے طول وعرض میں پھیل گئیں۔ اس تحریک کا تعلیمی تخیل ایسا نہیں تھا جو مکتب کی چار دیواری میں گھٹ کے رہ جائے۔ وہ تعلیم تعلیم کے لئے نہیں، کلرکی اور منشی گری کے لئے۔ زندگی اور اس کے مطالبات کے لئے دینا چاہتے تھے۔ اگر ان کا نصاب پرانا تھا تو ان کی سیاست نئی تھی، ان کے طریق تعلیم فرسودہ تھے لیکن ان کے زندگی کے تخیل عجیب وغریب تازہ اور شاداب تھے۔

اب تک ہمارے ہاں تعلیم اور تعمیر سیرت کا ایک بڑا سرچشمہ شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ رہا تھا۔ اب تک مغلیہ خاندان کی آخری یادگار، لال قلعہ کا تاج وتخت دنیوی قوت کا یہ مٹتا ہوا نشان نہی اخلاقی اور روحانی تجدید کا کام کرنے والوں کے لئے ایک ظاہری سہارا تھا، جب اسے گھن لگا تو ان باہمت بزرگوں نے سرحد پار اس دنیوی نفوذ کو پیدا کرنے کی کوشش کی جو زندگی کو ایک مرتبہ پھر بلند سطح پر لانے میں امداد دے سکے۔ لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی ادھر غدر نے دنیوی استقلال کی اس مٹتی ہوئی نشانی کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم کر دیا۔

دیوبند کی تحریک کی جڑیں پہلے سے ہی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کا نقطۂ نظر ہندوستانی اسلام کی گیرائی اور ہندوستانی سیاست کی گہرائی تھا۔ ایک بالغ نگاہ، باشعور تصور کے تحت انہوں نے اس نئی تحریک کا تعلق سلطنت عثمانیہ سے ملانے کی کوشش کی۔ آج سے نہیں، سلطان ٹیپو بلکہ اس سے پہلے سے بالغ نظر مفکرین نے ہمیشہ ہندوستان کے مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنانے کی کوشش کی۔ آج ہم ہندوستان کی ایسی گتھیوں کو جو ایک زمانے سے سلجھ نہ سکیں بلکہ اور زیادہ الجھتی رہیں خود بخود ایک نئے سحر کے اثر سے کھلتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ سحر ہے بین الاقوامی سیاست کا سحر۔ اگر ہم پہلے سے اپنے ذہنی اور سیاسی حدود اربعہ کو ہندوستان کی حدود سے پار لے جاتے تو شاید اب تک ہمارے ہاں کبھی کا خندۂ سحر نمودار ہو چکا ہوتا۔ اس سحر کی پہلی کرن دیوبند کی تحریک تھی۔ اس کے پہلے پیامبر مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔

دیوبند نے محض سیاست کے ٹھہرے ہوئے پانیوں کو موجِ بحر کی تلخی سے آشنا نہیں کیا بلکہ اس ادارے کو صحیح معنوں میں بین الاسلامی ادارہ بنا دیا۔ اسے سرحد پار کے علاقے افغانستان بلکہ مرکزی ایشیا کے علاقوں کے لئے ایک روحانی قوت، ایک سیاسی اثر بنا دیا سال بسال ان علاقوں سے طالب علموں کی ایک رَو چلی آرہی ہے، ان میں سے ہر ایک طالبعلم واپس جاکر ایک نئے پیام کا مبلغ ایک نئی زندگی کا علم بردار بن جاتا ہے۔

ان اداروں کا فارغ التحصیل طالب علم ان وسیع معنوں میں نئی زندگی کا مبلغ بن سکتا ہے جس میں مغربی تعلیم یافتہ نہیں بن سکتا۔ ان اداروں کی تعلیم کا مقصد سماجی اور مذہبی ہے۔ ان کے طلبار تعلیم پاتے ہیں تو عوام کے خادم بننے کے لئے پاتے ہیں، ان کے حاکم بننے کے لئے نہیں پاتے۔ وہ جب مدرسے سے نکلتے ہیں تو عوام کی بنائی ہوئی مسجدوں میں رہتے ہیں، ان کے مکتبوں میں پڑھاتے ہیں۔ ان کی امداد سے زندگی کی ضروریات پورا کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ان کے ساتھ جیتے اور مرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر عوام کی تعلیم و تربیت کا کون ذریعہ ہو سکتا ہے! روحانیت کے یہ مشعل بردار شہروں میں نہیں۔ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے سلسلے کی وسعت، ان کے کام کی گہرائی سے ان کی بے پناہ ممکنات کا اندازہ ہو سکتا ہے

آج مسلمان حیات ملّی کے ایک بڑے نازک دَور میں سے گزر رہے ہیں۔ مسلمان من حیث القوم بیدار ہو رہے ہیں۔ ان میں اپنی قسمت کو اپنے ہاتھ میں لینے کا ایک نیا عزم، فکر و عمل کو اپنی طرز پر ڈھالنے کی نئی آرزو پیدا ہو رہی ہے۔ ان کے بڑے اور چھوٹے امیر اور غریب ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں ایک نیا اجتماعی شعور پیدا ہو رہا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا جذبہ دکھ درد میں شریک ہونے کا احساس۔ یہ احساس اب تک غریبوں میں تھا، اب امیروں میں بھی بیدار ہو رہا ہے اس لئے نہیں کہ وہ محبت کی نئی تڑپ محسوس کر رہے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ایک نامعلوم متعدی خوف سے گھبرائے جا رہے ہیں، اب تک قطرہ بیرون دریا بہا اور اسے بیرونی دریا پر ایک حد تک ناز بھی تھا لیکن اب تمازت حوادث سے

قطرہ کی اپنی ہستی معرضِ خطر میں ہے اور وہ دوبارہ دریا کی آغوش میں آنے کو بے تاب ہے۔

اور اب لوگوں میں دریا کی گہرائیوں کو تہ آب تک ڈھونڈنے کی نئی آرزو پیدا ہو رہی ہے سیاسی بحران نے محض جذبات کا طوفان ہی نہیں اٹھایا اس کے ساتھ ساتھ زندگی کو پرانی لیکن ہر زمان زندہ بنیادوں پر تعمیر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ لیکن زندگی کا ایوان ہوا میں تعمیر نہیں ہو سکتا اس کے لئے ایک فکری نظام، ایک اقتصادی ڈھانچہ، ایک سماجی طریق بھی مرتب ہونا چاہیے ہمارے دل میں آج ایک نئی زندگی کی لگن سی ہے۔ اس لَو کو اقبال کی شاعری نے لگایا، اسے سیاسی طوفانوں نے ہوا دی لیکن ابھی تک اس جذبے کے لئے تسکین اور اطمینان نصیب نہیں اس کی تسکین کے لئے ہمیں اپنا سیاسی نہیں پوری زندگی کا نصب العین مقرر کرنا ہوگا۔ اس کا اقتصادی اور سماجی نظام تیار کرنا ہوگا، اس کی روحانی اور نفسیاتی بنیادیں تعمیر کرنا ہوں گی۔ انہیں تعلیم و تربیت سے استوار کرنا ہوگا۔ فکر و عمل کے پرانے نمونوں اور سانچوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ ان کی روشنی میں زندگی کا نیا خاکہ تیار کرنا ہوگا۔

دنیا آج مذہب کا پرانا چیلنج نہیں، زندگی کا نیا چیلنج ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے۔ ایک پہلو کا نہیں، ایک ہزار اور ایک پہلوؤں کا چیلنج۔ اس کا جواب اخباری مضامین سے نہیں دیا جا سکتا خوبصورت لیکن بے مغز تقریروں سے نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے معلوم کرنے کا عمل خود ایک ریاضت، ایک ذہنی مجاہدہ ہوگا۔ اگر ہمارے مفکرین اس ریاضت کے لئے تیار نہیں تو دنیا ان کا انتظار نہیں کرے گی۔ اگر ہم فکر و عمل کی مہم میں ایک جراءت آزما انداز میں دوبارہ شریک نہ ہوں گے تو دنیا ہمیں ایک دوسرا خدائی فوجدار، ایک جدید ڈان کیوزوٹ سمجھ کر آگے بڑھ جائے گی، فکر و عمل کا یہ میدان ابھی تک شاہ ولی اللہ کے زمانے سے ایک نئے مبارز کا منتظر ہے۔ ایک نئی للکار کی صدا کے لئے بے چین ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے عربی شعبے، ان کے اسلامیات اور دینیات کے محکمے شاید اس نئے چیلنج کا کوئی جواب دے سکیں۔ قوم برسوں سے ان علمی

ایوانوں کی طرف تک رہی ہے لیکن ان بلند و بالا سنگِ مرمر کے میناروں سے اب تک زندگی کی ایک کرن بھی پھوٹ نہ سکی۔ ان کے اسلامیات اور دینیات کے شعبے ہمیں کوئی فکری نظام نہیں دے سکے۔ ان کے عربی کے محکمے ہمیں ادب کی روح سے آشنا نہ کرسکے۔ ان کی متاعِ تحقیق چند ایک پرانی کتابوں کے انڈکس (Index) ہیں یا ایڈیشن۔ ابھی تک ہم بیرونِ در کی دربانی میں لگے ہوئے ہیں لیکن اس میدان میں بھی ہماری کامیابی محدود سی ہے اور ہمارے ان شعبوں سے بجا طور سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ تو برونِ درچہ کردی کہ درون خانہ آئی!

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اہم کام عربی مدرسوں کے لئے ایک امانت ہے اور جو بارِ گراں اب تک کسی اور سے اٹھایا نہیں گیا ان کے شانوں پر اتنا گراں نہ گزرے گا۔ انہیں تعلیم اور تعلم کے کام سے بلند ہوکر غور و فکر کی سطح پر آنا ہوگا اور ایک مرتبہ پھر شاہ عبدالعزیز کے مدرسے کی مدھم قندیل کو دوبارہ روشن کرنا ہوگا۔ اس کے لئے مغربی طرزِ تحقیقات کے نئے فانوس مہیا کرنے ہوں گے۔ زندگی کے نئے مطالبات کو اس کے نت نئے تقاضوں کو جانچنا ہوگا اور ان مسائل کے لئے اسلامی حل پیش کرنا ہوگا۔ غور و فکر کی یہ نئی منزل، یہ نئی تجربہ گاہیں، اگر عربی مدرسوں کی آغوش میں پروان چڑھیں تو وہ ادارے کے ماحول کو ذہنی بیداری اور معاشرتی احساس سے آشنا کردیں گے اور اس کی روح ایک جان بخش فضا کی طرح خود بخود ان کے طلباء کی رگ رگ میں پیوست ہوجائے گی۔ پھر عربی زبان کی ترویج کا مسئلہ بھی ہے۔ ہم نے لوگوں کو عربی صرف و نحو کے صحرستان میں چالیس سال نہیں بارہ بارہ سال ضرور سرگشتہ و پریشان دیکھا اور اس کے بعد بھی کوئی خوش قسمت ہوا تو اس کی بھول بھلیاں سے نکل سکا۔ روم و خطا میں صلح ہوگئی تھی لیکن گلستان کا طالب علم ابھی تک زید و عمرو کی جنگ میں مبتلا تھا۔ آج جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ انسانوں کے شکار کا بازار بند ہوگیا مگر اس ملک میں عربی زبان کا طالب علم ابھی تک اسی ذہنی کشمکش کا شکار ہے آج اردو زبان میں مذہبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے رواج کو ایک سو سے زیادہ سال ہوتے ہیں لیکن ہم اب تک ایک بھی ایسی کتاب کا نام نہیں لے سکتے جسے ہم صحیح معنوں میں

مَا أَغْنَيْتُكَ عَنِ الصَّرْفِ وَالنَّحْوِ کہہ سکیں۔

تعلیم بدلی۔ تعلیم کے طور طریق بدلے۔ پرانے استادوں کی جگہ نئے ساتھیوں نے لی ڈائرکٹ میتھڈ (تدریس بالراست) نے غیر زبانوں کی تدریس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا بیسک یا بنیادی زبان کے تخیل نے لغت اور قواعد کو منطقیانہ موشگافیوں سے نکال کر افادی سطح پر لا بٹھایا۔ اسے مدرسے کی چار دیواری سے اس کی بند بو باس سے روزمرہ کی زندگی کی کھلی فضا میں لا ڈالا۔ سب کچھ ہوا مگر ہمارے عربی مدرسوں کے طریقے وہی رہے۔ ہم نے پرانی اقدار کو برقرار رکھنے پر بجا طور سے اصرار کیا لیکن موجودہ طریق تعلیم، اس کی ٹکنیک سے بے جا طور پر انکار کیا۔ ہم جوہر کو عرض سے، مقصد کو ذرائع سے علیحدہ نہ کر سکے۔ عربی زبان کی صرف و نحو مقصود بالعرض نہیں مقصود بالذات رہی اور اس کا بارہ سال کا چکر ختم نہ ہو پایا۔

ہم نے کہیں کہیں زیادہ رواداری سے کام لیا تو مصر کی جدید کتابیں داخل نصاب کر دیں۔ مصر والوں نے یقیناً عربی زبان کی تدریس کی بنیاد جدید اصولوں پر رکھی لیکن یہ تعمیر اہل مصر کے لئے کی گئی تھی، اسے کسی ادھار ادر سیتے کے اصول پر ہندوستان کو نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اقتصادی زندگی کا یہ آئین علمی اور کلچرل زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اس کا حل تو ہمارے فکری عمل کی کٹھالی میں ہی تیار ہو سکتا ہے۔

عربی زبان ہماری مادری زبان نہیں لیکن بالکل غیر بھی نہیں۔ ہمارے مذہبی ادب میں ہماری بول چال میں اس کا بڑا سرمایہ موجود ہے، ایک کار آمد لغت کا ذخیرہ ہے۔ ہماری عربی کی تدریس اس کی بنیادیں اسی نازک لیکن اہم بنیاد پر رکھی جائیں گی۔ ہمیں عربی پڑھنے والوں کے دو گروہ بنانا ہوں گے، ایک وہ جو محض مذہبی فرائض ادا کرنے کے لئے تھوڑی سی روشناسی چاہتے ہیں، ان کی تعداد بہت ہوگی، ان کے لئے ایک عام سادہ لغت کا طریق بتانا ہوگا۔ دوسرے وہ جو عربی زبان کو ایک مستقل ادبی زبان کی حیثیت سے، اس کے ادب کو ایک کلاسک کے نقطۂ نظر سے سیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے ہمیں مخصوص طریقے تدریس سوچنا ہوں گے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ نصاب کی اصلاح کا

مسئلہ بھی ہے۔ بعض عربی مدرسے پرانے نصاب سے یوں وابستہ ہو گئے ہیں جیسے کوئی طوفان زدہ مسافر کسی ٹوٹے ہوئے مستول سے۔ اسے کیا معلوم کہ اگر وہ یہ آسرا چھوڑ دے تو لب ساحل اس کے پاؤں کے نیچے اس کے قدم چومنے کو تیار ہے۔ ایک حد تک ان مدرسوں کا یہ خوف بیجا ہے نئے نصاب کے ذریعہ درمیانی طبقہ زندگی کے نئے تقاضوں سے آشنا ہوگیا۔ عام زندگی کے نئے تقاضوں سے آشنا ہوگیا لیکن بعض سچی اقدار سے محروم ہوگیا۔ عام زندگی کے دھارے سے علیحدہ ہوگیا۔ سماجی اور روحانی خلوص سے ناآشنا ہوگیا۔ علم تو آیا لیکن اس کے نقش قدم پر اچھی اقدار نہ آئیں۔ پرانے نصاب میں زندگی کے نئے مطالبات کا علم نہ آسکا لیکن پرانی سچی اقدار ان مدرسوں کی چار دیواری میں ایک حد تک محفوظ رہیں۔

لیکن ہمارا مقصد محض سچی اقدار کا علم ہی نہیں بلکہ ایک نت نئے بدلتے ماحول میں انہیں اپنانے اور ان کی حفاظت کے لئے جان دے دینے کا جذبہ بھی پیدا کرنا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے ایک سچی قدر حقیقت اور اکثر خالص مادی حقیقت کی پیہم جستجو بھی ہے۔ آسمان کے سیاروں میں زمین کے پوشیدہ خزانوں میں اس کی قوت نمو میں، اس کے گوناگوں مظاہروں میں ہمیں حقیقت ازلی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ہیئت کے آسمان پر کئی ایک نئے سیارے ابھرے۔ کئی ایک ستاروں کی دنیا معلوم کی گئیں لیکن ہمارے مدرسے ابھی تک پرانے زائچے اور اسطرلاب سے آگے نہ بڑھ سکے لوگ کب تک یہ کہیں گے کہ ہم اپنے مدرسوں میں آج سے دو ہزار سال پہلے کی یونانی طب پڑھائے چلے جا رہے ہیں، اور اجرام فلکی کو کرۂ ہیئت کی جگہ ایک مٹی کے بدھنے کو پھرا کر سمجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے فارغ التحصیل طالب علم کب تک ملت کے لئے یا بر شاطر نہیں بار خاطر بنے رہیں گے۔ پرانے اساتذہ کی طرح اپنے ہاتھ سے کمائے ہوئے نہیں بلکہ دوسروں کے لائے ہوئے کی طرف تکیں گے۔

ہمیں پرانے نصاب کی روح برقرار رکھنا ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ روح جسم کے بوجھ سے گھٹ کر رہ جائے۔ نئے یا پرانے مطالبات سے مجبور ہو کر نہیں۔ زندگی کے تقاضوں سے مجبور

ہو کر ہمیں اُس نصاب میں دو اجزا شامل کرنے ہوں گے۔ پرانے نصاب کے مغز کو محفوظ رکھتے ہوئے ہمیں اسے کسی ایک حرفے یا پیشے کی تعلیم سے مربوط کرنا ہوگا۔ اور طالب علم کو سماجی علوم اور سماجی طریق کار سے روشناس کرانا ہوگا، اسی طریق سے ہمارا ملائے مسجد، قوم کا امام اور ملت کے لئے مدرسوں کا انعام ثابت ہو سکیگا۔

آج ہمارے ملک میں ان مدرسوں سے بڑا کوئی کُل ہند تعلیمی نظام نہیں۔ ان سے زیادہ کسی اور نظام کو عوام کی زندگی سے وابستگی اور ہم آہنگی نصیب نہیں۔ ان سے زیادہ غریبوں کی روحانی اور ذہنی فلاح کے ممکنات کسی اور سلسلے میں موجود نہیں۔ آج مسلمان حیات و ممات کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ قوم کے منتشر شیرازے کو اکٹھا کرنا ان کے لئے اخلاقی یا مذہبی فرض نہیں بلکہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں انہیں سب سے پہلے اپنے ذہنی اور علمی سرمائے کی فکر کرنا ہوگی۔ اسے ایک اچھے نظام تعلیم کے ذریعہ محفوظ کرنا ہوگا۔ ان سب اداروں کو ایک ایسے نظام میں منسلک کرنا ہوگا جو مقامی لحاظ سے انہیں پورا پورا حق خود ارادی عطا کرے لیکن مقاصد۔ نصاب، طریق تعلیم اور تنظیم کے عام اصول کے لحاظ سے ایک کم از کم معیار کی پابندی بھی عاید کر سکے۔

سندھ میں عربی مدارس کی ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ رامپور کے مدرسہ عالیہ میں تجدید نصاب کا مسئلہ درپیش ہے۔ بھوپال میں سید سلیمان ندوی جیسے بالیدہ نگاہ عالم مدرسے کا کام اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں اس مسئلہ پر ایک نئی دلچسپی ایک نئے تجسس کا اظہار ہو رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ نظام تعلیم ایک مرتبہ پھر ایک نئی روح، ایک تازہ تمنا سے بیتاب ہوگا اور مسلمانوں کے احیاء کے لئے ملک اور قوم کی توقعات پوری کر سکے گا۔ اس کی بیداری مسلمانوں کی تعلیم کے لحاظ سے نہیں بلکہ عام تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی ایک کارنامہ ہوگی۔

(۴) ندوہ کی اصلاحی تحریک

ندوہ کی تحریک ایک اصلاحی تحریک تھی جس کی بنیاد ندوۃ العلماء میں رکھی گئی۔ مذہب اور مذہبی تعلیم کے سنگِ بنیاد علماء تھے۔ بدقسمتی سے سنگِ بنیاد اپنی اساسی جگہ چھوڑ کر لوگوں کے ہاتھوں میں آگیا تھا، علماء لوگ بجائے سنگ سازی کے سنگ اندازی میں مبتلا ہوگئے۔ اس کی کچھ دعوتِ عمل تو سرسید اور نیچری لوگوں نے دی اور پھر کوئی دوسرا نہ ہو تو آپ سے آپ ہی چھیڑ چلی جارہی تھی۔

ایک مرتبہ دربارِ شاہی میں آلو کی حلّت پر بحث چلی۔ حضرت اسمٰعیل شہید بھی موجود تھے لوگوں نے آپ سے رجوع کیا، ان کی نظریں ادھر پھرنا تھیں کہ آپ کھڑے ہوگئے اور یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ میں آلوؤں کے مسئلہ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ سودا نے تو "اک مسخرا یہ کہتا ہے کو احلال ہے" لکھ کر ایک نزاعی مسئلہ کو عام ادب کی حیثیت دے دی تھی لیکن جوں جوں قوم کی سیاسی اور اخلاقی حالت گرتی چلی گئی ان کی اقدار اور معیار میں بھی انحطاط آتا چلا گیا آہستہ آہستہ زندگی کے مسائل میں احساس توازن کی کمی ہوتی گئی۔ وہ حسنِ توازن جو ان فروعی باتوں پر طوفان انگیزیوں کو دفعتہً دامن سے جھٹک دے یا مذاق مذاق میں اڑا دے۔

۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس کا بڑا مقصد اس احساس کو علماء میں بیدار کرنا تھا اور ایسے حریفوں کو جو ہمیشہ سامنے آئے تو مد مقابل بن کر آئے۔ ایک نشست میں شرکاء کی حیثیت سے ساتھ بٹھا دینا تھا۔

توازن اور ہم آہنگی کی یہ کمی جو طبیعت ثانیہ بن چکی تھی یا تو خود مذہبی تعلیم کے غیر مناسب نصاب کا آئینہ تھی یا مضامین نصاب اور ان کی تدریس کا ... عکس ، اس لئے اس پہلے اجلاس میں ندوۃ العلماء کا ایک مقصد طریق تعلیم کی اصلاح قرار پایا۔ اس مقصد کی ترویج و اشاعت کا طریق یہ سوچا گیا کہ تمام مدارس اسلامیہ کو ایک سلسلہ میں مربوط کر دیا جائے۔ دیوبند، فیضِ عام کانپور اور مدرسۂ احمدیہ

آرہ کو دارالعلوم کی حیثیت حاصل ہو اور باقی مدرسے ان کی شاخیں قرار دے دی جائیں۔

یہ تعلیمی تحریک ہمارے ہاں اس زمانے میں جاری ہوئی جب پوری دنیائے اسلامی میں تجدید اور احیاء کی برقی صفت رویں چل رہی تھیں اس نئی زندگی کی لہروں سے مذہبی تعلیم کے ایوان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نئی زندگی کے تقاضے ان ایوانوں کے پرانے دریچوں سے جھانکتے نظر آتے تھے، ڈر تھا کہ اگر انھیں اندر آنے کا راستہ نہ ملا تو یہ پرانی فصیل کو توڑ کر اپنا راستہ خود بنالیں گے۔

ادھر جلال الدین افغانی کے شاگرد مفتی محمد عبدہ نے مصر کی نظامت داخلہ کے سامنے ایک انقلابی رپورٹ پیش کردی۔ اس کی رُو سے ازہر اور دوسری مذہبی درسگاہیں بالکل بدل جاتیں سرکاری مدرسوں اور ان اداروں میں بس اتنا فرق رہ جاتا کہ ان میں مذہبی امور کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا لیکن مفتی محمد عبدہ اپنے زمانے سے کہیں پہلے آگئے تھے۔ دوسرے کیا خود جامعہ ازہر کے لوگ ان کو سمجھ نہ پائے اور یہ تجویز اسی پُرانے گورستان میں دفن کردی گئی جس میں ابنِ خلدون کے زمانے سے لے کر اب تک کئی ایک تعلیمی مفکرین کے مشورے زندہ درگور کر دیئے گئے ہیں لیکن تاہم پوری دنیائے اسلام میں تعلیم اور زندگی کے مطالبات کے بارے میں ایک نیا شعور، ایک نئی بے چینی سی پیدا ہو چلی تھی، خود خلیفہ اسلام سلطان ٹرکی نے علماء کی ایک کانفرنس بلائی جس کے مشورہ سے قسطنطنیہ کے بعض مدارس کو نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ غرضیکہ الجیریا سے انڈونیشیا تک اور سوڈان سے قازان تک اسلامی دنیا کی فضا میں نئی سرگوشیاں سی ہو رہی تھیں۔ انھیں کی ایک صدائے بازگشت ہمارے ہاں کے ندوہ کی تحریک تھی۔

اس تحریک کے راستے میں کیا سنگ گراں حائل تھے؟ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ کیا کچھ نہیں تھا نئی تحریک کے رہنماؤں کو مدت تعلیم متعین کرنا تھی۔ نصاب کے مقاصد کو واضح کرنا تھا، ان کی حدود کو اور گہری اور متمیز بنانا تھا، اکثر مضمون شلاً فلسفہ یلغار کر کے دوسرے مضامین کی حدوں کو پار کر جاتے تھے اور مضامین میں اس قدر خلط مبحث ہو جاتا تھا کہ طلباء کیا اکثر استاد اس گورکھ دھندے

میں پھنس کر رہ جاتے تھے۔ نصاب میں ایک مرتبہ پھر تناسب و توازن کو قائم کرنا تھا۔ معقولات
نے مدرسے کی چار دیواری کو ہر طرف سے ایسا آلیا تھا کہ منقولات کو کہیں اندر جانے کی راہ
نہیں ملتی تھی۔ علم و ادب کے حقیقی سرچشمے، اصلی فطری سوتیں مذہبی تعلیم کے وہ ماخذ جو دل کو گرماتے
اور ذہن کو چمکاتے تھے، حواشی، شرح اور شرح الشرح کے نیچے گم ہو کے رہ گئے۔ استاد لوگ شرحیں
پڑھاتے تھے، شرح کی شرح پڑھاتے تھے لیکن اس سرچشمے سے بے خبر تھے جس سے یہ سوتیں نکلی تھیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک پرانا مرض اور بھی تھا اور تعلیم میں پرانی یادگاروں کی طرح مرض جتنا
پرانا ہو عزیز تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کی تشخیص علانیہ ابنِ خلدون نے بھی کی تھی، لوگوں نے مقصود
بالعرض مضامین کو مقصود بالذات کا درجہ دے دیا۔ چیخوف کے پروفیسر بجیا کی طرح انہوں نے
بلی کے بچے کو پیدا ہوتے ہی چوہا پکڑنے کے قواعد و ضوابط بتانا شروع کئے۔ ابھی ننھے نے پیوں
پیوں چلنا سیکھا تھا کہ اسے چلنے کے آداب و انداز میں پھنسا دیا۔

طالبِ علم کے سامنے زبان اور ادب کا شاداب نخلستان لہک رہا تھا، سامنے نہیں وہ خود
اس کی شادابیوں سے گھرا ہوا تھا وہ خود اس کی شادابی اور رنگینی کا ایک ورق تھا۔ مدرسے کی
تدریس نے اسے صرف و نحو کے اس خارستان میں ایسا لا ڈالا کہ ساری عمر اسے پاؤں سے کانٹے
ہی نکالتے بنی۔ کبھی پھول چننے کا موقع نہ ملا۔ صرف و نحو تو ایک ذریعہ تھے، ایک اوزار تھے اُستادوں
کے ہاتھ میں یہ مقصود بالذات ہو گئے۔ ننھے کو تیرنا سکھانے کے لئے زبان کے دریائے بے پایاں
میں ڈھیل دینا چاہئے تھا۔ انہوں نے اسے تاروں میں لٹکا کر فضا میں پیراکی کے داؤ سکھانا شروع
کر دئے۔ اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ ظاہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مصور رنگوں کے آماز بکھا
میں الجھ کر رہ گیا ہو اور اس کی یاد سے یہ بات بالکل اُتر گئی ہو کہ اسے کوئی شاہکار بھی تیار کرنا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ عربی علم و ادب کا جنازہ صرف و نحو کے کندھے پر اٹھا اور صنائع و بدائع
کے گورستان میں ٹھکانے لگا۔

اس کے کئی ایک اثرات ہوئے۔ اکثر طلبا بچپن میں داخل ہوتے تھے اور علم کی شاہراہ پہ

چلتے چلتے زندگیاں گذار دیتے تھے لیکن منزل کا نشان تک نظر نہیں آتا تھا۔ آغاز شباب کا اُبلتا ہوا شوق اور ولولہ صرف و نحو کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر رہ جاتا تھا۔ اور جب برسوں کے بعد اس وادی کی بھول بھلیاں سے نکل کر علم و ادب کے شاداب مرغزاروں میں پہنچتے تھے تو دل سرد ہو چکے ہوتے تھے نگاہیں بے کیف ہو چکی ہوتی تھیں۔ عربی ادب ان کی شخصیت کی تعمیر میں اس کا پیام ان کی اقدار کی تشکیل میں اہم عنصر نہ بن پاتا تھا۔ سیرت کی تکمیل کے لئے ایک کارگر اور موثر ذریعہ قوتِ اظہار ہے مادری زبان کے دروازے ویسے ہی تیغہ کردیے گئے تھے اور عربی زبان کے دریچے برسوں کھٹکھٹانے کے بعد کہیں کھل پاتے تھے تو پھر شخصیت کی کال کوٹھری میں نسیم سحری کی جاں بخش مہک کیسے پہنچ پاتی۔ اس سلسلے میں کچھ کمی فارسی کی کلاسیک نے ضرور پوری کی لیکن اکثر مدارس میں تو یہ کتابیں دخل در معقولات سمجھی جاتی تھیں۔ یہ نقصان جو ہوا وہ انفرادی طالب علم کا ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کو بھی نقصان پہنچا۔ ہمارے ادب میں قرآن کریم کی زبان کی بلندی و عظمت اس کا اعجاز، اس کا بلیغ تناسب اور ٹھہراؤ۔ اس کی بے لاگ نشتریت اور قطعیت نہیں آسکے۔ موجودہ انگریزی زبان کو بنانے اور ڈھالنے میں انجیل کے انگریزی ترجمے کا بڑا حصہ ہے۔ ہمارے ہاں یہ اثر نہ آسکا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان مدرسوں میں قرآن کی جگہ تفسیر نے لے لی۔ اس کے ادبی پہلو کی جگہ لفظی مباحث نے غصب کر لی۔

بیروت اور ممالک عرب کی دوسری عیسائی یونیورسٹیوں نے قرآن کریم کو ایک ادبی کلاسیک لے لحاظ سے نصاب میں رکھا۔ ادبی پہلو پیش نظر رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کے پیام کو نظر انداز کر دیں۔ پھر خود اس کے پہلو میں بھی ایک پیغام چھپا ہوا ہے۔ اس میں روزمرہ کے سلام کلام، بات چیت، نشست و برخاست کے لئے ایک نیا اور متناسب انداز ایک حسین توازن موجود ہے۔ اس کا عکس ہمیں قرون اولے کے مسلمانوں کی تقریر و تحریر میں ملتا ہے، کبھی کبھار کسی عربی ممالک کے عالم کی تقریر اور تحریر میں اس کی جھلک مل جاتی ہے۔

اور پھر حدیث کا اپنا جدا رنگ ہے۔ اگر قرآن ادب کا جلالی پہلو ہے تو حدیث جمالی ہے

اگر وہ ہمالیہ سے نیچے گرتے ہوئے دھارے ہیں تو یہ زمین سے اُبلتے ہوئے گنگناتے ہوئے چشمے۔ اگر اس میں گرمی ہے تو حدیث میں نرمی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کسی نے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اس کے گوناگوں انسانی پہلوؤں اِس کے محبت اور خلوص کے اُبلتے ہوئے سوھارے اس کی تشبیہوں کی سادگی، ان کی لطافت اور پاکیزگی سے لطف اندوز نہ ہوسکا تو وہ باہر کے اس ہندوستانی کی طرح ہے جو دریا پر خیمہ لگاتا ہے تو اس کی پشت ہمیشہ لب دریا کی جانب رکھتا ہے۔ آپ بچوں کو اللہ کے باغ کا پھول کہتے تھے، کہتے ہی نہیں سمجھتے بھی تھے آپ انھیں سینے سے لگاتے تھے، رانوں پر بٹھا کر جھولا جھلاتے تھے اور پھر دونوں ہاتھوں میں لے کر خوب زور سے سونگھتے تھے۔ آخر بچے اللہ کے باغ کے پھول تھے! ایک بچہ کو آپ نے سینے سے لپٹایا تو آپ کو اس سے خوشبو کی لپٹ آئی سو آئی لیکن بچے نے کہا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھ پر عطر کی پٹاری کھول دی ہو۔

جو کوئی ان حدیثوں کو پڑھے گا ان کے گہرے انسانی پہلوؤں کو محسوس کرے گا محبت کے اس ہلکورے لیتے ہوئے دریا کے کنارے پر کھڑا نظارہ نہیں کرے گا۔ اس میں پھاند پڑے گا۔ محبت کا یہ والہانہ جذبہ اس کی پور پور میں سرایت کر جائے گا۔ انہیں پڑھ کر ایک مرتبہ وہ خود اپنے معصوم بچپن کو پا سکیگا۔ وہ بچوں کی جنت کے قریب ہی نہیں بلکہ خدا کی جنت کے بھی قریب تر ہو جائے گا۔ دل کی برفیلی سِل کا پگھلنا، ننھے منھوں کی محبت میں بہ نکلنا تعلیم نہیں تو کیا کہیں گے۔ یہ شخصیت میں ایک انقلاب نہیں تو اسے کیا سمجھیں گے۔

پھر عربی زبان کا ادب ایک آفاقی گہرائی اور گیرائی لئے ہوئے ہے۔ یہ اپنے دامن میں صحرائے عرب کی وسعتیں، وادیِ نیل کی ادبی دولتیں۔ اندلس کے گلستان زار لئے ہوئے ہے۔ اس کی روح صحرا کی ہوا سے سرگوشیاں کرتی ہے۔ برگ نخل سے اٹھکھیلیاں کرتی ہے اس میں سادگی ہے۔ فطرت کی سادگی، اس میں وہ قوت ہے جو صدھا سال مادرِ فطرت اور صحرا جیسی مادرِ فطرت کی آغوش میں پل کر اُبھرتی ہے۔ ہمارے شہروں کے در و دیوار کے اندر

پلی ہوئی زبان کے لئے یہ ایک نئی زندگی کا پیغام دے سکتی تھی ایسا پیغام جو سنسکرت کبھی ہندی کو نہ دے سکی۔ سنسکرت دربارداری کی زبان ہی نہیں، مذہبی اجارہ داری کی زبان تھی اسکی ٹکسال راجہ بکرماجیت کا دربار تھی۔ عربی زبان کی ٹکسال اعرابی کا خیمہ تھی۔ ایک مشہور نحوی کو جب زبان سیکھنے کا شوق ہوا تو اس نے صحراؤں کی خاک چھان ماری۔ ایک قبیلہ سے دوسرے میں جاتا تھا اور زبان سیکھنے کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ اسی حالت میں اس کا رنگ سنولا گیا۔ اس نے اسے مبارک فال سمجھا۔ اس کا رنگ ایک غریب بدوی کا سا ہو گیا تھا۔ اب اس کی زبان بھی انہیں کی سی ہو جائے گی ہمارے عربی مدرسے ادب کی اس روح کو اپنا نہیں سکے ورنہ ممکن ہے وہ اردو ادب میں ایک آزاد، بے جھجک، نشتر صفت طرز کی داغ بیل ڈال دیتے۔

مولانا شبلی جب ندوہ کے لئے نصاب کا خاکہ تیار کرنے لگے تو انہیں سب خامیوں کا پورا احساس تھا۔ وہ ہر فن کی غایت اور اس کا مقصد تعین کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے تحت نفس فن پر توجہ دینا چاہتے تھے۔ جب کہ رواجی استاد ہڈیوں کو ہی کھنگولتے رہتے تھے اور مغز تک پہنچ نہیں پاتے تھے مولانا شبلی اور ان کے ساتھیوں نے بھی کوشش کی کہ لفظی بحث کے پردے چاک کر کے شاہد معنی کے جلوے سے مدرسے کی در و دیوار کو بقعۂ نور بنا دیں۔ پھر علوم میں بھی ایک باشعور تناسب اور ترتیب کا لحاظ رکھا گیا یہ نہیں کہ شاگرد پیشہ قسم کے مضامین تو صدر میں بٹھا دئیے جائیں اور اصل نصاب کو جوتیوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا جائے۔

اس تحریک نے شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی نصابی روایات کو ایک مرتبہ پھر زندہ کر دیا۔ حیدرآباد کے دارالعلوم کے لئے نیا نصاب مرتب کرتے وقت مولانا شبلی نے اس میں قرآن کو جائز اہمیت دی۔ اس کے ساتھ ساتھ حدیث کا نصاب بھی زیادہ کر دیا۔ ادب عربی تحریر اور انشا پردازی کو بھی جگہ ملی۔ نصاب کے بھولے ہوئے سرچشموں یعنی متقدمین کی کتابوں کو دوبارہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مدرس میں داخل کیا گیا۔

ندوہ کی تحریک کا اصلی مقصد یہی تھا کہ مذہبی مدرسے اس رواں دواں اور بیدار دنیا میں

اس کے نت نئے مطالبوں اور بدلتے ماحول میں محض ایک آثار قدیمہ ، ایک ذہنی جزیرے کی حیثیت اختیار نہ کرلیں۔ ماحول ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ ماحول پر کارگر حملہ کرنے ، اسے ڈھالنے، بنانے کے ہتھیار ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ مذہب کی روح نہیں بدلتی۔ اس کے پیغام کی ابدیت اس فلک بوس چوٹی کی طرح ہے جو نچلے بادلوں کے بدلتے ہوئے رنگوں کا اثر قبول نہیں کرتی لیکن اس پیغام کو انسانیت تک پہنچانے کی زبان ، اس کے طور طریقے بدلتے رہتے ہیں اسی لئے ندوہ کے نئے نصاب میں جو ۱۹۰۲ء میں مرتب کیا گیا ، انگریزی زبان کو لازمی قرار دیا گیا۔ اگرچہ بقول مولانا شبلی ان کے ایک ساتھی کو محض اس خیال سے ہی کہ انگریزی زبان نصاب میں داخل کر دی گئی ، لرزہ آجاتا تھا مگر وقت کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے انہوں نے اس لرزہ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ فلسفہ جدید کے سلسلے میں دروس الاولیہ جن میں آجکل کی سائنس کے مسائل سے بحث کی گئی تھی شامل کئے گئے۔ ندوہ کی تحریک ایک زندہ جیتی جاگتی دنیا کی تحریک تھی اس لئے کلاسیکل عربی کے ساتھ ساتھ جدید عربی کا بھی انتظام کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ ندوہ میں ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کے لئے بھی سہولتیں مہیا کی گئیں۔

مولانا شبلی نے نئے نصاب کی ناؤ ، مذہبی تعلیم کی ایک اٹھتی ہوئی لہر پر چھوڑی تھی اور اگر بادِ شرط ساتھ دیتی تو وہ موجوں پر سے ہنستی کھیلتی خدا جانے اب تک کتنا کچھ راستہ طے کر چکی ہوتی اس قسم کی مذہبی تعلیم وقت کی اہم ضرورت تھی ، اور یہ ضرورت آج بھی جوں کی توں قایم ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کا لنگر سرسیدؔ کے زمانے سے مذہبی تعلیم رہا۔ لیکن اس کی زنجیریں جوں کی توں ڈھیلی رہیں۔ انہیں سنبھالنے کے لئے بالیدہ نظر استادوں کی ضرورت تھی جو مذہب کے پیغام کو وقت کی زبان میں بیان کرسکیں ، صرف ونحو کی زبان نہیں۔ زمانہ کے محسوسات وجذبات ، اس کے نظریات اور تخیلات کی روشنی میں پیش کرسکیں۔ انہیں دنوں وقار الملک نے نینی تال کی بلندیوں پر وہ فتح حاصل کی جو وہ نچلے میدانوں میں حاصل نہ کرسکے تھے ، ان کی پیہم کوشش سے حکومت نے ہفتہ میں دو بار آدھے گھنٹے کا وقت مذہبی تعلیم کے لئے دینا منظور کر لیا۔ ان دو فتوحِ کا

ساتھ ساتھ ہونا قِران السعدین تھا، یہ قِران گو دسے کی ان گولیوں کا تھا جو بجلی کے تجربے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ دم کے دم ملتی ہیں اور ملتے ہی چشم زدن میں یوں علیحدہ ہو جاتی ہیں جیسے کبھی ملاقات ہی نہیں رہی۔ مذہبی تعلیم کے استادوں کا مسئلہ ابھی تک ہماری تعلیمی شاہراہ کے راستے میں ایک چٹان ہے اور اس کو حل کرنے کے لئے ایک چٹان کا سا عزم اور پیہم فکر و جستجو کی ضرورت ہے۔

---

(۵) مہاراشٹر کی تعلیمی تحریک

تعلیمی تنظیم میں خود ارادی اور خود اعتمادی کی داستان

پونا کے اوپر سے ایک خشک پہاڑی جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس پر کہیں پھول پتی کا نام و نشان نہیں۔ ہر طرف پتھریلی چٹانیں۔ ہر جانب سخت شکن چڑھائیاں فرگوسن کالج اس کے سائے میں بسا ہوا ہے۔ ایک صبح جب سورج نے اس کی سنگلاخ چٹانوں کو چوما تھا اور وہ فرطِ حیا سے سُرخ ہو گئی تھیں اس کی چوٹی پر تین آدمی کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں دور پار افق کا جائزہ لے رہی تھیں ان کی نگاہوں میں کسی دور دراز کی دنیا کے خواب پَل رہے تھے۔ ان کے چہروں پر آہنی عزم کا ارادہ تھا۔ یہ تھے گوکھلے اور ان کے دو ساتھی۔ اس سنگلاخ پتھریلی چوٹی پر یہ تینوں ساتھی یوں کھڑے تھے جیسے اسی نے ان کو جنم دیا ہو۔ اس بلندی پر کھڑے ہو کر انہوں نے مل کر ایک قسم کھائی تھی۔ یہ تھی غربت اور خدمت کی قسم۔ صبح کی اُبلتی ہوئی روشنی میں جبکہ آفتاب مشرق میں ڈھلک رہا تھا، ان کے الفاظ فضا میں گونجے "ہم جب تک زندہ رہیں گے، غریب رہیں گے، اور اس غربت میں قوم کی خدمت کریں گے"۔ یہ قسم کسی شاعر یا ادیب کی قسم نہ تھی۔ یہ سیدھے سادھے کسانوں کی قسم تھی۔ اور اس میں وہ قوت و عزم و ابدیت اور جامعیت، وہ سادگی اور خلوص تھا جو مادرِ ارضی کی آغوش میں اور فطرت کی گود میں ہی پرورش پا سکتا ہے۔

کسانوں کی تعلیمی تحریک

ہماری اکثر تحریکیں شہروں سے نکلی ہیں، ان میں شہریوں کی خوبیاں اور اس کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں جہاں ان میں ایک نئے پیغام کا نغمہ سنائی دیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ مذہبی اور سماجی زنجیروں کی جھنکار بھی کان میں پڑتی ہیں۔ تحریکیں شہروں سے چلتی ہیں لیکن کامیاب گاؤں میں جاکر ہوتی ہیں۔ کسانوں کے تعاون سے ان میں زندگی کی نئی لہر، خون کی نئی رَو دوڑ جاتی ہے۔ ہماری ہر کامیاب سیاسی تحریک کا سہرا اس دیس کے کسانوں کے سر ہے، اور اگرچہ اب تک کوئی تعلیمی تحریک کامیاب نہیں ہوئی لیکن ہر آنے والے کامیاب تعلیمی تجربے کا سہرا بھی کسانوں کے سر رہے گا۔

مہاراشٹر کی تعلیمی تحریک کے کام کرنے والے، اگرچہ خود کسان نہ تھے لیکن وہ کسانوں کی سماج میں پلے بڑھے تھے۔ تعلیمی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کے لئے ان لوگوں نے کسانوں کی سی ان تھک محنت اور جراءت سے کام لیا۔

اس کسان راہرو کی طرح جو ندیوں اور جنگلوں کو پھلانگتا چیرتا اپنا راستہ بنالیتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی ہماری تعلیمی ترائی کے جنگلوں میں سے ایک راستہ نکالا جو تیر کی طرح سیدھا تھا لیکن اس پر چلنے کے لئے ایک کسان کے عزم وارادے۔ دلیری اور ولولے کی ضرورت تھی۔ اس پر گزرنے کے لئے ایک نئی مجاہدانہ سپرٹ کی ضرورت تھی۔

تعلیمی اور سماجی تحریکوں کے دھارے کبھی تو خود بخود کسی ہلکے سہارے سے، حیات ملی کی گہرائیوں سے اُبلنے لگتے ہیں اور کبھی یہ چشمے ایک جان توڑ تصادم سے پھوٹ نکلتے ہیں ہماری اکثر تعلیمی تحریکیں ایسے ہی تصادم کا نتیجہ ہیں۔ عصائے کلیمی جب خشک چٹانوں سے ٹکراتا ہے تو پانی کے دھارے بہنے لگتے ہیں اور حیات ملی جب رجعت پسند عناصر سے ٹکراتی ہے تو حیات ابدی کے سرچشمے کا پیام لاتی ہے۔

مہاراشٹر ایک غریب کسانوں کا دیس ہے۔ نہ کارخانے نہ زمین کے قیمتی خزانے لے دیکر مادرِ ارضی ہے وہ بھی خشک بنجر پہاڑوں سے پٹی ہوئی۔ اس کی دولت۔ یہاں کے مالی وسائل نہیں

یہاں کے انسان ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ٹیگو رہوتا تو دنیا بھر کی ہمدردی ایک ہی گیت میں حاصل کرلیتا اگر کوئی امریکن پادری ہوتا تو ڈالر کا ڈھیر ایک ہی اپیل سے اکٹھا کرلیتا مگر یہاں تو نہ گیت تھے نہ ڈالر۔ بس لے دے کر کام کرنے والے انسان تھے، ان کا بے پناہ جوش وخروش، خلوص اور ولولہ تھا۔ انہوں نے ان بنجر اور ویران پہاڑیوں میں ایک نئے تعلیمی نخلستان کی بنیاد ڈالی ایک کی نہیں بلکہ پورے سلسلے کی داغ بیل ڈال دی۔

لائف ممبری کا اصول

حکومت نے ۱۸۸۲ء کا تعلیمی کمیشن بٹھایا۔ اس نے نجی اداروں کو دور سے امید کے بڑے بڑے سبز باغ دکھائے۔ ان کے لئے زرامدادی کے اصول وضوابط، مخیرانہ مراعات کے انداز میں پیش کئے۔ مہاراشٹر کے لوگوں کے حوصلے بھی بڑھے اور ۱۸۸۵ء میں فرگوسن کالج کی بنیاد پڑی، لیکن امید کے وہ سبز باغ جو تعلیمی کمیشن نے دکھائے تھے سراب بنتے گئے۔ شروع میں طلباء کی کمی تھی اس کے ساتھ فیس کے نرخ بھی کم تھے۔ اور اس پر حکومت کی ستم ظریفی کہ زرامدادی اداروں کو بس جیتا ہوا تو رکھ سکتا تھا، رواں دواں اور زندگی سے بھرپور نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا اور لائف ممبری کا اصول تھا۔ فرگوسن کالج کے بانی لائف ممبروں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کالج کی خدمت کے لئے چالیس روپئے ماہوار پر وقف کردیں گے بعد میں یہ اعزازی مشاہرہ پچھتر روپئے ہوگیا۔ ہماری انگریزی تعلیم کی تاریخ میں یہ قربانی کی پہلی مثال تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قومی خلوص کی مثال تھی۔ ہم کہیں گے کہ یہ تعلیمی خلوص کی مثال بھی تھی، اندھیارے کے ان قندیل دکھانے والوں نے ہمیں سچے اور حقیقی تعلیمی نظام کی راہ بتادی۔

تعلیمی اداروں کے نظم ونسق، اس کے مقاصد ومطالب کو تعین کرنے والے کون لوگ ہونا چاہئیں، کیا وہ سرمایہ دار اور اوپر کا طبقہ جو چند چھدام دے کر استادوں کو کیا بچوں کی روحوں کو بھی خرید لینا چاہتا ہے یا خود اس ادارے کے استادوں کی انجمن جو بچوں کے ساتھ ساتھ اپنی روحوں کو بھی زندہ وبیدار رکھنا چاہتی ہے۔ اور اس اقتصادی نظام کے ماتحت جس میں ہم الجھ کر

رہ گئے ہیں، اچھے استادوں کے لئے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ اپنی زندگیاں اداروں کو وقف کر دیں۔ زندگی دینے سے ہی نئی زندگی مل سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگیاں دے دیں گے تو ان کے اداروں کے نظم ونسق ہیں۔ اس کے نصاب اور طریق تعلیم میں نئی زندگی کی رَو دوڑنے لگے گی۔ مہاراشٹر کے لوگوں نے تعلیم کے اس سچے اور کھرے اصول پر عمل کیا اور کامیاب ہوئے ان کے خلوص کی لَو لیکی اور دوسرے دلوں میں بھی جالگی، آہستہ آہستہ صوبہ بمبئی کے بہت سے کالجوں نے لائف ممبری کے اصول کو اپنا لیا اور اس صوبے میں نجی کالجوں کے ذریعہ یونیورسٹی تعلیم اسی کے ذریعے مکمل ہوئی۔

دنیا بھر کا بہترین ادارہ

اور اب پورے ملک کے طول و عرض میں کئی ادارے اس پر کاربند ہو گئے ہیں۔ دنیا بھر کی نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے صدر کو جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان آنے کا اتفاق ہوا تو اس نے جامعہ ملیہ کو دیکھا۔ اور اس میں اسی تعاونی زندگی کے اصول کو جاری وساری دیکھا۔ اس کی انتظامیہ انجمن کے جلسوں میں باہر کے اجارہ داروں کو نہیں بلکہ ادارے کے کارکنوں کو کام کرتے پایا۔ ان اصولوں کا اثر بچوں کی زندگی میں دیکھا۔ اس کا اثر ادارے کی فضا میں محسوس کیا اور اس کے بعد یہ رائے لکھی کہ میں نے زندگی بھر میں آج تک اس سے بہتر ادارے نہیں پائے حقیقت تو یہ ہے کہ خواہ ازمنۂ وسطیٰ کی یونیورسٹیاں ہوں یا اسلامی دنیا کے پُرانے مدرسے۔ سب اچھے اداروں میں پہلے سے یہی اصول کارفرما رہا ہے۔

مرکزی تعلیمی بورڈ نے کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے نئے گریڈ تجویز کئے ہیں۔ اساتذہ کی حیثیت۔ ان کا سماجی رتبہ اونچا ہونے سے ہر بھلے آدمی کو خوشی ہو گی کسی قوم کی تہذیب و ترقی کا معیار یہی ہے کہ وہ اپنے استادوں کو سماج میں کیا درجہ دیتی ہے، اور جب ہم سول سروس کے شاہانہ اسکیل۔ ان کی سماجی وجاہت کا یونیورسٹی کے استاد سے مقابلہ کرتے ہیں تو اس اہم سماجی خدمت کا معاوضہ کس قدر حقیر اور کم مایہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ہمیں اس ملک میں نچلے طبقوں کے معیار زندگی کو بلند کرنا ہے کم سے کم اتنا بلند کہ وہ حیوانوں کی زندگی کے

کچھ تو اوپر ہو جائیں تو شاید ہمیں اپنا ہاتھ روکنا پڑے۔ استاد کے لئے دل تو جان تدر کر دینے کو چاہتا ہے لیکن اوپر والوں کا تعلیمی بل دیکھ کر تو جسم میں جان بھی باقی نہیں رہتی۔ ویسے بھی استاد کے لئے یہ سودا کچھ ایسا سستا نہیں پڑتا۔ اگر وہ ایک ہاتھ سے کام کے دام لیتا ہے تو دوسرے سے اپنا حق خود اختیاری اور علمی آزادی بھی آقا کی خدمت میں تدر کر دیتا ہے۔ وہ سررشتۂ تعلیم جو اس کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے تھا دوسرے کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔

اور پھر ابھی ہماری یونیورسٹی تعلیم کو سارجنٹ اسکیم کے گرنیڈ کا بھاری بل ادا کرنا ہے۔ ابھی انہیں اس نظام تعلیم کی اور ضروریات کو بھی پورا کرنا ہے۔ ہمیں کالجوں کی جماعتوں کو چھوٹا کرنا ہوگا استاد اور شاگرد کے تعلقات کو زیادہ گہرے اور ہمہ گیر بنانا ہوگا۔ ٹیوٹوریل طریق کو عام کر دینا ہوگا رہائشی انتظام کو طالب علم کی زندگی کا ایک موثر عنصر بنانا ہوگا۔ ان سب کاموں کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اب تک اعلیٰ تعلیم کے لئے روپیہ عوام کی تعلیم سے بچا کر دیا گیا ہے لیکن آنے والے زمانے میں ایسی غلط قسم کی بچت کرنا ممکن نہیں، ہماری اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو ایک نہ ایک دن اس منمنت کا سامنا کرنا ہوگا۔ کچھ عرصہ ہوا۔ گاندھی جی نے ان اداروں کے لئے اپنا خرچ آپ چلانے کی تجویز پیش کر کے یونیورسٹیوں کے ایوان میں ایک زلزلہ سا ڈال دیا تھا، معلوم نہیں ابھی ان اداروں کو ایسے کتنے زلزلوں سے سابقہ پڑے گا۔ ان کے خلاف بہترین تحفظ خود استادوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی جانب پہلی رہنمائی دکن ایجوکیشن سوسائٹی اور فرگوسن کالج کے لوگوں نے کی۔

---

(۶) شانتی نکیتن

ٹیگور ازل سے ہی ایک شاعر کا دل لے کر آئے تھے۔ ان کا دل بچپن سے ہی بے روح اور بے کیف نظام تعلیم کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھا۔ جب اُستاد کے آنے کا وقت ہوتا تھا تو ننھے ننھے ہاتھ ایک پُر خلوص دعا کے لئے مل جاتے تھے اور ننھا ٹیگور ان تمام آسمانی طاقتوں کے

واسطے سے جن کے نام وہ تتلانے لگا تھا دعا مانگا کرتا تھا کہ ماسٹر صاحب نہ آئیں۔ اگر بارش ہونے لگی تو یہ دعائیں اور بھی زور پکڑ جاتی تھیں۔ بھلا بارش کا اس سے بھی بلند تر کوئی مقصد ہو سکتا ہے کہ ایک ننھے منھے بچے کو ایک دن کے ہی لئے استاد سے نجات دلا دے!

بچپن کا باغی جب پہلے پہل ان کے بھائی مدرسے جانے لگے تو یہ بھی مچل گئے اور بولے میں بھی مدرسے جاؤں گا۔ کسی نے کہا ابھی اپ تو مدرسے جانے کے لئے فیل مچا رہے ہو پھر وہاں سے آنے کے لئے دھند مچاؤ گے۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ ٹیگور سمجھے تھے کہ مدرسے کے بہانے گھر کی قید سے رہائی ملے گی۔ لیکن کیا پتا تھا کہ اس نظر بندی کی بجائے قید سخت کی سزا ملے گی۔ ٹیگور نے مدرسے کی پابندیوں کو اس شدت سے محسوس کیا کہ مدرسے کا نام کالا پانی رکھ دیا اور استاد کا "مولا بخش"!

اس بچے کی طرح جسے پہلے پہل الف بتایا گیا تو بولا الف کہاں ہے، مجھے تو یہ قلم سا نظر آرہا ہے۔ ننھا ٹیگور بھی جب انگریزی کی کتاب ہاتھ میں لیتا تھا تو اسے ہر سبق کے شروع میں موٹے حروف میں لکھے ہوئے الفاظ عجب بہروپیا سے لگتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سنگینیں لئے کھڑے ہوں آنکھ بچی کی اور انہوں نے تیز تیز انیاں بدن میں بھونک دیں۔

شانتی نکیتن کا مدرسہ انھیں بچپن کے تاثرات کا ردِ عمل تھا۔ اس کی بے رونق فضا کے خلاف، اس کے بے جان نصاب کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ پرانے مدرسے میں بچوں کے جسم نہیں ان کی روحیں بھی چار دیواری میں قید کر دی جاتی تھیں۔ یہاں انہیں مادرِ فطرت کی گود میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہاں ان کے جسم کا بند بند میزوں اور ڈسکوں میں جکڑ کر رہ جاتا تھا یہاں اس کی قوت پرواز کو افق کی حدود بھی نہیں روک سکتی تھیں۔

نئے اُستاد کا نیا سبق ٹیگور کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنا مدرسہ پانچ بچوں سے شروع کیا تھا۔ سردیوں کے دن، چاروں طرف خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی ہم سب مل کر لانبے لانبے درختوں کے سائے میں پڑھنے بیٹھ گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں

کوئی نئی نظم لکھنے والا ہوں صفحۂ قرطاس پر نہیں صفحۂ زندگی پر! شانتی نکیتن ان بچوں کے لئے ایک گھر کی طرح تھا لیکن کیسا حسین گھر! اس احساس سے کبھی کبھی ٹیگور کا دل گرما جاتا تھا، وہ اکثر کہتے تھے میں نے ان بچوں کے لئے کیسا اچھا گھر بنا دیا ہے۔ یہ بچے دنیا میں آئے تو سہی لیکن ابھی انہوں نے اچھے گھر کا شکھ نہیں دیکھا تھا۔ یہ مدرسہ بنا کر میں نے انہیں اچھے گھر کے شکھ سے آشنا کرا دیا شکھ ہی سے نہیں اس کے حسن، اس کی شانتی، اس کی مسرت اور محبت بھری فضا۔ اس کی رنگینی اور ہم آہنگی سے بھی، ہم آغوش کرا دیا۔

خاندانی ماحول

ٹیگور کا خاندان برہمو سماج کا پیرو تھا۔ پیرو ہی نہیں بلکہ اس کی روایات کی محافظت کرنے والا اور اسے آئندہ نسلوں تک پہنچانے والا تھا۔ ٹیگور کے والد سماج کے مہارشی ہو گزرے ہیں لیکن ٹیگور نے محض روحانی لحاظ سے نہیں تعلیمی طور پر بھی اس کے بانی راجہ رام موہن رائے کی روایات کو دوبارہ زندہ کیا۔ ان کی آفاقی نگاہ مشرقی اور مغربی علوم کو ہی اپنے دامن میں سمیٹنا چاہتی تھی، ٹیگور اپنے دائرۂ علم میں ہندوستانی۔ چینی اور اسلامی سبھی علوم کو جگہ دینا چاہتے تھے۔ مہارشی کے روحانی تخیل میں اُپنشدوں کے ساتھ حافظ اور رومی کی بھی جگہ تھی۔ ان کی تربیت نے ٹیگور کو بھی وسعت نظر بخشی۔ ان کے دنیا بھر سے کلچرل اور ادبی تعلقات نے اور بھی گہرائی اور گیرائی دے دی۔ انہوں نے جب زندگی اور مذہب پر نظر کی تو اسے پورے کا پورا بطور کل دیکھا اور جب تعلیم پر نگاہ کی تو اسے بھی ایک ہمہ گیر نگاہ سے سمیٹا۔ وسوا بھارتی کے نام میں دو دھارے، یعنی دنیا اور ہندوستان، یہ دونوں مل کر شانتی نکیتن کے رومانی کنجوں میں عجیب و غریب گنگا جمنی بہار دکھا رہے ہیں۔

روحِ نمو کے لئے نئی راہیں

ایک زندہ تحریک، ایک تناور بارآور درخت کی طرح پھولتی پھلتی بڑھتی پھیلتی ہے۔ جب جوبن پر آتی ہے تو قوتِ نمو کے جوش سے ٹیڑھی میڑھی رگیں بھی استوار ہو جاتی ہیں۔ ہندو کالج کی تحریک میں بنگالی زبان کی جگہ تھی۔ میکالے اور ساتھیوں کے اثر سے یہ جگہ چھن سی گئی۔ ٹیگور نے مادری زبان کو ایک مرتبہ

پھر شہ نشین میں لا بٹھایا۔ بنگالی زبان نہیں بنگالی آرٹ، بنگالی ناچ اور بنگالی گیتوں سے اظہار خودی کی نئی راہیں کھول دیں۔ برہمو سماج تعلیم یافتہ طبقے میں گھر کے رہ گئی تھی۔ ایک زمین بند جھیل کی طرح جسے کھلے سمندروں کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ ٹیگور نے تعلیم کے ذریعہ کوشش کی کہ اس جھیل کو بہتے ہوئے دھارے سے ملا دے۔ اور روح اور زندگی کا پیغام مخصوص طبقوں سے نکال کر عوام تک پہنچا دے۔

دیہی زندگی کا معمار فطرت کی اس ہمہ گیر محبت کی طرح جو بلند دیوداروں کو ہی نہیں بلکہ بنفشہ کی شرماتی ہوئی کونپلوں کو نسیم بہار کی گودی میں جھولا جھلاتی ہے۔ ٹیگور نے شانتی نکیتن کے روشنی کے مینار سے دنیا کی سرحدوں کو ہی اس طوفانی روشنی سے نہیں جگمگایا بلکہ انہوں نے تاڑ کے درختوں کے نیچے بنی ہوئی سنتھال لوگوں کی غریب جھونپڑیوں میں بھی علم اور محبت کے نئے دریچے کھولنے کی کوشش کی۔ سری نکیتن کا دیہات سدھار کا تجربہ ہماری دیہی تعلیم کے لئے وہ برچھے کی انی ہے، جو ایک نہ ایک دن دیہی زندگی کے تاریک پردوں کو چیر کر رکھ دے گی۔

انہوں نے دیہی مسئلہ کو ہمہ گیر نگاہ سے دیکھا۔ کسانوں کے لئے صحت کمیٹیاں بنائیں اچھے بیج اور پودوں پر تجربے کئے۔ ملیریا کی روک تھام کی۔ گھریلو صنعتوں میں دوبارہ جان ڈالنے کی، احساس حسن بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس کام میں سری نکیتن کا ادارے نہیں خود ٹیگور بھی لگے رہتے تھے۔ عمارت کے باہر ایک کھلا میدان ہے۔ یہاں موسمی مشاعرے ہوتے تھے۔ علاقے کے کسان شاعر اپنے کلام سناتے تھے۔ ٹیگور داد دیتے تھے اور مقابلے میں اپنی نظمیں بھی سناتے تھے۔ جس زمانے میں ہمیں وہاں جانے کا اتفاق ہوا اس زمانے میں ٹیگور کسانوں کے جھونپڑے کے لئے نئی قسم کی چھت اور نیا مصالحہ بنانے کی فکر میں تھے۔ آخر کار کئی تجربوں کے بعد ایک جھونپڑا تیار ہوا۔ کچی اینٹوں کا صاف ستھرا سا گھر۔ تارکول سے لپی پتی چمکتی ہوئی چھت، اپنا شاہی ایوان کا سا بنگلا چھوڑ کر ٹیگور اس میں آ رہے۔ اس کی چھت کچھ دن

تو جلی ایک مرتبہ ٹیگور بنارس گئے ہوئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں بارش کے زور سے نیچے آرہی۔ انہیں بالغوں کی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ نوجوان مدرسے سے پڑھ لکھ کر نکلتے تھے لیکن گاؤں کے اندھیارے میں جاتے ہی قندیل علم مدھم پڑنے لگتی تھی۔ علمی دنیا کے ان طوفان زدہ مسافروں کے لئے عام معلومات کا ایک نصاب تیار کیا گیا۔ اس کے لئے امتحان اور سندیں متعین کی گئیں۔ ان کے لئے ٹیگور سادی زبان میں خود کتابیں لکھتے تھے، اور آسان بنگالی میں رسالہ بھی نکالتے تھے

دہکتا ہوا شعلہ یا بجلی کا قمقمہ

یہ سب کچھ ہوا لیکن اتنا کچھ ہونے پر بھی ایک حد تک شانتی نیکیتن کا ادارہ ایک تحریک نہ بن سکا۔ ٹیگور کے گیتوں کا آہنگ ان کے نغمے ہر بنگالی گھر میں سنائی دینے لگے۔ ان کا بنگالی زبان کا نظریہ ایک تحریک بن گیا لیکن شانتی نیکیتن کا تعلیمی تخیل۔ اس کی پُر مسرت آرٹ اور نغمہ سے بھرپور فضا میں اس کے ننھے ننھے کرداروں کی فن کاری۔ اس کے دیہی شعبہ کا پیغام آنولے کے سایوں سے باہر نہ جا سکے۔ ایک شعلہ سے دوسرا شعلہ بھڑکتا ہے۔ لیکن شانتی نیکیتن کا روشنی کا مینار اس گیس کے قمقمے کی طرح تھا جس سے دوسری شعلیں روشن نہیں ہوسکیں، یا پھر یہ اسقدر بلند تھا کہ دوسرے اپنی قندیلوں کو جلانے کے لئے ان بلندیوں تک پہنچ نہیں پائے لیکن مینار اسقدر روشن تھا کہ اس کی شعاعیں سات سمندر پار تک جگمگا رہی تھیں۔ آج تعلیمی دنیا میں ہندوستان کا نام شانتی نیکیتن اور اس کے بلند تخیل والے بانی کی برکت سے لیا جا رہا ہے۔

نئی تعلیم اور نئے مدرسے

"نئی تعلیم" یا "ترقی پسند تعلیم" کا نام آج کل بہت سننے میں آرہا ہے۔ اس تحریک کے علمبردار کون ہیں۔ اس کو کب اور کن جگہوں میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا مفہوم کیا ہے۔ کن اعتبارات سے یہ پرانی تعلیم سے مختلف ہے۔ اس کا کچھ مختصر حال ذیل کے صفحات میں درج کیا جاتا ہے۔

روسو اور تعلیم میں انفرادی تجربے اور تحقیقات کی اہمیت

نئی تعلیم کے علمبرداروں میں اوّلیت کا شرف روسو کو حاصل ہے۔ انقلاب فرانس سے چند سال پہلے اس نے اپنی کتاب ایمیلی (EMILE) تصنیف کی جس کے بنیادی خیالات یہ ہیں :-

(۱) ہر قسم کی تعلیم کی ابتدا بچے ہی سے ہونا چاہیئے۔ بچہ کی صلاحیتوں کو آزاد کرنا اور انھیں بالغوں کی عائد کردہ پابندیوں کے بغیر نشو و نما کا موقع دینا چاہیئے۔

(۲) بچے کو اپنے ماحول کی ذاتی تجربی تحقیقات کا موقع دینا چاہیئے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے علم میں از خود اضافہ کر سکے اور بڑوں کے مذہبی یا سیاسی عقیدوں کو بچے پر ہرگز نہ ٹھونسنا چاہیئے۔

(۳) تعلیم کا ذریعہ کتابیں نہیں بلکہ خود حقیقی زندگی ہونا چاہیئے۔

روسو نے صرف تعلیمی نظریہ بنایا۔ اس کو وہ عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تعلیمی مصلحوں نے اس کے بعض زیادہ قابل عمل نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کی

کوشش کی۔

پستالوزی اور تعلیم بذریعہ مشاہدۂ اشیاء

بستالوزی نے روسو کے نظریوں سے متاثر ہوکر انیسویں صدی کے نصف اول میں بچہ کی تعلیم کے نئے طریقوں کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ روسو کی طرح پستالوزی بھی حواس کی تربیت پر زور دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کتابوں کی تعریفیں اور مجرد بیانات سکھانے سے پہلے یہ لازمی ہے کہ تجربوں کے ذریعہ بچے کے حواس کی تربیت کی جائے۔ ان تجربوں کے لئے وہ چیزوں، بلا واسطہ مشاہدوں اور میدانوں کی سیر کا انتظام کرتا تھا۔ اسی لئے اس کے نظام تعلیم کو "تعلیم اشیاء کا طریق کار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایڈلر اور تعلیم بذریعہ تخلیق اشیاء

ایڈلر کا یہ عقیدہ تھا کہ محض اشیاء کی تعلیم ہی کافی نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ اشیاء کی تخلیق کا کام بھی جاری رہنا چاہئے اور تخلیقی کام کو تعلیم کا باقاعدہ حصہ بنانا چاہئے۔ چنانچہ اس نے انیسویں صدی کے آخری رُبع میں شہر نیویارک میں اخلاقی تربیت کا جو مدرسہ قایم کیا اس کی ہر ابتدائی جماعت میں چار گھنٹے فی ہفتہ کا تعمیری یا تخلیقی کام لازمی قرار دیا گیا۔

فرائبل اور "بچوں کا باغ"

فرائبل کے کنڈرگارٹن (بچوں کا باغ) کی تعلیم کی بنیادی شے بچے کی نموپزیری ہے۔ نموپزیری کا مفہوم اس کے نزدیک یہ ہے کہ بچہ کی باطنی صلاحیتوں کو باہر نکالا جائے۔ فرائبل نے روحانیت پر بہت زور دیا۔ وہ حسن پرست تھا اور اس تصور کا قایل تھا کہ نموپزیری لامحدود اور لافانی کی سمت ہوتی ہے۔ وہ تخلیق اندکچھ کام کرکے سیکھنے پر زور دیتا تھا۔ وہ مدرسہ کو ایک ایسی زندہ سماج بنانا چاہتا تھا جس کے کاموں میں بچے پوری طرح شرکت کرسکیں۔

ہربرٹ اور بچے کی نفسیات

ہربرٹ نے بچے کی نفسیات پر بہت زور دیا۔ وہ پڑھانا شروع کرنے سے پہلے بچے کا مطالعہ کرنا بہت ضروری

سمجھتا تھا۔ وہ انفرادی اختلافات کی اہمیت کا قایل تھا اور تعلیم کی کامیابی کے لئے بچے کی دلچسپی کو لازمی شرط قرار دیتا تھا۔ ہربرٹ کے طریقۂ تعلیم میں استاد کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ بچہ کو چونکہ وہ ناواقف اور استاد کو واقف مانتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک استاد کا یہ فرض ہے کہ جن چیزوں سے وہ واقف ہے ان کے بارے میں بچوں کی ناواقفیت کو دور کرے، ہربرٹ نے استاد کے تعلیمی کام کو پانچ باقاعدہ تدریجی اقدامات میں تقسیم کیا ہے (۱) تیاری (۲) پیشی۔ (۳) مقابلہ (۴) عمومی بیان اور (۵) تطبیق۔

جان ڈیوئی اور اس کا تجربی فلسفہ

ہم عصر تعلیمی مفکروں میں سب سے زیادہ مشہور نام جان ڈیوئی کا ہے۔ امریکہ کے نئے مدرسوں کے طریقۂ تعلیم کو بدلنے میں اس کا اثر سب سے زیادہ ہے اور دنیا کے تمام ترقی پسند معلم اس کی رہنمائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ امریکہ سے باہر دوسرے ملکوں، یعنی چین و ترکی اور روس میں بھی تعلیم کو نئی تنظیم دینے کے کام میں مدد دینے کے لئے جا چکا ہے۔ اس کو شروع ہی سے فلسفہ سے بہت دلچسپی رہی ہے اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں وہ اس مضمون کا درس دیتا رہا ہے۔ ابتداء میں یہ عینیت پسند تھا بعد میں فلسفہ عملیت[1] کا قائل ہو گیا اور آج اس کا شمار عام طور پر تجربی (یا اختیاری) فلسفہ کے ماننے والوں میں کیا جاتا ہے۔ ڈیوئی کے نزدیک فلسفہ کا کام یہ معلوم کرنا نہیں ہے کہ ہم دنیا کو کس طرح جانتے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم دنیا پر کس طرح قابو پا سکتے ہیں، اور اس کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس کے نظریہ کے مطابق فلسفہ سماجی جھگڑوں کے مطالعہ کا نام ہے۔ خصوصاً ان جھگڑوں کے مطالعہ کا جو جدید سماج کی تین مبینہ قوتوں یعنی جمہوریت، صنعت اور سائنس کے تعلقات کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔" اس مفہوم کے مطابق فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ "آدمیوں کے ان خیالات میں صفائی پیدا کرے جو اپنے زمانے کے سماجی اور اخلاقی جھگڑوں کے متعلق ان کے ذہن میں پیدا ہوں" اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تجربی طریقہ ہی کو اختیار کر کے سماجی مسئلوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔

---

[1] یہ نظریہ کہ کسی چیز کا معیار حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کا انسانی اغراض و مفاد سے تعلق ہو۔

نظریہ اور طریقہ دونوں کے لحاظ سے تجربی فلسفہ تمام چیزوں کو تجربی سمجھتا ہے۔ کوئی چیز قایم اور دایم نہیں ہے۔ کائنات خود تغیر کی حالت میں ہے۔ اس لئے دائمی حقیقتوں کے بارے میں صاف ستھرے اور پختہ و پیوستہ فارمولے وضع کرنا نہ صرف یہ کہ ناممکن ہے بلکہ ایک فعلِ عبث ہے۔ تجربی فلسفہ کا ماننے والا ما فوق الفطرت دنیا سے انکار کرتا ہے، اس کا یہ دعویٰ ہے کہ آخر میں انسان کو راستہ خود ہی مقرر کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے آدمی اسی وقت ایک کارگزار سماجی زندگی کے تعمیر کرنے کی توقع قایم کر سکتا ہے، جب وہ اپنے پیچیدہ مسئلوں کو حل کرنے کے لئے تجربی طریقوں کو اختیار کرے تبدیلی کے عمل پر قابو پانے کے لئے جس جدوجہد میں آدمی مصروف ہے۔ اس میں اس کو اپنی تخلیقی ذہانت ہی پر بھروسہ کرنا ہوگا۔

جان ڈیوئی کے تعلیمی اصول

ڈیوئی اور اس کے پیروؤں کے جم غفیر کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایسی سماجی اہلیت پیدا کرنا ہے جس کے ذریعہ ایک آدمی زندگی کے عام دھندوں میں شرکت کرنے کے قابل بن جائے۔ ایک مثالی مدرسہ کو ایک باعمل اور باحرکت سماج ہونا چاہئے جس میں بچہ اپنے تجربوں کے ذریعہ ضروری باتیں سیکھ سکے۔ یہاں بچے کی زندگی کو خود تعلیم ہونا چاہئے۔ یہاں نمو پزیری میں بتدریج اضافہ ہوتا رہنا چاہئے۔ ترقی کی ہر حالت میں بعد کی ترقی کے بیج موجود رہنا چاہئیں۔ فلسفہ عملیت اور فلسفہ تجربی۔ دونوں بچے کو ایک ایسی شخصیت سمجھتے ہیں جس میں برابر نشو ونما اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یہ مدرسہ کو محض ایک ایسا آلہ سمجھتے ہیں جس سے اس نشو ونما اور تبدیلی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بزرگوں کی عقل اور ان کا علم مدرسہ میں جو کچھ بچہ سیکھے اس پر شرطیں عاید کر دیں لیکن ہر بچے یا ان کے گروہ کی ایک منفرد حیثیت تو ضرور ہی تسلیم کرنا چاہئے۔ بچے کو اپنی ذاتی زندگی بسر کرنا ہے اور اُسے ایک ایسے مستقبل کا سامنا کرنا ہے جو نئے اور غیر حل شدہ مسائل سے معمور ہوگا۔ بزرگ یہ تو تجویز کر سکتے ہیں کہ بچہ کو کیا سیکھنا چاہئے۔ لیکن اس واقفیت کو مناسب طریقہ پر استعمال کرنے کا کام آخر میں خود بچے ہی کو کرنا پڑے گا۔ پورے تعلیمی عمل کی روح یہ ہونا چاہئے کہ نمو پزیر بچہ

اپنے تمدنی ورثہ میں سے انتخاب کرنا اور اس کو نئی تنظیم دینا سیکھے اور وقت آنے پر نئی اور بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی ضرورتوں کے مطابق اس تمدنی ورثہ کو نئے سانچے میں ڈھال سکے۔ اس کے اندر اس اہلیت کو پیدا کرنے کے لئے تخلیقی قوتوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اس فضا میں جبر اور عقیدوں کی تعلیم کی گنجائش بہت کم ہے، اگر ان کا استعمال ضروری ہی سمجھا جائے تو جہاں تک ہو سکے کم سے کم اور بدرجہ مجبوری استعمال کرنا چاہئے۔ فلسفہ تجربی کے حامی خالقیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ لیکن یہ خالقیت اتفاقی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کی رہنمائی کرنا چاہئے یہ خالص انفرادی چیز بھی نہیں ہے۔ اپنی بہترین شکل میں یہ خالقیت ایسے انکشاف اور مہم جوئی کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس میں ایک شخص کے ساتھی پوری طرح اس کے شریک ہوتے ہیں۔

اوپر کی اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) تعلیم محض زندگی کی تیاری نہیں بلکہ خود زندگی ہے۔

(۲) تعلیم نمو پزیری ہے اور جب تک نمو پزیری باقی رہتی ہے تعلیم بھی جاری رہتی ہے

(۳) تعلیم جمع کئے ہوئے تجربہ کی مسلسل تجدید ہے۔

(۴) تعلیم ایک سماجی عمل ہے اور مدرسہ کو ایک جمہوری جماعت ہونا چاہئے۔

فرائبل اور ہربرٹ سے ڈیوئی کا مقابلہ

جان ڈیوئی کے خیالات پر اپنے سے پہلے کے مفکروں خصوصاً فرائبل اور ہربرٹ کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ فرائبل کے کنڈرگارٹن کا بنیادی تصور نمو پزیری تھا۔ اس کو ڈیوئی نے بھی قبول کیا لیکن اس نے اس بات کو نہیں مانا کہ نمو پزیری باطنی صلاحیتوں کے ابھرنے کا نام ہے۔ فرائبل کے تصوف اور علامت پرستی کو بھی ڈیوئی نے نظریہ عملیت کے پیرو ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا۔ کیونکہ ان کا بیشتر حصہ مابعد الطبیعاتی تھا، اور کنڈرگارٹن کو عملی طور پر چلانے کے لئے ہرگز لازمی نہ تھا۔ فرائبل نے روحانیت پر جو زور دیا تھا وہ بھی ڈیوئی جیسے فلسفہ تجربی کے ماننے والے کیلئے قابل قبول نہیں تھا۔ فرائبل چونکہ اپنے فلسفے کے لحاظ سے عینیت پسند تھا اس لئے وہ لامحدود اور لافانی

کی سمت نموپزیری کا قائل تھا لیکن ڈیوئی کے نزدیک کسی بعید منزل کی جانب نموپزیری اس لئے ناممکن ہے کہ اس قسم کی منزل کا قایم اور غیر متحرک ہونا ضروری ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم ایک مسلسل عمل ہے جس کی کوئی قایم منزل نہیں ہے لیکن کئی باتوں میں فرآبل اور ڈیوئی باہم متفق ہیں دونوں خالقیت پر زور دیتے ہیں اگرچہ مختلف طریقوں پر۔ دونوں کر کے سیکھنے پر اصرار کرتے ہیں دونوں مدرسے کو ایک زندہ سماج سمجھتے ہیں، جس کے اندر بچے سماجی کاموں میں پوری طرح شرکت کرتے ہیں۔

ہربرٹ کے طریقوں اور اس کی شقوں میں چونکہ باقاعدگی بہت زیادہ ہے اس لئے ڈیوئی کے نزدیک یہ بہت زیادہ قابل اعتراض ہیں، چنانچہ وہ ہربرٹ کی مخصوص کتاب خوانی کو زیادہ ترقیاسی سمجھ کر اور یہ کہہ کر کہ اس میں طلبہ کی ذاتی فاعلیت کا موقع کم ہے مسترد کر دیتا ہے ڈیوئی کے نزدیک ہربرٹ کے مدرسہ میں استاد کی نگرانی بہت زیادہ اور بچہ کی مرکزیت ناکافی ہوتی ہے۔ یہ بہت بے لوچ، بہت زیادہ حکم پسند اور ناکافی جمہوریت پسند ہوتا ہے۔ ہربرٹ کے یہاں جو نظری ذہنیت پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے اُسے بھی ڈیوئی نے مسترد کر دیا ہے لیکن جن باتوں میں دونوں کم وبیش متفق ہیں وہ یہ ہیں، دونوں تعلیم کے لئے دلچسپی کو بہت اہم قرار دیتے ہیں۔ دونوں انفرادی اختلافات کی اہمیت کے قائل ہیں۔ دونوں بچے کو تعلیم دینے کی کوشش کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہربرٹ کے "باقاعدہ اقدامات" اور ڈیوئی کے "عمل فکر" میں بھی فرق کی کوئی بڑی خلیج حائل نہیں ہے جیسا کہ ذیل کے باہمی مقابلے سے ظاہر ہو جائے گا:۔

طریقہ کے لوازمات

ڈیوئی کے یہاں	ہربرٹ کے یہاں
۱۔ مشغلہ۔	۱۔ تیاری۔
۲۔ مسئلہ۔	۲۔ پیشکشی۔

۳- مقدمات۔	۳- مقابلہ
۴- فرضیہ۔	۴- عمومی بیان
۵- آزمائش	۵- تطبیق۔

ہربرٹ کے طریقے میں استاد کا کام اہم سمجھا جاتا ہے۔ ڈیوئی کے طریقے میں بچے کا کام ایک باعمل سیکھنے والا ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلا طریقہ اس چیز کو بچے تک پہنچاتا ہے جو بچے کو نامعلوم ہے لیکن استاد کو معلوم ہے۔ دوسرا طریقہ نامعلوم کے انکشاف کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ہارن کا قول ہے:" یہ دونوں طریقے نہایت خوبی کے ساتھ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کو مختلف میدانوں میں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ہربرٹ کا طریقہ زبان، ادب، تاریخ اور خیالی میدانوں میں زیادہ بااثر ہے۔ ڈیوئی کا دستی ہنرمندی اور سائنس کے میدانوں میں۔ جہاں کتاب کے مضامین پڑھانا ہوں وہاں ہربرٹ مفید ثابت ہوتا ہے۔ جہاں چیزوں کے برتنے کی اہمیت مقدم ہو وہاں ڈیوئی کا۔"

شکاگو میں ڈیوئی کا تجربی مدرسہ جان روز ایلس ڈیوئی نے ۱۸۹۶ء میں جب وہ شکاگو یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ تھے کچھ پڑوسیوں اور رفقائے کار کے ساتھ مل کر ایک تجربی مدرسہ کھولا۔ یہ مدرسہ بہت ہی غیر رسمی قسم کا تھا۔ تعلیمی طریقوں کے جو مسلّمہ اصول تھے وہ یہاں بہت کم نظر آتے تھے۔ مدرسہ میں کوئی مقررہ مضامین نہیں تھے اور مدرسوں میں جو تھوڑا سا فرنیچر عام طور پر نظر آتا ہے وہ بھی یہاں غائب تھا۔ تعلیمی نقاد جو اسے دیکھنے آئے وہ بہت جزبز اور پریشان ہو کر واپس گئے۔ انھیں یہ کامل یقین تھا کہ یہ مدرسہ ہرگز نہیں چل سکے گا۔ لیکن یہ مدرسہ چلتا رہا اور آہستہ آہستہ بڑھتا، اور اس دوران میں مدرسوں کے مروّجہ طریقوں کو چھوڑتا رہا۔

ڈیوئی کا مدرسہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے واقعی تعلیمی اصولوں کے جانچنے کی جگہ تھا۔ روسو کی کتاب ایمیل کو اگر مروّجہ تعلیم کے خلاف ایک تحریری احتجاج مانا جائے تو ڈیوئی

کے تجربے کو مدرسے کی صورت میں احتجاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسٹاف کے ساتھ گول میز پر مباحثے ہوتے تھے۔ استادوں اور والدین کے سامنے لکچر دیئے جاتے تھے۔ ڈیوئی نے ان موقعوں پر جو گفتگوئیں کیں ان کی بنیاد پر کئی مقالے تصنیف ہو گئے۔ ان میں سے دو کے نام "مدرسہ اور سماج" اور "بچہ اور نصاب" ہیں۔ یہ دونوں بعض ان مسئلوں سے بحث کرتے ہیں جن کو تجربی مدرسہ حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ مدرسہ چار سے تیرہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے تھا ان میں ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی تھی جنھیں فرابل نے شاید پہلی بار شعوری طور پر پیش کیا تھا ڈیوئی کے مدرسہ کی بنیاد اس خیال پر قایم کی گئی تھی کہ "بچوں کو اشتراک عمل اور باہمی فائدے کی زندگی کے لئے تیار کرنا چاہئے۔" چنانچہ اس بات کا اعلان کیا گیا کہ "تمام تعلیمی کاموں کی ابتدائی اساس بچہ کی جبلی اور اضطراری انداز طبیعت اور سرگرمیاں ہوتی ہیں۔" اس لئے ہربرٹ کا طریقہ جو اس زمانے میں مقبول تھا اور جس کے اندر خارجی مواد کو پیش کرنے اور تطبیق دینے پر زور دیا جاتا تھا پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اس کے مقابلے میں ڈیوئی کے طریقہ کی بنیاد اس چیز پر تھی جسے آج عام طور پر مشغلے کے پروگرام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں پڑھائی لکھائی اور حساب کی تثلیث بھی یا تو بچہ کی "زندگی کے مشاغل" سے یا اس کے سیکھنے اور رہنے کے طریقوں سے بتدریج نمو پاتی تھی اور اس کام میں کسی معین اور مقررہ نصاب کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ مدرسہ میں فاعلانہ تعلیم اور تجربہ کی تجدید کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، سب طرح کے مشغلے ہوتے تھے جن میں کھیل، تعمیر، فطرت سے قرب واتصال، اظہار ذات، اوزاروں کا استعمال وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ ان کے سلسلے میں ڈیوئی کا خیال یہ ہے کہ "ہمیں اس بات کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ان کے (یعنی مشاغل کے) ذریعہ مدرسہ کی پوری روح بدل جاتی ہے۔ مدرسہ کو اپنے تئیں زندگی سے وابستہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بچے کا گھر بن جاتا ہے۔ جہاں وہ استاد کی رہنمائی میں خود زندگی بسر کرنا سیکھتا ہے۔ یہ وہ جگہ نہیں رہتی جہاں وہ ایسے سبق سیکھے جن کا آنے والی کسی امکانی زندگی سے کوئی خیالی یا

دور کا تعلق ہو۔ اُسے مختصر پیمانے پر ایک جماعت جیسی حالت میں ایک سماج بننے کا موقع مل جاتا ہے۔
بچوں کو اس مدرسہ میں سننے کی جگہ کرنا، مجہول کی جگہ عامل ہی نہیں بننا پڑتا تھا بلکہ انھیں یہ بھی سیکھنا پڑتا تھا کہ وہ سماج کے لئے اپنے آپ کو کس طرح مفید اور کارگذار بنا سکتے ہیں۔ مقابلہ کی جگہ اشتراک عمل مدرسہ کی بنیادی خصوصیت تھی۔ بچے کے انفرادی رجحانات کو اشتراک عمل کی زندگی کو قایم رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اور اسی کے ذریعے ان کی تنظیم اور رہنمائی کی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں مدرسہ بچے کو زندگی بن کر زندگی کے لئے تیار کرتا تھا۔ اُسے مختصر پیمانے پر زندگی کے مخصوص حالات" کو پیدا کرنا پڑتا تھا۔ ڈیوئی کا دعویٰ یہ تھا کہ "پیدائش اور تخلیقی استعمال کے ذریعہ ہم کو قیمتی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ذہنی ترکہ میں ترمیم و تحریف کی جاسکتی ہے اور سماج کو سماجی ترکہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد کیا جاسکتا ہے۔
۱۹۰۲ء میں اس عملی مدرسہ کو شکاگو یونیورسٹی کے اسکول آف ایجوکیشن میں ضم کر دیا گیا، اور یہ اپنے بانی کی نگرانی میں دو سال تک برابر چلتا رہا۔ لیکن آخر کار ۱۹۰۴ء میں ڈیوئی نے شکاگو چھوڑ دیا اور کولمبیا یونیورسٹی میں وہ فلسفہ کا پروفیسر ہو گیا۔

ڈیوئی کے نظریوں پر فلسفیانہ تنقید

یہ صحیح ہے کہ بیسویں صدی کی تعلیم پر ڈیوئی کا بہت زبردست اثر پڑا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا درست نہیں ہے کہ امریکہ میں ہر جگہ اس کے نظریوں کو قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے نظریہ کو زیادہ تر فلسفۂ عملیت اور فلسفۂ تجربی کے پیرو مانتے ہیں لیکن واقعیت پسند اور عینیت پسند اس کو مسترد کرتے ہیں۔ فلسفۂ واقعیت کے پیرووں کے نزدیک زندگی کی شکل بدلنا اتنا اہم نہیں ہے جتنا حقیقی زندگی کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا ہے۔ لیکن تعلیمی میدان میں واقعیت پسندوں نے بہت کم کام کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فکر کو زیادہ تر نظری فلسفہ تک محدود رکھا ہے۔ اس کے برعکس عینیت پسندوں نے تعلیم میں بھی زندگی اور بارآوری کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے گروہ کی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ اس میں اٹلی کا گیورگی جنٹائل پہلے جرمنی اور اب سوئزرلینڈ کا پال گے ہیب، فرانس کا وکٹر کزن اور انگلستان کا سے سنکلیر شامل ہیں

امریکہ کے عینیت پسندوں کی فہرست میں جوسیا رائس، ڈبلیو۔ ٹی۔ ہیرس اور ہرمن۔ ایچ۔ ہارن شامل ہیں۔ ان میں ہارن ڈیوئی کا تیز لیکن ہمدرد نقاد ہے۔ ڈیوئی کی طرح ہارن نے بھی اپنے خیالات کو متعدد تصانیف میں ظاہر کیا ہے جن میں حسب ذیل شامل ہیں: "تعلیم کا فلسفہ" "تعلیم میں عینیت پرستی" "اختیار اور انسان کی ذمہ داری" "تعلیم" "جان ڈیوئی کا فلسفہ" اور "تعلیم کا جمہوری فلسفہ"۔ آخر الذکر کتاب ۱۹۳۲ء میں شایع ہوئی اور اس کا مطالعہ ڈیوئی کی کتاب جمہوریت اور تعلیم کے ساتھ بطور تنقید کے کرنا بہت ضروری ہے۔

عینیت پسندوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ تعلیم لازمی طور پر تقلید کا نام ہے۔ لیکن وہ اس تصور کو بھی مسترد کرتے ہیں کہ تعلیم صرف خالقیت اور اختراعیت ہے۔ عینیت پسند کے نزدیک تعلیم نہ تو تمام تر تقلید ہے۔ نہ تمام تر اختراعیت۔ بچہ تقلید بھی کرتا ہے اور تخلیق بھی۔ جو باتیں اسے سادہ اور ظاہری حقیقت معلوم ہوتی ہیں انھیں وہ قبول کر لیتا ہے۔ لیکن اُسے نئی قدروں کو پیدا کرنا بھی ضرور سیکھنا چاہیئے۔ فلسفۂ عملیت کے پیروؤں کی مخالفت میں عینیت پسند اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ تعلیم تجربہ کی تجدید کا نام ہے۔ عینیت پسند کے نزدیک جس چیز کی تجدید یا نئے سرے سے تعمیر کی جاتی ہے وہ تجربہ نہیں بلکہ سماجی اور انفرادی زندگی کا وہ مثالی نمونہ ہے جو تجربہ سے ماقبل موجود ہوتا ہے۔ عینیت پسند کے نزدیک انسان کی شخصیت آزاد ہے اور تعلیم کا کام یہ ہے کہ اس آزاد شخصیت کو نمو دے۔ جہاں تک امکانات کا تعلق ہے انسان کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم ہمیشہ ناقص رہتی ہے۔ لیکن عینیت پسند کے نزدیک تعلیم کی ایک قایم اور متعین منزل مقصود ضرور ہے۔ اس کے خیال کے مطابق تعلیم محض نمو پذیری اور مسلسل مطابقت اور پھر از سر نو مطابقت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ لامحدود کی سمت نمو پذیری ہے۔ لیکن فلسفۂ عملیت کے ماننے والے کو یہ چیز مبہم معلوم ہوتی ہے اور وہ اسے پوری طرح قابل عمل نہیں سمجھتا۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ عینیت پسند روح پر زور دیتا ہے۔ اس کا دعوٰی ہے کہ انسان محض علم حیات کے نامی وجود نہیں ہیں بلکہ زندہ مشینوں سے زیادہ اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں

انسان زندہ موجود ہیں۔ ہارن نے لکھا ہے: "عینیت پسند، زمین کو آسمان سے ملا دیتا ہے۔ انسان کو وہ لامحدود کی اولاد سمجھتا ہے۔ یہ ناقابل عمل بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ یہ علم میں علم کی خاطر بھی اعتقاد رکھتا ہے اور زندگی کی خاطر بھی۔ یہ زندگی اور تعلیم کے لئے ایک ایسی مطلق منزل کو تسلیم کرتا ہے جس کی طرف چل کر انسان اپنا صحیح کھوج لگا سکتا ہے۔ یہ انسان کی الوہی ابتدا اور لافانی انتہا کو قبول کرتا ہے.........."

جونیس ایل مریم اور بچہ کی زندگی سے مربوط نصاب اور نظام اوقات

تعلیمی نظریہ کو عملی طور پر جدید شکل دینے میں جونیس ایل مریم کا نام بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ ڈیوئی کی طرح مریم نے بھی سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک تجربی مدرسہ، مسوری کی یونیورسٹی میں قائم کیا جہاں وہ دس بارہ سال تک ایک انقلابی نصاب کا تجربہ کرتا رہا۔ مریم کا عقیدہ تھا کہ تعلیم ایسی چیز نہیں ہے جسے باہر سے ٹھونسا جا سکے بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو بچہ کے باطنی امکانات کو ابھار کر باہر لاتی ہے۔ ڈیوئی کی طرح مریم بھی مروجہ تعلیم کی روایت پرستی کو توڑنا چاہتی تھی۔ اپنے تجربہ کی سہولت کی خاطر اس نے مدرسہ کے نصاب اور مدرسہ کے فرنیچر کو خیرباد کہا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ ایسا نصاب بنائے جو بچہ کی زندگی سے مربوط ہو۔ اس نے مشغلوں کا پروگرام شروع کیا جس میں تفریحی سیر، تعمیری کام، مشاہدہ اور مباحثہ کا حصہ بہت اہم تھا۔ کچھ عرصہ بعد مریم اس نتیجے پر پہنچا کہ مدرسہ کے دن کو بغیر کسی قسم کی تقسیم کے رائج کئے چلاتے رہنا ناقابل عمل ہے چنانچہ آہستہ آہستہ مشاغل اور سامان کی ایک چوگونہ تقسیم رائج ہو گئی یعنی (۱) مشاہدہ (۲) کھیل (۳) کہانیاں اور (۴) ہاتھ کا کام۔ ظاہر ہے یہ سب ہربرٹ کے مدرسہ کے مقابلے میں فرائبل کے کنڈرگارٹن سے زیادہ مشابہ ہے۔ مریم کا پروگرام اسکول کے دن کا لحاظ رکھتے ہوئے نو ۹ سے نو ۹ منٹ کے چار گھنٹوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ یہ چیز روایتی اسکول کے دن سے جس میں دس تا تیس منٹ کے وقفوں کے بعد مقررہ طور پر کتاب خوانی کرائی جاتی تھی بہت مختلف تھی مریم کی اس جدت نے صرف کتاب خوانی کی پرانی روایت ہی کو نہیں توڑا بلکہ اس نے معلم

اور متعلم دونوں کے اندر بہت لچک پیدا کردی۔ اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس بات کو ہمیشہ کے لئے ثابت کردیا کہ مدرسہ کا دن محض گھڑی کی پابندی کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔

فرانسس۔ ڈبلیو پارکر کا مدرسہ اور پراجکٹ کے طریقے کی تلاش

کرنل فرانسس ڈبلیو پارکر امریکہ کا اوّل درجہ کا معلم تھا اس نے مضامین کے روایتی نصاب میں تو کوئی ترمیم نہیں کی لیکن وہ اپنی زندگی بھر اس خیال کی تبلیغ کرتا رہا کہ تعلیم نام ہے بچے کی پوری شخصیت کی نشو ونما کا۔ معلموں پر جو اس کا زبردست اثر تھا اس کی بناء پر اس کا شمار بھی ڈیوئی کے ساتھ ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے امریکہ کی بیسویں صدی کی تعلیم کو نئی شکل دینے میں بہت اہم حصہ لیا۔ پارکر کے انتقال سے ایک سال قبل اس کے نام پر ایک تجربی مدرسہ ۱۹۰۱ء میں شروع کیا گیا۔ اس کی بانی فلورا جے کُک تھی اور سولہ معلم اس کے اسٹاف میں شامل تھے جن میں سے اکثر کرنل پارکر کے ساتھ کُک کاؤنٹی نارمل اسکول میں کام کرچکے تھے۔ ڈیوئی اور مریم کے اسکولوں کی طرح یہ مدرسہ بھی رسمی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ ان تجربی مدرسوں کی طرح یہ بھی مضامین کی واضح تقسیموں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی پروجکٹ کے طریقے کی جانب اپنا راستہ ٹٹول رہا تھا اگرچہ ابھی تک اس طریقہ کی کوئی متعین شکل ظاہر نہ ہوسکی تھی۔ فرانسس ڈبلیو پارکر کے مدرسہ کی سرپرستی میں ۱۹۱۲ء سے سال ناموں کے شایع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس قسم کے آٹھ سال نامے شایع ہوئے اور ان میں اس مدرسے کے کام اور اس کے فلسفے کے بارے میں نہایت اچھے بیانات موجود ہیں۔ اس کی پہلی جلد میں اس مدرسے کے معلموں کے مندرجہ ذیل نتائج فکر کو درج کیا گیا تھا۔

جس کام کو طلبہ خود شروع کرتے ہیں اس سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔

بچے کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کی قوت اقدام کی تربیت کی جائے۔

بچے کو جن چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے ان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا بہترین موقع

نکالا جا سکتا ہے۔

اخلاقی اور ذہنی ترقی کی بہترین شرط یہ ہے کہ متوازن ذمہ داری کے ساتھ طلبہ کو آزادی دی جائے۔

اصلی ساز و سامان کے ذریعہ حقیقی تجربہ، تعلیم کے لئے لازمی چیز ہے۔

صحیح تعلیم کے لئے اظہار کے مختلف النوع مواقع بہت ضروری ہیں۔

سماجی محرک، کام کا سب سے موثر اور مفید محرک ہے۔

غرض، یہ نصب العین تھے جو اس اسکول کے چلانے میں کارفرما تھا۔ ادنیٰ جماعتوں میں بصورت مجموعی بارہ جماعتیں ہوتی تھیں یمضمونوں کی شعبہ وار تقسیم ختم کر دی گئی تھی اور ان کی جگہ مطالعہ کے وسیع وحدے بنا دیے گئے تھے اور جماعتی زندگی، یونانیوں کی زندگی، نوآبادیوں کی زندگی وغیرہ کو مرکز بنا کر اس کے گرد انھیں اکٹھا کیا جاتا تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہائی اسکولوں کے نصاب میں تجربہ کا کوئی موقع نہ تھا۔ کالج اور یونیورسٹی کا یہاں اقتدار قایم تھا اور اس کی وجہ سے وہاں تجربے کرنے ممکن نہیں تھے۔ امریکہ کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی یہی صورت تھی اور آج تک ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ادارے داخلے کی شرائط کے ذریعے ثانوی مدرسوں پر براہ راست نگرانی قایم رکھ سکتے تھے جس کی وجہ سے تعلیمی تجربے خصوصاً نصاب کے معاملے میں بہت مشکل تھے لیکن اب کچھ سالوں سے خصوصاً امریکہ میں ثانوی مدرسے بھی اپنی کچھ بیڑیوں کے توڑنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

ولیم۔ ایچ۔ کلپاٹرک اور پراجکٹ کا طریقہ

ولیم۔ ایچ۔ کلپاٹرک کو عام طور پر ڈیوئی کے مفسر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے لیکن جدید نظریہ تعلیم کے اور اس کے طریقوں کے بنانے میں خود کلپاٹرک کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے استادوں کے مدرسہ میں اس کے جو لکچر ہوتے تھے ان میں طلبہ کا اسقدر ہجوم ہوتا تھا کہ اسے لوگوں نے کروڑپتی پروفیسر کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لکچروں کی طرح اس کی تصانیف بھی اتنی ہی سادہ اور قابل فہم ہوتی

ہیں کہ ہزاروں معلم آزادی کے ان رجحانات سے واقف ہو گئے ہیں جو امریکہ کی تعلیم میں پائے جاتے ہیں اس کی بعض اہم تصنیفوں کے نام یہ ہیں: "مانٹی سوری نظام کی جانچ پڑتال" (۱۹۱۴) "فرابل کے کنڈرگارٹن کے اصولوں کی تنقیدی جانچ" (۱۹۱۶) "تعلیم کے فلسفہ کے ماخذوں کی کتاب" (۱۹۲۳) "طریقہ کی بنیادیں" (۱۹۲۵) "بدلتی ہوئی تہذیب کے لئے تعلیم" (۱۹۲۶)

جیمس اور تھارن ڈائک وغیرہ کی نفسیات سے متاثر ہوکر اور تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی نظام کی اہمیت کے قائل ہونے کے بعد کلپاٹرک کا مطالبہ یہ تھا کہ مدرسہ کو "ایسی جگہ بنایا جائے جہاں بچے حقیقی تجربے کر سکیں"۔ اپنی نفسیات کو تعلیمی عمل پر منطبق کرتے ہوئے کلپاٹرک نے جتلایا: "تعلیم کا ہر پُر معنی تجربہ ایک حد تک بعد کے تجربے کی تعمیر کرتا ہے۔ زندگی کے امکانات کے بارے میں ایک وسیع تر منظر اور زندگی کے اعمال کے بارے میں ایک گہری بصیرت عطا کرتا ہے۔ جو مختلف النوع نئی چیزیں دیکھی اور محسوس کی جاتی ہیں، ان کے بارے میں بھی مختلف النوع انداز طبیعت اور مختلف قدر شناسی کے جذبوں کو پیدا کرتا ہے۔ تکنیک میں اضافہ اور تجربے کے عمل پر نگرانی کی طاقت بخشتا ہے تاکہ اسے شعوری رہنمائی کے ماتحت لایا جا سکے۔"

کلپاٹرک کے خیال کے بموجب تعلم اور آموزش کی مختلف قسمیں اپنا کام علیحدہ علیحدہ نہیں کرتیں۔ چنانچہ اس بات کو اس نے دلچسپ پیرایہ میں اس طرح بیان کیا کہ "پوری بلی چوہے کو پکڑتی ہے"۔ کلپاٹرک کا عقیدہ تھا کہ تعلیم کے تین پہلو ہوتے ہیں (۱) ذہنی (۲) جسمانی اور (۳) مزاجی۔ پہلا پہلو کس طرح ہے، ان کی نمائندگی کرتا ہے، یعنی مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ دوسرا مہارت کے پہلو کی نمائندگی کرتا ہے اور تیسرا چیز کے مطالعہ کے لئے محرک فراہم کرتا ہے۔

پراجکٹ کا طریقہ

ڈیوئی، مزکم اور فرانسس۔ ڈبلیو پارکر اسکول کا شعبہ تعلیم جب غور و فکر اور تجربے میں مصروف تھے اس نے آخر کار پراجکٹ کے طریقہ کو پیدا کیا۔ کلپاٹرک اس طریقہ کا پہلا اور سب سے ممتاز مبلغ ہے۔ نفسیاتی اصل کے لحاظ سے

پراجکٹ کے طریقے کو ڈیوئی کے عمل فکر کی تطبیق قرار دیا جاسکتا ہے۔ پراجکٹ کی مختصر تعریف یہ ہے کہ یہ ایک بامقصد شغل ہے جو ایسے حالات کے ماتحت کیا جاتا ہے جو حقیقی زندگی سے بہت قریب اور مشابہ ہوتے ہیں۔ پراجکٹ کا طریقہ تعلیم کو غیر رسمی بنانا چاہتا ہے اور اسے شاگرد کی ضرورت کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے اس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ "بامقصد تجربے کا ایک واحدہ ہے ...... جہاں مقصد غالب بطور ایک محرک کے۔ (۱) عمل کے مقصد (منتہا) کو مقرر کرتا ہے (۲) طریقہ عمل کی رہنمائی کرتا ہے اور (۳) اس کے لئے قوت عمل فراہم کرتا ہے۔ یعنی پر جوش تکمیل کے لئے ایک اندرونی محرک فراہم کرتا ہے۔

پراجکٹ کی کئی قسمیں کی گئی ہیں۔ خود کلپاٹرک نے ان کی یہ فہرست بنائی ہے:- پیدا کرنے والوں کا پراجکٹ، خرچ کرنے والوں کا پراجکٹ، مشق یا بالخصوص مطالعہ کا پراجکٹ، کلپاٹرک کے علاوہ ایلسورتھ کالنگس ایک دوسرا معلم ہے جس نے پراجکٹ کے طریقہ کو عام رواج دینے میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ اس کے نزدیک پراجکٹ کی حسب ذیل قسمیں ہیں:- کھیل کے پراجکٹ، تفریحی سیروں کے پراجکٹ، کہانیوں کے پراجکٹ اور دستی پراجکٹ

تجربی مدرسوں میں جہاں پراجکٹ کا طریقہ پیدا ہوا اور جہاں اس نے نشوونما پائی، اس کا مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ یہ مدرسوں کو مضامین کی سخت اور ناقابل تبدیل حدبندیوں سے نجات دلائے گا۔ ہربرٹ کے طریقہ نے تعلیم کو بالکل مشین جیسا بنا دیا تھا۔ اس کی پوری توجہ واقعات کو جذب کرانے کی طرف تھی۔ اس نے حفظ یاد کرانے اور ذہنی کام کرانے پر بہت زور دے رکھا تھا۔ اس طریقہ کو کتابی تعلیم میں خصوصی مہارت حاصل تھی لیکن جو مضمون بچہ کو اس طریقہ سے سکھلایا جاتا تھا وہ بچہ کی زندگی سے بہت دور ہوتا تھا اور اس کی زندگی سے اس کا کوئی واضح تعلق نظر نہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ روایتی طریقہ، استاد سے مصروفیت کا بہت زیادہ مطالبہ کرتا تھا جس کی وجہ سے طلبہ مجہول ہی جاتے تھے۔ ڈیوئی، مرحوم اور دوسرے مصلحین یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس روایتی طریقہ سے نجات حاصل کریں۔ ان کے

نزدیک کوئی مضمون بذاتِ خود اہم نہیں تھا خصوصاً ان باقاعدہ جرعوں کی صورت میں جس طرح لیے ہوئے میں بچوں کو گھونٹ کر پلایا جاتا تھا۔ چنانچہ بعد میں اسی بات کو کلپاٹرک نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہمیں بچہ کو حساب اس وقت سکھانا چاہئے جب اس کی ضرورت ہو یعنی ایسے محل اور موقع (......) سے اسے مربوط کر کے جس میں حساب کی حقیقی ضرورت محسوس ہو۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ حساب کا مضمون زندگی کے راستے میں بہت سے مقامات پر بکھرا ہوا نظر آئے گا۔"

تخلیقی تحریر اور مے ارنس

پرانی طرز کا روائتی مدرسہ الفاظ کی تحریر کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس کلچر کو جو اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ آسانی سے حافظہ میں محفوظ اور گفتگو کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا، تحریر کے ذریعے محفوظ کرے۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا تعلیم کو زیادہ سے زیادہ اس بات سے سروکار رہنے لگا کہ طلبہ تحریری زبان پر پوری طرح قادر ہو جائیں اور گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے جب سے کہ مطبوعہ الفاظ کی اہمیت زندگی کے معمولی کاروبار میں روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے خصوصیت کے ساتھ یہ بات بالکل صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ انیسویں صدی میں نہ صرف یہ ہوا کہ تمام تعلیم کو لفظی بنا دیا گیا، بلکہ تقریباً سارے تعلیمی پروگرام کا مغز اور جوہر مطبوعہ مواد ہی میں نظر آنے لگا۔ پھر جب تعلیم کا مقصد ضبط کی عادتیں پیدا کرنا قرار دیا گیا تو پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کو بھی ضبط کی تربیت کا اصلی وسیلہ سمجھا جانے لگا۔ یہ خیال کہ لکھائی، نقل کرنے اور چربہ اتارنے کی مشق سے بھی زیادہ کوئی چیز ہے۔ اول تو کبھی کسی ذہن میں آتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی اتفاق سے آتا تھا تو اس کو فوراً مسترد کر دیا جاتا تھا۔ بچہ کی جانب سے اظہار ذات کی کوشش کو اتنا اہم نہیں سمجھا جاتا تھا جتنا کہ معیاروں کی پابندی کو چنانچہ تحریر میں خیال کے اظہار کے مقابلہ میں بندش الفاظ پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی مثلاً خوش خطی، قواعد زبان کی پابندی، اوقاف نگاری، حاشیہ چھوڑ کر صاف ستھرے کاغذ پر لکھنا

یہ چیزیں تھیں جن پر خاص نظر رکھی جاتی تھی۔ ان خارجی عاید کردہ پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ تحریر کی انفرادیت پامال ہوجاتی تھی۔ ایک طالب علم کی اچھی تحریر بالکل ایسی ہی ہوتی تھی جیسی کہ کسی دوسرے طالب علم کی ہوتی تھی۔ تحریر بجائے اس کے کہ بچے کی ذات کا اظہار کرتی افسوس ناک طریقہ پر فرسودہ طریقوں کی پابند بن جاتی تھی۔ پھر تحریر کی بنیاد چونکہ کوئی محسوس شدہ ضرورت نہ ہوتی تھی اس لئے یہ مفہوم سے معرا ہوجاتی تھی اور بچے کے نزدیک اس کی اہمیت اس سے زیادہ نہ ہوتی تھی کہ اس نے بالغوں کے تبلائے ہوئے گروں میں مہارت اور چابک دستی پیدا کرلی ہے۔

لیکن ڈیوئی اور بیسویں صدی کے دوسرے تعلیمی مفکروں نے بچوں کو بالغوں کے معیار کے مطابق تربیت دینے کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے قواعد زبان کی رواجی پابندی کی جگہ بے تکلفانہ اظہار خیال پر زیادہ زور دیا۔ بچہ کے خیالات کو انھوں نے اُس کی اِس مہارت کے مقابلے میں کہ وہ بالغوں کے طریقۂ اظہار کی اچھی نقالی کرسکتا ہے، زیادہ اہم قرار دیا۔ مناسب رہنمائی میں بچہ کیا کچھ کرسکتا ہے۔ اس بات کو مے آرنس نے تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ ثابت کر دیا۔ وہ نیویارک کی یونیورسٹی میں تعلیمات کا پروفیسر تھا اور اس نے دو کتابیں "خالق نوخیز" اور "تخلیقی قوت" کے نام سے تصنیف کیں۔ مے آرنس کو کالج کے طلبہ کی تعلیم ہی میں خداداد مہارت حاصل نہیں تھی، بلکہ وہ چھوٹے بچوں کا بھی ویسا ہی اچھا معلم تھا۔ "خالق نوخیز" میں اس نے اپنے ان مشاہدوں کو درج کیا ہے جو لنکن اسکول کی معلمی کے زمانے میں اس نے کئے تھے۔ اس مدرسہ میں جو طلبہ موجود تھے ان ہی سے اس نے اپنے کام کی ابتدا کی یعنی غیر پختہ جونیر ہائی اسکول کے طلبہ سے جنھیں اچھی تحریر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان نوعمروں کو مے آرنس نے کتابیں پڑھ کر سنائیں اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں تنقید کے سلسلے کو بھی جاری رکھا۔ آہستہ آہستہ ان میں سے وہ طلبہ جو زیادہ قابل تھے خود بھی اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے کتابیں پڑھنے کی طرف راغب ہوگئے۔ آہستہ آہستہ انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ کتابوں پر تنقید بھی کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس خود بھی کچھ کہنے کے لئے موجود ہے، اور جو

کچھ وہ کہتے تھے اس کی مصنف کی تحریر سے علیحدہ بھی ایک اہمیت ہے۔ مے آرنس کہتا ہے "ہم پڑھتے تھے۔ اس کے بعد پچاس منٹ تک جگالی کرتے تھے۔ پرانے مرغوب مصنفین کی تحریروں سے وہ لطف و اثر حاصل ہوتا تھا جو عمدہ نغموں کے دوہرانے سے ہوتا ہے......" ان تجربوں کے نتیجے کے طور پر رابرٹ فراسٹ کلب قایم کیا گیا اور اس کلب نے ادب کی کلاس کی جگہ لے لی۔ شاگردوں سے پڑھنے کے لئے کہا جاتا تھا لیکن وہ کیا پڑھیں، یہ بات خود ان کی پسند پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں عمدہ تحریریں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں اور ایسے بصیرت افروز تبصرے کئے جاتے تھے جن سے وہ چیز جو پہلے بے جان تھی ان کے لئے پر معنی بن جاتی تھی۔ دلچسپی بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی قدروں کے بارے میں زیادہ سرگرمی اور زیادہ پختگی کے ساتھ بحثیں کی جانے لگیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے بچے ادبی خوبیوں کے بارے میں بہت اچھی طرح نقد و تبصرہ کرنے لگتے تھے۔

تحریر کی جماعت میں بھی مے آرنس نے اسی طریقے کی پیروی کی۔ یہاں بھی اس نے ایک بے میل جماعت میں اپنا کام شروع کیا۔ یہاں بھی کوئی مقررہ چیز تحریر نہیں کرائی جاتی تھی یہ واقعہ ہے کہ بعض وقت پورا سال گذر جاتا تھا اور بچہ کچھ بھی نہ لکھتا تھا لیکن اس کے بعد بچے کی تخلیقی قوت بیدار ہوتی تھی۔ مے آرنس اپنا کام انفرادی ملاقاتوں اور جماعت کے ہمدردانہ اور مشفقانہ مباحثوں سے شروع کرتا تھا۔ اور اپنے شاگردوں میں خود اعتمادی کا احساس پیدا کراتا تھا۔ آہستہ آہستہ بچے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ لیکن مے آرنس برابر اس بات پر زور دیتا رہتا تھا کہ پوری قوت اور محنت کے ساتھ کوشش کریں۔ ابتدا میں بچہ تخلیق کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کو اپنی اس تخلیقی تصنیف کو بہترین شکل میں پیش کرنا ہوتا تھا۔ مے آرنس کے نزدیک ادارت و ترتیب کا یہ میکانکی عمل بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس نے پُر زور طریقے پر لکھا ہے "اپنی جگہ پر یہ سرد ذہنی منزل بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تخلیقی کام کی قدر اسی تناسب سے زیادہ ہوتی ہے جتنی کہ اس کے خالق کے اندر ذہانت ہوتی ہے"

مے آرنس کی استادانہ رہنمائی کے زیر اثر بچے نہ صرف عمدہ نثر لکھنا شروع کر دیتے تھے بلکہ بہت حسین نظمیں بھی کہنے لگتے تھے۔ خالق نوخیز اور تخلیقی قوت میں اس نے ان کی بیسیوں مثالیں درج کی ہیں۔ نوخیزوں کی خالقیت کو ابھارنے میں مے آرنس کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ مے آرنس خود ایک اچھا تخلیقی صناع تھا۔ جو وہ خود کہتا ہے "میں لکھنے والا ہوں، لکھنا سکھانے والا نہیں ہوں اور خدا کی ان دونوں مخلوقوں میں بڑا زبردست فرق ہوتا ہے" بلا شبہ ان دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لکھنے والے کے لئے تحریر ایک تجربہ کا اظہار ہوتی ہے، لیکن لکھنا سکھانے والے کے لئے تحریر اکثر وبیشتر محض تربیت کا ایک طریقہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مے آرنس بچوں کا شمار طالب علموں میں نہیں بلکہ تخلیقی اشخاص میں کرتا تھا۔ "وہ زبان کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے صناع ساری دنیا میں ہر زمانے میں اپنے معمول کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ یعنی اس کو بذات خود مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اپنے خیال یا جذبہ کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ زبان بجائے خود نسبتاً غیر اہم چیز ہے .... وہ کبھی لفظ پر توجہ نہیں کرتے بلکہ اس قوت پر کرتے ہیں جو لفظ کو پیدا کرتی ہے" ان سب باتوں سے زیادہ مے آرنس اس بات پر زور دیتا تھا کہ طلبہ کے اندر آمد ہونی چاہئے۔ بچہ کے کام میں کسی قسم کی مداخلت اور اس پر کوئی جبر نہ کرنا چاہئے۔ ماحول موافق اور سازگار بنانا چاہئے۔ مذاق اڑانا، شرم دلانا، غلط معیار قائم کرنا۔ اس طرح کی کوئی چیز نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ ہمدردی کے ساتھ بچے کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے" نوخیز اسی وقت ہمیں اس مملکت کی جس کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں لگایا جا سکا ہے اور جس کے نشان و آثار بہت دھندلے ہیں ایک جھلک دکھلاتے ہیں، جب انھیں بے خوفی کے ساتھ وہ بننے دیا جاتا ہے جو وہ ہیں، جب انہیں بالغوں کی مربیانہ سرپرستی سے محفوظ رکھا جاتا ہے، اور جب وہ اپنے کھیل میں یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کمتر درجہ کے ہیں"

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مے اَرَنس مکمل اور غیر محدود آزادی کا حامی تھا۔ انتہا پسند ونیکسن کی طرح وہ اس بات پر زور نہیں دیتا تھا کہ بچہ کو مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیئے اور بالغوں کی طرف سے حکومت، مذہب یا خاندان کی پابندیوں کی صورت میں اسکے معاملات میں کوئی مداخلت نہ ہونا چاہیئے۔

"مجھے سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ ان نوخیزوں پر بر خود غلط ہونے کا الزام لگایا جائے گا۔ نوخیز جب اپنی قوتِ فیصلہ کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے بڑے اس کو یہی نام دیتے ہیں، ہم جانتے تھے کہ ہمیں ان بچوں کو دنیا کے سخت اور ناقابلِ تبدیل رسم و رواج بھی سکھلانا چاہئیں...... مختصر یہ کہ ان کو ہمیں ادب و تمیز سے بھی باخبر کرنا چاہیئے لیکن فارغ التحصیل ہونے سے پہلے جتنے سبق انھیں سکھلائے گئے ان سب میں یہ سب سے کٹھن سبق تھا۔ بہر حال ہم نے اپنی طرف سے اس کے سکھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔"

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ قدرتی پن اگرچہ اچھی چیز ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ بعض موقعے اظہارِ ذات کے ہوتے ہیں اور بعض مصلحت شناسی کے: "ہمارے نتیجوں کی کامیابی کا راز اس ماحول میں ہے جو ہم معلم کی حیثیت سے ہشیاری کے ساتھ اور شعوری طور پر روزانہ بچوں کے لئے پیدا کرتے رہتے ہیں، جو اثرات مدرسہ شعوری طور پر پیدا کرتا ہے ان کی موجودگی میں ہمیں بھروسہ ہے، بچوں کا رویہ قدرتی ہی رہتا ہے۔ وہ عام طور پر اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ ہماری ہدایت کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ لیکن ہم بہر حال اس کی اہمیت سے ہر لمحہ باخبر رہتے ہیں۔"

فرانز سی زیک اور تخلیقی آرٹ

نئی تعلیم کے بانیوں میں ایک اور ممتاز نام فرانز سی زیک کا ہے۔ اس نے نازیوں سے پہلے کی جمہوریت آسٹریا میں خداداد صلاحیت رکھنے والے بچوں کی آرٹ کلاس میں نمایاں کام انجام دے کر اور صنعت و حرفت کے مدرسہ کے طلبہ میں اپنے تعلیمی فلسفہ کو پھیلا کر مدرسوں کی اصلاح

میں نہایت اہم حصہ لیا۔ تقریباً پچاس سال سے سی زیک تخلیقی اظہار کے ذریعہ بچوں کی قدرتی طاقتوں کو آزاد کرنے پر زور دے رہا ہے۔ اس کا قول ہے: "ہمیں ڈھکنا اٹھا دینا چاہیے" اس کا عقیدہ ہے کہ ہر بچے میں کسی نہ کسی چیز کی تخلیق کے ذریعے اپنی ذات کو ظاہر کرنے کا ایک قدرتی رجحان پایا جاتا ہے۔ اگرچہ شروع میں اس اظہار میں کوئی فن کاری نہیں دیکھی جا سکتی یہ قدرتی چیز ہوتی ہے، صناعی نہیں ہوتی۔ یہ خالقیت ابتدا میں بچے کی زاید توانائی میں نظر آتی ہے جو کسی نہ کسی خالقانہ اظہار کے ذریعے اپنے لئے ایک راستہ ڈھونڈ نکالتی ہے بعد میں جب یہ توانائی گھٹنے لگتی ہے تو بچہ اپنے "قرنوں کے ترکہ" سے اکتساب فیض کرنا شروع کر دیتا ہے۔ آخر میں بچہ کی خالقیت پر اس کے ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ کچھ بچے سی زیک کے مشاہدہ کے بموجب حالات سے بے نیاز ہو کر از خود ترقی کرنے لگتے ہیں۔ کچھ حالات میں ایسے بندھے جکڑے ہوتے ہیں کہ ان کی خالقیت کی قدرتی صلاحیت تقریباً مفلوج ہو جاتی ہے۔ کچھ صورتوں میں باری باری سے خودمختاری اور خودکاری کے زمانے آتے رہتے ہیں۔

سی زیک کا "قرنوں کا ترکہ" ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا۔ یہ بچے میں مخفی طور پر بھی موجود ہو سکتا ہے، یہ غائب بھی ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں یہ خلط ملط بھی ہو سکتا ہے اگر ترکہ مخفی طور پر موجود ہو تو اسے باشعور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ خلط ملط ہو تو اسے واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ مناسب تعلیم کے ذریعہ ایک توازن قایم کرنا پڑتا ہے تاکہ بچہ نئی چیز کو حاصل کر سکے۔ ماحول کے بارے میں سی زیک اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ خاندان کے ثقافتی اور تعلیمی اثر زوال کی طرف مائل ہے۔ جہاں تک اوسط درجہ کے مدرسہ کا تعلق ہے سی زیک اس سے زیادہ توقع قایم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک اس کی حیثیت ایک کارخانہ کی سی ہے۔ جو بچوں کو تیار تو کرتا ہے، لیکن ان کو نشوونما پانے کا موقع نہیں دیتا۔"

سی زیک کا دعویٰ ہے کہ ایک فرد میں دو طرح کی انانیت پائی جاتی ہے۔ ایک شعوری، دوسری غیر شعوری۔ موخرالذکر ہی وہ چیز ہے جو بچہ کے صناعی کے کام میں انفرادی حسن پیدا کرتی ہے لیکن رسمی مدرسہ اس غیر شعوری انانیت کو عام طور پر کچل ڈالتا ہے۔ بچہ کی روح لنجی ہو جاتی ہے اس کے اظہار ذات کی قوت بالغوں کے خیالات کے اثر سے مسخ ہو جاتی ہے۔ خالقیت مرجھا جاتی ہے۔ انفرادیت مرجاتی ہے۔ ایسی صورت میں سی زیک نوخیز کے لئے ارادتاً اس کے بچپنے کی دنیا کو، اس کی غیر شعوری انانیت کو باقی اور برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مے آرنس کی طرح یہ بھی بچہ کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے پر بہت زور دیتا ہے۔ غیر رسمی اشارے اور کنائے اور مناسب محل و موقع پر سلیقہ کے ساتھ تعریف کرنے سے وہ بچہ کے تحت شعوری میں ان خیالات کو شکل پذیر کرانے کی کوشش کرتا ہے جو تعبیر و تعفیہ کے لئے اس کے سینے میں بیتاب ہوتے ہیں۔ سی زیک کے نزدیک خالقیت کی جبلّی خواہش، ایک صناع کی طرح شکلوں اور خیالوں سے کھیلنے کی خواہش ایک وقتی چیز، ایک عارضی تنزل ہوتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اگر اس کی مناسب طریقہ پر نگہداشت اور آبیاری کی جائے تو اسے بچپن کے پورے زمانے میں باقی رکھا جا سکتا ہے لیکن ابتدائی عنفوان شباب میں یہ ضرور غائب ہو جاتی ہے۔ اس لئے خالقیت کی اس تحریک سے بچپن کے دوران ہی میں فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہے اور اسے جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ مدت تک باقی رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تاکہ بعد کو آنے والے عنفوانِ شباب کے زمانے میں معمولی قابلیت والے طلبہ کے پاس بھی خیالات اور محسوس شدہ تجربات کی ایک زرخیز بنیاد موجود رہے اور وہ اس سے رسمی حرفوں میں کام لے سکیں۔ رہا ان نادر روحوں کا معاملہ جو صناعی کی قدرتی صلاحیت رکھتی ہیں سو وہ تو اپنی خالقانہ طاقتوں کو برابر ترقی دیتی ہی رہیں گی اور آہستہ آہستہ ان تکنیک اور معیاروں پر قدرت حاصل کر لیں گی جو صناعی کے اعلیٰ ترین اظہار کے لئے لازمی بنیاد کا کام انجام دیتی ہیں۔

یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ آرٹ کی مروجہ تعلیم کو سی زیک پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں

دیکھتا تھا۔ درحقیقت وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ آرٹ کی تعلیم مدرسہ میں نہ دینی چاہئے۔ مدرسہ میں ایک عام مدرس اپنے طلبہ پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے! ایسی صورت میں آرٹ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ بچہ کی اظہار ذات کی حیثیت سے ترقی کرسکے گا۔ تخلیقی کام کے لئے استاد کا اثر بہت برا ثابت ہوتا ہے۔ خود اپنے اثر کو سی زیک اپنی جماعت کے لئے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہتا ہے، بچے بہترین تخلیقی کام اس وقت کرسکتے ہیں جب انھیں بالکل ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ سی زیک اس بات پر زور دیتا ہے کہ معلم کو بالکل صفر ہونا چاہئے۔ سی زیک کہتا ہے کہ میرے پاس چونکہ خود کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اس لئے میں اپنے طلبہ کی رہنمائی کو قبول کرتا ہوں۔" ہمیں بچوں کو خود بخود پڑھنے دینا چاہئے اور اس کے لئے"۔ ان کے اندر جو خدا موجود ہے اس سے بہتر کوئی دوسرا رہنما نہیں ہوسکتا۔ بچہ کی اس اندرونی زندگی کی ترقی کے لئے تعلیمی ٹکنیک کوئی جادو کی کنجی مہیا نہیں کرسکتا۔ البتہ اس پر زبردستی ایسے طریقے لادنا جو اس کے لئے قدرتی نہیں ہیں اس کی انفرادیت کا گلا گھونٹنا ہے۔

سی زیک کی کلاس بغیر کسی ضبط کے کام کرتی ہے نظم و انتظام اور معمول کی پابندی کی اس کے مدرسہ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اکثر اس کے تعلیمی حلقوں میں بہت شور و ہنگامہ نظر آتا ہے البتہ ضبط کے لئے صرف ایک خارجی مدد موسیقی کی ضرور استعمال کی جاتی ہے۔ تال سُر اور گانے کو زائد توانائی کی نکاس کی اہم اور قیمتی راہیں سمجھا جاتا ہے۔

تعلیم اور موسیقی جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے۔ نئی تعلیم میں بچے کی خالقیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ بات قدرتی تھی کہ نئی تعلیم کے حامی موسیقی کی طرف بھی توجہ کرتے۔ ابھی حال کے زمانے تک تو مدرسہ کے ہفتہ بھر کے پروگرام میں صرف ایک گھنٹہ موسیقی کی تعلیم کے لئے دیا جاتا تھا اور موسیقی کی قابلیتوں کے اظہار کا طریقہ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ طلبہ مل کر گایا کرتے تھے اور موسیقی کی علامات اور دیکھ کر پڑھنے پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ رسمی قواعد زبان کی طرح، موسیقی کا رجحان بھی قیاسی اور ذہنی ہونے کی طرف تھا۔ یہ ایک ایسا

(زیادہ صفحات کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے بقیہ مضمون مختصر صورت میں شائع کیا گیا ہے)